تفسیر
ترجمان القرآن بلطائف البیان
مصنف
مفسر القرآن نواب صدیق الحسن خان بھوپالوی
www.KitaboSunnat.com
بحسن اہتمام:
عبد اللطیف ربانی
مکتبہ اصحاب الحدیث
حسن مارکیٹ مچھلی منڈی اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم
جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں
مکتبہ اصحاب الحدیث
حسن مارکیٹ، مچھلی منڈی، اُردو بازار لاہور
فون نمبر: 7321823
www.KitaboSunnat.com
نادر اور نافع کتب کا بہترین مرکز
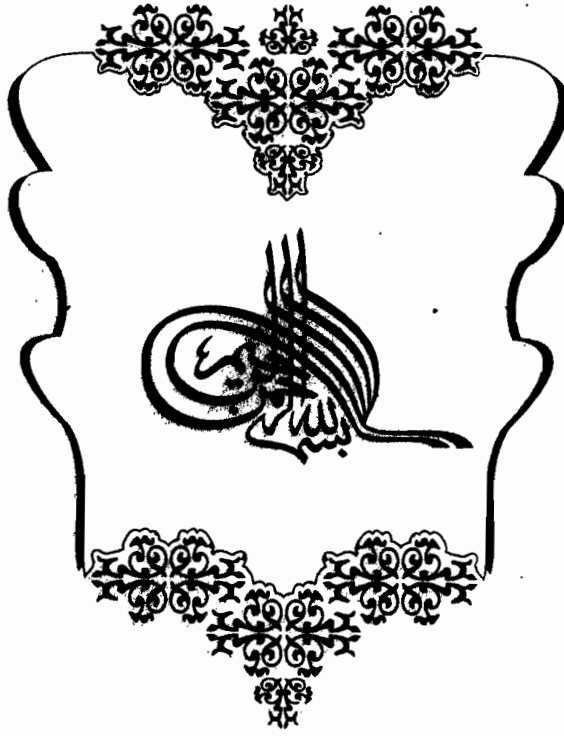
تفسیر

ترجمان القرآن (اُردو)
بلطائف البیان

صحیح احادیث کی روشنی میں ایک نادر اور جامع تفسیر

تفسیر

علامہ (نواب) صدیق الحسن خان رحمہ اللہ
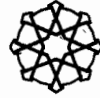
ترجمہ
مولانا فتح محمد جالندھری رحمہ اللہ
(بعض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ)

تسہیل
لجنۃ شیوخ الحدیث
والعلماء

مکتبہ اصحاب الحدیث
حسن مارکیٹ، مچھلی منڈی، اُردو بازار لاہور

نام کتاب: -------- تفسیر ترجمان القرآن بلطائف البیان

مصنف: -------- مفسر قرآن نواب صدیق الحسن خانؒ

اشاعت اول: -------- اکتوبر 2003ء

قیمت جلد اول: --------

ناشر: -------- عبداللطیف ربانی مدیر مکتبہ اصحاب الحدیث حسن مارکیٹ

مچھلی منڈی نیو اردو بازار لاہور۔ فون: 042-7321823

ملنے کے پتے

(1) مکتبہ اخوت نزد مچھلی منڈی (بوہڑ) نیو اردو بازار لاہور۔ (2) نعمانی کتب خانہ لاہور (3) اسلامی اکادمی لاہور۔

(4) مکتبہ سلفیہ لاہور۔ (5) مکتبہ رحمانیہ لاہور۔ (6) مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد۔ (7) مکتبہ دارارقم فیصل آباد

(8) مکتبہ تفہیم السنۃ اوکاڑہ (9) مکتبہ احیاء التراث الاسلامیہ سولجر بازار کراچی (10) فاروقی کتب خانہ ملتان

طبع في

المطبعة العربية

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰهِ رب العالمين الرحمن الرحيم مالك يوم الدين اياك نعبد و اياك نستعين والصلوٰة والسلام على عبده و رسوله محمد سيد المرسلين و خاتم النبين و على اله و اصحابه و من تبعهم بالاحسان اجمعين ا ٰتعين ابصعين ۔

امابعد !

ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنے معبود حقیقی اور خالق و مربی کو پہچانے اس کی صفات کو جانے اور اس کے احکام کا علم حاصل کرے کیونکہ اس کے بغیر اس کی عبادت ممکن نہیں جب تک انسان اللہ کی رضا و غیر رضا کو نہ جانے تب تک وہ اس کی رضا حاصل بھی نہیں کر سکتا ہے۔ پھر جو اس کی رضا کے حصول سے بے رغبت ہو وہ فضول شخص ہے اور اس کی زندگی بے فائدہ ہے۔ اور انسان پیدائشی طور پر لاعلم پیدا ہوتا ہے۔ پھر اللہ کی معرفت کا علم بتانے سے اسے پتا چلتا ہے اور اس کے علاوہ دوسری چیز بھی سکھانے سے سیکھ لیتا ہے۔ پھر بتانے والے جتنی بھی وضاحت کریں وہ اس کے برابر نہیں ہو سکتی جتنی ذات اقدس نے خود اپنے بارے میں بیان فرمائی اور وہ ہدایت جو اس کلام ربانی میں موجود ہے وہ اور کسی کے کلام میں نہیں ہو سکتی۔ لیکن کلام الٰہی عربی زبان میں تھا۔ بندوں کو اس کا سمجھنا مشکل تھا اس لیے سب سے پہلے شاہ ولی اللہ محدث دھلوی رحمہ اللہ نے فتح الرحمٰن کے نام سے اس کا فارسی ترجمہ لکھا۔ پھر ان کے بعد ان کے فرزند بزرگوار شاہ عبدالقادر دھلوی رحمہ اللہ اردو زبان میں موضح القرآن کے نام سے ایک ترجمہ لکھ گئے۔ اس ترجمے سے بندیوں کو بہت فائدہ حاصل ہوا۔ جیسا کہ ترجمہ فارسی سے علماء نے کثیر فوائد حاصل کیے اور تفاسیر کی تعداد ویسے تو شمار سے زائدہ ہے۔ تیرہ سو تفاسیر کا تذکرہ کتاب اکسیر میں ملتا ہے۔ پھر وہ تفسیریں عربی میں زیادہ ہیں اور دو چار فارسی میں ہیں اور ایک دو اردو میں۔ اس لیے ایک مدت سے اہل دین کی جماعت مجھ سے اصرار کر رہی تھی کہ میں اردو زبان میں ایک ایسی تفسیر لکھ دوں جو نہ بہت لمبی ہو نہ بہت مختصر بلکہ درمیانہ درجے کی ہو۔ جو کلام پاک کے معانی کی وضاحت کر دے اور کم علم والوں کو صراط ہدایت پر چلائے لیکن میرے پاس فرصت نہ تھی کہ اس کام کا ارادہ کرتا لیکن جب احباب کا تقاضا بڑھتا گیا تو بہر حال

رمضان ۱۳۵۲ھ بروز دو شنبہ کو میں نے تفسیر لکھنے کا آغاز کر دیا۔ اس سے قبل موضح القرآن کو اس کے مولف رحمہ اللہ نے ۱۳۵۵ھ میں لکھا۔ جس کو تین برس کم سو سال ہوئے ہیں۔ وہ فقط ترجمہ تھا یہ تفسیر ہے اس کو رمضان المبارک میں اس لیے لکھنا شروع کیا کہ سب سے پہلے آسمان دنیا سے نزول قرآن اسی بابرکت مہینے میں ہوا جیسا کہ قرآن میں بیان ہوا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرآن﴾ اس تفسیر میں آیات کا ترجمہ مع فوائد موضح القرآن کی عبارت کو روزمرہ حالات کے موافق تبدیل کر لیا ہے۔ اصل کے بالکل موافق نہیں رکھا اس لیے کہ تین کم سو سال میں کئی محاورے اردو زبان میں تبدیل ہو چکے ہیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ عوام الناس قرآن کے مفہوم و مطالب اپنی زبان میں سمجھ لیں۔ اسی غرض سے جو علمی بحثیں تھیں جیسے صرف و نحو اور قراء کے بیان کردہ معانی کی طویل بحثیں اس سے حذف کر دی گئی ہیں جن کو عام لوگ سمجھ نہیں سکتے تاکہ تفسیر عوامی مقبولیت حاصل کر لے۔ اس تفسیر میں آیات کی وہ تفسیر نقل کی گئی ہے جو حدیث صحابہ تابعین اور تبع تابعین اور عربی لغت سے بیان کی گئی ہے۔ کیونکہ جس طرح ان آیات کے مطالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرون ثلثہ مشہود لھا بالخیر سمجھے تھے اس کا مطلب ہر کوئی عالم بیان نہیں کر سکتا۔ اور اس کے علاوہ اپنی رائے کو یا غیر کی رائے کو یا علوم عقلیہ کو اپنی مرضی سے اس میں ملانا اس طرح کہ ترجمہ و تفسیر میں کوئی فرق نہ رہے بہت بڑا گناہ ہے۔ پھر اس کی تفسیر وہی معتبر ہے جو سلف سے منقول ہو کر ہم تک پہنچی ہے اور سب امت پر یہ بات لازم ہے کہ جس طرح وہ سب سے پہلے اپنے بچوں کو قرآن کریم کی تعلیم دیں اس طرح ان پر یہ بھی لازم ہے کہ یہ اہتمام کریں جب بچہ تھوڑی بہت حروف کی سوجھ بوجھ کر کے اردو زبان پڑھنے لگے تو اول موضح القرآن کا سبق دیں تاکہ وہ قرآن کریم کے لفظی معانی سمجھ لے اسے اس تفسیر کے پڑھانے سے یہ فائدہ ہوگا کہ سب سے پہلے کلام الٰہی کے معانی اس کے دل میں بیٹھ جائیں گے پھر جب وہ قرآن کریم پڑھ لے تو اس کے بعد حدیث کی چھ کتابیں پڑھا دیں۔ ان کا ترجمہ بھی اردو زبان میں ہو گیا ہے پھر جسے فقط احکام دین سیکھنا مقصود ہوں تو اسے اتنا علم و دانش کافی ہے۔ پھر اللہ جس کو بلند ہمت عطا کرے اور وہ علوم درسیہ پڑھے اور عالم ہو جائے تو اس کے لیے عربی لغت کی کی صحاح و سنن کی کتب و موجود ہیں۔ پھر وہ ان کو پڑھے، پڑھائے اور علماء کا درجہ حاصل کرے۔ قرآن کریم میں فرمایا کہ: "پڑھے ہوئے اور ان پڑھ برابر ہو سکتے ہیں؟" یعنی وہ برابر نہیں ہو سکتے۔ جن کو علم ملا ہے وہ بڑے بلند رتبوں میں ہیں۔ اللہ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو عالم ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ان کو جنت ملے گی۔ اللہ کو علم کے بغیر کوئی نہیں پہچان سکتا۔ تین چیزیں ایسی ہیں جس سے معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے

ایک اللہ کا کلام دوسرا رسول اللہ ﷺ کی سنت اور تیسرا فرائض کا علم۔ اسکے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ کم فائدہ ہے۔ آیا تو بھی کیا نہ آیا تو بھی کیا۔ دین و دنیا کی درستگی کے لیے علوم قرآن و حدیث اور فرائض کا علم ہی کفایت کرتے ہیں۔ جب ان پر عمل کیا گیا تو سمجھیں آخرت درست ہو گئی۔ اب کچھ ضروری نہیں رہا کہ اس کے لیے انسان بے فائدہ محنت کرے۔ پھر جس نے قرآن کریم مع ترجمہ و تفسیر پڑھا اور حدیث رسول کو حاصل کر لیا تو ان شاء اللہ اس آیت کا مصداق بن جائے گا: ﴿وَاٰتَیْنَاہُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ "اور ہم نے اس کو دنیا میں اچھائی دی اور وہ آخرت میں نیکو کاروں میں سے ہے" اور اسلام کا سارا دارومدار دو امر پر ہے: ایک اخلاص دوسرا صواب۔ اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ صرف اللہ کی عبادت کرے اور کسی اچھے یا برے حال میں کسی بھی طرح کسی کو اللہ کے ساتھ شریک نہ کرے۔ اسی کو اپنا معبود سمجھے اور اس کو اپنا رب جانے۔ اس سے توحید ربوبیت والوہیت مکمل ہو گئی۔ صواب کے یہ معنی ہیں کہ عمل صریح سنت کے موافق کرے اور بدعت والائے کی ہوا بھی نہ لگنے پائے۔ جب یہ دونوں کسی مسلمان میں جمع ہو جاتی ہیں تو وہ شخص کامل مومن ہو جاتا ہے۔ ورنہ اس کے ایمان میں نقصان ہے۔ کیونکہ اگر اخلاص نہ ہوا تو کوئی نہ کوئی کھلا یا مخفی شرک اس سے صادر ہو گا اور اس کے عقیدے میں موجود ہو گا۔ اگر صواب ہو گا تو عمل میں بدعت راہ پکڑے گی، ہر بدعت گمراہی ہے پھر جو شخص بدعت و گمراہی میں پھنسا اس کا سب کچھ ضائع ہو گیا۔ بہر حال اس تفسیر کو اردو زبان میں بہت سہل لکھا گیا ہے۔ اس کا تاریخی نام "ترجمان القرآن بلطائف البیان" رکھا گیا ہے۔ اللہ کریم اس کو اپنے فضل و کرم سے خالصتاً اپنی رضا کے لیے اس طرح قبول فرمائے جس طرح دونوں تراجم فارسی اور ہندی کو ہمارے مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ سے قبول فرما کر عالم کو اس سے فیض یاب کیا اور جس طرح ہمارا سلسلہ سند ان بزرگوں تک جا ملتا ہے۔ اسی طرح اس خدمت کا سلسلہ قبولیت بھی ان کے ترجموں تک جا ملے اور یہ بات اللہ کے احسان و انعام سے دور نہ ہے۔ اللہ کریم پہلے مجھے پھر میرے اہل و اولاد پھر سارے مومنین کو اتباع سنت کی توفیق عطا کرے۔ آمین

مقدمه

اللہ کریم نے فرمایا ہے:﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ "ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی جو ہر چیز کو بیان کرتی ہے۔" اور فرمایا:﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ﴾ یعنی "ہم نے اس کتاب میں کچھ (قابل ذکر) چیز نہیں چھوڑی۔" حدیث میں آیا ہے:((ستكون فتن قيل و مالمخرج منها قال كتاب الله فيه خبر ما قبلكم و خبر ما بعدكم و حكم ما بينكم)) اس کو ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ یعنی عنقریب فتنے ہونے والے ہیں۔ کسی نے کہا کہ ان سے نکلنے کے لیے کیا رستہ ہے فرمایا: اللہ کی کتاب موجود ہے اس میں اگلی پچھلی خبر اور حال کا حکم موجود ہے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ: جو کوئی علم سیکھنا چاہے وہ قرآن کو سیکھے اس میں پہلوں اور پچھلوں کی خبریں ہیں، اس اثر کو حضرت سعید بن منصور نے روایت کیا۔ بیہقی نے کہا اس مقام پر علم سے اصول علم مراد ہیں۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ اللہ کریم نے ایک سو چار کتابیں نازل کیں اور ان کا سارا علم چار کتابوں میں تورات، زبور، انجیل اور قرآن کریم میں رکھا پھر ان تینوں کتابوں کا علم قرآن مجید میں سمو دیا۔ پھر قرآن کا سارا علم مفصل میں ہے پھر تمام مفصل کا علم سورۃ فاتحہ میں ہے، جس نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر سمجھ لی گویا تمام آسمانی کتابوں کا علم حاصل کر لیا۔ اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے۔ امام شافعی نے کہا کہ کچھ ائمہ دین فرماتے ہیں کہ وہ سب سنت رسول ﷺ کی شرح ہے اور سنت قرآن کریم کی شرح ہے۔ بعض سلف نے کہا کہ میں نے کوئی حدیث نہیں سنی مگر اس کے لیے ایک آیت کتاب اللہ میں سے ڈھونڈ نکالی۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا کہ مجھے حدیث رسول ﷺ سے جو بھی صحیح حدیث ملی تو اس کا مصداق کلام مجید سے پایا۔ اس اثر کو ابن ابی حاتم نے روایت کیا۔ اور حضرت ابن مسعود کا یہ بھی قول ہے کہ اس قرآن میں ہر علم اتارا گیا۔ اور ہمیں ہر چیز کا فرق بتایا گیا لیکن ہمارا علم دریافت قرآن کے بیان سے قاصر ہے۔ [بتخریج ابن جریر ابن ابی حاتم] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اگر اللہ کسی چیز کو چھوڑتا تو ذرہ، خردلہ اور بعوضہ کو چھوڑ دیتا۔ [بتخریج ابو الشیخ] شافعی نے فرمایا کہ جو بھی نبی علیہ السلام نے حکم دیا ہے وہ سب کلام پاک سے سمجھا ہے۔ حضرت عائشہ کی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ صرف اس چیز کو حلال کرتا ہوں جو اللہ کریم نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے۔ [بروایت الطبرانی] یہ بھی امام شافعی کا

قول ہے کہ دین میں کسی شخص پر کوئی نیا مسئلہ درپیش نہیں ہوتا مگر اللہ کی کتاب میں اسے نئے مسئلے پر رستہ ہدایت ہوتا ہے۔ بعض احکام کہ جن کا ثبوت سنت سے ابتداء معلوم ہوتا ہے وہ بھی درحقیقت کتاب اللہ سے ہی ماخوذ ہیں۔ اس لیے کہ کتاب اللہ نے ہی سنت رسول ﷺ کی اتباع کا حکم دیا ہے اور رسول اللہ علیہ السلام کی اتباع ہم پر فرض کی ہے۔ ایک دفعہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے مکہ معظمہ میں یہ بات فرمائی کہ اے لوگو! تم مجھ سے جو بھی پوچھو گے میں اس کا جواب کلام پاک سے دوں گا کسی نے کہا کہ بتائے محرم کا زنبور کو قتل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ فرمایا :بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،قال الله تعالیٰ : ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ کہ جو پیغمبر علیہ السلام حکم دیں اس کو قبول کرلو اور جس سے منع کریں (اس سے) رک جاؤ۔ پھر اپنی سند سے حضرت حذیفہؓ کی حدیث روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:﴿اقتدو بالذين من بعدى ابى بكر و عمر﴾ پھر اپنی سند سے ایک اور روایت ذکر کی جس کا مضمون یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے محرم کو زنبور کے قتل کا حکم دیا۔

امام بخاری نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کیا کہ انہوں نے حدیث پڑھی کہ:﴿ لعن الله الواشمات والمستوشمات ......﴾ پر ایک عورت نے اس میں گفتگو کی تو انہوں نے فرمایا میں اس شخص پر کیسے لعنت نہ کروں جس پر نبی علیہ السلام نے لعنت کی اور وہ بات کلام مجید میں ہو۔ اس نے کہا میں نے وہ سارا قرآن پڑھا جو دونوں تختیوں (گتوں) کے درمیان ہے مگر جو تم نے کہا ہے وہ میں نے اس میں نہیں پایا۔ انہوں نے فرمایا اگر تو قرآن پڑھتی تو اس میں ضرور پاتی۔ کیا تو نے یہ نہ پڑھا:﴿ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ' وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ کہ رسول اللہ ﷺ جو تمہیں دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔ اس نے کہا: ہاں یہ تو پڑھی ہے فرمایا: پھر رسول اللہ ﷺ نے ان کاموں سے منع کیا ہے۔ ابن برجان کہتے ہیں کہ جو بات بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہی یا تو وہ بذات خود قرآن میں موجود ہے یا اس کی اصل قرآن میں ہے۔ وہ قریب ہو یا بعید ہو پھر جس نے سمجھا سو سمجھا اور جو اندھا رہا سو اندھا رہا۔ اسی طرح آپ علیہ السلام کا ہر حکم و فیصلہ کلام پاک میں موجود ہے ۔ حضرت عائشہؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ:﴿کان خلقه القران﴾ پھر غضب ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام تو قرآن پر عمل کریں لیکن امت عمل نہ کرے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ ایسی کوئی چیز نہ ہے جس کا قرآن سے نکالنا ممکن نہ ہو مگر اس کے لیے جس کو اللہ نے سمجھ دی۔ حتیٰ کہ بعض علماء نے نبی علیہ السلام کی عمر تریسٹھ سال ہونا بھی قرآن کریم سے سورۃ منافقین سے برآمد کیا کہ:﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا﴾ کیونکہ یہ آیت تریسٹھ سورتوں کی آخری آیت ہے اور اس کے بعد تغابن ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی غیر موجودگی پر افسوس کا

اظہار ہوتا ہے۔ مریسی نے کہا کہ قران کریم نے تمام پہلے اور پچھلے علوم جمع کر لیے ہیں سوائے ان علوم کے کہ جن کے در حقیقت احاطہ کے ساتھ اللہ ہی کی ذات خاص ہے اور وہ خصوصی علوم نبی علیہ السلام بھی نہیں جانتے۔ پھر آپ علیہ السلام کے بعد کبار صحابہ کرام خلفائے اربعہ زیادہ علم رکھتے تھے اور جیسے حضرت ابن مسعودؓ و ابن عباسؓ وغیرہ تمام صحابہ سے بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر اونٹ کے پاؤں میں باندھنے والی رسی گم ہو جائے تو میں اس کو بھی کتاب اللہ میں پالوں گا۔ پھر وہ علم صحابہؓ سے تابعین عظام کی وراثت میں منتقل ہوا۔ پھر اس کے بعد ہمتیں کم ہو گئیں، ارادے سست پڑ گئے، امنگیں جاتی رہیں، اہل علم کم ہو گئے، علم کا بوجھ صحابہؓ نے اٹھایا تھا۔ پھر یہ بوجھ ان سے نہ اٹھایا جاسکا۔ انہوں نے علوم کو قسمیں قسمیں کر دیا۔ ہر گروہ ایک خاص علم و فن سے قائم ہوا۔ کسی نے لغات و قرأت تحریر کیں۔ معرفت مخارج حروف، شناخت عدد کلمات و آیات، سورو اجزاء و انصاف ارباع و عدد سجدات و تعلیم اعشار آیات، حصر کلمات اور متشابہ آیات و متماثلہ آیت کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے نہ معانی سے کچھ تعلق رکھا نہ ان کے مطالب میں غور و فکر سے کام لیا، ان لوگوں کو قراء کہا جاتا ہے۔

کسی نے یہ کام کیا کہ اسماء و افعال، حروف عاملہ غیر عاملہ اور معرب و مبنی سے بحث کی اور اسماء و توابع اسماء میں خوب دل بھر کر کلام کیا اور اقسام لازم و متعدی، رسوم خطِ کلمات اور اسی کے متعلقات سے بحث کی اور طویل وسعت دی۔ پھر کسی نے اس میں مشکلات پر اعراب لگائے یا کسی نے ہر کلمہ کو معرب کر دیا۔ (اعراب لگا دیئے) مفسرین الفاظ میں کھو کر رہ گئے۔ دیکھا کوئی لفظ ایک معنی پر دلالت کرتا ہے کوئی دو معانی پر اور کوئی دو سے بھی زیادہ معانی پر دلالت کرتا ہے۔ پہلے تو لفظ کو اس کے معنی پر رکھا پھر مخفی معنی ظاہر کیے اور جس حرف میں کئی معانی کا احتمال تھا ان میں سے کسی کو راجح اور کسی کو مرجوح قرار دیا۔ ہر ایک نے اپنی سوچ فکر سے کام لیا جس طرح نظر اٹھی اس کی موافقت کی پھر اہل اصول و کلام اٹھے انہوں نے عقلی دلائل اور اصلی شواہد کا ذمہ لیا۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ اس سے انہوں نے وحدانیت، وجود و بقاء، قدم و قدرت و قلم اور تنزیہ پر بہت سے دلائل تلاش کیے اور بہت سی حجتیں قائم کیں، اس علم کا نام علم اصول رکھا۔ ایک گروہ نے خطاب کے معانی میں غور و فکر کیا کسی کو عموم پر محمول کیا کسی کو خصوص پر محمول کیا۔ پھر اس سے حقیقت و مجاز کے احکام تخریج کیے اور تخصیص اضمار، نص، ظاہر، مجمل، محکم متشابہ و امر و نہی اور نواسخ پر گفتگو کی۔ انواع قیاسات استصحاب حال و استقراء محال کیا۔ پھر اس فن کا نام اصول فقہ رکھا۔ ایک اور گروہ نے اپنی نظر صحیح اور فکر صادق سے کام لیا اور حلال و حرام اور سارے احکام میں غور کیا۔ احکام کے اصول و فروع بنائے اور مفصل و مبسوط کلام

تحریر کیا اسکا نام علم فروع و فقہ رکھا۔ اور کسی گروہ نے یہ کیا کہ سارے گذشتہ امتوں اور پہلے قصوں کو چھان دیا احادیث اور آثار و واقعات کو مرتب کیا اور ابتدائے دنیا کے اول معاملات کا ذکر کیا اور اس فن کا نام علم تاریخ و قصص رکھا۔ پھر ایک اور گروہ نے تمام حکمتیں مثالیں اور نصیحتیں جمع کیں جن سے دل ڈھل جائیں، پہاڑ پھٹ جائیں اور وعد وعید، خوف و خوشخبری، موت، مابعد کے حالات کا ذکر، حساب و کتاب، ثواب و سزا اور جنت جہنم کا ذکر کیا۔ انہوں نے نصائح کی فصلیں اور زواجر کے اصول مقرر کیے ان لوگوں کو وعاظ و خطباء کہا جاتا ہے۔ ایک اور قوم آئی تو انہوں نے خواب کی تعبیر کے اصول بنائے، سورۃ یوسف کی جس آیت میں موٹی گایوں کا ذکر ہے اور دو قیدیوں کے خواب کا ذکر ہوا اور جو انہیں سجدہ کیا گیا جو مضمرت حضرت یوسف علیہ السلام کو چاند ستاروں اور سورج نے سجدہ کیا، اس قسم کی آیات سے اس فن کو تخریج کیا، اس فن کو تعبیر الرؤیا کا نام دیا، ہر خواب کی تعبیر کلام پاک سے دریافت کی جو وہاں سے نہ مل سکی اسے حدیث مطہرہ سے تلاش کیا۔ کیونکہ سنت کتاب اللہ کی وضاحت ہے۔ پھر اگر کچھ سنت سے نہ پایا تو حکمتوں اور مثالوں سے پھر عوام کی بول چال و عرف و عادات و اصطلاح سے تلاش کر لیا۔ پھر ایک قوم آئی جس نے میراث کی آیت سے وراثت کے حصوں اور حصہ داروں کو سمجھا۔ نصف ثلث، ربع، سدس، ثمن کے حساب مقرر کیے اور مسائل عول درست کیے اور وصیت کے احکام واضح کیے اور ان مسائل کے علم کو علم الفرائض کے نام سے موسوم کیا۔ پھر ایک اور جماعت جس نے وہ تمام آیات جمع کیں جو اللہ کی حکمت بالغہ پر دلالت کرتی ہیں جن میں سورج، چاند، ستارے، دن، رات، اور چاند کی منازل اور ستاروں کے مدار اور بروج وغیرہ کا ذکر ہے انہیں جمع کر کے علم مواقیت بنایا، پھر شعراء کتّاب آئے انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اور کوشش نظم و نسق اور حسن سیاق، مبادی، مقاطع و مخالص و تلوین خطاب اور کلام کے طوال و اختصار پر صرف کر دی۔ انہوں نے معانی اور وضاحت کا استنباط کیا اور اصحاب اشارات و حقیقت نے اور میدان میں اپنی نظر دوڑائی اور جو الفاظ و معانی اور کتاب اللہ کے نکات ان پر واضح ہوئے۔ انہوں نے علامتی اصطلاحات مثلاً بقاء و فناء، حضور، خوف و ہیبت، انس و وحشت، قبض و بسط وغیرہ قائم کیں۔ یہ تو مختصراً ان فنون کا بیان ہے جن کو ملت اسلامیہ نے کلام پاک سے حاصل کیا اس کے علاوہ اور علوم و فنون بھی ہیں جن پر کلام مجید محیط و مشتمل ہے۔ جیسے علم طب، معیشت، ہندسہ جدل، جبر، مقابلہ، نجامت وغیرہ۔ طب کا دار و مدار نظام صحت کے تحفظ اور استحکام قوت پر ہے۔ یہ امور اعتدال سے اور اپنے متضاد امور کے وجود سے حاصل ہوتے ہیں۔ سو کتاب اللہ کی آیت ﴿وَ كَانَ بَيْنَ ذَالِكَ قَوَامًا﴾ کہ وہ اس کے درمیان معتدل ہے۔ اس کو جامع طور پر شامل ہے۔ پھر یہ بات پہچاننا چاہئے کہ

صحت کا دوبارہ آنا فتور صحت کے بعد اور شفاء کا حصول وجود علالت کے بعد ہوتا ہے۔یہ بات اس آیت مبارکہ میں ہے:﴿ شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ ﴾یعنی وہ پینے کی چیز ہے جس کے مختلف رنگ ہیں۔اس میں لوگوں کے لیے شفاء ہے۔پھر اجساد کی طب پر قلوب کی طب کو بڑھادیا، فرمایا:﴿ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ﴾اور یہ شفاء اس چیز کے لیے جو سینوں میں ہے اور ہیئت ان آیات کے متعلق ہے جن میں زمین و آسمان کی تخلیق اور عالم علوی و سفلی کا ذکر اور مخلوقات کے انتشار کا تذکرہ ہے اور علم ہندسہ جیسے یہ آیت:﴿ اِنْطَلِقُوْا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ لَا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴾اس میں قاعدہ ہندسیہ موجود ہے کہ مثلث شکل کے لیے سایہ نہیں ہوتا۔اور جدل کے براہین و مقدمات و نتائج و اقوال وغیرہ پر بہت سے آیات دلالت کرتی ہیں، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ اصل اور قدیم بنیاد ہے۔جبر و مقابلہ کی صورت یہ ہے کہ صورت کے اوائل میں عوام وایام تواریخ امم سابقہ کا ذکر ہے اور اس میں بقایا ملت اسلامیہ و تاریخ مدت دنیا ہے کہ دنیا کتنی گذری اور کتنی باقی رہی ہے اور بعض کو بعض میں ضرب دینے سے یہ حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور نجامت:﴿ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ ﴾میں ہے۔حضرت ابن عباس نے اس کی یہی تفسیر فرمائی۔بعض نے کہا اس علم حدیث کی اسناد کا علم مراد ہے۔اگر اس آیت کو دونوں علوم پر دلیل بنالیا جائے تو بھی کچھ مانع نہ ہے اور قرآن کریم سے اتباع سنت کے حکم اور رد تقلید کا حکم تو بارہا دفعہ نکلتا ہے۔اس آیت سے سلسلہ اسناد کا علم ہونا واضح ہوتا ہے۔وللّٰہ الحمد.

اور قرآن کریم میں جس طرح علوم و فنون کے اصول مذکور ہیں اسی طرح کاری گری اور آلات کے نام بھی ہیں جن کی روز مرہ میں ضرورت ہوا کرتی ہے اور صنائع میں خیاطت ہے اس میں یہ دلیل ہے ﴿ وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ ﴾کہ وہ گانٹھنے لگے۔اس سے جوتے گانٹھنے کا پیشہ بھی واضح ہوا کیونکہ جوتا گانٹھنے کو عربی میں خصف کہتے ہیں اور آہن گری کا ذکر اس آیت میں ہے﴿ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ،وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴾معماری کا کام بھی بہت سی آیات میں مذکور ہے:﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ ﴾کہ ہم نے آسمان کو ہاتھ سے بنایا اور تجارت یعنی بڑھئی پیشہ کا ذکر بھی اس میں ہے:﴿ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ ﴾غزل یعنی سوت کاتنے کا ذکر اس آیت میں ہے کہ ﴿ نَقَضَتْ غَزْلَهَا ﴾کہ وہ اپنا کاتا ہوا سوت توڑ دیتی اور نسبح بنائی کا کام آیت میں مذکور ہے کہ ﴿ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ﴾جیسے ایک مکڑی کی مثال ہے کہ اس نے گھر بنالیا۔اور کھیتی باڑی کا ذکر فرمایا تو کہا:﴿ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴾کہ تمہارا کیا خیال ہے جو تم کھیتی باڑی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ اور کئی آیات میں بھی اس کا ذکر موجود ہے اور شکار کھیلنے کا ذکر کئی آیات میں بھی اس کا ذکر آیا ہے جیسے محرم کے متعلق فرمایا:﴿ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ

البَحْرِ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ﴾ کہ جب تک احرام کی حالت میں ہو تو تم پر دریائی شکار حرام ہے۔ اور غوطہ خوری کا ذکر اس آیت میں ہے کہ ﴿ کُلَّ بَنَّاءٍ وَّ غَوَّاصٍ ﴾ کہ سارے معمار اور غوطہ خور۔ اور فرمایا: ﴿ وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً ﴾ کہ تم اس سے زیورات نکالو۔ اور سناری کے پیشہ کا ذکر اس میں کیا فرمایا: ﴿ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا ﴾ کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کی قوم نے اپنے زیورات سے ایک بچھڑا بنا لیا۔ شیشہ آلات کا کام اس آیت میں مذکور ہے ﴿ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ﴾ کہ وہ محل تھا جس میں شیشے کا جڑاؤ کیا گیا تھا اور: ﴿ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ﴾ چراغ ہے شیشے میں ہے۔ اور اینٹوں سے تعمیر کا ذکر اس آیت میں ہے۔ ﴿ فَاَوْقِدْ لِيْ يَا هَامَانُ عَلَى الطِّيْنِ ﴾ کہ اے ہامان! میرے لیے مٹی پر آگ جلاؤ۔ اور ملاحی و تیراکی کا ذکر اس آیت میں ہے۔ ﴿ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ ﴾ اور جو کشتی ہے وہ مساکین کی ہے جو دریا میں کام کرتے ہیں۔ اور کتابت کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴾ کہ رحمٰن وہ ہے جس نے قلم سے (لکھنا) سکھایا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی آیات میں اس کا ذکر ہے۔ اور نانبائی کا پیشہ بھی اس قوم میں مذکور ہے ﴿ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا ﴾ کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہیں اور باورچی گری کا پیشہ بھی مذکور ہے کہ: ﴿ فَجَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴾ کہ وہ ایک تلا ہوا بچھڑا لے آئے۔ اور غسل کرنا اور اہتمام طہارت کا ذکر فرمایا کہ: ﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ اور ﴿ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ ﴾ کہ حواریوں نے کہا یہ حواری دھوبی تھے اور قصاب کا پیشہ یوں ذکر فرمایا: ﴿ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ﴾ کہ مگر وہ جو تم پالو (ذبح کرو) اور سوداگری کا ذکر بڑی تعدد میں مذکور ہے فرمایا: ﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ کہ وہ ایسے لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔ رنگریزی کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ صِبْغَةَ اللّٰهِ ﴾ کہ اللہ کا رنگ ہے۔ اور ﴿ وَبِيْضٌ وَّ حُمْرٌ ﴾ اور سفید اور سرخ اور سنگ تراشی کا ذکر اس میں ہے ﴿ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا ﴾ کہ تم پہاڑوں سے گھر تراشتے ہو۔ اور ماپ تول کا ذکر کئی آیات میں ہے کہ ﴿ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴾ کہ سیدھے ترازو سے وزن کرو۔ اور فن تیر اندازی کا ذکر اس آیت میں ہے۔ فرمایا: ﴿ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ﴾ کہ جب آپ ؐ نے تیر پھینکا وہ حقیقتاً آپ ؐ نے نہ مارا بلکہ اللہ نے مارا تھا۔ اور: ﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ ﴾ کہ ان کے لیے مقدور بھر قوت تیار کر رکھو۔ حدیث میں قوۃ سے مراد تیر اندازی ہے لیکن لفظ عام ہے ہر قسم کی سپاہ گری کے لیے مستعمل ہو سکتا ہے اس میں بندوق چلانا، غلیل چلانا، توپ چلانا وغیرہ سب کچھ داخل ہے اور ان مذکورہ اشیاء و پیشہ جات کے سوا اور بھی جو آلات وغیرہ کلام پاک میں ذکر ہے وہ سب اس آیت کے

معنی کو شامل ہے جس میں فرمایا کہ: ﴿ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ کہ ہم کے کلام مجید میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ کچھ زیارت کے ساتھ موسیٰ کا کلام تمام ہوتا ہے بقول سیوطی لیکن اس کلام میں جو جوتے گانٹھنے کا ذکر اور اسناد حدیث کے علم ہونے کا کلام ہے وہ کلام سیوطی سے بھی زیادہ کیا گیا اصل میں کلام سیوطی سے نہ تھا۔اسی طرح یہ آیت: ﴿ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ ﴾ کہ ان پر اپنے سوار اور پیادے جمع کرے سے فن انتظام اور اقسام لشکر واضح ہوتا ہے اور: ﴿ وَيَخْلُقُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ سے وہ تمام نئی مصنوعات مراد ہیں یعنی اس آیت کے تحت وہ بھی داخل ہیں جو قیامت تک دنیا میں نئی پیدا ہوں گی۔ غرض یہ کہ جو کوئی قرآن میں جتنا زیادہ غور کرتا ہے اس پر اس کے اسباب کھلتے ہیں۔ اللہ کی کتاب میں ہر چیز ہے خواہ وہ دلالت نص کے طریقے سے ہو یا اشارہ نص کے طریقے سے ہو۔اور علوم فنون کی اقسام میں سے کوئی قسم بھی ایسی نہیں جس کا ذکر قرآن کریم میں نہ ہو۔ ضرور کلام پاک میں اس چیز میں یا اس باب میں کوئی نہ کوئی بات ضرور موجود ہے اگر ہم اسے نہ حاصل کر سکیں یا تلاش کے باوجود نہ پا سکیں تو یہ ہماری عقل و فہم کی کمی ہے نہ یہ کہ کتاب اللہ میں کچھ کمزوری ہے ۔نیز کلام پاک میں مخلوقات کے عجائب کا علم، زمین و آسمان کی بادشاہی اور اس میں جو کچھ ہے سب ملکیت کا علم اور اوپر والے جہاں کا علم اور زمین میں نچلے جہاں کا علم اور مخلوق کی ابتداء کا علم اور مشہور انبیاء و رسل کے نام، فرشتوں کا تذکرہ اور پہلی امتوں کی خبروں کا علم واقع ہے۔ جس طرح ابلیس سمیت حضرت آدمؑ کو جنت سے نکالنا، پھر اولاد کا نام عبدالحارث رکھنے کا قصہ ،اور حضرت ادریس علیہ السلام کا آسمان کی جانب اٹھنے کا قصہ پھر قوم نوح علیہ السلام کے غرق ہونے کا ذکر پھر عاد اولیٰ و ثانیہ کے قصے ،اس کے بعد قوم تبع کا ذکر پھر حضرت یونسؑ کا قصہ اور اصحاب کہف کا قصہ اور اصحاب الرس کا قصہ ، ثمود کی اونٹنی کا قصہ اور قوم لوط و قوم شعیب کا ذکر اور ان کا دوبارہ بھیجے جانے کا ذکر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر پھر دریا میں پھینکے جانے کا ذکر اس کے بعد قبطی کے قتل کا واقعہ پھر وہاں سے مدین جانا وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت کرنا پھر ان کی بیٹی سے شادی کرنا پھر واپسی پر کوہ طور کے جانب میں اللہ کے کلام سے مشرف ہونا پھر اس کے بعد فرعون کی طرف جانا، پھر مصر سے نکلنے کا ذکر اور اس کے بعد فرعون کے غرق ہونے کا ذکر پھر بنی اسرائیل کے بچھڑے کی عبادت کرنے کا ذکر پھر قوم پر بجلی گرنے کا ذکر پھر بنی اسرائیل کے مقتول کا ذکر پھر ذبح گائے کا تذکرہ، پھر جبارین کے قتل کا واقعہ پھر حضرت موسیٰ کی خضر علیہ السلام سے ملاقات کا ذکر پھر قوم کا سرنگ سے چھین جانے کا واقعہ پھر طالوت و داؤد علیہما السلام کا جالوت سے مقابلے کا ذکر پھر حضرت سلیمان کا ملکہ بلقیس کے ساتھ بات چیت کا واقعہ پھر اس قوم کا قصہ جو طاعون کے ڈر سے بھاگی

لیکن اللہ نے انہیں پھر بھی مار دیا لیکن بعد ازاں زندہ کر دیا، پھر ابراہیم کا ذکر اور ان کا اپنی قوم سے جھگڑا کرنا اور نمرود مردود سے مناظرے کا ذکر پھر حضرت ہاجرہ واسماعیل علیہما السلام کو مکہ معظمہ میں چھوڑ جانے کا ذکر پھر ذبح کا واقعہ پھر کعبہ کی عمارت کی تعمیر کا ذکر ہے پھر اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر ہے اس میں عشق و فسق کی خدمت اور تقویٰ و طہارت و حیاپسندی کی مدح مذکور ہے یہ قصہ بڑا تفصیلی ہے۔ پھر مریم علیہا السلام و علی سائر المؤمنات السلام کا قصہ۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی ولادت پر ان کی رسالت اور پھر آسمان کی طرف اٹھائے جانے کا ذکر ہے۔ پھر حضرت زکریا کا قصہ پھر یحییٰؑ کا قصہ اور حضرت ایوبؑ کا ذکر اور ذوالکفل کا ذکر اور ذوالقرنین کا قصہ اور ان کا سورج کے طلوع و غروب کی جگہ تک جانے کا قصہ اور پھر دیوار یاجوج ماجوج کی تعمیر کا قصہ، پھر اصحاب کہف ور قیم کا ذکر پھر بخت نصر کا قصہ پھر ان دو آدمیوں کا ذکر جن میں سے ایک کے پاس بڑا ہرا بھرا باغ تھا ۔پھر ایک اور باغ والوں کا قصہ اور ایک مومن کا قصہ پھر ہاتھی والوں کا ذکر پھر اس جبار کا قصہ جس نے آسمان پر چڑھنا چاہا تھا پھر ان قصوں میں سے ہر قصے کے نیچے اس قدر نصائح و حکمتیں مذکور ہیں جن کے لیے ایک کتاب کافی نہیں ہے۔

فائدہ: نیز قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کے ذکر پھر بھی توجہ کی گئی ہے۔ آپ کا رسول بننا، پھر ہجرت کرنا اور حضرت ابراہیم کی دعوت عام کرنا حضرت عیسیٰ کی بشارت ہونا ذکر کیا اور غزوات میں سے سورۃ انفال میں غزوہ بدر کا ذکر کیا اور سورۃ آل عمران میں غزوہ احد کا ذکر کیا اور سورۃ الاحزاب میں غزوہ خندق کا ذکر فرمایا اور سورۃ حشر میں بنو نضیر کی جلاوطنی اور سورۃ الفتح میں صلح حدیبیہ کا ذکر کیا۔ سورۃ براۃ میں غزوہ تبوک کا ذکر کیا سورۃ مائدہ میں حجۃ الوداع کا تذکرہ فرمایا پھر حضرت زینب بنت جحش کے نکاح کا ذکر تحریم سریہ، اور بیویوں کی ایک دوسری کی مدد کرنا ذکر ہے اور حضرت عائشہ پر بہتان لگانے کا واقعہ، شب معراج کا ذکر، چاند کا دو ٹکڑے ہونا اور یہود کا جادو کرنا یہ سب بتقاضائے اسلوب قرآن کریم میں جہاں تفصیلی یا اجمالی ذکر کرنا مناسب ہوا وہاں ذکر کیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی طیبہ و مبارکہ کی قسم کھائی فرمایا: ﴿لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ کہ اے پیغمبر علیہ السلام آپؐ کی عمر کی قسم وہ لوگ گونشے میں مدہوش ہیں اور ﴿وَقِيلِهِ يَا رَبِّ﴾ اور قسم ہے ان کے کہنے کی اے پروردگار!، الغرض گویا اسلام کی تاریخی کتب انہیں حالات وواقعات کی شرح ہیں۔

فائدہ: پھر اس کلام پاک میں انسان کی حقیقت بند ہے اس کی ابتدائی تخلیق سے اس کی موت تک حالت و کیفیت بیان ہے۔ پھر موت اور روح کے قبض ہونے کی کیفیت بیان کی ہے۔ پھر یہ بیاں فرمایا کہ جب روح قبض

ہو کر آسمان پر جاتی ہے تو کیا ہوتا ہے، مومنین کی ارواح کو کامیابی دی جاتی ہے، کفار کی روحوں کو دوبارہ زمین پر گرادیا جاتا ہے۔ پھر عذاب قبر، اور قبر میں سوال وجواب پھر ارواح کے مقام اور قیامت کی بڑی بڑی علامات کا الگ بیان ہے۔ یہ دس علامات ہیں، نزول عیسیٰ علیہ السلام، دجال کا نکلنا، یاجوج و ماجوج کا ظاہر ہونا، دابۃ الارض کا آنا، دھواں اٹھنا، قرآن کا سینوں اور اوراق سے اٹھ جانا، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، توبہ کا دروازہ بند ہونا اور زمین کا دھنسنا، بے ہوشی اور گھبراہٹ کا صور پھونکا جانا اور دوسرا نفخہ حشر نشر کے لیے ہوگا اور میدان محشر کی ہولناکی اور سورج کی حرارت کی شدت عرش عظیم کا سایہ، پل صراط، ترازو، حوض کوثر، اور حساب کا تذکرہ پھر ایک قوم کا بغیر حساب جنت میں جانا اور ایک قوم کے متعلق اعضاء کی گواہی اور اعمال نامہ کا دائیں یا بائیں ہاتھ میں ملنا یا پشت کی جانب سے ملنا اور شفاعت اور جنت کا ذکر اور جو کچھ جنت میں ہے جیسے اس کے وسیع و عریض دروازے اس میں نہریں، پھلوں کی کثرت، درختوں کی بہتات، زیورات کی ریل پیل، قیمتی برتن اور بلند و بالا درجات اور سب سے بڑھ کر دیدار الٰہی کی نعمت کا ذکر اور پھر آگ کا ذکر اور جو کچھ آگ میں ہے کئی قسم کے عذاب اور انجام بد کی لاتعداد صورتیں جیسے زقوم، حمیم، غسلین وغیرہ۔ اگر ان تمام احوال کو تفصیلاً لکھا جائے تو کئی جلدوں پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ جس قدر ائمہ کرام نے اس بارے میں قابل اعتماد کتب لکھی ہیں گویا وہ سب قرآن کریم کی تفسیر ہیں اور یہ سب کتب وہ اشارے ہیں جن کو ائمہ نے کلام پاک سے صراحتاً یا اشارۃً اجمالاً یا تفصیلاً سمجھا ہے۔

فائدہ: اور قرآن کریم میں اللہ کریم کے تمام اسمائے حسنیٰ موجود ہیں جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو یاد کرے گا وہ جنت میں جائے گا۔ ان اسماء کے سوا اور بھی کئی نام و صفات مذکور ہوئی ہیں جن کی تعداد ہزار کے قریب ہے۔ اس کے علاوہ نبی علیہ السلام کے بھی بہت سے نام اس میں مذکور ہوئے ہیں۔ ستر سے کچھ زائد شعب ایمان کا بھی ذکر ہے اور تین سو پندرہ شرائع اسلام کا بھی ذکر ہے اور کبائر گناہوں کا ذکر بھی کیا اور صغائر کو بھی الگ بیان کیا۔ پھر ہر حدیث کی علیحدہ سے تصریح و تصدیق کی گئی ہے۔ پھر جب سارا علم حدیث قرآن کریم کی شرح و تفسیر ہے تو پھر قرآن کو سمجھنا علم سنت و حدیث کے ساتھ لازم ہوا۔ پھر جس کو حدیث کا علم نہیں تو گویا وہ قرآن کا عالم بھی نہیں ہے۔ اسی طرح جب کوئی ان کا علم نہیں رکھتا وہ عالم نہیں تو جس نے حدیث پر عمل نہ تو گویا قرآن پر بھی عمل نہ کیا۔ گو زبانی دعویٰ کتنا ہی ہو کہ وہ قرآن کو بڑا سمجھتا اور عمل کرتا ہے جیسے بعض اہل الرائے اور اہل البدع کرتے ہیں: ﴿تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ﴾ ''کہ یہ بس ان کی آرزوئیں ہیں۔'' ہنوز دہلی دور است۔ غرضیکہ اجمالی سی بات یہ ہے کہ فضائل قرآن کو یہاں صرف بطور نمونہ بتایا گیا ہے اور جس بھی علم

قرآنی کو دیکھو خواہ وہ واضح ہو یا بطور اشارہ وہ اپنے اندر جاذبیت و دلکشی رکھتا ہے:

«مخدرات سراپا دھائے قرانے چه دلبر اند که دل می به ند پنهانے»

قرآن کریم کی اصل لذت تو اس شخص کو حاصل ہو سکتی ہے جس کو علم نافع کے ساتھ عمل صالح اور اخلاص قلبی کی توفیق بھی ملی ہو ورنہ اہل معاشرہ کی وہی مثال ہے جو اکثر مستعمل ہے کہ:

«که نکته دان نشود کرم گر کتاب خورد»

اور قرآن کے مختلف اقسام کے علوم میں کئی لوگوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ کسی نے اسباب نزول کے متعلق کتب لکھی ہیں کسی نے معرب و مبہمات میں کتابیں لکھی ہیں، کسی نے نزول کے مقامات کے متعلق کتاب لکھی ہے، سب سے جامع کتاب امام سیوطی رحمہ اللہ کی ہے جس کا نام الاتقان ہے، ان کا یہ احسان عظیم امت پر ثابت ہے۔ پھر انہوں نے کتاب اکلیل میں انہوں نے مختصر طور پر بہت اچھے اچھے استنباط ذکر کیے جو انہوں نے کتاب کریم سے اخذ کیے تاکہ علماء کرام اس سے فائدہ حاصل کر سکیں، جن کو دیکھنے اور سمجھنے سے ایک سنجیدہ عالم دین کے دل میں کلام پاک کی قدر مزید بڑھ جاتی ہے۔ غزالی سے نقل کیا ہے کہ آیات احکام کل پانچ سو ہیں۔ بعض نے کہا ایک سو پچاس آیات ہیں۔ شاید ان صاحبان کی مراد یہ ہو کہ بالکل واضح احکام انہی آیات میں ہیں اور نہ آیاتِ قصص و احکام وغیرہ سے بہت سے احکام نکل سکتے ہیں۔ حافظ ابن الوزیر نے لکھا ہے کہ وہ آیات احکام جن کا حفظ رکھنا ایک مجتہد کے لیے ضروری ہے ان کی تعداد ایک سو تینتیس ہے۔ میں نے ان کی تفسیر عربی میں نیل المرام میں لکھی ہے۔ شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے کتاب الامام میں لکھا ہے کہ اللہ کریم نے قرآن کریم میں جو مثالیں ذکر کی ہیں ان سے مخلوق کو نصیحت کرنا مقصود ہے۔ اس لیے کہ اس میں سے بعض ثواب کے درجات کے متعلق ہیں یا اعمال کے ضائع ہونے کے متعلق یا اعمال کی اچھائی یا برائی کے متعلق ہیں۔ سو یہ سب امثال احکام پر دلالت کرتے ہیں۔ پھر کہا کہ قران کریم کی اکثر آیات احکام سے خالی نہ ہیں وہ ابواب حسنہ و اخلاق جمیلہ پر مشتمل ہیں۔ کسی آیت سے کوئی حکم صراحتاً اخذ ہوتا ہے اور کسی آیت سے بطورِ استنباط اخذ ہوتا ہے۔ خواہ دوسری آیت کو ساتھ ملانے سے اخذ کیا جائے یا بغیر ملائے اخذ کیا جائے۔ جیسے تحریم استمناء اس آیت سے استنباط ہے: ﴿اِلَّا علی ازواجهم اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ الی قوله فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾ اور انکحہ کفار کا درست ہونا اس آیت سے ثابت ہے: ﴿ وَامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ کہ اس کی بیوی لکڑیاں اٹھانے والی ہے۔ اور جنبی کے روزے کا درست ہونا اس قول سے اخذ ہے: ﴿فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ اِلٰى

قَوْلِهٖ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ ﴾ سواب ملاؤ ان سے اور تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اور کھاؤ اور پیو حتی کہ واضح ہو جائے۔ یہ سب مثالیں بغیر ملائے استنباط کی ہیں۔ رہی ملا کر استنباط کی مثالیں تو وہ یہ ہے کہ حمل کی مدت چھ ماہ بھی ہوتی ہے اس کا استنباط ان دو آیات کو ملانے سے ہوا کہ: ﴿ وَحَمْلُهٗ وَ فِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا اور وَفِصَالُهٗ فِیْ عَامَیْنِ ﴾ کہ اس سے مدت فصال دو سال ہوئی تو گویا مدت حمل چھ ماہ ہوئی۔ پھر کبھی احکام پر استدلال کسی صیغے سے ہوتا ہے کبھی اخبار سے جیسے: ﴿ اُحِلَّ لَکُمْ ﴾ اور ﴿ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ ﴾ اور ﴿ کُتِبَ عَلَیْکُمْ ﴾ کبھی اس خیر و شر یا نفع و ضرر سے جو عاجل یا اجل یعنی جلد یا دیر پا ہوتی ہے سے مرتب ہوتا ہے۔ پھر اس کی کئی اقسام ہیں جیسے ترغیب ترہیب عباد، جو اقرب الی الفهم ہو۔ سو جو کام ایسا ہے کہ شارع نے اس کو مقام عظیم دیا۔ یا اس کام کی تعریف کی یا اس کام کے کرنے والے کی تعریف کی یا اس کام کو یا اس کام کو کرنے والے کو محبوب ٹھہرایا یا اس کام سے یا اس کو کرنے والے سے رضامندی ظاہر کی یا اس کی استقامت و برکت و طہارت سے موصوف کیا۔ یا اس کی یا اس کے کرنے والے کی قسم کھائی کہ جفت و طاق راتیں یا مجاہد بن کے گھوڑے یا نفس لوامہ جن کی قسم کھائی یا اس کو اپنے ذکر و محبت یا ثواب عاجل یا اجل یا شکر یا ہدایت و مغفرت ذنوب یا تکفیر سیئات یا قبول یا اس کے کرنے والے کی مدد کا وعدہ یا اسے بشارت قرار دیا یا کسی کام کو معروف کہا یا اس کو کرنے والے سے غم و خوف کی نفی کی یا اس کو امن کا وعدہ دیا یا اس کو ولایت و قرب کا سبب کہا یا اس کو صفت مدح سے یاد فرمایا۔ جیسے حیات یا نور یا شفاء یا رحمت سو یہ سارے احکام ان کی مشروعیت پر دلیل ہوئے۔ خواہ وہ واجب ہوں یا مندوب۔ اور جس کام کو ترک کرنا شارع کو مطلوب پایا اس کے فاعل کو مذموم کہا یا اس پر سزا کی دھمکی دی یا اس کو ناپسند کیا یا اس پر لعنت کی یا اس سے محبت کی نفی کی یا اس کام کو کرنے والے کو جانوروں یا شیاطین کے مشابہ کہا یا ہدایت و مقبولیت کا مانع کہا۔ یا اس کو کراہت و برائی سے بیان کیا۔ یا اس کو صلاح و فلاح کی نفی کا سبب کہا۔ یا اس کو قریب یا بعید زمانے میں عذاب کا سبب ٹھہرایا یا اس کو مذمت و ضلالت یا معصیت و رجس و فسق یا اثم و لعن و غضب یا زوال نعمت یا مروت نعمت سے یاد کیا یا اس کو حدود میں سے کسی حد سے شمار کیا ہو یا اس کو رسوائی یا عداوت الٰہی یا محاربہ یا استہزاء و سحر یا نسیان فاعل قرار دیا یا اس کے مقابلہ میں اپنے نفس کو صبر و علم یا صفح و عفو سے موصوف کیا یا اس سے توبہ کی طرف دعوت دی یا اس کام کو کرنے والے کو حقارت و ذلالت سے متصف کیا یا اس کو شیطانی عمل کی طرف منسوب کیا یا اس کو ابلیس کی زینت یا ابلیس کی دوستی کہا یا کسی وصف ذم سے اس کو موصوف کیا جیسے ظلم، عدوان، بغی یا مرض یا اس سے انبیاء نے اظہار بیزاری کیا یا اس کام میں شک ظاہر کیا یا اس عقاب پر حزن و غم سے منع کیا یا اس کام کے کرنے والے کو نقصان زدہ

کہایااس پر جنت کی محرومی کا اشارہ کیایااس کام کرنے والے کو اللہ کا دشمن قرار دیایااللہ کو اس کا دشمن کہا۔ یا وہ کام کرنے والے کو اللہ سے جنگ کرنے والے یا اپنے غیر کا گناہ اٹھانے والا کہا۔ اس کو ﴿لا ینبغی ﴾یا﴿لَا یَکُونُ ﴾جیسے الفاظ سے یاد کیایااس کو﴿لَیسَ مِنَ اللّٰہِ فِی شَیءٍ﴾ یا ﴿لَیسَ مِنَ الرَّسُولِ وَاَصحَابِہٖ﴾ فرمایایااس کو مصلحین کے درمیان عداوت کووقوع کا سبب کہایاعدم فلاح کا موجب ٹھہرایا۔ یااس کے حق میں ﴿فَھَل اَنتَ مُنتَہٍ ﴾یا ﴿قَاتَلَہُ اللّٰہُ ﴾ کہایااس کے فاعل کے متعلق کہا کہ اللہ تعالیٰ قیامت والے دن نہ اس سے بات کرے گااور نہ اس کی طرف دیکھے گایانہ اس کے عمل کو درست نہ کرے گایااس کے مکر کو چلنے نہ دے گایااس پر کوئی شیطان سوار ہے یا وہ کام دل کے زنگ کا سبب ہے یہ تمام اقسام ممانعت فعل پر دلالت کرتے ہیں اور اس تحریم دلالت سے صرف کراہت تو ظاہر تر ہے۔ رہی اباحت وجواز تو وہ نفی جناح یا نفی حرج یا نفی اثم و مواخذہ سے یااذن سے یا عفو سے یااس پر بیان تحریم سے سکوت اختیار کرنے سے، یا کسی چیز کے حرام ہونے کا انکار کرنے سے یا یہ کہنے سے کہ ﴿خَلَقَ﴾ یا ﴿جَعَلَ ﴾یا﴿فَعَلَ مِنْ قَبلِنَا﴾ کو زم کے بغیر ذکر کرنے سے حاصل ہوتی ہے پھر خواہ یہ ان چیزوں کی مشروعیت پر وجوباً دلالت کرے یا استحباباً۔ و اللّٰہُ اعلم

فائدہ: اللہ کریم نے دنیا میں اپنے رسول بھیجے وہ اس کی طرف سے خوشخبری لائے اور خوف لائے تاکہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر کوئی حجت باقی نہ رہے سب سے بعد میں ہمارے نبی امّی، مکی و مدنی کو بھیجا اور سب کی طرف قیامت تک آئے اور سارے جن وانس کے لیے پیغمبر بن کر آئے۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿فَاٰمِنُوا بِاللّٰہِ وَرَسُولِہِ النَّبِیِّ الاُمِّیِّ﴾ ”کہ اللہ پر اور اس کے امی پیغمبر پر ایمان لاؤ۔“ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اِنِّی رَسُولُ اللّٰہِ اِلَیکُم جَمِیعًا﴾ ”کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں۔“ تیسری جگہ فرمایا: ﴿لِاُنذِرَکُم بِہٖ وَمَن بَلَغَ﴾ یعنی ”تاکہ میں تمہیں اس کے ساتھ ڈراؤں۔“ اور جس کو بھی یہ پیغام پہنچے گا عرب ہو یا عجم گورا ہو یا کالا جن ہو یا انسان اس کے لیے یہ کتاب ڈرانے والی ہے۔ چوتھے مقام پر فرمایا: ﴿ وَمَن یَّکفُر بِہٖ مِنَ الاَحزَابِ فَالنَّارُ مَوعِدُہٗ ﴾ ”کہ جو فریق اس کا انکار کرے گا تو جہنم اس کا وعدہ ہے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ کافر جو قرآن کا منکر ہے وہ خواہ کوئی ہے یا کہاں ہے وہ جہنم میں جائے گا۔ قرآن کا انکار ایک تو یوں ہے کہ ایک تو سرے سے اس کا انکار کردے اور اس کو اللہ کا کلام ہی نہ سمجھے اور رسول اللہ ﷺ کو خاتم الانبیاء ہی نہ مانے جس طرح یہود و نصاریٰ کا عقیدہ ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کو پیغمبر تو مانے لیکن اللہ کے کلام کو مخلوق مانے یہ بھی کفر ہے۔ جس طرح معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ نبی علیہ السلام اور قرآن دونوں کو عموماً تو مانے لیکن اس کے کچھ حصے کا انکار کرے جیسے بعض

لوگ کہتے ہیں کہ ہم حرمت سود اور تقسیم فرائض اور طلاق کی صحت کو نہیں مانتے یہ بھی واضح کفر ہے۔چوتھی صورت یہ ہے کہ قران کا اقرار تو کرے لیکن کسی امام یا عالم و مجتھد کی بات کو اس پر غالب کرے یہ بھی در حقیقت قرآن کا انکار ہے۔ مقلدین عذاھب یہی کام کرتے ہیں،اسی طرح سنت صیحہ پر کسی کے قول کو یا رائے اور قیاس یا اجتہاد کو مقدم کرنا گویا رسول اللہ ﷺ کا انکار کرنا ہوا۔اور جب یہ کام دیدہ و دانستہ کیا جائے تو ایمان باقی نہیں رہتا۔ایک اور جگہ پانچویں مقام پر فرمایا:﴿فَذَرْنِی وَمَنْ یُکَذِّبُ بِھٰذَا الْحَدِیْثِ سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴾"کہ مجھے اور اس شخص کو چھوڑ دیجئے جو اس قرآن کو جھٹلاتا ہے۔ عنقریب ہم اس کو وہاں سے کھینچیں گے جہاں سے وہ جانتے نہ ہوں گے۔" حدیث مبارکہ میں ہے کہ میں ہر سرخ و سیاہ کی طرف بھیجا گیا ہوں اور اس سے جن و انس مراد ہیں۔ غرضیکہ نبی علیہ السلام دونوں مخلوقوں انس و جن کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے جو کچھ اللہ کریم نے ان کی طرف وحی کی وہ اس کو اللہ کی مخلوق کی طرف پہنچانے والے ہیں۔اللہ کریم نے فرمایا:﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا﴾"کہ کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے اور اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اسمیں بڑا اختلاف پاتے۔"دوسری جگہ فرمایا:﴿کِتَابٌ اَنْزَلْنَاہُ اِلَیْکَ مُبَارَکٌ لِیَدَّبَّرُوْا اٰیَاتِہٖ وَلِیَتَذَکَّرُوْا اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾"کہ یہ قرآن ایک مبارک کتاب ہے جو ہم نے آپؐ پر نازل کی تاکہ وہ اس کی آیات میں غور فکر کریں اور تاکہ عقل منداس سے نصیحت حاصل کریں۔"تیسری جگہ فرمایا:﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا﴾کہ یہ کیوں اس میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ نزول قران کا مطلب صرف پڑھنا ہی نہ ہے بلکہ اس کو پڑھ کر سمجھنا ضروری ہے۔پھر اس کے مطالب پر عمل کریں اور یہ چیز ہر پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب پر واجب ہے۔جو خود پڑھ سکتے ہیں ان پر اس دلیل سے واجب ہے کہ اللہ کریم نے فرمایا:﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ﴾کہ جب اللہ کریم نے اہل کتاب سے عہد لیا کہ تم اس کتاب کو ضرور ہی لوگوں کے سامنے واضح کرو گے اور اس کو ہر گز نہ چھپاؤ گے،اسی لیے علماء کرام نے تفاسیر لکھی ہیں اور اپنا ذمہ پورا کیا اب کوئی سنے یا نہ سنے۔بہر حال وہ اپنا حق پورا کر چکے۔پھر جن لوگوں نے اس عہد کو معمولی قیمت پر فروخت کر دیا اللہ نے ان کا حصہ خیر آخرت سے ختم کر دیا بلکہ قیامت کے دن نہ وہ ان سے کلام کرے گا نہ ان کی طرف نظر رحمت کرے گا اور نہ انہیں گناہوں سے پاک کرے گا۔اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔جس طرح فرمایا:﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَاَیْمَانِھِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰئِکَ لَا خَلَاقَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ

وَلَا یُزَکِّیۡھِمۡ وَلَھُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴾اس میں ہم سے پہلے اہل کتاب کی مذمت ہے کہ انہوں نے اللہ کی کتاب جو ان پر نازل ہوئی اسے چھوڑ دیا اور دنیا جمع کرنے پر جھک گئے اور کتاب کی پیروی کی بجائے دوسرے کاموں میں لگ گئے۔اب ان پڑھ رہے تو ان پر کتاب پر تدبر کرنے کا وجوب اس آیت سے ہے۔جو اللہ کریم نے فرمایا:﴿اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُھُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ وَلَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتَابَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡھِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُھُمۡ وَکَثِیۡرٌ مِّنۡھُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴾"کہ کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل ذکر اللہ اور نازل کردہ حق کے لیے جھک جائیں اور نرم پڑ جائیں۔یہ لوگ ان کی طرح نہ ہو جائیں جن کو کتاب دی گئی اس سے قبل پس ان پر مدت دراز ہوئی تو ان کے دل سخت پڑ گئے اور اکثر ان میں سے یہی فاسق لوگ ہی تھے۔"اور اللہ کے ذکر سے مراد کتاب اللہ ہی ہے۔جس نے کتاب اللہ کو پڑھا تو گویا اللہ کا ذکر کیا جس نے اس کو سمجھا تو گویا اس نے حق مان لیا۔پھر جو اس کو پڑھتے پڑھتے تھک گیا اور گھبرا گیا کہ اس کو کب تک پڑھا کروں تو گویا اس کا دل سخت ہو گیا اور وہ نافرمانی کی طرف ہونے لگا۔ورنہ قرآن تو ایسی چیز ہے کہ اس کو جتنا ہی ایمان والے پڑھیں ان کا ایمان اتنا ہی قوی ہوتا ہے۔اور اس کے عمل کو قبولیت حاصل ہو گی۔اس آیت کے بعد یہ فرمایا:﴿اِعۡلَمُوۡا اَنَّ اللّٰہَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِھَا قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ﴾"کہ خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔تحقیق ہم تمہارے لیے آیات کو واضح کرتے ہیں تاکہ تم عقل کرو۔"اس سے معلوم یہ ہوا کہ جیسے زمین مردہ ہونے کے بعد زندہ ہو سکتی ہے تو مردہ دل بھی نور ہدایت سے نرم پڑ جاتے ہیں تو اس کلام سے بہتر کوئی نور ہدایت وایمان نہیں ہے۔

ہر مسلمان کو یہی پڑھتے رہنا چاہئے اور یہ کہ ہر مومن اسی کو سمجھتا رہے اور اس کلام پاک میں کوئی جتنا ہی غور کرے گا اس پر برکت ورحمت کے اتنے ہی دروازے کھلتے جائیں گے اور جو اس سے جتنا ہی دور بھاگے گا اتنا ہی اس کا دل سخت وسیاہ ہو جائے گا اور ایمان وہدایت سے دور ہو جائے گا۔﴿رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ ھَدَیۡتَنَا وَھَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَۃً اِنَّکَ اَنۡتَ الۡوَھَّابُ﴾"کہ اے اللہ ہدایت کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر اور اپنے ہاں سے رحمت عطا کر بے شک تو عطا کرنے والا ہے۔"

فائدہ: قرآن کریم کی تفسیر اس طرح ہوتی ہے کہ قرآن کی تفسیر پہلے تو قرآن سے ہی کی جائے کیونکہ جو بات ایک جگہ قرآن میں مجمل آئی ہے تو دوسری جگہ تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔اسی طرح جو تفسیر آنحضرت ﷺ سے ثابت ہو چکی ہے وہ ہر چیز پر مقدم ہے بلکہ وہی تفسیر ساری امت پر حجت ہے۔اس کے خلاف ہر گزنہ

کہنا چاہئے سب پر اس کی پیروی واجب ہے۔امام شافعی نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بھی حکم دیا ہے وہ قرآن سے سمجھ کر حکم دیا۔اللہ کریم نے فرمایا:﴿اِنَّا اَنۡزَلۡنَا اِلَيۡكَ الۡكِتَابَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنۡ لِلۡخَائِنِيۡنَ خَصِيۡمًا﴾ ”کہ بے شک ہم نے آپ پر حق سے کتاب نازل کی تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو دکھائی اور آپ خیانت کرنے والوں کا حامی مت بنئے۔“ دوسری جگہ فرمایا:﴿وَمَا اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتَابَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِیۡ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ وَهُدًى وَّرَحۡمَةً لِقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ﴾ یعنی کہ ”ہم نے آپؐ پر اس لیے کتاب نازل کی تاکہ تو لوگوں کو وہ چیز بیان کرے جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اس میں ہدایت اور رحمت ہے اس قوم کے لیے جو ایمان والی ہے۔“ معلوم یہ ہوا کہ آپس کے اختلاف اس قرآن سے دور ہو جاتے ہیں،جب دو آدمیوں میں کسی عقیدہ یا حکم پر جھگڑا ہو تو انہیں چاہئے کہ قرآن سے فیصلہ لیں جو اس قرآن کو ہدایت و رحمت نہ سمجھے ان کا ایمان درست نہ ہے۔تیسرے مقام پر فرمایا:﴿وَاَنۡزَلۡنَا اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ﴾ اور ہم نے آپؐ کی طرف ذکر نازل کیا تاکہ تو لوگوں کے لیے اس چیز کو واضح کرے جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے اور تاکہ وہ غور و فکر کریں، معلوم ہوا کہ قرآن کریم دو مقاصد کے لیے آیا ہے:ایک ذکر کے مقصد کے لیے،جس کو وعظ و تذکیر کہتے ہیں اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس میں غور و فکر کیا جائے اور اس کے معانی کو سمجھا جائے۔پھر اس کے موافق عمل کیا جائے صرف یہ مقصد نہ تھا کہ صرف ذکر کیا جائے اور فکر کو کچھ تعلق نہ ہو۔بلکہ ذکر و فکر دونوں شرع کے مطلوب و مقصود ہیں۔حدیث میں آیا ہے:((اَلَا اِنِّیۡ اُوۡتِيۡتُ الۡقُرۡاٰنَ وَمِثۡلَهٗ مَعَهٗ)) کہ مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ وہ چیز بھی دی گئی ہے جو اس کی مثل ہے۔یعنی یہ حجت ہونے میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث و سنت کی طرف ہے۔حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سنتِ رسول ﷺ کا نزول بھی وحی سے ہوا ہے۔جیسے قرآن کا نزول ہوا ہے۔صرف اتنا فرق ہے کہ جس طرح قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے اس طرح سنت کی تلاوت نہیں کی جاتی ہے۔شافعی وغیرہ اماموں نے اس متعلق بہت دلائل دیئے ہیں۔یہاں اس کا مقام نہ ہے۔

الغرض اگر قرآن کی تفسیر قرآن کریم سے نہ ملے تو حدیث پاک سے تلاش کرے جس طرح کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یمن کی طرف روانگی کے وقت فرمایا کہ اگر میں فیصلے کو قرآن میں نہ پاؤں تو سنت کے مطابق عمل کروں گا،اگر سنت سے نہ ملے تو اجتہاد کروں گا۔آپ علیہ السلام نے ان کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا اور کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اللہ کے پیغمبر کے قاصد کو رسول اللہ ﷺ کی مرضی کے مطابق توفیق دی۔اس حدیث کی

سند درست ہے۔ پھر جب کلام پاک کی تفسیر قرآن و حدیث سے نہ ملے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال سے تلاش کرنا چاہیے اس لیے کہ انہوں نے وہ احوال و قرائن آنکھوں سے دیکھے اور نزول قرآن کے وقت وہ پاس ہوتے تھے اور علم تام و فہم کامل اور عمل صالح کے مالک تھے۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ وہ کلام پاک کی تفسیر میں کوئی ایسی بات بیان کریں جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی نہ ہو۔ اگر بالفرض محال یہ بھی مان لیا جائے کہ انہوں نے بالکل وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنی ہو گی تو پھر بھی وہ ایسے عربی دان تھے جو لغتِ عربی کے ذرہ ذرہ سے واقف تھے اور بال کی کھال اتارنا جانتے تھے۔ خصوصاً بڑے علماء صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین جیسے خلفائے اربعہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ و ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! کتاب اللہ میں نازل شدہ کوئی آیت ایسی نہیں جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو میں جانتا ہوں کہ کونسی آیت کس کے متعلق نازل ہوئی اور کس مقام پر نازل ہوئی۔ اگر مجھے پتا چلے کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھتا ہے تو میں ضرور اس کے پاس جا پہنچوں۔ پھر کہا کہ جب ہم میں سے کوئی کلام پاک کی دس آیات سیکھ لیتا تو جب تک اس کے معنی کماحقہ پہچان نہ لیتا اور اس پر عمل نہ کر لیتا آگے نہ بڑھتا تھا۔ یہ مضمون کئی روایت میں مذکور ہے۔ اور حضرت ابن عباس کو تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی تھی کہ اے اللہ! اس کو دین کی سمجھ دے اور اسے قرآن کے معانی سکھادے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ ترجمان القرآن ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا انتقال ۳۲ھ میں ہوا جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ان کی وفات کے بعد ۳۶ برس تک زندہ رہے۔ اس مدت کے دوران انہوں نے کیا کچھ نہ سیکھا ہو گا۔ ہاں جو بات ان صاحبان نے اہل کتاب سے حکایت کی ہے وہ نہ تو حجت کے لائق ہے اور نہ متابعت کے لائق۔ کیونکہ اسرائیلی روایات کی تین اقسام ہیں:

- ایک وہ جن کی صحت کے متعلق ہمیں واضح علم ہے کہ یہ واقعی درست ہیں۔
- دوسری وہ جن کے کذب پر ہماری شریعت دلالت کردے وہ جھوٹ ہے۔
- تیسری قسم وہ ہے جس کے متعلق ہماری ملت و شریعت خاموش ہے۔

ہمیں ان کے متعلق یہ حکم ہے کہ ان کی تصدیق کی جائے نہ ان کی تکذیب۔ اگرچہ اس کو نقل کرنا درست ہو لیکن غالباً ایسی چیزوں کو نقل کرنے سے نہ کچھ فائدہ ہے اور نہ ان کو چھوڑنے میں کچھ دینی نقصان ہے۔ جیسے اصحاب کہف کے نام کیا تھے یا ان کے کتے کا رنگ کیسا تھا یا ان سب کی تعداد کیا تھی؟ یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی کس درخت کی لکڑی سے بنی تھی؟ یا ان پرندوں کے نام کیا تھے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے لیے زندہ کر

دیئے تھے یا وہ گائے کا کونسا حصہ تھا جو بنی اسرائیل کے مقتول کو لگایا گیا جس سے وہ زندہ ہو گیا، یا وہ درخت کونسا تھا جس کے پاس اللہ کریم نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا وغیرہ۔ایسی چیزوں کو اللہ کریم نے تفصیل سے بیان نہیں کیا۔ بس اجمالی سا تذکرہ بتادیا۔ اس سے پتا یہ چلا کہ انکی کی مزید تحقیق میں جانے کی کوئی ضرورت نہ ہے۔ نہ دین کا فائدہ نہ دنیا کا فائدہ یاں ان کا دوسرا پہلو ذکر کرنے میں حرج نہ ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا:﴿سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۔ قُلْ رَّبِّيٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيلٌ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا﴾ "یعنی عنقریب وہ کہیں گے کہ وہ تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا۔اور وہ یہ بھی کہیں گے وہ پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا تھا۔ وہ غیب میں تیر چلاتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ وہ سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کہہ دیجئے کہ میرا رب ان کی گنتی کو زیادہ جانتا ہے اور بہت کم لوگ اس کو جانتے ہیں۔ سو آپ ان کی بحث میں نہ پڑیں بس ظاہری بحث کریں اور ان کے احوال کے متعلق ان میں سے کسی سے مت پوچھیے۔"

اس آیت میں ہمیں ایک اشارہ وادب سکھایا گیا ہے کہ اللہ کریم نے اس جگہ تین اقوال ذکر فرمائے ہیں۔ دو اقوال کو ضعیف قرار دیا اور تیسرے سے سکوت فرمایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید دونوں میں سے یہ قول زیادہ درست ہے کیونکہ اگر یہ باطل ہوتا تو پہلے دونوں اقوال کی طرف اس کو بھی رد کر دیتا۔ پھر فرمایا کہ ان کی تعداد پر واقفیت میں کوئی فائدہ نہ ہے۔ صرف اللہ کو ہی علم ہے یا جس کو اس نے بتادیا ہو۔ پھر فرمایا کہ آپ اپنے نفس کو اس کی طویل ابحاث میں مبتلا نہ کرنہ بتکلف ان کے پیچھے پڑیے کیونکہ اس میں بحث کے سوا کچھ نہیں ہے اور اس بارے میں وہ جو وہ کہتے ہیں وہ بھی تیر تکے ہیں کچھ حقیقت نہ ہے۔ غرضیکہ مبہم معاملے کا مخالف ذکر کر دینا ایک اچھا قاعدہ ہے۔ اقوال کو جمع کر کے صحیح قول بتادے اور باطل قول کی نشاندھی کر دے جس طرح تفسیر فتح القدیر اور فتح البیان میں کہا گیا ہے۔

فائدہ: جب کلام پاک کی تفسیر سنت صحیحہ یا اقوال صحابہ میں نہ ملے تو جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ تابعین کے قول سے دلیل لے مگر جو کم علم شخص ہو وہ عبارات تابعین کو ایک دوسرے کے مخالف سمجھ کر چند مختلف اقوال بنا دیتا ہے۔ حالانکہ بات یوں نہیں ہے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ان میں سے کوئی تو کسی چیز کی تفسیر لازم سے کرتا ہے کوئی ہم مثل سے کر دیتا ہے اور کوئی بعینہ کسی چیز پر نص سے دلالت کرتا ہے اس لیے ان سب اقسام کے تقریباً ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ سمجھ دار شخص اکثر مواقع پر ایسی چیزیں پہچان سکتا ہے۔ لیکن اہل علم کی دوسری

جماعت کی یہ رائے ہے کہ جب اقوال تابعین فروع میں حجت نہیں ہیں۔ تو تفسیر میں کیسے حجت ہو سکتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے کہا یہ بات ٹھیک ہے لیکن جب سب تابعین کسی بات پر اجماع کر لیں گے تو ان کی بات حجت ہونے میں کیا کلام ہے۔ لیکن جب باہم اختلاف ہو گا تو پھر ان کا قول نہ بعض کا قول بعض پر حجت ہو گا نہ مابعد لوگوں پر حجت ہو گا بلکہ اس وقت لغت قرآن، سنت مطہرہ، اقوال صحابہ اور عام لغت عرب کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ پھر فرمایا: کہ صرف رائے سے قرآن کی تفسیر کرنا حرام ہے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ جس شخص نے بغیر علم ے اپنی رائے اور قیاس سے قرآن میں کچھ کہا (جسے وہ جانتا ہی نہ تھا) تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم کی آگ میں بنا لے۔ اسکو ترمذی نے حسن کہا اور نسائی وابو داؤد نے بھی روایت کیا بلکہ دوسری روایت میں یوں ہے کہ جس نے قرآن میں اپنی عقل اور رائے سے کچھ کہا اگرچہ وہ ٹھیک بھی ہو اتب بھی اس نے غلطی کی اور راہ حق سے ہٹ گیا۔ معلوم ہوا کہ جب بھی تفسیر کلام پاک کی ضرورت در پیش ہو تو سب سے پہلے اس کی تفسیر کلام مجید سے تلاش کرے پھر سنت مطہرہ سے پھر اقوال صحابہ سے پھر اجماع تابعین سے پھر لغت عرب سے تلاش کرے یہ پانچ مراتب ہوئے اس سے ہٹ کر اپنی رائے سے ہر گز کوئی بات نہ کرے اگرچہ اچھی ہی کیوں نہ ہے۔ اپنی رائے سے تفسیر کرنے والے کو جہنمی قرار دیا ہے۔ حدیث: ((فَلْيَتَبَوَّءُ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ)) نیچر یہ فرقے کے لیے بڑی خوشخبری ہے جنہوں نے ساری تفسیر اپنی رائے سے بنالی ہے۔ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی رسولؐ یہ بات فرمائیں کہ اگر میں بے علمی سے قرآن کے متعلق کچھ کہہ دوں تو کونسی زمین مجھے اٹھائے گی اور کونسا آسمان مجھے سایہ دے گا تو پھر بعد والے کسی کی کیا ہستی ہے کہ وہ قرآن کے معانی کو اپنی سوچ فکر سے حل کرے۔ کسی نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے منبر پر پوچھا کہ: ﴿وَفَاكِهَةً وَّ اَبًّا﴾ کے کیا معنی ہیں ذرا سوچ کر کہا کہ اے عمر! یہ تو تکلف ہے یعنی ہر گز اپنے نفس کی بات سے تفسیر نہ کرنا، مطلب یہ ہے کہ لفظ اَبًّا کی کیفیت لفظ واضح کرنا تھا ورنہ یہ بات تو واضح تھی کہ اَبٌّ ایک گھاس ہے جس کو ہندی میں دوب کہتے ہیں۔ ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ ہزار برس کا دن کیسا ہو گا۔ فرمایا تم بتاؤ کے پچاس ہزار برس کا دن کیسا ہو گا۔ اس نے کہا میں تو آپ سے پوچھتا ہوں۔ فرمایا: اللہ بہتر جانتا ہے اس نے ان دونوں دنوں کا ذکر اپنی کتاب میں فرمایا ۔ مطلب یہ کہ اپنی طرف سے بغیر علم کے کچھ کہنا ناپسند سمجھا حاصل یہ ہے کہ سلف تفسیر قرآن کے معاملے میں بڑے محتاط رہتے تھے رائے زنی سے ڈرتے تھے۔

فائدہ: قرآن کریم کے فضائل بہت سی احادیث میں وارد ہوتے ہیں۔ اگر قرآن پڑھنے والا یہ چاہے کہ

اسے کما حقہ تلاوت کا ثواب ملے تو یہ بات اس کے معانی سمجھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ پہلے اسے چاہئے کہ اس کے معانی ومفاہیم کو سمجھے بڑے تعجب کی بات ہے کہ ایک قرآن پڑھنے والا قرآن کو دن رات پڑھے مگر صرف حروف اور الفاظ کی حد تک ہی محدود رہے۔ اس کو اس کے معانی معلوم نہ ہوں نہ حرام کا علم نہ حلال کا، نہ محکم کی پہچان ہو نہ متشابہ کی شناخت، نہ مجمل کا پتا نہ مفصل کی پہچان، نہ ترغیب کو جانے نہ ترہیب کو، صرف الفاظ منہ سے ادا کرنا جانتا ہو۔ پھر جو شخص قرآن کو صرف لفظاً پڑھنا جانتا ہو وہ بلا شبہ اس شخص کے اجر سے محروم ہے جو قرآن کے معانی جانتا ہے۔ جس کی فضیلت حدیث میں مذکور ہے۔ گو صرف تلاوت کے اجر سے تو کس قدر فائدہ مند ہو سکتا ہے لیکن ایک عالم قرآن کے اجر سے تو بے پناہ کم اجر کا مستحق ہو گا اور صرف پڑھنے والے اور اس کو سمجھنے والے آپس میں وسعت اجر میں کئی گنا فرق میں ہوں گے۔

((بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحلها))

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن کو سیکھے اور سکھائے۔" اس کو بخاری نے روایت کیا۔ حضرت عائشہؓ کا مرفوعاً لفظ یہ ہے کہ جو قرآن کا ماہر ہے وہ باعزت فرشتوں کے ساتھ ہو گا۔ وہ فرشتے جو بڑے نیک باعزت اور اعمال واحوال کو لکھتے ہیں اور جو شخص قرآن پڑھتا ہے لیکن وہ اس پر مشکل ہے اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے معلوم یہ ہوا کہ صرف قرآن کو پڑھنا اور اس کے معنی سے بے فہم ہونا لیکن اٹک اٹک کر محنت سے پڑھنا اجر سے خالی نہیں ہے بلکہ دوہرا اجر ملے گا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ اس کتاب کے ذریعے سے کئی اقوام کو بڑھاتا ہے اور کئی اقوام کو کم کر دیتا ہے۔ [بروایت مسلم] بڑھاتا تو ان لوگوں کو ہے جو اس کو پڑھ کر عمل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو کم کرتا ہے جو اس کے حلال و حرام کی پرواہ نہیں کرتے۔ حضرت ابو امامہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ تم قرآن پڑھا کرو یہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کا سفارشی ہو گا۔ [بروایت مسلم] قرآن والے وہی لوگ ہیں جو قرآن کو پڑھتے پڑھاتے ہیں اس کو رواج دیتے ہیں۔ دن رات اس کی ترقی اور تعلیم میں صرف کرتے ہیں اور اس کو فروغ دینے میں اپنے جان و مال خرچ کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً فرمایا جس کسی شخص (کے سینے) میں قرآن کا کچھ بھی حصہ نہیں وہ اجاڑ گھر کی طرح ہے۔ ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے ۔ابو سعید نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ کریم فرماتا ہے کہ جس کو قرآن مجید کی تلاوت وذکر نے مجھ سے سوال سے مشغول رکھا میں اس کو سوال کرنے والوں سے زیادہ دوں گا۔ اور کلام اللہ کی فضیلت تمام کلاموں پر

اس طرح ہے جیسے خالق کو مخلوق پر فضیلت ہے۔[بروایت ترمذی و دارمی]

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مرفوعاً لفظ یوں ہے کہ جس نے کتاب اللہ سے ایک حرف پڑھا اسے ایک نیکی ملے گی اور ہر نیکی کا اجر دس گنا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔ اس کو ترمذی نے صحیح کہا ہے۔ دارمی نے بھی اس کو روایت کیا۔ حدیث علی رضی اللہ عنہ میں مرفوعاً آیا ہے کہ جس شخص نے قرآن کریم حفظ کیا پھر اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھا تو اللہ کریم اس کو اپنی جنت میں داخل کرے گا اور وہ اپنے ایسے دس گھر والوں کا سفارشی ہو گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی۔ [بروایت امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ]

ابو موسیٰ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ قرآن کی خبر گیری رکھا کرو۔ اللہ کی قسم! یہ قرآن سینوں سے اس سے بھی جلدی بھاگتا ہے جیسا کہ اونٹ اپنی رسی سے چھوٹتے ہی بھاگ جاتا ہے۔[متفق علیہ] بہت مشاہدے میں آرہا ہے کہ جب تک ہر روز قرآن کی تلاوت ہوتی ہے اور آدمی دن رات اس کی خبری گیری کرتا رہتا ہے تب تک وہ محفوظ رہتا ہے لیکن جب ہی دو چار دن کی غفلت ہوئی تو مہینوں کی سستی تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ اس لیے اس کی خبر گیری کا حکم فرمایا ہے۔ حدیث میں امر کا صیغہ ہے جس سے اس کی وجوب پر دلالت ہوتی ہے۔ ابن عمرو نے کہا رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا کہ تو قرآن پڑھتا جا جس طرح تو دنیا میں پڑھتا تھا۔ جہاں تیری آخری آیت ہو گی وہاں تک مقام جنت تیرا ہے۔ اس کو امام احمد نے اور ابن ماجہ کے سوا تمام اہل سنن نے روایت کیا۔ معلوم ہوا کہ جس شخص کو جس قدر قرآن یاد ہو گا ایک آیت سے لے کر ایک پارے تک اور ایک پارے سے لے کر آخر قرآن تک۔ جس کو جتنا یاد ہو گا وہ اس کے مراتب جنت کی حد ہو گا۔ اور اس حدیث میں مکمل حافظ قرآن کی بڑی فضیلت و بشارت ہے۔ جب وہ کلام پاک کو بسم اللہ کی باء اور والناس کی سین تک مکمل پڑھ ڈالے گا تو کلام پاک کی آیات کے برابر ترقی کی منازل طے کرے گا۔ حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ کلام پاک میں چھ ہزار آیات ہیں اس سے زیادہ تعداد میں اہل علم کا اختلاف ہے کسی نے کہا تمام اس قدر ہی ہیں۔ کسی نے کہا اس سے دو سو چار آیات زیادہ ہیں، کسی نے چودہ آیات زیادہ بتائی ہیں، کسی نے دو سو انیس آیات زیادہ بتائیں۔ کسی نے کہا دو سو پچیس یا چھبیس آیات زیادہ ہیں۔ کسی نے کہا دو سو چھتیس آیات زیادہ ہیں۔ رہی کلمات کی تعداد تو اس متعلق حضرت عطاء بن یسار نے کہا کہ کل ستتر ہزار چار سو انتالیس کلمے ہیں (۷۷۴۳۹) حضرت مجاہد نے فرمایا: تین لاکھ اکیس ہزار ایک سو اسی حروف ہیں۔ حضرت عطاء بن یسار نے فرمایا تین لاکھ تیئس ہزار

پندرہ حروف ہیں۔ حجاج بن یوسف نے تمام حفاظ و قراء کو جمع کر کے پوچھا کہ بتاؤ قرآن کریم میں کتنے حروف ہیں سب نے شمار کر کے آخر میں اس پر اتفاق کیا کہ تین لاکھ چالیس سات سو چالیس حرف ہیں۔ پھر کہا نصف قرآن کس حرف تک ہے بتایا گیا سورۃ کہف میں لفظ ﴿وَلْيَتَلَطَّفْ﴾ کے حرف فاء پر نصف قرآن ہے۔ رہا ثلث اول و ثانی وغیرہ تو وہ تفسیر ابن کثیر میں مذکور ہے مگر سب میں اختلاف مذکور ہے۔ غرضیکہ جب قرآن کے ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو ذرا اس کے عدد حروف سے اندازہ لگاؤ کتنا کثیر ثواب ہے اور یہ محض اللہ کا فضل ہے ورنہ کسی بندے میں اتنی طاقت کہاں کہ ساری عمر بھر بھی اتنی نیکیاں کر سکے۔ دنیا میں تو کوئی مکان غالباً سات آٹھ یا دس بارہ منازل سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن حافظ کلام پاک کو چھ ہزار سے زیادہ منازل والا گھر جنت میں ملے گا۔

اس دولت و نعمت کی عظمت کا کیا ٹھکانا، ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اگر کسی کو اتنی بڑی ہمت نہیں کہ وہ کلام پاک کو حفظ کر لے تو اوپر سے عبارت دیکھ کر پڑھنا تو لازم ہے۔ اسے چاہئے کہ اگر تین یا سات دن میں یا مسلسل ایک ماہ میں ہر روز قرآن پڑھ کر مکمل نہیں کر سکتا تو ہر روز ایک دو رکوع تو لازمی پڑھا کرے تاکہ کم از کم ہر روز قرآن پڑھنا تو نامہ اعمال میں لکھا جائے اور کچھ نہ کچھ نیکیوں کی بہار لوٹ کر تو رخصت ہو، اور توفیق اللہ کی طرف سے ملتی ہے۔
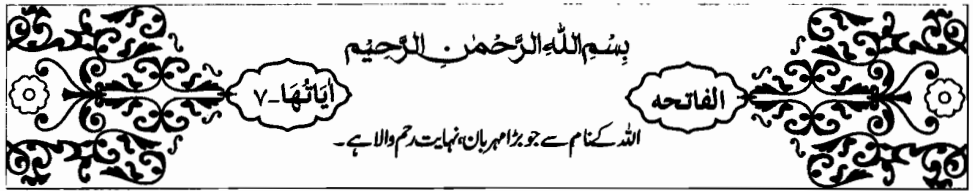
حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ام القرآن، ام الکتاب، سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے۔ [بروایت ترمذی و صححہ] اس کو **الفاتحة** اس لیے کہتے ہیں کہ کلام پاک کی قرآت و کتابت اس سے شروع ہوتی ہے اور نماز بھی اسی سے شروع کی جاتی ہے۔ اس کو "حمد" اور "صلوۃ" بھی کہتے ہیں۔ صحیح حدیث قدسی میں آیا ہے: ((قسمت الصلوة بيني و بين عبدی نصفين)) اور صلوہ سے مراد یہی سورت فاتحہ ہے اس کو نماز میں لازمی شرط کی حیثیت حاصل ہے اس کو پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اس کا ایک نام "شفاء" بھی ہے۔ دارمی کے نزدیک ابو سعید کی مرفوع حدیث میں وارد ہوا ہے کہ سورۃ فاتحہ ہر زہر سے شفاء ہے۔ دوسری روایت میں اسی کو رقیۃ کہا گیا ہے کہ ایک شخص نے سانپ وغیرہ کے ڈسے ہوئے پر یہ پڑھ کر دم کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا تمہیں کس نے بتایا کہ یہ دم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کو اساس

القرآن کہا کرتے تھے۔اور بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کو سورۃ فاتحہ کی اساس کہتے تھے۔

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی یا ایک دفعہ مکہ میں ایک دفعہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ کسی نے کہا کہ آدھی مکے میں نازل ہوئی اور آدھی مدینے میں نازل ہوئی۔ پہلی بات زیادہ ٹھیک ہے۔اکثر علماء کا یہی قول ہے اسی کو بغوی اور بیضاوی نے صحیح تر کہا ہے۔سب سورتوں کے نام اور سب سورتوں اور آیات کی ترتیب توقیفی ہے۔یعنی رسول اللہ ﷺ کی نقل پر موقوف ہے۔ قرآن کے ایک ٹکڑے کو سورت کہتے ہیں۔ کبھی کسی سورت کا نام ہی نام ہوتا ہے۔ کبھی کئی کئی نام ہوتے ہیں جیسے سورۃ فاتحہ کے کئی نام ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے مصاحف میں سورتوں کے نام نہیں لکھے تھے اس کو پہلی دفعہ حجاج بن یوسف نے ایجاد کیا۔اس سورت میں پچیس کلمے اور ایک سو تیرہ حروف ہیں۔

فائدہ: رسول اللہ ﷺ نے ابو سعید بن معلیٰ سے فرمایا کہ تیرے مسجد سے نکلنے سے قبل میں تجھے ایک بہت بڑی سورت سکھاؤں گا پھر سورۃ الفاتحہ بتائی اور فرمایا کہ یہی سبع مثانی و قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا۔اس کو بخاری، احمد، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا۔اور حضرت ابی بن کعب نے کہا کہ تو چاہتا ہے کہ میں تجھے ایک ایسی سورت سکھاؤں جو نہ تورات میں ہے نہ انجیل میں نہ زبور اور نہ فرقان میں ہے۔ پھر فرمایا یہ وہی سورت فاتحہ ہے۔ اس کو احمد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ترمذی نے صحیح بتایا ہے اور مسند امام احمد میں اس کو حضرت عبداللہ بن جابر کی حدیث میں اس کو خیر کثیر والی سورت قرار دیا۔اس سے معلوم ہوا کہ بعض سورتوں کو بعض پر فضیلت ہے۔اکثر علماء نے یہی فرمایا ہے۔اگرچہ ویسے سارا قرآن کی کلام فاضل ہے بلکہ نورٌ علی نور ہے۔ حدیث ابی ہریرہ میں مرفوعاً مذکور ہے کہ جس نے ایسی نماز پڑھی جس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ناقص و ناتمام رہی۔ کسی نے حضرت ابوہریرہ سے کہا کیا خیال ہے کہ جب ہم امام کے پیچھے ہوں فرمایا: اپنے نفس میں پڑھ لے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے سورۃ فاتحہ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر لیا ہے (دو حصوں میں) میرے بندے کو اس کی مانگی ہوئی چیز ملتی ہے جب اس نے کہا: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ اللہ فرماتے ہیں میرے بندے نے میری حمد بیان کی ۔جب کہا: ﴿اَلرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ﴾ تو اس نے کہا میرے بندے نے میری ثناء کی۔جب کہا: ﴿مَالِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ﴾ فرمایا میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ کبھی یوں فرمایا کہ میرے بندے نے میرے سپرد کر دیا۔جب بندے نے کہا: ﴿اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ﴾ فرمایا یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے وہی ہے جو اس نے طلب کیا۔ جب کہا: ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ، غَيۡرِ

الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ فرمایا یہ میرے بندے کے لیے ہے اور اس کو اس کی مطلوبہ چیز مل گئی۔ اس کو مسلم اور نسائی نے روایت کیا، ترمذی نے اس کو صحیح ٹھہرایا، نسائی کا لفظ یہ ہے کہ آدھی میرے لیے ہے اور آدھی میرے بندے کے لیے ہے اور اس کو اس کی طلب کی ہوئی چیز مل جاتی ہے۔ ابوزرعہ نے اس کو صحیح کہا۔ امام احمد بھی اس کے راوی ہیں۔ سعید بن منصور اور بیہقی کے نزدیک ابو سعید کی حدیث میں اس سورت کو ہر بیماری کی شفاء کہا گیا ہے۔ دارمی و بیہقی کے نزدیک حدیث ابن عمر میں اس کو ہر بیماری کی دوا کہا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ایک دفعہ حضرت جبریل نبی علیہ السلام کے پاس بیٹھے تھے کہ اوپر سے دروازہ کھلنے کی آواز سنی گئی تو حضرت جبریل علیہ السلام نے آنکھ آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا یہ دروازہ آج سے قبل کبھی نہ کھولا گیا تھا۔ اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا اس نے کہا آپ ؐ کو دو نوروں کی بشارت دی گئی جو آپ ؐ سے قبل کسی نبی کو عطا نہیں کیے گئے ایک سورۃ فاتحہ ہے اور دوسری سورۃ بقرہ کی آخری آیات ہیں۔ آپ ؐ ان کا کوئی حرف نہ پڑھیں گے مگر وہ نور آپ ؐ کو عطا کیا جائے گا۔ [بروایت مسلم و نسائی]

فائدہ: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے کہ نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنا کچھ متعین نہ ہے۔ بلکہ کوئی چیز کسی مقام سے قرآن میں سے پڑھ لے تو نماز ہو جائے گی لیکن اس کے سوا باقی تینوں اماموں اور جمہور کے نزدیک اس سورت کو پڑھنا لازم ہے اس کے بغیر نماز قابل قبول نہ ہے۔ اس لیے کہ حدیث عبادہ بن صامت میں مرفوعاً فرمایا کہ جس نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہ ہے۔ یہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ کا لفظ ہے کہ اس شخص کی نماز کافی نہ ہے جس نے نماز میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی۔ اس کو ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنی صحاح میں روایت کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس باب میں بہت سی احادیث وارد ہیں۔ یہی درست مذہب سنت کے موافق ہے اس سے یہ بھی پتا چلا کہ مقتدی بھی ضرور فاتحہ پڑھے ورنہ نماز نہ ہوگی۔ اس مسئلے میں گرچہ دو تین اقوال ہیں لیکن درست قول یہی ہے کہ مقتدی پر بھی سورۃ فاتحہ کی قرأت واجب ہے اس امر کے دلائل بڑی تعداد میں اور بڑے صاف ستھرے ہیں۔ جو لوگ اس کو واجب قرار نہیں دیتے ان کے دلائل قوی نہ ہیں بلکہ مخفی و ضعیف ہیں۔

فائدہ: قرأت سے قبل استعاذہ جمہور کے نزدیک سنت ہے۔ اس دلیل پر جو فرمایا: ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ﴾ کہ جب تو قرآن پڑھنے لگے تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ اور یہ کہنے میں انسان کا اظہار عاجزی ہے اور یہ عقیدہ واضح ہوتا ہے کہ تکلیف کو دور کرنا صرف اللہ ہی کا خاصہ

ہے۔حافظ ابن کثیر کے استعاذہ کے لطائف میں سے ایک بڑا عمدہ نکتہ اخذ کیا اور فرمایا کہ استعاذہ سے منہ پاک و صاف ہو جاتا ہے اور لغو ورفث منہ سے نکل جاتا ہے۔اور منہ کی طہارت ہو جاتی ہے۔ مطلق استعاذہ کا حکم کلام پاک میں تین مقامات پر آیا ہے۔فرمایا:﴿وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّه‘ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴾"اور اگر کبھی تجھے شیطان ورغلائے تو اللہ کی پناہ پکڑ بلا شبہ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔"اور دوسرے مقام پر فرمایا:﴿قُلْ رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّیٰطِیْنِ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ یَحْضُرُوْنَ ﴾"فرمادیجئے !اے مالک!میں تیری پناہ میں آتا ہوں شیطان کی چھیڑ چھاڑ سے اور اے رب میں (اس بات سے) تیری پناہ میں آتا ہوں کہ وہ میرے پاس حاضر ہوں۔"تیسرے مقام پر﴿ سَمِیْعٌ عَلِیْم ﴾کی بجائے﴿اِنَّه‘ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم﴾ فرمایا۔باقی آیت اسی طرح ہے۔ان کے سوا باقی کہیں اس مضمون کی آیت نہ ہے۔اس اختلاف میں کہ استعاذہ کا مختار لفظ کیا ہے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہ ہے۔جو لفظ بھی کلام پاک یا حدیث شریف میں استعمال ہوا وہ اس کے معانی کو کافی ہے۔ابو سعید کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ رات کو نماز کے لیے اٹھتے تو فرماتے:((اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفَسِهٖ))اس کو اہل سنن نے روایت کیا ہے۔ابی بن کعب کی روایت میں مرفوعاً یوں آیا ہے۔((اعوذ بالله من الشیطان الرجیم))دوسری روایت میں یہ لفظ ہے:((اَللّٰهُمَّ اِنِیْ اعوذبك من الشیطن الرجیم)) اور ایک ضعیف و منقطع اثر میں:((استعیذ بالله السمیع العلیم من الشیطان الرحیم)) کے الفاظ بھی مذکور ہیں۔غرضیکہ جس لفظ سے بھی کوئی تعوذ پڑھے گا وہ کفایت کرے گا۔خواہ پکار کر کہے یا چپکے سے پڑھے۔شیطان اس کو کہتے ہیں جس کی طبیعت انسان کی طبیعت سے دور ہو اور اپنے فسق کی وجہ سے ہر چیز سے روکا گیا ہو، پھر جو بھی سرکش ہو، جن ہو انسان ہو یا کوئی اور حیوان ہو، اسے شیطان کہا جاتا ہے۔اللہ کریم نے فرمایا:﴿ وَكَذَالِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیَاطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ﴾اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شیطان دشمن رکھے ہیں جو انسانوں اور جنوں میں سے ہیں(ان جنوں) کا بعض بعض کی طرف (مزین) ملمع بات ڈالتے ہیں تاکہ انہیں دھوکہ دیں۔اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کا کام یہ ہے کہ وہ فریب دینے کے لیے ایک دوسرے کی طرف جھوٹی باتیں پہنچاتے ہیں۔مسند امام احمد میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:اے ابوذر!تو انسان اور جن شیطانوں سے اللہ کی پناہ مانگ۔انہوں نے کہا: کیا انسانوں میں بھی شیاطین ہوتے ہیں۔فرمایا:ہاں۔ایک دوسری روایت میں، جو مسلم شریف میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس میں کالے کتے کو شیطان کہا ہے۔رَجِیْمٌ کے دو معنی ہیں:ایک یہ کہ وہ اپنے وسوسوں سے

لوگوں کو ہلاک کرتا ہے انہیں برے خیالات میں پھنسا دیتا ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ خود خیر سے محروم و مردود ہے ، جیسا کہ اللہ کریم نے فرمایا کہ: ﴿وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ﴾ اور ہم نے انہیں شیطان کو مارنے کے لیے بنایا۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَيُقْذَفُونَ مِن كُلِّ جَانِبٍ دُحُورًا﴾ کہ وہ ہانکے ہوئے ہر جانب سے پھینکے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا: ﴿إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ﴾ "مگر جس نے چوری سن لیا تو اس کے پیچھے چمکتا ہوا (شعلہ) انگارا لگ گیا۔" ابن کثیر رحمہ اللہ نے دوسرے معانی کو درست قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم

﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ "شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔" صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے کتاب پاک کو اسی جملہ مبارک سے شروع کیا تھا۔ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سورۂ نمل کی ایک آیت ہے ۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام ایک سورت کا دوسری سے فرق بِسْمِ اللّٰهِ کے نزول سے پہچانتے تھے ۔ ابو داؤد نے بھی اسی طرح صحیح سند سے روایت کیا، اور مستدرک حاکم میں بھی مروی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت کلام پاک کی ہر سورت کا مستقل حصہ ہے۔ کوئی شخص جب نماز یا غیر نماز میں تلاوت کرے تو لازم ہے کہ ابتدا میں وہ یہ آیت پڑھے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی حالت میں سورۃ فاتحہ میں پہلے بِسْمِ اللّٰهِ پڑھی ہے اور اس کو اس کا حصہ سمجھا ہے۔ [بروایت ابن خزیمہ وفیہ ضعیف] صحابہ و تابعین کی ایک جماعت نے کہا کہ سورۃ براۃ کے سوا بسم اللہ ہر سورت کی آیت ہے۔ امام احمد و شافعی کا بھی یہی مذہب ہے۔ جبکہ امام مالک اور امام ابو حنیفہ (رحمہم اللہ) اس کو کسی سورت کی مستقل آیت نہیں کہتے۔ پہلا مسلک زیادہ قوی اور صحیح تر ہے۔ اسی بنیاد پر جب کوئی قرأت جہری کرے تو اسے پکار کر پڑھے۔ سلف و خلف صحابہؓ و تابعینؒ و ائمہ مسلمینؒ کی ایک جماعت کا یہی موقف ہے۔ خطیب نے کہا کہ خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم اس کو جہراً پڑھتے تھے مگر یہ روایت غریب ہے۔ ابن کثیر نے بہت سے صحابہؓ و تابعینؒ کے نام لکھے جو اس کو جہراً پڑھتے تھے۔ ان کے نام لکھنے کے بعد فرمایا: جب یہ سورۃ فاتحہ کا حصہ ہی ٹھہری تو اس کو جہراً ہی پڑھنا چاہئے ۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے نماز پڑھی جس میں بِسْمِ اللّٰهِ جہراً پڑھی۔ اور نماز کے بعد فرمایا: میں تم سب سے زیادہ رسول اللہ علیہ السلام سے نماز سے مشابہ ہوں۔ [بروایت نسائی، ابن خذیمہ، ابن حبان، حاکم اور دار قطنی، خطیب اور بیہقی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بِسْمِ اللّٰهِ جہراً پڑھتے تھے ۔ اس کو حاکم نے صحیح کہا۔ صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ ان سے رسول اللہ علیہ السلام کی قرأت کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؓ

نے فرمایا کہ آنحضرت علیہ السلام کی قرأت کھینچ کر تھی۔ پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر بتایا کہ بِسْمِ اللّٰہِ کو اس طرح کھینچتے، الرَّحْمٰن کو اس طرح اور الرَّحِیْم کو اس طرح پڑھتے تھے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت علیہ السلام اپنی قرأت کو الگ الگ پڑھتے۔ ﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٥اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٥مٰالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ دار قطنی نے فرمایا: اس کی سند صحیح ہے۔ آنحضرت ﷺ اپنی قرأت میں ہر آیت پر وقف کرتے، ایک کو دوسرے سے ملاتے نہ تھے۔ بعض لوگ کسی عمل وغیرہ کے لیے الرَّحِیْمِ کے میم کو اَلْحَمْدُ کے لام سے ملا کر پڑھتے ہیں یہ سنت صحیح کے خلاف ہے بلکہ دونوں آیات کو فرق سے پڑھنا چاہئے تاکہ قرأت سنت صحیحہ کے موافق ہو۔ امام ابو حنیفہ، مالک اور احمد رحمہم اللہ کا موقف ہے کہ نماز میں بِسْمِ اللّٰہِ جہراً نہ پڑھے لیکن نماز میں کوئی آہستہ پڑھے یا پکار کر پڑھے سب کی نماز کو یہ درست بتاتے ہیں یہ بھی غنیمت ہے۔ فتح البیان میں فرمایا کہ اگرچہ ترک بِسْمِ اللّٰہِ کی روایتیں صحیح تر ہیں لیکن اس کو پڑھنا زیادہ صحیح ہے کیونکہ صحیح طریق و تخریج سے مروی ہے، اس لیے اس کا اختیار کرنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ترک بسم کی تاویل بھی ممکن ہے۔ یعنی تاویل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ ذاتاً بھی ثابت ہے۔ یعنی اس کا کلام پاک ہونا ثابت ہے اور صفاتاً بھی ثابت ہے۔ یعنی جس سورت میں یہ نازل ہوئی ہے اس میں اس کو جہراً پڑھنا چاہئے۔ حاصل کلام یہ ہوا کہ بِسْمِ اللّٰہِ سورۃ فاتحہ سمیت سب سورتوں کی ایک آیت ہے اور اس کے سرّاً و جہراً کا وہی حکم ہے جو سورۃ فاتحہ کا کہ جب وہ جہراً پڑھے تو بھی بِسْمِ اللّٰہِ بلند آواز پڑھے پڑھے اور جب سورۃ فاتحہ آہستہ پڑھے تو اسے بھی آہستہ پڑھے۔ اس ترکیب و تطبیق سے تمام روایات جمع ہو جاتی ہیں۔ اختلاف کی بجائے اتفاق کو راہ ملتی ہے۔

فائدہ: حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے بِسْمِ اللّٰہِ کے متعلق سوال کیا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، اللہ کی ذات اور اس کے اسم اعظم کے درمیان ایسا قرب ہے جیسے دونوں آنکھوں کی سیاہی اور سفیدی میں ہے۔ اس کو ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ اور ایک دوسری سند سے یہ ابن مردویہ سے بھی مروی ہے۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص چاہے کہ وہ ان انیس جہنم کے داروغوں سے بچ جائے جنہیں زبانیہ کہا جاتا ہے تو وہ ﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ کا ورد کرلے اس کا ہر حرف ایک زبانیہ سے ڈھال بن جائے گا۔ اس کو قرطبی نے بھی ذکر کیا۔ ابن عطیہ نے اس کی تائید کی ہے۔ اس دلیل سے کہ ایک آدمی نے کہا تھا: ((رَبَّنَا لَكَ

الحمد حمدًا کثیرًا طیبًا مبارکًا فیه ﴾ کہا تھا تو آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ نے تیس سے زائد فرشتوں کو دیکھا جو اس کو لینے میں جلدی کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کلمے کے تیس سے اوپر حروف ہیں۔

اس کے علاوہ یہ ایک ایسی بات ہے جو محض عقل واجتہاد کی بنیاد پر نہیں کہی جاسکتی۔ حضرت ابو تمیمہؓ آنحضرت علیہ السلام کے ساتھ ایک سواری پر تھے اس کو ٹھوکر لگی تو انہوں نے کہا تعس الشیطان۔ یعنی شیطان برباد ہو۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا یہ نہ کہہ اس سے وہ بڑا ہو جاتا ہے اس خوشی سے پھول جاتا ہے کہ میں نے اس کو اپنی قوت سے پچھاڑ دیا ہے بلکہ تو بِسۡمِ اللّٰهِ کہہ اس سے وہ مکھی جتنا چھوٹا ہو جاتا ہے۔[بروایت امام احمد] نسائی سے "عمل الیوم واللیلہ" میں یوں مروی ہے کہ وہ پھول کر ایک گھر جتنا ہو جاتا ہے۔ اور بِسۡمِ اللّٰهِ کہنے سے وہ دب کر مکھی کی طرح چھوٹا ہو جاتا ہے اور یہ بِسۡمِ اللّٰهِ کی برکت سے ہے۔ اس لیے ہر کام وکلام میں پہلے بِسۡمِ اللّٰهِ مستحب ہے۔ جیسے دیباچۂ کتاب بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت اور وضو کرتے وقت واجب ہے جیسا کہ بعض علماء نے کہا اور کھانا کھاتے وقت، ذبح کرتے ہوئے اور بوقتِ جماع مستحب یا واجب ہے جیسا کہ اس باب میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔

فائدہ: حدیث ابو ہریرہؓ میں مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ جس نے انہیں یاد کیا وہ جنت میں جائے گا۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى فَادۡعُوۡهُ بِهَا﴾ "اور اللہ کے لیے اچھے اچھے نام ہیں اسے انہی کے ساتھ پکارو۔" دوسری جگہ فرمایا: ﴿اُدۡعُوا اللّٰهَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ اَيًّامَّا تَدۡعُوۡا فَلَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى﴾ "کہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو۔ جو کچھ بھی تم پکارو گے سب اچھے نام اسی کے ہیں۔" بعض محققین نے کہا کہ لفظِ "اللہ" اسم اعظم ہے۔ اور قرآن میں اللہ کا یہ نام دو ہزار تین سو ساٹھ دفعہ مذکور ہے۔ او، رحمٰن کا لفظ کسی مخلوق پر نہیں بولا جاتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کے بعض نام مخلوق پر بولے بھی جاسکتے ہیں۔ جیسے رؤوف رحیم۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق اللہ کریم نے فرمایا: ﴿حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ﴾ "وہ حریص ہے تم پر ایمان والوں کے ساتھ مشفق ومہربان ہے۔" یا جیسے سَمِیۡعٌ یا بَصِیۡرٌ ہے ہر انسان کے متعلق فرمایا: ﴿اِنَّا خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اَمۡشَاجٍ نَّبۡتَلِيۡهِ فَجَعَلۡنٰهُ سَمِيۡعًا بَصِيۡرًا﴾ "بلاشبہ ہم نے انسان کو ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا ہم اسے آزماتے ہیں۔ پھر ہم نے اس کو سننے والا دیکھنے والا کر دیا۔" جبکہ لفظ اللہ اور رحمٰن غیر اللہ پر نہیں بولے جاسکتے۔ لیکن بعض کفار قریش نے جو مسیلمہ کذاب پر لفظ رحمٰن کا اطلاق کیا تھا۔ اس لیے عطاء خراسانی نے یہ بات کہی کہ بِسۡمِ اللّٰهِ میں رحمٰن کے بعد

رحیم کا لفظ اس لیے آیا ہے کہ لفظ رحمٰن اور رحیم دونوں اکٹھے صرف اللہ کے ساتھ خاص ہیں۔ ان کو یکجا کسی مخلوق پر نہیں بولا جا سکتا کیونکہ بعض عرب نے اپنے کفر و عناد اور حماقت کی وجہ سے غیر اللہ کو بھی رحمٰن کہہ لیا تھا۔ مگر یہ دونوں صفات یکجا کسی غیر پر نہیں بولی گئیں۔ اس لیے یہ وصف مذکورہ وہم کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اور لفظ رحیمؔ کی نسبت رحمٰن میں زیادہ مبالغہ ہے۔ ابن جریر کے بیان سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ گویا اس پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ رحمٰن کا رحم عام ہے جو ہر نیک و بد جملہ مخلوقات کو شامل ہے۔ جب کہ رحیم وہ ہے جو خاص مومنوں پر شفقت کرے۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ رحمٰن وہ ہے جو دنیا اور آخرت ہر دو جگہ رحم فرمائے اور رحیم وہ ہے جو خاص آخرت میں رحم کرے۔ لیکن دعائے ماثور میں اس طرح ہے کہ: ((رحمٰن الدنیا والآخرۃ ورحیمھما)) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا قولِ زیادہ درست ہے۔ واللہ اعلم.

ابن المبارک نے کہا رحمٰن وہ ہے کہ جب اس سے مانگو تو عطا کرتا ہے۔ اور رحیم وہ ہے کہ اگر اس سے نہ مانگا جائے تو وہ ناراض ہوتا ہے۔ اس مفہوم کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ سے سوال نہیں کرتا اللہ کریم اس پر ناراض ہو جاتا ہے۔ [بروایت ترمذی] اے اللہ! ہم تجھ سے یہ بھیک مانگتے ہیں کہ تو ہمیں دونوں جہاں میں عفو و عافیت عطا کر دے اور اس دعا کی قبولیت سے ہماری جھولی بھر دے۔ اللّٰھُمَّ آمین۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴿۱﴾ تمام تعریفیں اللہ کے لیے جو جہانوں کا رب ہے۔

جب کوئی شخص اپنے اختیار سے کوئی عمدہ کام کرتا ہے۔ اور دوسرا شخص اس کی بزرگی کے ارادے سے اس کے کام کی ثناء و صفت اپنی زبان سے بجا لاتا ہے تو اسے حمد کہتے ہیں۔ یہ حمد خاص اللہ کی ذات کو زیبا ہے۔ دوسرے کو زیبا نہ ہے۔ حدیث میں ہے: ((اللّٰھُمَّ لك الحمد کله)) حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ شکر کا کلمہ ہے بندہ جب یہ کلمہ کہتا ہے تو اللہ کریم فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا۔ حکم بن عمیر نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تو نے الحمد للہ رب العالمین کہا تو اللہ کا شکر ادا کیا اب اللہ تجھے زیادہ دے گا۔ [بروایت ابن جریر] ابن عمرو کا مرفوع لفظ یہ ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ شکر کا سر ہے۔ جس نے اللہ کی حمد نہ کی اس نے شکر نہ کیا۔ [بروایت عبدالرزاق]

خطابی، حکیم ترمذی، بیہقی۔ قرآن پاک میں اللہ کریم نے حضرت نوح علیہ السلام کو شکر گزار بندہ فرمایا اس لیے کہ وہ اللہ کی بہت حمد بیان کیا کرتے تھے۔ جابر رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً فرمایا کہ افضل ذکر ((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)) اور افضل دعا ((اَلْحَمْدُ

لِلّٰهِ ﴾ ہے۔ اس کو ترمذی نے حسن کہا۔ [بروایت نسائی ، ابن ماجه، ابن حبان ، بیہقی] ابو مالک اشعری کا لفظ یہ ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میزان کو بھر دیتا ہے۔ [بروایت مسلم ، نسائی ، احمد]

حضرت انس کا لفظ مرفوع یہ ہے کہ اللہ کو حمد سے زیادہ محبوب کوئی چیز نہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں یوں فرمایا ہے کہ ہر عمدہ کام جو اللہ کی حمد کے بغیر شروع کیا جاتا ہے وہ برکت سے جدا ہے۔ [بروایت اهل السنن ، ابن حبان ، بیہقی] مسلم میں حضرت انسؓ سے مرفوع لفظ یوں ہے کہ اللہ اس بندے پر خوش ہوتا ہے جو ہر گھونٹ اور ہر نوالے پر اللہ کی حمد کرتا ہے۔

فائدہ: رب کسی چیز کے مالک، مربی، مدبر، قائم اور مصلح کو کہا جاتا ہے۔ معبود کو بھی رب کہتے ہیں۔ سو یہ سارے معانی اللہ کی ذات پاک میں موجود ہیں۔ اور رب کا لفظ غیر اللہ کے لیے صرف اضافت سے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے رب الدار۔ ورنہ بغیر اضافت صرف اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کسی نے یہ کہا کہ یہ اسم اعظم ہے۔ عالم ہر اس موجود کو کہتے ہیں جو اللہ کے سوا ہے۔ لفظ عالم میں ساری خلق داخل ہے۔ کسی نے کہا عالم علامت سے مشتق ہے۔ یہ مصنوعات گویا صانع کے وجود کی علامت ہیں۔ ابن المعتز نے کیا خوب کہا ہے:

فیا عجبًا کیف یعصی الا له ام کیف یجحد ہ الجاحد

وفی کل شیء له ایة تدل علی انه واحد

بعض نے کہا کہ ہر زمانے کے لوگ عالم کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ عالم سے جن و انس مراد ہیں۔ بعض نے ملائکہ و شیاطین کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔ قول اول صحیح تر ہے۔ اس دلیل سے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ رب العالمین کون ہے؟ انہوں نے یہ جواب دیا تھا کہ: ﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ "کہ وہ جو آسمانوں کا اور زمین اور ان کے درمیان سب چیزوں کا مالک ہے۔" اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات عالم سے الگ تھلگ ہے۔ عالم میں داخل نہ ہے۔ اسی لیے کلام پاک میں ہے کہ رحمٰن عرش پر ہے۔ عالم کی تعداد میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا عالم چودہ ہزار ہیں۔ کسی نے کہا عالم سترہ ہزار ہیں۔ کسی نے کہا اٹھارہ ہزار کسی نے اسی ہزار بتایا ہے۔ درست بات یہ ہے کہ عالم الغیب کے سوا عالموں کی تعداد کوئی نہیں جانتا۔ کعب الاحبار نے کہا کہ عدد عوالم کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ میں کہتا ہوں اللہ کریم نے فرمایا: ﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ﴾ کہ تیرے رب کے لشکروں کو صرف وہی جانتا ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

لفظ رب العالمین میں ایک طرح کا ڈرانا ہے۔اس لیے اس کے بعد یہ دونوں صفات کے ذکر سے تسلی دی۔ ترہیب کو ترغیب سے ملادیا۔اور ان دونوں صفات کو دوبارہ اس لیے ذکر کیا کہ اللہ کریم سب سے زیادہ اسی رحمت کی طرف متوجہ ہے۔یا یہ کہ مخلوق کو سب سے زیادہ اسی رحمت کی ضرورت ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اگر مؤمن اس عقوبت کو جان لے جو اللہ کے پاس ہے تو کوئی بھی جنت کی طمع نہ کرے۔ اور اگر کافر اللہ کے پاس موجود رحمت کو جان لے تو کوئی ایک بھی اس رحمت سے ناامید نہ ہو۔: ؎

اگر در دھد یك صلائے كرم عزازیل گوید نصیبی برم

مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ انصاف کے دن کا مالک ہے۔

انصاف کا دن وہ ہے جس دن ساری مخلوق کا حساب کتاب ہوگا۔ عمل خواہ نیک ہو یا بد اس کے عامل کو اس کا بدلہ دیا جائے گا۔ مگر یہ کہ کسی کو اس کا گناہ معاف کر دیا جائے۔ قرآن مجید میں اس دن کی وضاحت اس طرح ہے:

﴿وَمَا اَدْرَاكَ مَايَوْمُ الدِّيْنِ ۝ يَوْمَ لَاتَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ ۝﴾

کہ اور آپ کو کیا خبر کہ انصاف کا دن کیا ہے؟ وہ دن کہ جس دن کوئی نفس کسی نفس سے کچھ اختیار نہ رکھے گا اور معاملہ اس دن سارا اللہ کے لیے ہوگا۔اس دن کے حاکم و مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا اس دن کسی کا حکم نہ چلے گا۔ جیسا کہ دنیا میں وہ لوگ حکم چلاتے تھے۔اکثر صحابہؓ و تابعینؒ نے یہی معنی بیان کیے ہیں۔اللہ کریم نے فرمایا:﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝﴾ ''کہ آج بادشاہی کس کی ہے؟ اللہ زبردست واحد ذات کی۔'' اس دن کس میں طاقت ہوگی کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بات زبان سے نکال سکے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ اللہ کریم زمین کو مٹھی میں لے گا اور آسمان کو داہنے ہاتھ میں لپیٹے گا پھر فرمائے گا کہ میں بادشاہ ہوں۔ زمین کے بادشاہ کہاں ہیں۔ کہاں ہیں جبر و تکبر کرنے والے۔[بروایت شیخین]

دوسری روایت میں جو صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ذلیل شخص وہ ہے جس کا نام ملک الاملاک ہے۔اللہ کے سوا کوئی مالک نہیں ہے۔دنیا میں جو غیر اللہ کو ملک کہتے ہیں یہ کہنا مجازاً ہے۔یہ مجاز قرآن مجید میں بھی ہے۔فرمایا:﴿اِنَّ اللّٰهَ قَدْبَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا﴾ ''کہ بلاشبہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔'' دوسری جگہ فرمایا:﴿وَكَانَ وَرَاءَ هُمْ مَلِكٌ﴾ '' اور ان کے پیچھے ایک بادشاہ تھا۔'' تیسری جگہ فرمایا:﴿وَجَعَلَكُمْ مُلُوْكًا﴾ '' اور اس نے تمہیں بادشاہ بنادیا۔ ''صحیحین میں آیا ہے کہ ((مثل الملوك على الاسرة))

اس آیت میں بھی مالک کی بجائے ملک پڑھا گیا ہے۔ دونوں طرح پر قراءت ثابت ہوئی ہے۔ اس دن کی ملکیت کی تخصیص سے یہ بات لازم نہیں آتی ہے کہ اوروں کا وہ مالک یا ملک نہ ہو۔ اس لیے کہ اس سے پہلے رب العالمین کا لفظ فرمادیا ہے۔ جو دنیا و آخرت کو شامل ہے۔ اس آیت سے امر معاد کا ثبوت ہوا۔ قیامت کا وقوع ثابت ہوا۔ جو معاد کا منکر ہے وہ کافر ہے۔ یہ معاد جسمانی ہو گا۔ محض روحانی نہ ہو گا۔ اور اعمال کا یہ حساب اس دن حقیقی ہو گا مجازی و خیالی نہ ہو گا۔

اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ﴿۴﴾ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

اس میں جبر یہ وقدریہ دونوں فرقوں کا رد ہے۔ جمع کا صیغہ اس لیے ہے کہ گویا اس جملے کا کہنے والا تمام موحدین لوگوں کی طرف سے خبر دیتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ وہ جماعت کو تھامے رہے۔ جماعت سے اہل سنت مراد ہے۔ سنت حدیث کو کہتے ہیں۔ عبادت استعانت کا وسیلہ ہے۔ اس لیے پہلے عبادت کا ذکر کیا پھر مدد طلب کرنے کا ذکر ہے۔ اور لفظ اِیَّاكَ کو نَعۡبُدُ اور نَسۡتَعِیۡنُ پر مقدم کیا۔ اس سے حصر اور صرف اللہ کے ساتھ عبادت واستعانت کا اختصاص سمجھا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہ ہے۔ اور نہ کوئی مدد چاہنے کے لائق ہے۔ جب عبادت کرے تو محض اللہ کی کرے۔ جب بھی کسی کام میں مدد مانگے تو اللہ سے ہی مانگے۔

وہ کیا ہے؟ جو نہیں ہوتا خدا سے   جسے تم مانگتے ہو خدا سے

عبادت، ذلت وخواری اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ ذلت وخواری اللہ کے سوا کسی کے لیے نہ ہونی چاہئے۔ عبودیت عبادت کا ایک ادنیٰ مرتبہ ہے۔ استعانت یہ ہے کہ کسی سے کہے کہ تم ہماری مدد کرو ہمارا کام نکالو۔ سو سارے دین کی چکی انہی دوامر پر گھومتی ہے۔ اسی لیے بعض سلف نے کہا کہ سورۃ فاتحہ سارے قرآن کا راز ہے۔ اور سورۃ فاتحہ کا راز یہی دو کلمے ہیں۔ کیونکہ پہلے کلمے میں شرک سے بیزاری ہے۔ اور دوسرے کلمے میں اپنی طاقت وقوت سے علیحدگی ہے۔ اور اپنے ہر کام کو اللہ کی طرف سونپتا ہے۔ یہی مضمون اور آیات میں بھی بتایا گیا ہے۔ جیسے: ﴿فَاعۡبُدۡهُ وَتَوَكَّلۡ عَلَیۡهِ﴾ "کہ اسی کی عبادت کرو اور اسی پر توکل کرو۔" پھر فرمایا: ﴿قُلۡ هُوَ الرَّحۡمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَیۡهِ تَوَكَّلۡنَا﴾ "کہ فرمادیجئے وہی رحمٰن ہے ہم اس کے ساتھ ایمان لائے اور اسی پر ہمارا توکل ہے۔" ایک اور جگہ فرمایا: ﴿رَبُّ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذۡهُ وَكِیۡلًا﴾ "کہ وہ رب ہے مشرق ومغرب کا، اس کے سوا کوئی معبود نہ ہے۔" پس اسی کو کارساز بناؤ۔ اس سورت کے شروع میں اللہ کریم

نے اپنی ثناء بیان فرمائی ہے۔ صفات حسنیٰ کا ذکر کیا ہے اور بندوں کو ارشاد فرمایا ہے کہ تم بھی اسی طرح اس کی ثناء وصفت بیان کرو۔ اسی لیے جو شخص سورۃ فاتحہ پڑھنے کی قدرت رکھتا ہو لیکن نہ پڑھے تو اس کی نماز درست نہیں ہوتی۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت عبادہؓ بن صامت سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس شخص نے فاتحہ الکتاب نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔

فائدہ: حافظ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ عبادت ایک بڑا مقام ہے۔ انسان کو اس عبادت سے شرف حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بندہ جنابِ الٰہی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اللہ کریم نے اپنے رسولؐ کو اشرف مقامات میں لفظ "عبد" سے یاد فرمایا ہے۔ فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتَابَ﴾ "کہ سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندہ پر کتاب نازل کی۔" دوسری جگہ فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ﴾ "جب اللہ کا بندہ اسے پکارنے کے لیے کھڑا ہوا۔" تیسرے مقام پر فرمایا: ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا﴾ "کہ وہ ذات پاک ہے جس نے اپنے بندے کو رات کو سیر کرائی۔" غرضیکہ قرآن کے نزول کے وقت، بندے کے قیام کے ذکر کے وقت اور معراج کے وقت عبد کا نام رکھا۔ جب مخالفین کی تکذیب سے دل تنگ ہوا تو کہا کہ عبادت کیا کرو۔ ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ یَضِیْقُ صَدْرُكَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السَّاجِدِیْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰی یَاْتِیَكَ الْیَقِیْنُ﴾ "اور تحقیق ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتوں سے آپؐ کا سینہ تنگ ہوتا ہے تو اللہ کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرو اور سجدہ گذاروں سے ہو جاؤ اور اپنے رب کی عبادت کرو حتیٰ کہ تیرے پاس یقین آجائے۔" صوفیہ کا کہنا ہے کہ عبادت حصول ثواب اور دفع عقاب کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ عبادت محض اس کی ذات پاک کے لیے کیا جائے۔ جنت جہنم سے غرض نہ رکھے یہ درست بات نہ ہے۔ دیکھئے اعرابی کی حدیث میں ہے کہ جب اس نے یہ بات کہی کہ مجھے آپؐ کی اور معاذؓ کی طرح گنگنانا نہیں آتا۔ میں تو اللہ سے جنت مانگتا ہوں اور جہنم سے پناہ مانگتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جولہا ندندن کہ ہم بھی تو اس کے ارد گرد گنگناتے ہیں۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾ "کہ وہ اپنے رب کو خوف اور طمع سے پکارتے ہیں۔" یعنی وہ جہنم کے خوف اور جنت کے لالچ سے عبادت کرتے ہیں۔ ابو طلحہ فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک جنگ میں تھے۔ جب دشمن سے ملاقات ہوئی تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: ﴿یَامَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ میں نے دیکھا کہ لوگ زمین پر گرتے ہیں۔ فرشتے ان کو آگے پیچھے سے مارتے ہیں۔ اس کو بغوی باوردی نے بھی روایت کیا ہے۔

معرفة الصحابة میں طبرانی نے اوسط میں اور ابو نعیم نے دلائل میں ذکر کیا ہے۔اسی طرح کا ایک وہ قصہ ہے کہ جب والی دمشق کا دشمن کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو اس نے کہا (جبکہ لڑائی گرم تھی) یا خالد بن الولید شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ وہاں موجود تھے شریک جہاد تھے۔ فرمایا تو یہ کیا کہتا ہے یہ کہہ: ﴿یَامَالِكِ یَومِ الدِّیْنِ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ اس نے یوں ہی کہا اللہ نے فتح دی۔ اللہ نے کلمہ توحید اور خالص عبادت و استعانت من اللہ کی برکت سے فتح نصیب کی۔ وللہ الحمد.

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۝ تو ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔

ہمیں کھلے راستے پر چلا جیسے تو نے ہمیں زمانِ حال میں ہدایت دی ہے ہمیں آئندہ زمانے میں بھی اسی طرح ہدایت پر قائم رکھ۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْ وَزَادَهُمْ هُدًی﴾ "وہ لوگ جو ہدایت یافتہ ہوئے انہیں مزید ہدایت دی۔" دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ "اور وہ لوگ جنہوں نے ہمارے راستے میں جہاد کیا ہم انہیں اپنے راستے کی ہدایت دیں گے۔" راہ دکھانا، توفیق دینا، مطلب واضح کرنا، الہام کرنا نرمی سے راہ بتانا یہ سب ہدایت کے معانی ہیں۔ اور مستقیم اس چیز کو کہتے ہیں جو برابر سیدھی ہو۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ صراط مستقیم وہ کھلا راستہ ہے جس میں کسی طرح کا ٹیڑھ نہ ہو۔ ساری لغت عرب میں اس کے یہی معنی ہیں۔ یہاں سیدھی راہ سے ملت اسلام کا طریقہ مراد ہے۔ حدیث نواس ابن سمعان میں بھی صراط سے اسلام مراد لیا گیا ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس کی سند کو حسن صحیح کہا۔

ابن مسعود نے کہا کتاب اللہ مراد ہے۔ یعنی ہمیں قرآن پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ کسی نے کہا سنت و جماعت کا طریقہ مراد ہے۔ یعنی رسول اللہ علیہ السلام کی حدیث پر چلا۔ کسی نے کہا راہ حج مراد ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ہمیں دین حق سمجھا۔ کسی نے کہا کہ ہمیں ان لوگوں کی راہ دکھا جو جنت کے مستحق ہیں۔ پہلا قول ظاہر تر ہے۔ اگر سارے معانی مراد لیے جائیں تو بھی کوئی مانع نہیں۔ ابن کثیرؒ نے کہا کہ صراط کے معانی میں مفسرین سلف و خلف کی مختلف عبارتیں ہیں۔ لیکن سب کا حاصل ایک ہی بات ہے۔ وہ کتاب و سنت ہے۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ صراط مستقیم وہ راہ ہے۔ جس پر ہم نے رسول اللہ علیہ السلام کو چھوڑا ہے۔

ان لوگوں سے وہ چار لوگ مراد ہیں جن کا ذکر سورۃ نساء میں ہے۔ فرمایا: ﴿وَمَنْ یُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُوْلٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصَّالِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا﴾ "اور جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی وہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن نبیوں، صدیقوں

، شہداء اور صالحین پر اللہ نے انعام کیا اور رفاقت کے لحاظ سے یہ لوگ خوب ہیں۔" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی اقوام مراد ہیں۔ جو اپنے دین میں قائم تھے۔ یا اس سے صحابہ رضی اللہ عنہم اور اہل بیت مراد ہیں۔ یا اس سے انبیاء اور سارے مومنین مراد ہیں۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ اس آیت میں اس بات کا اشارہ ہے کہ سلف صالحین کا مقتدی بننا اچھا ہے۔

سو اقتداء اور چیز ہے اور تقلید اور چیز ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ﴾ "کہ ان کی راہ پر چل۔" یعنی جیسے وہ مواحد و دیندار تھے تو بھی ایسا ہی حق پرست بن جا۔

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ﴿۶﴾ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا۔

حضرت عدی بن حاتم کی طویل حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ یہود اور ضَالِّينَ عیسائی ہیں۔ [بروایت احمد حسنہ ترمذی] اسی طرح ابن مردویہ کے نزدیک ابوذرؓ کی مرفوع روایت میں یہ تفسیر منقول ہے۔ سارے صحابہؓ و مفسرین کا یہی قول ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں ہوتا۔ کسی نے کہا کہ وہ سنت سے بہک گئے تو بدعت کے سبب ان پر غضب نازل ہوا۔ [بقول قرطبی] کسی نے کہا اس میں سارے نافرمان کافر، بدعتی شامل ہیں۔ لیکن اس کی درست تفسیر وہی ہے جو آنحضرت علیہ السلام سے منقول ہے۔ کہ اس سے وہ اہل کتاب مراد ہیں جن کا طریقہ اہل ایمان کے طریقے سے جدا ہے۔ اہل ایمان کا طریقہ علم حق اور عمل صواب دونوں پر شامل ہے۔ یہود نے عمل نہ کیا نصاریٰ کو علم نہ ہوا۔ اس لیے یہود کا جرم سنگین ہونے کی وجہ سے ان پر غضب ہوا اور عیسائی بہکا دیے گئے۔ کیونکہ جو عالم بے عمل ہو وہ غضب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس شخص کے خلاف کہ جسے سرے سے حق ملا ہی نہ تھا۔ وہ جاہل رہا۔ اور نصاری نے دریافت حق چاہا لیکن درست راہ ہاتھ نہ لگی اور گمراہ ہو کر رہ گئے۔ اگرچہ یہود و نصاری دونوں ہی گمراہ و مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ ہیں۔ لیکن یہود کا خاص وصف غضب ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ فَبَآءُوْا بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ﴾ "جس کو اللہ نے لعنت کی اور اس پر ناراض ہوا تو وہ غصے پر غصے سے لوٹے۔" اور نصاری ضلال کے ساتھ اخص ہیں۔ جیسے ارشاد فرمایا: ﴿قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ۝ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۝﴾ "تحقیق وہ اس سے قبل گمراہ ہو چکے تھے اور

انہوں نے بہت سارے لوگوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔ بنی اسرائیل سے کافر لوگ حضرت داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان پر ملعون ٹھہرے۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گذرنے والے تھے۔ اور وہ ایسی برائی سے منع کرتے تھے جس کو وہ خود مرتکب ہوتے تھے البتہ بہت برا ہے جو وہ کرتے تھے۔" معلوم ہوا کہ احادیث و آثار کے قطع نظر ضَالِّیْنَ اور مَغْضُوبِ عَلَیْھِمْ کی یہ تفسیر قرآن سے بھی منقول و ثابت ہے۔ وللہ الحمد.

فائدہ: اول سورت حمد ہے۔ آخر سورت ذم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خیرات کی ابتداء وانتہا اللہ کی طرف توجہ کرنا ہے۔ اور مخالفات وشرور کی انتہا اعراض کرنا ہے۔ اور اللہ کی عبادت واطاعت سے دور رہنا ہے۔ اور اس کا انجام غضب و گمراہی ہے۔ اس سورت میں چار قسم کے علوم مذکور ہیں۔ ایک علم اصول ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے لے کر اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ تک اسی میں اشارہ ہے۔ مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں امر معاد کا ثبوت ہے۔ أَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ سے معرفت نبوت کی اطلاع دی۔ دوسرا علم فروع ہے۔ اس علم میں بڑی چیز عبادت ہے۔ خواہ مالی ہو یا بدنی۔ سو وہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ سے ثابت ہوئی تیسرا علم اخلاق ہے۔ وہ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ سے مُسْتَقِیْم تک ہے۔ چوتھا علم تاریخ ہے۔ کہ پہلی امتوں میں سے کون بدبخت تھا اور کون خوش بخت تھا۔ وہ أَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ سے آخر سورت تک دریافت ہوتا ہے۔ غزالی ورازی نے اس سورت کا علوم قرآن پر مشتمل ہونا بڑا بسط سے بیان کیا ہے۔ حتیٰ کہ امام رازی نے اس سورت سے دس ہزار مسائل استنباط کیے ہیں۔

فائدہ: اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم کے نزول کا سب سے بڑا مقصود توحید کو شرک سے پاک صاف بتانا ہے یہ کوئی سا بھی تعلق ہو بہر حال ایسی کھلی ہوئی بات ہے۔ جس پر اقوال نقل کرنے کی ضرورت نہ ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ اللہ کریم نے رسولؑ اسی کام کے لیے بھیجے اور اسی لیے کتابیں نازل کیں یہ اجمال تفصیل کا تقاضا نہیں کرتا۔ جس کو شک ہو وہ کلام پاک میں غور وفکر کرے تو جلد ہی وہ معلوم کرے گا۔ کہ اس کتاب کا بڑا مقصد یہی ہے۔ اگر قرآن میں غور وفکر کرنے سے عاجز ہے تو صرف اسی سورت فاتحہ میں غور کرے تیں مقامات سے اخلاص توحید کا حکم نکلتا ہے۔ فتح البیان میں ان جگہوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

فائدہ: ابن کثیر نے کہا ہے کہ علماء کا درست مذہب یہ ہے کہ مخارج میں سے ضاد اور ظاء کے درمیان اگر خلل ہو جائے تو معاف ہے کیونکہ ان دونوں کے مخارج ایک دوسرے سے قریب قریب ہیں۔ ضاد اول حافئہ زبان اور اضراس سے نکلتا ہے۔ اور ظاء نوک زبان اور اطراف ثنایا سے نکلتا ہے۔ دونوں حرف اقسام مجہورہ رخوہ

مطبقہ سے ہیں۔اس لیے ایک حرف کا دوسرے حرف کی جگہ استعمال جن کا فرق مشکل ہے تو وہ غلطی معاف ہے۔ رہی یہ حدیث کہ انا افصح من نطق بالضاد وہ بے اصل ہے۔

فائدہ: یہ سورت سات آیات پر مشتمل ہے۔اس اختصار کے باوجود اس میں اللہ کی حمد و تمجید اور ثناء ہے۔اسماء حسنیٰ صفات علیا کا بیان ہے۔ معاد کا ذکر ہے۔بندوں کو ارشاد ہے کہ وہ اپنے حول و قوت سے بری ہو کر اللہ سے سوال اور عاجزی کریں۔اخلاص، عبادت، توحید الوہیت، توحید ربوبیت بجالائیں۔اللہ کو شریک اور مثال سے پاک جانیں۔ اور صراط مستقیم پر ثابت رہنے کا سوال کریں۔ حتیٰ کہ وہ جنت میں انبیاء، صدیقین، شہداء وصالحین کا ساتھ پائیں۔اس سورت میں اعمال صالحہ کی ترغیب ہے۔ تا کہ قیامت والے دن ایسے اعمال والوں کے ساتھ ہوں۔اور باطل مسلکوں والوں سے ترہیب ہے تا کہ قیامت والے دن باطل والوں کے ساتھ ان کا حشر نہ ہو۔

فائدہ: انعام ایک اچھی چیز ہے۔اس لیے اس کی نسبت اپنی طرف کی اور گمراہی اور غضب بری صفت ہے اس لیے اس کے فاعل کا ذکر نہ کیا اگرچہ دونوں کا فاعل حقیقی اللہ ہی ہے۔ فرمایا:﴿غَضِبَ اللّٰهُ وَعَلَيْهِمْ﴾ "اللہ ان پر غصے ہوا۔" فرمایا:﴿وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا﴾"اور جس کو وہ گمراہ کر دے تو تو ہرگز اس کے لیے کوئی رفیق راہ دینے والا نہ پائے گا۔" ایک اور مقام پر فرمایا:﴿وَمَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ﴾" اور جس کو اللہ گمراہ کر دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔" اسی طرح کی اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ اللہ ہدایت واضلال کے ساتھ منفرد ہے۔نہ اس طرح جیسے فرقہ قدریہ کہتے ہیں کہ بندے خود اپنے کام کے مختار ہیں جو چاہیں کریں۔وہ اس مطلب پر متشابہ قرآن کو حجت لاتے ہیں۔اور جو آیات ان پر صریح رد کرتی ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہیں۔ سارے اہل غی وضلال کا یہی حال ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جب دیکھو تم ان لوگوں کو جو متشابہ قرآن کو جستجو کرتے ہیں۔ سو اللہ نے انہی کا نام لیا ہے۔تم ان سے بچو۔ابن کثیر کہتے ہیں کہ الحمد للہ قرآن میں کسی بدعتی کے لیے کوئی حجت نہ ہے۔ قرآن تو حق کو باطل سے اور ہدایت کو ضلالت سے جدا کرنے آیا ہے۔اس میں اختلاف و نقض کیسے ممکن ہے۔وہ توحید و حکیم کی طرف سے اترا ہے۔ سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد آمین کہنا مشروع و مستحب ہے۔

فائدہ: آمین کا مطلب ہے کہ اے اللہ ہم سے قبول فرما۔اس دعا کو ٹھکانے لگا۔وائل بن حجر نے کہا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہا، تو میں نے سنا کہ انہوں نے آواز کو کھینچا اور آمین کہا۔[بروایت احمد، ابو داؤد، ترمذی]

ترمذی نے حسن بتایا ہے کہ حدیث مذکور کا لفظ مد بہا صوتہ ہے۔ اور ابوداؤد کا لفظ ہے کہ رَفَعَ بِھَا صوتہ۔ اور آمین چپکے سے نہیں بلکہ پکار کہتے۔ دوسری روایت میں مرفوعاً یوں ہے کہ رب اغفرلی آمین فرماتے۔ [اخرجہ الطبرانی عنہ] ابوہریرہؓ کا لفظ یہ ہے کہ جب وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہتے تو آمین پڑھتے۔ اول صف والے جو قریب ہوتے وہ آواز سنتے۔ [بروایت ابو داؤد] ابن ماجہ نے اتنا زیادہ کیا ہے کہ ((فیرتج بھا المسجد)) یعنی مسجد گونج جاتی۔ دارقطنی نے کہا اس کی سند حسن ہے۔ صحیحین میں ابوہریرہؓ سے مرفوعاً ہے کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو جائے تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ مسلم کا لفظ یوں ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں آمین کہتا ہے تو آسمان پر فرشتے آمین کہتے ہیں جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے مل جائے تو اس کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ موافق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وقت یا اجابت یا اخلاص میں یکساں ہو۔ حضرت ابو موسیٰؓ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ جب امام وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو اللہ کریم تمہاری دعا قبول فرمائے گا۔ [بروایت مسلم] ابن ماجہ میں حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً لفظ یہ ہے کہ یہود اتنا حسد تم سے کسی بات پر نہیں کرتے جتنا حسد وہ آمین اور سلام سے کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جسے آمین کا کہنا برا لگے اس میں یہودیت کا شائبہ ہے۔ امام احمد کا لفظ عائشہؓ سے یوں ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام کے پاس یہود کا ذکر ہوا تو فرمایا کہ یہود نے اتنا حسد ہم پر کسی چیز سے نہ کیا جتنا کہ وہ جمعہ کی بابت کرتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں وہ بتادیا اور وہ اس سے گمراہ ہو گئے۔ اور قبلہ پر کہ اللہ نے ہمیں درست بتادیا لیکن انہیں نہ ملا۔ اور آمین خلف الامام پر۔

فائدہ: ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اگر امام آمین بالجہر بھول جائے تو مقتدی ایک دفعہ آمین پکار کر کہے۔ اگر امام پکار کر کہے تو مقتدی اونچی آواز سے نہ کہے۔ امام ابو حنیفہ کا یہی مذہب ہے۔ امام احمد کا مذہب یہ ہے کہ مقتدی بہر صورت پکار کر آمین کہے۔ تیسرا قول ہے کہ اگر مسجد چھوٹی ہو تو مقتدی آمین بالجہر نہ کرے تاکہ وہ لوگ امام کا پڑھنا سنیں لیکن اگر مسجد بڑی ہو تو اونچی آواز سے آمین کہے تاکہ تمام مسجد میں سامعین کی آواز پہنچ جائے یہ تعلیل کچھ نہیں ہے۔ بلکہ آمین بالجہر اور بالسر دونوں طرح ثابت ہے۔ جہر سے کہنے میں اس وقت جبکہ بدعت کا زور و شور ہے تو یہ سنت کا زندہ کرنا ہے۔ وَباللہ التوفیق۔ لیکن جبکہ آمین بالجہر سے لڑائی جھگڑے کا خوف و خدشہ ہو تو پھر چپکے کہنا مصلحت ہے۔ واللہ اعلم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

البقرہ — اٰیاتھا - ۲۸۶

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

موضح قرآن میں کہا کہ اللہ کریم نے یہ سورت بندوں کی زبان میں نازل فرمائی کہ وہ اس طرح کہا کریں۔

یہ سورت مدتوں مدینے میں نازل ہوتی رہی سب سے پہلے مدینہ میں یہی سورت نازل ہوئی لیکن یہ آیت ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ﴾ "کہ اس دن سے ڈر جاؤ جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔" یہ تمام قرآن کے بعد یوم النحر کو حجۃ الوداع میں منیٰ کے مقام پر نازل ہوئی اور سود کی آیت کو بھی آخری نازل ہونے والی آیات میں شمار کیا گیا ہے۔ اس سورت کی فضیلت میں صحاح و سنن میں بہت سے احادیث وارد ہیں۔ ان میں سے کچھ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تفسیر میں مذکور ہیں ان احادیث میں سے کچھ آیۃ الکرسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ بعض خواتیم سورۃ بقرہ کے متعلق ہیں۔ بعض اس سورت اور آل عمران کی فضیلت میں مذکور ہیں۔ بعض میں صرف سبع طوال کی فضیلت کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس سورت کی دو سو چھیاسی یا ستاسی آیات ہیں۔ چھ ہزار دو سو اکیس کلمات ہیں اور پچیس ہزار پانچ سو حروف ہیں۔ واللّٰہُ اَعْلَمُ

ابن العربی نے فرمایا: اس میں ہزار امر ہزار نہی ہزار اخبار اور ہزار حکم ہیں۔ حضرت خالد بن معدان نے اس کا نام فسطاط القرآن رکھا تھا۔ اس سورت کو اخذ کرنا باعث برکت اور ترک کرنا موجب حسرت ہے۔ اور جادوگر اس کو حاصل نہیں کر سکتے۔ وللہ الحمد و اعنہ.

الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

الٓمّٓ. یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں (کہ کلام اللہ ہے، اللہ سے) ڈرنے والوں کی رہنما ہے۔ جو غیب پر ایمان لاتے اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جو کتاب (اے محمدؐ) تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تم سے پہلے (پیغمبروں پر) نازل ہوئیں سب پر ایمان لائے اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے پروردگار (کی طرف) سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں۔

الٓمّٓ محدثین کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ حروف مقطعہ قرآن کے اسرار ہیں۔ جیسا کہ ہر کتاب الٰہی میں کچھ اسرار ہیں۔ قرآن کے اسرار حروف مقطعہ ہیں اور یہ ایسے متشابہ ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ ہمیں صرف ان پر ایمان لانا واجب ہے ان میں بحث و تحقیق کی بالکل ضرورت نہ ہے۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے خلفائے اربعہ اور حضرت ابن مسعودؓ وغیرہ کا بھی موقف و مذہب یہی تھا۔ ابو حاتم نے فرمایا کہ ہم نے ایسے حروف صرف سورتوں کی ابتداء میں پائے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ان سے اللہ کی مراد کیا ہے۔ دوسرے گروہ نے ان حروف کے معانی اور کئی طرح کے مطالب بیان کیے جو سب تکلفات ہیں۔ رازی نے وہ اقوال ذکر کیے ہیں۔ اس متعلق سب سے زیادہ باریک بینی زمخشری معتزلی نے "تفسیر کشاف" میں کی جس میں سے امام شوکانی رحمہ اللہ نے کچھ فتح القدیر میں ذکر کیے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس متعلق بڑے اجمالی انداز میں روشنی ڈالی کہیں تو صرف اتنا اس بارے میں کہا کہ میں نہیں کہتا کہ الٓمّٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے۔ لیکن امت نے بلا مطلوب شارع اس میں بلا ضرورت طویل بحثیں کیں۔ جن میں تضیع اوقات کے سوا کچھ خیر الدنیا و الاخرہ نہ ہے۔ اس مسئلے کی مکمل بحث فتح البیان میں مذکور ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ ایک جماعت کہتی ہے کہ سورتوں کے ابتداء میں ایسے حروف استعمال کرنے سے قرآن کا اعجاز بیان کرنا مقصود ہے تاکہ مخلوق قرآن کی وجہ سے خود کو عاجز سمجھ لے کہ اس کے باوجود کہ یہ وہی حروف ہیں جن کے ساتھ وہ باہم دن رات خطاب کرتے ہیں۔ مگر ان کو ایسی ترکیب نہیں دے سکتے۔ رازی نے کہا کہ مبرد اور ایک محققین کی جماعت کا مذہب یہی ہے۔ اسی کو قرطبی نے بھی فراء اور قطرب سے حکایت کیا ہے۔ اور کشاف میں اس کی تائید کی ہے۔ اور ہمارے شیخ امام ابو العباس بن تیمیہ اور حافظ مجتہد ابو الحجاج مزی بھی اسی طرف گئے ہیں۔

﴿ذَالِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيهِ﴾ "اس کتاب میں کچھ شک نہ ہے۔" اس مقام پر کتاب سے یہی کتاب اللہ مراد ہے۔ جس کو قرآن کریم فرقان عظیم کہا جاتا ہے۔ اس کے سوا دس اور بھی اقوال ہیں جن میں سے صحیح ترین یہی قول ہے کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں ہے، اور یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے اور سراپا حق و صدق ہے، اللہ کریم نے فرمایا: ﴿الٓمٓ تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ لَارَيْبَ فِيهِ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ "کہ یہ کتاب اللہ رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔" اس میں کوئی شک نہیں ہے، ریب کے معنی شک کے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے کہا مجھے اس معانی میں کسی کا خلاف معلوم نہ ہے، مطلب یہ ہے کہ اس میں شک و شبہ نہیں ہے، گویا یہ خبر بمعنی نہی ہے۔ ریب کے ایک معنی تہمت کے بھی ہیں، حدیث پاک میں ہے شک ریبت اور صدق طمانیت ہے۔ قرطبی

نے فرمایا کہ اس نفی عام کے معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب کسی طرح شک و شبہ کے لائق نہیں ہے، اس کی دلالت واضح ہے جو کہ روشن دلیل کے مقام پر ہے، جو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس میں کوئی شک راہ نہ پائے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ "متقین کو راہ بتاتی ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ یہ کتاب فی نفسہٖ ہدایت ہے لیکن اصل میں اس سے متقین ہی ہدایت حاصل کرنے والے ہیں۔ جنکو اللہ کا ڈر ہے لیکن جو لوگ بے خوف ہیں انہیں اس کتاب سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا ٥ ﴾ "اور ہم کلام پاک سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو شفاء ہے اور مومنین کے لیے رحمت ہے، اور وہ ظالموں کو نہیں زیادہ کرتی مگر نقصان میں۔" ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَآءٌ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى أُولَٰئِكَ يُنَادَوْنَ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ ٥ ﴾ "فرما دیجئے! کہ وہ ایمان والوں کے لیے ہدایت اور شفاء ہے اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور یہ ان پر اندھا جو گیا ہے، یہی لوگ ہیں جن کو دور مقام سے پکارا جاتا ہے۔" ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴾ کہ "اے لوگو! تحقیق تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آچکی اور وہ اس چیز کے لیے شفاء ہے جو سینوں میں ہے اور وہ مومنین کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔" معلوم ہوا کہ جو لوگ کلام پاک کو حکمت و نصیحت و شفاء اور ہدایت و رحمت نہیں سمجھتے وہ ہدایت سے محروم ہیں اور ایمان سے خالی ہیں۔ سو جب ایمان نہ ہوا تو تقویٰ بھی ختم ہو گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے فرمایا کہ یہ اہل تقویٰ کے لیے نور ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا متقی وہ مومن ہیں جو شرک سے بچتے ہیں اور اطاعت پر عمل کرتے ہیں دوسرا لفظ یہ ہے کہ وہ ترک ھدی پر اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور قرآن کی تصدیق پر رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ کلبی نے فرمایا متقی وہ لوگ ہیں جو کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں۔ اعمش نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ کسی نے کہا متقی وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اس کے بعد آتا ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، (آخر تک) حضرت جریر نے فرمایا کہ آیت کے معنی ان سب کو شامل ہیں اور عطیہ سعدی کی حدیث میں مرفوعاً آتا ہے کہ بندہ تب تک متقی نہیں ہوتا جب تک کہ وہ خوف والی چیز سے بچنے کے لیے بے خوف کی چیز کو بھی ترک نہ کر دے۔ [بروایت ترمذی و ابن ماجہ] امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تقویٰ کے شرعی معنی یہی ہیں ان کی طرف رجوع کرنا واجب ہے۔ اس حدیث کو احمد و عبد بن حمید اور بخاری نے تاریخ میں اور ابن ابی حاتم و بیہقی وغیرہ نے روایت کیا

ہے۔اور اس کو ترمذی نے حسن کہا جبکہ حاکم نے صحیح قرار دیا۔اس حدیث کے ہوتے ہوئے تقویٰ کی ان تعریفوں کی طرف جانے کی حاجت نہ ہے جو احباب نے اپنی عبارتوں میں بیان کی ہیں۔گو کہ ان کی تعاریف میں کچھ حرج نہ ہے لیکن آفتاب کے سامنے شمع وچراغ بے فائدہ ہے۔ہدایت سے کبھی ایمان مراد لیتے ہیں۔سو دل میں ایمان پیدا کرنا اللہ کے سوا کسی سے ممکن نہیں کہ اس کا وقوع عمل میں آئے۔فرمایا:﴿اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ ﴾کہ جسے آپؐ چاہیں اس کو ہدایت نہیں دے سکتے۔اور فرمایا:﴿ لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰٮهُمۡ﴾"کہ آپؐ کے ذمہ ان کو ہدایت دینا نہ ہے۔"اور فرمایا:﴿مَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ ﴾"کہ جس کو اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت کرنے والا نہ ہے۔"اور فرمایا:﴿مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرۡشِدًا﴾"کہ جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے جس کو وہ گمراہ کر دے تو آپؐ اس کے لیے کوئی ہدایت دینے والا ساتھی نہ پائیں گے۔"کبھی ہدایت سے بیان حق مراد لیا جاتا ہے یعنی حق کو کھول کر بیان کرنا اس کی طرف رہنمائی کرنا۔جیسے اللہ کریم نے فرمایا:﴿وَاِنَّكَ لَتَهۡدِىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ﴾"کہ بلا شبہ آپ سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔"اور فرمایا:﴿ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ﴾"کہ آپ صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کا ایک رہنما ہوتا ہے۔"اور فرمایا:﴿وَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَهَدَيۡنٰهُمۡ فَاسۡتَحَبُّوا الۡعَمٰى عَلَى الۡهُدٰى ﴾"کہ جو ثمود تھے تو ہم نے ان کو ہدایت دی پھر انہوں نے ہدایت پر اندھیرپن کو پسند کر لیا۔"اور فرمایا:﴿وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ﴾"کہ ہم نے اس کو دونوں راستوں کی ہدایت دی۔"راجح بات یہ ہے کہ اس مقام پر نجدین سے خیر و شر مراد ہیں۔حضرت عمر بن خطابؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ فرمایا: کبھی تم خار دار راستے پر چلے ہو۔فرمایا: جی ہاں۔کہا: پھر؟ آپ نے کہا: دامن اٹھا کر الگ الگ ہو کر چلا۔فرمایا یہی تو تقویٰ ہے۔حضرت ابو امامہ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ اللہ کے تقویٰ کے بعد انسان نے نیک بیوی سے بڑھ کوئی چیز نہ پائی کہ جب وہ اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور جب وہ اسے حکم دے تو اس کو بجالائے اور جب وہ قسم کھائے تو اس کو سچا کر دے اور جب اس کے پاس سے کہیں چلا جائے تو اس کے مال میں اور اپنی جان میں خیر خواہی کرے۔[بروایت ابن ماجہ]

﴿اَلَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ ﴾"جو یقین رکھتے ہیں غیب پر۔"یہ متقین کا وصف ہے کہ وہ بغیر دیکھے ایمان لاتے ہیں۔ایمان تصدیق کو کہتے ہیں۔یعنی دل سے کسی بات کو سچا جان لینا کسی نے کہا کہ اس مقام پر ایمان سے ڈر مراد ہے۔ابن جریر نے کہا اولیٰ یہ ہے کہ وہ لوگ قول اعتقاد اور عمل ہر چیز میں ایمان بالغیب سے متصف ہیں۔پھر

کبھی اللہ کا خوف بھی ایمان میں شامل ہو جاتا ہے۔ یعنی اس ایمان میں داخل ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ قول کی تصدیق عمل سے کرے ایمان ایک ایسا جامع لفظ ہے جو ایمان باللہ و بالرسل اور اقرار القول بالفعل کو شامل ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ لغت میں ایمان کا لفظ محض تصدیق پر بولا جاتا ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ ''کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور مومنین کی بات پر بھی تصدیق کرتا ہے۔'' اور جیسے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد سے کہا تھا: ﴿وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِيْنَ﴾ ''کہ اے ابا جان! اگرچہ ہم سچے بھی ہوں لیکن آپ ہماری تصدیق کرنے والے نہیں ہیں۔'' اسی طرح جب یہ اعمال کے ساتھ آتا ہے تو تصدیق کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ ''کہ مگر وہ لوگ جنہوں نے دل سے یقین کر لیا اور نیک اعمال کیے۔'' اور جب مطلقاً استعمال ہوتا ہے تب بھی یہ بغیر اعتقاد قول و عمل کے نہیں ہوتا بلکہ ایمان کی شرعی تعریف و تقاضا ہی یہی ہے۔ جمہور ائمہ کا یہی مسلک ہے بلکہ امام شافعی ،امام احمد اور ابو عبیدہ نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ ایمان قول و عمل سے بڑھتا اور کم ہوتا ہے اور اس باب میں کئی احادیث و اقوال منقول ہیں۔ جن کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے شرح صحیح بخاری کے ابتداء میں علیحدہ نقل کر دیا ہے۔ جس نے اس مقام پر ایمان سے خشیت مراد لیا ہے اس کی دلیل یہ ہے جو اللہ کریم نے فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ﴾ ''کہ بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈرتے ہیں۔'' اور یہ فرمان: ﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ﴾ ''کہ جو رحمٰن سے ڈر گیا، غیب کی حالت میں اور وہ رجوع کرنے والا دل لے کر آیا۔'' اور یہ خشیتِ ایمان و علم کا خلاصہ ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ ''کہ بلا شبہ اللہ سے اس کے علماء بندے ہی ڈرتے ہیں۔'' پھر دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا: ﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ﴾ ''کہ یہ اس کو ملے گی جو اپنے رب سے ڈر گیا۔'' معلوم ہوا کہ جنت علماء کا ٹھکانا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس جگہ غیب سے کیا مراد ہے؟ کسی نے تو یوں وضاحت کی کہ اس سے مراد اللہ کی ذات، فرشتوں کا وجود، کتابوں کی حقانیت، رسولوں کی رسالت، جنت اور جہنم کا تصور، وجود اور اللہ کی ملاقات مراد ہیں کہ وہ لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد (یقیناً) دوبارہ اٹھیں گے۔ یہ سب ایمان بالغیب میں داخل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ غیب وہ ہے جو اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ کسی نے قرآن مراد لیا ہے، کسی نے کہا کہ جو اللہ کی ذات پر ایمان لایا گویا وہ غیب پر ایمان لایا۔ کسی نے غیب سے اسلام مراد لیا ہے۔ کسی نے کہا: قضاء و قدر مراد ہے۔ یہ تمام معانی ملتے جلتے ہیں اور تمام ہی ایمان بالغیب کی اقسام ہیں ان سب پر ایمان لانا واجب

ہے۔ابو جمعہ فرماتے ہیں کہ ایک صبح ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھایا اور ہمارے ساتھ ابو عبیدہ بن الجراح بھی تھے۔انہوں نے کہا:اے اللہ کے رسول!کیاہم سے کوئی بہتر بھی ہے جب کہ ہم آپؐ کے ساتھ ایمان لائے اور آپؐ کے ساتھ مل کر جہاد کیا؟ فرمایا:ہاں!ایک قوم ہے جو تمہارے بعد آئے گی اور مجھ پر بغیر دیکھے ایمان لائے گی۔[بروایت امام احمد] دوسرا لفظ اس مضمون کا یوں ہے کہ ہم نے کہا اے اللہ کے رسول! ﷺ کیا کوئی قوم ہم سے اجر میں زیادہ ہو گی؟ ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپؐ کی پیروی کی۔ فرمایا: تمہیں اس چیز (ایمان) سے کون منع کرتا ہے جبکہ تم میں (میں) رسول اللہؐ (بذات خود) موجود ہیں۔ ہر وقت آسمان سے وحی آتی رہتی ہے۔ تمہارے بعد ایک قوم آئے گی ان کو دو لوح کے درمیان ایک کتاب ملے گی وہ اس کی تصدیق کرے گی اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کرے گی۔ان کا اجر تمہارے اجر سے دو چند زیادہ ہو گا۔[بروایت ابن مردویہ] اور اس مقام پر کتاب سے مراد کلام پاک ہی ہے اور اس حدیث مبارکہ سے یہ بھی مسئلہ اخذ ہوتا ہے کہ وجادت (جو کہ علم کی ایک قسم ہے) پر عمل کرنا جائز ہے۔ فتح الباری میں لکھا ہے کہ صحابیت کے اعزاز و فضیلت کی کوئی دوسری چیز برابری نہیں کر سکتی ہے انہوں نے تو رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے۔ صرف اجر کی زیادتی سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ غیر صحابہ صحابہؓ پر افضل ہوں۔اس لیے کہ اجر کی کمی بیشی عمل کے سبب سے ہوتی ہے اور صحابیت کے اعزاز سے بڑھ کر کوئی عمل خیر نہیں۔اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کا لفظ یہ ہے کہ مجھے ایمان کے لحاظ سے وہ لوگ بہت پسند ہیں جو تمہارے بعد آئیں گے۔انہیں دو لوح کے درمیان ایک کتاب ملے گی وہ اس چیز پر ایمان لائیں گے جو ان صحف میں ہو گا۔[بروایت ابن عرفہ] ابو حاتم نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند میں مغیرہ بن قیس منکر حدیث راوی ہے لیکن اسی مضمون سے ملتی جلتی حدیث جسے ابو یعلی،ابن مردویہ اور حاکم نے محمد بن حمید کی حدیث سے روایت کیا ہے۔حاکم نے اس کو صحیح کہا۔ان احادیث میں متبعین کتاب و سنت کے لیے بشارت ہے۔ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ دیکھا نہ ہے لیکن قرآن پر ایمان لائے ہیں اور اس کے موافق عمل کرتے ہیں۔لغت میں غیب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو نظر سے پوشیدہ ہو۔ کسی نے کہا یہاں غیب سے مراد دل ہے وہ دل کی تصدیق کرتے ہیں یعنی اس کتاب حمید کو سچے دل سے قبول و تسلیم کرتے ہیں۔ کسی نے کہا غیب وہ چیز مراد ہے جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے لیکن وہ عقل سے دریافت نہیں ہو سکتی۔ جیسے علامات قیامت،عذاب قبر،حشر و نشر، صراط، میزان ، جنت اور جہنم یہ سب کچھ غیب کے تحت داخل ہے۔حدیث جبریلؑ میں ایمان شرعی کی یہی تعریف بیان کی گئی ہے۔ فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تو اللہ کی تصدیق کرے اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں، یوم

آخرت پر اور تقدیر کی خیر و شر پر ایمان لائے۔ یہ حدیث بخاری شریف میں والقدر خیرہ وشرہ کے الفاظ سے مذکور ہے۔ حدیثِ نزیلہ بنت اسلم میں بذکر تحویل قبلہ یوں آیا ہے کہ جب صحابہؓ کو یہ خبر ملی کہ قبلہ تبدیل ہو چکا ہے تو انہوں نے نماز کی ہی حالت میں منہ کعبہ کی طرف پھیر لیے۔ جب آنحضرت ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا: ((أُولٰئِكَ قومٌ آمَنُوا بِالْغَيْبِ)) کہ یہ لوگ وہی قوم ہیں جو غیب پر ایمان لائے۔ [بروایت ابن ابی حاتم، طبرانی، ابو نعیم و ابن منده] حضرت عوفؓ بن مالک نے مرفوعاً فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کاش کہ میں اپنے بھائیوں سے ملتا صحابہؓ نے عرض کیا کیا ہم آپؐ کے بھائی نہ ہیں۔ فرمایا: ہاں ہو لیکن تمہارے بعد ایک قوم آئے گی جو مجھ پر تم جیسا ایمان لائیں گے اور تم جیسی تصدیق کریں گے اور تم جیسی مدد مجھے دیں گے۔ کاش میں ان سے ملتا اور ان سے ملاقات کرتا۔ [بروایت ابن ابی شیبه فی مسنده]

اس حدیث کے مکمل مصداق اہل حدیث گروہ ہے۔ ان کو رسول اللہ ﷺ نے اپنا بھائی کہا ہے۔ ان کی یہ پہچان بتائی ہے کہ ایمان و تصدیق اور نصرتِ نبوی میں صحابہؓ کی طرح ہوں گے سو یہ وصف صرف اہل حدیث میں ہی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ اسی طریقہ پر گامزن ہیں جس پر رسول مکرم اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین قائم تھے۔ احیائے سنت سے ہمیشہ دین کی مدد کرتے ہیں اور بدعات کے قلع قمع سے رسول اللہ علیہ السلام کے مددگار رہتے ہیں۔ وللہِ الحمد۔ حضرت ابو امامہ باہلی کا مرفوعاً لفظ یہ ہے کہ خوشی ہو اس شخص کے لیے جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا۔ اور سات دفعہ اس شخص کو خوشی ہو جس نے مجھے دیکھا نہیں لیکن مجھ پر ایمان لایا۔ [بتخریج احمد و طیالسی، بخاری فی تاریخه والحاکم] حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں اس ذات کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہ ہے۔ کوئی شخص ایمان بالغیب سے بڑھ کر کوئی ایمان نہ لایا پھر یہ آیت پڑھی: ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتَابُ﴾ اور ایمان بالغیب کے متعلق تابعین کے بہت سے اقوال ہیں جن میں سے راجح یہی ہے کہ شرعی ایمان ان سب مذکورات پر صادق آتا ہے۔ اعمال ایمان میں داخل ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں۔ ان میں سے افضل ((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)) کہنا ہے اور ادنیٰ ان میں سے راستے سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹانا ہے۔ اور حیاء ایمان کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا۔

﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ﴾ ''درست کرتے ہیں نماز کو۔'' یعنی ہمیشہ نماز کو اس کے وقت پر بغیر تاخیر کے اور اس کے تمام ارکان و سنن کو درست کر کے ادا کرتے ہیں۔ اور فرائض و حدود اور افعال نماز کو خلل پڑنے سے بچاتے ہیں۔ اصل اقامت کے معنی ہمیشگی اور ثابت رکھنے کے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جو شخص وقت پر نماز نہیں پڑھتا یا کسی وقت

کی چھوڑ دیتا ہے یا بے وقت پڑھتا ہے یا اس طرح نہیں پڑھتا جس طرح اس کا شرعی طریقہ ہے یا غفلت اور بے پرواہی سے نماز پڑھتا ہے وہ نماز کو قائم کرنے والا نہ ہے۔ بلکہ جان بوجھ کر ایک فرض نماز چھوڑنے سے کفر لازم آجاتا ہے۔ اگر توبہ سے قبل فوت ہو گیا یا مارا گیا تو مرتد مرا۔ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرنا چاہئے ۔لوگ دعویٰ تو ایمان واسلام کا کرتے ہیں لیکن اکثر نمازیں جان بوجھ کر چھوڑ دیتے ہیں یا تاخیر و غفلت سے پڑھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے انجام کا اللہ کو ہی علم ہے۔ خصوصاً عورتیں اس سلسلے میں کم پابندی کرتی ہیں۔ اگر چہ وہ جہنم میں زیادہ ہوں تو کیا تعجب ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس مقام پر نماز سے پانچوں نمازیں مراد ہیں ۔حضرت قتادہ نے فرمایا کہ محافظت سے مراد وقت وضو، رکوع و سجود کی محافظت ہے۔ کسی نے کہا اقامت سے مراد رکوع و سجود اور خشوع و تلاوت مراد ہے۔ بہر کیف ان تمام اقوال کا ماحصل یہ ہے کہ اس طرح نماز پڑھے جس طرح رسول اللہ ﷺ کو پڑھتے دیکھا یا جیسا کہ حدیث مبارکہ میں مذکور ہوا۔ فرمایا: ((صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّيْ)) اس طرح کی نماز میں رفع الیدین، آمین بالجھر، سینے پر ہاتھ باندھنا، جلسہ استراحت کرنا، رکوع کے بعد کچھ اعتدال کرنا وغیرہ سب شامل ہیں۔ ان تمام تراکیب کو "مسك الختام شرح بلوغ المرام" میں لکھا گیا ہے۔ اور رسالہ "حقیقة الصلوة" میں نماز کے مطلب کو بڑے خوبصورت پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے۔ جو مطالعہ کے قابل ہے۔ ﴿وَمِمَّا رَزَقْنَا هُمْ يُنفِقُونَ ﴾ "اور جو ہم نے ان کو دیا اس سے خرچ کرتے ہیں۔" یعنی راہِ للہ میں صدقہ کرتے ہیں رزق سے مراد جو معنی جمہور کے نزدیک ہے وہ یہ ہے کہ رزق ہر وہ چیز ہے جو نفع کی حقدار ہو وہ حلال ہو یا حرام ہو۔ لیکن معتزلہ اس بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں وہ صرف حلال مال کو رزق کہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ حرام کو دینا، دلانا یا کھانا بہت گناہ ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ رزق کے شمار سے باہر ہے۔ اور کچھ خرچ کرتے ہیں سے یہ بھی پتا چلا کہ اسراف و تبذیر بُری چیز ہے۔ اور اللہ کی رضا کے خلاف مال خرچ کرنا بڑا گناہ ہے ۔ایسے لوگوں کو قرآن کریم میں اخوان الشیاطین کہا گیا ہے۔ یہ معاملہ ایسے امراء میں جو بخیل نہیں ہوتے زیادہ پایا جاتا ہے۔ رؤساء میں سے کچھ اسراف و تبذیر سے ہلاک ہوئے تو کوئی بخل کی وجہ سے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا اس سے زکوٰۃ کی ادائیگی مراد ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اس سے مراد اہل خانہ پر خرچ کرنا ہے۔ ابن جریر نے اس کے معانی کو عام قرار دیا جو فرائض و نوافل صدقات و خیرات و زکوٰۃ کو شامل ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اللہ کریم نے نماز اور صدقات کی ادائیگی کو بہت مقامات پر اکٹھا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ نماز عبادت ہے اور اللہ کا حق ہے اور یہ عبادت توحید الٰہی و ثناء و تمجید اور دعا و اظہار عاجزی و توکل پر مشتمل ہے۔ اور انفاق فی سبیل اللہ مخلوق کے

ساتھ احسان ہے اور یہ نفع بڑھنے والا ہے اور اس احسان کے زیادہ تر لائق قرابت والے ہیں پھر اجانب کا حق ہے ۔کیونکہ: ،،اول خویش بعدہ درویش مقولہ،، مشہور ہے۔اسی لیے تمام نقصان واجبہ اور زکوۃ مفروضہ اس میں شامل ہیں۔اسی لیے صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے:

- ایک اس بات کی گواہی دینا کہ ((لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ))
- دوسرے نماز قائم کرنا۔
- تیسرا زکوۃ ادا کرنا۔
- چوتھا روزے رکھنا۔
- اور پانچواں بیت اللہ کا حج کرنا۔

ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس باب میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ﴾ ”اور جو یقین کرتے ہیں اس چیز پر جو آپؐ پر نازل ہوا۔“ اس سے مراد قرآن اور تمام شریعت اسلام ہے۔ قرآن کے اترنے کا مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام نے اس کو آسمان پر سنا اور جوں کا توں رسول اللہ ﷺ کو سنا دیا۔اس کو آسمانوں سے زمین تک لے آئے اس سے قدرت الٰہیہ کا علو و فوق واضح ہوا۔اور قرآن کا کانوں سے سنا جانا، زبانوں سے پڑھا جانا، سینوں میں محفوظ ہونا، مصحفوں پر لکھا جانا یا حرف و صوت کا ہونا ثابت ہے۔اور کلام اللہ کے یہ تمام اوصاف کلام اللہ اور حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوئے۔﴿وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ ”اور اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپؐ سے پہلے نازل ہوا۔“ یعنی جو دوسرے رسولوں پر اترا جیسے: صحف ابراہیم، زبور داؤد پر، تورات موسیٰ پر، انجیل عیسیٰ پر، وغیرہ۔ان سب پر اجمالی ایمان لانا فرض عین ہے۔

صحابہؓ کی ایک جماعت نے کہا کہ ان سے مراد اہل کتاب کے مومنین ہیں جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَاِنَّ مِنْ اَھْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ﴾ ”اور اہل کتاب میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس چیز پر جو تمہاری طرف نازل ہوا، اور جو ان کی طرف نازل کیا گیا۔“ دوسری جگہ فرمایا:﴿وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ﴾ ”اور وہ لوگ جن کو ہم نے ان سے پہلے کتاب دی وہ اس کے ساتھ ایمان لانے والے ہیں۔“ جس طرح کہ پہلی آیت سے مومنین عرب مراد تھے۔کسی نے کہا کہ یہ آیت تمام مومنین کے لیے ہے خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، جنی ہو یا انسی، اہل کتاب سے ہو یا مسلمان ہو۔امام شوکانی رحمہ اللہ نے اسی بات کو راجح قرار دیا ہے۔پھر فرمایا: دیکھئے کہ اللہ کریم نے ان دونوں چیزوں پر

ایمان لانے والوں کی کئی مقامات پر تعریف فرمائی ہے۔ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ﴾ "کہ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو ان کے رسول پر اتری اور اس کتاب پر بھی جو ان سے پہلے نازل ہوئی۔" دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ﴾ "کہ ہم اس چیز کے ساتھ ایمان لائے جو ہماری طرف نازل کی گئی، اور جو تمہاری طرف نازل کی گئی۔" ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ یعنی "رسول اس چیز پر ایمان لائے جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل کیا گیا اور ایمان والے بھی۔ ہر کوئی اللہ پر اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان لایا ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔" چوتھے مقام پر فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ "اور وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہ کیا۔" حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ اگرچہ یہ آیت سارے مومنین کو شامل ہے مگر اہل کتاب کے مومنین کو ایک یہ خصوصیت حاصل ہے کہ جب وہ اپنی ہر مفصل ایمان لانے کے بعد مسلمان ہو جائیں اور اس قرآن پر بھی مفصل ایمان لائیں تو ان کو دوہرا اجر ہو گا۔ کیونکہ غیر اہل کتاب کا پہلی کتابوں پر مجمل ایمان ہے۔ لیکن بہت سے عرب ایسے بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کا ایمان اتنا کامل و اکمل ہو کہ اہل کتاب میں سے کسی کے دوہرے اجر سے اس کا اکہرا اجر بڑھ جائے۔ ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ﴾ "اور وہ آخرت کا یقین رکھتے ہیں۔" یعنی جتنے کام اس دن ہوں گے سب برحق ہیں جیسے بعث، حشر و نشر وغیرہ۔ ان سب کی تصدیق کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں جانتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ متقین کا وصف ہے کہ وہ آخرت کے ایمان کو ایمان و اسلام کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ جبکہ اہل کتاب اس ایمان کے سلسلے میں کمزور ہیں چہ جائیکہ وہ یقین کے درجے کو پہنچیں۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اس جگہ آخرت سے مراد بعث، قیامت، جنت و نار، حساب و میزان ہے۔ وہ دن دنیا کے بعد آئے گا اس لیے اس کا نام آخرت کا یوم آخر ہے۔ ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ "انہوں نے اپنی رب کی ہدایت پائی ہے۔" راہ سے مراد نور یا استقامت یا بیان یا برہان یا بصیرت و توفیق یا سیدھی راہ مراد ہے بلکہ تمام معانی مراد ہو سکتے ہیں۔ اس جملہ میں متقین کے حالات کی خبر دی گئی ہے کہ وہ کمال استعداد اعمال صالحہ و ترک محرمات کی برکات سے سیدھی راہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ "اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔" یعنی دنیا و آخرت میں فلاح پانے والے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ اپنے مدعا و مطلوب میں کامیاب ہوئے اور جس چیز سے ڈرتے تھے اس سے امن میں ہو گئے کسی نے کہا کہ جنت کو پالیا اور جہنم سے بچ گئے۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے کہا اے اللہ کے پیغمبر علیہ السلام ہم بعض دفعہ قرآن پڑھتے ہیں تو ہمیں کچھ امید بندھتی ہے لیکن بعض دفعہ ناامیدی آگھیرتی ہے۔ فرمایا کیا میں تمہیں جنت اور دوزخ والوں کی خبر نہ دوں۔ کہا: ہاں۔ فرمایا: الٓمٓ سے لے کر مُفۡلِحُوۡنَ تک ذکر اہل جنت کا ہے۔ فرمایا: ہمیں امید ہے کہ ہم یہی لوگ ہوں گے۔ پھر فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾ جو لوگ کافر ہیں انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لیے برابر ہے۔

﴿ سے عَظِیۡمٌ ﴾ تک اہل نار کا ذکر ہے۔ فرمایا: یا رسول اللہؐ ہم یہ لوگ تو نہیں ہیں۔ فرمایا: تم درست کہتے ہو۔

[بروایت ابن ابی حاتم]

جو لوگ کافر ہیں آپ ﷺ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ لوگ ایمان نہ لائیں گے یعنی اللہ نے ان پر کفر کو لکھ دیا ہے خواہ کوئی انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ کسی طرح ایمان نہ لائیں گے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ حَقَّتۡ عَلَیۡهِمۡ کَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ وَلَوۡ جَآءَتۡهُمۡ کُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰی یَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ﴾ یعنی "بے شک وہ لوگ جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی وہ ایمان نہ لائیں گے۔ اگرچہ ان کے پاس ہر نشانی بھی آجائے، حتیٰ کہ وہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔" تیسرے مقام پر اہل کتاب کے مخالفین کے متعلق یوں فرمایا: ﴿وَلَئِنۡ اَتَیۡتَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوۡا قِبۡلَتَكَ﴾ کہ اگر آپ ﷺ اہل کتاب کے پاس ہر نشانی بھی لے آئیں تو بھی وہ آپ علیہ السلام کے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے۔ یعنی جس کو اللہ کریم بدبخت کر دے اسے کوئی (ہدایت سے) خوشبخت نہ کر سکے گا، اور جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت کرنے والا نہ ہے۔ پھر اے پیغمبر! آپ ان کی ایمان نہ لانے کی حسرت میں اپنے نفس کو ہلاک نہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تو فقط تبلیغ حق لازم ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے اس کی ذمہ داری آپ پر نہ ہے۔ کوئی ایمان لائے گا تو اپنے نفع کو لائے گا لیکن جو کفر کرے گا وہ آپ علیہ السلام کا کیا بگاڑ سکتا ہے ۔ آپ کیوں ان کے لیے پریشان ہوتے ہیں۔ آپ کا کام ابلاغ پیغام ہے۔ حساب لینا ہمارا کام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حرص رہتا تھا کہ سارے لوگ ایمان لے آئیں اور ہدایت کی پیروی کریں اور میرا کہا مانیں۔ اللہ کریم نے فرمایا ایمان تو وہ لاتا ہے جس کے متعلق تقدیر ازلی میں لکھا جا چکا ہے کہ وہ ایمان کی سعادت حاصل کرے گا۔ اور گمراہ بھی وہی ہوتا ہے جو علم ربانی میں بدبختی کے سپرد ہو چکا ہے۔ ابو العالیہ نے

کہا کہ یہ آیات لشکروں سے پیچھے رہنے والوں کے حق میں نازل ہوئیں۔ جن کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا:﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا و حَلُّوا قَومَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا﴾ یعنی "کیا آپؐ نے ان لوگوں کو نہ دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدلا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں جا گرایا۔ جہنم میں وہ داخل ہوں گے۔" علماء نے فرمایا: آیت عام ہے مگر معنی خاص ہیں۔اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا حالت کفر میں مرنا ثابت ہو چکا ہے۔اور اللہ کے علم میں ٹھہر چکا ہے۔اللہ کریم نے چاہا کہ لوگوں کو بتا دیں کہ ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کا یہ حال ہو گا لیکن متعین کسی شخص کو نہیں کیا۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝٧

کہ اللہ کریم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے،اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔

دل کان اور آنکھ کا ذکر اس لیے کیا کہ حصول علم کے ذرائع تین ہی ہیں: دل سے انسان سمجھتا ہے،کان سے سنتا ہے، آنکھ سے دیکھتا ہے،جب دل اور کان پر مہر لگ گئی اور آنکھ پر پردہ پڑ گیا تو اب نہ وہ ہدایت کو دیکھ سن سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ بعض اہل علم نے کہا کہ اس آیت میں اس چیز کی خبر دی گئی ہے کہ وہ حق بات سننے سے تکبر و اعراض کرتے تھے۔ابن جریر نے کہا یہ قول ٹھیک نہ ہے۔اس لیے کہ اللہ کریم نے تو یہ فرمایا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔امام زمخشری نے پانچ طرح ابن جریر کا رد کیا ہے مگر وہ سب وجوہ ضعیف ہیں۔اعتزال نے یہ اسے یہ جرأت دلائی کہ خدا کا مہر لگانا اس کے عقیدہ میں ایک برا امر ہے۔اگر وہ اس آیت میں غور کرتا کہ:﴿ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ "کہ جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا اور اس آیت میں غور کرتا:﴿وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ﴾ "اور ہم ان کے دل اور آنکھیں الٹ دیں گے۔" تو مذکورہ رد نہ کرتا اور یہ بات جان لیتا کہ اللہ کریم ان کے دلوں پر مہر لگا کر ان کے اور ان کے دلوں کے درمیان حائل ہو گیا ہے اور انہیں حق سے اندھا کر دیا ہے اور یہ حق کو ٹھکرانے کی پوری جزاء ہے۔قرطبی نے کہا کہ اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ اللہ کریم نے کافروں کے دلوں پر مہر لگانے کے ساتھ اپنے نفس کو موصوف کیا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ﴾ کہ "بلکہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا کفر ہے۔" پھر حدیث تقلیب قلب کا ذکر کیا پھر یہ دعا ذکر کی:((يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰى دِيْنِكَ)) اس کے بعد حضرت حذیفہ والی حدیث ذکر کی جس میں دلوں پر فتنوں کا پیش کیا جانا مذکور ہے۔یہ حدیث بخاری میں مذکور

ہے۔ابن جریر کہتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں مرفوعاً مذکور ہے کہ جب مومن شخص کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔اگر توبہ کرلی اور باز رہ گیا تو وہ زنگ دور ہو جائے گا اور اگر زیادہ گناہ کیے تو دل پر وہ نقطہ بڑھتا جاتا ہے۔حتی کہ مکمل دل سیاہ ہو جاتا ہے۔یہ وہی رَانَ ہے جس کا ذکر فرمایا کہ:﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ "کہ ہرگز (ایسا نہ ہے) بلکہ ان کے اعمال و مکاسب کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ پڑ گیا ہے۔" اس حدیث کو ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے۔اور نسائی نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔پھر ابن جریر نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب لگاتار دل پر گناہ آتے ہیں تو دل بند ہو جاتا ہے۔جب دل بند ہو گیا تو اس پر اللہ کی طرف سے مہر لگ گئی،جب مہر لگ گئی تو نہ وہاں سے کفر باہر آسکتا ہے نہ ایمان اندر جا سکتا ہے۔اور اس آیت مبارکہ کا یہی مطلب ہے۔غرضیکہ دل پر اور کان پر مہر لگتی ہے اور آنکھ پر پردہ پڑتا ہے۔جیسے فرمایا:﴿وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً﴾ "کہ اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔" حضرت مجاہد نے فرمایا: رین طبع سے ہلکا ہے اور طبع اقفال سے ہلکا ہے۔اقفال سب سے زیادہ سخت ہے۔رہا عذاب عظیم،سو اس جگہ اس سے مراد آخرت کا عذاب اور قیامت کا انجام ہے یا دنیا میں قتل و قید مراد ہے۔عذاب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو تکلیف دیتی ہے وہ کوئی چیز بھی ہو۔عظیم حقیر کی ضد ہے جیسے کبیر صغیر کی ضد ہے۔اس بنیاد پر عظیم کبیر سے بڑھ کر ہوا جس طرح کہ حقیر صغیر سے کمتر ہے۔پہلے چار آیات میں اللہ کریم نے خالص مومنین کا ذکر کیا پھر دو آیات میں خالص کافروں کا ذکر کیا ہے۔اب تیرہ آیات تک منافقین کا ذکر ہے یہ وہ گروہ ہے جو نہ ادھر کے ہیں نہ ادھر کے۔ظاہراً وہ مومنین کے موافق نظر آتے تھے جبکہ حقیقتاً کافرین کے ساتھی تھے۔اسی لیے اس تیسرے فرقے کے متعلق فرمایا:﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ "کہ بلاشبہ منافقین آگ کے نچلے طبقے میں ہوں گے۔" کیونکہ اس قسم کے لوگوں کا حال عموماً لوگوں پر مشتبہ رہتا تھا۔اس لیے بطور علامت چند اوصاف ذکر کر دیئے۔ہر وصف بذات خود ایک طرح کا نفاق ہے جن کا ذکر سورۃ براء،منافقین اور سورۃ نور میں ہوا ہے۔تاکہ تمام لوگ ان کا ذکر معلوم کر کے ان اوصاف قبیحہ سے بچتے رہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸

اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ ایمان نہیں رکھتے۔

یہ آیت مبارکہ عبداللہ بن ابی،معقب بن قشیر اور جد بن قیس اور ان کے ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی۔

اور یوم آخر سے مراد وہ وقت ہے جو ختم نہ ہو بلکہ ہمیشہ رہے اور ایسا دن قیامت کا دن ہے۔ اللہ نے ان سے بالکل ایمان کی نفی کر دی کہ وہ بالکل کسی بھی وقت ایمان نہ لائیں گے۔

يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ کہ وہ اللہ سے اور ایمان والوں سے دھوکہ کرتے ہیں۔

خُدَاعَ لغت میں بمعنی فساد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مفسدوں کے سے کام کرتے ہیں۔ گو کہ کسی مفسد کا فساد اللہ پر مخفی نہیں رہ سکتا ہے۔

وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ اور وہ صرف اپنے ہی نفس کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ شعور نہیں رکھتے۔

نفاق اسے کہتے ہیں کہ خیر ظاہر کرے لیکن شر چھپائے۔ اس نفاق کی دو اقسام ہیں ایک نفاق اعتقادی ہے جس میں یہ نفاق ہو اوہ دوزخ والا ہے۔ دوسرا نفاق عملی ہے، جو بہت بڑا گناہ ہے۔ ابن جریج نے کہا منافق وہ ہے جس کا قول فعل کے خلاف ہو اور جس کا پوشیدہ ظاہر سے مخالف ہو۔ مدخل کچھ ہو مخرج کچھ ہو، غائب کچھ ہو، حاضر کچھ ہو۔ منافقین کا حال مدینہ میں نازل ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ منافق مکہ میں نہ تھے۔ وہاں جو شخص مخالف ہوتا ناخوشی سے اظہار کفر کر دیتا۔ لیکن باطن میں مومن تھے۔ یعنی اپنی حالت واضح رکھتے تھے۔ یعنی دل کی خوشی سے کفر نہ کرتے بلکہ صرف مخالفت سے بچنے کے لیے اظہار کفر کر دیتے تھے۔ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے گئے یہاں کے انصار بت پرست تھے اور یہود اپنے پہلوں کے حال پر چلتے تھے۔ جب بدر کی لڑائی ہوئی تو عبداللہ بن ابی بن سلول اور حوالی مدینہ کے اعرابیوں نے نفاق کا اظہار کر دیا۔ یہ عبداللہ قبیلہ خزرج سے تھا۔ اللہ نے اہل ایمان کو آگاہ کر دیا کہ ان کے ظاہری حال سے دھوکہ نہ کھا جائیں وہ دل میں کافر ہیں۔ گو ظاہری طور پر ایمان کا عقیدہ ظاہر کریں۔ معلوم ہوا کہ بدکاروں کے متعلق کبھی خیر کا گمان نہ کرے۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ اس طرح خیال کرتے ہیں کہ جس طرح کفر کو چھپا کر اور ایمان کو ظاہر کر کے ہم نے لوگوں کو دھوکہ دیا ہے اسی طرح یہ فقرہ اللہ اور اہل ایمان کے سامنے بھی چل جائے گا اسی لیے اللہ کریم نے ان کے مقابلے میں فرمایا کہ تمہارا یہ قول تمہاری ہی جان کے لیے وبال ہوگا۔ اگرچہ تم نہ جانتے ہو، ان باتوں سے اللہ کی ذاتِ عظیم پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ نہ اس سے مومنین کا کچھ فساد ہوتا ہے۔ بلکہ چاند کا تھوکا منہ پر آئے گا۔ ابن جریج نے کہا ان کی دغابازی یہ تھی کہ ظاہر میں ((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)) کہہ کر اپنا جان و مال بچا لیتے تھے لیکن ان کے دل میں بتوں کی محبت تھی۔ قتادہ نے کہا منافق وہ ہے جو بد خلق ہے۔ دعویٰ کچھ ہو اور دل سے انکار کرے۔ قول و فعل میں تضاد ہو، دن کو کچھ حال اور رات کو کچھ حال ہو۔ کشتی کی طرح بے سہارا کہ جس طرف کی ہوا چلی اس طرف کو

بہہ پڑے۔((لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ))ابن سیرین نے کہاکہ سلف کے نزدیک اس آیت سے زیادہ خطرناک کوئی آیت نہ تھی۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ ان کے دلوں میں (کفر کا)مرض تھا۔اللہ نے ان کا مرض اور مَرَضًا............................ زیادہ کر دیا۔

مرض اس چیز کو کہتے ہیں جو آدمی کو حد صحت و تندرستی سے نکال دے۔ جیسے کوئی علت یانفاق یاکسی امر میں تقصیر ہو۔ بعض نے کہاکہ ہر درد کانام مرض ہے۔اس صورت میں یہ لفظ فساد عقیدہ کے لیے مجازی طور پر استعمال کیا گیاہے۔خواہ شک و نفاق ہویاانکار و تکذیب اور جس قدر اللہ کی دینی ودنیاوی نعمتیں آنحضرت پر زیادہ ہوتی جاتی تھیں اتناان کا مرض نفاق زیادہ ہوتا تھا۔یہ جملہ ان پر بدعاہے کہ تم اسی طرح شک و حسرت میں پڑے رہو۔ابن زید نے کہااس سے مراد مرضِ دین ہے۔مرضِ بدن نہ ہے۔ عکرمہ و طاؤس نے کہااس مرض سے مراد ریا ہے۔ کسی نے کہایہ مرض اسلام میں شک ہے۔اللہ کریم نے فرمایا:﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ﴾"پس وہ لوگ جو ایمان لائے پس ان کو زیادہ کیاایمان میں اور وہ خوش ہوتے ہیں،اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے تو انہیں گندگی پر گندگی میں زیادہ کرتے ہیں۔"یعنی شر پر شر اور ضلالت پر ضلالت بڑھتی جاتی ہے۔گویایہ جزاء جنس عمل سے ہے کہ جیسا کیاویسابدلہ پایا۔ان کے مقابلے میں یہ آیت ہے:﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتَاهُمْ تَقْوٰهُمْ﴾ "اور وہ لوگ جنہوں نے ہدایت حاصل کی تو انہیں ہدایت میں زیادہ کیااور ان کوان کا تقویٰ دیا۔"موضح قرآن میں فرمایاکہ ایک مرض یہ تھاکہ جس دین کودل نہ چاہتا تھاچار وناچار قبول کرناپڑا۔دوسرا مرض اور تکلیف یہ تھی جسے ان کے لیے بڑھادیاوہ یہ تھاکہ انہیں جہاد کا حکم دیااور جن سے خیر خواہی کرتے تھے ان سے لڑناپڑا۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ اور ان کے جھوٹ بولنے کے سبب ان کو دکھ دینے والا عذاب ہوگا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایاکہ جہاں کہیں قران میں لفظ اَلِيْمٌ آیاہے اس سے مراد مُوجعٌ ہے۔یعنی وہ عذابِ دردناک کہ جس کادکھ دل میں جاگھستاہے۔ جھوٹ یہ ہوتاہے کہ کسی چیز کا حال اصل ماہیت کے خلاف ظاہر کرے۔یہ حرام ہے کیونکہ اس کو عذاب کا موجب ٹھہرایاہے۔ان کا جھوٹ یہ تھاکہ حقیت میں مومن نہ تھے لیکن خود کو مومن کہتے تھے۔ابوالسعود نے کہاکہ وہ تبدیل و تحریف کرتے تھے۔

فائدہ: رسول اللہ ﷺ کواگرچہ بعض منافقین کے نفاق کے متعلق مطلع تھے لیکن ان کواس لیے قتل نہ

کیا کہ کہیں عرب یہ بات نہ کہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنا اصحاب کو قتل کرواتے ہیں۔ کیونکہ ان کو قتل کرنا تو کفر کی وجہ سے تھا لیکن بظاہر یہ گنوار انہیں مسلمان سمجھتے تھے۔ اور انہیں نبی علیہ السلام کا ساتھی سمجھتے تھے۔ وہ اس حکمت کو کیسے جانتے وہ تو مفت میں بدنام کرتے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے برے اعتقاد کے باوجود ان کے تالیف قلب کو لیتے دیتے تھے۔ اس کے سوا اور بھی کئی جواب ہیں جن کو ابن کثیر نے ذکر کیا ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ۝۱۱

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین فساد نہ ڈالو تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں، دیکھو یہ بلا شبہ مفسد ہیں لیکن خبر نہیں رکھتے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا کہ اس جگہ فساد سے مراد کفر اور گناہ ہے۔ جس نے زمین میں اللہ کی نافرمانی کی یا کسی معصیت کا حکم دیا تو گویا اس نے زمین میں فساد کیا۔ کیونکہ زمین کی اصلاح طاعت سے ہے۔ سلمان نے کہا: کہ جو لوگ اس آیت کے مصداق ہیں وہ ابھی نہیں آئے۔ ابن جریر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اس صفت سے موصوف لوگ ان سے زیادہ فسادی ہیں جو نبی علیہ السلام کے دور میں تھے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اس قسم کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہ تھے۔ پھر کہا کہ زمین میں زیادہ فسادی یہی اہل نفاق تھے۔ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں، زمین میں گناہ کرتے ہیں، دین میں شک کرتے ہیں، مومنین کے دعووں کو جھٹلاتے ہیں، اہل تکذیب کے مددگار ہیں اور خیال یہ کرتے ہیں کہ ملک و حال کی اصلاح کر رہے ہیں۔ ملک کا ایک فساد یہ بھی ہے کہ ایمان والے کافروں کے دوست بنے رہیں۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِیْرٌ﴾ "اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اگر تم ایسا (قانون) نہ رکھو گے تو زمین میں بڑا فساد اور فتنہ برپا ہوگا۔" اللہ کریم نے اس آیت میں مومن اور کافر کا باہم دوستی کا رشتہ کاٹ دیا۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ "کہ اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی نہ کرو۔" اس میں مومن کی کافر سے دوستی کی واضح ممانعت مذکور ہے۔ اور نہی کا فائدہ تحریم ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جو مسلمان کسی کافر کا دوست ہے اور سرے سے اس کا انکار نہیں کرتا ہے وہ حرام کا مرتکب ہے۔ وہ مسلمان مخلص نہ ہے بلکہ منافق خالص ہے۔ یہ دوستی زمین میں کوئی فتنہ فساد برپا کرے گی۔ اس دوستی کا نتیجہ آجکل ہر تجربہ کار پر واضح ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ جب ان سے کہیں کہ فساد نہ کرو تو جواباً کہتے کہ ہم تو مومنین اور اہل کتاب کے درمیان صلح

کراتے ہیں۔ اللہ کریم نے فرمایا جس کو یہ لوگ صلح کہتے ہیں وہی تو عین فساد ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح اور لوگ ایمان لے آئے تم بھی ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں بھلا جس طرح بیوقوف ایمان لے آئے ہیں اسی طرح ہم بھی ایمان لے آئیں؟ سن لو کہ یہی بے وقوف ہیں، لیکن نہیں جانتے۔

پہلی آیت میں منافقین کو فساد سے روکا گیا ہے اور اس میں انہیں ایمان کا حکم دیا گیا ہے اور یہاں لوگوں سے مراد صحابہ رضی اللہ عنہم اور انصار یا مہاجرین یا عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ہیں۔

فائدہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ زندیق کی توبہ قابل قبول ہے اور زبان سے اقرار کرنا بھی ایمان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے لوگ اللہ کی ذات، ملائکہ، کتب، رسل، بعث بعد الموت، جنت اور جہنم پر یقین لائے ہیں اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ۔ وہ جواب میں کہتے کہ کیا ہم ان لوگوں کی طرح ایمان لے آئیں یہ تو (نعوذ باللہ) احمق ہیں ۔سفیہ لغت میں جاہل ضعیف الرائے کو کہا جاتا ہے جو نفع و نقصان کو صحیح جانچ نہ سکتا ہو۔ اسی لیے اللہ کریم نے عورتوں اور بچوں کو سفہاء کہا ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا﴾ "اور بے وقوفوں کو اپنے وہ اموال نہ دے دو جن (اموال) کو اللہ نے تمہاری گذران زندگی کا سبب بنایا۔" علماء نے یہی تفسیر کی کہ اس مقام پر سفہاء سے عورتیں اور بچے مراد ہیں۔ اللہ نے جواباً فرمایا کہ وہ خود ہی احمق ہیں۔ اس سے بڑی حماقت کیا ہوگی کہ خود وہ اپنی جہالت کو بھی نہیں جانتے۔ ان سے بڑھ کر اندھا اور ہدایت سے دور کون ہوگا؟

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ﴿١٤﴾ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٥﴾

اور یہ لوگ جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں تو (ان سے) کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور (پیروان محمدؐ سے) تو ہم ہنسی کیا کرتے ہیں۔ ان (منافقوں) سے اللہ ہنسی کرتا ہے اور انہیں مہلت دیئے جاتا ہے کہ شرارت و سرکشی میں پڑے بہک رہے ہیں۔

یہاں شیاطین سے یہود و مشرکین کے رؤساء مراد ہیں۔ وہ علماء یہود و رؤساء کفر کے سامنے جا کر اپنا اتحاد ظاہر کرتے اور کہتے کہ ہم اور تم تو ایک ہیں ہم تو صرف مسلمانوں کو تمسخر بنانے جاتے ہیں۔ ان سے دل لگی کرتے ہیں ہم نے کونسا سچ مچ ایمان قبول کیا ہے۔ اللہ نے برابر ان کا جواب دیا کہ تم ان سے مذاق کیا کرتے ہو خود اللہ تم سے

مذاق کرتا ہے۔اور تمہاری گمراہی بڑھتی جاتی ہے اس مذاق کا صلہ تمہیں آخرت میں ملے گا۔اللہ کریم نے فرمایا: ﴿یَوۡمَ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا انۡظُرُوۡنَا نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِکُمۡ قِیۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَکُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا فَضُرِبَ بَیۡنَہُمۡ بِسُوۡرٍ لَّہٗ بَابٌ بَاطِنُہٗ فِیۡہِ الرَّحۡمَۃُ وَ ظَاہِرُہٗ مِنۡ قِبَلِہِ الۡعَذَابُ﴾ کہ ”جس دن منافق مرد وعورتیں مومنوں سے کہیں گے کہ ذرا دیکھو ہم بھی تمہارے نور سے روشنی لے لیں۔ کہا جائے گا پیچھے جاؤ پھر نور تلاش کرو پھر ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس کا دروازہ ہوگا اس دیوار میں رحمت پوشیدہ ہوگی اور سامنے سے عذاب ظاہر ہوگا۔“ دوسرے مقام پر فرمایا:﴿وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ خَیۡرٌ لِّاَنۡفُسِہِمۡ اِنَّمَا نُمۡلِیۡ لَہُمۡ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا﴾”کہ کافر یہ خیال نہ کریں کہ جو ہم ان کو ڈھیل دے رہے ہیں یہ ان کے لیے بہتر ہے بلکہ ہم تو ان کو اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں تاکہ وہ اور زیادہ گناہ کر لیں۔“گویا اس طرح کی آیات اللہ کی طرف سے مشرکین دغابازوں کے لیے مذاق و تمسخر ہے۔ بعض نے کہا کہ اللہ کا ان سے استہزاء یہ ہے کہ ان کو ڈانٹا ہے اور کفر و عصیان پر انہیں ملامت کی ہے۔ کسی نے کہا مراد یہ ہے کہ اس استہزاء کی ہم ان کو جزاء بصورت سزا دیں گے۔اول ظلم تھا، دوسرا عدل ہے۔ کسی نے کہا کہ جس طرح وہ اپنے شیطان ساتھیوں سے یہ فریب کی بات کہتے تھے کہ ہم تکذیب رسل میں تمہارے ساتھ ہیں۔ اس طرح اللہ نے ان کے ساتھ مذاق کیا کہ دنیا میں تو ان کا جان و مال محفوظ کر کے انہیں بظاہر امن دیا لیکن آخرت میں ان کے لیے سخت سزا و انجام ہوگا۔ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا اور اس کو قوی کہا کیونکہ لہو و لعب کی صورت میں اللہ کی طرف سے دھوکہ و فریب ممکن نہ ہے۔ مگر بطریق مقابلہ و انجام کار بر طریق عدل و جزاء کچھ منع بھی نہ ہے۔ بعض نے کہا جب یہ لوگ کوئی گناہ کرتے ہیں تو اللہ ان کو نئی نعمت دے دیتا ہے جو حقیقت میں نعمت ہے وہ راحت نہیں جراحت ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا:﴿فَلَمَّا نَسُوۡا مَا ذُکِّرُوۡا بِہٖ فَتَحۡنَا عَلَیۡہِمۡ اَبۡوَابَ کُلِّ شَیۡءٍ حَتّٰۤی اِذَا فَرِحُوۡا بِمَاۤ اُوۡتُوۡۤا اَخَذۡنٰہُمۡ بَغۡتَۃً فَاِذَا ہُمۡ مُّبۡلِسُوۡنَ فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا وَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾”پس جب وہ بھول گئے اس چیز کو جو انہیں یاد دلائی گئی تھی تو ہم نے ان پر آسمان سے ہر چیز کے دروازے کھول دیئے حتیٰ کہ جب وہ اس چیز پر خوش ہو گئے جو انہیں دی گئی تو ہم نے ان کو اچانک (عذاب میں) پکڑ لیا تو اچانک وہ ناامید ہو گئے۔ پس ظالموں کی قوم کی جڑ کاٹ دی گئی اور سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے فرمایا کہ بڑھانے سے مراد مہلت دینا ہے اور یہ مہلت ان کے لیے نقصان

دہ ہے کچھ فائدہ مند نہ ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِ مِن مَّالٍ وَبَنِينَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَل لَّا يَشْعُرُونَ﴾ "کیا خیال ہے ان کا کہ جو ہم ان کو مال واولاد میں فراوانی دے رہے ہیں (یہ ان کو نیکیوں میں جلدی کرنے کے اسباب ہیں) کہ ہم ان کے لیے خیرات میں جلدی کر رہے ہیں بلکہ وہ شعور نہیں رکھتے ہیں۔" اور اللہ کریم نے فرمایا: ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ﴾ "کہ عنقریب ہم ان کو وہاں سے آہستہ آہستہ کھینچیں گے جہاں سے وہ جانتے نہ ہوں گے اور میں ان کو ڈھیل دے رہاں۔ بلا شبہ میری تدبیر بڑی مضبوط ہے۔" ابن جریر نے کہا ٹھیک بات یہ ہے کہ ہم ان کو زیادہ مہلت اس لیے دے رہے ہیں تاکہ وہ سرکشی میں بڑھ جائیں۔ جس طرح فرمایا: ﴿وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ "اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو الٹ دیں گے جیسے وہ اس پر پہلی دفعہ ایمان نہ لائے تھے۔ اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں حیران چھوڑ دیتے ہیں۔" طغیان یہ ہے کہ کسی کام میں حد سے تجاوز کرے۔ جس طرح فرمایا: ﴿إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ﴾ "کہ جب پانی بکثرت آیا تو ہم نے تم کو چلنے والی میں سوار کر لیا۔" ابن عباس وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ طغیان سے کفر مراد ہے۔ ابن زید نے کہا ضلالت مراد ہے۔ بعض نے کہا کہ آنکھ کے کورے کو عمی اور دل کے کورے کو عمیہ کہتے ہیں۔ لیکن عمہ کی بجائے کبھی عمی بھی کہہ دیتے ہیں جیسے ایک مقام پر فرمایا: ﴿فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ "کہ بلا شبہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں لیکن وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ دل کے اندھے ہیں اور اپنا نقصان پہچان نہیں سکتے۔ اپنی چالاکی کو عقل سمجھ رکھا ہے۔ یہ عقل انہیں ایک دن جہنم کے پر خطر کھڈے میں جا پھینکے گی۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾	یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی تو نہ تو ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا اور نہ وہ ہدایت یاب ہی ہوئے۔

صحابہ کی ایک جماعت نے فرمایا کہ انہوں نے گمراہی لے لی اور ہدایت چھوڑ دی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایمان دے کر کفر خرید لیا۔ حضرت مجاہد نے فرمایا: ایمان لا کر بھی کافر ہوئے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ انہوں نے ہدایت پر گمراہی کو پسند کر لیا۔ جس طرح فرمایا: ﴿فَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى

الْهُدٰى﴾ ”کہ ثمودیوں کو ہم نے ہدایت دی لیکن انہوں نے ہدایت پر اندھے پن کو محبوب رکھا۔“ پھر حضرت قتادہ نے فرمایا: واللہ تم نے انہیں دیکھا کہ وہ راہ سے نکل کر گمراہ ہو گئے اور جماعت سے نکل کر تفرقہ بازی میں پڑ گئے۔ امن چھوڑ کر خوف میں جا گرے، سنت سے علیحدہ ہو کر بدعت میں پھنس گئے، اصل قیمت سے جو زائد وصول کی جائے وہ ربح ہے اور تجار کے آپس کے لین دین کو تجارت کہا جاتا ہے۔ سو انہیں اس تجارت میں نقصان ہوا، کوئی نفع نہ ہوا کیونکہ راس المال ایمان کو دے کر ضلالت کے معتقد ہوئے اور ہدایت سے بہک گئے۔

ہوئی شب کو واردات کچھ عجیب — کہ بوسہ لینے پر ہم جو اڑے

تو لبوں سے ملتے ہی لب جان دی — حسن اور لینے کے دینے پڑے

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے (شب تاریک میں) آگ جلائی، جب آگ نے اس کے اردگرد کی چیزیں روشن کیں تو اللہ نے ان لوگوں کی روشنی زائل کر دی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ (یہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں کہ (کسی طرح سیدھے رستے کی طرف) لوٹ ہی نہیں سکتے۔

یعنی اللہ کریم نے نبی ﷺ کے ذریعے دین کو روشن کیا مخلوق نے اس میں رہنمائی حاصل کی۔ منافق اس وقت اندھے رہے، آنکھ کی روشنی نہ ہو تو چراغ کیا کام کرے۔ کاش اگر کوئی خود اندھا ہو تو کسی کو پکارے یا کسی کی بات سنے اور جو بہرہ بھی ہو اور گونگا بھی ہو تو وہ کس طرح راہ پا سکتا ہے۔ منافقین کے پاس نہ عقل کی آنکھ ہے کہ آپ کو پہچانیں اور نہ کسی رہنما کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس کی رہنمائی کرے۔ اور نہ حق بات کو سنتے ہیں۔ ایسے شخص سے رجوع کی کوئی توقع نہ ہے۔ اس مثال میں اس پر دلیل ہے کہ وہ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے تھے۔ جس طرح اللہ کریم نے کئی مقامات پر فرمایا: ﴿ذَالِكَ بِأَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ ”کہ یہ اس لیے ہوا کہ وہ ایمان لائے پھر انہوں نے کفر کر دیا تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی پس وہ سمجھتے نہ ہیں۔“ امام رازی نے فرمایا: یہ تشبیہ نہایت درست ہے اس لیے کہ انہوں نے ایمان لا کر جو نور حاصل کیا تھا کفر و نفاق سے وہ بھی کھو دیا اور ایک بڑی حیرت میں پڑ گئے کیونکہ دین کی حیرانی سے بڑھ کر کوئی حسرت و حیرت نہ ہے۔ ابن جریر کا خیال یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان نہ لائے تھے۔ اس دلیل سے جو فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ ”کہ لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو

کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے حالانکہ وہ ایمان والے نہیں ہیں۔" لیکن یہ بات درست نہیں ہے اس لیے کہ اس آیت میں ان کے کفر و نفاق کا حال بتایا گیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس سے پہلے کبھی ایمان نہ لائے تھے بلکہ ان سے وہ ایمان لے کر ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی تھی۔ ان کو شاید آیت: ﴿ذَالِكَ بِأَنَّهُمُ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا﴾ یاد نہ ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو کچھ لوگ ایمان لائے اور پھر بعد میں منافق بن گئے۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص اندھیرے میں تھا، اس نے آگ سلگائی اور اس کی روشنی میں جو گندگی یا تکلیف دہ چیزیں تھیں وہ نظر آ گئیں اور اس نے وہ چیز پہچان لیں، جس سے خوفزدہ تھا۔ اچانک وہ آگ بجھ گئی۔ اب نہ یہ سمجھ آئی کہ کس چیز سے بچے اور کس سے نہ بچے۔ یہی حال منافق کا ہے کہ پہلے شرک کے اندھیرے میں پڑا تھا۔ اسلام لایا تو حلال و حرام اور خیر و شر کو پہچان لیا پھر کافر ہو گیا۔ اب وہ بھی کچھ نہیں پہچان سکتا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ نور سے ایمان مراد ہے جس کی بابت وہ بات چیت کرتے تھے اور ظلمت سے مراد کفر و ضلالت ہے۔ جس میں وہ پھنسے ہوئے تھے۔ یہ ایک قوم تھے جن کو نور ہدایت دینے کے بعد پھر لے لیا گیا۔ عطاء خراسانی نے فرمایا کہ یہ منافق کی مثال ہے جو کبھی تو دیکھتا پہچانتا ہے کبھی پھر اس کا دل اندھا ہو جاتا ہے۔ ابن زید نے کہا یہ منافقین کی مثال ہے کہ وہ پہلے تو ایمان لائے نور ایمان ان کے دل میں چمکا، جس طرح آگ سلگانے کے وقت روشن ہو جاتی ہے، پھر کافر ہو گئے تو اللہ ان کا نور ایمان لے گیا۔ جس طرح بجھنے کے بعد اب وہ اندھیرے میں پڑے ہیں اور کچھ سمجھ نہیں آتا۔ ابو العالیہ نے کہا کہ منافق جب کلمہ اخلاص لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتا ہے تو اس کا دل چمک اٹھتا ہے لیکن جب شک کرتا ہے تو پھر اندھیرے میں جا گرتا ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا یہ لوگ دنیا میں کلمہ پڑھ کر کھاتے پیتے نکاح کرتے اور اپنے جان و مال بچاتے ہیں۔ پھر جب مریں گے تو اللہ ان کو اندھوں کی طرح اندھیروں میں پھینک دیتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا ظلمات سے مراد مرنے کے بعد عذاب کا وجود ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ مرتے وقت ان سے ایمان لے لیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے دل میں ایمان کی کوئی اصل یا بنیاد نہ تھی۔ نہ ان کا عمل کچھ حقیقت رکھتا تھا۔ بلکہ دھوکہ تھا، اب قبر کے اندھیرے میں پڑے رہو وہ ایسے بہرے، گونگے اور اندھے ہیں کہ کبھی ہدایت کی طرف نہ آئیں گے، نہ اسلام لائیں گے نہ اپنے کفر و نفاق سے توبہ کریں گے۔ اور آگ سے مراد باطل کی آگ ہے۔ اس کی چمک کا ذکر اس لیے کیا کہ ہر باطل چیز کی چمک چند لمحات تو بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہے۔ پھر آخر مٹ جاتی ہے۔ عرب کی مثال ہے کہ:

« للباطل صولة ثم یضمحل»

علماء بلاغت نے کہا کہ ضرب المثل کا مقام مخفی کو واضح کرنے میں بڑا عالی ہے۔اس لیے اللہ کریم نے کلام پاک میں جگہ جگہ مثالیں اور کہاوتیں ذکر فرمائی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے وعظ و نصیحت میں اکثر مثالیں دیا کرتے تھے۔ابن جریر نے کہا کہ ایک جماعت کی مثال کبھی ایک شخص سے بھی ہو سکتی ہے جیسے اس میں فرمایا:﴿رَاَیْتَہُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ تَدُوْرُ اَعْیُنُہُمْ كَالَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْهِ مِنَ الْمَوْتِ﴾"کہ آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ جب وہ آپؐ کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھیں اس شخص کی طرح گھوم رہی ہوتی ہیں جس پر موت کی وجہ سے غشی طاری ہو۔"اور جیسے فرمایا:﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾"کہ حاملین توراۃ کی مثال ایسے ہے کہ جب انہیں تورات اٹھوائی گئی تو انہوں نے اس کو نہ اٹھایا مگر اس گدھے کی طرح جو بوجھ (بے فائدہ) اٹھائے ہوئے ہو۔"اور ضرب المثل سے کہنے والے کی بات سننے والے پر زیادہ اثر کرتی ہے اور اگر وہ کچھ بھی عقل و شعور رکھتا ہو تو بات سمجھ سکتا ہے۔لیکن اگر ہو ہی اندھا تو اندھے کے سامنے رونا گویا اپنی آنکھیں کھونا ہے۔اور مثل ہر زبان میں اپنا وجود خصوصی رکھتی ہے۔اور عربی، اردو ،فارسی سب زبانوں میں مستعمل ہوتی ہے۔علماء ادب نے اس کے متعلق خصوصی کتابیں لکھی ہیں جیسے:"امثال میدانی"،اور"خزینۃ الامثال"وغیرھما۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۰﴾

یا ان کی مثال مینہ کی سی ہے کہ آسمان سے (برس رہا ہو اور)اس میں اندھیرے پر اندھیرا (چھا رہا ہو)اور (بادل) گرج (رہا) ہو اور بجلی (کوندرہی) ہو تو یہ کڑک سے (ڈر کر) موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور اللہ کافروں کو (ہر طرف سے)گھیرے ہوئے ہے۔قریب ہے کہ بجلی (کی چمک) ان کی آنکھوں (کی بصارت) کو اچک لے جائے جب بجلی (چمکتی اور) ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کانوں (کی شنوائی) اور آنکھوں (کی بینائی دونوں) کو زائل کر دیتا، بلا شبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یعنی دین اسلام میں آخر میں تو سب نعمت ہی نعمت ہے گو اول میں کچھ محنت و زحمت ہو جیسے بارش میں کڑک

چمک تو ہوتی ہے لیکن اس کے نتیجے میں آبادی ہوتی ہے۔ سو جو منافق ہیں وہ پہلی سختی سے ہی ڈر جاتے ہیں انہیں سامنے سے آفت نظر آتی ہے جیسے بجلی میں کبھی اندھیرا اور کبھی روشنی ہوتی ہے اس طرح منافق کے دل میں کبھی اقرار اور انکار ہوتا ہے۔

فائدہ: اللہ کریم نے سورت کی ابتداء سے یہاں تک تین قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک مومنین مخلصین کا ذکر، پھر ان کافروں کا ذکر جن کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے جن کی قسمت میں ایمان لکھا ہی نہ ہے۔ تیسرے ان منافقوں کا ذکر کیا ہے جو بظاہر مسلمان نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کا دل ایک طرف نہیں ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ ایک اور مثال ہے جو اللہ کریم نے منافیقن کے متعلق بیان فرمائی یہ وہ قوم ہے جو کبھی حق کا اظہار کرتی ہے کبھی شک ظاہر کرتی ہے۔ ان کے دل ہمیشہ شک وتردد میں رہتے ہیں جیسے بارش ہو، ظلمات سے مراد شک وکفر ونفاق ہے اور رعد سے مراد خوف ہے۔ جو ہر وقت منافقوں کو گھیرے رہتا ہے۔ اور وہ دہشت و گھبراہٹ میں رہتے ہیں۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: یَحۡسَبُوۡنَ کُلَّ صَیۡحَۃٍ عَلَیۡہِمۡ۔ یعنی وہ ہر آفت کو سمجھتے ہیں کہ وہ انہیں پر آنے والی ہے۔ اور فرمایا: ﴿یَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰہِ اِنَّہُمۡ لَمِنۡکُمۡ وَمَا ہُمۡ مِّنۡکُمۡ وَلٰکِنَّہُمۡ قَوۡمٌ یَّفۡرَقُوۡنَ لَوۡ یَجِدُوۡنَ مَلۡجَاً اَوۡ مَغٰرٰتٍ اَوۡ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوۡا اِلَیۡہِ وَہُمۡ یَجۡمَحُوۡنَ﴾ ”کہ وہ اللہ کے نام کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں۔ حالانکہ وہ تم میں سے نہ ہیں، لیکن وہ ڈرنے والے لوگ ہیں اگر وہ کوئی پناہ گاہ یا غار (گڑھا) یا داخل ہونے کی کوئی جگہ (دیکھیں) پائیں تو رسیاں تڑاتے اس کی طرف بھاگیں گے۔“ برق سے مراد ایمان کی چمک ہے جو گاہے بگاہے ان کے دلوں میں روشن ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ وہ کڑک کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں لیکن اس سے بھلا کیا فائدہ۔ اللہ تو ہر طرف سے انہیں گھیرے ہوئے ہے۔ وہ اس کی قدرت ومشیت سے نکل کر کہاں بھاگ سکتے ہیں۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ تَکۡذِیۡبٍ وَّاللّٰہُ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ مُّحِیۡطٌ﴾ ”کہ بلکہ کافر تکذیب میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ انہیں پیچھے سے گھیرے ہوئے ہے۔“ ظلمات جمع ہے اس لیے کہ ایک تو رات کی تاریکی ہوتی ہے دوسری بادل کی تاریکی اور تیسری بارش کی تاریکی۔ رعد ایک فرشتے کا نام ہے جو بادل کو ڈانٹتا ہے، یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ رعد کیا چیز ہے۔ فرمایا: یہ ایک فرشتہ ہے جس کے ہاتھ میں آگ کے کوڑے ہیں جن سے وہ بادل کو اللہ کی مرضی کی طرف ہانکتا ہے۔ کہا یہ آواز کیا ہے، کہا یہ ڈانٹ ہے کہ بادل کو جہاں کا حکم ہے اس طرف جائے۔ کہا سچ فرمایا۔ (الحدیث)

اس کو ترمذی نے روایت کیا اس حدیث کی سند میں اگرچہ کچھ گفتگو ہے مگر جمہور اسی طرف گئے ہیں۔ فلاسفہ

وجہال متکلمین کا قول ہے کہ یہ رعد اجرام ابر کی گڑ گڑاہٹ ہے اور یہ پانی زمین کے بخارات ہیں اور ان بخارات کے ٹکرانے سے یہ بجلی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بالکل بے اصل بات ہے۔ ابن عباس نے فرمایا: رعد اس فرشتے کا نام ہے جو بادلوں کو ہانکتا ہے اور بجلی اس کوڑے کی چمک ہے۔ یہ نور کا کوڑا ہے جس سے وہ بادل کو ہانکتا ہے۔ اکثر صحابہ و جمہور علمائے شریعت یہی کہتے ہیں کہ برق ایک مخراق ہے۔ یعنی فرشتے کے ہاتھ میں پھاڑنے والا کوڑا ہے۔ جب وہ یہ چابک بادل پر مارتا ہے تو وہ بادل اللہ کے حکم کی جگہ پر متفرق ہو کر گرتا یا برستا ہے۔ صاعقہ آگ کا ایسا ٹکڑا ہے جو اس رعد فرشتے کے چابک سے شدتِ ضرب کے وقت جدا ہو کر گرتا ہے کسی نے کہا یہ آگ فرشتے کے منہ سے خارج ہوتی ہے۔ کسی نے کہا یہ نہیں بلکہ یہ رعد کی آواز کے وقت آسمان سے اترتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاعقہ اور رعد کی آواز سنتے تو یہ دعا پڑھتے: ((اَللّٰھُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُھْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذَالِكَ)) اسکو ترمذی نے روایت کیا اور اس کو غریب کہا ہے جو کہ حدیث صحیح کی ایک قسم ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ محکم قرآن منافقوں کے سارے عیوب بیان کر دے جب انہیں اسلام سے کچھ عزت افزائی ملتی ہے تو مطمئن ہو جاتے ہیں اور جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کافر ہونے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُنِ اطْمَاَنَّ بِهٖ﴾ "کہ لوگوں میں بعض لوگ ایک کنارے پر اللہ کی عبادت کرتے ہیں کہ اگر خیر ملے تو اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ میں نے ایک عیسائی نوجوان کو دیکھا کہ اس نے مسلمان بن کر قرآن پڑھنا شروع کیا، کئی ماہ تک یہ ہی کام کیا اسے امید یہ تھی کہ ریاست میں معقول تنخواہ پر نوکری مل جائے گی لیکن جب اتفاقاً ایسا نہ ہوا تو مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا۔ اکثر نو مسلموں کا یہی حال دیکھا سنا جاتا ہے کہ دنیا حاصل کرنے کے لیے مسلمان ہو جاتے ہیں لیکن جب تھوڑی سی رزق میں تنگی ہوئی تو پھر کافر ہو گئے۔ اس پر فتن دور میں اخلاص تو عنقاد کیمیا ہو گیا ہے۔ پرانے ایمان والوں میں یہ چیز کم ہے نئے ایمان والوں کا تو تذکرہ ہی کیا کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق کو پہچانتے ہیں تو استقامت ظاہر کرتے ہیں مگر جب کفر کی طرف جھکتے ہیں تو حیران ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ زیادہ ظاہر اور درست بات یہی ہے اور قیامت کے دن بھی ان کا یہی حال ہو گا۔ جب کہ لوگوں کو ان کے ایمان کے موافق نور دیا جائے گا۔ کسی کو کئی میل تک کسی کا اس سے کم کسی کو زیادہ۔ پھر کسی کا نور چمکے گا اور کبھی بجھے گا۔ کبھی کوئی ایک دفعہ پل صراط پر چلے گا پھر رک جائے گا کسی کا نور بالکل بجھ جائے گا ((اللھم لا تجعلنا منھم)) وہ خالص منافق ہوں گے جن کے حق

میں فرمایا:﴿يَقُوْلُ الْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ ((اِلٰی قوله))فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ﴾اور مومنین کے حق میں فرمایا: ﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ”کہ جس دن آپ مومنین و مومنات کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور دائیں طرف دوڑ تا ہو گا اور (کہا جائے گا) کہ تمہیں ان باغات کی خوشخبری ہو جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔“ اور اللہ کریم نے فرمایا: ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْلَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ ”کہ وہ دن جس دن اللہ نبیؐ اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہ کرے ان کا نور ان کے دائیں اور آگے کی طرف دوڑ تا ہو گا وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار! ہمارے لیے ہمارا نور مکمل کرنا اور ہمیں معاف کرنا بلاشبہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔“ اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی قدرت عام ہے کوئی بھی چیز ہو اور کیسی مشکل کیوں نہ ہو لیکن وہ ہر چیز کو بنانے پر قادر ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وقت کو حدوث دینے والا اپنے بقاء کے ساتھ حدوث کے وقت امکان میں بھی مقدورات میں داخل ہے۔ جبکہ معتزلہ کا خیال ہے کہ استطاعت فعل سے پہلے ہوتی ہے یہ کوئی درست بات نہ ہے۔ اس مقام پر قدرت کا ذکر منافقین کو ڈرانے کے لیے کیا ہے۔ تاکہ اس کی شان و شوکت سے ڈر جائیں اور نفاق چھوڑ دیں اور یہ بات سمجھ لیں کہ اگر اللہ ان کو اندھا اور گونگا بہرہ کر دے تو یہ اس کے سامنے کیا مشکل ہے جبکہ ہر چیز اس کے احاطے میں ہے۔ وہ ہر چیز پر مکمل قدرت و غلبہ رکھتا ہے۔ یہ ان کا نفاق قادر مطلق کے سامنے کچھ کام نہ کر سکے گا۔ غرضیکہ یہ مثال بھی اللہ کریم نے منافقین کے لیے بیان فرمائی ہے۔ منافق بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اعتقادی منافق جو ظاہر میں مسلمان اور باطن میں کافر و شیطان ہوتے ہیں۔ دوسرے منافق عملی ہیں۔ جن کے متعلق فرمایا کہ تین خصلتیں جس میں ہوں وہ خالص منافق ہے۔ اور جس میں ایک خصلت ہے اس میں وہ خصلت نفاق کی ہے۔ جب کہ کہ اس کو چھوڑ نہ دے۔ جب بات کرے تو جھوٹ بول دے۔ جب وعدہ کرے تو خلاف کرے جب امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ [بروایت شیخین عن ابن عمر مرفوعاً] دوسری روایت میں ایک اور مذکور ہے وہ یہ کہ جب لڑائی کرے تو گالی دے۔ تیسری روایت میں ایک اور پانچویں چیز بھی ہے وہ یہ کہ جب عہد کرے تو (دھوکہ کرے) توڑ دے اس سے معلوم ہوا کہ کبھی انسان میں ایسا وقت بھی ہوتا ہے کہ کبھی ان میں ایک شعبہ ایمان کا اور ایک نفاق کا ہوتا ہے خواہ عملی ہو جیسے حدیث شریفہ میں مذکور ہے۔ خواہ اعتقادی ہو جیسے آیت مبارکہ میں ذکر ہے۔ اکثر سلف و

بعض علماء کا یہی قول ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے قرآن حکیم نے فرمایا:﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ﴾ ''کہ اور اکثر ان کے ایمان نہیں لاتے مگر اس طرح کہ وہ مشرک بھی ہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اکثر ظاہری ایمان کے ساتھ باطنی شرک بھی جمع ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح شرک ایمان کو تباہ کر دیتا ہے اسی طرح نفاق اخلاص کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ کفر و نفاق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اللّٰھم احفظنا۔

حافظ ابن کثیر نے کہا یہاں تک اللہ کریم نے کئی قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا۔ ایک خالص مومنین کا ذکر پہلی چار آیات میں کیا، پھر اس کے بعد دو آیات میں کافروں کا ذکر ہے۔ تیسرے خالص منافقین کا ذکر ہے جن کی دو اقسام ہیں۔ ایک وہ جن کے لیے آگ سلگانے کی مثال دی گئی۔ دوسرے وہ ہیں جو متردد رہتے ہیں کبھی ایمان چھپاتے اور کبھی ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی مثال بارش سے بیان کی گئی ہے۔ یہ منافق پہلی قسم والوں سے کس قدر ہلکے ہیں۔ یہ مقام بعض وجوہ سے اس مثال کے مشابہ ہے جس کا ذکر سورۃ نور میں کیا گیا ہے۔ وہاں مومن کی مثال چراغ و فانوس سے بیان کی گئی ہے۔ مثال مذکور کا مکمل بیان ان شاء اللہ وہاں آئے گا۔ پھر ابن کثیر نے فرمایا کہ پھر اس کے بعد ان کافروں کی مثال بیان کی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کسی دین پر ہیں حالانکہ وہ کسی دین پر نہ ہیں۔ بلکہ جہل مرکب لوگ ہیں۔ جیسے اللہ کریم نے ارشاد فرمایا:﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى إِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا﴾ ''اور کافروں کے اعمال کی مثال اس ریت کی سی ہے جو چٹیل میدان میں ہو اسے پیاسا پانی سمجھتا ہے حتیٰ کہ جب اس کے پاس آیا تو اسے کچھ نہ پایا۔'' پھر اس کے بعد جہل بسیط کافروں کی مثال بیان کی ہے۔ ان کے حق میں یہ فرمایا:﴿ أَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۝ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَآ أَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَالَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ ''یا اس کی مثال ان اندھیروں کی سی ہے جو موج دار دریا کی تہہ میں ہوں ایک پھر دوسری لہر کے اوپر ڈھانپ رہی ہو اس کے اوپر بادل ہوں اور کئی اندھیرے ایک کے اوپر دوسرے ہیں۔ جب اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو قریب نہیں کہ اسے دیکھے اور جس کے لیے اللہ نور نہ کرے تو اس کے لیے کوئی نور نہ ہے۔

غرضیکہ کفار کی بھی دو اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ ایک داعیہ، دوسرے مقلد۔ ان دونوں کا ذکر سورۃ حج کے اوائل میں کیا۔ فرمایا:﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطَانٍ مَّرِيْدٍ﴾ ''اور بعض لوگوں میں سے ایسے ہیں جو بغیر علم کے اللہ کریم کے متعلق جھگڑا کرتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے چلتے ہیں۔'' اور فرمایا:﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتَابٌ مُّنِيْرٌ﴾ ''اور

لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ میں بغیر علم اور بغیر ہدایت اور بغیر روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں۔"
اسی طرح اللہ کریم نے مومنین کی تقسیم سورۃ واقعہ کے شروع میں، اس سورۃ کے شروع میں اور سورۃ دھر میں ذکر کی ہے۔ کہ ان کی اقسام دو طرح ہیں۔ ایک وہ سابقین جو مقربین بھی کہلاتے ہیں، دوسرے وہ جو اصحاب یمین کہلاتے ہیں۔ جنہیں ابرار بھی کہتے ہیں۔ گویا مقربین اور ابرار مومنین کی اقسام ہیں۔ اسی طرح کفار کی بھی دو اقسام ہیں۔ ایک دعاۃ، دوسرے مقلدین۔ منافقین کی بھی دو اقسام ہیں۔ ایک اعتقادی، دوسری عملی۔ ابو سعید مرفوعاً فرماتے ہیں کہ دل کو چار اقسام ہیں ایک اجرد، دوسرا اغلف، تیسرا منکوس، چوتھا مصفح۔ اجرد، برہنہ کو کہتے ہیں اور اغلف وہ جو غلاف میں بند ہے۔ اجرد مومن کا دل ہے اس میں ایک چراغ جلتا ہے اور وہ چراغ وہی نور ایمان ہے۔ اغلف کافر کا دل ہے اور منکوس خالص منافق کا دل ہے جس نے حق کو پہچان کر اس کا انکار کر دیا۔ اور مصفح وہ دل ہے جس میں ایمان و نفاق ہے۔ اس کے اندر ایمان کی مثال اس گندے پھوڑے کی ہے جس کو خون اور پیپ بڑھاتا ہے۔ پھر جو مادہ جس مادے پر غالب ہو گا وہی چیز اس دل پر غالب ہو گی۔ [بروایت امام احمد]

ابن کثیر نے فرمایا اس کی سند جید و حسن ہے۔ ابن جریر وغیرہ مفسرین فرماتے ہیں یہ دونوں مثالیں ایک ہی قسم کے منافقوں کے متعلق ہیں۔ ابن کثیر نے فرمایا یہ منافقین کی جنس کے اعتبار سے ہے کیونکہ کئی قسم کے منافقین اور بھی ہیں۔ جن کا ذکر سورۃ براۃ میں کیا گیا ہے۔ ان کے اقوال و افعال کا حال بتایا ہے۔ ان دونوں مثالوں کو منافقین کی اقسام بتانا ان کے احوال و صفات کے مطابق ہے۔ واللہ اعلم۔ جس طرح سورۃ نور میں دو قسم کے کافروں کی مثالیں بیان کی ہیں۔ ایک دعاۃ، دوسرے مقلدین۔ دعاۃ کی مثال سراب سے دی ہے جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہ دعاۃ ہیں۔ دوسرے مقلدین ہیں جن کی مثال تاریک دریا سے بیان کی ہے۔ دعاۃ جہل مرکب ہیں اور مقلدین جہل بسیط ہیں۔ واللہ اعلم۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم (اس کے عذاب سے بچو)۔ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے مینہ برسا کر تمہارے کھانے کے لیے انواع و اقسام کے میوے پیدا کیے پس کسی کو اللہ کا ہمسر نہ بناؤ، اور تم جانتے تو ہو۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: ﴿یٰاَیُّھَا النَّاس﴾ سے اہل مکہ کو خطاب ہے اور ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے اہل مدینہ کو خطاب ہے۔ اور یہ قول اکثر ہے کلی نہ ہے۔ کیونکہ سورۃ بقرہ، نساء، حجرات بالا تفاق مدنی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک میں ﴿یٰاَیُّھَا النَّاس﴾ آیا ہے۔ اور اس جگہ یہ خطاب سارے مکلفین کے لیے عام ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ قرآن جہاں کہیں اُعْبُدُوْا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ توحید اپناؤ شرک سے بچو۔ پیدا کرنے کا ذکر یہاں اس لیے کیا کہ سارے کافر اللہ کے خالق ہونے کا اقرار کرتے ہیں: ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَھُمْ مَنْ خَلَقَھُمْ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰہَ﴾ ”کہ اگر آپ ان کافروں سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے۔“ اس لیے ان پر اس احسان کا ذکر کیا جس کے وہ خود معترف تھے تاکہ وہ انکار نہ کر سکیں۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ میں اللہ کریم نے مکمل الوہیت بیان فرمائی ہے کہ ذرا اس انعام کو تو دیکھو کہ اس نے تمہیں عدم سے وجود بخشا اور طرح طرح کی کھلی نعمتیں عطا کیں۔ زمین پر پہاڑوں کی میخیں لگا کر اسے تمہارے چلنے پھرنے کا فرش بنا دیا اور آسمان کو ایک کھلی چھت بنا دیا۔ جیسے فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّھُمْ عَنْ اٰیَاتِھَا مُعْرِضُوْنَ﴾ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دی اور وہ اس کی نشانیوں سے اعراض کرتے ہیں۔ فتح البیان میں فرمایا کہ اگر کوئی شخص اس جہاں میں غور کرے تو اس کو ایک آباد گھر کی طرح پائے گا۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز مہیا ہے۔ آسمان کو دیکھو تو چھت کی طرف بلند ہے زمین کو دیکھو تو فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ ستاروں کو دیکھو تو چراغوں کی طرح روشن ہیں، انسان کو دیکھو تو گھر کے مالک کی طرح ہے اس گھر میں ہر طرح کی کشادگی پر جانور، اور ہر کام کی چیز مہیا ہے۔ پھر اس انسان پر جس کی تسخیر یں یہ سب کچھ ہے واجب ہے کہ اللہ کا شکر بجا لائے اور اس نعمت سے غفلت نہ کرے۔

ابرو باد ومه و خورشید و فلك در کاراند ناتونانے بکف آری و بغفات نخوری
همه از بهم تو سر گشته و فرما نبردار شرط انصاف بنا شد که تو فرما نبری

ابن کثیر نے فرمایا اس جگہ آسمان سے بادل مراد ہیں۔ یعنی اللہ کریم نے ضرورت کے وقت بادل سے پانی برسایا۔ پھر اس بارش سے طرح طرح کے پھل اور کھیتیاں اگائیں، یہ مضمون کلام پاک میں اور بھی کئی مقامات پر مذکور ہے۔ اس آیت سے ملتی جلتی وہ آیت بھی ہے۔ فرمایا: ﴿اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَاءً وَّ صَوَّرَکُمْ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبَاتِ ذَالِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ یعنی ”اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو قرار بنا دیا اور آسمان کو چھت بنا دیا اور تمہاری اچھی صورتیں

بنائیں اور تمہیں پاکیزہ رزق دیا۔ یہ اللہ تمہارا رب ہے پس اللہ رب العالمین بڑا بابرکت ہے۔" مطلب یہ ہوا کہ جب اس گھر کا خالق ومالک ایک ہوا تو وہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت اس طرح کی جائے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ صحیحین میں ابن مسعود سے مروی ہے کہ میں نے کہا اے اللہ کے پیغمبر! اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کیا ہے۔ فرمایا: یہ کہ تو کسی کو اس کا شریک ٹھہرائے حالانکہ اس نے تجھ کو پیدا کیا۔ (الحدیث)

اسی طرح حضرت معاذ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے۔ پھر فرمایا: حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ (الحدیث)

تیسری حدیث میں یوں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص یوں نہ کہے کہ ماشاء اللہ وشاء فلان بلکہ یوں کہے ماشاء اللہ ثم شاء فلان یعنی کسی کو مشیت کچھ نہیں ہوتی جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ جب اللہ کی مشیت ہوگی تب ہی کسی اور کی مشیت کی کوئی حیثیت ہوگی ورنہ نہ ہوگی۔

چاھا ھم نے ویسے نہ چاھا اس نے　　　　چاھا اس کا ھوا ھمارا نہ ھوا

اور طفیل بن سنجرہ کی طویل حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی یوں کہے ماشاء اللہ وشاء محمد پھر فرمایا یوں کہو ماشاء اللہ وحدہ۔ [بروایت ابن مردویہ]

اس کو ابن ماجہ نے بھی اور طریق سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ سفیان ثوری کی روایت میں بھی حضرت ابن عباس سے اس طرح آیا ہے کہ ایک شخص نے نبی علیہ السلام سے ماشاء اللہ وشئت کہا تو فرمایا کیا تو نے مجھے اللہ کے برابر کر دیا ہے بلکہ یوں کہو ماشاء اللہ وحدہ۔ [بروایت ابن مردویہ، نسائی، ابن ماجہ]

ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ سب توحید کی حمایت وصیانت ہے۔ فتح البیان میں فرمایا ہے کہ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ ترکِ تقلید اور اخذ حجت واجب ہے۔

فائدہ: حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ﴿یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ﴾ کا فر اور منافقین کو خطاب ہے۔ پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ یہ توحید جس کی طرف تمہیں رسول اللہ ﷺ بلاتے ہیں بلاشبہ یہی حق ہے۔ پھر کیوں اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہو۔ جو نہ نفع دیں نہ نقصان، انداد سے شرک مراد ہے اور یہ شرک سیاہ رات میں سیاہ پتھر پر سیاہ چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے۔ اللہ کے ساتھ برابری یوں ہے کہ کہے کہ اللہ کی قسم اور تیری جان کی قسم۔ یا یوں کہے کہ اگر یہ کتیا یا بطخ گھر میں نہ ہوتی تو چور چوری کر لیتے۔ یا کسی سے کہے کہ اگر اللہ

اور تم یوں چاہوں گے تو یہ کام ہو گا یا اگر اللہ اور فلاں شخص نہ ہو تا تو اس طرح ہو جاتا۔ یہ سب شرک کے اقسام و نظائر ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ بعض جاہل ضرورت مند کسی امیر یا دولت مند سے یوں کہہ دے کہ اوپر اللہ ہے نیچے تم ہو تو یہ کہنے سے مشرک ہو جاتے ہیں اگر سننے والا منع نہیں کرتا تو وہ بھی شرک میں شریک ہو گا۔

فائدہ: حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ آیت توحید باری تعالیٰ پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اس کو تنہا معبود بنانا چاہئے۔ مفسرین نے اس آیت سے وجود صانع عالم پر دلالت کی ہے جیسے امام رازی وغیرہ۔ جس طرح یہ آیت وجود صانع پر دلالت کرتی ہے اسی طرح یہ آیت توحید ربانی پر دلیل ہے۔ کیونکہ جو شخص ان سفلیہ و علویہ موجودات اور اختلاف الوان و اشکال اور طبائع پر غور کرے گا کہ ان تمام منافع کو کس عمدگی سے ان کے بہتر مقامات پر رکھا گیا ہے تو وہ ضرور ہی ان کو ترکیب دینے والی ہستی کی قدرت و حکمت اور عظمت سلطان کو جان لے گا۔ جس طرح ایک دیہاتی سے کسی نے پوچھا کہ اللہ کی ذات کے وجود پر کیا دلیل ہے۔ اس نے جواب دیا: ((سبحان الله ان البعر ليدل على البعير و ان اثر الاقدام ليدل على المسير فسماء ذات البراج وارض ذات فجاج و بحار ذات امواج الايدل ذالك على وجود اللطيف الخبير)) "کہ تعجب ہے کہ مینگنی اونٹ پر دلالت کرتی ہے اور قدم چلنے پر دلالت کرتے ہیں تو کیا آسمان ستاروں والا، زمین داڑوں والی اور دریا موجوں والے ایک لطیف و خبیر پر دلالت نہیں کرتے۔" رازی نے امام مالک سے حکایت کی کہ رشید نے ان سے پوچھا کہ وجود ربانی پر کیا دلیل ہے تو فرمایا کہ زبانوں، رنگوں اور آوازوں کا اختلاف اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے۔ ابو حنیفہ سے کسی زندیق نے پوچھا کہ وجود باری تعالیٰ پر کیا دلیل ہے۔ انہوں نے کہا ذرا مجھے چھوڑ دو میں نے ایک خبر سنی ہے میں ذرا اس کی فکر میں ہوں۔ لوگوں نے مجھے ذکر کیا کہ دریا میں ایک بڑی کشتی طرح طرح کے سامان تجارت سے بھری ہوئی چلتی ہے اور اس کو کوئی چلانے والا نہ ہے۔ وہ خود ہی آتی جاتی اور چلتی پھرتی ہے۔ بڑی بڑی موجوں کو پھاڑ کر جہاں چاہتی ہے چلی جاتی ہے، اس کو کوئی ہانکنے والا نہ ہے۔ لوگوں نے کہا کہ کوئی عاقل تو ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ یعنی یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ انہوں نے فرمایا: کمبختو! ذرا غور کرو کہ اتنا بڑا جہاں جس میں عالم علوی و سفلی بھی ہیں اور اتنی محکم چیزیں جو اس کائنات میں پائی جاتی ہیں کیا وہ بغیر کسی صانع کے چل رہی ہیں۔ اس بات پر سب لوگ حیران ہو گئے اور اسلام لے آئے راہ حق پر چل پڑے۔ اسی طرح شافعی رحمہ اللہ سے کسی نے وجود صانع پر سوال کیا۔ کہا کہ دیکھو یہ توت کے پتے ہیں ان کا مزہ ایک ہی ہے اگر اس کو کیڑا کھائے تو ابریشم بنتا ہے۔ شہد کی مکھی کھاتی ہے تو شہد نکلتا ہے۔ گائے بکری کھاتی ہے تو گوبر اور مینگنی بن جاتی ہے۔ ہرن

کھاتا ہے تو مشک بنتا ہے۔حالانکہ یہ ایک ہی چیز ہے۔یہی سوال کسی نے امام احمد سے بھی کیا تھا۔انہوں نے کہا کہ یہاں ایک قلعہ چونا گچ ہے اور بغیر دروازے کے ہے۔باہر سے سفید چاندی کا سا ہے اور اندر سے صاف سونے کی طرح ہے۔اچانک اس قلعے کی دیوار ٹوٹ گئی اس میں سے ایک جانور سنتا، دیکھتا، اچھی شکل والا اور نمکین آواز والا نکلا یعنی انڈھے سے مرغی کا بچہ پیدا ہو نا مراد لیا تھا۔کسی اور شخص نے کہا کہ جوان آسمانوں کی اونچائی اور کشادگی میں غور و فکر کرے گا اور چھوٹے بڑے ستارے چلتے اور ٹھہرے ہوئے دیکھے گا اور فلک اعظم کا ہر رات دن میں چکر لگانا اور ایک خاص ہیئت پر چلنا جان لے گا۔ان دریاؤں کو دیکھے گا جو اطراف جہاں کو گھیرے ہوئے ہیں اور زمین پر پہاڑ رکھے ہوئے دیکھے گا تاکہ زمین اور زمین والے ہلنے سے محفوظ رہیں پھر وہ انکا رنگ و شکل کا اختلاف دیکھے گا جس طرح کہ اللہ کریم نے فرمایا:﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾"اور پہاڑوں میں سے کچھ سرخ و سفید گھاٹیاں ہیں جن کے مختلف رنگ ہیں اور لوگوں اور کیڑوں مکوڑوں اور جانوروں کے مختلف رنگ ہیں۔اسی طرح اللہ سے اس کے وہ بندے ڈرتے ہیں جو جاننے والے ہیں۔" اسی طرح ان ندی نالوں میں غور کرے گا جو ایک طرف سے دوسری طرف بہتے ہیں۔اور ہر جگہ نفع کے لیے جاری ہیں۔پھر ان زمین میں پھیلے ہوئے جانوروں میں غور کرے گا اور ان گھاس اور جڑی بوٹیوں میں فکر کرے گا جن کا ذائقہ، رنگ اور خوشبو مختلف ہے۔جب کہ زمین اور پانی ایک ہی ہے۔تب وہ جان لے گا کہ ان تمام عجائبات کو بنانے والا بڑا عظیم کاریگر ہے۔یہ اس کی عام رحمت جو اس کی تمام مخلوق اور خصوصاً انسان پر لطف و احسان کیے ہوئے ہے وہ ایک عظیم ذات کے بغیر کیسے ممکن ہے۔((لا الہ غیرہ و لا رب سواہ علیہ توکلت و الیہ انیب)) اس مضمون کی آیات کلام حکیم میں بکثرت بکھری ہیں۔

وَإِنْ كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٣﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿٢٤﴾

اور اگر تم کو اس (کتاب) میں جو ہم نے اپنے بندے (محمد عربی) پر نازل فرمائی ہے کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔لیکن اگر (ایسا) نہ کر سکو اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے (اور جو) کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

جب مالک مطلق توحید کے بیان سے فارغ ہوا تو رسالت کا بیان کیا۔ کافروں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر تمہیں اس کتاب میں شک ہے جو اللہ نے اپنے بندے پر نازل کی یا اس میں شک ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے تو تم بھی بڑے فصیح ہو اس طرح کی ایک کتاب تم بھی بنالاؤ اور اس کام پر جس سے چاہو مدد لے لو۔ جن کو تم اللہ کے سوا معبود بناتے ہو اور اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔ انہی سے مدد لو اگر یہ کتاب کسی مخلوق کی طرف سے ہے تو تم بھی اکیلے یا سب مل کر اس جیسی کتاب بنالو۔ اگر نہیں کر سکتے تو پھر اس کتاب کا انکار ناحق ہے۔ قرآن کریم میں اس قسم کا دعویٰ کئی مقامات پر مذکور ہے اور منکرین کتاب سے کھلے عام چیلنج کیا گیا۔ سورۃ قصص میں فرمایا ہے: ﴿قُلْ فَاْتُوْا بِكِتَابٍ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَا اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُم صَادِقِيْنَ﴾ "کہہ دیجئے! کہ اللہ کی طرف سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت دیتی ہو۔ میں اس کی پیروی کروں گا اگر تم سچے ہو۔" ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿قُلْ لَئِنَ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا لْقُرْآنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ "کہ فرما دیجئے! اگر جن وانس اس بات پر جمع ہو جائیں کہ وہ اس قرآن جیسا بنالائیں تو وہ اس جیسا نہ لا سکیں گے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی ہو جائیں۔" سورۃ ہود میں فرمایا: ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهٖ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ "یا وہ کہتے ہیں کہ اس کو بنالیا ہے، کہہ دیجئے! کہ اس جیسی دس سورتیں خود سے بنالاؤ اور اللہ کے سوا جس کو چاہو بلالو۔ اگر تم سچے ہو۔" سورۃ یونس میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَمَا كَانَ هٰذَ الْقُرْآنَ اَنْ يُفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرَاهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِنْ مِثْلِهٖ وَادْعُوْمَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ "اور یہ قرآن ایسا نہ ہے کہ اس کو اللہ کے سوا بنالیا جائے لیکن یہ اپنے سے پہلے والی کتاب کی تصدیق ہے اور اس کتاب کی تفصیل ہے جس میں کوئی شک نہ ہے جو رب العالمین کی طرف سے ہے۔ یا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس نے خود اس کو گھڑ لیا ہے۔ کہہ دیجئے! کہ اس جیسی ایک سورت بنالاؤ اور اللہ کے سوا جس کو چاہو بلالو۔ اگر تم سچے ہو۔" یہ ساری آیات مکہ میں نازل ہوئیں پھر مدینہ میں اس کے ساتھ مزید تاکید اُٹھاتا ہے۔ فرمایا کہ اگر تمہیں اس میں کچھ شک ہے تو اس جیسا قرآن یا اس جیسی سورت بنالاؤ۔ اسی کو ابن جریر، زمخشری، رازی وغیرہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین و محققین کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے اور اس کو ترجیح دی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ یہ چیلنج سب کو عام ہے کوئی متفرق ہو یا مجتمع، امی ہو یا کتابی، اگر صرف امیوں کو یہ چیلنج ہوتا تو اتنا عموم شمول نہ ہوتا ایک آیت سے دس آیات تک حد مقرر کی

گئی۔ کہا کہ ذرا اس جیسا کلام لا کر تو دکھاؤ۔ یہ چیلنج مکہ اور مدینہ میں بارہا ہوا۔ کفار کی دشمنی اور رسول اللہ ﷺ سے اور دین سے ان کا بغض بے حساب تھا۔ مگر اس شدتِ عداوت کے باوجود وہ قرآن کے مقابلے سے عاجز رہے۔ اسی لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے۔ یعنی نہ اب ایسا کر سکے ہو نہ آئندہ کر سکو گے۔ یہ ایک اور معجزہ ہے کہ قطعی خبر دے دی کہ قیامت تک ان سے یہ کام نہ ہو سکے گا۔ کہ وہ قرآن کا مقابلہ کریں۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یقیناً ایسا ہی ہوا کہ اس وقت سے لے کر ہمارے وقت تک کسی نے اس کا مقابلہ نہ کیا اور یہ ہو بھی نہ سکے گا اور کیسے اس کا وقوع ممکن ہے جبکہ یہ تو اس کا کلام ہے جو ہر چیز کا خالق ہے۔ بھلا مخلوق کا کلام خالق کے کلام کے برابر کیسے ہو سکتا ہے۔ جو بھی اس قرآن میں غور کرے گا اس کو اعجاز کے کئی لفظ و معنوی، کھلے اور چھپے مقامات مل جائیں گے ۔اللہ کریم نے فرمایا:﴿ الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴾ ''ایسی کتاب ہے جس کی آیات بیان کی گئی ہیں۔'' پھر حکمت والے خبردار کی طرف سے ان کی وضاحت کی گئی۔ معلوم ہوا کہ اس کتاب کے لفظ محکم اور معانی مفصل ہیں۔ یا اس کے برعکس ہو غرضیکہ جو بھی ہو لفظ و معنی دونوں ہی معجز ہیں۔ کس میں طاقت ہے جو اس کا مقابلہ کر سکے اور اس کے جیسا اور کلام لا سکے۔ اور وہ مخفی باتیں جن کی قرآن کریم نے خبر دی ہے وہ کیسے درست واقع ہوئیں۔ پھر ہر خیر کا حکم ہے ہر شر سے نفی ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا:﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ ''اور تیرے رب کی بات صدق و عدل میں مکمل ہے۔'' یعنی یہ کلمے اللہ کے اخبار میں صادق اور احکام میں عادل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا سارا کلام صدق و عدل و حق و ہدیٰ ہے جس میں نہ کچھ ملمع سازی ہے نہ جھوٹ ہے جس طرح اشعار عرب میں لاف و گزاف ہوتا ہے۔ دروغ بندی کی جاتی ہے اس کے شعر کے حق میں یوں فرمایا: کہ عمدہ اور مزے کا شعر وہ ہے جس میں دروغ وغیرہ ہے۔ کسی بھی قصیدہ طویلہ کو دیکھو اس میں زیادہ تر اوصاف نساء، شراب و کباب یا کسی معین شخص کی مدح یا کسی جنگ کا ذکر اونٹوں کا ذکر یا اندیشہ درندہ میں یا کسی مشہور چیز میں ہوتے ہیں۔ جس میں سوائے چرب زبانی کے کچھ نہیں ہوتا کسی خاص مخفی چیز کا ظاہر یا کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہوتا ہے۔ پھر بھرے قصیدے میں ایک دو اشعار ایسے ہوتے ہیں جن کو بیت القصید یا بیت الغزل کہہ سکتے ہیں۔ باقی سارا نظام ہذیان و طغیان کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جب کہ قران کریم اول سے آخر تک حد درجہ فصاحت سے مزین اور پر مغز مضامین سے بھرپور ہے۔ اس بات کو وہی شخص خوب جانتا ہے جو کلام عرب کو اجمالاً اور تفصیلاً جانتا ہے۔ تصریف عبارات کو پہچانتا ہے۔ قرآن کے اخبار میں غور کرو کہ وہ کس قدر شیریں ہیں۔ خواہ اجمالی ہیں یا تفصیلی۔ یا تکرار سے آئے ہیں یا بغیر تکرار کے اور عام کلام کے خلاف جو مکرر کلام ہے اس میں اور

زیادہ لطف ہے۔اس کے تکرار سے نہ کلام پرانا محسوس ہوتا ہے نہ پڑھنے والا اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔نہ دل گھبراتا ہے نہ وحشت کا احساس ہوتا ہے۔اگر اس کے وعید و تہدید کو دیکھا جائے تو اتنے سخت کہ پہاڑ ہل جائیں۔پھر ان دلوں کا کیا ذکر کرنا جن میں کچھ شعور و سمجھ ہو۔وعدہ دیکھو تو دل اور کانوں کی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں دارالسلام کا شوق پیدا ہوتا ہے۔اور عرش رحمٰن کے جوار و قرب کا ذوق دوبالا ہوتا ہے۔اس میں رغبت دلانے کے لیے فرمایا کہ:﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا اُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾"کہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ مخفی ہے (اور) یہ اس کا بدلہ ہے جو وہ دنیا میں (اعمال صالحہ) کرتے رہے۔" دوسرے مقام پر فرمایا:﴿وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسِ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ وَاَنْتُمْ فِيْهِمَا خٰلِدُوْنَ﴾"اور وہاں وہ کچھ ہوگا جو دل چاہیں گے اور جن سے آنکھیں لذت حاصل کریں گی اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔" اور خوف دلانے کے لیے فرمایا:﴿اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ﴾ کہ "کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ وہ تمہیں جنگل کے کنارے میں دھنسا دے۔" اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا:﴿ءَاَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ اَمْ اَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ﴾" کہ کیا تم نڈر ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ تمہیں زمین میں دھنسا دے پھر اچانک وہ (زمین) لرزنے لگے۔یا اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ تم پر آسمانوں سے پتھراؤ کرے پھر عنقریب تم جان لو گے کہ ڈرانا کیسا رہا۔" مقام زجر میں یوں فرمایا:﴿فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِهٖ﴾"کہ ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ کے مطابق پکڑا۔" مقام وعظ میں فرمایا:﴿اَفَرَاَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنَا هُمْ سِنِيْنَ ثُمَّ جَآءَ هُمْ مَا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ مَا اَغْنٰى عَنْهُمْ مَا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ﴾"کہ کیا خیال ہے کہ اگر ہم ان کو چند برس فائدہ دیں پھر ان کے پاس وعدے کی چیز آجائے تو کیا کام آئے گا۔ان سے وہ کچھ جس سے وہ فائدہ اٹھاتے رہے۔" اسی طرح کے فصیح و بلیغ کلام سے یہ قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔پھر آیات امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو دیکھو کہ کس طرح ہر خیر و نفع کا حکم دیا گیا اور ہر گھٹیا اور گندے کام سے کس طرح منع کیا گیا۔ابن مسعود وغیرہ سلف رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ کلام پاک میں جہاں بھی﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ آیا ہے اس مقام کو غور سے دیکھو وہاں یا تو کسی خیر کا حکم ہوگا یا کسی شر سے ممانعت ہوگی۔اسی مقام سے یہ ارشاد کیا ہے:﴿يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾"کہ وہ انہیں نیکی کا حکم اور برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے طیبات کو حلال ہونا بتاتا ہے اور خبائث کا حرام ہونا بتاتا ہے اور ان سے ان کے بوجھ اتارتا ہے

اور وہ طوق بھی (اتار تا ہے) جو ان پر تھے۔" پھر وہ آیات جن میں آخرت، جنت، دوزخ احوال قیامت نعیم و جھیم اور عذاب الیم کا ذکر ہے وہ مزید فعل خیرات کا شوق دلاتی ہیں اور ترک منکرات پر مجبور کرتی ہیں۔ دنیا سے بے ثبات اور آخرت کے شائق بناتی ہیں اور درست راستے پر ثابت رکھتی ہیں۔ اور شیطان کے خیالات و وساوس کو دل سے نکالتی ہیں۔ اسی لیے صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ہر نبی کو کچھ ایسی نشانیاں دی گئیں جن کے سبب سے لوگ ان پر ایمان لائے اور مجھے اللہ کی طرف سے یہی وحی عطا کی گئی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ سب سے زیادہ تابع قیامت والے دن میرے ہوں گے۔ یہ مسلم کا لفظ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معجزہ وحی کے ساتھ مجھے خصوصیت دی گئی ہے اور مجھے یہ ایسا قرآن دیا گیا ہے جو لوگوں کو عاجز کر دے۔ دوسری کتب الٰہی کے خلاف اس قرآن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ علماء کے نزدیک دوسری کتب سماویہ معجزہ نہ ہیں۔ حضرت ابن کثیر نے اس کے بعد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے وہ معجزات جو ان کے صدق پر دلیل ہیں وہ لاتعداد ہیں۔ **وللہ الحمد**۔

بعض متکلمین نے اعجاز قرآن کا بیان اس انداز سے کیا جو اہل سنت اور معتزلہ دونوں کے اقوال کو شامل ہے۔ یعنی اگر یہ قرآن فی نفسہٖ معجزہ ہے اور کوئی بشر اس جیسا کلام نہیں لا سکتا اور نہ اس کا معارضہ اس کی قوت میں ہے پھر تو مقصود مل گیا کہ قرآن فی نفسہٖ معجزہ ہے۔ لیکن اگر اس کا معارضہ ممکن تو ہے لیکن شدت عداوت کے باوجود وہ لوگ اس کا مقابلہ نہیں کر سکے تو یہ ان کا عجز اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ نے ان کو قدرت کے باوجود اس کے مقابلے سے باز رکھا۔ حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ اگرچہ یہ بیان کچھ پسندیدہ نہ ہے کیونکہ قرآن تو فی نفسہٖ معجزہ ہے اس کا مقابلہ کرنے کی کسی میں جرأت ہی نہ ہے لیکن بر طریق مناظرہ و مجادلہ اور دفاع حق کے انداز میں یہ بیان درست ہو سکتا ہے۔ چنانچہ رازی نے بھی سور قصار سے سورۃ والعصر اور الکوثر کے ساتھ سوال کا جواب اسی طرح دیا ہے۔

فائدہ: اس آیت کریمہ میں اللہ کریم نے رسول اللہ ﷺ کو اپنا بندہ کہا اور یہ اپنی طرف نسبت کرنا تکریم و تشریف کے قبیل سے ہے۔ عبد تعبد سے ماخوذ ہے جس کے معنی تذلل کے ہیں۔

داغ غلامیت کر دیا پہ خسرو بلند مہر ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید

اسی لیے اہل تجربہ نے یہ بات کہی ہے کہ بندہ بننا تو مشکل ہے لیکن خدا بننا آسان ہے کیونکہ اکثر لوگ غرور و تکبر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ وصف اللہ کے سوا کسی اور کو زیبا نہ ہے۔ گویا متکبر خدائی کا دعویٰ رکھتا ہے جیسے خاکسار عبدیت کا دعوے دار ہوتا ہے۔ سو جو شخص رتبہ عبدیت میں جتنا چست ہو گا اتنا ہی اللہ کے ہاں مقرب و

محبوب ہوگا اور جو شخص شخصیت و خود پسندی میں جس قدر پھنسا ہوگا اتنا ہی رحمت ربانی سے دور ہوگا۔

فائدہ: سورت قرآن کے ایک ٹکڑے کو کہا جاتا ہے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ خواہ تین آیات کی کیوں نہ ہو، ایسی سورت بھی معجز ہے۔ معتزلہ کا یہ کہنا کہ قرآن کا اعجاز سارے قرآن سے متعلق ہے یہ غلط ہے۔ بلکہ قرآن تو سورۃ والعصر اور الکوثر جتنا بھی معجز ہے۔

حافظ ابن کثیر نے فرمایا جو اللہ کریم نے اس جگہ فرمایا ہے: ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِنْ مِثْلِهٖ﴾ "کہ اس جیسی ایک سورت بنالاؤ۔" اور جو سورۃ یونس میں فرمایا: ﴿بِسُوْرَةٍ مِثْلِهٖ﴾ "کہ اس جیسی سورت۔" یہ قرآن کی ہر سورت کو شامل ہے وہ لمبی ہو یا مختصر۔ اس لیے کہ نکرہ سیاق شرط میں محققین کے نزدیک اسی طرح عام ہے جیسے سیاق نفی میں عام ہوتا ہے۔

پس قرآن کا اعجاز طوال و قصار دونوں اقسام کی سورتوں میں برابر ہے۔ میرے علم میں نہیں کہ سلف و خلف میں سے کسی نے اس مسئلے پر اختلاف کیا ہو۔ امام شافعی نے فرمایا کہ اگر لوگ والعصر میں غور کریں تو وہ ان کو کفایت کر سکتی ہے۔ اسلام لانے سے قبل حضرت عمرو بن العاص مسیلمہ کذاب کے پاس گئے۔ مسیلمہ نے کہا بتاؤ آجکل مکہ میں تمہارے صاحب پر کیا نازل ہوا ہے؟ انہوں نے فرمایا ایک مختصر مگر بہت بلیغ سورت اتری ہے۔ پھر والعصر پڑھ کر سنائی۔ تھوڑی دیر سوچا پھر سر اٹھا کر بولا مجھ پر بھی ایک ایسی سورت اتری ہے۔ کہا کونسی؟ اس نے کہا: ﴿یا وبر یا و بر انما انت اذنان و صدر و سائرك حضر و فقر﴾ کہا اے عمرو! یہ کیسی سورت ہے؟ انہوں نے کہا: واللہ تو خود جانتا ہے کہ میں تجھے جھوٹا سمجھتا ہوں۔ یعنی اتنا مقفہ کلام جو تو نے قرآن کے مقابلے میں اکٹھا کر لیا ہے یہ فضول ہے ہرگز وحی نہیں ہو سکتا۔ نہ میں تجھے رسول سمجھتا ہوں۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ پوری سورت یا آیت کو چھوڑ کر قرآن کا ہر مکمل جملہ بجائے خود معجز ہے۔ کسی بڑے سے بڑے ادیب و فصیح و بلیغ کی کہاں مجال کہ وہ اس قرآن کا مقابلہ کر سکے اور اس طرح کی ترکیب الفاظ میں لا سکے۔ اگرچہ کوئی عقل کا کورا احمق اس کو نہ بھی تسلیم کرے۔ اسی لیے تو اللہ کریم نے ماضی، حال اور استقبال پر حال میں نفی کر دی اگر کسی انسان کو اس کا ذرا بھی اختیار ہوتا تو اب تک کچھ نہ کچھ بنالاتا۔ مگر جب کوئی نہ بنا سکا تو اس کا معجزہ ہونا بخوبی ظاہر ہو گیا۔ حالانکہ عربی بڑے فصاحت و بلاغت والے تھے اور قرآن انہی کی جنس کلام سے آیا ہے۔ انہیں بڑا حرص و طمع تھا کہ وہ نور قرآن کو بجھا دیں اور امر نبوی کو باطل کر دیں مگر اس شدت حرص کے باوجود وہ اس کا ذرا بھی مقابلہ نہ کر سکے۔ بلکہ قتل و قید کی صعوبتوں میں گرفتار ہو گئے اور نہ صرف قبول کیا بلکہ رضا سے قبول کیا۔ پھر جب ان کا یہ عجز ظاہر ہو گیا تو

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق میں کیا شک باقی رہا۔ پھر جب یہ بات ثابت ہو گئی تو دشمنی کو ترک کرنا واجب ہو گیا۔ یہ غیب کی خبر جس کے متعلق قرآن نے وقوع سے پہلے نشاندھی کی اس لیے ایام نبوت میں اور اس کے بعد اب تک کوئی کافر اس کا مقابلہ نہ کر سکا۔

وقود، لکڑی اور ایندھن کو کہتے ہیں۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ "اور جو بے انصاف ہیں پس وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔" اور فرمایا: ﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ "کہ تم اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود بناتے ہو وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے تم اس میں داخل ہونے والے ہو اور اگر یہ لوگ معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے اور ہر ایک اس میں ہمیشہ رہنے والا ہے۔" اس جگہ پتھر سے مراد وہ بت ہیں جن کو وہ کافر پوجتے تھے۔ یا گندھک کے پتھر مراد ہیں جس سے آگ جلد سلگتی ہے۔ یا ہر قسم کے پتھر مراد ہیں۔ جو کچھ بھی ہو اس آگ کی قوت ظاہر ہے نہ وہ انسانوں کو چھوڑے گی نہ پتھروں کو سب کو جھلس دے گی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اس آگ کو ہزار برس سلگایا گیا تو وہ سرخ ہو گئی پھر ہزار برس سلگائی تو وہ سفید ہو گئی پھر ہزار برس جلائی تو وہ سیاہ ہو گئی۔ اب یہ سیاہ ہے اس کی لپیٹ بجھتی نہ ہے۔ [بروایت ابن مردویہ والبیهقی فی شعب الایمان] حضرت ابوہریرہ کا مرفوعاً لفظ یہ ہے کہ دنیا کی یہ آگ جہنم کی آگ کے ستر حصوں سے ایک حصہ ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے پیغمبر! یہی ایک جزء ہی کافی ہے۔ فرمایا: بلکہ وہ ننانوے جزء حرارت میں زیادہ ہے۔ [بروایت مالک، احمد، الشیخان]

فائدہ: اس قول سے کہ یہ آگ اور اس کے پتھر تیار ہیں پتا چلا کہ آگ مع اپنے آلات و اوزار کے اب موجود ہے۔ یہ نہیں کہ وہ قیامت کے دن پیدا کی جائے گی۔ اس پر کئی احادیث دلالت کرتی ہیں۔ جیسے ((تحاجت الجنة والنار)) اور جیسے ((استاذ نت النار ربّها)) جیسے حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ ہم نے ایک دن ایک آواز سنی پوچھا: اے اللہ کے پیغمبر! یہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ ایک پتھر ہے جسے جہنم کے کنارے سے گرایا گیا ہے۔ ستر برس سے چلا ہے لیکن ابھی تک جہنم کی تہہ میں نہیں پہنچا۔ یہ حدیث مسلم میں ہے۔ اسی طرح صلوٰۃ کسوف اور حدیث معراج میں آگ کا ذکر متواتر معنی ہے۔ معتزلہ اس عقیدے کے خلاف کے معتقد ہیں۔ بلوطی قاضی اندلس بھی اسی طرف گئے ہیں۔ یہ ان کی صریح غلطی ہے۔ یہ عقیدہ قرآن و حدیث کے ظاہر کے خلاف ہے۔ کیونکہ کتاب و سنت میں ماضی کا صیغہ ہے۔ اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ جہنم آج موجود ہے۔ ورنہ اس سے اللہ کی

خبر میں کذب کا احتمال ہو گا۔ جو اس کی شان عظیمی کے لائق نہ ہے۔ بلاوجہ کیا ضرورت ہے کہ ماضی کو مستقبل کے معنی میں کیا جائے جبکہ کوئی قرینہ بھی موجود نہ ہے۔ جو اللہ اس دن پیدا کر سکتا ہے وہ اسے اس سے قبل پیدا کرنے پر بھی ویسا ہی قادر ہے اس عقیدے کے اپنانے میں معتزلہ کا کیا نقصان ہے۔ دیکھیے قوم فرعون کے متعلق فرمایا: ﴿أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا﴾ کہ دریائے نیل میں غرق ہوتے ہی جہنم کی آگ میں جا پہنچے۔ اگر دوزخ نہ تھی تو وہ کہاں گئے؟ نیز حدیث پاک میں ہے کہ ہر مردے پر جنت اور دوزخ سے اس کا ٹھکانا ہر صبح و شام پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب تو قبر سے اٹھے گا تو یہ تیرا ٹھکانا ہو گا۔ اگر جہنم کا وجود نہیں ہے تو یہ قول بے معنی ہو گا۔

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِزْقًا قَالُوا هَذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے لیے (نعمت کے) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں جب انہیں ان میں سے کسی قسم کا میوہ کھانے کو دیا جائے گا تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے اور وہاں ان کے لیے پاک بیویاں ہوں گی اور وہ بہشتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

فائدہ: جنت کے ہر میوے کا مزہ جدا جدا ہے۔ اگرچہ صورت نئی نہ ہو لیکن جب اس کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اس سے قبل جنت میں یا دنیا میں ہمیں ایسے ہی دیئے گئے تھے لیکن جب چکھیں گے تو اس کا ذائقہ مختلف ہو گا۔

فائدہ: اللہ کریم جب کافروں کا حال و انجام بیان کر چکا تو اب مومنین کا ذکر خیر کیا۔ اس لیے قرآن کا نام مثانی ہے کہ ایمان کے بعد کفر کا ذکر کیا جاتا ہے یا کفر کے بعد ایمان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اور خوش بختوں کے بعد بد بختوں کا ذکر ہوتا ہے یا اس کے برعکس۔ مطلب یہ ہے کہ جب ایک چیز کا ذکر کیا تو اس کے بعد اس کے مقابل چیز کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اور جو اس کے ہم مثل کا ذکر ہو تو اس کو متشابہ کہتے ہیں۔ بہر حال ترغیب کے ساتھ ترھیب اور وعد و وعید میں مومنین کو اطاعت گذاری کا شوق اور اس کی چستی حاصل ہوتی ہے اور کافروں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ عمل صالح کی شرط سے معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ اعمال صالح بھی ہوں گے تب جنت ملے گی یہ بات نہیں صرف ایمان لانے سے جنت مل جائے گی۔ اہل علم نے کہا کہ عمل صالح کی چار علامتیں ہیں: ایک علم، دوسرا نیت، تیسرا صبر، چوتھا اخلاص۔ یعنی وہ عمل ریا سے پاک ہو، جنت کے درختوں اور کھڑکیوں کے نیچے سے نہریں

جاری ہوں گی۔حدیث پاک میں ہے کہ وہ نہریں خندق کے بغیر برابر زمین پر بہتی ہوں گی جس طرح دنیا کی نہریں نشیبی زمین میں ہوتی ہیں اس طرح نہ ہو گا۔نہر کوثر کے متعلق ہے کہ اس کے دونوں کناروں پر خالی موتیوں یعنی (جوف دار) موتیوں کے خیمے ہوں گے۔اس میں کچھ مضافات نہ ہے کوثر کی مٹی خالص مشک کی ہو گی اوراس کے سنگریزے موتی اور جواہر کے ہوں گے۔اے اللہ ہم تجھ سے تیرا فضل مانگتے ہیں تو احسان و رحمت والا ہے۔حضرت ابی ہریرہ کی حدیث مرفوع میں ہے کہ جنت کی نہریں ٹیلوں کے نیچے سے پھوٹتی ہیں اور وہ ٹیلے مشک کے پہاڑوں کے نیچے ہیں۔[بروایت ابن ابی حاتم]

فائدہ: حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ جنت کی کوئی چیز دنیا کی کسی چیز سے مشابہ نہ ہو گی مگر صرف نام میں۔یعنی صرف یہاں کی سی چیز کا نام وہاں کی چیز کا ہو گا۔باقی مختلف ہوں گے۔ابن زید نے فرمایا کہ چیزوں کے نام پہچانیں گے جیسے سیب،انار وغیرہ،ورنہ مزہ سب کا علیحدہ علیحدہ ہو گا۔

فائدہ: عورتیں ہر قسم کی گندگی اور بیماری سے پاک صاف ہوں گی۔حضرت مجاہد نے فرمایا کہ وہ حیض، نفاس،بول و براز، آب بینی، آب دھن، منی اور نفاس وغیرہ کی نجاستوں سے پاک ہوں گی۔حضرت قتادہ نے کہا کہ ایذا و اثم سے صاف ہوں گی۔نہ حیض ہو گا نہ کوئی اور نجاست۔حضرت جابر بن عبد اللہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جنتی کھائیں پئیں گے مگر بول و براز کی حاجت نہ ہو گی نہ تھوک ہو گا۔انہیں حمد و تسبیح کا اس طرح الہام ہو گا جیسے سانس کا الہام ہوتا ہے۔اور ڈکار سے ان کا کھانا ہضم ہو گا اور پسینے سے مشک کی سی خوشبو آئے گی۔[بروایت مسلم]
کسی نے کہا کہ وہ یہی دنیا کی عورتیں ہوں گی جو بوڑھیاں اور بد مزاج ہوں گی لیکن انہیں ہر قسم کی بد مزاجی سے پاک کر دیا جائے گا۔بعض نے کہا وہ اخلاق بد سے پاک ہوں گی۔جنت اس باغ کو کہتے ہیں جس درخت نے پتے اور پھل پھول چھپائے ہوں۔کسی نے کہا جنت کھجور کا باغ ہے اور فردوس انگور کا باغ ہے۔یہاں جنت سے مراد ثواب کا گھر ہے اور خلود ہمیشہ باقی رہنے کو کہتے ہیں۔جس کی انتہا نہ ہو یا دیر تک رہنے کو کہا جاتا ہے خواہ ہمیشہ رہے یا نہ رہے۔یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔کیونکہ آیات واحادیث سے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے کہ نہ وہ جنت سے نکالنے جائیں گے نہ وہاں موت آئے گی۔بلکہ بلا انقطاع اس میں ہمیشہ ایک ہی اچھی حالت میں رہیں گے۔**وللہ الحمد**.
شیخین وغیرھما نے ابن عمر سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں جا چکیں گے تو ایک منادی یہ ندا کرے گا کہ اے جنت اور دوزخ والو! اب جو جس حال میں ہے اسی میں رہے گا۔اس میں ہیشگی ہے۔
حضرت ابن مسعودؓ کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ اگر آگ والوں سے کہا جائے کہ تم جہنم میں دنیا کی ہر کنکری کی تعداد تک

رہو گے تو وہ خوش ہو جائیں گے اور اگر اہل جنت سے کہا جائے کہ تم جنت میں ہر سنگریزے کی تعداد تک رہو گے تو وہ غم زدہ ہو جائیں گے لیکن ان سب کے لیے ابد ہے۔ [بذکر طبرانی،ابن مردویہ، ابو نعیم] اسامہ بن زید کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ کوئی جنت کے لیے کمر باندھنے والا، جنت میں کوئی خطرہ نہ ہے۔ رب کعبہ کی قسم! جنت ایک چمکتا نور ہے ایک لہراتا پھول ہے، ایک گچ کیا ہوا محل ہے، ایک بہتی ہوئی نہر ہے، ایک پکا ہوا میوہ ہے، ایک حسین و جمیل بیوی ہے، وہاں عمدہ اور بکثرت لباس ہیں، وہاں رہنا بھی ہمیشہ ہے وہ سلامتی کا گھر ہے۔ ایک ہرا بھرا سر سبز پھل ہے۔ [الحدیث براویت ابن ماجه، البزار، ابن حبان، البیقهی وغیرهم] اور جنت کے وصف اور جنت کی عورتوں اور نعمتوں کے ذکر میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ جن کو یہاں مکمل بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یہ حدیثیں صحیحین وغیرھما میں مروی ہیں اور بیانِ جنت میں "حادی الارواح" اور "مشیر ساکن الغرام" سے بہتر اسلام میں کوئی تلخیص و تالیف نہ ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ خلود جنت کی خبر مکمل سعادت ہے وہ اس مقام میں اس نعمت کے ساتھ موت و انقطاع سے امن میں رہیں گے جس میں نہ انتہا ہے نہ انقطاع بلکہ ابدًا ابدًا ہو گی۔ **اللّٰھم ارزقنا** . آمین.

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَافَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ﴿٢٦﴾ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾

اللہ اس بات سے عار نہیں کرتا کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکھی مکڑی وغیرہ) کی مثال بیان فرمائے، جو مومن ہیں وہ یقین کرتے ہیں کہ وہ ان کے پروردگار کی طرف سے سچ ہے اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ کی مراد ہی کیا ہے اس سے (اللہ) بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت بخشتا ہے اور گمراہ بھی کرتا ہے تو نافرمانوں ہی کو۔ جو اللہ کے اقرار کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جس چیز (یعنی رشتہ قرابت) کے جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو قطع کیے ڈالتے ہیں اور زمین میں خرابی کرتے ہیں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

فائدہ: فرقان کریم میں کہیں مکھی کی مثال ہے کہیں مکڑی کی، اس پر کافر اس کو عیب شمار کرتے تھے کہ اللہ کی شان کبریائی کے لائق نہ ہے کہ وہ ان حقیر چیزوں کی مثال دے۔ اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو اس میں یہ ذکر نہ ہوتے اس پر یہ دو آیات نازل ہوئیں۔

فائدہ: ربیع بن انس نے کہا کہ اللہ کریم نے یہ مثال دنیا کے لیے بیان کی ہے کہ جس طرح مچھر جب تک بھوکا رہتا ہے تب تک زندہ رہتا ہے۔جب پیٹ بھر کے کھاتا ہے تو تن کر مر جاتا ہے۔اسی طرح یہ قوم بھی جب دنیا پیٹ بھر کے حاصل کر لیتے ہیں تو اللہ انہیں پکڑ لیتا ہے۔جیسے فرمایا:﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ ”کہ جب وہ اس چیز کو بھول گئے جو انہیں یاد دلائی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔“یعنی ہر چیز بکثرت دی۔ [بروایت ابن جریر] گویا یہ سبب نزول کے متعلق اختلاف ہے۔ ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے اس لیے کہ اس کا سیاق مضمونِ سورت سے زیادہ ملتا ہے۔حدیث پاک میں مذکور ہے کہ اگر اللہ کے نزدیک اس دنیا کی مچھر کے پر جتنی بھی قدر ہوتی تو کبھی کسی کافر کو ایک پانی کا گھونٹ نہ دیتا۔معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک دنیا مچھر کے پر سے بھی زیادہ بے وقعت ہے۔اس بنا پر فوق کے معنی حقارت کی طرف ہوں گے یعنی جو اس سے بھی زیادہ حقیر ہو۔اکثر محققین کا یہی قول ہے۔بعض نے فوق سے اکبریت مراد لی ہے۔اس لیے کہ مچھر سے چھوٹی کوئی چیز نہ ہے۔ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔بدلیل حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا وعن سائر المومنات: کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کو کوئی کانٹا نہیں لگتا یا اس سے اوپر کوئی تکلیف مگر اس کے بدلے اس کے لیے ایک درجہ لکھا جاتا ہے اور اس کی خطاء مٹادی جاتی ہے۔سو اللہ کریم نے بیان فرمایا کہ مثال دینے سے کوئی چیز چھوٹی نہیں ہو جاتی اگرچہ حقارت میں مچھر کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔جس طرح مچھر کو پیدا کرنے میں کوئی عار نہ ہے اس طرح اس کی مثال دینے میں بھی کوئی محل عار نہ ہے۔اسی لیے مکھی اور مکڑی کی مثال بیان فرمائی۔فرمایا:﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴾ یعنی ”اے لوگو!ایک مثال بیان کی گئی ہے اسے غور سے سنو۔کہ بلاشبہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ہرگز ایک مکھی بھی پیدا نہ کر سکیں گے اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین کر لے جائے تو اس سے چھڑا بھی نہیں سکتے۔چاہنے والا اور جس کو چاہا گیا دونوں کمزور ہیں۔“ اور اللہ نے فرمایا:﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ ”ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اللہ کے سوا دوست بنا رکھے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا اور بلاشبہ تمام گھروں سے مکڑی کا گھر کمزور ہے۔کاش کہ وہ جانتے ہوتے۔“ اور اللہ کریم نے فرمایا:﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۙ تُؤْتِيْۤ

اُكُلَهَا كُلَّ حِيۡنٍ بِاِذۡنِ رَبِّهَا وَيَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيۡثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيۡثَةِ اجۡتُثَّتۡ مِنۡ فَوۡقِ الۡاَرۡضِ مَالَهَا مِنۡ قَرَارٍ ٥ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَفِى الۡاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيۡنَ وَيَفۡعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ﴾ ''کیا آپ نے نہ دیکھا کہ اللہ نے کیسے مثال بیان کی پاکیزہ کلمے کی، مثال ایسے ہے جیسے پاکیزہ درخت ہو جس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں۔ جو ہر وقت میں اپنے رب کے حکم سے اپنا میوہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے مثال بیان فرماتا ہے کہ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور برے کلمے کی مثال ناپاک درخت کی سی ہے جو زمین کے اوپر جگہ پکڑے اس کو کوئی قرار نہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ثابت بات کے ساتھ دنیا و آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے۔ اور اللہ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔'' اور فرمایا:﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبۡدًا مَّمۡلُوۡكًا لَّا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ﴾ اللہ تعالیٰ نے ایک غلام کی مثال بیان فرمائی جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔ پھر فرمایا:﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيۡنِ اَحَدُهُمَا اَبۡكَمُ لَا يَقۡدِرُ عَلٰى شَىۡءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوۡلٰٮهُ اَيۡنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاۡتِ بِخَيۡرٍ هَلۡ يَسۡتَوِىۡ هُوَ وَمَنۡ يَّاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ ......اٰية﴾ ''اور اللہ نے دو آدمیوں کی مثال بیان فرمائی کہ جن میں سے ایک گونگا ہے جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا ہے اور وہ اپنے صاحب پر بوجھ ہے وہ اسے جس طرف بھی بھیجتا ہے اور وہ خیر نہیں لاتا کیا وہ برابر ہے؟ اور وہ شخص جو عدل سے حکم دیتا ہے۔'' اور فرمایا:﴿ضَرَبَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ هَلۡ لَّكُمۡ مِّنۡ مَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ مِّنۡ شُرَكَآءَ فِىۡ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ﴾ ''اور تمہارے لیے ایک اور مثال تمہارے نفسوں سے بیان کی کہ کیا تمہارے دائیں ہاتھوں کے مملوکوں میں تمہارے کوئی شریک ہیں اس چیز میں جو ہم نے تم کو عطا کیا۔'' اور فرمایا:﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيۡهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوۡنَ﴾ ''اور اللہ نے ایک ایسے شخص کی مثال بیان کی جس میں ضدی لوگ شریک ہوں۔'' اور فرمایا﴿وَتِلۡكَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعۡقِلُهَاۤ اِلَّا الۡعٰلِمُوۡنَ﴾ ''اور یہ وہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں، اور ان کو نہیں سمجھتے مگر وہی لوگ جو جاننے والے ہیں۔'' غرضیکہ قرآن میں بہت سی امثال بیان کی گئی ہیں۔ بعض سلف نے فرمایا کہ جب میں قرآن میں کسی مثال کو سنتا ہوں لیکن وہ مجھے سمجھ نہیں آتی تو اپنے نفس پر روتا ہوں اس لیے کہ حکیم حقیقی نے فرمایا:﴿ تِلۡكَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعۡقِلُهَاۤ اِلَّا الۡعَالِمُوۡنَ﴾ ''کہ یہ مثالیں ہم نے لوگوں کے لیے بیان (تو) کرتے ہیں لیکن اس کو سمجھتے صرف عالم ہی ہیں۔'' حضرت مجاہد نے فرمایا: امثال چھوٹی ہوں یا بڑی ہوں مومن سب پر ایمان لاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ

انہیں ان امثال سے ہدایت دیتا ہے۔ ابو العالیہ نے فرمایا کہ جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اللہ کو ان امثال سے کیا مطلب تھا؟ جیسا کہ سورۃ مدثر میں فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلْنَا اَصْحَابَ النَّارِ اِلَّا مَلٰئِكَةً وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِيْمَانًا وَلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَرَضٌ وَالْكَافِرُوْنَ مَا ذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا كَذَالِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَشَآءُ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ﴾ ”اور نہیں کیا ہم نے آگ کے داروغوں کو مگر فرشتے اور نہیں کیا ہم نے ان کی تعداد کو مگر کافروں کے لیے فتنہ، تاکہ اہل کتاب یقین کریں اور ایمان والے ایمان میں زیادہ ہوں اور اہل ایمان اور اہل کتاب کسی شک میں نہ رہیں۔ اور تاکہ کافر اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ اس مثال سے کیا چاہتا ہے۔ اسی طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور تیرے رب کے لشکر کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“ اسی طرح اس سورۃ بقرہ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعے ہدایت دیتا ہے اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اور اس سے فاسق ہی گمراہ ہوتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا کہ ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ سے منافقین مراد ہیں اور پھر ﴿يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ سے مومنین مراد ہیں۔ منافقوں نے جب مثال کو سچ سمجھ کر بھی انکار کیا تو گمراہی پر گمراہی میں بڑھ گئے اور مومنین نے جب اس کو سچ سمجھ کر تصدیق کی تو ہدایت پر ہدایت میں زیادہ ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ اہل کفر مراد ہیں جو جاننے کے باوجود انکار کر دیتے ہیں۔ کسی نے خوارج مراد لیے ہیں اور یہ تفسیر بالمعنی ہے۔ کیونکہ اس آیت کے نزول کے وقت خوارج موجود نہ تھے لیکن آیت کے عموم میں وہ بھی داخل ہیں۔ اس لیے کہ خارجی اس شخص کو کہتے ہیں جو اطاعت شریعت سے نکلتا ہے اور فاسق بھی اسی کو کہتے ہیں۔ اور فاسق کا لفظ کافر و عاصی دونوں کو شامل ہے۔ لیکن اتنی بات ہے کہ کافر کا فسق زیادہ گہرا ہوتا ہے اور اس آیت میں فاسق سے کافر مراد ہے۔ واللہ اعلم۔ اس لیے کہ یہاں جو صفات نقض عہد وغیرہ فاسق کی بیان کی گئی ہیں ویسی صفات کافروں کی ہیں۔ مومنین کے اوصاف اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ جس طرح سورۃ رعد میں فرمایا ہے: ﴿اَفَمَنْ يَعْلَمُ اَنَّمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ -اِلٰى قوله- وَيَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَا اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ

الدَّارِ﴾ ”کیا پس جو شخص جانتا ہے کہ جو آپ کی طرف اتارا گیا ہے وہ حق ہے کیا وہ اس کی طرح ہے جو اندھا ہے۔ بلاشبہ عقلمند ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں جو اللہ کے عہد پورے کرتے ہیں اور وعدہ کو توڑتے نہ ہیں وہ لوگ جو اس چیز کو ملاتے ہیں جس کو ملانے کا حکم ہوا اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب سے ڈرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے عہد کو مظبوطی کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے ملانے کا حکم دیا اور وہ زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور برا گھر ہے۔“ قرطبی نے کہا کہ اس آیت میں مذہب اہل سنت پر دلالت ہے کہ ہدایت و ضلالت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ زمخشری نے کہا ہے کہ اضلال کی اللہ کی طرف نسبت مجازی ہے یہ اعتزال کا عقیدہ ہے اس کو امام رازی نے اپنی تفسیر میں بہت خوب حل کیا ہے۔

فائدہ: اس جگہ عہد سے مراد اللہ کی اوامر و نواہی ہیں وہ وصیت ہے جو اس نے انبیاء اور کتب سماویہ کے ذریعے اپنی مخلوق سے کی۔ اس کو توڑنے سے مراد اس پر عمل نہ کرنا ہے کسی نے کہا کہ مراد اہل کتاب کے کافر اور منافقین ہیں اللہ نے تورات میں ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ تورات پر چلیں اور محمد ﷺ کی پیروی کریں، جب وہ مبعوث ہوں ان کی تصدیق کریں۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ آئے تو انہوں نے پہچان کر انکار کر دیا اور لوگوں سے ان کا حق ہونا چھپایا یہ عہد شکنی ہوئی۔ ابن جریر نے اس کو اختیار کیا ہے۔ کسی نے یوں کہا ہے اس آیت سے سارے اہل کفر و شرک و نفاق مراد ہیں۔ ان سے عہد توحید لیا گیا ان پر ادلہ ربوبیت ظاہر کیے گئے۔ یہ اقرار یہی تھا کہ جب ہمارے رسول معجزات لائیں جن پر کوئی بشر قادر نہ ہے، تو تم ان کے اوامر و نواہی قبول کرنا۔ انہوں نے اس عہد و اقرار کو اس طرح توڑ دیا کہ توحید و نبوت و کتاب سب کے منکر ہو گئے۔ زمخشری نے اسی کو زیادہ مناسب سمجھا ہے۔ ابن کثیر نے بھی اسی وجہ کو حسن کہا۔ کسی نے کہا کہ اس عہد سے ان کا عہد: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ ہے، جس کا توڑنا عدم وفا تھا۔

فائدہ: ابو العالیہ نے کہا کہ منافقین کی چھ خصلتیں ہوتی ہیں: جب ان کو لوگوں پر غلبہ ملتا ہے تو ساری خصلتیں ظاہر کر دیتے ہیں۔ جب بات کریں تو جھوٹ بولیں، وعدہ کریں تو خلاف کریں، جب امین ہوں تو خیانت کریں۔ اللہ سے عہد کر کے توڑ ڈالیں، جس چیز کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ان کو توڑ دیں، زمین میں فساد کریں، اگر انہیں لوگوں پر غلبہ حاصل ہو تو پہلی تین باتیں ظاہر کر دیتے ہیں اور پچھلی تین سے خاموش ہو رہتے ہیں۔ ربیع بن انس نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ سدی نے کہا عہد وہ ہے جو ان سے قرآن میں لیا گیا۔ انہوں نے اس کا اقرار کیا بعد ازاں کافر ہو کر پھر اسے توڑ دیا۔ اور کاٹنے سے مراد صلہ رحم کا قطع کرنا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ

تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ﴾''کہ شاید اگر تمہیں غلبہ (ولایت) مل جائے تو تم زمین میں فساد کرو اور قطع رحمی کرو۔''ابن جریر نے اس کو راجح کہا ہے۔کسی نے کہا بلکہ ہر وہ چیز ہے جس کے وصل و فعل کا حکم تھا۔اس کو قطع کیا، چھوڑ دیا۔جیسے مومنین سے دوستی اور قول و عمل کو باہم مطابق کرنا۔جماعات سے مفروضہ کا لزوم، لفظ شرائع و حدود اور ہر خیر کو ترک کرنا اور ہر شر پر عمل کرنا اس سے خالق و مخلوق کا وہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے جو ان کے درمیان قائم تھا۔جمہور کا یہی قول ہے اور اس کو عام رکھنا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔واللہ اعلم.

فائدہ: زمین میں فساد کرنے سے ان اقوال و افعال کا ارتکاب مراد ہے جو اللہ کے حکم کے خلاف ہوں۔ جیسے عبادة غير الله۔ مخلوق کو تکلیف دینا، اور اس چیز کو بدل دینا جس کی محافظت کا حکم دیا گیا تھا۔ غرضیکہ جو چیز شرعاً و عقلاً خلاف صلاح ہے وہ فساد ہے۔حضرت قتادہ نے فرمایا میں نہیں جانتا کہ اللہ نے کسی گناہ پر ایسی وعید کی ہو جیسی نقض میثاق پر سخت وعید کی۔سو جس نے اللہ سے کوئی اقرار کیا سچے دل سے کوئی عہد کیا اس کو چاہئے کہ اپنا اقرار پورا کرے اور اپنا عہد وفا کرے۔احادیث صحیحہ میں عہد شکنی کی نفی فرمائی ہے اور اس پر سخت وعید فرمائی ہے۔مقاتل بن حیان نے کہا:﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ﴾''کہ وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔''اس آیت کی طرح ہے:﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ﴾''یہی لوگ ہیں جن کے لیے لعنت ہے اور برا گھر ہے۔''حضرت ابن عباس نے کہا کہ جس چیز کو اللہ نے غیر اہل اسلام کی طرف نسبت کیا جیسے خاسر وغیرہ اس سے گناہ مراد ہے، اور جس کو اہل اسلام کی طرف منسوب کیا اس سے کفر مراد ہے۔خسران ، تجارت میں نقصان کو کہتے ہیں۔منافق و کفر کا یہی نقصان ہے کہ وہ رحمت ربانی سے دور و محروم ہیں اس سے زیادہ نقصان اور کیا ہوگا؟

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴿۲۸﴾

(کافرو) تم اللہ سے کیونکر منکر ہو سکتے ہو جس حال میں کہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو جان بخشی پھر وہی تم کو مارتا ہے پھر وہی تم کو زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

فائدہ: اس آیت مبارکہ میں اللہ کریم نے اپنے وجود قدرت خالق و مشرف ہونے پر دلیل بیان کی ہے، کہ تم کیسے اللہ کے وجود کا انکار کرتے ہو اور اس کے غیر کو معبود بنائے ہوئے ہو جبکہ وہ تو ایسا قادر ہے کہ اس نے تمہیں عدم سے وجود بخشا۔جیسے فرمایا:﴿اَمْ خُلِقُوْا بِغَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۔ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ﴾''کہ کیا وہ بغیر کسی چیز (ذات) کے پیدا ہوئے ہیں یا وہ خود پیدا کرنے والے ہیں یا

انہوں نے آسمان وزمین پیدا کیے ہیں بلکہ وہ یقین نہیں کرتے ہیں۔" اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا:﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾"کہ یقیناً انسان پر ایک ایسا وقت بھی آیا ہے جب کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔" اس مضمون کی آیات اور بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:﴿قَالُوْا رَبَّنَا اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا﴾"کہ انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو موتیں دیں اور دو زندگیاں دیں پھر ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا۔" یہ اسی طرح ہے جیسے فرمایا:﴿كُنْتُمْ اَمْوَاتًا...... الخ﴾ حضرت ابن عباس نے فرمایا تم مردہ تھے یعنی اپنے آباء کی پشتوں میں کچھ چیز نہ تھے پھر تمہیں پیدا کیا پھر حقیقتاً تمہیں مارا۔ پھر دوبارہ زندگی دے گا۔ یہ اس آیت کی طرح ہے جو فرمایا:﴿اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ﴾"کہ تو نے ہمیں دو موتیں اور دو زندگیاں دیں۔" ان کا دوسرا لفظ اس طرح ہے کہ تم پیدا ہونے سے پہلے مٹی تھے یہ ایک طرح کی موت ہے۔ پھر تمہیں زندہ کیا، یہ زندگی ہوئی پھر دو دفعہ مرنا اور دو دفعہ زندہ ہونا معلوم ہوا۔ کسی نے کہا کہ زندگی کے بعد موت دینا یہ ہے کہ قبر میں زندہ کر کے پھر مارے گا لیکن حضرت ابن مسعودؓ و ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اس کے متعلق زیادہ درست ہے جو ابھی ذکر کیا گیا تھا۔ تابعین کی ایک جماعت بھی اس طرف گئی ہے۔ جیسے فرمایا:﴿قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَارَيْبَ فِيْهِ﴾"کہہ دیجئے! اللہ تمہیں زندہ کرتا ہے پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں اس قیامت کے دن کی طرف جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہ ہے۔" پھر بتوں کے متعلق فرمایا:﴿اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ﴾"یعنی وہ مردہ ہیں زندہ نہ ہیں اور وہ شعور نہیں رکھتے۔" اور فرمایا:﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا فَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ﴾"اور ان کے لیے مردہ زمین بھی نشانی ہے۔ ہم نے اس کو زندہ کیا پھر ہم نے اس سے دانے نکالے۔ جس میں سے وہ کھاتے ہیں۔" ماحصل یہ ہوا کہ پہلی موت سے مراد عدم سابق اور حیات اول سے مراد پیدائش ہے اور دوسری موت سے مراد وہ موت ہے جس کا وعدہ دیا گیا ہے، اور دوسری زندگی سے مراد بعث ہے۔ فتح البیان میں لکھا ہے کہ یہ تفسیر سب اقوال سے عمدہ ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اس طرف ہی گئی ہے۔ ابن عطیہ نے کہا اس آیت سے یہی قول مراد ہے۔ اور کافر کسی طرح اس سے گریز نہیں کر سکتے اس لیے کہ جب انہوں نے یہ بات مان لی کہ پہلے معدوم تھے پھر موجود ہوئے پھر یہاں ایک دن مریں گے اب انہیں دوسری زندگی کا اقرار کرنا بھی لازم ہے۔ کسی نے کہا کہ قبر کی زندگی بھی دنیا کی زندگی کے حکم میں ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾

وہی تو ہی جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لیے پیدا کیں پھر آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا، توان کو ٹھیک سات آسمان بنادیا اور وہ ہر چیز سے خبر دار ہے۔

ابن کیسان نے فرمایا کہ زمین کے سارے خزائن، نباتات، حیوانات، دریا، پہاڑ وغیرہ تمہارے دنیاوی و دینی نفع کے لیے ہیں۔ دینی نفع یہ ہے کہ تم ان سب کو دیکھ کر اللہ کی قدرت کے عجائبات کو پہچانو اور اس کی وحدانیت کو مانو اور دنیا میں بھی ان سب چیزوں سے نفع حاصل کرو اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر چیز میں اصل اباحت (جواز) ہی ہے الا یہ کہ کوئی خاص دلیل اسکو اس کی اصل سے پھیر دے۔ اس میں حیوانات بھی داخل ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی پتا چلا کہ مٹی کھانا حرام ہے کیونکہ اللہ نے ہمارے لیے مافی الارض کو نافع بنایا، نفس ارض کو نہیں۔ لیکن یہ ایک احتمالی استدلال ہے اس سے بہتر یہ دلیل ہے کہ حدیث میں مٹی کھانے کی حرمت مذکور ہے اس کے سوا مٹی مضر صحت بھی ہے۔ [بقول ابن کثیر]

فائدہ: پہلے توحید کی وہ دلیل بیان کی جو خود ان کے نفسوں میں تھی اب زمین و آسمان کی تخلیق کے اندر توحید پر دلالت کی ہے۔ اس جگہ استواء کے معنی مقصد کے ہیں اور لفظ آسمان جنس کا لفظ ہے۔ اللہ کے ہر چیز سے واقف ہونے میں اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا علم ساری مخلوقات پر حاوی ہے۔ جس طرح فرمایا: ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ "کہ کیا وہ نہیں جانتا جس نے ساری مخلوقات پیدا کی ہیں۔" معلوم ہوا کہ خالق کو تمام مخلوقات کا علم ہونا لازم ہے۔ کیونکہ اس میں کلیات و جزئیات تمام علوم داخل ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا کہ صفت علم تمام صفات کی امام ہے۔

فائدہ: اس آیت کی تفسیر سورۃ حٰم سجدہ میں آئی ہے۔ فرمایا: ﴿قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أَنْدَادًا ذَٰلِكَ رَبُّ الْعَالَمِينَ ○ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِلسَّائِلِينَ ○ ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ○﴾ "فرمادیجئے! کیا تم اس ذات کا کفر کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا اور تم اس کے شریک بناتے ہو یہ رب العالمین ہے۔ اور اس میں اوپر سے پہاڑ بھی رکھ دیئے اور اس میں برکت دی اور چار دنوں میں اس کے اندر اس کے (خزانے) خوراک رکھ دی۔ برابر ہے سوال کرنے والوں کے لیے۔ پھر آسمان کی

طرف بلند ہوا اور وہ دھواں تھا پھر اس کو اور زمین کو کہا کہ دونوں خوشی یا ناخوشی سے آ جاؤ۔ انہوں نے کہا (بلکہ) ہم دونوں خوشی سے آتے ہیں۔ پھر دو دنوں میں اسے سات آسمان درست بنا دیا اور ہر آسمان میں اس کا حکم وحی کر دیا۔ اور آسمان دنیا کو ستاروں سے زینت دی اور ان کو محافظ بنا دیا۔ یہ زبردست علم والے کا اندازہ ہے۔" اس آیت میں اس بات کی دلالت ہے کہ پہلے اللہ نے زمین بنائی پھر سات آسمان بنا دیئے۔ عمارت بنانے والا بھی اسی طرح کرتا ہے کہ پہلے نیچے سے بنیاد رکھتا ہے پھر چھت کی طرف جاتا ہے۔ رہی یہ آیت کہ ﴿أَمِ السَّمَآءُ بَنَاهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا﴾ الی قولہ ﴿وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَالِكَ دَحَاهَا﴾ "کہ کیا تم تخلیق میں مضبوط ہو یا وہ آسمان جس کو اس نے بنایا جس نے اس کی بلندی اٹھائی پھر اس کو درست کر دیا۔ یہاں تک کہ زمین کو اس کے بعد بچھایا۔" اس میں خبر کا خبر پر عطف ہے نہ کہ فعل کا فعل پر عطف۔ کسی نے کہا کہ زمین کو پیدا تو پہلے کیا لیکن بچھایا بعد میں۔

فائدہ: حضرت ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا کہ اللہ کا عرش پانی پر تھا۔ اللہ کریم نے پانی سے قبل کوئی چیز پیدا نہیں کی۔ پھر جب مخلوق بنانے کا ارادہ کیا تو پانی سے دھواں پیدا کیا، وہ پانی کے اوپر بلند ہو گیا۔ اللہ نے اس کا نام آسمان رکھا، پھر پانی کو خشک کر دیا اس کا نام زمین رکھا۔ یہ زمین ایک ہی تھی، اسکو پھاڑ کر سات زمینیں بنا دیا، اور یہ کام دو دن میں کیا۔ اتوار اور پیر کو یہ زمین ایک مچھلی کے اوپر پیدا کی یہ وہی مچھلی ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے۔ ﴿نٓ وَالْقَلَمِ﴾ "اور قسم ہے قلم کی۔" یہ مچھلی پانی میں ہے اور وہ پانی ایک صاف پتھر پر ہے۔ پتھر ایک فرشتے کی پشت پر ہے اور فرشتہ ایسے سخت پتھر پر ہے جو ہوا میں ہے۔ اس پتھر کا ذکر لقمان نے کیا ہے۔ یہ پتھر نہ آسمان میں ہے نہ زمین میں۔ مچھلی نے حرکت کی تو زمین ہلنے لگی، اللہ نے اس پر پہاڑ رکھ دیئے تو وہ ٹھہر گئی۔

زمین از تپ و لرزہ آمد ستوہ　　فرو کوفت بر دامنش میخ کوہ

زمین پر پہاڑوں کو اس بات کا فخر ہے۔ اس آیت کا یہی مطلب ہے کہ: ﴿وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ﴾ "کہ ہم نے زمین میں پہاڑ رکھ دیئے کہ وہ ان کو لے کر جھک جائے۔" اللہ نے پہاڑ، لوگوں کی خوراک، اور درخت وغیرہ دو دن میں پیدا کیے۔ یعنی منگل اور بدھ کو۔ اس آیت کا یہی مطلب ہے جو فرمایا: ﴿قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْأَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ "کہ تم ایسی عظیم ذات کا کفر کرتے ہو جس نے دو دن میں زمین کو پیدا کیا۔ دھواں پانی کے بخارات سے اٹھا اس کو آسمان بنا دیا یہ آسمان ایک ہی تھا۔ پھر اس کو سات بنا دیئے۔ یہ کام جمعرات اور جمعہ کو ہوا۔ اس دن کو جمعہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس دن زمین و آسمان کی تخلیق جمع ہو گئی۔ ہر آسمان میں اس کا امر وحی کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس میں فرشتے بنائے، دریا، پانی، برف اور پہاڑ بنائے اور

نا معلوم کئی چیزیں اور بنادیں۔ پھر ہر آسمان کو ستاروں سے مزین کر کے شیاطین سے حفاظت کا سامان کر دیا۔ پھر جب اس تخلیق سے فارغ ہوا تو عرش پر مستوی ہوا۔ اس آیت کا یہی مطلب ہے جو فرمایا: ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ "کہ آسمان و زمین کو چھ دنوں میں بنایا، پھر عرش پر مستوی ہوا۔" اور فرمایا: ﴿كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ "کہ وہ دونوں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان دونوں کو جدا جدا کیا اور پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا۔" حضرت عبداللہ بن سلام کا قول ہے کہ اتور کو تخلیق کی ابتداء کی، اتوار اور پیر کو ساری زمینیں بنائیں، بدھ اور منگل کو پہاڑ اور خوراک پیدا کی۔ اور جمعرات و جمعہ کو آسمان بنایا۔ جمعہ کے دن پچھلے وقت فارغ ہوا اس وقت حضرت آدم کو پیدا کیا۔ اس وقت قیامت قائم ہوگی۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ ایک آسمان دوسرے کے اوپر ہے اور ایک زمین دوسری کے نیچے ہے۔

فائدہ: ابن کثیر فرماتے ہیں اس آیت سے پتا چلا کہ زمین آسمان سے پہلے پیدا کی گئی اور سورۃ حٰم سجدہ سے بھی یہی بات اخذ ہوتی ہے۔ پہلے زمین کی تخلیق کا ذکر ہے پھر آسمان کی طرف جانے کا ذکر ہے۔ ان آیات کے مطالب کی دلالت کی وجہ سے میں نہیں جانتا کہ علماء میں سے کسی نے اس کے متعلق اختلاف و بحث کو ہوا دی ہو۔ مگر قتادہ نے فرمایا کہ آسمان زمین سے پہلے پیدا ہوا ہے۔ قرطبی نے اس میں توقف کیا ہے۔ صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ بعینہٖ یہ سوال کسی نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی کیا۔ انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا کہ: زمین کو آسمان کی تخلیق کے بعد بچھایا گیا لیکن پیدا پہلے ہی کی گئی تھی۔ یعنی پہلے زمین بنائی پھر آسمان بنایا، پھر زمین کو برابر بچھا دیا۔ یہی جواب علماء قدیم اور علماء حدیث و تفسیر نے دیا ہے جس کو ہم نے والنازعات کے تحت مکمل بیان کیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جو کچھ زمین کے اندر ہے ان سب کو آسمان کی تخلیق کے بعد قوت فعل دی۔ لیکن نفس زمین، آسمان سے پہلے بنی ہے۔ جیسے نباتات و جمادات پانی وغیرہ بمع ان کے رنگ و نسل اور بو کے اختلاف کے۔ اسی طرح آسمان کا گردش کرنا اپنے ثوابت و سیارات کے ساتھ اور افلاک کا چکر لگانا ان چیزوں سمیت جو اللہ نے ان کے اندر رکھی ہیں وغیرہ۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: فتح البیان میں بھی اسی طرح کی آیات میں یوں ہی تطبیق دی گئی ہے کہ زمینوں کو آسمان کی تخلیق کے بعد پھیلایا ہے۔ پھر کہا کہ تطبیق کا یہ انداز عمدہ ہے اسی کو موقف ماننا چاہئے۔ امام شوکانی کا بھی یہی قول ہے۔ آیت مذکور سے آسمانوں کا سات ہونا ثابت ہے۔ رہی زمین تو اس کے متعلق قرآن میں ایک جگہ ارشاد فرمایا کہ: ﴿وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ "کہ زمین بھی اسی کی مانند ہے۔" اس سے بعض نے گنتی مراد لی ہے کہ زمینیں بھی

سات ہیں۔ کسی نے اس کا وجود مراد لیا ہے کہ اتنی ہی موٹی ہے۔ماوردی نے کہا کہ ساتوں زمینیں ملی ہوئی ہیں ان میں فاصلہ نہ ہے۔ لیکن درست بات یہ ہے کہ وہ بھی جدا جدا ہیں۔ مگر دعوت اسلام اسی زمین کے ساتھ خاص ہے جس پر ہم رہتے ہیں۔ حدیث صحیح میں بھی زمینوں کی تعداد سات مذکور ہے۔امام رازی نے آسمانوں کی تعداد کے متعلق بحث کی کہ وہ سات ہیں یا آٹھ اس کے بعد حکماء کے مذاہب ذکر کیے آخر میں کیا عمدہ بات فرمائی کہ اس خبط سے تمہیں یہ ہوشیاری حاصل ہو جائے گی کہ عقل ان چیزوں کی دریافت سے قاصر ہے۔ یہ اسی کو علم ہے جس نے ان کو بنایا ہے۔اس لیے یہاں ان کی سنی سنائی دلیلوں پر اکتفا کرنا واجب ہے۔ حدیث میں اہل سنن کے نزدیک آسمانوں کے وصف میں جماعتِ صحابہؓ سے کئی احادیث منقول ہیں۔ ہر آسمان کی موٹائی پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ ہر آسمان کا دوسرے سے فاصلہ بھی اسی مدت کی مقدار جتنا ہے اور دونوں آسمان و زمین کی تعداد سات سات بتائی ہے۔ مگر کسی صریح و صحیح مرفوع حدیث میں یہ نہیں آیا کہ اس اوپر کی زمین کی طرح ہر زمین میں علماء و انبیاء اور کئی مخلوقات ہر زمین میں ہیں۔اس جگہ اگرچہ صحابہ تک آثار کی اسناد صحیح ہیں کیوں نہ ہو لیکن وہ قابلِ حجت نہ ٹھہریں گے۔ کیونکہ غالباً ایسے آثار اسرائیلیات سے لیے گئے ہیں۔ جن کا حکم یہ ہے کہ: «لَا تُصَدِّقُوهُمْ وَلَا تُكَذِّبُوهُمْ» ”کہ ان کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب کرو۔“ سو ہمیں اس مقام پر توقف کرنا چاہیے۔

فائدہ: نسائی اور مسلم نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ اللہ نے مٹی کو ہفتے کے دن، پہاڑوں کو اتوار کے دن، درختوں کو پیر کے دن، مکروہ چیزوں کو منگل کے دن، نور کو بدھ کے دن جانداروں کو جمعرات کے دن اور آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر سے رات تک کے اوقات کے درمیان پیدا کیا۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ حدیث غرائب مسلم میں سے ہے۔ علی بن المدینی اور بخاری اور بہت سے حفاظ نے اس حدیث میں کلام کیا ہے اور اس کو کعب احبار کا کلام قرار دیا ہے۔ ابوہریرہ نے یہ کعب الاحبار سے سنا لیکن کچھ رواۃ نے اس کو وہم سے مرفوع ٹھہرا دیا۔ بیہقی نے اس کی تحقیق کی ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۰﴾

اور (وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں (اپنا) نائب بنانے والا ہوں، انہوں نے کہا کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں (اللہ نے) فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

فائدہ: اللہ کریم نے یہاں ابن آدم پر اپنے احسان کا ذکر کیا کہ دیکھو تمہارے وجود سے قبل ہم نے تمہارا ذکر مَلَاءُ الْاَعْلٰی میں کیا۔اور قرن در قرن اور قوم در قوم تیرا خلیفہ ہونا ثابت کیا۔جیسے ارشاد فرمایا:﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ﴾"کہ وہی ذات ہے جس نے تمہیں زمین میں نائب بنادیا۔"اور فرمایا:﴿وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ﴾"کہ وہ تمہیں زمین میں نائب بناتا ہے۔"اور فرمایا:﴿وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ﴾"اور اگر ہم چاہیں تو تمہاری نسلوں سے فرشتے پیدا کردیں۔جو زمین میں نائب بن کر رہیں۔"اور ایک اور مقام پر فرمایا:﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ﴾"کہ ان کے بعد ایسے خلیفہ ہوئے۔"ابن کثیر نے فرمایا اس جگہ خلیفہ سے مراد اکیلے آدم نہ ہیں جس طرح کہ مفسرین کے ایک گروہ نے فرمایا۔قرطبی نے اسکو ابن مسعودؓ وابن عباسؓ اور تمام اہل تاویل کی طرف منسوب کیا ہے کیونکہ اس میں نظر ہے اور اختلاف شدید ہے۔رازی نے اس کا ذکر کیا۔اگر اس سے صرف آدم علیہ السلام مراد ہوتے تو فرشتے یہ نہ کہتے کہ تو فساد کرنے والوں اور خونریزوں کو کیوں (خلیفہ) مقرر کرتا ہے۔بلکہ جنس انسان مراد ہے۔یہ بات کہ وہ فساد کریں گے۔فرشتوں کو کسی علم خاص سے معلوم ہوگئی تھی یا انہوں نے طبیعت بشریہ سے اندازہ لگالیا ہوگا۔اس لیے کہ اللہ نے انہیں بتادیا تھا کہ میں ان کو کھنکتی مٹی سے پیدا کروں گا۔یا خلیفہ کے لفظ سے وہ سمجھے ہوں گے کیونکہ خلیفہ کے وجود کا مقصد لوگوں کے فساد و مظالم کی روک تھام اور درست فیصلہ ہوتا ہے۔لیکن ملائکہ نے یہ بات اللہ سے بطور اعتراض یا ابن آدم سے بطور حسد نہ کہی جس طرح کہ بعض مفسرین کا قول اس کی نشاندہی کرتا ہے۔اس لیے کہ اللہ کریم نے فرمایا:﴿لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ﴾"کہ وہ اس سے بڑھ کر بات نہیں کر سکتے۔"یعنی اس کی اجازت کے بغیر وہ کوئی بات پوچھ نہیں سکتے۔﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾"کہ بلکہ وہ باعزت بندے ہیں۔"یعنی حسد سے بری ہیں۔یہاں تو اللہ کریم نے اس مخلوق کی تخلیق سے انہیں باخبر کیا ہے اور ان کا یہ سوال بطور دریافتِ حال تھا کہ اس مخلوق کے پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے جبکہ وہ خونریز اور فساد پسند ہوں گے اگر عبادت درکار ہے تو ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور ہم سے کوئی قصور بھی سرزد نہ ہوتا ہے۔ہم ہی پر اقتصار کرنا کیا برا ہے؟اللہ کریم نے فرمایا کہ اس مقصد کے باوجود جس کا تم ذکر کرتے ہو میں ان کی حکمت کو خوب جانتا ہوں۔تمہیں اس کا علم نہ ہے کیونکہ میں ان میں انبیاء و رسول بھیجوں گا۔اور میں ان میں صدیق،شہید،صالح،عابد،زاہد،اولیاء،ابرار و مقرب،علماء،عامل،خاشع،محب و متبع قسم کے لوگ پیدا کروں گا۔حدیث صحیح میں وارد ہے کہ جب فرشتے لوگوں کے اعمال لے کر چڑھتے ہیں تو باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ ان سے خوب واقف ہے فرشتوں سے سوال کرتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا،وہ کہتے ہیں کہ ہم ان سے جدا ہوئے تو وہ

نماز پڑھ رہے تھے۔اور جب ہم ان کے پاس گئے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔یہ اس لیے سوال ہوتا ہے کہ ہمارے پاس فرشتے آتے جاتے رہتے ہیں۔نماز صبح اور نماز عصر کے وقت باہم ملتے ہیں ایک آجاتے ہیں دوسرے چلے جاتے ہیں۔دوسری حدیث میں آیا ہے کہ رات کا عمل دن سے پہلے اور دن کا عمل رات سے پہلے اللہ کی طرف جاتا ہے۔سو ملائکہ کا یہ کہنا کہ ہم نے ان کو نماز پڑھتے پایا اور اس حالت میں چھوڑا گویا آیت:﴿اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾"کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔"کی تفسیر ہے۔اس کے سوا اور جوابات بھی رازی رحمہ اللہ نے ذکر کیے ہیں۔مگر یہ سب سے واضح ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس زمین میں پہلے جن آباد تھے،جب انہوں نے فساد مچایا اور خونریزی کی بعض نے بعض کو مارا تو اللہ کریم نے ابلیس کو ان کے قتل کے لیے بھیجا انہوں نے ان کو مار پیٹ کر دریاؤں کے بندوں کی طرف اور پہاڑوں کی طرف نکال دیا۔پھر اللہ کریم نے آدم کو بنا کر اس زمین میں پھیلایا،بسایا،اس لیے اس کو خلیفہ کہا۔ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں آدمیوں سے دو ہزار سال قبل جن آباد تھے۔ان کی خونریزی و فساد کے سبب اللہ نے ملائکہ کو بھیجا انہوں نے ان کو جزائر،دریاؤں کی طرف نکال دیا پھر ان کی جگہ آدم کو بسایا۔

فائدہ: حضرت قتادہ نے کہا کہ تسبیح سے مراد سبحان اللہ کہنا اور تقدیس سے مراد نماز پڑھنا ہے۔صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے بھی ایسا ہی کلام فرمایا۔حضرت مجاہد نے فرمایا کہ تسبیح سے مراد تعظیم اور تقدیس سے مراد تکبیر ہے۔ضحاک نے فرمایا تقدیس تطہیر ہے۔محمد بن اسحٰق نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ ہم تیری نافرمانی نہ کریں گے نہ کوئی ایسی بات کریں گے جو تجھے ناپسند ہو۔ابن جریر نے کہا تعظیم و تطہیر کو تقدیس کہتے ہیں۔یعنی بڑائی کرنا،پاک کہنا،اسی لفظ سے سُبُّوْحٌ و قُدُّوْسٌ ہے۔یعنی ہم تجھے اس چیز سے پاک اور بری کرتے ہیں جو اہل شرک تیری طرف منسوب کرتے ہیں۔ہم اس میل کچیل سے جو اہل کفر تیری طرف منسوب کرتے ہیں تجھے مبرہ و منزہ کہتے ہیں۔صحیح مسلم میں ابوذر سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ افضل کلام کیا ہے؟فرمایا: وہ کلام جسے اللہ نے فرشتوں کے لیے منتخب فرمایا:((سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ))بیہقی نے عبدالرحمٰن بن قرط سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج میں سماوات علا پر یہ تسبیح سنی۔((سبحان العلی الاعلی سبحانه و تعالیٰ))

فائدہ: قرطبی نے کہا اس آیت سے یہ بھی پتا چلا کہ فیصلہ حق اور نزاع کے خاتمہ،اقامت حدود اور اہم امور کے لیے خلیفہ کا وجود لازم ہے۔یہ ایسے معاملات ہیں جو امام کے بغیر قائم نہیں ہو سکتے۔سو جو واجب چیز کسی چیز کے بغیر تمام نہ ہو وہ بھی واجب ہو جاتی ہے۔یہ امامت یا تو نص سے مل سکتی ہے جس طرح حضرت ابو بکر امام

ہوئے یا اشارے سے یا خلیفہ مقرر کرنے سے جس طرح حضرت عمرؓ کو حضرت ابو بکرؓ نے خلیفہ نامزد کیا تھا یا مجلس شوریٰ کے صلحاء رکن پر چھوڑ دیتے ہیں۔ جس طرح حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ یا اہل حل و عقد کے اجتماع سے کسی شخص کی بیعت پر یا کسی ایک ایسے شخص کی بیعت کر لینے سے جس کا التزام جمہور کے نزدیک واجب ہے۔ امام الحرمین نے فرمایا کہ یہ مسئلہ اجتماعی ہے۔ واللہ اعلم. یا اس طرح کہ ایک شخص لوگوں کو اپنی اطاعت پر زیر کرے اس صورت میں بھی اس کی اطاعت واجب ہے۔ تاکہ اختلاف پیدا نہ ہو۔ شافعی نے اس پر نص کی ہے۔ عقد و امامت پر کسی کی گواہی ہونا کسی کے نزدیک شرط نہ ہے۔ اور جس کے نزدیک شرط ہے اس کے نزدیک دو گواہ ہونا کافی ہیں۔ یہ بات واجب ہے کہ امام وقت مرد، عالم، عاقل، بالغ، مسلمان، مجتہد، عادل، سلیم الاعضاء، بصیر، اور جنگی حربوں سے واقف کار قرشی النسب ہو یہی درست ہے۔ ہاشمی یا خطا سے معصوم ہونا شرط نہ ہے۔ ارتکاب فسق سے معزول نہ ہوگا۔ مگر یہ کہ کفر صریح ظاہر ہو۔ لوگوں کے پاس بھی اللہ کی طرف سے معزول کرنے کی دلیل موجود ہونی چاہیئے۔ خود معزول ہونے میں اختلاف ہے۔ امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے خلافت معاویہؓ کو دے دی اور خود معزول ہو گئے اور یہ معزول ہونا عذر کے باعث تھا۔ اس پر ان کی مدح کی گئی ہے۔ دو اماموں یا دو سے زیادہ اماموں کو ایک وقت مقرر کرنا درست نہ ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ جو شخص تمہارے پاس آئے اور تمہارا معاملہ اتفاق سے ہو وہ تم میں تفرقہ ڈالنا چاہے تو چاہے کوئی بھی ہو اس کو قتل کر دو۔ جمہور کا یہی قول ہے۔ امام الحرمین نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ ہاں استاذ ابو اسحاق نے دو اماموں یا زیادہ اماموں کا مقرر کرنا جائز کہا ہے مگر وہ بھی اس صورت میں جبکہ اطراف مملکت وسیع ہوں۔ مگر امام الحرمین کو اس میں تردد ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ خلفائے عباسیہ عراق میں تھے، فاطمین مصر میں اور امویوں کی حکومت مغرب میں تھی۔ ہم کتاب الاحکام سے اس کی تفصیل کسی اور مقام پر لکھیں گے۔ ان شاء اللہ. (کلام ابن کثیر)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ طوائف الملوک کا ہے اس کی اچھی بحث حسن المساعی میں لکھی گئی ہے۔ استاذ کا کہنا درست ہے۔

فائدہ: اللہ کا یہ فرمان کہ ہم خلیفہ مقرر کریں گے ملائکہ ارض سے تھا جو جنوں کے نکلنے کے بعد زمین میں بستے تھے۔ یا مطلقاً خطاب عام ملائکہ سے ہے۔ اس میں ان کو مشاورت کی تعلیم دی اور آدمؑ کی تعظیم بتائی۔ اور ان کے وجود کی حکمت بتائی کہ جس کام میں خیر غالب ہو اس کو شر پر اختیار کرنا بہتر ہوتا ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ فرشتوں سے مشورہ نہ تھا بلکہ ان کے دل کی بات پوچھنا تھا۔ بعض نے کہا بلکہ یہ انسانوں کو تعلیم ہے کہ باہم مشورہ کر لیا کریں۔ یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ فرشتے غیب نہ جانتے ہیں۔ غیب کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۱﴾ قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۳۳﴾

اور اس نے آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے کیا اور فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان کے نام بتاؤ، انہوں نے کہا تو پاک ہے جتنا علم تو نے ہمیں بخشا ہے اس کے سوا ہمیں کچھ معلوم نہیں بے شک تو دانا (اور) حکمت والا ہے۔ (تب) اللہ نے (آدم کو) حکم دیا کہ آدم! تم ان کو ان (چیزوں) کے نام بتاؤ جب انہوں نے ان کو ان کے نام بتائے تو (فرشتوں سے) فرمایا کیوں میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی (سب) پوشیدہ باتیں جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو پوشیدہ کرتے ہو (سب) مجھ کو معلوم ہے۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس جگہ آدم کی فرشتوں پر فضیلت بتائی۔ کہ ہم نے اسکو چیزوں کے نام سکھا کر خصوصیت دی۔ وہ ان چیزوں کے نام جانتے تھے لیکن فرشتے نہ جانتے تھے۔ یہ ماجرہ اس کے بعد ہوا کہ فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا لیکن اس فصل کو اس پر اس لیے مقدم کیا کہ اس مقام کو ملائکہ کے عدم علم سے خلیفہ کی تخلیق کی حکمت سے زیادہ مناسبت ہے۔ کیونکہ اللہ کریمنے ان کے سوال کے جواب میں یہ فرمایا تھا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے ہو۔ اس لیے اللہ نے اس امتحان کا یہاں ذکر کیا۔ تاکہ علم میں آدم کو فرشتوں پر جو برتری تھی وہ ظاہر ہو جائے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اللہ نے آدمؑ کی اولاد کے اور جانوروں کے نام الگ الگ بنا دیئے کہ یہ گدھا ہے یہ اونٹ ہے، یہ گھوڑا ہے، یہ زید، یہ عمرو اور یہ بکر ہے۔ ان کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ وہ یہی متعارف نام تھے۔ جن کو سب لوگ باہم بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ انسان، چوپائے، آسمان، زمین، دریا، گھوڑا، گدھا وغیرہ۔ تیسر الفظ یہ ہے کہ ان کو ان چیزوں کے نام بتائے گئے جو عام ہیں۔ جیسے یہ دیگچی ہے، یہ چمچہ ہے اور انہیں ریح کے نام بھی سکھائے۔ حضرت مجاہد نے فرمایا: ہر جانور، پرندے اور ہر چیز کے نام سکھائے۔ ربیع نے کہا فرشتوں کے نام سکھائے، کسی نے کہا ستاروں کے نام سکھائے، کسی نے کہا ساری اولاد کے نام سکھا دیئے۔ ابن جریر نے اس معنی کو ترجیح دی ہے۔

ابن کثیر نے کہا صحیح یہ ہے کہ ساری چیزوں کے نام ان کی ذات و صفات اور افعال سمیت بتائے۔ جیسا کہ

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حتی العنسوۃ والھنیۃ یعنی مکبر ومصغر سب کچھ سکھلادیا۔ اسی لیے صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ قیامت والے دن سب مومنین مل کر کہیں گے کہ چلو آج اپنے رب کے پاس کسی سے سفارش کو کہیں۔ پھر وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ آپ ابوالبشر ہیں، اللہ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور آپ کو مسجود ملائکہ بنایا اور ہر چیز کا نام بتایا۔ آپ اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں۔ (الحدیث بطولہ) اس کو مسلم نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ اس جگہ فقط یہ مضمون مقصود تھا۔ ((و علمك اسماء كل شیء)) ''کہ اللہ نے آپ کو ہر چیز کے نام سکھادیئے۔'' یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آدم ؑ کو ساری مخلوقات کے نام سکھادیئے۔ اس لیے کہا کہ پھر ان چیزوں کو آدم نے ملائکہ پر پیش کیا۔ قتادہ نے کہا کہ ان اسماء کو پیش کیا۔ ابن مسعودؓ اور صحابہ کی ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ مخلوق کو ملائکہ پر پیش کیا۔ حضرت مجاہد کا لفظ یہ ہے۔ ارباب اسماء کو عرض کیا۔ حسن و قتادہ نے کہا ہر چیز کا نام سکھایا۔ وہ ہر ایک چیز کا نام لیتے ایک ایک گروہ کو پیش کیا جاتا۔ مطلب یہ ہوا کہ ملائکہ سے یہ بات کہی گئی کہ یہ جو چیزیں تمہیں دکھائیں گئیں ان کے نام بتاؤ۔ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ جس کو میں خلیفہ مقرر کروں گا وہ فساد برپا کریں گے اور تم رہو گے تو مطیع و تابع رہو گے۔ پھر وہ چیزیں جو تم پر پیش کی گئیں مگر تمہیں اس کے نام تک معلوم نہ ہیں حالانکہ تم انہیں دیکھ رہے ہو۔ تو جو چیزیں تمہیں نظر نہیں آتیں زمانہ آئندہ میں ہوں گی ان کے متعلق تم کیا جان سکو گے۔ اس پر ملائکہ نے اظہار عاجزی اور اللہ کی تنزیہ و تقدیس بیان کی۔ حضرت ابن عباس نے کہا کہ لفظ سبحان اللہ، اللہ کا اپنے نفس کی ہر برائی سے تقدیس بیان کرنا ہے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے پوچھا یہ کیا کلمہ ہے؟ فرمایا: اللہ نے اس کلمے کو اپنے لیے پسند فرمایا ہے اور اللہ چاہتا ہے کہ یہ کلمہ پڑھا جائے۔ میمون بن مہران نے کہا: یہ ایک ایسا نام ہے جس سے اللہ کی تعظیم ظاہر ہوتی ہے۔

فائدہ: زید بن اسلم نے کہا کہ حضرت آدم نے اس طرح نام بتائے کہ تم جبریل ہو یہ میکائیل ہیں یہ اسرافیل ہیں۔ حتیٰ کہ غراب تک سارے نام گن دیئے۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ کبوتر، کوا، ہر چیز کے نام لئے۔ پھر جب حضرت آدم ؑ کا بیان اسماء و اشیاء میں فرشتوں پر فضل و کمال ظاہر ہو گیا تو اللہ کریم نے فرمایا کیا میں نے نہ کہا تھا کہ میں ہر ظاہر و مخفی غیب کو جانتا ہوں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّه يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى﴾ ''کہ اگر تم ظاہری بات کرو گے تو بلاشبہ وہ چھپی اور مزید چھپی بات کو جانتا ہے۔'' اور زبانِ ھدھد سے سلیمان کو یوں خبر دی: ﴿اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا

تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ○ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ ''کہ وہ اس اللہ کو سجدہ کیوں نہیں کرتے؟ جو آسمانوں اور زمین سے مخفی چیزیں نکالتا ہے۔ اور وہ اس چیز کو جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ اللہ (وہ ہے) کہ نہیں کوئی معبود مگر وہ، وہ عظیم عرش کا مالک ہے۔'' حضرت ابن عباسؓ نے کہا مطلب یہ ہے کہ جیسے میں علانیہ چیز کو جانتا ہوں ویسے میں مخفی کو بھی جانتا ہوں۔ گروہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ﴿مَا تُبْدُوْنَ﴾ سے ملائکہ کی یہ بات مراد ہے: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا﴾ اور ﴿تَكْتُمُوْنَ﴾ سے وہ تکبر و غرور مراد ہے جو ابلیس کے نفس میں تھا۔ ابن جریر نے اس کو اختیار کیا ہے۔ قتادہ وغیرہ نے کہا ﴿تَكْتُمُوْنَ﴾ سے وہ ملائکہ کی بات مراد ہے کہ جتنی مخلوقات ہیں ان سب سے زیادہ علم ہم کو ہے۔ اللہ کے نزدیک ہم سے زیادہ عزت کسی کی نہ ہے۔ اب انہیں معلوم ہو گیا کہ آدم علیہ السلام ان پر علم و فضل میں فوقیت رکھتے ہیں۔ ابن جریر نے کہا اس باب میں حضرت ابن عباس کا قول سب سے عمدہ ہے کہ جو تم زبان سے کہتے ہو اور جو دل میں چھپاتے ہو وہ سب میرے نزدیک برابر ہے۔ کوئی چیز ظاہر ہو یا مخفی مجھ پر کچھ پوشیدہ نہ ہے۔

فائدہ: کشاف میں کہا ہے کہ آدم عجمی نام ہے۔ بیضاوی و سمین کا بھی یہی قول ہے کہ یہ نام کسی سے مشتق نہ ہے۔ جب اللہ کریم حضرت آدمؑ کو پیدا کر چکا تو انہیں سب چیزوں کے نام سکھا دیئے اور اسماء سے مسمیات مراد ہیں۔ کسی نے کہا سب لغات مراد ہیں۔ لیکن جب ان کی اولاد متفرق ہوئی تو کسی کو عربی بھول گئی ور کسی کو یاد رہی۔ علم اسماء سے یہ مراد ہے کہ لفظ و معنی مفرد و مرکب، حقیقت و مجاز سب کچھ بتا دیا۔ اسم سے وہ لفظ مراد ہے جو کسی معنی پر دلالت کرے۔ خواہ ذات ہو یا عرض۔ پھر اسم، فعل اور حرف اسی میں شامل رہے۔ تفسیر مظہری میں یہ قول لکھا ہے کہ اللہ نے انہیں سارے اسمائے حسنیٰ سکھ دیئے۔ مگر عموم خصوص سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ علیم اس کو کہتے ہیں جو سب معلومات کا عالم ہو اور حکیم قاضی عادل کو کہتے ہیں۔ یا اس کو جس کا کام بڑا عمدہ ہو اس میں کوئی نقص نہ ہو۔ اس آیت سے یہ بھی استدلال ہوا کہ آدم علیہ السلام مکلم نبی تھے کیونکہ اللہ نے ان سے یہ بات کہی کہ انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ نام بتانے سے یہ بھی واضح ہوا کہ عالم کو جاہل پر فوقیت ہے۔ اسی لیے خلافت کے لیے علم شرط ہے۔ اللہ کریم نے اسی علم کی وجہ سے آدمؑ کو فرشتوں پر فضیلت دی۔ اگر علم سے بڑھ کر کوئی شرف ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسی کے ذریعے ان کا اظہار فضل کرتا اور اسی علم کی وجہ سے آدم کو وہ مقام دیا کہ انہیں مسجود ملائکہ کے رتبہ تک پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ عالم کے لیے تعظیم علم کے لیے کھڑا ہونا جائز ہے۔ [نوٹ: نواب صاحب کا یہ نظریہ محلِ نظر ہے۔ (ادارہ)] تعظیم شخصی میں کھڑا ہونا جائز نہ ہے۔ طیبی نے کہا اس آیت سے معلوم ہوا کہ لغت

کا علم عبادت سے بڑھ کر ہے پھر علم شریعت کا کیا کہنا۔

فائدہ: یہ ارشاد کہ میں آسمان وزمین کا غیب جانتا ہوں اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ غیب کو جاننے کا دعویٰ مردود ہے۔ جیسا کہ ستارہ پرست کاہن، اہل رمال ساحر و شعبدہ باز کرتے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی علم غیب نہیں جانتا وہ خواہ نبی ہو فرشتہ ہو یا ولی ہو۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٤﴾

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو، تو وہ سب سجدے میں گر پڑے مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آکر کافر بن گیا۔

فائدہ: یہ ایک اور کرامت ہے جو اللہ کریم نے ابن آدم کے مقدر میں رکھا۔ کہ ہم نے آدم کو مسجود ملائکہ بنایا اس بات میں کئی احادیث آئی ہیں۔ حدیث شفاعت ابھی اوپر گذری ہے۔ جب حضرت آدم اور موسیٰ علیہما وعلی نبینا السلام کی باہم ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی ان سے یہی کہا کہ تم وہی آدمؑ ہو جسے اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا اس میں اپنی روح پھونکی اور اسے فرشتوں کے سجدے کا شرف بخشا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ابلیس فرشتوں کے ایک قبیلے سے تھا۔ جنہیں جن کہتے ہیں۔ یہ ملائکہ کا قبیلہ گرم آگ سے پیدا کیا گیا۔ اس کا نام حارث تھا اور یہ جنت کا ایک خزانچی تھا۔ باقی سب فرشتے نور سے بنے ہیں اور وہ جنات جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے ان کی تخلیق شعلہ آگ سے ہوئی وہ شعلہ جب آگ بھڑکتی ہے تو آگ کی زبان ہوتی ہے۔ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے، زمین میں سب سے پہلے جن آباد ہوئے، جب انہوں نے فساد کیا، خونریزی شروع کر دی ایک دوسرے کو قتل کر دیا، تو اللہ کریم نے ابلیس کی سرکردگی میں فرشتوں کا ایک لشکر بھیجا یہ فرشتے اس قبیلے کے تھے جنہیں جن کہا جاتا ہے۔ جب ابلیس نے انہیں مار کر جزائر واطراف جبال کی طرف ہانک دیا تو اس نے دل میں خیال کیا کہ میں نے ایسا کام کیا ہے جو اور کسی سے نہ ہو سکا اور مغرور متکبر ہوا۔ اللہ کو اس کے دل کی بات کا علم ہوا لیکن ان فرشتوں کو اس کا علم نہ ہوا۔ جو ان کے لشکری تھے۔ جب اللہ کریم نے ان فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانا چاہتا ہوں تو انہوں نے کہا جیسے جنوں نے اس میں فساد کیا یہ بھی اسی طرح کرے گا۔ ہمیں اسی کام کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اللہ کریم نے فرمایا کہ جو مجھے معلوم ہے وہ تم نہ جانتے ہو۔ یعنی اس ابلیس کے تکبر و غرور پر میں ہی مطلع ہوں۔ پھر مٹی اٹھائی جو چکنی اور بجنے والی تھی اس سے آدم کو بنایا۔ چالیس رات تک وہ دھڑیوں میں پڑا رہا، ابلیس آتا اس دھڑ کو پاؤں سے ٹھوکر مارتا تو وہ کھنکھناتا۔ جیسے فرمایا: ﴿مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ یعنی "غیر ٹھوس چیز سے بنایا"

یعنی اس بجتی مٹی سے بنایا جو ٹھیکری کی طرح تھی۔ابلیس منہ کی طرف سے گھس کر دبر سے نکلتا، کبھی دبر سے داخل ہو کر منہ سے باہر نکلتا، پھر کہتا کہ تو صرف اس صلصلہ کے لیے نہیں بلکہ کسی اور مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔اگر میں تجھ پر غالب ہوا تو تجھے برباد کروں گا،اگر تو مجھ پر غالب ہوا تو میں تیری نافرمانی کروں گا۔جب اللہ نے اس میں روح پھونکی تو سر کی طرف سے شروع کیا جہاں تک روح جاتی خون اور گوشت بنتا جاتا تھا۔جب روح ناف تک پہنچی تو بدن کو دیکھ کر خوش ہوئے چاہا کہ اٹھ کر بیٹھ جائیں لیکن نہ ہو سکا۔اس آیت کا یہی مطلب ہے:﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ ”کہ انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے۔“یعنی اسے خوشحالی و تنگی پر صبر نہ ہے بہت جلد باز ہے۔جب روح سارے بدن میں پہنچ گئی تو چھینک آئی تو﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کہا کہ سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے ہیں۔یہ کہنا بھی اللہ کی طرف سے الہام تھا۔اللہ کریم نے فرمایا:((یَرْحَمُكَ اللّٰهُ یَا اٰدَمُ)) پھر اللہ نے ان فرشتوں کو حکم دیا جو ابلیس کے ساتھ بھیجے گئے تھے نہ وہ جو آسمانوں میں تھے۔کہ تم آدمؑ کو سجدہ کرو،سب نے سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے نہ کیا، غرور کیا۔اس کے دل میں تکبر تھا ،اور دل میں کہتا کہ میں ہرگز اس کو سجدہ نہ کروں گا۔میں اس سے کہیں بہتر ہوں۔عمر میں بڑا ہوں، تخلیق میں قوی ہوں۔اس آیت کا یہی مطلب ہے:﴿خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ﴾ ”کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔“یعنی آگ مٹی سے زیادہ زبردست ہے۔جب ابلیس نے سجدہ نہ کیا تو اللہ نے اسے ہر خیر سے ناامید کر دیا اور شیطان رجیم بنا دیا۔یہ اس کی معصیت کا انجام ہوا۔پھر حضرت آدمؑ کو سب چیزوں کے نام بتا دیئے پھر سب (ان چیزوں) کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور آدم سے ان چیزوں کے نام گنوائے،سب نے خود پر اللہ کا غصہ محسوس کیا تو علم غیب سے برأت ظاہر کر دی۔ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس اثر کا سیاق غریب ہے۔اس میں کئی مقامات محل نظر ہیں۔طویل بحث ہے۔حضرت ابن عباس کی مشہور تفسیر اسی سند سے ہے۔اسی کے قریب قریب سدی نے روایت کیا ہے اور سدی کی تفسیر میں اسرائیلیات بہت ہیں۔کیا تعجب کی بات ہے کہ اس میں سے کچھ کلام مدرج ہو۔صحابی کا کلام نہ ہو۔یا صحابہؓ نے بعض پہلی کتب سے اخذ کیا ہو۔حاکم نے مستدرک میں سدی کی اسناد بعینہٖ لا کر شرط بخاری پر بیان کیا ہے۔پھر حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ مقصد یہ ہے کہ جب اللہ نے فرشتوں کو آدم کے سجدے کے متعلق حکم دیا تو اس خطاب میں ابلیس بھی داخل ہوا۔اگرچہ وہ ان کی ذات سے نہ تھا لیکن ان جیسے کام کرنے کی وجہ سے ان میں مل جل گیا تھا۔اسی لیے حکم کی مخالفت پر اس کے اس کام کو برا کہا گیا۔اس کی وضاحت اپنے مقام پر آئے گی جہاں فرمایا:﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾

"کہ وہ جنوں سے تھا اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔" حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ابلیس معصیت سے قبل فرشتوں میں سے تھا انہی جیسے کام کرتا تھا۔ اس کا نام عزازیل تھا اور زمین میں رہتا تھا۔ سب ملائکہ سے بڑھ کر عبادت گزار اور عالم تھا۔ اسی گھمنڈ میں آکر اس نے تکبر کیا۔ اس کی قوم کا نام جن تھا۔ ان کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ اس کا نام عزازیل تھا اشراف ملائکہ سے تھا اس کے چار پر تھے۔ پھر ابلیس ہو گیا۔ تیسرا لفظ یہ ہے کہ زمین اور آسمانِ دنیا کا بادشاہ تھا۔ دونوں جگہ پر اس کی سیاست چلتی تھی۔ جب نافرمانی کی تو اللہ نے مسخ کر کے شیطان رجیم بنادیا۔ حسن نے کہا کہ وہ کسی وقت بھی فرشتوں سے نہ تھا بلکہ جس طرح اصل جنس بشر میں آدم تھے اسی طرح وہ ملعوم اصل جنس میں جن تھا۔

ابو العالیہ نے کہا اس جگہ کافرین سے عاصین مراد ہیں۔ سدی نے کہا کہ وہ ان کافروں سے ہے جو ابھی پیدا نہ ہوئے ہیں بعد میں ہوں گے۔ قرطبی نے کہا کہ اللہ نے اس کو اصل کفر و ضلالت پر ہی پیدا کیا تھا گو وہ فرشتوں سے کام کرتا تھا۔ پھر اس کو اس کی اصل پر پھیر دیا کیونکہ فرمایا: ﴿وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ﴾ "کہ وہ کافروں سے تھا۔" حضرت قتادہ نے کہا کہ اللہ نے جو آدم کو فرشتوں سے سجدہ کرایا یہ آدم کی اللہ کی اطاعت کی وجہ سے تھا۔ جب انہوں نے اللہ کی اطاعت کر لی تو اللہ نے ان کو یہ عزت دی کہ فرشتوں سے ان کو سجدہ کروایا۔ کسی نے کہا کہ یہ سجدہ، ادب و احترام و اکرام کے طور پر تھا جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کو سجدہ کیا تھا۔ ﴿وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا﴾ "کہ وہ اس کے لیے سجدے میں گر گئے۔ یہ سجدہ پہلی امتوں میں مشروع تھا۔ امت محمدیہ میں منسوخ ہو گیا۔ حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ میں ملک شام میں گیا، وہاں دیکھا کہ وہاں کے لوگ اپنے علماء کو سجدہ کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں آپ کو سجدہ کرنا مناسب بات ہے۔ فرمایا: اگر میں کسی انسان کو حکم دیتا کہ کسی انسان کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ کیونکہ خاوند کا حق بیوی پر بہت بڑا ہے۔ رازی نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ بعض نے کہا کہ وہ سجدہ حقیقتاً اللہ کو تھا۔ آدم علیہ السلام قبلہ تھے۔ جیسے فرمایا: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ "کہ سورج کے ڈھلنے سے نماز قائم کیجیے۔" لیکن اس مثال میں نظر ہے پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ یہ سجدہ آدم ہی کو تھا اور ان کے اعظام و اکرام کے لیے تھا۔ اس کے بجالانے میں اللہ کے حکم کی اطاعت تھی۔ قبلہ ٹھہرانے میں کیا شرف واضح ہوتا ہے۔

رازی نے ان دونوں اقوال کو ضعیف ٹھہرا کر پہلی بات کو درست کہا۔ حدیث صحیح بخاری بمقدمہ شفاعت میں بھی اسی کی تصریح و تائید کرتی ہے۔ فرمایا: ((وَاَسْجَدَ لَكَ مَلَائِكَتَهٗ))

فائدہ: رازی نے فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرنے کا حکم صرف زمین کے فرشتوں کو تھا یا آسمان کے فرشتوں کو بھی۔ یہ دو اقوال ہیں اہل علم کے ہر گروہ نے ان دونوں میں سے ہر ایک کو ترجیح دی ہے۔ یعنی کسی نے اول کو اور کسی نے دوسرے کو ترجیح دی۔ مگر آیت کا ظاہر عموم کا مقتضی ہے کہ: ﴿فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ اِلَّا اِبْلِيْسَ﴾ "کہ سب کے سب فرشتوں نے سجدہ کر لیا صرف ابلیس (نے نہ کیا)" میں کہتا ہوں کہ اس سے عموم اسی وقت سمجھ آسکتا ہے جبکہ ملائکہ سے وہ ملائکہ خصوصاً مراد نہ لیے جائیں جو ابلیس کے ساتھ تھے۔ اس طرح عموم کی بجائے خصوص مراد ہوگا لیکن جبکہ اس بارے میں کوئی مرفوع حدیث وارد نہ ہے پھر ایسی صورت میں کتاب و سنت کے ظاہر کے موافق اجمالی ایمان کافی ہے۔ اور گہرائی کی ضرورت نہ ہے۔ حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ عدو اللہ ابلیس نے آدمؑ پر حسد کیا اس بات پر کہ یہ کرامت و عظمت ان کو کیوں ملی۔ کہا میں ناری ہوں، یہ خاکی ہے اور کبر کی ابتدا اسی مردود سے ہوئی۔ اس نے حسد و کبر سے آدمؑ کو سجدہ نہ کیا۔ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جس کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہ جائے گا کیونکہ ابلیس تکبر و غرور کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے دور ہوا تھا۔

تکبر عزازیل را خوار کرد بزندان لعنت گرفتار کرد

کسی نے کہا وہ کافر ہو گیا تھا۔ جبکہ کسی نے کہا یہ وہ علم خداوندی میں ازل سے کافر لکھا ہوا تھا۔ قرطبی نے اسی کو راجح کہا ہے۔ پھر یہ لکھا کہ ہمارے علماء نے یہ بات کہی ہے کہ جو شخص غیر نبی ہے تو اللہ اس ہاتھ پر خرق عادت واقعات رونما کرے تو یہ اس کی ولایت پر کچھ دلیل نہ ہے۔ جس طرح کہ بعض صوفیاء و روافض نے کہا ہے۔ پھر کہا کہ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ایسا شخص اللہ سے باایمان ملے گا، جی ہاں ولی باایمان ملے گا۔ حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ کبھی خرق عادت واقعات کافر و فاجر کے ہاتھ سے بھی ظاہر ہوتے ہیں جیسے ابن صیاد نے کہا تھا: ((هُوَ الدُّخ)) حالانکہ نبی علیہ السلام نے اس سے یہ آیت پوشیدہ رکھی کہ ﴿يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ﴾ "اسی طرح جب اسے غصہ آتا تو اس قدر پھول جاتا کہ رستہ بھر جاتا۔" حضرت ابن عمرؓ نے اسی کام پر اسے مارا تھا۔ اور کیا احادیث میں دجال کے خوارق عادات بھی مذکور نہ ہیں۔ جیسے آسمان سے بارش برسانا، زمین کے خزانے لیے پھرنا، ایک نوجوان کو مار کر دوبارہ زندہ کرنا۔ شافعی ولیث بن سعد نے فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ پانی پر چلتا اور ہوا میں اڑتا ہے تو اس سے دھوکہ نہ کھانا۔ جب تک کہ اس کے کام کو کتاب سنت کے میزان میں تول نہ لو۔ میں کہتا ہوں کہ ہوا میں باز اور کبوتر اڑتے ہیں، پانی پر حیوان چلے جاتے ہیں اس میں کونسا فخر کا کوئی پہلو ہے۔ اللہ

نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور عزت و عظمت سے نوازہ۔اس کا فخر اس میں نہیں ہے کہ وہ ہوا میں اڑے یا پانی پر چلے بلکہ اس کا شرف تو حق بندگی ادا کرنے میں ہے۔اس کو تکبر و غرور کی ہوا بھی لگنے نہ پائے۔ نعلین کی طرح خاکسار بنے،دستار کی طرح صاحب کبر نہ ہو۔

فائدہ: بقائی نے کہا کہ پہلے آدم علیہ السلام کو نام سکھائے پھر سجدہ کروایا۔پھر جنت میں بسایا پھر وہاں سے نکالا،اس کے بعد زمین میں بھیج دیا۔اس آیت میں مذہب اہل سنت کے اس موقف کی دلیل ہے کہ انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کا یہ قصہ قرآن کریم میں سات مقامات پر مذکور ہے۔اس سورت میں، پھر سورۃ الاعراف میں،پھر سورۃ حجر،سورۃ الاسراء،سورۃ کہف،سورۃ طٰہٰ اور سورۃ صٓ میں اس تکرار سے شاید رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا مقصود ہے۔کیونکہ رسول اللہ علیہ السلام اپنی قوم اور اہل زمانہ کے ہاتھوں بڑی مشقتیں برداشت کر رہے تھے۔یہ قول خطیب کا ہے مگر ظاہر بات یہ ہے کہ یہ تکرار حضرت آدم علیہ السلام کے شرف و عظمت کے لیے ہے۔اس لیے نہیں کہ وہ کسی محنت میں مبتلا رہے تھے۔فتح البیان میں فرمایا یہ سجدہ جمعہ کے دن زوال سے عصر تک کے وقت میں کروایا۔ سب سے قبل جبریل نے پھر میکائیل،پھر اسرافیل اور پھر عزرائیل علیہم و علی سائر الملائکہ السلام اور پھر سارے ملائکہ نے سجدہ کیا۔یہ قول اس صورت میں ہی درست ہو سکتا ہے جبکہ سجدے کے حکم کو ان فرشتوں سے خصوصیت نہ دی جائے جو ابلیس کے ساتھ تھے۔جس طرح کہ اکثر اہل علم کا قول ہے کہ شیطان کا نام سریانی زبان میں عزازیل جبکہ عرب میں حارث تھا۔نافرمانی کے بعد ابلیس نام رکھا جس کے معنی ناامید کے ہیں۔نام کے ساتھ صورت بھی بدل دی گئی۔استکبار یہ ہے کہ اپنے نفس کو بڑا سمجھے۔حدیث صحیح میں کبر کی تعریف ہے کہ ((بطر الحق و غمط الناس)) کے حق کو ٹھکرانا اور لوگوں کو حقیر جاننا تکبر ہے۔انکار استکبار کے بعد تھا۔لیکن ذکر میں اس لیے مقدم کیا کہ انکار ظاہری افعال سے ہے جبکہ استکبار دلی افعال سے متعلق ہے۔پھر سورۃ صٓ میں صرف استکابر کا ذکر کیا اور سورۃ فجر میں صرف انکار کا ذکر فرمایا۔اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ تکبر مذموم ہے اور اللہ کے پوشیدہ امور میں بے جا بحث کرنا بھی مکروہ ہے۔اور یہ بھی واضح ہوا کہ امر کا صیغہ وجوب کے لیے ہے اور حقیقت میں کافر وہی شخص ہے جس کے متعلق علم ازلی میں کفر پر مرنا لکھا جا چکا ہے۔کیونکہ خاتمے کا اعتبار ہے اگرچہ درمیان میں مومن ہی کیوں نہ رہا ہو۔اسی کو مسئلہ مواخاۃ کہا جاتا ہے۔حنفیہ،شافعیہ اور ماتریدیہ کا اس میں اختلاف منقول ہے۔سبکی نے اس باب میں ایک مستقل کتاب تالیف فرمائی ہے۔

وَقُلْنَا يَاآدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿٣٥﴾ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَى حِينٍ ﴿٣٦﴾

اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو اور جہاں سے چاہو بے روک ٹوک کھاؤ (پیو) لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا نہیں تو ظالموں میں (داخل) ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا اور جس (عیش و نشاط) میں تھے اس سے ان کو نکلوا دیا، تب ہم نے حکم دیا کہ (بہشت بریں سے) چلے جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور معاش (مقرر کر دیا گیا) ہے۔

فائدہ: یہ بنی آدم پر تیسری نعمت کا احسان مذکور ہے کہ اس نے ابوالبشر آدم علیہ السلام کے لیے جنت کو مباح کر دیا تھا کہ جہاں چاہیں رہیں اور جو دل چاہے کھائیں۔ حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا آدم نبی تھے؟ فرمایا: جی ہاں! وہ نبی و رسول تھے۔ اللہ نے ان سے کلام فرمایا: کہا: اے آدم! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اس جنت کے مقام میں یہ اختلاف ہے کہ یہ زمین میں تھی یا آسمان پر تھی۔ جمہور نے کہا کہ یہ جنت آسمان میں تھی۔ قرطبی نے معتزلہ و قدریہ سے نقل کیا کہ وہ جنت زمین میں تھی اس کا تذکرہ سورۃ الاعراف میں آئے گا۔ ان شاء اللّٰہ

فتح البیان میں فرمایا کہ یہ زمین فلسطین میں یا فارس اور کرمان کے درمیان تھی۔ اللہ نے اس کو حضرت آدم کی آزمائش کے لیے بنایا تھا وہاں سے ان کا اتارنا یہ تھا کہ وہ زمین ہند کی طرف منتقل ہو گئے۔ جیسے فرمایا: ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا﴾ "کہ کسی شہر میں اتر جاؤ۔" یعنی مصر (شہر) کی طرف چلے جاؤ۔ بلا اختلاف حضرت آدم کی تخلیق اسی زمین میں ہوئی اس میں ان کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کا ذکر نہ ہے۔ اگر رفع و قوع میں آیا ہوتا تو یقیناً اس نعمت کا ذکر کلام پاک میں موجود ہوتا اور اگر یہ جنت دار الخلد ہوتی تو ابلیس اس میں نہ جاتا۔ کسی نے کہا کہ یہ سب کچھ ممکن ہے ادلہ نقلیہ متعارض ہیں۔ اس لیے کہ کسی بات پر یقین کر لینے کی بجائے توقف (بہتر) واجب ہے۔ ابوالسعود نے بھی یہی بات کہی۔ ابن القیم نے کتاب "حادی الارواح" میں فریقین کے دلائل کو تفصیلی ذکر کیا لیکن راجح اقوال کی علیحدہ تصریح نہ کی ہے۔ اور پھر اس بات میں کوئی شک نہ ہے کہ جو بات اللہ اور اس کے پیغمبر علیہ السلام نے ہمیں واضح نہ بتائی اس میں بلاوجہ بحث و تمحیص کی ضرورت نہ ہے۔

فائدہ: ابن کثیر فرماتے ہیں کہ سیاق آیت اس کا متقضی ہے کہ آدم علیہ السلام کے دخول جنت سے قبل

حضرت حواء پیدا ہوئیں۔ محمد بن اسحاق نے اسی قول کی تصریح فرمائی مگر بحوالہ تورات وغیرہ۔ حضرت ابن عباس اور اہل علم نے کہا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام پر نیند ڈالی گئی تو ان کی بائیں جانب سے ایک پسلی لے کر اسے گوشت سے جوڑا گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام بدستور سوتے رہے حتیٰ کہ ان کی اس پسلی سے حضرت حوا پیدا ہوئیں اور ایک مکمل عورت بن گئیں تاکہ حضرت آدم کو تسکین ہو اور آرام میسر آئے۔ جب وہ اس خواب سے بیدار ہوئے تو حضرت حوا کو پہلو کے پاس بیٹھے پایا۔ دیکھا تو کہا: ((لَحْمِیُ وَدَمِیُ وَزَوُجَتِیُ)) یعنی "میرے جیسا ہی گوشت پوست اور خون ہے یہ میرا جوڑا ہے۔" ان کو دیکھ کر دل کو تسکین و تشفی ہوئی۔ پھر اللہ نے آدم سے ان کی شادی کر دی اور فرمایا کہ دونوں جنت میں رہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ، پیو لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا۔ کسی نے کہا کہ دخول جنت کے بعد حضرت حواء پیدا ہوئیں۔ ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور صحابہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے کہ دخول جنت کے بعد ان کی پیدائش ہوئی۔ حوا کا نام حوا اس لیے رکھا کہ وہ ایک زندہ چیز سے پیدا ہوئیں۔ یعنی تم زندہ رہو اور اللہ کریم کا یہ ارشاد کہ اس درخت کے قریب نہ جانا بطور آزمائش و امتحان تھا۔ ابن عباس نے کہا کہ یہ درخت انگور کا تھا۔ صحابہ کی ایک جماعت و تابعین و تبع تابعین کا یہی قول ہے۔ یہود کا خیال تھا کہ یہ گیہوں کا درخت تھا۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباس سے بھی ایسا ہی منقول ہوا ہے۔ دوسری روایت میں بتایا کہ یہ سنبلہ تھا۔ ابوالجلد کا یہی قول ہے اور جس درخت کے پاس توبہ کی وہ زیتون کا درخت تھا۔ مگر وہ گیہوں کا دانہ بہت بڑا تھا جیسے گائے کا سر ہو اور وہ مکھن سے زیادہ نرم اور شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔ ابو مالک نے کہا کہ وہ درخت کھجور کا تھا۔ مجاہد نے کہا وہ انجیر کا درخت تھا۔ کسی نے کہا وہ لوز کا درخت تھا کسی نے کہا قلم کا درخت تھا، کسی نے کافور بتایا۔ کسی نے الترج کہا۔ بعض نے کہا کہ وہ درخت کی جنس سے تھا۔ ابوالعالیہ نے کہا کہ اس درخت کو جو کھاتا تھا اسے حدث کی ضرورت ہوتی جبکہ جنت حدث کا مقام نہ ہے اس لیے آدم کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ وہب بن منبہ نے کہا یہ ایک شاخ دار درخت تھا، اس پر پھل لگا کرتا تھا۔ فرشتے اسے ہمیشہ رہنے کے لیے کھاتے تھے۔ اللہ نے آدم و حوا کو اس کے قریب جانے سے بھی روک دیا، کھانے کا کیا تذکرہ۔ ابن جریر نے فرمایا کہ اللہ نے بعینہٖ ایک خاص درخت سے ان کو روک دیا تھا، سارے جنت کے درختوں سے ممانعت نہ فرمائی تھی۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کونسا درخت ہے کیونکہ حکیم مطلق نے اس درخت کی تعین میں کچھ ذکر نہیں کیا۔ نہ سنت صحیحہ میں کوئی تصریح آئی ہے۔ کوئی کچھ ذکر کرتا ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور یہ ایسا علم ہے جس کو جاننے والے کو کچھ نفع نہ ہے اور نہ جاننے والے کو کچھ ضرر نہ ہے۔ واللہ اعلم۔

امام رازی نے بھی ابہام کو ترجیح دی، ابن کثیر نے بھی اسی کو درست فرمایا۔ اور امام شوکانی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ غرضیکہ کوئی بھی درخت ہو بہر کیف اس کے سبب سے ابلیس نے ان دونوں کو جنت سے نکلوادیا۔ انہیں ڈگمگادیا اور جس اچھی ٹھاٹھ باٹھ میں وہ تھے انہیں وہاں سے نکلوادیا۔ اللہ کریم نے فرمایا اب تم زمین پر چلے جاؤ اور ایک مدت معین (موت یا قیام قیامت) تک وہیں رہو تمہارا رہنا، رزق اور اجل یہی زمین ہے۔ ابن کثیر نے سانپ اور ابلیس کا مفصل قصہ سورۃ الاعراف کی تفسیر میں ذکر کیا کہ کیسے انہیں جا کر وسوسہ ڈالا کیونکہ وہاں قصہ مفصل ہے۔ لیکن بہر حال وہ اخبار بھی اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں اور: ((لا تصد قوھم و لا تکذبوھم)) کی مستحق ہیں۔

فائدہ: ابی بن کعب مرفوعاً فرماتے ہیں کہ اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو لمبا قد دیا تھا۔ سر پر گھنے بال تھے جیسے کھجور کا درخت ہو، جب انہوں نے ممنوع درخت سے پھل چکھ لیا تو ستر نظر آنے لگا۔ جنت کا لباس اتر کر گر گیا۔ جنت میں دوڑتے پھرتے تھے، ایک درخت میں سر کے بال الجھ گئے یہ اس سے بال چھڑانے لگے تو رحمٰن جل ذکرہ نے پکارا: اے آدم! تو مجھ سے بھاگتا ہے؟ کہا: نہیں اے مالک! بلکہ حیاء محسوس کرتا ہوں۔ [بروایت ابن ابی حاتم]

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام جنت میں عصر سے مغرب تک رہے۔ حضرت حسن نے کہا دن میں سے ایک ساعت رہے۔ جو دنیا کے ایام کے حوالے سے ایک سو تین دن کی مقدار ہے۔ ربیع بن انس نے کہا کہ حضرت آدم جنت سے نویں یا دسویں ساعت میں نکلے۔ ان کے سر پر جنت کے درختوں کا ایک تاج تھا۔ سدی نے کہا: جب اللہ نے فرمایا کہ آدمؑ جنت سے نکل جاؤ تو حضرت آدم ہند میں اتر گئے۔ ان کے ساتھ حجر اسود اور جنت کے کچھ پتے تھے۔ انہوں نے وہ پتے ہندوستان میں پھینک دیئے۔ اس سے ہر خوشبودار درخت پیدا ہوئے۔ عطرِ ہندوستان کی اصل وہی جنت کے پتے ہیں۔ آدم علیہ السلام بڑی حسرت و افسوس کے ساتھ مٹھی بھر پتے بطور یادگار جنت سے لیتے آئے تھے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت آدم دہنا نامی جگہ زمینِ ہند میں اترے۔ حواء جدہ میں اتریں، یہ زمین مکہ و طائف کے درمیان میں ہے، حضرت حسن بصری نے فرمایا: ابلیس دستمیسان میں اترا جو زمین بصرہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے اور سانپ اصبہان میں اترا۔ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ آدمؑ صفا پر اور حواء مروہ پر اتریں۔ رجاء بن سلمہ نے کہا کہ آدم علیہ السلام زانو پر ہاتھ رکھے اور سر جھکائے ہوئے اترے جبکہ ابلیس انگلیوں میں انگلیاں ڈالے آسمان کی طرف دیکھتا ہوا اترا۔ یہ تمام آثار صحابہؓ تھے۔ حدیث مرفوع میں کسی معین شہر یا قصبے کی تعین نہ ہے صرف اتنا مذکور ہے کہ وہ ہند میں اترے تھے۔ ثابت یہ ہوا کہ صرف اتنا کافی ہے کہ جہاں اللہ نے چاہا اتار دیا۔ اگر جگہ معلوم ہو گی تو کیا فائدہ اگر معلوم نہ ہوئی تو کیا نقصان ہے؟

ابو موسیٰ نے کہا کہ جب اللہ نے آدمؑ کو زمین پر اتارا تو سب قسم کی صنعت سکھادی اور جنت سے کچھ پھل بطور زادِ راہ ساتھ دے دیئے۔ تمہارے یہ پھل اسی سے ہیں اور وہیں سے آئے ہیں صرف اتنی بات ہے کہ یہ گل سڑ جاتے ہیں لیکن وہ خراب نہیں ہوتے ہیں۔ ابو ہریرہ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ بہتر دن جس پر سورج طلوع ہوا وہ جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن آدم پیدا ہوئے اسی میں جنت میں داخل ہوئے اور اسی دن جنت سے نکالے گئے۔ [بروایت مسلم و نسائی]

فائدہ: رازی نے فرمایا کہ اس آیت مبارکہ میں کئی وجوہ سے دھمکی ہے۔ ایک یہ کہ جو شخص خیال کرے گا کہ آدم علیہ السلام کو ذرا سی لغزش پر اتنی سزا دی کہ جنت سے نکال دیا تو وہ گناہوں سے بچے گا یہاں بنی آدم سے لگاتار رات دن مسلسل گناہ ہوتے ہیں لیکن کبھی خیال تک نہیں گزرتا اس کا انجام تصور کیجئے کیا ہو گا؟ ان فاسقوں کی تو وہی مثال ہے:

پدرم جنت جاوید به گندم بفروفت نا خلف باشم لگر من بجوئے لغزوشم

فتح موصلی نے کہا ہے کہ پہلے ہم جنت کی ایک قوم تھے۔ ابلیس ہمیں زمین میں قید کر لایا، اور ہمیں رنج و غم کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا جبکہ کہ ہم اسی گھر میں نہ پہنچ جائیں جہاں سے نکلے تھے۔ سچ ہے مسافر کو جب ہی آرام ملتا ہے جبکہ وہ سفر کی صعوبت چھوڑ کر اپنے وطن و مسکن میں نہ پہنچ جائے۔

فائدہ: انسان کے پرانے دشمن دو ہی ہیں۔ ایک ابلیس، اور دوسرا سانپ ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ یہاں سے نکلو تمہارا ایک، دوسرے کا دشمن ہے۔ یعنی ابلیس اور بشر کے درمیان بڑی پرانی دشمنی چلی آتی ہے۔ اس آیت میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ: ﴿اِنَّ الشَّیْطَانَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عُدُوًّا﴾ عُدْوَان ظلم کو کہتے ہیں اور عَدُوًّا اس کو کہتے ہیں جو دوست نہ ہو۔

بقول دشمن پیمان دوست بشکستی ببین که آز که جو پدی و با که پیوستی

اور سانپوں کی دشمنی کا حال یہ ہے کہ بہت سی احادیث میں اہل سنن وغیرہ کے نزدیک حکم ہے کہ سانپوں کو قتل کر دو، بدلہ لینے سے نہ ڈرو۔ قرطبی نے یہ احادیث لکھی ہیں، کچھ فتح البیان میں بھی مذکور ہیں۔ سانپ کو تو لوگ اس لیے مارتے ہیں کہ وہ دشمن جان ہے اس کے کاٹنے سے جان جاتی ہے، آدمی مر جاتا ہے، مگر وہ شیطان جو دشمن ایمان ہے جس کے اثر سے ایمان جاتا رہتا ہے، جس کا زہر سانپ کے زہر سے کئی گنا زیادہ ہے اسے تو شاید سو میں سے دو چار آدمی خالص توحید صادق عبادت سے مارتے ہوں تو ممکن ہے ورنہ غفلت ہی پائی جاتی ہے۔

فَتَلَقّٰی آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴿۳۷﴾ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے اور معافی مانگی تو اس نے ان کا قصور معاف کر دیا بے شک وہ معاف کرنے والا (اور) صاحب رحم ہے۔

موضح القرآن میں فرمایا کہ اللہ کریم نے آدمؑ کے دل میں کئی کلمات ڈال دیئے جن کے ساتھ اس نے اللہ کو پکارا تو توبہ قبول ہو گئی۔وہ سورۃ الاعراف میں مذکور ہیں۔ابن کثیر نے فرمایا وہ کلمات یہ تھے:﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ﴾"کہ ہمارے رب!ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کر لیا،اگر آپ نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"
جماعتِ سلف نے بھی یہی فرمایا ہے۔ابن عباسؓ نے فرمایا:ان کلمات کے پانے سے مراد یہ ہے کہ حج کا طریقہ معلوم کر لیا۔عبید بن عمیر نے کہا کہ آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار!یہ خطا جو مجھ سے واقع ہوئی ہے یہ میری تخلیق سے پہلے میرے مقدر میں لکھی جا چکی تھی یا میں نے ایجاد کی ہے۔یعنی بدعت نکالی ہے۔فرمایا نہیں بلکہ یہ تمہاری پیدائش سے پہلے تیرے مقدر میں لکھی جا چکی تھی۔انہوں نے عرض کیا کہ جس طرح مجھ سے یہ لکھی ہوئی خطا سرزد ہوئی اسی طرح اب تو مجھے معاف کر دے۔مذکورہ تلقی (فتلقیٰ میں) سے یہ کلمات مراد ہیں۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ آدم نے عرض کیا:اے رب!کیا تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا؟ فرمایا:ہاں!کیوں نہیں۔کہا کیا تو نے مجھ میں اپنی روح نہیں پھونکی؟فرمایا:جی ہاں!پھونکی ہے۔کہا:کیا چھینک کے جواب میں یَرْحَمُكَ اللهُ نہیں فرمایا؟اور یا تیری رحمت تیرے غصے پر حاوی نہ ہے؟کہا:ہاں۔کہا:کیا تو نے یہ میری تقدیر میں نہ لکھا تھا؟فرمایا:ہاں۔کہا اگر میں شرمندہ ہوں اور توبہ کروں تو کیا تو مجھے پھر دوبارہ جنت میں لے جائے گا؟کہا:کیوں نہیں۔[بروایت حاکم و صححه]

معلوم ہوا کہ توبہ سے جنت مل سکتی ہے۔جو توبہ نہیں کرتا وہ جنت سے محروم رہتا ہے۔توبہ کا سب سے اول وقت تو یہ ہے کہ جب گناہ سرزد ہو تبھی فوراً توبہ کر کے اس کا خاتمہ کرے دیر نہ کرے۔اور آخری وقتِ نزع میں توبہ فائدہ مند نہ ہو گی۔

توبہ پار انفس باز پسین دست درست بے خبر دیر سیدی در محمل بستنت

ابی بن کعب کا لفظ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ آدمؑ نے عرض کیا:اے رب!اگر میں رجوع کروں اور توبہ کروں تو کیا تو مجھے دوبارہ جنت دے دے گا؟پھر وہاں لے جائے گا؟فرمایا:ہاں۔ان کلمات سے یہی گفتگو مراد ہے۔بروایت ابن ابی حاتم یہ حدیث غریب اور منقطع ہے۔حضرت مجاہد نے فرمایا وہ کلمات یہ تھے:((اَللّٰهُمَّ لَا اِلٰهَ اِلَّا

اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ اِنَّكَ اَنْتَ خَیْرُ الْغَافِرِیْنَ ﴾ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں بعینہٖ وہ کلمات نہیں بتائے وہی جانے کہ وہ کلمات کیا ہیں۔ کچھ بھی ہو بہر حال آدم کی توبہ قبول کی۔ یہی وعدہ اللہ نے بنی آدم سے کیا تھا۔ جیسے فرمایا: ﴿ اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ ﴾ ”کہ کیا انہوں نے یہ نہ جانا کہ اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔“ اور جو فرمایا: ﴿ وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ ﴾ ”کہ جو کوئی برائی کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرے۔“ اور یہ فرمان: ﴿ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا ﴾ ”کہ اور جو توبہ کرے اور نیک عمل کرے۔“ اس کے علاوہ اور بہت سے آیات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کرنے والے کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ ”محوّ الحو به “ نامی رسالے میں استغفار و توبہ کا مفصل ذکر ہے۔ اور یہ توبہ کو قبول کرنا اللہ کی طرف سے محض مخلوق پر لطف و مہربانی ہے۔ ((لا اله الا هو التواب الرحيم اللهم اغفرلي و تب علي)) توبہ قبول ہونے کی نشانی یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کی ہے اس گناہ پر ندامت کا اظہار کرے، پھر اس کام کے قریب نہ جائے ورنہ اگر توبہ توڑ دی تو پہلے گناہ پھر ثابت ہو جاتے ہیں۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

ہم نے فرمایا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو اس کی پیروی کرنا کہ جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔ اور جنہوں نے (اس کو) قبول نہ کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ دوزخ میں جانے والے ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

فائدہ: یہ ڈرانا اگرچہ حضرت آدم و حوا اور ابلیس سب کو تھا۔ جبکہ انہیں جنت سے نکالا لیکن اس مقام پر اس سے مراد آدمؑ کی اولاد ہے۔ ابو العالیہ نے کہا کہ ھدیٰ سے مراد انبیاء و رسل اور بینات و بیان ہیں۔ مقاتل بن حیان نے کہا کہ ھدیٰ سے رسول اللہ ﷺ مراد ہیں۔ حسن نے کہا: ھُدیٰ قرآن ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ دونوں اقوال درست ہیں۔ ابو العالیہ کا قول عام تر ہے۔ آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ کتاب و سنت کے پیروکار کو آخرت میں کچھ غم نہ ہو گا۔ نہ آخرت کے احوال سے خوف ہو گا نہ دنیا کے چھوٹ جانے کا غم ہو گا۔ سورۃ طٰہٰ میں فرمایا: ﴿ اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی ﴾ ”کہ تم دونوں اس سے اتر جاؤ، تمہارا بعض بعض کا دشمن ہو گا، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آجائے پھر جس نے میری ہدایت کی پیروی کی پھر وہ نہ گمراہ ہو گا نہ بد بخت ہو گا۔“

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ہدایت کا پیروکار دنیا میں گمراہ نہ ہو گا اور آخرت میں بد بخت نہ ہو گا۔﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمٰى﴾"اور جس نے میرے ذکر سے اعراض کیا تو اس کے لیے تنگ معیشت ہو گی اور ہم قیامت والے دن اسے اندھا اٹھائیں گے۔"ابن جریر نے سعد بن مالک خدری سے مرفوعاً روایت کیا کہ جہنمی لوگ جہنم میں نہ مریں گے نہ زندہ ہوں گے۔ لیکن کچھ لوگ جن کو ان کے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں گرائے گا، انہیں اس میں مار دے گا وہ اس میں کوئلہ ہو جائیں گے تو ان کے لیے شفاعت کی اجازت عطا کرے گا۔اس کو ابو سلمہ سے مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔باقی تیسری قسم کے لوگ رہے جو ایمان تو لائے لیکن اعمال صالحہ نہ کیے۔وہ ان آیات میں داخل نہ ہیں کیونکہ خلود سے مراد وہ مدت ہے جس میں انقطاع نہ ہو۔کسی نے کہا دوسری دفعہ اتارنا تاکید کے لیے ذکر کیا ہے لیکن بعض نے کہا کہ پہلی دفعہ آسمان دنیا پر اتارا پھر دوبارہ زمین پر اتار دیا لیکن پہلا قول زیادہ درست ہے۔

صحیحین میں آدم و موسیٰ علی علیہ السلام کا مناظرہ مذکور ہے۔آخر یہ بات کہی کہ کیا یہ اس امر پر ملامت ہے۔جسے اللہ نے میری تخلیق سے پہلے میرے مقدر میں کیا تھا۔صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا یہی قول ہے کہ حضرت آدم ارض ہند میں اترے تھے۔حضرت علی مرتضیٰ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ خوشبودار زمین ہندوستان کی ہے۔وہاں حضرت آدمؑ اترے تھے۔جنت کی خوشبو اس کے درختوں میں لگ گئی تھی۔رہی یہ بات کہ حضرت آدم کس ہیئت میں اترے اور ساتھ کیا کیا لائے اور آخر کیا کام کیا۔ان کا تذکرہ ابن القیم نے "حادی الارواح" میں کیا ہے۔میر آزاد بلگرامی نے "شماۃ العنبر "نامی ایک رسالہ فضائل ہند میں مرتب کیا ہے۔اس کا ترجمہ "ھدایة السائل "میں رقم ہے۔جب حضرت آدمؑ زمین پر آئے تو نور محمدی ان کی پیشانی میں تھا، پھر نسل در نسل منتقل ہو کر مکہ معظمہ پہنچا۔سارے لوگوں کا وطن اصلی یہی ارض ہند ہے اولاد آدمؑ یہیں سے منتقل ہو کر سات اقالیم میں جا بسی

گر نیست از بهشت فزون بوستان هند   آدم ،نازو نعمت چستان گزشت

ابی ہریرہ کی حدیث مرفوع میں ہے کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت نہ گلتا نہ سڑتا، اگر حوا نہ ہوتی تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔اس کو بخاری و حاکم نے روایت کیا۔اس سے قبل عورت نے شرک کیا اس کا فتنہ بڑا عظیم ہے۔ہابیل اسی سلسلے میں مارے گئے۔قصہ ذبح بقرہ بھی اسی سلسلے میں وقوع میں آیا۔سب سے پہلے عشق اسی سے ظاہر ہوا۔زنا کی ابتدا بھی اسی سے ہوتی ہے۔ان کا مکر بڑا عظیم ہوتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے ان کو

ناقصات العقل والدین کہا ہے۔ پھر یہ بھی کہا کہ بڑے عقل مند شخص کی عقل کھو دیتی ہیں۔

يَابَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ﴿٤٠﴾ وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ ﴿٤١﴾

اے آلِ یعقوب! میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے تھے اور اس اقرار کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا میں اس اقرار کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔ اور جو کتاب میں نے (اپنے رسول محمدؐ پر) نازل کی ہے جو تمہاری کتاب (تورات) کو سچا کہتی ہے اس پر ایمان لاؤ اور اس سے منکر اول نہ بنو اور میری آیتوں میں (تحریف کر کے) ان کے بدلے تھوڑی سی قیمت (یعنی دنیاوی منفعت) نہ حاصل کرو اور مجھ ہی سے خوف رکھو۔

فائدہ: بنی اسرائیل حضرت یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہم و علی نبینا السلام کی اولاد کو کہا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی انہی میں پیدا ہوئے۔ اس پر تورات نازل ہوئی۔ انہوں نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکال کر ملک شام میں لا بسایا۔ اللہ نے بنی اسرائیل سے یہ اقرار لیا کہ تورات پر عمل کرنا جو پیغمبر میں بھیجوں اس کی مدد کرنا تو شام کی بادشاہت تمہارے پاس رہے گی۔ وہ گمراہ ہو گئے۔ بدنیت ہو گئے، رشوت لے کر غلط مسئلے بتاتے، خوشامد کر کے غلط مسئلے بتاتے، اپنی ریاست کو چاہتے تھے لیکن نبی کی اطاعت نہ چاہتے تھے۔ جو پیغمبر علیہ السلام کی صفت تورات میں لکھی تھی اس کو بدل دیا۔ اللہ نے انہیں اپنا احسان اور ان کی نافرمانی یاد دلائی۔ تورات میں یہ علامت بتائی کہ جو نبوت کا دعویٰ کرے تو اگر تورات کی تصدیق کرے تو وہ سچا ہو گا اس کو مان لینا اگر وہ اس کی تصدیق نہ کرے تو پھر وہ جھوٹا ہو گا۔ آیتوں کو تھوڑی قیمت پر مول لینے سے مراد یہ ہے کہ دنیا کی محبت میں دین چھوڑ دیتے تھے۔

فائدہ: حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ اس میں اللہ کریم نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور نبی علیہ السلام کی اطاعت کریں۔ یعقوب کا نام حوصلہ کے لیے لیا کہ اے فرمانبردار و مطیع نبی کی اولاد تم بھی اطاعت خداوندی میں چست ہو جاؤ جیسے تمہارے باپ اس بارے میں بڑے تیز رو تھے۔ جس طرح کہتے ہیں ((یا ابن الكريم افعل كذا يا ابن العالم اطلب علماً)) یہ خطاب یہود کی اس جماعت کو ہے جو اولاد یعقوب سے تھے اور مدینہ میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اسرائیل کے معنی عبداللہ ہیں۔ کسی نے کہا رجل اللہ مرد خدا کسی نے کہا صفوۃ اللہ مگر پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ یاد کرنے سے مطلب یہ ہے کہ شکر کرو۔

جس نے کسی نعمت کو یاد کیا تو گویا شکر ادا کیا۔ جس نے انکار کیا گویا کفران نعمت کیا۔ ذکر، خاموشی کی ضد ہے اور ذکر فراموشی کی ضد ہے۔ نعمت سے یہ مراد ہے کہ پتھر سے نہر جاری کی۔ من سلویٰ نازل کیا۔ فرعون کی غلامی سے نجات دی اور ان پر بادلوں کا سایہ کیا۔ ابو العالیہ نے کہا نعمت یہ ہے کہ ان میں انبیاء ورسل بھیجے۔ یہ ایسی بات ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا: ﴿يَا قَومِ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوْكًا وَاٰتَاكُمْ مَالَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِنَ الْعَالَمِيْنَ﴾ "اے قوم! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر ہے۔ جب اس نے تم میں انبیاء بھیجے اور تمہیں بادشاہ بنا دیا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو جہان والوں میں سے کسی کو نہ دیا گیا۔" عَالَمِيْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ان کے زمانہ کے تھے۔ عہد سے مراد وہ عہد ہے جو ان سے انبیاء کے متعلق لیا گیا کہ جب وہ مبعوث ہو چکیں تو ان کی تصدیق کرنا پھر ہم بھی اپنا وعدہ پورا کریں گے اور جو بوجھ اور طوق تمہارے گلے میں گناہوں کی وجہ سے پڑ گئے تھے وہ اتار دیں گے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس عہد سے مراد یہ آیت ہے: ﴿وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۔ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ "اور تحقیق اللہ نے بنی اسرائیل سے مضبوط وعدہ لیا اور انہیں میں سے ان کے بارہ سردار مقرر کیے اور اللہ کریم نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرو اور میرے رسولوں کے ساتھ ایمان لاؤ گے۔ اور اللہ کو قرض حسنہ دو گے تو میں تم سے تمہاری سیادت کو دور کروں گا اور ضرور ہی تمہیں ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔" بعض نے کہا یہ وہ عہد ہے جو تورات میں ان سے لیا گیا کہ ہم عنقریب بنی اسماعیل سے ایک عظیم نبی مبعوث کریں گے۔ سارے قبائل اس کی اطاعت گذاری کریں گے۔ اس سے مراد بعثت نبوی ہے۔ جس نے ان کی پیروی کی اللہ اس کے گناہ بخش دے گا اس کو جنت میں داخل کرے گا اور اسے دوہرا اجر دے گا۔ اس کی تصدیق کلام پاک میں یوں فرمائی: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ﴾ الی قولہ ﴿اُولٰئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا﴾ "یعنی وہ لوگ جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب عطا کی وہ اس کے ساتھ ایمان لانے والے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اجور دوہرے دیئے جائیں گے اس وجہ سے جو انہوں نے صبر کیا۔" علی بن عیسیٰ نے کہا کہ اس کی تصدیق یہ آیت کرتی ہے: ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهٖ﴾ "اے لوگ! جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو

اور اس کے رسول کے ساتھ ایمان لاؤ۔ وہ تمہیں اپنی رحمت سے (اجر کے) دو حصے دے گا۔" پھر حدیث شریف میں جن لوگوں کے دوہرے اجر مذکور ہیں ان میں وہ کتابی ہے جو پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لایا۔ رازی نے اس جگہ نبی علیہ السلام کی بابت انبیاء کے بشارات ذکر کیے ہیں۔ بعض بشارات فتح البیان میں بھی مذکور ہیں۔ ابو العالیہ نے کہا ان کا عہد یہ تھا کہ دین اسلام کی عبادت بجالاؤ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اس عہد کے پورا کرنے کے نتیجے میں جو عہد اللہ نے ان سے کیا تھا وہ یہ تھا کہ میں تم سے راضی ہوں گا اور تمہیں جنت میں داخل کروں گا۔ ابن فارس نے کہا اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی نعمت کفار پر بھی ہوتی ہے۔ کسی نے کہا وہ عہد یہ تھا: ﴿وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّه‘ لِلنَّاسِ﴾ "کہ جب اللہ کریم نے اہل کتاب سے یہ عہد لیا کہ وہ اس کو لوگوں کے سامنے بیان کریں گے۔" کسی نے کہا بلکہ وہ عہد یہ تھا: ﴿خُذُوْا مَا اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ "کہ جو ہم نے تمہیں عطا کیا اسے قوت سے پکڑلو۔" کسی نے کہا وہ عہد مراد ہے جو سورۃ الاعراف میں مذکور ہے: ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَه‘ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ "اور میری رحمت ہر چیز کو محیط ہے۔ عنقریب میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیزگار ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو امی نبی کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر خیر وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔" رہا وہ عہد جو اللہ نے ان کے ساتھ کیا تھا۔ بعض نے کہا وہ یہ عہد ہے: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَا اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ......الايه﴾ "کہ جب اللہ کریم نے انبیاء سے مضبوط عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت دوں گا پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو اس چیز کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔" فرمایا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا ذمہ لیا انہوں نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا گواہ رہو میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُه‘ اَحْمَدُ﴾ "کہ جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں اور اس چیز کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے آگے ہے۔ تورات سے اور اس پیغمبر کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا اس کا نام

احمد ہو گا۔" یہ بھی ممکن ہے کہ ان آیات سے جو عہد مراد ہیں وہ سب ہی مراد ہیں۔ واللہ اعلم. اور جو فرمایا کہ مجھ سے ہی ڈرو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم میرا عہد توڑو گے تو تمہیں سزا دوں گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا یعنی جو آفات تمہارے آباء و اجداد پر نازل ہوئیں وہ تم پر بھی نازل کروں گا جیسے شکلیں مسخ کرنا وغیرہ۔ پہلے ترغیب دی تھی پھر خوف دلایا، غرضیکہ ترغیب و ترہیب میں سے ہر طرح کی چیز سے اتباع حق اور اطاعت نبی ﷺ کی طرف بلایا۔ قرآن کے زواجر سے نصیحت حاصل کرنا اور اللہ کے احکام کو بجا لانا اور کتاب اللہ کی تصدیق کرنا سمجھایا۔ مگر ہدایت اسی کو ملتی ہے جسے اللہ چاہے۔ اسی لیے فرمایا کہ تم پہلے ہی کافر نہ بنو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ جو علم تمہیں ہے وہ دوسروں کو نہ ہے۔ پھر کیوں سب سے پہلے نبی علیہ السلام کا انکار تم ہی کیوں کرتے ہو۔ حالانکہ تم ان کی بعثت کی خبریں پڑھ اور سن چکے ہو۔ ابن جریر نے فرمایا قرآن مراد ہے کہ سب سے پہلے تم قرآن کے منکر نہ بنو۔ ابن کثیر نے کہا دونوں قول درست ہیں اس لیے کہ دونوں باہم متلازم ہیں۔ جو قرآن کا منکر ہو گا وہ رسول اللہ ﷺ کا بھی منکر ہو گا۔ اول کافروں سے بنی اسرائیل مراد ہیں کیونکہ ان سے پہلے بہت سے کفار قریش وغیرہ عرب انکار کر چکے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ قوم بنی اسرائیل میں سب سے پہلے منکر تم نہ بنو۔ اس لیے کہ قرآن میں سب سے پہلے مخاطب یہی یہود مدینہ تھے۔ ان کے انکار سے یہ بات لازم آئے گی کہ ان کی جنس میں سب سے پہلے منکر وہی تھے۔

حضرت حسن بصری نے کہا تھوڑی قیمت ساری دنیا سے عبارت ہے۔ یعنی تم ایمان و تصدیق رسول ﷺ کے عوض تھوڑی سی شہوات فانی کو اختیار نہ کرو۔ سدی نے کہا مراد یہ ہے کہ تھوڑے سے لالچ پر اللہ کے نام کو مت چھپاؤ۔ یہی لالچ مول ہے۔ ابو العالیہ نے کہا تعلیم علم پر اجرت نہ لو، دیکھو تمہاری پہلی کتاب میں کیا لکھا ہے کہ اے ابن آدم تم علم کو بلا اجرت سکھاؤ، جس طرح تم نے اس کو بلا اجرت سیکھا ہے۔ بعض نے کہا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں اپنی ریاست کو قائم رکھنے کے لیے ایمان و ایضاح و بیان کے بدلے لبس و کتمان نہ کرو۔ دھوکہ نہ دو، کیونکہ یہ دنیا قلیل و حقیر ہے۔ عنقریب ختم ہو جائے گی۔ حضرت ابی ہریرہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ جس نے کوئی ایسا علم سیکھا جس سے ذات الٰہی مقصود ہوتی ہے اور اس نے اس علم کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنا کر سیکھا تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو نہ پائے گا۔[بروایت ابی داؤد] معلوم ہوا کہ علم دین پڑھ کر دنیا کمانا جہنم میں جانا ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اگر تم تعلیم دینے پر اجرت مقرر کر لی تو جائز نہ ہے البتہ اپنے اہل و عیال کے اخراجات کے موافق بیت المال سے لے سکتا ہے لیکن اگر وہاں سے کچھ نہیں ملتا اور تعلیم پر اجرت بھی نہیں لیتا تو گویا وہ اس

شخص کے حکم میں ہے جس نے کچھ اجرت مقرر نہیں کی ہے۔ تو اب مالک و شافعی اور احمد و جمہور علماء کے نزدیک وہ تعلیم مذکور پر اجرت لے سکتا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں ایک شخص کے قصے میں مذکور ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((انَّ اَحَقَّ مَا اَخَذْتُمْ عَلَيْهِ اَجرًا كِتَابُ اللّٰهِ)) "کہ جس پر تم مزدوری لے سکتے ہو اس میں کتاب اللہ زیادہ مستحق ہے۔" پھر ایک عورت کے قصہ کے تحت آیا ہے: ((زَوَّجْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ)) لیکن پہلی اجرت دم کے عوض تھی تعلیم کے عوض نہ تھی۔ دوسری اجرت مہر کے عوض تھی تعلیم کے عوض نہ تھی۔ اسی لیے حدیث عبادہ بن صامت میں آیا ہے کہ ایک شخص نے ان کو تعلیم قرآن کے عوض ایک کمان تحفے میں دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تو آگ کی کمان گلے میں لٹکانا چاہتا ہے تو اس کو قبول کر لے۔ [بروایت ابی داؤد] ابن کثیر نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ تعلیم اللہ کے لیے تھی۔ اس لیے ثواب کے عوض تحفہ لینا جائز نہ ہوا اگر پہلے سے اجرت ٹھہرالی ہوتی تو درست ہوتا۔ پھر فرمایا کہ جمہور علماء کے نزدیک یہ حدیث اسی مطلب کے لیے ثابت کی گئی ہے۔

فائدہ: تقویٰ ڈر کو کہتے ہیں۔ تقویٰ یہ ہے کہ رحمت الٰہی کی امید پر اللہ کی اطاعت کرے اور اس کے عذاب کے خوف سے اس کی نافرمانی چھوڑ دے۔ اور جو فرمایا کہ مجھ سے ہی ڈرتے رہو یہ سخت وعید ہے جو حق کو چھپانے باطل کو ہوا دینے اور مخالفت رسول پر کمر بستہ رہنے پر مخلوق کو سنائی گئی ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿٤٣﴾

اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور سچی بات کو جان بوجھ کر نہ چھپاؤ۔ اور نماز پڑھا کرو اور زکوۃ دیا کرو اور (اللہ کے آگے) جھکنے والوں کے ساتھ جھکا کرو۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ کریم نے یہودیوں کو دو چیزوں سے منع فرمایا اور حق کو ظاہر کرنے کا حکم دیا۔ حضرت ابن عباس نے کہا کہ حق کو باطل سے اور سچ کو جھوٹ سے نہ ملاؤ۔ ابو العالیہ نے اتنا زیادہ کہا ہے کہ امت محمدیہ ﷺ سے خیر خواہی کرو۔ حضرت قتادہ نے کہا کہ یہودیت و نصرانیت کو اسلام میں داخل نہ کرو۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ اللہ کا دین یہی اسلام ہے۔ یہودیت و نصرانیت بدعت ہے۔ اللہ کی طرف سے نہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا کہ جان بوجھ کر حق چھپانا یہ ہے کہ تورات اور انجیل میں رسول اللہ کا ذکر لکھا ہوا پایا اور ان صفات کی روشنی میں آنحضرت ﷺ کو پہچان بھی لیا مگر جان بوجھ کر انکار کر دیا۔ حق بات کو چھپایا یہ مطلب ہے کہ تم حق بات کو چھپاتے ہو حالانکہ تمہیں علم ہے کہ حق کو چھپانے میں کس قدر نقصان ہے۔ یہ نقصان ان لوگوں کو ہو گا جو

تمہارے اس اضلال میں پھنس گئے کیونکہ یہ دھوکہ انہیں جہنم میں جا پھینکے گا۔

فائدہ: اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کو کسی حق بات کا علم ہے تو اس پر وہ ظاہر کرنا واجب ہے اور اس کو چھپانا حرام ہے۔ اس میں ساری مخلوق کو تنبیہ ہے۔ اور اس کام پر خوف دلایا جا رہا ہے۔ اگرچہ یہ خطاب خاص ہے مگر اس کا معنی عام ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر شخص پر حق و باطل کو نہ ملانا اور اظہار حق واجب ہے۔ جس مسلمان نے علم حدیث کی کتب پڑھی یا سنی ہیں اور اس کو آنحضرت کے احکام میں سے کسی حکم کے متعلق علم ہو چکا ہے پھر بوقت سوال وہ اس کو چھپائے یا کسی ملا و شیخ کی بات کے ساتھ درست بات کو ملا دے تو وہ اس آیت کے تحت داخل ہو گا اور لفظ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سے یہ ثابت ہوا کہ یہود کا کفر کرنا، عناد کی وجہ سے تھا۔ جہالت کی وجہ سے نہ تھا۔ اس گناہ کی سزا بہت سخت ہے کیونکہ یہ بڑا عظیم گناہ ہے۔ جیسے مقلدین کا سنت کی اتباع سے انکار کرنا بھی انکار عناد ہے۔ انکار جہل نہ ہے۔ اس آیت کا یہ مطلب نہ ہے کہ جہالت کی وجہ سے دین کو مشکوک کرنا اور چھپانا جائز ہو جاتا ہے۔ کیونکہ لاعلم پر یہ واجب ہے کہ خصوصاً دین کے معاملے میں بغیر سوچے سمجھے کوئی بات نہ کرے۔ اس لیے کہ احکام دین میں بات چیت کرنا اور تصدیق کرنا اس شخص کا کام ہے جو علم میں پختہ اور فہم میں عمدہ ہو۔ کہاں یہ جُہّال مقلدین اور کہاں دین مبین۔ ((لا حول ولا قوۃ الا باللہ))

فائدہ: فتح البیان میں اس مقام پر ان متکلمین و مفسرین کا رد کیا ہے جو بینات قرآن میں باہمی مناسبات بیان کرتے ہیں۔ سب سے پہلے بقاعی نے یہ کام کیا، پھر دوسروں نے کہا۔ تفسیر رحمانی اور تفسیر عزیزی میں بھی یہی کچھ ہے۔ اللہ کے کلام پاک کو ان تکلفات سے کیا واسطہ ہے۔ نزول قرآن تو مختلف حالات و حادثات کے موافق رہا ہے ان میں باہمی مناسبت تلاش کرنا تو کوہ کندن و کاہ بر آوردن یا باد بمشت پیمودن یا آہن سرد کو فتن ہے۔

فائدہ: مقاتل نے کہا کہ اس آیت میں اہل کتاب کو حکم ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ نماز پڑھا کریں اور یہ کہ مال کی زکوٰۃ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا کریں۔ اس امت اسلام کے ساتھ رہو اور اس کے افراد میں سے ایک فرد بن جاؤ۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس جگہ زکوٰۃ سے طاعت و اخلاص مراد ہے۔ دوسرا لفظ یہ ہے کہ مقدار زکوٰۃ مراد ہے۔ دو سو یا اس سے زیادہ اس لیے کہ زکوٰۃ کا ذکر صلوٰۃ کے ساتھ آیا ہے۔ اگرچہ لغت میں پہلے معنی بھی درست ہو سکتے ہیں۔ ادائے زکوٰۃ بذات خود طاعت و اخلاص ہے۔ اسی لیے حسن نے کہا کہ زکوٰۃ سے فریضہ واجبیہ مراد ہے۔ کیونکہ بلا نماز و زکوٰۃ اعمال کچھ فائدہ نہ دیتے ہیں۔ حارث عکلی نے کہا کہ اس سے صدقہ فطر مراد ہے۔ مگر عموم بہتر ہے۔ فتح البیان میں ہے کہ نماز سے اس جگہ پانچ وقت

کی نماز معین وقت پر اس کے تمام حدود وارکان کو مکمل کر کے پڑھنا مراد ہے۔ یہی حال زکوٰۃ کا ہے۔

فائدہ: رکوع کمر جھکانے اور سر نیچا کرنے کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ نمازیوں کے ساتھ تم بھی نماز پڑھو، رکوع کا ذکر خصوصاً اس لیے کیا کہ یہود کی نماز میں رکوع نہ تھا۔ اہل جاہلیت پر رکوع گراں گزرتا تھا۔ سب نمازی رکوع شرعی کو جانتے ہیں کہ سر اور کمر جھکا کر گھٹنوں کو ہاتھ ہتھیلی سے پکڑ کر اطمینان سے مشروع ذکر کرے۔

فائدہ: اس سے یہ واضح ہوا کہ نماز جماعت سے پڑھنا بعض اہل علم کے نزدیک واجب ہے۔ جمہور کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔ واجب نہ ہے۔ یہی قول حق ہے کیونکہ صحابہ کی ایک جماعت سے مرفوعاً احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نماز باجماعت تنہا نماز سے پچیس یا ستائیس درجے زیادہ ہے۔ معلوم ہوا کہ اگر کسی عذر یا بغیر عذر کے تنہا نماز پڑھ لی تو ہو جائے گی اگر فرض ہوتی تو تنہا پڑھنے سے ادا نہ ہوتی۔ بخاری میں مرفوعاً آیا ہے جو شخص امام کے ساتھ نماز پڑھتا ہے وہ اس شخص کی نماز سے بہتر ہے جو اکیلا نماز پڑھتا ہے۔ اس مسئلے کی پوری بحث منتقیٰ میں ہے۔ قرطبی نے اس آیت کے تحت جماعت وامامت کے مسائل تحریر کیے ہیں۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤٤﴾	(یہ) کیا (عقل کی بات ہے کہ) تم لوگوں کو نیکی کرنے کو کہتے ہو اور اپنے تئیں فراموش کیے دیتے ہو حالانکہ تم کتاب (اللہ) بھی پڑھتے ہو کیا تم سمجھتے نہیں؟

فائدہ: یہ اہل کتاب کو خطاب ہے کہ تم لوگوں کو نیک کام کا حکم دیتے ہو اور اپنے نفس کو بھول جاتے ہو کیا تم یہ نہیں سمجھتے ہو کہ کیا کر رہے ہو۔ ذرا ہوش سے کام لو۔ حضرت قتادہ نے کہا کہ بنی اسرائیل لوگوں سے کہتے کہ اللہ کی اطاعت کرو نیک کام کرو اور اللہ سے ڈرو لیکن خود اس ارشاد کے خلاف چلتے تھے۔ اس پر اللہ نے ان کو عار دلایا۔ ابن جریج نے کہا کہ منافق لوگوں سے کہتے تھے کہ روزہ رکھو اور نماز پڑھو لیکن خود یہ کام نہ کرتے تھے۔ سو جو کوئی دوسرے کو خیر کا حکم دے اس کو چاہئے کہ سب سے پہلے اور جلد ہی خود اس پر عمل کرے ورنہ خود ((فضیحت دیگراں را نصیحت)) والی مثال کا مصداق ہو گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ اے اہل کتاب! تم لوگوں کو کفر سے روکتے ہو اس لیے کہ تمہارے پاس نبوت اور عہد ہے مگر تم خود اس عہد کے منکر ہو جو کہ تم سے آنحضرت ﷺ کی تصدیق کے متعلق تم سے لیا گیا تھا۔ دوسرا لفظ یہ ہے کہ کہ تم لوگوں سے تو کہتے ہو کہ دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہو جاؤ مگر خود تم مسلمان نہیں ہوتے ہو۔ ابو الدرداء نے فرمایا کوئی آدمی تب تک فقیہ نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ کے لیے لوگوں کو دشمن نہ سمجھے پھر اپنے نفس کی طرف پلٹے اور اسے سب

سے بڑا دشمن سمجھے۔ ابن زید نے کہا کہ جب یہود کے پاس کوئی شخص آتا اور کوئی ایسی بات پوچھتا جس میں نہ حق ہوتا نہ لالچ رشوت تو سچی بات بتا دیتے۔ حاصل یہ ہے کہ ان کی اس حرکت کی مذمت کی اور انہیں اپنے ہی نفس کے اس نقصان سے آگاہ کیا۔ کہ دیکھو تم دوسروں کو خیر کا حکم دیتے ہو مگر خود عمل نہ کرتے ہو۔ کہ لوگوں کو نیکی کا حکم کرنے میں کوئی قباحت نہ ہے بلکہ ایک اچھا کام ہے لیکن مذمت تو اس بات میں ہے کہ جس چیز کا حکم تم لوگوں کو دیتے ہو وہ خود چھوڑ دیتے ہو۔ یہ اس لیے فرمایا کہ امر بالمعروف ہر عالم پر فرض ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس کا عامل ہونا بھی لازم ہے۔ صرف یہی کافی نہ ہے کہ لوگوں کو اس کا حکم کر کے خود بیٹھ رہے۔ جس طرح شعیب علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿وَمَا اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَا اَنْهَاكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ ”کہ میں نہیں چاہتا کہ میں اس چیز سے مخالفت کروں جس سے میں تم کو روکتا ہوں۔ میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں۔ جب تک کہ میری استطاعت ہے اور میری توفیق اللہ ہی کے ساتھ ہے۔“ سو امر بالمعروف اور اس پر خود عمل کرنا دونوں واجب ہیں۔ ایک کے ترک کرنے سے دوسرا ساقط نہیں ہو جاتا۔ سلف و خلف کے نزدیک یہی درست ہے۔ اور یہی قول کہ کسی منکر کام کا مرتکب دوسرے کو اس کام سے منع نہ کرے۔ یہ ضعیف ہے۔ اور اس سے بھی کمزور بات یہ ہے کہ اس آیت سے یہ استدلال کیا جائے کہ جو غلط کام خود کرتا ہے اس سے دوسروں کو بھی منع نہ کرے۔ حالانکہ آیت اس مدعا پر دلیل نہ ہے۔ درست بات یہی ہے کہ اگرچہ خود کو عالم ایک خیر کا کام نہ بھی کر سکے تو اسے چاہیئے کہ دوسروں کو اس کا حکم دے۔ (کہ شاید کوئی دوسرا وہ کام کر لے) اور اگر وہ کسی جرم کا مرتکب ہو گیا ہے پھر بھی اسے چاہیئے کہ لوگوں کو اس سے بچنے کا حکم دے۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا کہ اگر ایسی ہی بات ہوتی تو نہ کوئی امر بالمعروف کرتا نہ نہی عن المنکر ہی کر سکتا۔ مالک نے فرمایا کہ یہ بات درست ہے کیونکہ کون شخص ایسا ہے جس میں کوئی گناہ نہ ہو۔

ابن کثیر نے فرمایا لیکن جان بوجھ کر ایک نیک کام کو چھوڑنا اور برے کام کرنا بڑی مذموم حرکت ہے کیونکہ عالم و غیر عالم برابر نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے ایسی حالت اپنانے پر حدیث پاک میں سخت وعید آئی ہے۔ انس بن مالک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں معراج کی رات ایک ایسی جماعت کے پاس سے گذرا جن کے ہونٹ قینچی سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے کہا یہ کون لوگ ہیں۔ فرمایا یہ تیری امت کے دنیادار خطیب ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے تھے لیکن اپنے نفس کو بھول جاتے تھے حالانکہ وہ کتاب بھی پڑھتے تھے پھر بھی کیوں نہ سمجھے۔ [بروایت احمد] ان کی دوسری روایت اسامہ سے یوں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت والے دن

ایک شخص کو لا کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا اس کی آنتیں اس کو لپیٹ لیں گی۔ وہ آگ میں یوں چکر کاٹے گا جیسے گدھا چکی لیے پھرتا ہے۔ دوزخی لوگ آکر اسے کہیں گے کہ اے فلاں! تجھے کیا ہوا کیا تو ہمیں نیکی کا حکم اور برائی سے منع نہ کرتا تھا وہ کہے گا کہ میں تمہیں نیکی کا حکم دیتا تھا لیکن خود ایسا نہ کرتا تھا تمہیں برائی سے روکتا تھا مگر خود نہ رکتا تھا۔ شیخین نے بھی اسی سے قریب قریب روایت بیان فرمائی ہے۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ قیامت والے دن ان پڑھوں کو تو معاف کر دے گا لیکن علم والوں کو معاف نہ کرے گا۔ [بروایت امام احمد] معلوم ہوا کہ شرک و کفر کے سوا اور گناہوں میں جہالت عذر ہو سکتی ہے یہ اس لیے ہے کہ عالم و غیر عالم برابر نہ ہیں۔ جیسے مالک کائنات جل ذکرہ نے فرمایا: ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ "کہ کیا علم والے اور غیر علم والے برابر ہو سکتے ہیں۔ بلاشبہ عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔"

حضرت ولید بن عقبہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ کچھ جنتی لوگ دوزخیوں کو جھانک کر کہیں گے کہ تم کیسے آگ میں آگئے واللہ ہم تو تم سے سیکھ کر یہاں آئے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ جو ہم کہتے تھے وہ کرتے نہ تھے۔ [بروایت ابن عساکر]

ایک آدمی حضرت ابن عباسؓ کے پاس آیا اور کہا میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروں۔ فرمایا: کیا تو اس درجے کو پہنچ گیا ہے کہا امید تو ہے۔ فرمایا اگر تجھے یہ خوف نہ ہو کہ کتاب اللہ کی تین آیات تجھے رسوا کریں گی تو یہ کام کر لے۔ اس نے کہا وہ کونسی آیات ہیں۔ فرمایا: ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ "کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھول جاتے ہو۔" کیا تو نے اس کو مضبوط کر لیا ہے۔ اس نے کہا: نہیں۔ اور دوسری آیت کونسی ہے؟ فرمایا: ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ "کہ تم جو کر نہیں سکتے ہو وہ کہتے کیوں ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ بڑی ناراضگی والی بات ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں ہو۔" پوچھا کیا تو نے اس کو محکم کر لیا ہے؟ بولا: نہیں۔ اور تیسری آیت کونسی ہے؟ کہا شعیب علیہ السلام کا فرمان کہ: ﴿وَمَا اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ﴾ "کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہاری مخالفت کروں (یعنی جس چیز سے تمہیں منع کرتا ہوں وہ خود کر لوں اور جس چیز کا تمہیں حکم دوں خود چھوڑ دوں۔)" کہا اس کو بھی محکم نہیں کیا؟ کہا پھر اپنے نفس سے ابتدا کر۔ [بروایت ابن مردویہ] ابراہیم نخعی نے فرمایا کہ میں انہی تین آیات کی بناء پر وعظ کرنا غیر مناسب سمجھتا ہوں۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ﴿٤٥﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿٤٦﴾

اور رنج و تکلیف میں صبر اور نماز سے مدد لیا کرو اور بے شک نماز گراں ہے مگر ان لوگوں پر گراں نہیں جو عجز کرنے والے ہیں۔ جو یقین کیے ہوئے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

فائدہ: حضرت مجاہد نے فرمایا کہ اس جگہ دین سے روزہ مراد ہے۔ قرطبی نے کہا کہ اسی لیے رمضان کو شہر صبر کہتے ہیں۔ جس طرح کہ حدیث میں آیا ہے کہ صوم نصف صبر ہے۔ کسی نے کہا صبر یہ ہے کہ گناہوں سے باز رہے۔ اسی لیے اس کو نماز کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ و عن سائر المومنین نے فرمایا کہ صبر دو طرح کا ہے۔ ایک صبر مصیبت پر ہے یہ بھی حسن ہے لیکن اس سے زیادہ اچھا یہ صبر ہے کہ محارم سے رک جائے۔ ابو العالیہ نے کہا کہ اللہ کی رضا پر شاکر رہنا اور اس کو اللہ کی اطاعت سمجھنا ہی نماز اور صبر سے مدد لینا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ کسی کام پر ثابت قدمی کے لیے نماز سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ "کہ نماز قائم کیجئے! بلا شبہ نماز بے حیاء اور برائی سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔" معلوم ہوا کہ جس کی نماز اسے بے حیائی اور برائی سے نہیں روکتی اس کی نماز اللہ کریم کے ہاں قابل قبول نہ ہے۔ حدیث حذیفہ رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی معاملہ پریشان کرتا تو نماز پڑھنے لگتے۔ [بروایت امام احمد و ابو داؤد]

ابن جریر کا لفظ یہ ہے کہ نماز کے ذریعے پناہ پکڑتے۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کی رات جو کوئی بھی تھا سو رہا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاگتے رہے۔ ساری رات نماز پڑھتے اور دعا کرتے رہے۔ بروایت ابن نصر المروزی ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے گذرے تو وہ پیٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ فرمایا: کیا تیرے پیٹ میں درد ہے کہا: جی ہاں۔ فرمایا: اٹھ اور نماز پڑھ بلا شبہ نماز شفاء ہے۔ [بروایت ابن جریر]

حضرت ابن عباس کو راستے میں خبر ملی جبکہ کسی سفر میں تھے کہ ان کے بھائی قثم فوت ہو گئے تو ((انا للہ و انا الیہ راجعون)) پڑھا اور راستے سے الگ ہو کر اونٹ بٹھایا اور نماز پڑھنے لگے۔ پھر سواری کے پاس جا کر یہ آیت

پڑھی:﴿وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ﴾ ''کہ نماز اور صبر سے مدد مانگو۔'' ابن جریر نے اس کو بھی روایت کیا۔ ابن جریج نے کہا کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کی رحمت سے مددگار ہیں۔ صبر اور صابرین کی مدح میں بہت سی احادیث مروی ہیں مگر عام ہیں اس آیت سے خاص نہ ہیں۔ سیوطی رحمہ اللہ نے کسی قدر ''در منثور'' میں ذکر کی ہیں۔ اسی طرح اللہ کریم نے صبر کی ترغیب کے لیے جابجا کلام پاک میں صبر کی مدح ذکر فرمائی ہے۔

صبر ست علاج دل بیمار تو واقف افسوس که کم داری و بسیار ضرورست

میں کہتا ہوں کہ صبر کی جزاء و ترغیب میں اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَهُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ کہ صابر لوگ اپنے اجر بغیر حساب کے دیئے جائیں گے۔ صرف یہی آیت ہوتی اور احادیث و آیات نہ بھی ہوتیں تو دین و دنیا میں صبر کے لیے یہی کافی تھی۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ انبیاء گھبراہٹ کے وقت نماز پڑھا کرتے تھے۔ [بروایت امام احمد، نسائی، ابن حبان]

فائدہ: بعض کے نزدیک خاشعین سے مومنین مراد ہیں۔ کسی نے کہا خائفین، کسی نے کہا مطیعین مراد ہیں۔ بعض نے کہا مصدقین وعد و وعید مراد ہیں۔ کسی نے کہا مستکیفین۔ بعض نے کہا مُتَذَلِّلِیۡنَ، بعض نے کہا متواضعین مراد ہیں۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ میں نے اعمش سے پوچھا کہ خشوع کیا چیز ہے۔ انہوں نے کہا: اے ثوری! تو لوگوں کا امام بنا چاہتا ہے اور تجھے یہ علم نہیں کہ خشوع کیا ہے؟ خشوع یہ نہ ہے کہ تو موٹا کھائے اور پہنے اور سر جھکائے پھرے بلکہ خشوع یہ ہے کہ تو باعزت اور کم عزت کو حق میں برابر سمجھے اور جو چیز اللہ نے تجھ پر فرض کی ہے اس میں عاجزی، خاکساری و غریبی برتے۔ ابن کثیر نے فرمایا: اگرچہ یہ آیت سیاق بنی اسرائیل کے انداز کے متعلق آئی ہے مگر کچھ ان کے ساتھ خاص نہ ہے بلکہ ان کے اور ان کے سوا دوسرے سب لوگوں کے لیے عام ہے۔ اس آیت میں یہ بھی پتا چلا کہ یہ نماز و وصیت اور مدد طلب کرنا اسی شخص پر آسان ہے جو آخرت کا اقرار کرتا ہے۔ اللہ کی ملاقات اور اپنے بلائے جانے کا یقین رکھتا ہے۔ جس کو آخرت کا یقین آگیا اس پر طاعات کا بجالانا اور منکرات کو چھوڑنا آسان ہو گیا۔ جس کا یقین کمزور ہے اس پر نیکی کرنا اور گناہ چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔

﴿لا حول و لا قوۃ الا باللہ﴾

اس جگہ محاورۂ عرب اور اہل ادب کے اشعار کے مطابق ظن سے یقین مراد ہے۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ

جہاں کلام مجید میں ظن کا لفظ استعمال ہوا ہے اس سے علم مراد ہے۔ سلف کی ایک جماعت نے یہی بات کہی ہے۔ حدیث بخاری میں آیا ہے کہ اللہ کریم قیامت والے دن ایک بندے سے کہے گا: ((اَظَنَنْتَ انك ملاقی فیقول لا فیقول الله الیوم انساك كما نسیتنی)) اس جگہ بھی ظن سے یقین مراد ہے۔ اس جگہ پارہ اول کا ربع اول ختم ہوا۔ ولله الحمد والمنه۔

يَابَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٤٧﴾

اے یعقوب کی اولاد! میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کیے تھے اور یہ کہ میں نے تم کو جہاں میں لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جب اس آیت کو تلاوت فرماتے تو کہتے کہ قوم تو گذر چکی ہے مگر مراد تم ہو یعنی لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے سبب کے خصوص کا نہیں۔ اس آیت میں اللہ کریم نے ان نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ کریم نے یہود کے اسلاف پر کی تھیں۔ اور جو انہیں ان کے ہم زمانہ لوگوں پر فضیلت دی تھی۔ جیسے رسولوں کا انہی میں مبعوث کرنا اور ان میں کتابیں نازل کرنا، جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنَا هُمْ عَلَى عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ "کہ ہم نے انہیں علم کے باوجود جہاں والوں پر پسند کر لیا۔" اور اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ﴾ "اور جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر ہے جبکہ اس نے تم میں انبیاء بھیجے اور تمہیں بادشاہ بنادیا اور تمہیں وہ کچھ عطا کیا جو جہاں والوں میں سے اور کسی کو عطا نہ کیا گیا۔"

ابو العالیہ نے فرمایا وہ تفضیل یہ تھی کہ انہیں بادشاہی و پیغمبری دی اس وقت میں جو شخص عالم تھا اس پر کتاب نازل کی۔ ہر زمانے میں ایک عالم ہوتا ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا اس کو اسی احتمال پر محمول کرنا واجب ہے کیونکہ یہ امت ان سے افضل ہے کیونکہ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم﴾ "کہ تم بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہو تم لوگوں کو اچھائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ کے ساتھ ایمان لاتے ہو، اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔" اہل سنن نے معاویہ قشیری سے مرفوعاً

روایت کیا کہ تم ستر امتوں کو مکمل کرو گے۔ تم ان سب سے بہتر ہو۔اس باب میں اور بھی بہت سی احادیث آئی ہیں۔ کسی نے کہا کہ سب لوگوں پر ایک طرح کی تفضیل مراد ہے مطلقاً مراد نہ ہے۔ مگر یہ قول محلِ نظر ہے۔ کسی نے کہا بلکہ ساری امتوں پر فضیلت دی گئی کیونکہ اکثر انبیاء اسی امت میں ہوئے لیکن یہ قول بھی محل نظر ہے کیونکہ عالمین کا لفظ عام ہے ،اگلے پچھلے سات انبیاء کو شامل ہے حالانکہ ابراہیم ان سے پہلے تھے وہ سارے انبیاء سے افضل ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بعد ہوئے وہ بھی ساری مخلوق میں سے افضل ہیں بلکہ اولاد آدمؑ کے سردار ہیں۔اور انہیں ہر شرف دنیاو آخرت میں حاصل ہے۔

فائدہ: فتح البیان کا لفظ یہ ہے کہ عالمین سے اس زمانے کے لوگ مراد ہیں۔پھر یہ لفظ ماضی اور استقبال کو شامل نہ ہوگا اور وہ تفضیل اگرچہ آباء کے حق میں ہے مگر ایک طرح سے وہ ابناء ہی کا شرف ہے۔کشاف میں فرمایا عالمین سے ایک بڑا گروہ مراد ہے۔جس طرح فرمایا:﴿بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ﴾ لفظ عالم بولتے ہیں جبکہ مراد کثرت ہوتی ہے۔ مگر رازی نے اس کو ضعیف بتایا ہے۔امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس ضعف کو قبول نہیں فرمایا بلکہ کشاف کی تائید فرمائی ہے۔اور یہی بات درست ہے۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٨﴾

اور اس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے اور نہ کسی کی سفارش منظور کی جائے اور نہ کسی سے کسی طرح کا بدلہ قبول کیا جائے اور نہ لوگ (کسی اور طرح) مدد حاصل کر سکیں۔

بنی اسرائیل کہا کرتے تھے کہ ہم جتنے بھی گناہ کریں ہمیں کوئی مواخذہ نہ ہوگا ہمارے باپ دادا پیغمبر تھے ہمیں عذاب سے بچالیں گے۔

فائدہ: اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔جس دن کوئی بھی کسی کے کام نہ آئے گا۔جیسے فرمایا:﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کے بوجھ نہ اٹھائے گا۔اور جیسے فرمایا:﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ﴾ "کہ اس دن ہر شخص کی ایسی حالت ہوگی جو اسے کفایت کرے گی (یا دوسروں سے بے نیاز کردے گی۔)" اور فرمایا:﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَا يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَالِدِهِ شَيْئًا﴾ "کہ اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن سے ڈرو جس دن نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کام آئے گا نہ اولاد اپنے والد سے کچھ بھی کفایت کرے گی۔" یہ مقام نہایت بلیغ ہے

کہ باپ بیٹا آپس میں ایک دوسرے کو کچھ فائدہ نہ دے سکیں گے۔ بلکہ اس دن ہر شخص اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے بھاگتا، چھپتا پھرے گا۔ پہلے نفس سے نفس مومن مراد ہے اور دوسرے نفس سے نفس کافر مراد ہے۔ یعنی کسی فرماں بردار کی اطاعت کسی نافرمانی کرنے والے سے عذاب کو ہٹانہ سکے گی جو گناہوں کی وجہ سے اس پر مسلط ہو گیا ہے۔ نہ کسی شخص کی کوئی سفارش قابل قبول ہو گی۔ جیسے فرمایا: ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ﴾ کہ ان کو کسی سفارش کرنے والے کی سفارش نفع نہ دے گی۔ اسی طرح خود جہنم والے کہیں گے کہ: ﴿فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ﴾ "کہ ہمارے لیے نہ تو کوئی سفارشی ہیں اور نہ کوئی گرم جوش دوست۔" اسی طرح اگر کوئی چاہے گا کہ اس سے کچھ فدیہ لے کر اسے رہا کر دیا جائے لیکن وہ بھی ممکن نہ ہو گا۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ﴾ "بے شک وہ لوگ جو کافر ہوئے اور کفر کی حالت میں ہی مر گئے تو ان سے ہر گز کوئی فدیہ قبول نہ کیا جائے گا کہ اگرچہ زمین بھر کر بھی سونا دیا جائے۔" اور فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ "بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اگر ان کے پاس اتنا ہو جتنی زمین ہے اور اتنا ہی اور بھی تاکہ وہ قیامت کے دن عذاب سے فدیہ دیں تو ان سے قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔" اور فرمایا: ﴿وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا﴾ "اور اگر وہ ہر قسم کا بدلہ بھی دیں تو بھی ان سے قبول نہ کیا جائے گا۔" اور فرمایا: ﴿فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَاْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ﴾ "پس آج تم سے اور کافروں سے کوئی فدیہ نہ لیا جائے گا تمہارا ٹھکانہ آگ ہے اور یہی تمہاری رفیق ہے۔" ان آیات میں اللہ کریم نے یہ خبر دی ہے کہ نہ وہ رسول پر ایمان لائے نہ انہوں نے رسول کی پیروی کی۔ اب وہ قیامت کے دن اللہ سے اسی حال میں ملیں گے۔ نہ ان سے کوئی قرابت کام آئے گی، نہ ان سے کسی شخص کی سفارش کفایت کرے گی۔ اگر زمین بھر سونا بھی دیں تو بھی نہ لیا جائے گا۔ جیسے فرمایا: ﴿مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ﴾ "کہ اس دن سے پہلے پہلے خرچ کرو جس دن نہ خرید و فروخت ہو گی نہ دوستی ہو گی اور نہ شفاعت ہو گی۔" اور فرمایا: ﴿لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ﴾ "کہ اس دن میں نہ خرید و فروخت ہو گی اور نہ دوستی ہو گی۔" حضرت

ابن عباس نے فرمایا لفظ عدل سے بدل مراد ہے۔ بدل فدیہ ہوتا ہے۔ سلف کی ایک جماعت نے بھی یہی بات کہی ہے کہ اس جگہ عدل سے فداء مراد ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ نے فرمایا کہ صرف عدل ہے۔ عدل فریضہ ہے۔ لیکن یہاں یہ قول غریب ہے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ ایک حدیث میں بھی آیا ہے کہ عدل فدیہ ہے۔ [بروایت جریر]

فائدہ: اس کا مطلب ہے کہ انہیں مدد نہ ملے گی۔ وہاں ایسا کوئی شخص نہ ہوگا جس کو غصہ آئے تو وہ ان کی مدد کے لیے کھڑا ہو اور انہیں اللہ کے عذاب سے بچائے۔ غرضیکہ نہ کوئی اپنا ان کی مدد کرے گا نہ غیر۔ جیسے فرمایا: ﴿فَمَالَه' مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ﴾ کہ ان کے لیے نہ کوئی طاقت ہوگی اور نہ کوئی مددگار، مراد یہ ہے کہ اللہ کافروں کے حق میں نہ کوئی فدیہ قبول کرے گا نہ کسی کی سفارش ان کو اس کے عذاب سے بچا سکے گی۔ جیسے فرمایا: ﴿وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ﴾ ''کہ وہ خود پناہ دیتا ہے اس پر پناہ نہیں دی جاتی۔'' اور فرمایا: ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَه' اَحَدٌ وَلَا يُوْثِقُ وَثَاقَه' اَحَدٌ﴾ ''پھر اس دن سے ایسا عذاب دے گا کہ اس جیسا کسی اور کو عذاب نہ دیا ہوگا اور اس طرح قید کرے گا جس طرح اور کسی کو قید نہ کیا ہوگا۔'' اور فرمایا: ﴿مَالَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ﴾ ''تمہیں کیا ہے کہ باہم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے ہو۔ بلکہ وہ آج آپ کو سپرد کرتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ﴾ ''پس کیوں نہ ان کی ان لوگوں نے مدد کی جن کو انہوں نے اللہ کے سوا تقرب کا ذریعہ (بصورت معبود) بنالیا تھا بلکہ وہ (سب) ان سے کھوگئے۔'' ابن جریر نے فرمایا اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اس دن ان کی کوئی مدد نہ کرے گا نہ ان کا کوئی سفارشی ہوگا نہ فدیہ یا بدلہ لیا جائے گا وہاں باطل دوستیاں رشوتیں سب ناکام ہو جائیں گی اور باہم ایک دوسرے سے مدد کرنا ختم ہو جائے گا۔ اسی جبار و عادل جل ذکرہ کا فیصلہ نافذ ہوگا۔ نہ سفارشی کچھ فائدہ دے سکیں گے نہ مددگار کوئی حمایت کر سکیں گے۔ بدی کا پورا پورا بدلہ اور نیکی کی دوہری جزاء دے گا۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے کہ ﴿وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ مَالَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ﴾ ''کہ انہیں ٹھہرا رکھو ان سے سوال کیا جائے گا تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد نہ کرتے ہو۔ غرضیکہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین ان کے لیے اس دن رہائی کی کوئی صورت حال درپیش نہ ہوگی۔ وہ دن دنیا کے دنوں جیسا نہ ہوگا کہ اس میں کھانے کھلانے اور خوشامد و سفارش سے کام چل جائے گا۔ یا بھائی بھائی یا دوست ایک دوسرے کی مدد کریں یا باپ دادا کام آجائیں۔

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿٤٩﴾

اور (ہمارے ان احسانات کو یاد کرو) جب ہم نے تم کو قومِ فرعون سے مخلصی بخشی۔ وہ (لوگ) تم کو بڑا دکھ دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو تو قتل کر ڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے، اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔

فائدہ: ان کی یہ نجات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے وقوع میں آئی۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ فرعون لعنۃاللہ نے خواب دیکھا اور ڈر گیا۔ خواب یہ تھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ نکلی ہے جو بلاد مصر میں قبطیوں کے گھروں میں گھس گئی ہے لیکن بنی اسرائیل اس سے محفوظ رہے ہیں۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ ایک اسرائیلی شخص کے ہاتھوں قبطیوں کی بربادی ہو گی۔ فرعون سے بھی یہ بات کہی گئی تھی کہ بنو اسرائیل ایک شخص کے منتظر ہیں جس کے ہاتھ پر انہیں عظمت و دولت ملے گی۔ تب فرعون نے یہ حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو گا اس کو قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رکھا ان لوگوں سے سخت محنت کے کام لیے اور نہایت غلیظ خدمتیں لیا کرتا تھا۔ حضرت ابن کثیر فرماتے ہیں کہ قوم عمالقہ میں ہر بادشاہ مصر کو فرعون کہا جاتا ہے۔ جیسے روم و شام کے ہر کافر بادشاہ کو قیصر کہا جاتا ہے۔ فارس کے ہر کافر بادشاہ کو کسریٰ کہتے ہیں۔ ہر کافر بادشاہ یمن کا نام تبع ہے، ہر بادشاہ حبشہ کا نام نجاشی ہے۔ ہر بادشاہ ہند کا نام بطلیموس ہے لیکن کتب تاریخ میں یونانی بادشاہوں کا بطالسہ بتایا جاتا ہے اور ہر بادشاہ ہند کا لقب جیسپال ہے۔ ہر بادشاہ چین کا لقب خاقان ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس فرعون کا نام جو حضرت موسیٰ کے دور میں تھا، ولید بن مصعب بن ریان تھا۔ کسی نے کہا مصعب بن ریان نام تھا، کسی نے کہا مصعب بن ریان عملیق بن اود بن ارم بن سام بن نوح کی اولاد سے تھا۔ اس کی کنیت ابو مرہ تھی۔ اصل میں اہل اصطخر سے فارسی النسل ہے۔ پھر کہا کچھ بھی ہو اللہ اس پر لعنت کرے۔

فتح البیان میں فرمایا کہ اہل کتاب کے قول میں اس کا نام قابوس تھا۔ چار سو برس سے زیادہ عمر پائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس برس تھی۔ مسعودؒ نے کہا کہ عربی میں فرعون کے کچھ معنی نہ ہیں۔ جوہری نے کہا کہ ہر سرکش، جبار، مکار کو فرعون کہا جاتا ہے۔

فائدہ: لفظ بلاء کا استعمال خیر و شر دونوں میں ہوتا ہے۔ اگر یہاں خیر مراد ہو تو مراد یہ ہو گا کہ ان کے آباء واجداد کو فرعون کی سزا و غلامی سے نجات دی۔ اسی لیے ابن جریر، ابن عباس اور مجاہد نے اس جگہ بلاء کا ترجمہ نعمت عظیمہ سے کیا ہے۔ اگر شر مراد ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ بیٹوں کو قتل کرنا اور عورتوں کو زندہ چھوڑنا ایک

آزمائش تھی۔ سدی اور ابو العالیہ وغیر ھما نے کہا کہ بلاءؔ کا اصل معنی آزمائش ہے۔ آزمائش کبھی خیر سے ہوتی ہے اور کبھی شر سے۔

جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ "کہ ہم تمہیں خیر و شر سے آزمائش میں ڈال کر آزمائیں گے۔" اور فرمایا: ﴿بَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ کہ ہم نے انہیں حسنات وسیات سے آزمایا تاکہ وہ پلٹ آئیں۔ قرطبی نے فرمایا اس مقام پر بلاء سے شر مراد ہے۔ جمہور کا بھی یہی قول ہے۔

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٠﴾ اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو پھاڑ دیا تو تم کو نجات دی اور فرعون کی قوم کو غرق کر دیا اور تم دیکھ ہی تو رہے تھے۔

فائدہ: یہ قصہ سورۃ الشعراء میں مفصل ہے۔ وہاں مذکور ہو گا۔ دیکھنے کا ذکر اس لیے کیا کہ ان کا دل ٹھنڈا ہو کر دشمن کی ذلت اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ عمرو بن میمون نے کہا جب موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر نکلے تو فرعون نے کہا جب تک مرغ اذان نہ دے پیچھا نہ کرنا۔ اس دن مرغ نے اذان نہ دی۔ پھر صبح کو ایک بکری منگا کر ذبح کی اور کہا کہ جب تک میں اس کی کلیجی سے فارغ ہوں تب تک چھ لاکھ قبطی جمع ہو جائیں چنانچہ اس کی فراغت تک وہ جمع ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام جب دریا کے کنارے پہنچے تو ان کے ایک ساتھی یوشع بن نون نے کہا کہ تیرے رب کا حکم کہاں ہے۔ کہا سامنے۔ انہوں نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا وہ غوطے کھانے لگا۔ یوشع واپس آئے اور پھر وہی کہا کہ کہاں کا حکم ہے۔ واللہ نہ میں جھوٹا ہوں نہ آپ جھوٹے ہیں۔ تین دفعہ یہی کہا پھر اللہ کریم نے وحی کی کہ دریا کو اپنی لاٹھی سے مارو جب ایسا کیا تو دریا پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے پہاڑ کی طرح تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سمیت چل نکلے تو رستے میں فرعون آملا۔ جب وہ دریا کے درمیان پہنچا تو دریا مل گیا۔ یہ مطلب ہے اس قول کا کہ ہم نے فرعون کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے۔ بہت سے سلف نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دن عاشوراء کا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود عاشوراء کے دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ پوچھا یہ کیا دن ہے جس کا تم روزہ رکھتے ہو۔ بولے یہ ایک اچھا دن ہے جس دن اللہ نے بنی اسرائیل کو ایک بڑے دشمن سے نجات دی۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام روزہ رکھا تھا فرمایا تم سے زیادہ میں موسیٰ علیہ السلام کا حقدار ہوں پھر خود بھی اس دن روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی حکم دیا۔ [بروایت امام احمد] اسی کے قریب قریب اس روایت کو بخاری و مسلم، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت انس کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ اللہ نے عاشوراء کے دن بنی اسرائیل کے لیے دریا کو پھاڑ دیا۔ [بروایت ابو یعلیٰ] لیکن

اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ زید عمی اس کے راوی ہیں جن میں ضعف ہے۔ اور ان کے شیخ یزید رقاشی اس سے بھی زیادہ ضعیف ہیں۔ فتح البیان میں فرمایا جس طرح یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں سے ایک بڑا معجزہ ہے جس پر بنی اسرائیل کو شکر کرنا واجب ہے اسی طرح نبی علیہ السلام کا اس واقعے کو جوں کا توں بیان کرنا بھی ایک بڑا معجزہ ہے۔ جس کا قبول کرنا ان کے ساتھیوں پر واجب ہے۔

وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَى أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٥١﴾ اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا تو تم نے ان کے پیچھے بچھڑے کو (معبود) مقرر کر لیا اور تم ظلم کر رہے تھے۔

اس کا مکمل قصہ سورۃ طٰہ اور اعراف میں آئے گا۔ سورۃ اعراف میں فرمایا: ﴿وَوَاعَدْنَا مُوسىٰ ثَلَاثِيْنَ لَيْلَةً وَ اَتْمَمْنَا هَا بِعَشْرٍ﴾ "اور ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور اس کو دس کے ساتھ مکمل (چالیس) کر دیا۔" کہتے ہیں یہ ایک مہینہ ذی القعدہ اور دس دن ذی الحجہ کے تھے۔ اور یہ ماجرہ فرعون سے خلاصی کے بعد پیش آیا۔ بے انصاف اس لیے کہا کہ انہوں نے شرک کیا تھا اور شرک سے بڑھ کر بے انصافی اور کونسی ہوگی۔ اور یہ بچھڑے کے پجاری آٹھ ہزار لوگ تھے بلکہ تقریباً سبھی اس میں ملوث ہوئے تھے۔ حضرت ہارون اور بارہ ہزار شخصوں کے سوا۔ اور یہی قول زیادہ عمدہ ہے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٢﴾ پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کر دیا تاکہ تم شکر کرو۔

فائدہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر چلے جانے کے بعد انہوں نے بچھڑے کی عبادت شروع کر دی۔ پھر اللہ نے ان کا یہ قصور معاف کر دیا اور انہیں اپنا یہ احسان بطور نعمت یاد دلایا۔ کہتے ہیں کہ اس بچھڑے کا نام بہموت یا بہبوت تھا۔ موسیٰ عبرانی عجمی نام ہے۔ موماء کو شاشجر کو کہتے تھے۔ انہیں پانی اور درخت کے درمیان پایا تھا اس لیے موسیٰ کہنے لگے۔ شین سین ہو گیا۔ شکر محسن کا احسان ماننے اور اس کی تعریف کرنے کو کہتے ہیں۔

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٣﴾ اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے عنایت کیے تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

اس جگہ کتاب سے تورات مراد ہے۔ فرقان وہ ہے جو ہدایت و ضلالت اور حق و باطل میں فرق کر دے کسی نے کہا فرقان یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی اور فرعون کو غرق کر دیا۔ کسی نے کہا حلال و حرام میں فرق

کرنا فرقان ہے۔ یا دریا کو پھاڑ دینا فرقان ہے۔ جبکہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ فرقان سے حجت وہ بیان الٰہی مراد ہے۔ جیسے عصا و ید بیضاء یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب بھی دی اور معجزات بھی دیئے اور یہ عطا کرنا بھی دریا سے نکلنے کے بعد ہی ہوا۔ جیسا کہ سورۃ اعراف سے سمجھ آتا ہے۔ اور فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِ مَا اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَائِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ ''اور تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اس کے بعد جبکہ پہلے قرون کو ہلاک کر دیا جو لوگوں کے لیے بصیرت کا سبب ہے اور ہدایت و رحمت ہے۔ تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔'' اور اس کے بعد بنی اسرائیل کی توبہ کا ذکر کیا فرمایا:

وَاِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا اَنفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿۵۴﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ بھائیو تم نے بچھڑے کو (معبو) ٹھہرانے میں (بڑا) ظلم کیا ہے تو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو، اور اپنے تئیں ہلاک کر ڈالو، تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے حق میں یہی بہتر ہے پھر اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا وہ بے شک معاف کرنے والا (اور) صاحب رحم ہے۔

فائدہ: لفظ باری کہنے میں انہیں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ انہیں اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہو کہ اصل خالق کو چھوڑ کر انہوں نے غیر کی عبادت شروع کر دی۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ان کی توبہ یہ تھی کہ جب وہ کسی شخص سے ملیں تو باپ ہو یا بیٹا بغیر امتیاز کیے قتل کرتے جائیں۔ پھر ان لوگوں نے جن کا حال حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام پر تو مخفی رہا لیکن اللہ کو علم تھا۔ توبہ کی، اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور اللہ کے حکم کو بجا لائے اور اللہ نے قاتل و مقتول دونوں کو معاف کر دیا۔ [بروایت نسائی ،ابن جریر اور ابن ابی حاتم] ابن کثیر نے فرمایا: یہ الفتون حدیث کا ایک ٹکڑا ہے۔ مکمل حدیث سورۃ طٰہٰ میں آئے گی۔ حضرت ابن عباس؄ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے انہیں اس بات کا حکم دیا کہ تم اپنے لوگوں کو قتل کرو۔ جنہوں نے عبادت کی تھی وہ بیٹھے اور جنہوں نے نہ کی تھی انہوں نے خنجر لیے اور انہیں قتل کرنا شروع کیا۔ اتنے میں سخت اندھیرا ہو گیا اور ایک دوسرے کا قتل عام ہونے لگا۔ جب اندھیرا دور ہوا تو دیکھا کہ ستر ہزار مقتول ہوئے۔ جو قتل ہو گیا اس کی توبہ قبول ہوئی جو بچ گیا وہ بھی تائب ہوا۔ [بروایت ابن جریر] یہ قصہ قتل کی اسی تعداد کے ساتھ سلف کی ایک جماعت سے منقول ہے جن کے نام ابن کثیر نے قلم بند کیے ہیں۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَامُوسَى لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنَاكُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٦﴾

اور جب تم نے (موسیٰ سے) کہا کہ موسیٰ جب تک ہم اللہ کو سامنے نہ دیکھ لیں گے تم پر ایمان نہیں لائیں گے تو تم کو بجلی نے آگھیرا اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر موت آجانے کے بعد ہم نے تم کو از سر نو زندہ کر دیا تاکہ احسان مانو۔

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جھرۃً کے معنی علانیۃً ہیں۔ حضرت قتادہؒ نے فرمایا عیاناً معنی ہیں۔ یہ وہ ستر آدمی تھے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اختیار کیا تھا۔ انہوں نے کلام الٰہی سن کر کہا کہ ہم تو تب ایمان لائیں گے جبکہ اللہ تعالیٰ کو سامنے سے دیکھیں گے۔ اس پر بجلی کی آواز آئی جس کو سن کر وہ بے ہوش ہوگئے بعد ازاں مر گئے۔ کسی نے کہا کہ صَیْحَۃٌ آسمانی چیخ کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا آگ کو کہتے ہیں۔ سدی نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام اس حال کو دیکھ کر رونے لگے۔ دعا کی، اے اللہ! میں بنی اسرائیل کو کیا جواب دوں گا۔ یہ ان کے سردار لوگ تھے۔ جو سارے مر گئے۔ اللہ نے وحی کی کہ یہ ان ستر میں سے ہیں جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ پھر اللہ نے ان کو زندہ کر دیا اور دوسرے کے زندہ ہونے کو دیکھا تھا۔ ربیع بن انس نے کہا کہ یہ مدت ان کی سزا تھی پھر زندہ ہو کر اپنی عمر پوری کریں گے۔ ابن کثیر نے اس روایت کو ابن اسحٰق سے طویل بیان کیا ہے۔ رازی کا قول ہے کہ وہ سب زندہ ہونے کے بعد نبی بن گئے تھے لیکن یہ بات درست نہ ہے۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہارون اور یوشع علیہما السلام کے سوا کوئی نبی نہ تھا۔ اور اہل کتاب کا یہ قول کہ ان سب نے اللہ کو دیکھا ہے غلط ہے۔ موسیٰ علیہ السلام تو دیکھ نہ سکے یہ کیا دیکھتے۔ قرطبی نے کہا کہ اس واقعے کے بعد وہ بدستور مکلف رہے یہ نہیں کہ ان سے شرعی مسائل ساقط ہو گئے تھے۔

فائدہ: معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ کا دیدار نہ دنیا میں ہو سکتا ہے نہ آخرت میں ہو گا۔ اہل سنت کہتے ہیں یہاں ممکن نہ ہے مگر وہاں ضرور ہو گا۔ احادیث صحیحہ متواترہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے رب کو دیکھیں گے۔ ان احادیث کی دلالت قطعی ہے۔ عقلی دلائل اور کلامی قواعد اس لائق نہ ہیں کہ حدیث کے مقابلے میں ان سے حجت پکڑی جا سکے۔ یہ بحث حافظ ابن القیم نے "حادی الارواح" میں مفصل تحریر فرمائی ہے اور جمہور سلف و خلف نے ادلہ کتاب و سنت کے ذریعے یہ بات ثابت کی ہے کہ آخرت میں دیدار الٰہی ہو گا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَى كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٥٧﴾

اور بادل کا تم پر سایہ کیے رکھا اور (تمہارے لیے) من وسلویٰ اتارتے رہے کہ جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ (پیؤ) مگر تمہارے بزرگوں نے ان نعمتوں کی کچھ قدر نہ جانی اور وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑتے تھے بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

فائدہ: جب فرعون غرق ہو چکا تو بنی اسرائیل جنگل کی طرف نکل آئے اور خیمے لگا لئے۔ سارا دن بادلوں کا سایہ رہتا دھوپ سے بچاؤ رہتا اور جب کھانا کھانے کی ضرورت پیش آتی تو من اور سلویٰ نازل فرمادیا۔ من ایک میٹھی چیز تھی۔ دھنیے کے دانے کی طرح رات کو اوس میں لشکر کے ارد گرد ڈھیر لگ جایا کرتے۔ صبح ہر شخص اپنی قوت کے موافق چن لاتا۔ سلویٰ ایک جانور کا نام ہے وہ لشکر کے ارد گرد ہزاروں کی تعداد میں آجاتے اندھیرا ہوتے ہی وہ انہیں پکڑ لاتے اور کباب بنالیتے۔ مدتوں تک یہی کھاتے رہے۔

فائدہ: حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ ابر ایسا نہ تھا جیسا عام ہوتا ہے۔ بلکہ وہ اوس سے بھی زیادہ ٹھنڈا اور پاکیزہ تھا۔ اسی قسم کے ابر میں اللہ کریم قیامت کے دن آئے گا اور بدر کے دن اسی طرح کے بادلوں میں فرشتے اترے تھے۔ یہ بادل ان کے ساتھ مقام تیہ میں رہتا تھا۔ مَنْ ترنجبین کو کہتے ہیں۔ حضرت مجاہد نے فرمایا وہ ایک طرح کا گوند تھا۔ عکرمہ نے کہا کہ وہ اوس ہی تھی مگر گاڑھی تھی۔ سدی نے کہا کہ یہ اوس درخت زنجبیل پر پڑتی تھی۔ حضرت قتادہ نے کہا کہ وہ برف کی طرح ان کی جگہ پر گرتی، دودھ سے سفید اور شہد سے میٹھی ہوتی تھی اور طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک برسا کرتی۔ جو شخص ایک دن کی خوراک سے زیادہ لے لیتا تو وہ خراب ہو جاتی۔ ربیع بن انس نے کہا مَنْ ایک پانی پانی تھا شہید کی طرح ہوتا تھا اسے پانی میں ملا کر پیتے تھے۔ وہب بن منبہ نے کہا مَنْ چپاتی تھی۔ شعبی نے کہا کہ تمہارا یہ شہد مَنْ کا سترواں حصہ ہے۔ زید بن اسلم کا بھی یہی قول ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ مَنْ کی تفسیر میں مفسرین کی عبارتیں قریب قریب ہیں۔ اتنی بات ہے کہ کسی نے اس کو کھانا کہا اور کسی نے پانی کہا۔ ظاہر یہ ہے کہ مَنْ ایسی چیز تھی جو کہ اللہ کریم نے انہیں بطور نعمت عطا کی وہ کھانا ہو یا پینا ہو بہر حال ایک عظیم نعمت تھی جو بغیر محنت و مشقت کے انہیں ملتی تھی۔ جو مَنْ اب مشہور ہے اس کو الگ کھاؤ تو کھانا ہے، پانی میں ملاؤ تو پینا ہے۔ کسی اور چیز میں ملاؤ تو اور کچھ بن جاتا ہے۔ لیکن اس جگہ آیت سے وہ مراد نہ ہے۔ اس دلیل سے کہ بخاری میں حضرت سعید بن زید سے مرفوعاً آیا ہے کہ کھمبی من ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لیے شفا ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔ بلکہ ابو داؤد کے سوا تمام اہل سنن نے اس کو روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اس کو

حسن صحیح کہا ہے۔ یہ حدیث شیخین وغیرہ سے کئی طریق سے مروی ہے۔ ابن کثیر نے اس حدیث کے کئی طریق اپنی تفسیر میں نقل کیے ہیں۔ پھر کہا کہ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ سلویٰ سُمانی کے مشابہ ایک پرندہ ہے۔ ابن مسعود اور صحابہ کی ایک جماعت کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ جنت کی چڑیا جیسی ایک چڑیا تھی جو کنجشک سے بڑی ہوتی ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا وہ سرخی مائل پرندہ تھا جسے جنوبی ہوا لاتی تھی۔ وہب بن منبہ نے کہا کہ وہ کبوتر کی طرح ایک موٹا پرندہ ہوتا ہے۔ اس کو ایک ہفتے سے دوسرے ہفتے تک پکڑ رکھتے تھے وہ ایک میل کے انداز میں ایک نیزہ بلند زمین پر گرتا اور برستا تھا۔ سدی نے کہا کہ جب بنی اسرائیل جنگل میں آ گئے تو انہوں نے کہا: اے موسیٰ! علیہ السلام یہاں کھانا کہاں ہے؟ تو اللہ نے من سلویٰ نازل کیا۔ انہوں نے پوچھا پانی کہاں ہے؟ پتھر پر لاٹھی ماری تو بارہ چشمے پانی کے چل پڑے۔ کہا سایہ کہاں ہے؟ بادل آیا وہ سایہ کرتا تھا۔ کہا لباس کہاں ہے؟ اللہ نے لباس دیا۔ وہ لباس ان کے جسموں کے ساتھ بڑھتا تھا نہ پرانا ہوتا تھا نہ پھٹتا تھا۔

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ وہ بادل ان کے ساتھ ساتھ جنگل میں رہتا تھا۔ نور کا ایک ستون تھا۔ جب رات کو چاند نہ ہوتا تو وہ چمکتا تھا۔ یہ جنگل جسے تیہ کہتے ہیں یہ شام و مصر کے درمیان تھا اور نو کوس کا لمبا اور چوڑا۔ وہاں یہ لوگ چالیس سال بھٹکتے رہے وہاں سے نکلنے کا راستہ نہ ملا۔ مفسرین نے کہا کہ انہیں یہ سزا اس لیے دی گئی کہ انہوں نے جبارین کی بستی میں جانے سے انکار کر دیا تھا اور کہا کہ تو اور تیرا رب جا کر لڑو اور یہ چھ لاکھ لوگ تھے۔ سب اسی میدان میں مر گئے تھے مگر جو شخص بیس برس سے کم تھا۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے بھی یہیں وفات پائی اور ان کے ایک برس بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی وہیں انتقال کیا۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس من اور سولویٰ کو ان کے لیے حلال اور لذیذ بنا دیا تھا فرمایا کھاؤ اور پیو مگر ذخیرہ نہ کرو۔ معلوم ہوا کہ جو چیز مہمان کے سامنے لائیں وہ اس کا مالک نہیں ہو جاتا نہ اس کو میزبان کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کا حق ہے۔ انہوں نے یہ ظلم اختیار کیا تھا کہ وہ جو رزق انہیں بغیر محنت کے اور بغیر حساب کے ورثے میں ملتا اس کو لے کر جمع کرنا شروع کر دیا اور جو حد مقرر کی گئی تھی اس سے بڑھ گئے۔ عذاب کے مستحق ہوئے، نعمت کا شکر نہ کیا نافرمانی کی۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ

اور جب ہم نے (ان سے) کہا کہ اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ (پیؤ) اور (دیکھنا) دروازے میں داخل ہونا تو سجدہ کرنا اور حِطَّةٌ کہنا ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے

خَطَايَاكُمْ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۵۹﴾

اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیں گے ۔ تو جو ظالم تھے انہوں نے اس لفظ کو جس کا ان کو حکم دیا تھا بدل کر اس کی جگہ اور لفظ کہنا شروع کیا پس ہم نے (ان) ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کیا کیونکہ نافرمانیاں کیے جاتے تھے۔

فائدہ: اپنی غلطی کی وجہ سے جنگل میں پھنس گئے تھے۔ سورۃ مائدہ میں اس کا بیان ہے۔ پھر ایک ہی کھانا کھاتے کھاتے تھک گئے تو انہیں ایک شہر میں بھیجا اور حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو جاؤ اور حطۃٌ کہو۔ یعنی گناہ معاف فرمادے۔ انہوں نے مذاق کیا اور حطۃٌ کی بجائے حنطۃٌ کہا یعنی گندم کا دانہ۔ اور سجدہ کرنے کی بجائے سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے۔ پھر شہر میں جا کر ان پر طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔ دوپہر کے قریب ستر ہزار کے قریب آدمی مر گئے۔

فائدہ: حافظ ابن کثیر نے فرمایا اس میں ان لوگوں کو ملامت کی گئی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلے تھے۔ انہیں ارض مقدس میں جانے کا حکم ہوا کہ وہ تمہارے باپ اسرائیل کی میراث ہے۔ وہاں جو عمالیق کے کفار رہتے ہیں لڑ جھگڑ کر انہیں وہاں سے نکال دو، وہ ان سے جنگ سے بزدلی کرنے لگے اور ہمت ہار گئے۔ اس لیے بوجہ سزا اللہ نے انہیں ایک جنگل میں پھینک دیا۔ جس طرح سورۃ مائدہ میں مذکور ہے۔ اس لیے صحیح تر یہ ہے کہ وہ شہر بیت المقدس تھا۔ خود اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کو بیان فرمایا: ﴿يَاقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا﴾ "کہ اے قوم! اس مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ۔ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور مرتد نہ ہو جاؤ۔" کسی نے کہا کہ وہ شہر اریحہ جبارین کی بستی تھی۔ حضرت ابن عباس اور عبدالرحمٰن بن زید کا یہی قول ہے۔ مگر حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ بات بعید ہے کیونکہ وہ بیت المقدس کے ارادے سے نکلے تھے اور یہ شہر ان کے راستے میں نہ تھا۔ لیکن ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اریحہ بیت المقدس کے قریب ایک پست سی (زمین) بستی ہے۔ اور فرمایا کہ اس سے بھی بعید بات یہ ہے کہ اس سے مراد مصر شہر لیا جائے۔ اس کو رازی نے ذکر کیا ہے۔ درست بات یہی ہے کہ بیت المقدس مراد ہے کیونکہ جب چالیس برس کے بعد حضرت یوشع بن نون کے ساتھ وہاں سے نکلے۔ اللہ نے ان کو فتح دی اور اس دن جمعے کو تیسرے پہر کو سورج روک دیا گیا حتیٰ کہ فتح ہو جائے۔ جب فتح ہوئی تو انہیں حکم ہوا کہ اب شہر کے دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے شہر میں داخل ہو جاؤ۔ کیونکہ سجدہ مذکورہ فتح پر اور نعمت الٰہی پر شکر گذاری کا آئینہ دار تھا۔ اس بات پر کہ اللہ

نے ان کو ان کا شہر عطا کر دیا۔ جنگل سے نجات دی۔ کہتے ہیں کہ اس بستی میں قوم عاد کے باقی لوگ تھے۔ جن کو عمالقہ کہا جاتا ہے۔ کسی نے کہا کہ ملک شام کی کوئی بستی تھی۔ قاضی بیضاوی و جمہور مفسرین نے قول اول کو ہی اختیار کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ سجدے سے یہاں رکوع مراد ہے کہ باب صغیر سے رکوع کرتے ہوئے گذر جاؤ۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا زمین پر پیشانی رکھنا ہی مراد ہے۔ مگر رازی نے اس کو بعید سمجھا ہے۔ کسی نے کہا یہاں سجدے سے مرد خضوع ہے۔ کیونکہ یہاں حقیقی سجدے کے معنی بنتے نہ ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ وہ دروازہ قبلے کی جانب تھا۔ یا بعض نے کہا اس دروازے سے قبلے کی طرف کوئی طرف مراد تھی۔ کسی نے کہا وہ جگہ اب تک باب حطہ کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ کسی نے کہا باب قبہ مراد ہے جس طرف رخ کر کے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اور جس نے کہا کہ اس شہر سے مراد اریحہ ہے وہ یہ کہتا ہے کہ مطلب یہ تھا کہ کسی بھی دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے گذر جاؤ کیونکہ اس کے سات دروازے تھے۔ لیکن وہ لوگ حکم کی مخالفت کرتے ہوئے سر اٹھائے ہوئے گذر گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حطۃ سے مراد یہ ہے کہ یہ امر حق ہے۔ دوسر الفظ یوں ہے کہ وہ استغفار و مغفرت کے معنی میں ہے۔ حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ ((لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ)) کہنا مراد ہے۔ کسی نے کہا کہ معنی یہ ہے کہ اپنے گناہوں کا اقرار کرو۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حاصل گفتگو یہ ہوا کہ بوقتِ فتح انہیں یہ حکم ملا تھا کہ عاجزی وانکساری سے اور قول و فعل سے اپنے گناہوں کا اقرار کر کے مغفرت مانگیں اور اللہ کی نعمت کا شکر کریں کیونکہ ایسے ہی کام اللہ کو محبوب ہیں۔ جس طرح فرمایا:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ o وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا o فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا﴾ "اور جب اللہ کی مدد اور فتح آگئی اور آپؐ لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی تسبیح اس کی حمد کے ساتھ کیجئے اور اس سے مغفرت طلب کیجئے۔ بلا شبہ وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔" اس کی تفسیر میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ اس سے یہ مراد ہے کہ فتح و کامیاب کے وقت کثرت سے ذکر و استغفار کرنا چاہئے۔ مگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ اس میں وفاتِ نبوی کی اطلاع دی گئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس معنی کو ثابت رکھا۔ اور ان دونوں اقوال میں کچھ منافات نہ ہے۔ اس لیے کہ جب ذکر و استغفار کا حکم دیا تو ساتھ ہی وفاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر دے دی۔ نبی علیہ السلام کی عادت مبارکہ تھی کہ جب فتح ہوتی تو نہایت عاجزی کا اظہار فرماتے۔ فتح مکہ کے دن جب ثنیہ علیا سے شہر داخل ہوئے تو عاجزی سے سر جھکائے ہوئے تھے۔ پھر غسل فرما کر آٹھ رکعت نماز ادا کی۔ کسی نے کہا چاشت کی نماز پڑھی تھی

کسی نے کہا: فتح کی خوشی اور اظہار عاجزی کے لیے نماز پڑھی۔ اس لیے لشکر کے امیر کے لیے مستحب ہے کہ شہر کے پہلے داخلے کے وقت آٹھ رکعت نماز ادا کرے۔ جس طرح حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایوانِ کسریٰ میں پہنچتے ہی آٹھ رکعت نماز ادا فرمائی۔ درست یہی ہے کہ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دے اس طرح آٹھ پڑھے۔ لیکن بعض نے یہ بھی کہا کہ ساری نماز پڑھ کر آخر میں ایک ہی سلام پھیرے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا کہ انہیں حکم ہوا تھا کہ حطۃ کہتے ہوئے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہوں، لیکن وہ سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور حبۃ فی شعرہ کہا۔ دوسری روایت میں حبہ کی بجائے حنطۃٌ مذکور ہے۔ اس کو ابن اسحٰق نے روایت کیا۔ تیسرے لفظ میں ((حنطۃ حمراء فیھا شعیرۃ)) آیا ہے یہ روایت براء سے مروی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان کا لفظ یہ تھا: ((ھطا سمعا ثا ازبۃ مذبا)) جس کا عربی ترجمہ یہ ہے کہ: ((حبۃ حنطۃ حمراء مثقوبۃ فیھا شعرۃ سوداء)) غرضیکہ اقوال مفسرین سے یہ پتا چلا کہ وہ نہایت ہٹ دھرم اور حد درجہ مخالفت پسند لوگ تھے انہیں کہا گیا کہ قول و فعل میں عاجزی کریں اور حطۃ کہیں یعنی گناہوں کی معافی مانگیں اور سجدہ کرتے ہوئے داخل ہوں لیکن انہوں نے حنطۃ کہا اور سرینوں پر گھسٹتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ ان کی اس مخالفت قولی و فعلی پر زبردست انتقام لینے والے مالک نے ان پر عذاب نازل کر دیا۔ فرمایا: ﴿فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ "کہ ہم نے ظالموں پر ان کے فسق و فجور کی وجہ سے آسمان سے عذاب نازل کر دیا۔" معلوم ہوا کہ فسق نزول عذاب کا سبب ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ کلام پاک میں جہاں بھی لفظ رجز آیا ہے اس سے عذاب مراد ہے۔ ابو مالک، مجاہد اور سدی نے بھی یہی بات کہی ہے۔ ابو العالیہ نے کہا کہ رجز بھی عذاب ہے۔ شعبی نے کہا رجز طاعون ہے۔ یا اَوَلاً ہے۔ حضرت سعد، اسامہ اور خزیمہ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ طاعون رجز ہے یہ عذاب تھا جو اللہ نے تم سے پہلے لوگوں پر نازل کیا تھا۔ [بروایت ابن ابی حاتم و النسائی] اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا دوسرا لفظ مرفوعاً لفظ یہ ہے کہ یہ درد اور بیماری رجز ہے۔ جو تم سے پہلے کئی امتوں پر بطور عذاب مسلط کی گئیں۔ [بروایت ابن جریر]

فائدہ: کہا: ہر اسی کہتے ہیں کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ جس بات پر نص موجود ہو اس کو بدلنا جائز نہ ہے۔ اس کی پیروی کرنا واجب ہوتا ہے۔ رازی نے کہا کہ توقیفی اذکار و اقوال کو بدلنا جائز نہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب اس امت محمدیہ ﷺ نے الفاظ نبوی اور عبارات قرآن چھوڑ کر تحریر فتوے اور مسائل و احکام کو اپنے تراشیدہ الفاظوں میں تعبیر کرنا شروع کیا تب سے یہ سارے اختلاف وجود میں آئے۔ اگر کتاب و سنت کو

لفظی طور پر جوں کا توں حفظ کرتے تو یہ تقلید و اتباع رائے کی خرابیاں پیش نہ آتیں۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں کئی ایسے لفظ لکھے ہیں کہ جن کو سلف کچھ معنی میں مراد لیتے تھے اور خلف کے نزدیک وہ کچھ اور ہی معنی میں منتقل ہو گئے۔ انہی میں سے لفظ فقیہ بھی ہے کہ سلف اس کو فقیہہ کہتے تھے جو دنیا سے زاہد اور آخرت میں راغب ہو تا لیکن خلف کے نزدیک فقیہہ وہ ہے جسے احکام و مسائل کا علم ہو۔ کتب فروع سے مسائل کا استنباط کر سکے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے منصوص علیہا کلام کو بدلنے والے کو فاسق و ظالم کہا۔ اور ان پر عذاب نازل کیا۔ اب بھی یہی دیکھا گیا ہے کہ جس علاقے اور بستی میں فسق و فجور کی کثرت ہو جائے اس میں کوئی وبا پھوٹ نکلتی ہے۔ اور سینکڑوں ہزاروں لوگوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ یہی وباہی رجز ہے۔ کسی جگہ زلزلہ آتا ہے کہیں زمین میں کچھ دھنس جاتا ہے کہیں مسخ کے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں۔ کسی جگہ سیلاب تباہی مچا جاتا ہے۔ کسی جگہ طاعون ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس رجز میں جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا تھا ایک ساعت میں ستر ہزار لوگ مر گئے تھے اور یہ وبا اس سے ہٹ کر تھی جو ان پر مقام تیہ میں نازل ہوئی تھی۔ سورۃ اعراف میں انہی کے تذکرے میں یفسقون کی بجائے یظلمون فرمایا۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ ہر دو وصف کے موصوف تھے۔

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے (اللہ سے) پانی مانگا تو ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو (انہوں نے لاٹھی ماری) تو پھر اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور تم لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر (کے پانی پی) لیا (ہم نے حکم دیا کہ) اللہ کی (عطا فرمائی ہوئی) روزی کھاؤ اور پیو مگر زمین میں فساد نہ کرتے پھرنا۔

فائدہ: اسی جنگل میں جہاں حیران و پریشان چالیس برس تک بھٹکتے رہے وہاں جب پانی نہ ملا تو ایک پتھر پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی مارنے سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ بارہ ہی قبائل تھے اور کچھ بڑے قبیلے تھے اور کچھ کم تعداد والے تھے۔ ان کی گنتی کے موافق بڑے اور چھوٹے چشمے پھوٹ پڑے۔ جن کو انہوں نے پہچان لیا کہ کونسا چشمہ کس گروہ کا ہے۔ جب ان کا لشکر کوچ کرتا تو ساتھ اٹھا لیتے جب پڑاؤ کرتا تو اس پتھر کو وہیں رکھ دیتے۔ یہ ایک نرم پتھر تھا اور دو گز لمبائی تھی۔ کسی نے کہا کہ وہ آدمی یا گائے کے سر جتنا تھا۔ یا یہ جنت کا پتھر تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد جتنا دس گز لمبا تھا۔ اس کے دو حصے تھے جو رات کو چمکتے تھے اور چراغ کا کام دیتے تھے۔ وہ پتھر گدھے یا گائے پر لاد لیا جاتا تھا کسی نے کہا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام ساتھ لائے تھے اور حضرت شعیب علیہ السلام کو

ورثے میں ملا تھا۔ انہوں نے عصا کے ساتھ وہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا۔ یہ وہ پتھر تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگا تھا۔ حضرت جبرئیل نے ان سے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام آپ اسے اٹھا لیجئے! اس میں تیرے رب کی قدرت اور تیرے لیے بطور معجزہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ پتھر چوکور تھا ہر جانب سے تین تین چشمے نکلتے تھے۔ یہ حدیث الفتون کا ایک لفظ ہے جس کو نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ قصہ سورۃ الاعراف کے قصے کے مشابہ ہے۔ صرف فرق یہ رہا کہ وہ مکی سورت ہے اور یہ مدنی ہے۔ اس لیے وہاں غائب کی ضمیر ہے یہاں حاضر کی ضمیر ہے۔ وہاں فَانۢبَجَسَتۡ کہا یعنی اس کا ابتدائی بہاؤ اور یہاں فَانۡفَجَرَتۡ فرمایا یعنی اس کا پچھلا بہاؤ۔ ان دونوں کے سیاق میں دس طرح سے انفرادیت ہے۔ جس کا ذکر کشاف میں کیا ہے۔ اور ان کا مطلب ایک دوسرے کے قریب قریب ہے۔ بہر حال اللہ کریم نے اس آیت میں انہیں اس بات سے منع کیا کہ زمین میں فساد نہ مچاتے پھریں۔ پہلے ان کے وصف ظلم اور فسق بیان کیے اب گویا یہ فرمایا کہ وہ مفسد بھی تھے اور جو لوگ مفسد نہیں ہوتے ان سے حسن آخرت کا وعدہ کیا۔ فرمایا: ﴿تِلۡكَ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ نَجۡعَلُهَا لِلَّذِيۡنَ لَا يُرِيۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فَسَادًا وَالۡعَاقِبَةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ﴾ ”کہ یہ آخرت کا گھر ہے ہم اسے ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں علو و فساد کا ارادہ نہیں کرتے اور انجام کار (خیر) متقین ہی کے لیے ہے۔“ جس شخص میں ظلم فسق و فساد پایا جاتا ہے گویا وہ بنی اسرائیل ہی کا ساتھی ہے اس کا انجام بھی انہی لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ **اللهم احفظنا**.

فائدہ: اور یہ عصا جس سے اس پتھر پر ضرب لگائی تھی وہ درخت آس کا تھا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے آیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قد جتنا لمبا یعنی دس گز تھا۔ اس کا نام علیق یا نبعہ تھا۔ وہ بارہ قبیلے کل چھ لاکھ لوگ تھے۔ ان کا پڑاؤ بارہ کوس میں ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک بڑا معجزہ ہے کہ اس چھوٹے سے پتھر سے اتنے بڑے لشکر کو سیراب کر دیتے تھے۔ مگر ہمارے پیغمبر علیہ السلام کا معجزہ اس سے بھی بڑھ کر ہے کہ انگلیوں میں سے اتنا پانی بہا کہ ایک عظیم لشکر سیراب ہو گیا۔ پتھر سے پانی کا نکلنا تو کچھ بعید نہ ہے۔ گوشت و خون میں سے پانی نکلنا ایک عظیم معجزہ ہے۔

وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰى لَنۡ نَّصۡبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُخۡرِجۡ لَنَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ مِنۡۢ بَقۡلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوۡمِهَا

اور جب تم نے کہا کہ موسیٰ! ہم سے ایک (ہی) کھانے پر صبر نہیں ہو سکتا تو اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز (وغیرہ) جو نباتات زمین سے اگتی

وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَى بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ

ہیں ہمارے لیے پیدا کر دے۔انہوں نے کہا کہ بھلا عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے بدلے ناقص چیزیں کیوں چاہتے ہو (اگر یہی چیزیں مطلوب ہیں) تو کسی شہر میں جا اترو وہاں جو مانگتے ہو مل جائے گا۔

حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ انہوں نے اپنا پہلا ٹھاٹھ باٹھ یاد کیا۔وہ قوم بڑی دولت و حشمت والی تھی۔ رہا کھانا تو انہیں من سلویٰ ملتا تھا۔اس لیے انہوں نے کہا کہ ہم ہر روز ایک ہی قسم کا کھانا کھا کر اکتا گئے ہیں۔دوسرا فوم تھا۔ابن مسعود نے کہا ثوم ہے۔ثوم لہسن کو کہتے ہیں۔ایک جماعت سلف بھی اسی طرف گئے ہیں۔حضرت ابن عباس و مجاہد اور حسن کا بھی یہی قول ہے۔گویا حرف میں تصحیف کی گئی ہے۔ثاء کی جگہ فاء کا استعمال کیا ہے۔ کسی نے کہا فُوْمٌ گیہوں کو کہتے ہیں۔ابن عباس نے فرمایا کہ بنی ہاشم کی زبان میں حنطة کو فوم کہتے ہیں۔حضرت مجاہد و عطاء نے کہا فوم سے روٹی مراد ہے۔لغت قدیمہ میں فوموا بمعنی اختبزوا آیا ہے۔جوہری نے بھی فوم کا ترجمہ خطہ کیا ہے۔ابن ورید نے کہا اس سے سنبلہ مراد ہے۔یعنی وہ بالی جن کے اندر دانے ہوتے ہیں۔حضرت قتادہ نے کہا کہ جس دانے کی بھی روٹی پکائی جائے تو وہ فوم ہے۔کسی نے کہا کہ شامی زبان میں چنے کو فوم کہتے ہیں۔نخود فروش کو فومی کی بجائے فامی کہتے ہیں۔بخاری شریف میں ہے کہ جتنے بھی دانے کھائے جاتے ہیں وہ سب فوم ہیں۔

فائدہ: جس سبزی کی بیل نہ ہے اس کو ساگ کہتے ہیں۔کشاف میں فرمایا کہ جو سبزہ زمین سے اگتا ہے اس کو بَقْلٌ کہتے ہیں۔ان کی مراد وہ ساگ تھے جن کو لوگ کھاتے تھے۔جیسے پودینا، مولی وغیرہ۔یہ چیزیں اس لیے مانگیں کہ شہوت قوی ہو یا اس لیے کہ اسی بہانے شہر میں چلے جائیں۔جنگل میں رہتے رہتے اکتا گئے تھے لیکن پہلی بات بہتر ہے۔اور جو فرمایا کہ شہر میں چلے جاؤ یہ بطور اہانت و عجز کے کہا کیونکہ راستوں کے بند ہونے کی وجہ سے وہ جنگل سے کہیں نکل ہی نہ سکتے تھے۔اگر کہیں نکلنے کا راستہ ہوتا تو چالیس سال کی مدت جنگل میں نہ گذارتے۔یہ بھی معلوم ہوا کہ خیر کو چھوڑ کر ادنیٰ چیز مانگنا حماقت و جہالت کی دلیل ہے۔ایسی تبدیلی کا تقاضا کرنا بھی انجام کار کا نقصان لاتا ہے۔کتاب و سنت خیر محض ہیں رائے اور قیاس ادنیٰ ہیں جو لوگ اس کو چھوڑ کر تقلید و قیاسی باتوں کو لیتے ہیں وہ خیر کو چھوڑ کر ادنیٰ چیزوں کے پیچھے پڑتے ہیں، یہ لوگ گھٹیا اور خیر سے خالی ہیں۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾

اور آخر کار ذلت (و رسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔ یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور (اس کے) نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے (یعنی) یہ اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

فائدہ: حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ ذلت و محتاجگی شرعاً و قدراً ان کے گلے پڑ کر رہی۔ جس نے انہیں ذلیل و خوار کیا اور وہ خود بھی ذلیل و محتاج تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ جزیہ ادا کیا کرتے تھے یہی ان کی ذلت و مسکنت تھی۔ حضرت حسن اور قتادہ نے کہا کہ وہ ذلیل ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا کرتے تھے۔ اللہ نے ان کو ذلیل کر دیا اور مسلمانوں کے ہاتھوں انہیں کچل دیا۔ ان کی کچھ قوت باقی نہ رہی جب اس امت نے ان کو پایا تو وہ مجبوس ہو کو جزیہ ادا کیا کرتے تھے۔ سدی وغیرہ نے کہا کہ مسکنت سے فاقہ کشی مراد ہے۔ عطیہ عوفی نے کہا خراج مراد ہے۔ ضحاک نے کہا جزیہ مراد ہے۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ اللہ کریم نے ان کے متعلق جو خبر دی وہ برابر ہر دور میں معلوم ہوتی رہی۔ یہود سے زیادہ ذلیل و خوار اور محتاج و فقیر کوئی فرقہ نہ تھا۔ انہیں کبھی شان و شوکت نصیب نہ ہوئی ہر دور میں جہاں بھی رہے غلاموں کی طرح رہے۔ اتفاقاً اگر ان میں سے کوئی مالدار ہوتا بھی تو بھی فقیری ظاہر کرتا تاکہ اس کے مال میں کسی کو کوئی لالچ نہ ہو۔ خواہ ایسے کہ ان پر جزیہ بڑھا دے یا یوں کہ ظلم سے ان کا مال چھین لے۔ غرضیکہ تمام ادیان والوں میں ان سے بڑھ کر فقیر اور لالچی کوئی نہ ہے۔ گویا اپنا مال کے وافر ہونے کے باوجود سب کوڑی کوڑی کے محتاج تھے۔

فائدہ: ضحاک نے فرمایا کہ غصہ لانے سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کے غصے کے مستحق ٹھہرے اور ناراضگی کے مستحق ٹھہرے۔ ان کو یہ سزا اس لیے دی گئی کہ انہوں نے حق کو ٹھکرا دیا اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اللہ کی آیات کا انکار کیا اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کو حقیر سمجھا۔ حتیٰ کہ ان کو قتل تک کر دیا۔ اس سے بڑھ کر اور کفر کیا ہو گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ خبر حق کو ٹھکرانا اور لوگوں کو حقیر جانا ہے۔ اسی لیے جب بنی اسرائیل اپنے سخت جرم کے مرتکب ہوئے تو ان پر اللہ نے عذاب نازل کیا اور دنیا و آخرت میں انہیں ذلت کا لبادہ اوڑھا دیا۔ ابن مسعود کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل ایک ایک دن میں پہلے وقت تین تین سو انبیاء کو قتل کرتے۔ پھر تیسرے پہر کو خرید و فروخت کا بازار لگاتے تھے۔ لین دین کرتے حضرت شعیا و زکریا و یحییٰ کو انہوں نے ہی قتل کیا۔ حدیث

ابن مسعودؓ میں مرفوعاً آیا ہے کہ قیامت والے دن سب سے زیادہ عذاب میں وہ لوگ ہوں گے جن کو کسی نبی نے قتل کیا ہو یا اس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو۔ یا ضلالت کے پیشوا تھا یعنی بدعت کا امام ہو یا مورتیاں بنانے والا ہو۔ [بروایت احمد] عصیان کہتے ہیں اس کام کے کرنے کو جس سے منع کیا ہے اور اعتداء حدِ اعتدال سے بڑھ جانا ہے۔ اس قوم میں عصیان و اعتداء دونوں بیماریاں تھیں۔ اللھم احفظنا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست (یعنی کوئی شخص کسی قوم و مذہب کا ہو) جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لائے گا اور عمل نیک کرے گا تو ایسے لوگوں کو ان (کے اعمال کا) صلہ اللہ کے ہاں ملے گا اور (قیامت کے دن) ان کو نہ کسی طرح کا خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

فائدہ: یعنی کسی فرقہ خاص پر موقوف نہ ہے۔ بلکہ یقین لانا شرط ہے۔ اور نیک عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ اپنے وقت میں جس نے بھی نیک عمل کیا ثواب پائے گا۔ یہ اس لیے فرمایا کہ بنی اسرائیل اسی بات پر مغرور تھے کہ ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں۔ ہم ہر طرح اللہ کے ہاں بہتر ہیں۔ یہود حضرت موسیٰ کی امت کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ کی امت کو کہتے ہیں۔ اور صابئین ایک فرقہ تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مانتا تھا۔

فائدہ: ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جب اللہ نے اس فرقے کا حال بیان کر دیا جنہوں نے اس کی نافرمانی کی جس کام کو کرنے کا حکم دیا اس سے باز رہے اور جس سے روکا وہی کام کرتے رہے۔ تو اب اس فرقے کا ذکر فرمایا کہ ان فرقوں میں سے جو نیک عمل کرے گا اس کو اچھا بدلہ ملے گا۔ اور یہ فیصلہ قیامت تک ثابت ہے کہ جو رسول اللہ ﷺ کا پیرو ہو گا اس کے لیے ابدی سعادت ہو گی۔ اسے نہ آخرت میں کچھ خوف ہو گا اور نہ دنیا چھوٹ جانے سے اسے کوئی غم ہو گا۔ جیسے فرمایا: ﴿اَلَا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ "کہ سنو! جو اللہ کے دوست ہیں ان پر نہ خوف ہو گا نہ وہ غم میں مبتلا ہوں گے۔" اور موت کے وقت فرشتے مومنین سے کہتے ہیں: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْ رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِىْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ "کہ بلاشبہ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر استقامت اختیار کی ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ نہ تم ڈرو نہ غمگین ہو اور اس جنت کی خوشخبری لے لو جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا تھا۔" حضرت سلمان علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس دین والوں کا حال پوچھا جن کے ساتھ

میں تھااور ان کی نماز و عبادت کا ذکر کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[بروایت ابن ابی حاتم]

سدی نے کہا کہ یہ آیت حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اصحاب کے حق میں نازل ہوئی۔یہود کا ایمان یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع کرنی چاہئے اور تورات پر عمل کرنا چاہئے۔لیکن جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہو چکے تو جس نے دین یہودیت کو چھوڑ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لایا تو وہ ہلاک ہوا، پھر عیسایوں کا ایمان یہ تھا کہ انجیل اور سنت عیسیٰ علیہ السلام پر چلنا چاہئے مگر جب پیغمبر آخری آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری ہوئی تو جس نے عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول نہ کیا وہ ہلاک ہوا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کے بعد وہ آیت اتری:﴿ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴾"کہ جس نے اسلام کے سوا کوئی دین اپنانا چاہا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔"معلوم ہوا کہ کسی شخص کا عمل اور طریقہ تب تک قبول نہ ہوگا جب تک کہ وہ شریعت محمدیہ کے موافق نہ ہو۔ہاں آپ علیہ السلام کی بعثت سے قبل اپنے اپنے انبیاء کے زمانوں میں جن لوگوں نے نیک اعمال کیے اور اپنے پیغمبروں علیہم السلام کی اتباع کی وہ نجات اور ہدایت والے راستے پر تھا۔اس آیت میں صرف اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان و یقین باندھنے کا تذکرہ ہے۔رسول علیہم السلام کا ذکر نہ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول پر ایمان لائے بغیر یہ ممکن ہی نہ ہے کہ کوئی اللہ اور آخرت کے دن پر کما حقہ ایمان لا سکے۔اللہ کی ذات پر وہی ایمان لائے گا جو رسول پر ایمان لا چکا ہے کیونکہ رسول ہی تو توحید الٰہی کی معرفت کا ذریعہ ہوتا ہے۔

فائدہ: بعض نے کہا کہ:﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سے منافقین مراد ہیں اس لیے کہ ان کا ذکر مذکورہ فرقوں میں سے ہر تیسرے فرقے کے ساتھ کیا۔یعنی بظاہر وہ ایمان دار بنے ہوئے تھے لیکن زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ اس سے حقیقی مومن رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنے والے لوگ مراد ہیں۔گویا اللہ نے اس موجودہ امت اور گذشتہ سب امتوں کا تذکرہ کر کے فرمایا کہ ان سب کا مرکز ایک ہی ہے۔وہ یہ کہ ایمان باللہ و بالآخرۃ کو پختہ کرتے ہوئے نیک عمل کریں۔ایمان سے مراد وہی باتیں ہیں جن کا ذکر حدیث جبریل علیہ السلام میں ہے کہ:((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ)) پھر ایسا عمدہ ایمان اسی کو حاصل ہوتا ہے جو ملت اسلامیہ میں داخل ہوتا ہے کیونکہ جو آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی پر اور قرآن پر ایمان نہ لایا وہ مومن نہیں ہو سکتا اور جس نے ان سب کا اقرار کر لیا اور ان کی تصدیق کی وہ ایماندار ٹھہرا۔نہ یہودی رہا نہ عیسائی رہا اور نہ مجوسی رہا۔

فائدہ: یہود، یہوذ بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہا جاتا ہے۔ ذال کو دال سے تبدیل کر دیا۔ یا یہ تہود سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں توبہ کرنا۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ﴾ یا تہود "ہلنے" کو کہتے ہیں یہ تورات کی تلاوت کے وقت ہلا کرتے تھے جیسے مکتبوں میں بچے سبق پڑھتے وقت ہلتے ہیں۔ اسی لیے یہود کہلائے۔ جب عیسیٰ علیہ السلام آگئے تو ان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع واجب ہو گئی اور جنہوں نے ان کا دین قبول کیا وہ نصاریٰ کہلائے۔ انہی کو انصار بھی کہتے ہیں جیسا کہ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ "کہ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں۔" یا اس لیے ان کا نام نصاریٰ پڑ گیا تھا کہ وہ ناصرہ نام کے ایک گاؤں میں آبسے تھے۔ پھر جبکہ نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو ان پر ان کی تصدیق واجب ہوئی۔ جنہوں نے سچے دل سے ان کی پیروی کی وہ مومن کہلائے اور امت محمدیہ ﷺ کا نام مومنین رکھا۔ اس لیے کہ ان کا ایمان بہت کثیر اور یقین بہت پختہ ہے۔ کیونکہ یہ سب گذشتہ انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں اور آئندہ غیب کی خبروں کا یقین رکھتے ہیں۔ رہے صائبین تو حضرت مجاہد نے فرمایا کہ وہ یہود و نصاریٰ و مجوس کے درمیان ایک قوم تھے جن کا کوئی خاص مذہب نہ تھا۔ سلف کی ایک جماعت نے کہا کہ وہ اہل کتاب کا ایک فرقہ تھا جو زبور پڑھتا تھا۔ اسی لیے امام ابو حنیفہ اور اسحٰق کہتے ہیں کہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اور ان سے نکاح کرنا درست ہے اور حضرت حسن نے کہا کہ یہ مجوس کی طرح تھے ان کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ وہ فرشتہ پرست لوگ تھے۔ زیاد رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ ابو الزناد نے کہا کہ وہ عراق سے متصل بستی کوئی میں آباد تھے۔ سب انبیاء پر ایمان رکھتے تھے۔ تیس روزے رکھتے تھے، یمن کی جانب منہ کر کے پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ وہب بن منبہ نے کہا کہ صابی وہ شخص ہے جو نہ موحد ہو نہ مشرک ہو اور نہ کسی شریعت پر عمل کرے۔ ابن زید نے کہا وہ ایک دین ہے وہ لوگ جزیرہ موصل میں رہتے تھے لا الٰہ الا اللہ کہتے تھے نہ عمل کرتے نہ کتاب رکھتے نہ نبی رکھتے تھے۔ صرف یہ کلمہ کہتے تھے۔ اس لیے مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو صائبین کہہ دیا تھا۔ یعنی وہ کلمہ کہنے میں صائبین کے مشابہ تھے۔ خلیل نے کہا کہ وہ ایک ایسی قوم تھی جن کا مذہب عیسائیوں سے ملتا جلتا تھا مگر ان کا قبلہ بار جنوب کی طرف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں۔ حضرت مجاہد نے کہا کہ ان کا دین یہود اور مجوس سے مل کر بنا ہے۔ اس لیے نہ ان کا ذبیحہ درست ہے اور نہ ان سے نکاح کرنا درست ہے۔ قرطبی نے کہا حاصل یہ ہوا کہ موحد تھے مگر تاثیر نجوم کے قائل تھے۔ نجوم کو فاعل مانتے تھے۔ اسی لیے ابو سعید اصطخری نے خلیفہ قادر باللہ کے جواب میں فتویٰ دیا تھا کہ یہ کافر ہیں۔ رازی نے فرمایا کہ وہ ایک ستارہ پرست قوم تھی۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ نے ستاروں کو دعا و عبادت کے لیے متوجہ

ہونے کی سمت مقرر کیا ہے۔ یا ان کو اس جہاں کی تدبیر سونپی ہے۔ پھر کہا کہ یہ قول کثر ائیسین کی طرف منسوب ہے جن کے ردو ابطال کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے تھے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ واللہ اعلم میرے خیال میں حضرت مجاہد اور وہب بن منبہ کا قول سب سے واضح ہے کہ وہ قوم نہ یہود کی تھی نہ نصاریٰ کی نہ مذہب مجوس پر تھی اور نہ مشرکین تھے بلکہ اپنی فطرت پر تھے۔ اور نہ ان کا کوئی دین تھا۔ جس کے وہ پیرو ہوتے۔ اسی لیے مشرکین مسلمانوں کو صابی کہتے تھے۔ یعنی تمام زمین والوں کے مذاہب سے باہر ہیں۔

((ہم طرز جنون اور ہی ایجاد کریں گے))

بعض علماء نے فرمایا کہ صائبین وہ لوگ تھے جن کو انبیاء کا پیغام نہ پہنچا تھا۔ واللہ اعلم۔ بعض نے کہا کہ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ صابی بن شیث بن آدم کے دین پر ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کتاب ''ردالمنطقیین'' میں لکھا ہے کہ شہر حران پہلے صابیوں کا گھر تھا اس جگہ اس قوم کی منڈی لگتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی جگہ پیدا ہوئے تھے۔ یا عراق سے چل کر یہاں آگئے تھے۔ یہاں بہت سے ستاروں کی مورتیاں تھیں جیسے زحل، مشتری، زہرہ، عطارد، قمر۔ بلکہ علت اولیٰ و عقل اول و نفس کلیہ کی بھی ہیکل بنائی تھی۔ ان کا یہ دین ظہور نصرانیت سے پہلے تھے۔ پھر ان میں نصرانیت آگئی اور کچھ صابی رہے۔ اتنی مدت میں پھر اسلام آگیا۔ یہ صابیہ و فلاسفہ دولت اسلام میں بھی آخر وقت تک باقی رہے۔ بغداد میں طبابت و کتابت کا پیشہ کیا کرتے تھے۔ فارابی جب حران میں آئے سنہ چار سو ہجری تھا اس نے یہیں کے فلاسفہ سے علم سیکھا تھا۔ اسی طرح دمشق والے بھی نصرانیت کے ظہور سے پہلے صابی تھے۔ قطب شمالی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ دمشق کی قدیم مساجد کا قبلہ اسی قطب کی طرف ہے۔ جامع دمشق کے نیچے اس قوم کا بڑا اعبادت خانہ تھا۔ ان کی بھی دو قسمیں تھیں ایک حنیف و موحد تھے دوسرے مشرک تھے۔ اللہ کریم نے اس آیت میں پہلے گروہ کی تعریف کی ہے۔ یہ نسخ و تبدیل سے پہلے تورات پر عمل کرتے تھے پھر انجیل پر عمل کرنے لگے۔ اور جو لوگ ان سے پہلے کے تھے وہ ملت ابراہیمی کے تابع تھے۔ مجوس و مشرک ان کے بر خلاف ہیں کیونکہ ان میں کوئی مومن نہ ہے۔ اسی لیے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئِيْنَ وَالنَّصَارٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ ''بلا شبہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ جو یہودی ہوئے اور صابی لوگ اور عیسائی اور مجوسی اور مشرک لوگ اللہ ان کے درمیان قیامت والے دن فیصلہ کرے گا بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔'' اس جگہ چھ ادیان کا ذکر فرما کر یہ ارشاد کیا کہ اللہ کریم قیامت کے دن ان میں

فیصلہ کر دے گا۔ان میں کسی مومن کا ذکر نہیں کیا۔ پھر یہ صابی مشرک ہو گئے۔ فلاسفہ انہی مشرکین میں سے تھے۔ ہاں پہلے فلسفی جو موحد تھے اور عالم کو بنانے والی ذات کا اقرار کرتے تھے وہ ان صائبین میں سے تھے جو حنفاء تھے جس کی اللہ نے تعریف کی ہے۔ رہے مشرکین صابی وہ بھی مشرکین عرب کی طرح جہان کے حدوث کا اقرار کرنے والے تھے۔ جس طرح کہ مشرکین ہند بھی اسی کے قائل ہیں۔ اہل مقالات نے ذکر کیا ہے کہ مشرکین فلاسفہ میں سے سب سے پہلے جو شخص قدیم عالم کا قائل ہوا وہ ارسطو تھا۔ اپنے فلاسفہ اسلام جیسے ابن سیناء وغیرہ سو ان کا حال بھی صائبہ مشرکین کی طرح ہیں۔ ان کے علوم اسی مذموم قوم کے فنون سے ماخوذ ہیں۔ اسی لیے علماء اسلام نے ان کو ملاحدہ میں شمار کیا ہے۔ اس زمانہ آخر میں جبکہ ہم دوش قیامت کبریٰ معلوم ہوتا ہے سر زمین ہند میں دھریت کا بڑا زور شور ہے۔ دعوے دار السلام کے ہیں لیکن حقیقتاً اسلام کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ **اقماهم الله تعالیٰ.**

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴿۶۳﴾ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴿۶۴﴾

اور جب ہم نے تم سے عہد (کر) لیا اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا (اور حکم دیا) کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے اس کو زور سے پکڑے رہو اور جو اس میں (لکھا) جو اسے یاد رکھو تاکہ عذاب سے) محفوظ رہو۔ تو تم اسکے بعد (عہد سے) پھر گئے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو تم خسارے میں پڑ گئے ہوتے۔

فائدہ: جب تورات نازل ہوئی تو کہنے لگے ہم سے اتنے احکام پورے نہ ہو سکیں گے۔ تب ان پر پہاڑ کو جڑ سے اکھیڑ کر ان کے سروں پر لا کھڑا کیا وہ اس طرح جھولنے لگا کہ گویا ابھی گر پڑے گا۔ تب خوف سے قبول کر لیا۔ جیسے فرمایا: ﴿وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ "اور جب ہم نے ان پر پہاڑ کو اٹھایا جیسے چھتری ہو اور انہوں نے خیال کیا کہ وہ ان پر گر پڑے گا (ہم نے کہا) کہ جو ہم نے تمہیں دیا ہے اس کو قوت سے پکڑ لو اور جو اس کے اندر ہے اس کو یاد کرو تاکہ تم بچ جاؤ۔" طور پہاڑ کو کہتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں اس کی تفسیر اسی طرح کی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ ظاہر بھی یہی معنی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں طور وہ پہاڑ ہے جس پر کچھ اگتا ہو، جو کچھ نہ اگاتا ہو وہ طور نہ ہے۔ اور طور اس پہاڑ کو بھی کہتے ہیں جس پر اللہ کریم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے اور تورات نازل ہوئی۔ یہ اس پہاڑ کے نیچے آگئے تھے اور وہ ان کے اوپر ہلتا

تھا۔ کسی نے کہا کہ سریانی زبان میں ہر پہاڑ کو طور کہا جاتا ہے اور جو پہاڑ ان کے سروں پر بلند کیا گیا یہ فلسطین کے پہاڑوں میں سے تھا۔ حدیث الفتون میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جب انہوں نے اطاعت نہ کی تو ان پر وہ پہاڑ کھڑا کیا گیا تاکہ بات سنیں اور اس کی اطاعت کریں۔ سدی نے کہا کہ انہیں سجدے کا حکم ہوا تھا جب انہوں نے اس کو نہ مانا تو ان پر پہاڑ لا کھڑا کیا گیا اس کو دیکھا تو بدحواس ہو کر سجدے میں گر پڑے۔ لیکن ایک جانب پر دوسری جانب سے دیکھتے جاتے کہ کہیں گر نہ جائے۔ اللہ نے رحم کیا اور پہاڑ کو ہٹا لیا۔ انہوں نے کہا سب سے پسندیدہ وہ سجدہ ہے کہ جس کے سبب سے یہ عذاب ان سے دور ہو گیا۔ اسی لیے اب تک وہ اسی طرح سجدہ کرتے تھے۔

فائدہ: حضرت حسن نے کہا: مَا اٰتَیْنٰکُمْ سے تورات مراد ہے۔ یعنی اس کو پکڑے رکھو۔ ابو العالیہ نے کہا کہ قوت سے طاعت مراد ہے۔ حضرت مجاہد نے کہا عمل کرنا مراد ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا کہ طاقت و کوشش مراد ہے۔ یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اس میں ہے اس کو پڑھو سمجھو اور اس پر عمل کرو۔ لیکن وہ مضبوط عہد کے بعد پھر اس سے پھر گئے اور وعدہ خلافی کی۔ اللہ کریم نے ان کی توبہ قبول کی۔ نبی اور رسول بھیجے۔ ورنہ دنیا و آخرت دونوں برباد کر چکے تھے۔ بعض علماء نے کہا کہ اگر وہ پہلی دفعہ مان لیتے تو اس عہد و پیمان کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ ابن عطیہ نے کہا کہ سجدے کے وقت ان کے دلوں میں ایمان پیدا ہو گیا تھا۔ یہ بات نہ ہے کہ اطمینان قلب کے بغیر زبردستی وہ ایمان لائے ہوں۔ امام شوکانی فرماتے ہیں کہ یہ بیان بناوٹی ہے۔ قواعد مذہبی کی پابندی نے ایسی پابندی کروائی ہے۔ ورنہ ہر عاقل شخص جانتا ہے ورنہ اس سے زیادہ اور اکراہ کیا ہو گا کہ ان کے سروں پر پہاڑ لا کھڑا کیا کہ مانتے ہو تو ٹھیک ورنہ یہ تم پر گرا دیا جائے گا۔ بلکہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ان کے سامنے آگ تھی، پیچھے دریا تھا اور اوپر پہاڑ تھا۔ غرضیکہ ہم تو کہتے ہیں کہ بلاشبہ اللہ نے ان پر اکراہ کیا اور وہ زبردستی ایمان لائے تھے۔ اسی ایمان کی وجہ سے اللہ نے ان پر سے عذاب کو ہٹا لیا یہ اسی طرح ہے جیسے کہ ہماری شریعت میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جب کوئی شخص کلمہ توحید منہ سے کہہ دے تو جہاں تک ہاتھ اٹھا ہے وہیں روک لو۔ اس پر تلوار نہ چلاؤ۔ صحیح بخاری شریف میں مذکور ہے کہ اسی طرح ایک شخص نے کلمہ توحید کہا لیکن دوسرے نے اس کو قتل کر دیا۔ جب مقدمہ نبی علیہ السلام کے سامنے پیش ہوا تو قاتل نے عذر کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ اس نے صدق دل سے نہیں کہا بلکہ قتل سے بچنے کے لیے کہا تھا۔ فرمایا: کیا نے تو اس کے دل کو چیر کر دیکھ لیا ہے۔ مجھے یہ حکم نہ ہے کہ لوگوں کے دل چیر کے دیکھ لوں۔ رہی یہ بات کہ ﴿لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ﴾ "کہ دین میں کوئی زبردستی نہ ہے۔ اور ﴿اَفَاَنْتَ

تُكْرِهُ النَّاسَ ﴾ "کہ کیا آپ لوگوں کو مجبور کرتے ہیں۔" تو یہ جہاد کے حکم سے قبل تھا اب منسوخ ہو گیا ہے۔

فائدہ: مشکوۃ شریف میں حدیث مذکور ہے کہ میں تم میں دو عظیم چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو گمراہ نہ ہو گے۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت۔ اسی طرح اور بہت سی احادیث میں قرآن و حدیث پر تمسک بلکہ ان کے اتباع کی وصیت فرمائی ہے کہ ان کو اپنے دانتوں سے مضبوط پکڑے رہو۔ قرآن کریم میں اہل علم سے عہد لیا گیا کہ تم اس قرآن کو بیان کیا کرو گے۔ سو جس طرح بنی اسرائیل اپنے قول و قرار سے پھر گئے کہ تورات کو نہ مضبوط پکڑا نہ عمل کیا اسی طرح ایک مدت سے وہی طریقہ اس امت نے بھی اختیار کر لیا ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے کہ جس طرح انہوں نے فرمایا تھا بعینہ ویسا ہی پورا ہوا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ تم مکمل طور پر پہلے لوگوں کی سی چال چلو گے۔ سو تقلید اصل میں یہود کا طریقہ ہے جو اس امت کے آخر میں بھی چل نکلا ہے۔ اور اتنا راسخ ہو چکا ہے کہ ظہور مہدی و نزول عیسیٰ سے پہلے اس کا ختم ہونا ناممکن نظر آتا ہے۔ جب سے یہ تقلید و قیاس عوام اس امت اسلامیہ نے پسند کر لیا ہے۔ میرے تیرے کہنے پر لوگ قناعت کر بیٹھے ہیں۔ قرآن کا پڑھنا حدیث کا سمجھنا کتاب پر چلنا اور سنت پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ تب ہی سے اسلام اجنبی بن کر رہ گیا۔ مسلمانوں پر پستی آنا شروع ہو گئی اور وہ یہود کی سی حالت میں ڈھلنے لگے۔ ((انا لله و انا اليه راجعون اللهم اهدنا فيهن هديت))

اب ان کی بھی یہ حالت ہو گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر کوہ طور کی طرح جب تک ان کو مہدویت کا کوڑا نہ لگا تب تک یہ اپنے عہد پر نہ چلیں گے۔ حضرت مہدی علیہ السلام کی سیرت میں ہے کہ وہ سنت کو زندہ کریں گے اور تقلید کو ختم کر دیں گے اور سب کو کتاب و سنت پر چلا دیں گے۔ جب ان مبتدعین و مقلدین کے سر پر ان کی تلوار چمکے گی تب جا کر یہ بے دین توبہ کریں گے۔ راہ راست پر آ جائیں گے ورنہ اب تک تو اپنے جہل و ضد میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اہل حق کا رد کرتے ہیں۔ حق کو باطل کہنے اور باطل کو حق ثابت کرنے پر کمر کسے ہوئے ہیں۔ مگر یہ ظالم عنقریب جان لیں گے کہ کونسا پلٹنے والا پلٹتا ہے، اہل حق یا یہ لوگ۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾ اور تم ان لوگوں کو خوب جانتے ہو جو تم میں سے ہفتے کے دن (مچھلی کا شکار کرنے) میں حد سے تجاوز کر گئے تھے تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل و خوار بندر ہو جاؤ۔ اور اس قصے کو اس وقت کے لوگوں کے لیے اور جو ان کے بعد آنے والے تھے عبرت اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت بنا دیا۔

فائدہ: یہ قصہ سورۃ اعراف میں ہے: ﴿وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ "اور ان سے اس بستی والوں کا حال پوچھیے جو دریا کے کنارے رہتی تھی۔ جب وہ زیادتی کرنے لگے ہفتے میں۔ جب کہ ان کے ہفتے کے دن ان کی مچھلیاں پانی کے اوپر تیزی سے آتیں اور جس دن وہ ہفتہ نہ کرتے نہ آتیں تھیں۔ یوں ہم ان کو ان کے فسق کی وجہ سے آزمانے لگے۔" سدی نے کہا کہ یہ بستی والے اہل ایلہ تھے۔ حضرت قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ بستی ایلہ اور طور کے درمیان تھی اسے مدین کہتے تھے۔ بہر حال اللہ نے ان سے یہ عہد و میثاق لیا تھا کہ تم ہفتے کے دن کی تعظیم کرو اس دن شکار نہ کرو۔ انہوں نے یہ حیلہ گھڑ لیا کہ ہفتے سے ایک دن پہلے وہ حوض بناتے اور جال لگا آتے۔ مچھلیاں اس میں پھنس کر رہ جاتیں۔ رات کو پکڑ لاتے اس پر اللہ کو غصہ آیا تو ان کو بندر بنا دیا۔ اور بندر شکل و صورت میں انسان سے بہت مشابہ ہے۔ گو کہ حقیقت میں حیوان ہے۔ اسی طرح جبکہ ان کے یہ حیلے بظاہر حق کے مشابہ تھے لیکن حقیقتاً حق کے مخالف تھے۔ اس پر اللہ نے انہیں ویسی ہی جزاء و سزا دی جو ان کے جنس عمل سے تھی۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ ان کے دل مسخ ہو گئے تھے سچ مچ شکلیں مسخ نہ ہوئی تھیں۔ یہ ایک مثال ہے جو اللہ کریم نے بیان فرمائی: ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾ "کہ گدھوں کی طرح جو بوجھ اٹھائے ہوئے ہے۔" ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حضرت مجاہد کا یہ قول سیاق آیت کے ظاہر کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس کے سوا اور مقام پر بھی یوں فرمایا کہ: ﴿جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ﴾ "اور بعض کو ان میں سے بندر بنا دیا اور بعض کو خنزیر بنا دیا۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ان کے جوان بندر بن گئے اور بوڑھے خنزیر بن گئے تھے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ قوم کی دم نکل آئی تھی اور چیخنے چلانے لگے۔ پہلے وہ مرد و عورت تھے اب بندر بن گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان کو ان کی معصیت کی وجہ سے بندر بنا دیا وہ تین دن تک زندہ رہے کوئی مسخ شدہ قوم تین دن سے زیادہ زندہ نہ رہی۔ نہ کچھ کھایا پیا نہ نسل چلی۔ اللہ نے بندر و خنزیر سمیت ساری مخلوق چھ دن میں بنائی۔ اس قوم کو بندر کی صورت میں بنا دیا۔ اسی طرح جس کے ساتھ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور جسے جو چاہتا ہے بنا دیتا ہے۔ ان میں صرف وہ لوگ بچے جو ان کو منع کرتے تھے۔ ورنہ سب کے سب ہلاک ہو جاتے تھے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں بات یہ نہ ہے کہ ان کا مسخ صرف معنوی تھا یا صرف صوری تھا۔ بلکہ ان کا مسخ صوری بھی تھا اور معنوی بھی تھا ۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مکمل قصہ مسخ نقل کیا۔ جس کا خلاصہ اوپر گذرا ہے۔ فتح البیان کا لفظ ہے کہ اس

آیت میں امر کا صیغہ تسخیر و تکوین کے لیے ہے۔ یعنی امن کے لیے قدرت کا تعلق حقیقتِ بشریت سے حقیت بندر کی طرف منتقل کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ حقیقتاً مسخ ہو گئے تھے۔ پھر فرمایا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے کہ یہود دو فرقے ہو گئے تھے ایک وہ جو بالکل باز نہ آتے تھے اور حد سے بڑھ گئے تھے۔ اور مچھلی کا شکار کرتے رہے۔ اور دوسرا فرقہ دو قسموں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک قسم نے کھل کر منع کیا اور کنارہ کشی اختیار کی۔ جبکہ دوسرا اگروہ نہ کھل کر منع کرتا نہ ان کا ساتھ دیتا تو صرف ایک گروہ بچا جو منع تو کرتا تھا لیکن ساتھ نہ دیتا تھا باقی سب مارے گئے اور عذاب میں برابر کے گرفتار ہوئے۔ یہ قصہ حضرت داؤد کے زمانے میں پیش آیا۔ جیسے فرمایا: ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ﴾ ”کہ لعنت کی گئی بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داؤد اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی زبان پر۔“

فائدہ: اللہ کریم نے اس انجام کار کو اس بستی والوں کے لیے اور اس کے ارد گرد والی بستیوں والوں کے لیے عبرت بنا دیا۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ ”اور تحقیق ہم نے تمہارے ارد گرد کی بستیوں کو ہلاک کر دیا اور ہم پھیر پھیر کر آیات لاتے ہیں تاکہ وہ لوٹ آئیں۔“ اور جیسے اللہ کا یہ فرمان: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ﴾ ”یعنی کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ ہم زمین کو اس کے اطراف سے کم کر کے لا رہے ہیں۔“ اطراف سے آس پاس کے شہر مراد ہیں۔ حضرت قتادہ نے کہا کہ ماقبلھا سے اگلے لوگ اور ماخلفھا سے پچھلے لوگ مراد ہیں، جو کہ بنی اسرائیل سے تھے۔ مگر یہ بات درست نہ ہے کہ کیونکہ اس سے مکان مراد ہے۔ زمان مراد نہ ہے۔ اگر آئندہ لوگوں کے حق میں یہ عبرت درست بھی ہو تو گذشتہ لوگوں کے حق میں یہ درست نہ ہے۔ اس لیے مضبوط بات یہ ہے کہ اس سے مکان مراد ہے کہ وہ گاؤں جو اس کے آگے اور پیچھے تھے جن تک اس حادثے کی خبریں پہنچیں تھیں۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ ﴾ ”اور ہمیشہ کافروں کو ان کے کیے پر کھٹکا ہوتا رہے گا۔“ اور اللہ کریم نے فرمایا: ﴿اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ﴾ ”کہ کیا وہ دیکھتے نہیں ہیں کہ ہم زمین کو اس کے اطراف سے کم کرتے چلے آتے ہیں۔“ غرضیکہ اللہ نے ان کو ان کے موجودہ دور والوں کے لیے بھی عبرت بنا دیا اور ان کو آئندہ آنے والوں کے لیے بھی انہیں نصیحت کا مقام بنا دیا۔ کہ وہ اس متواتر خبر کو معلوم کریں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ عبرت و نصیحت قیامت تک کے لیے ہے۔ حضرت حسن اور قتادہ نے کہا یعنی تاکہ لوگ اللہ کے اس انتقام کو دیکھ کر اس کی معصیت سے بچ جائیں۔

سدی نے کہا کہ اس جگہ متقین سے امت محمدیہ ﷺ مراد ہے۔ حافظ ابن کثیر نے فرمایا مطلب یہ ہے جو عذاب ان پر مسلط کیا گیا تھا وہ اس لیے تھا کہ انہوں نے اللہ کے محارم کی بے حرمتی کی اور اس میں طرح طرح کے حیلے نکالے۔ اب جو متقی لوگ ہیں انہیں چاہیے کہ ایسے کام سے بچیں کہیں ایسا نہ ہو کہ جو آفت ان پر آپڑی تھی وہ ان لوگوں کو بھی آگھیرے۔ حضرت ابی ہریرہ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ تم وہ کام نہ کرو جو یہود نے کیا تھا کہ ذرا حیلے نکال کر اللہ کے محارم کو حلال کر لیا۔ [بروایت احمد بسند جید] جامی نے اپنے نظم میں فقہاء کے حیلوں کا خوب شکوہ کیا ہے۔ اور انہیں حیلہ گر اور شعبدہ باز کہا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ دنیا کے لالچ کے لیے امراء کی خوشامد کرنے کے لیے ناجائز معاملات کو حیلوں کے ذریعے بظاہر جائز بنا لیتے تھے۔ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں حیل کے ابطال کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اللہ کریم نے حدیث و قرآن والوں کو اس حیلہ بازی سے ہمیشہ بچایا ہے اور بچائے گا۔

((ما اهل حدیثیهم و غارا نشنا هم))

((صد شکر که در مذهب ما حیله و من نیست))

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٦٧﴾

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک بیل ذبح کرو، وہ بولے کیا تم ہم سے ہنسی کرتے ہو؟ (موسیٰ نے) کہا کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ نادان بنوں۔

فائدہ: عبیدہ سلمانی نے کہا کہ بنی اسرائیل میں ایک بے اولاد شخص تھا۔ اس کے پاس بہت سا مال و دولت تھا۔ اور اس کا بھتیجا جو کہ اس کا وارث بنتا تھا اس نے اس کو قتل کر دیا۔ پھر رات کو اس کی لاش کو اٹھا کر کسی اور شخص کے دروازے پر ڈال دیا۔ صبح ان پر خون کا دعویٰ کر دیا۔ یہ لوگ ہتھیار باندھ کر لڑنے کو تیار ہو گئے۔ ان میں سے ایک سمجھ دار آدمی نے کہا کہ تم باہم خانہ جنگی کیوں کرتے ہو۔ تم میں اللہ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام موجود ہیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے یہ حال بیان کیا تو جواباً انہوں نے فرمایا کہ اللہ پاک کا حکم ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ اگر وہ لوگ طرح طرح کے سوال اور نوک ٹوک نہ کرتے تو کوئی سی ایک گائے کافی ہو سکتی تھی۔ مگر ان کے بات لمبی کرنے سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جس کا ذکر اللہ کریم نے اس مقام پر فرمایا ہے۔ ابن کثیر نے اسی قصے کو ابن عباس، ابو العالیہ اور سدی وغیرہم سے مختلف الفاظ سے نقل کرنے کے بعد کہا کہ ان سیاقات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی کتب سے حاصل کیے

گئے ہیں نہ ان پر مہر تصدیق ثبت ہو سکتی ہے نہ تکذیب۔ ممکن ہے کہ یہ سیاقات اسی قدر قابل اعتماد ہو سکتے ہیں جو حق کے موافق ہوں۔

فائدہ: ذبح بقرہ کا قصہ تلاوت میں مقدم ہے۔ مگر معنی میں ﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا﴾ سے موخر ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وَاِذْقَتَلْتُمْ سے نزول میں مقدم ہو اور ذبح کا حکم موخر ہو۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ۝ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ۝

انہوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے التجا کیجئے کہ وہ ہمیں یہ بتائے کہ وہ بیل کس طرح کا ہو۔ (موسیٰ نے) کہا پروردگار فرماتا ہے کہ وہ بیل نہ تو بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا بلکہ ان کے درمیان (یعنی جوان) ہو سو جیسا تم کو حکم دیا گیا ہے ویسا کرو۔ انہوں نے کہا اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ ہم کو یہ بھی بتادے کہ اس کا رنگ کیسا ہو، موسیٰ نے کہا: پروردگار فرماتا ہے کہ اس کا رنگ گہرا زرد ہو کہ دیکھنے والوں (کے دل) کو خوش کر دیتا ہو۔ انہوں نے کہا: (اب کے) پروردگار سے پھر درخواست کیجئے کہ ہم کو بتادے کہ وہ اور کس کس طرح کا ہو کیونکہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں (پھر) اللہ نے چاہا تو ہمیں ٹھیک بات معلوم ہو جائے گی۔ موسیٰ نے کہا کہ اللہ فرماتا ہے کہ وہ بیل کام میں لگا ہوا نہ ہو، نہ تو زمین جوتتا ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتا ہو، اس میں کسی طرح کا داغ نہ ہو، کہنے لگے اب تم نے سب باتیں درست بتادیں، غرض (بڑی مشکل سے) انہوں نے اس بیل کو ذبح کیا اور وہ ایسا کرنے والے تھے نہیں۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ کریم نے بنی اسرائیل کی ہٹ دھرمی ذکر کی ہے کہ انہوں نے اتنے سوال کیے کہ اپنے پیغمبر علیہ السلام کو تنگ کر دیا۔ جب انہوں نے تنگی کی تو اللہ نے ان پر تنگی اور سختی کر دی۔ ورنہ کوئی بھی گائے ذبح کرنا کفایت کر سکتا تھا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر یہ لوگ ان شاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی گائے کا معاملہ واضح نہ ہو پاتا۔ بروایت ابن ابی حاتم عن ابی ہریرۃ مرفوعاً بچپن اور بڑھاپے کے درمیان ہونا قوت و حسن کی نشاندہی کرتا ہے۔ حضرت حسن نے فرمایا یہ ایک وحشی گائے تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ

جو کوئی زرد جوتا پہنے گا جب تک پہنے گا خوش رہے گا۔ ابن عمر نے فرمایا کہ اس گائے کے کھر زرد تھے۔ ابن جبیر نے کہا بلکہ اس کے سینگ بھی زرد تھے۔ حضرت عطیہ نے کہا وہ اتنی گہری زرد تھی کہ سیاہ معلوم ہو تو بھی کچھ دور نہ ہے۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ بلکہ وہ صاف رنگی تھی۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ یوں لگتا تھا کہ شدت زردی سے سفید ہو جائے۔ وہب بن منبہ نے کہا کہ اگر تو اس کی کھال کو دیکھے تو خیال کرے گا کہ سورج اس کے پوست سے نکلتا ہے۔ تورات میں اس کو سرخ رنگ کہا گیا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں ہیں کہ یہ تعریب کی خطا ہے یعنی مترجم نے ترجمہ غلط کیا ہے۔ زرد کی جگہ سرخ لکھ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ گہری پیلی تھی اور اس زردی کی شدت کی وجہ سے لال کالی نظر آتی تھی۔ واللہ اعلم ۔ اور جو فرمایا کہ اس میں کوئی داغ نہ ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں زرد رنگ کے سوا کسی اور رنگ کا دھبہ نہ تھا کہ کہیں سے کالی ہو یا سفید ہو یا سرخ ہے۔ بلکہ اس کا رنگ یکساں تھا اور جو فرمایا کہ وہ کام کرنا نہ چاہتے تھے۔ اس میں ان کی مذمت ہے کہ اتنے سوال و جواب اور وضاحت کے باوجود بڑی مشکل سے ایسا کرنے پر آمادہ ہوئے۔ کسی نے کہا کہ قیمت کی گرانی کا سبب ذبح نہ کرنا چاہتے تھے لیکن یہ قول محل نظر ہے۔ اس لیے کہ یہ بنی اسرائیل سے منقول ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ہٹ دھرمی اور شرارت سے وہ ایسا نہ کرنا چاہتے تھے۔ بعض نے کہا قاتل کے ظاہر ہونے سے جو رسوائی ہونی تھی اس کے خدشہ سے ایسا کرنے سے گریز کر رہے تھے مگر پہلا قول ہی مناسب ہے جو کہ ان کی عادت تھی۔ نیز اس آیت سے کئی ایک احکام اخذ ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ حکم دینے والا حکم کے عموم میں داخل نہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ اس عموم میں داخل نہ تھے اس قول کی دلیل سے فَذَبَحُوهَا دوسرا یہ کہ گائے میں ذبح سنت ہے۔ تیسرے یہ کہ کسی حکم کا اجمالی تذکرہ بھی آسکتا ہے کہ اس کے بیان و وضاحت کی تاخیر ممکن ہے۔ چوتھا یہ کہ مذاق کرنے والے کو جاہل کہہ سکتے ہیں۔ پانچواں یہ کہ انشاءاللہ کہنے سے معاملات میں استثناء آجاتا ہے۔ چھٹا یہ کہ حکم دینا مشیت کو لازم نہ کرتا ہے۔ ساتواں یہ کہ حکم کرنا فوراً بجالانے کے لیے ہوتا ہے۔ اس قول سے ﴿وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ "کہ قریب نہ تھا کہ وہ کر گذرتے۔" آٹھواں یہ کہ حیوان میں سلم جائز ہے۔ حیوان کا وصف سے حصہ کر سکتے ہیں۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حیوان میں سلم کرنا مالک، اوزاعی، لیث، شافعی، احمد اور جمہور سلف و خلف کا مذہب ہے۔ مگر ابو حنیفہ اور ثوری ایسے سلم کو جائز نہ کہتے ہیں۔

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا وَاللّٰهُ اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کیا تو اس میں باہم جھگڑنے لگے لیکن جو مُخْرِجٌ مَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا بات تم چھپا رہے تھے اللہ اس کو ظاہر کرنے والا تھا۔ تو ہم نے کہا کہ اس اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذَٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ بیل کا کوئی سا ٹکڑا مقتول کو مارو، اس طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۷۳﴾ تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

فائدہ: بنی اسرائیل میں ایک شخص مارا گیا تھا اس کا قاتل معلوم نہ تھا اس کے وارث پر کسی پر خون کا دعویٰ کرتے پھر رہے تھے کہ اللہ نے اس طریقے سے اس مردے کو زندہ کیا تو اس نے بتایا کہ یہی وارث میرے قاتل ہیں۔ بخاری شریف میں ہے کہ فادا راتم بمعنی اختلفتم ہے۔ حضرت مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔ عطاء خراسانی فرماتے ہیں کہ اس کے معنی اختصمتم ہیں۔ ابن جریج نے کہا اس کے معنی یہ ہیں کہ بعض بعض پر دعویٰ کرنے لگے کہ ایک دوسرے کو کہتا کہ تم نے قتل کیا ہے۔ بہر حال ایک گائے کا ٹکڑا اس مردے کو لگایا گیا اب اس ٹکڑے میں یہ اختلاف ہے کہ آیا وہ کس عضو کا ٹکڑا تھا کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ ابن کثیر نے یہ سب اقوال ذکر کیے ہیں اور فرمایا کہ بہر حال وہ کوئی بھی ہے ایک معجزہ تو ہے۔ اگر اس کی تعین میں دینی یا دنیاوی کچھ فائدہ ہوتا تو اللہ کریم یقیناً اسے کہیں واضح فرما دیتے۔ لیکن جب وہ مبہم رکھا گیا اور معصوم علیہ السلام کی طرف سے کسی بھی طریق سے اس کا یہ ابہام ظاہر نہ ہوا تو ہمیں بھی اس کو مبہم رکھنا ہی بہتر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ کوئی شخص اگر کسی ایسے بند اور ٹھوس پتھر میں کوئی کام کرے گا جس میں نہ کوئی دروازہ ہے نہ کوئی دارڑ و سوراخ۔ تو بھی وہ کام لوگوں پر ظاہر ہو جائے گا۔ وہ کوئی سا کام کیوں نہ ہو۔ [بروایت احمد و صححہ الحاکم] حضرت مسیب بن رافع نے فرمایا کہ کوئی شخص سات کوٹھڑیوں میں کوئی اچھا کام نہ کرے گا مگر اللہ اسے ظاہر کر دے گا اور نہ کوئی برائی کرے گا کہ سات گھروں کے اندر بھی کرے تو اللہ اسے ظاہر کر دے گا اس کی تصدیق کلام اللہ میں موجود ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس کی بھی کوئی اچھی یا بری خصلت ہے اللہ اس کی ایک چادر ظاہر کرتا ہے جس سے وہ خصلت پہچانی جاتی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت سے اسی طرح کے کلمات مذکور ہیں میں کہتا ہوں کہ اگرچہ یہ بات عام ہے مگر خصوصاً قتل و سحر و زنا کسی بھی طرح چھپ نہیں سکتے۔

فائدہ: ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے چالیس برس تک اس گائے کو تلاش کیا جب پایا تو اس کی کھال میں دینار بھر کر اس کی قیمت ادا کی پھر لا کر اس کو ذبح کیا اس کا ایک حصہ مقتول کو

لگایا تو وہ خون آلودہ اٹھ بیٹھا۔ پوچھا گیا کہ تجھے کس نے قتل کیا ہے اس نے بتایا کہ فلاں شخص میرا قاتل ہے۔ اللہ نے اس کام کو آخرت کی زندگی پر دلیل بنادیا کہ جیسے یہ مردہ زندہ ہو گیا ہے اسی طرح سب نے مر کر زندہ ہونا ہے۔ اور امر معاد برحق ہے اس کا منکر کافر ہے۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس سورت میں پانچ مقامات پر مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ ﴿ثُمَّ بَعَثْنَا كُمْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ﴾ "پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد زندہ کیا۔" دوسرے مقام ﴿الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ﴾ "کہ جو لوگ اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے نکل پڑے تھے جبکہ وہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔" تیسرا مقام: ﴿اَلَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ "کہ وہ شخص جو ایک بستی پر سے گذرا اور وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی۔" ایک یہ مقام پانچواں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چار پرندوں کو قتل کر کے آواز دینا اور ان کا زندہ ہونا۔ اسی طرح زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرنا بھی اس کی دلیل ہے کہ مردہ جسم مٹی میں مل جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھیں گے۔ چنانچہ ابی رزین عقیلی کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے فرمایا اے اللہ کے پیغمبر! اللہ مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے۔ فرمایا کیا تیرا گذر کسی ایسے خشک جنگل سے نہ ہوا کہ پھر جب تو دوبارہ گذرا ہو تو وہ سرسبز ہو۔ کہا ہاں گذرا ہوں۔ فرمایا: اسی طرح اللہ کریم مردوں کو زندہ کردے گا۔ [بتخریج ابو داؤد الطیالسی] اس حدیث کے لیے یہ آیت گواہ ہے: ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّ فَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ﴾ "اور ان کے لیے مردہ زمین نشانی ہے جس کو ہم نے زندہ کیا اور اس سے وہ دانے نکالے جنہیں وہ کھاتے ہیں اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات لگادیئے اور اس میں چشمے پھاڑ دیئے تاکہ وہ اس کے پھل کھائیں اور انہیں ان کے ہاتھوں نے نہیں بنایا ہے، کیا وہ شکر نہیں کرتے ہیں؟"

فائدہ: غرض اس ایمان سے منکرین بعث پر رد مقصود ہے۔ اس میں رد کرنا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس آیت کے مخاطب عرب ہوں یہود نہ ہوں۔ اس لیے کہ یہود تو آخرت کا اقرار کرتے ہیں۔ اس صورت میں یہ جملہ معترضہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے ہم نے قتیل بنی اسرائیل کو زندہ کردیا اسی طرح سارے مردوں کو زندہ کردیں گے۔ ان دونوں امر میں جواز و امکان کے اعتبار سے کچھ فرق نہ ہے۔ یہ واقعہ اسی لیے دکھایا گیا کہ شاید تم اپنے نفس کو گناہ سے باز رکھو۔ سیوطی رحمہ اللہ نے در منثور میں وہب بن منبہ سے اس واقعے کو بڑا طویل ذکر کیا ہے۔ یہاں اس کو ذکر کرنے کی ضرورت نہ ہے۔ ہاں اگر مرفوع ہوتا تو ذکر میں کچھ مضائقہ نہ تھا۔

فائدہ: کسی نے کہا کہ اس آیت میں مالک رحمہ اللہ کے اس قول کی تائید ہے کہ اگر زخمی کہہ دے کہ مجھے فلاں شخص نے قتل کیا ہے تو اس کا قول معتبر ہو گا اس لیے کہ جب قتیل بنی اسرائیل نے اٹھ کر بتایا کہ میرا قاتل فلاں ہے تو اس کی بات کا اعتبار کیا گیا تھا کیوں کہ اس کی یہ حالت ایسی نہ تھی کہ اس میں گنجائش تہمت ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی اسی کو راجح کہتی ہے کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر پتھر سے کچل دیا تھا۔ جب اس سے کہا گیا کہ فلاں نے تجھے قتل کیا ہے یا فلاں نے حتی کہ جب اس قاتل یہودی کا نام لیا گیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر اس کو پکڑا گیا اور آخر اس نے قتل کا اقرار کر لیا کہ واقعی میں ہی اس کا قاتل ہوں۔ اقرار و اعتبار کی صورت میں اولیاء مقتول سے بطور قسامت حلف لیں گے۔ جمہور کہتے ہیں مقتول کا یہ قول معتبر نہ ہے۔ میں کہتا ہوں اس مسئلہ لوٹ پر ابن القیم نے کتاب "طرق حکمیہ" میں بڑا مفصل بیان لکھا ہے جس کا خلاصہ حسن المساعی میں آ گیا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٧٤﴾

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت اور پتھر تو بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں اور ان میں سے پانی نکلنے لگتا ہے اور بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے عملوں سے بے خبر نہیں۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس آیت میں بنی اسرائیل کی خوب مذمت کی ہے کہ تم اتنے نااہل اور نالائق ہو کہ تم نے سب نشانیاں دیکھیں، مردے کا زندہ ہونا دیکھا اس پر بھی تم کچھ نرم نہ ہوئے۔ تمہارے دل پتھروں جیسے ہو گئے جو نرم نہیں پڑ رہے۔

((موم سمجھے تھے تیرے دل کو سو پتھر نکلا))

اسی لیے مومنین کو اس سے منع کیا کہ کہیں وہ ایسا کام نہ کر بیٹھیں۔ فرمایا: ﴿ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ لَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ كَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ "کیا ایمان والوں کے لیے کیا وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے نرم و عاجز پڑ جائیں اور جو حق سے نازل ہوا اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی۔ پس ان پر مدت لمبی ہو گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب مقتول نے زندہ ہو کر کہہ دیا کہ مجھے میرے بھتیجوں نے قتل کیا ہے تو اس کے بعد وہ پھر فوت ہو گیا۔ اس وقت انہوں نے پھر انکار کر دیا کہ ہم نے اس کو قتل نہ کیا ہے۔ ان کا یہ انکار حق کے دیکھ لینے کے بعد تھا۔ اس لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ تمہارے دل تو پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے کہ کسی طرح نرم نہیں ہوتے بلکہ تم نے پتھروں کے بھی کان کترے کہ ان میں سے بھی اتنے سخت ہونے کے باوجود بعض سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور بعض سے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں اور بعض اللہ کے خوف سے گر جاتے ہیں۔ لیکن تمہاری اس سختی کا کوئی علاج نہ ہے۔ ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا لْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَرَأَيْتَه' خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللّٰه﴾ ”کہ اگر ہم اس قرآن کو ایک پہاڑ پر نازل کرتے تو تو دیکھتا کہ وہ نرم پڑ گیا ہے اور اللہ کے ڈر سے دب گیا ہے۔“ معلوم ہوا کہ اپنے حالات و واقعات کے حساب سے پتھروں کو بھی ایک طرح کا شعور ہوتا ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿تُسَبِّحُ لَه' السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَا تَفقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُم﴾ ”کہ اس کے لیے ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے تسبیح بیان کرتے ہیں اور نہیں ہے کوئی بھی چیز مگر وہ اس کی حمد سے تسبیح بیان کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہ ہو۔“ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ جو بھی پتھر ہے اس سے یا تو ندی نالہ نکلتا ہے یا چشمہ بہتا ہے یا وہ اللہ کے ڈر سے پہاڑ سے نیچے گر جاتا ہے۔ یعنی ان صفات سے کوئی بھی خالی نہ ہے۔ قرآن میں ایسا ہی آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بعض پتھر تمہارے دلوں سے زیادہ نرم ہیں تم حق کو مانتے نہیں ہو لیکن وہ اللہ کا حکم قبول کرتے ہیں۔ ﴿يَا جِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَه' وَالطَّيْرَ وَاَلَنَّا لَه' الْحَدِيْدَ﴾ ”کہ اے پہاڑو! اس کے ساتھ انابت کرو اور اے پرندو! اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کیا۔“ جبائی کا قول ہے کہ پتھر کے گرنے سے اولوں کا بادلوں سے برسنا مراد ہے۔ مگر یہ بعید ہے۔ رازی اور ابن کثیر نے بھی اس کو بعید سمجھ کر کہا اس میں اصل لفظ سے بلا دلیل نکلنے والی بات ہے۔ پتھر کا پہاڑوں سے گرنا بہت لوگوں نے دیکھا ہے۔ خبر متواتر سے سنا ہے۔ پھر اس کا انکار کر کے بات بنانا کیا ضروری ہے۔ ہم پر لفظ قرآن حجت ہے اور لفظ کے ظاہر کا اتباع کرنا فرض ہے۔ یحییٰ بن یعقوب نے کہا کہ ندی بہنے سے زیادہ رونا مراد ہے۔ اور پانی نکلنے سے کم رونا مراد ہے۔ اور گرنے سے مراد دل کا رونا ہے۔ جو بغیر آنسو کے ہو کسی نے کہا کہ یہ نسبت مجازی ہے۔ جیسے دیوار کے متعلق ارادے کا ذکر کیا ﴿يُرِيْدُ اَنْ يَنْقَضَ﴾ ”کہ وہ ارادہ کر رہی تھی کہ گر جائے۔“ مگر رازی اور قرطبی نے کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہ ہے کہ بے جا تکلفات میں پڑا جائے۔ اللہ اس پر قادر ہے کہ پتھروں میں یہ صفت پیدا کر دے۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنهَا ﴾ ”کہ ہم نے (اس) امانت کو آسمانوں زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس سے انکار کیا کہ وہ اسے اٹھائیں اور وہ اس سے ڈر گئے۔“ اور فرمایا: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ ﴾ ”کہ ساتوں آسمان اور زمین اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔“ اور اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ﴾ ”کہ ستارے اور درخت دونوں سجدہ کرتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ ﴾ ”کیا انہوں نے اس کی طرف نہ دیکھا جو اللہ نے کچھ پیدا کیا ہے ان کے سائے جھکتے (ڈھلتے) ہیں۔“ اور فرمایا: اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ کہ (زمین و آسمان نے کہا) بلکہ ہم دونوں خوشی سے آتے ہیں۔ اور فرمایا: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ ﴾ ”کہ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے۔“ اور فرمایا: ﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ ﴾ ”کہ جب (مجرم) اپنے چمڑوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی۔ وہ کہیں گے کہ ہمیں قوت نطق اللہ نے دی ہے۔“ پھر حدیث صحیح میں مذکور ہے کہ: ﴿هٰذَا جَبَلٌ یُحِبُّنَا وَنُحِبُّهٗ ﴾ ”کہ یہ ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ اس ستون کا رونا جو بطور منبر تھا۔“ خبر متواتر سے ثابت ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اب تک اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو بعثت سے قبل مجھ پر سلام کرتا تھا۔ حجر اسود کے متعلق بھی ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنے ساتھ ہاتھ اور منہ لگانے والے کے حق میں گواہی دے گا۔ اس کے اور بہت سے دلیلیں ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ یا تو تمہارے دل پتھر ہو گئے ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ ان وصفوں سے ہرگز خالی نہ ہیں۔ حضرت ابن جریر نے کہا کہ بعض دل پتھر کی طرح ہیں اور بعض پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مرفوعاً ہے کہ تم ذکر اللہ کے سوا بہت باتیں نہ کیا کرو کہ ذکر اللہ سے ہٹ کر باتیں کرنا دلوں کو سخت کر دیتا ہے۔ اور اللہ سے بہت دور دل بھی ایسے ہی لوگوں کے ہوتے ہیں۔ اس کو ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اس کو غریب بتایا ہے۔ بزار کے نزدیک حضرت انس کا مرفوعاً لفظ یہ ہے کہ چار چیزیں بدبختی ہیں۔ ایک آنکھ کا خشک ہونا، دوسرا دل کا سخت ہونا، تیسرا لمبی امید باندھنا، چوتھا دنیا کی حرص۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا

(مومنو) کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہارے (دین کے) قائل ہو جائیں گے (حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلام اللہ (یعنی تورات) کو سنتے پھر اس کے سمجھ لینے کے بعد اس کو جان بوجھ کر بدل دیتے رہے ہیں۔ اور یہ لوگ جب مومنوں

آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٧٦﴾ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٧٧﴾

سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں اور جس وقت آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں جو بات اللہ نے تم پر ظاہر فرمائی ہے وہ تم ان کو اس لیے بتائے دیتے ہو کہ (قیامت کے دن) اسی کے حوالے سے تمہارے پروردگار کے سامنے تم الزام دیں، کیا تم سمجھتے نہیں؟ کیا یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ کو (سب) معلوم ہے۔

فائدہ: ان میں سے جو منافق تھے وہ خوشامد کے لیے اپنی کتاب سے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں مسلمانوں کو بتایا کرتے تھے۔ اور جو مخالف تھے وہ انہیں الزام دیتے تھے کہ تم اپنے علم سے ان کو سند کیوں دیتے ہو۔

تحریف کا جیسا ذکر اس آیت میں ہے۔ ایسا ہی دوسری جگہ پر فرمایا: ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّا لَهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ﴾ "پس ان کے نقض عہد کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ کلمات کو اس کی جگہ سے بدل دیتے تھے۔" اور ان کا یہ بدل دینا عقل و فہم کے بعد تھا۔ لفظ کے کچھ اور ہی معنی بنا لیتے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اللہ کو دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ پھر بجلی گرنے سے مر گئے تھے۔ پھر دوبارہ زندہ ہوئے انہوں نے وہاں پہاڑ پر اللہ کا کلام سنا اور سمجھ لیا تھا۔ جب واپس آئے تو ایک فریق نے اس کو تبدیل کر دیا۔ سدی نے کہا مراد یہ ہے کہ تورات میں تحریف کی حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور حق کو باطل اور باطل کو حق ثابت کیا۔ جب کوئی رشوت لے کر آتا تو اسے کتاب اللہ سے مسئلہ نکال کر بتا دیتے۔ جب کوئی مدعی باطل رشوت لے کر آتا تو اس کو ویسا ہی مسئلہ سمجھا دیتے۔ جب کوئی ایسا شخص آتا جو نہ حقدار ہوتا نہ رشوت دینے والا اور نہ انہیں اس مسئلے سے کچھ سروکار ہوتا تو اس کو درست مسئلہ بتا دیتے۔ اسی بنیاد پر اللہ کریم نے فرمایا: ﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ﴾ "کہ کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھول جاتے ہو۔" یہی حال آجکل کے فقہا کا ہے کہ جس طرح کا مسئلہ کہو کتب فتاویٰ سے نکال کر بتا دیتے ہیں۔ حکم زبانی و تحریری جاری کر دیں۔ حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ وہ مسئلہ بالکل کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہے۔ مگر حجاب رسم و قرابت یا مروت یا مرید و شاگرد یا آمد رشوت یا تحفہ و ہدیہ حق گوئی اور حق نویسی سے مانع ہے۔ (اِنَّ لِلّٰہِ) اگر یہ حالت نہ ہوتی تو اسلام اس حالت کو کس لیے پہنچتا۔

فائدہ: جو تورات وانجیل آجکل یہود ونصاریٰ کے پاس ہے وہ بعض اہل علم کے نزدیک بالکل تبدیل و تحریف شدہ ہے۔الفاظ بدل گئے ہیں۔بعض علماء کے نزدیک وہ تحریف معنوی تھی۔بخاری میں یوں ہی لکھا ہے اسی کو فخر رازی نے اختیار کیا ہے۔تیسرے گروہ نے کہا کہ کسی جگہ لفظ بدلا ہے اور کسی جگہ معنی تبدیل کیے ہیں۔یہی قول حق ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو صرف ایک سورت دی تھی۔باقی تورات اولادِ ہارون علیہ السلام کے پاس رکھوادی تھی۔جب وہ واقعہ بخت نصر میں سب قتل ہوگئے تو حضرت عزیر علیہ السلام نے زبان حفاظ سے کچھ تھوڑی سی تورات جمع کی وہی تورات آجکل موجود ہے۔اس میں کمی بیشی ہے۔ترجمہ خلاف کیا گیا ہے۔اصل کا کہیں اتا پتا نہ ہے۔یہی حال انجیل کا ہے اس کے چار نسخے ہیں۔باہم لفظی اختلاف ہے۔دونوں میں تحریف و تبدیلی ہوگئی ہے۔اب یہ سنا گیا ہے کہ اہل اسلام کے اعتراضات کے دفاع کے لیے نئے سرے سے ترمیم ہوتی رہتی ہے۔اور اعتراض والے مقام کو تبدیل کردیا جاتا ہے۔

((لو مبارک ہو تمہیں میری بھی شامت آئی))

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان لوگوں سے منافق مراد ہیں۔یہ یہودی جب اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے تو کہتے کہ ہم مسلمان ہیں۔سدی نے کہا یہ وہ یہودی تھے جو ایمان لائے پھر منافق ہوگئے۔بہت سے سلف وخلف کا یہی قول ہے۔ابن مصعب نے کہا کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے اس قصبے میں مسلمانوں کے سوا کوئی نہ آئے، تو کفر ونفاق کے رؤساء نے کہا کہ تم بھی جا کر کہو کہ ہم مسلمان ہیں۔پھر جب ہمارے پاس آؤ تو انکار کردو۔وہ لوگ صبح مدینے جاتے عصر کے بعد واپس آجاتے۔پھر ابن وہب نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ﴾ "اور اہل کتاب کی ایک جماعت کہنے لگی کہ جو چیز ایمان والوں پر اتری ہے اس پر دن کے شروع میں ایمان لاؤ اور اس کے آخر میں کفر کردو۔شاید کہ یہ لوگ لوٹ آئیں۔"اور وہ مدینے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خبریں لینے جایا کرتے تھے۔جب پھر کر آتے تو وہی کافر کے کافر ہی رہتے۔مسلمان انہیں مسلمان سمجھتے تھے۔اللہ نے ان کے اس حال کو واضح کردیا۔

فائدہ: فتح سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر ہے۔آپس میں کہا کرتے کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے۔پھر دوسروں کو منع کرتے کہ تم یہ ذکر کسی سے نہ کرنا۔حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ بنو قریظہ کے دن قلعے کے نیچے کھڑے ہوکر فرمایا:((یا اخوان القردة والخنازیر و یا عبدة الطاغوت))اس پر انہوں نے کہا کہ محمد

ﷺ کو یہ خبر کہاں سے ملی ہے تمہیں میں سے کسی نے ان سے کہا ہے۔ تم ان سے اس طرح کیوں کہتے ہو کہ خود تمہی پر ان کی حجت تمام ہو۔ سدی نے کہا کہ تم مسلمانوں سے اپنے سابق عذاب کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ وہ کہیں گے کہ ہم اللہ کے ہاں تم سے زیادہ محبوب و مکرم ہیں۔ اللہ کریم نے فرمایا کہ تمہاری اس تدبیر سے کیا ہوتا ہے تم کہو یا نہ کہو۔ اللہ کو تو سب کھلی اور چھپی باتوں کی خبر ہے۔

((الحمد للّٰہِ یہاں تک پہلے پارے کا نصف تمام ہوا۔))

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٧٨﴾ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ﴿٧٩﴾

اور بعض ان میں ان پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا (اللہ کی) کتاب سے واقف ہی نہیں اور وہ صرف ظن سے کام لیتے ہیں۔ تو ان لوگوں پر افسوس ہے جو اپنے ہاتھ سے تو کتاب لکھتے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے (آئی) ہے تاکہ اس کے عوض تھوڑی سی قیمت (یعنی دنیوی منفعت) حاصل کریں، ان پر افسوس ہے اس لیے کہ (بے اصل باتیں) اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں اور (پھر) ان پر افسوس ہے اس لیے کہ ایسے کام کرتے ہیں۔

فائدہ: یہ وہ لوگ ہیں جو عوام کو ان کی خوشی کے موافق باتیں خود سے بنا کر لکھ دیتے تھے۔ اور اللہ یا اس کے رسول ﷺ طرف نسبت کرتے۔ جیسے اس زمانے کے اہل رائے و قیاس لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں۔ ان کا حال وہی ہے جو پہلے یہود کا حال تھا کہ رشوت لے کر مسئلے گھڑ لیتے۔ کتب فقہ کو دیکھو کہ کن حیلوں بہانوں سے مسئلے تراش کر رکھے ہیں۔ جدھر کہو دین کے فیصلے کی باگ ڈور موڑ دیں۔ جس ناجائز کو کہیں جائز بنا دیں۔ دار الحرب کا نام لے کر سود کھلائیں۔ شراب و نشہ پلا دیں۔ محرم پر زنا کی حد کو ساقط کر دیں۔ نعل نبوی کی تمثال کی پوجا کرائیں۔ قبروں پر چادریں چڑھائیں۔ چراغ جلوائیں۔ غرضیکہ اب سب کچھ ممکن ہے۔ ((انا للّٰہِ وانا الیہ راجعون))

فائدہ: ابن کثیر نے فرمایا اُمّی وہ ہے جو لکھنا نہ جانتا ہو۔ ابو العالیہ، ربیع، قتادہ ابراہیم نخعی وغیرھم کا یہی قول ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو اُمّی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ لکھنا نہ جانتے تھے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ "اور آپ ﷺ اس سے پہلے کوئی کتاب نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔ کہ البتہ شک کرتے باطل پسند۔" حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

((انا امة امية لا نكتبُ و لا نحسب الشهر هكذا و هكذا))"کہ ہم ان پڑھ امت ہیں نہ لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں اور مہینہ اتنا اتنا ہے۔" یعنی ہم عبادات میں حساب و کتاب کے محتاج نہ ہیں۔اور فرمایا:﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ "کہ وہ ذات ہے جس نے امیوں میں انہی میں سے ایک رسول ﷺ مبعوث کیا۔" ابن جریر نے کہا کہ جس کو لکھنا نہ آتا تھا عرب اس کو ماں کی طرف نسبت کرتے کہتے اپنی ماں کی طرح ان پڑھ ہے باپ کی طرف جہل میں نسبت نہ کرتے۔لفظ امانی سے جھوٹی باتیں مراد ہیں۔ بقول ابن عباس، حضرت مجاہد نے فرمایا کہ امیدیں مراد ہیں۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ اللہ سے ایسی آرزو کرتے جو ان کے لیے نہ ہے۔ابن زید نے کہا تمنا کر کے یہ کہتے کہ ہم اہل کتاب ہیں۔ حالانکہ وہ نہیں ہیں یہ اسی طرح ہے جیسے اھل الرائے و قیاس خود کو سنی کہتے ہیں۔ حالانکہ بدعت پر عمل کرنے والے اور سنت کو چھوڑنے والے ہیں۔ابن جریر نے کہا کہ زیادہ درست قول حضرت ابن عباس کا ہے کہ وہ تورات کو کچھ نہ سمجھتے تھے۔ صرف کذب و زور بناتے تھے۔ تمنی سے اس جگہ خود جھوٹ بنانا مراد ہے۔ کسی نے کہا کہ تمنی سے مراد صرف تلاوت ہے کہ صرف تلاوت کرتے عمل سے کچھ نہ واسطہ رکھتے۔

فائدہ: جن کی بربادی کا ذکر فرمایا یہ دوسری قسم ہے۔یہود کی جو ان پڑھوں کے سوا ہے۔ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مکر و کذب کی طرف بلاتے تھے اور اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے۔ دھوکے سے لوگوں کا مال کھاتے تھے۔وَيْلٌ بمعنی ہلاک و مار ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ جہنم کا ایک جنگل ہے یا دوزخ کا زرد پانی ہے۔ حضرت ابو سعید خدری کی مرفوع حدیث ہے۔وَيْلٌ جہنم کی ایک وادی ہے۔ جس کی تہہ میں پہنچنے سے پہلے آدمی چالیس برس تک نیچے گرتا دھنستا چلا جاتا ہے۔[بروایت ابن ابی حاتم] ترمذی نے اس کو روایت کیا ہے اور غریب کہا ہے۔ مگر ابن کثیر نے ترمذی کی سند کو منکر بتایا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مشقت عذاب کو ویل کہتے ہیں۔ خلیل بن احمد نے کہا کہ شدت شر کو ویل کہتے ہیں۔ سیبویہ نے کہا کہ جو ہلاکت میں گرا اس کو ویل کہتے ہیں۔ اصمعی نے کہا وَيْلٌ دکھ ہے۔ کسی نے کہا حزن ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اس سے علمائے یہود و مشرکین مراد ہیں۔ سدی نے کہا کچھ یہودی کتابیں لکھ کر عرب کے ہاتھ فروخت کرتے تھے اور کہتے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور تھوڑی قیمت پر مر جاتے اور دین بیچ دیتے۔ حضرت ابن عباس نے کہا کہ اے مسلمانو! اہل کتاب سے کیا پوچھتے ہو حالانکہ جو کتاب اللہ نے اپنے نبی ﷺ پر نازل کی ہے وہ سب خبریں دیتی ہے اور یہ تر و تازہ ہے جو پرانی نہ ہو گی اور اللہ نے تمہیں بتایا بھی ہے کہ اہل کتاب نے کتاب اللہ کو بدل دیا

ہے۔وہ اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھ کر اللہ کی طرف اس کی نسبت کرتے اور تھوڑی قیمت میں بیچ دیتے۔کیا یہ علم جو تمہارے پاس آیا ہے وہ تمہیں ان سے سوال کرنے سے منع نہیں کرتا ہے۔واللہ ہم انہیں نہیں دیکھتے کہ وہ کبھی تم سے تمہاری کتاب کے متعلق کچھ پوچھتے ہوں۔[بروایت بخاری] حضرت حسن نے فرمایا تھوڑی قیمت سے ساری دنیا مراد ہے۔اور جو کچھ انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا وہ سب کذب وافترا تھا۔اور جو کچھ کما کر کھایا وہ سب حرام ہے۔ تفتازانی نے کہا کہ لفظ ویل کی تکرار اس لیے ہے کہ کتابت وکسب دو گناہ کرتے تھے۔ہر گناہ پر وَیلٌ ہے۔ مجموعی طور پر نہیں۔

فائدہ: سیوطی نے سلف سے کچھ آثار نقل کیے ہیں کہ مصاحف کی بیع مکروہ ہے۔حالانکہ اس میں یہ دلالت نہ ہے پھر ایک جماعت سے بلا کراہت جواز بھی نقل کیا ہے۔

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾

اور کہتے ہیں کہ (دوزخ کی) آگ ہمیں چند روز کے سوا چھو ہی نہیں سکے گی،ان سے پوچھو کیا تم نے اللہ سے اقرار لے رکھا ہے کہ اللہ اپنے اقرار کے خلاف نہیں کرے گا،(نہیں) بلکہ تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں مطلق علم نہیں۔

فائدہ: حضرت ابن عباس نے کہا کہ یہودی کہتے تھے کہ دنیا سات ہزار برس ہے۔ہم ہر ہزار برس کے بدلے ایک دن آگ میں رہیں گے۔اس کے بعد عذاب موقوف ہو جائے گا۔اس پر اللہ کریم نے خالدون تک یہ آیت نازل فرمائی۔دوسرا لفظ یہ ہے کہ کہتے کہ چالیس دن ہم نے بچھڑے کی عبادت کی بس اتنے دن ہم آگ میں رہیں گے اس کے بعد عافیت میں ہوں گے۔تیسرا لفظ یہ ہے کہ چالیس سال آگ میں رہیں گے۔حضرت ابی ہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ فتح خیبر سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ نے یہود کو جمع کر کے فرمایا کہ جہنمی کون ہیں؟وہ بولے کہ ہم دوزخ میں تھوڑا عرصہ رہیں گے پھر ہم نکل آئیں گے اور ہماری جگہ تم ہو گے۔فرمایا تمہارا منہ سیاہ ہو ہم ہر گز تمہاری جگہ نہ ہوں گے۔[الحدیث] اسی طرح بخاری،احمد اور نسائی نے بھی لیث بن سعد کی حدیث سے بیان کیا ہے۔

فائدہ: اس کہنے میں کہ کیا تم نے کوئی اقرار لیا ہے اس میں انکار ہے کہ ان کا دعویٰ باطل ہے کہ وہ چند روز ہی آگ میں رہیں گے۔مطلب یہ ہے کہ نہ تو تمہارا اللہ سے کوئی عہد ہے نہ تم نے کوئی صالح عمل کیا ہے۔جو کہ اس دعوے کو سچا کر دے۔عہد سے اس جگہ وعدہ مراد ہے۔بلکہ تم ہمیشہ آگ میں رہو گے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّأَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ فَأُولٰٓئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُوْنَ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولٰٓئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُوْنَ﴿۸۲﴾

ہاں جو برے کام کرے اور اس کے گناہ (ہر طرف سے) اس کو گھیر لیں تو ایسے لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں (اور) وہ ہمیشہ اس میں (جلتے) رہیں گے۔ اور جو ایمان لائیں اور نیک کام کریں وہ جنت کے مالک ہوں گے اور (ہمیشہ) اس میں (عیش کرتے) رہیں گے۔

فائدہ: فرمایا: بات یوں نہیں ہے جیسے تم تمنا کرتے ہو بلکہ جو گناہ کرتا ہے اور شرمندہ نہیں ہوتا پھر ان گناہوں کو لے کر قیامت میں آئے گا اور سیات سے ہٹ کر کوئی نیکی نہ ہوئی تو وہ آگ میں رہنے والا ہوگا۔ اور جس نے ایمان کے ساتھ نیک عمل بھی کیے وہ اہل جنت سے ہوگا۔ یہ آیت ایسے ہی ہے جیسے فرمایا: ﴿لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوْءًا يُجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيْرًا o وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ وَ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا o﴾ ”نہ کچھ تمہاری آرزوؤں پر ہے نہ اہل کتاب کی آرزو پر جو بھی برا عمل کرے گا اس کو اس کے موافق جزاء دی جائے گی اور وہ اپنے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست نہ پائے گا۔ اور جس نے اچھے عمل کیے وہ مرد ہو یا عورت ہو اور وہ مومن ہو تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ایک تل بھر بھی ظلم نہ کیے جائیں گے۔“ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا گناہ سے مراد یہ ہے کہ تمہارے سے گناہ کیے اور تمہارا سا کفر کیا اور ہر طرف سے انہیں کفر نے گھیر لیا۔ کوئی نیک عمل نہ ہو سکا۔ دوسرا لفظ یہ ہے کہ شرک مراد ہے۔ حضرت مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ وغیرھم نے بھی یہی کہا ہے۔ سدی و حسن نے کہا کہ سیات سے گناہ کبیرہ مراد ہے۔ حضرت مجاہد نے فرمایا یعنی گناہوں نے دل کو گھیر لیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابو وائل اور عطاء نے کہا کہ شرک نے گھیر لیا۔ ربیع بن خیثم نے کہا کہ وہ شخص مراد ہے جس کی موت ہی خطاؤں پر ہوئی اور توبہ بھی نہ کی۔ ابو رزین و سدی کا بھی یہی قول ہے۔ ابو العالیہ، مجاہد و حسن نے یہ بھی کہا کہ انہیں ایسی خطاؤں نے گھیر لیا جو گناہ کبیرہ کو واجب کرتی ہیں۔ حضرت ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ سب اقوال معنی میں ایک دوسرے کے لگ بھگ ہیں۔ پھر حضرت ابن مسعود کی مرفوع حدیث لکھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چھوٹے گناہوں سے بھی بچو کہ یہ آدمی پر جمع ہو کر اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ پھر یہ مثال بیان فرمائی کہ یہ جنگل میں کچھ لوگ اترے، باورچی آیا تو کوئی لکڑی لایا اور کوئی لینے گیا۔ جب ڈھیر جمع ہو گیا اس میں کچھ ڈالا وہ پک گیا۔ [بروایت احمد] یعنی چھوٹے گناہ ہوتے ہوتے گناہ گار کو ہلاک کر دیتے ہیں

۔ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس چیز پر ایمان لایا جس کا تم نے انکار کیا۔جو دین تم نے چھوڑ دیا اس پر عمل کیا۔اس کے لیے جنت ہے۔یعنی خیر وشر کی جزاء اپنے صاحب پر ہمیشہ بلاانقطاع قائم رہے گا۔

فائدہ: اور جو فرمایا کہ ان کو ان کے گناہوں نے گھیر لیا اس سے معلوم ہوا کہ لفظ گناہ سے جہنم واجب نہیں ہو جاتی بلکہ جب گناہ ہر طرف سے گھیر لیتا ہے کوئی نیکی باقی نہیں رہتی ہر جانب سے نجات کے رستے بند ہو جاتے ہیں تب خلود جہنم واجب ہوتا ہے۔اور خطاء سے یہاں شرک مراد ہے۔یہی بات زیادہ مناسب ہے۔اس لیے کہ متواتر حدیث سے پتا چلتا ہے کہ موحدین گناہ گار جہنم سے نکالے جائیں گے تو گویا کہ لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے۔سبب کے خصوص کا اعتبار نہ ہوتا ہے۔مگر اس آیت کا نزول یہود کے متعلق ہوا۔اس سے بھی شرک والے معنی کی تائید ہوتی ہے۔اسی پر مفسرین کا اجماع ہے۔اس سے معتزلہ کا قول بھی باطل ہوا کہ آگ میں ہیشگی مشرکین و کفار کا خاصا ہے کیونکہ اس سے یہ بات متعین ہوگئی کہ اس جگہ سَیِّئَہ و خطیئہ سے کفر و شرک مراد ہے۔کبائر کا ارتکاب مراد نہ ہے۔پہلی آیت میں فَأُولٰئِكَ فرمایا تھا۔دوسری آیت میں أُولٰئِكَ فرمایا معلوم ہوا کہ شرک تو خلود نار کا سبب ہے لیکن ایمان خلود جنت کا سبب نہ ہے۔بلکہ وہ محض فضل ربی پر موقوف ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾	اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہنا، تو چند شخصوں کے سوا تم سب (اس عہد سے) منہ پھیر کر پھر بیٹھے۔......

فائدہ: اقرار مذکور سے بنی اسرائیل عمداً پھر گئے تھے۔وہ اپنے اقرار کو جانتے پہچانتے تھے۔اللہ نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ عبادت میں شرک نہ کریں۔ساری مخلوق کو یہی حکم دیا بلکہ کائنات کی تخلیق کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ خالص توحید کے ساتھ بغیر شرک کے عبادت کریں۔جیسے فرمایا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ "اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہ بھیجا مگر اس کی طرف وحی کرتے ہیں کہ کوئی معبود نہ ہے مگر اللہ تعالیٰ۔پس میری ہی عبادت کرو۔"اور فرمایا: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾"اور تحقیق ہم نے ہر امت میں پیغمبر بھیجا کہ اللہ کی عبادت

کرو، اور طاغوت سے بچو۔ سب حقوق میں سے عمدہ اور بڑا حق یہ ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔" اس کے بعد سب سے زیادہ مخلوق میں سے والدین کا حق ہے۔ اس لیے اللہ کریم نے اپنے حق کے ساتھ والدین کا حق ذکر فرمایا۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ﴾ " یہ کہ میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا، اور میری طرف لوٹنا ہے۔" اور فرمایا: ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ "اور تیرے رب نے فیصلہ کیا کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو اور والدین کے ساتھ نیکی کرو۔" یہاں تک: ﴿وَاٰتِ ذَالْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ "کہ قرابت دار اور مسکین و مسافر کو اس کا حق دے دو۔" صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ سے آیا ہے کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے پیغمبر! ﷺ کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا وقت پر نماز پڑھنا۔ پھر پوچھا کونسا؟ فرمایا: کہ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ پوچھا پھر کونسا عمل ہے؟ فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ نماز اللہ کا حق ہے اور والدین سے نیکی کرنا مخلوق کا حق ہے جسے جہاد سے بھی مقدم رکھا۔ دوسری صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ایک آدمی نے پوچھا کہ میں کس کے ساتھ نیکی اور احسان کروں۔ فرمایا: اپنی ماں سے۔ پوچھا: پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا: اپنی ماں کے ساتھ۔ پھر تیسری دفعہ دریافت کیا تو فرمایا: تیری ماں کے ساتھ۔ پھر پوچھا: تو فرمایا: تیرے باپ کے ساتھ۔ پھر جو تیرا جتنا قریب ہو اس کے ساتھ (نیکی کر)۔ اور جو فرمایا کہ نہ عبادت کرو مگر اللہ کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ یتیم وہ ہے جس کا کوئی باپ دادا کمانے والا نہ ہے۔ اور مسکین وہ ہے جو گھر والوں کے لیے خرچ نہ پاتا ہو۔ اس کا بیان سورۃ نساء کی اس آیت: ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ "کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ نیکی کرو۔" کے تحت آئے گا۔ نیک بات کہنے سے یہ مراد ہے۔ اچھا کلمہ کہے، نرمی سے بات کرے اس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی داخل ہے۔ جس طرح کہ حسن بصری نے فرمایا کہ قول حسن یہ ہے کہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے۔ حلم و عفو کرے درگذر سے کام لے۔ اور ہر نیک عادت جسے اللہ پسند کرے وہ قول حسن ہے۔ ابوذر مرفوعاً فرماتے ہیں کہ کسی نیکی کو حقیر نہ سمجھو اور کچھ نہ پائے تو خندہ پیشانی سے ملے۔ [بروایت مسلم] اس کو مسلم نے صحیح میں ابی عامر سے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے صحیح کہا ہے۔ ابو عامر کا نام صالح بن رستم ہے۔ پہلے فعل حسن کا ذکر کیا ماں باپ اور یتیم و مسکین سے اچھا سلوک کرو۔ پھر قول حسن کا تذکرہ کیا اور قولی و فعلی احسان کو جمع کر دیا۔ اپنی عبادت اور مخلوق کے ساتھ اچھے برتاؤ کو نماز و زکوٰۃ پر مقدم و موکد کیا

ہے۔ پھر خبر دی کہ بنی اسرائیل نے یہ سارے کام چھوڑ دیئے تھے۔ سب نے جاننے کے باوجود اس سے اعراض کیا۔ مگر چند ایک لوگ اپنے اقرار پر قائم رہے تھے۔

فائدہ: اللہ کریم نے امت محمدیہ ﷺ کو بھی اسی کا حکم دیا۔ فرمایا:﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ ذِي الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا﴾ "اور صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیکی کرو اور قرابت والوں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں اور قرابت دار ہمسایہ سے اور اجنبی ہمسایہ سے اور ساتھ کے رفیق سے اور مسافروں سے بھی (نیکی کرو۔) اور جو تمہارے دائیں یا تو مالک ہوئے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اترانے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا ہے۔" ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ان احکام پر جس طرح اس امت نے قیام کیا اس جیسا قیام گذشتہ امتوں میں سے کسی نے نہ کیا۔ میں کہتا ہوں کماحقہ قیام سلف نے کیا تھا۔ خلف میں وہ چستی نہ رہی الا ما شاء اللہ ۔ پھر جو قدرت و امکان کے باوجود ان امور پر قیام اختیار نہیں کرتا گویا اس میں یہودیت جیسی سرکشی انگڑائیاں لے رہی ہے اور وہ بنی اسرائیل کے سے جہل کا نمونہ ہے۔

فائدہ: ابن ابی حاتم نے اس جگہ ایک غریب روایت نقل کی ہے کہ اسد بن وداعہ جب گھر سے نکلتے تو جو یہودی یا نصرانی ملتا اسے بھی سلام کہتے۔ جب ان سے کہا گیا کہ تم ایسا کام کیوں کرتے ہو؟ کیا اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ "کہ لوگوں سے اچھی بات کہو۔" اس سے سلام ہی مراد ہے۔ عطاء خراسانی سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ سنت صحیحہ میں ثابت ہو چکا کہ اہل کتاب سے سلام میں پہل نہ کرے اگر وہ سلام کریں تو وعلیکم کہے۔ لیکن اس زمانے میں اسلام غریب ہونے کے سبب یہ سنت متروک ہو گئی ہے۔

فائدہ: یہ اقرار جو اللہ کریم نے بنی اسرائیل سے لیا تھا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہوا تھا۔ یہ وہی اقرار ہے کہ اللہ کی خالص عبادت کی جائے جس میں شرک کا شائبہ نہ ہو اور والدین کے ساتھ احسان کیا جائے۔ خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہوں۔ اور ان کا وہ ہر حکم جس میں اللہ کی نافرمانی کا خطرہ نہ ہو بجالانا ضروری ہے۔ اگر وہ ضرورت مند ہوں تو صلہ رحمی بھی کرے۔ اگر کافر ہوں تو ادب و احترام کا لحاظ رکھ کر انہیں دعوت اسلام بھی دے۔ اگر فاسق ہوں تو بغیر کسی سختی کے انہیں خیر کا حکم دے۔ اُف تک نہ کہے۔

فائدہ: کسی نے کہا قول حسن سے توحید مراد ہے۔ یا صدق یا خلق حسن مراد ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ قول کوئی خاص قسم نہ ہے بلکہ جو چیز بھی شرعاً اچھی ہو وہ اس کی مصداق ہے۔ اور قُوْلُوْا کا لفظی خطاب یہود کو ہے۔ خواہ ان کو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ہوں یا ان کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے۔ غرضیکہ اللہ کریم نے بنی اسرائیل کو یہ آٹھ حکم دیئے تھے لیکن وہ ان پر قائم نہ رہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۸۵﴾

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا اور اپنے کو ان کے وطن سے نہ نکالنا تو تم نے اقرار کر لیا اور تم (اس بات کے) گواہ ہو۔ پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو اور اپنے میں سے بعض لوگوں پر گناہ اور ظلم سے چڑھائی کر کے انہیں وطن سے نکال بھی دیتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم کو حرام تھا (یہ) کیا (بات ہے کہ) تم کتاب (اللہ) کے بعض احکام کو تو مانتے ہو اور بعض سے انکار کیے دیتے ہو تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں اور جو کام تم کرتے ہو اللہ ان سے غافل نہیں۔

فائدہ: یعنی خود قوم کو تنگ کرنے میں کوئی کمی نہ چھوڑتے لیکن اگر وہ کسی کے پاس قیدی بن جاتے تو فدیہ دے کر چھڑا لیتے تھے۔ فرمایا کہ اگر اللہ کا حکم ہی ماننا ہے تو دونوں جگہ اطاعت کرو۔ حضرت ابن کثیر فرماتے ہیں اس آیت میں ان یہود کی مذمت کی گئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے۔ اوس اور خزرج دونوں قبائل سے خانہ جنگی کی آگ سلگاتے رہتے یہ دونوں قبائل جاہلیت میں بت پرست تھے۔ باہم جھگڑتے رہتے تھے۔ یہود مدینہ تین قبیلے تھے۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر دو قبیلے خزرج کے حلیف تھے اور بنو قریظہ اوس کے حلیف تھے۔ جب لڑائی ہوتی تو ہر قبیلہ اپنے حلیفوں کے ساتھ لڑتا۔ یہودی اپنے دشمن کو قتل کرتا کبھی

دوسرے یہودی کو بھی مار ڈالتے حالانکہ کتاب کی نص سے یہ بات ثابت تھی کہ یہودی کا یہودی کو قتل کرنا حرام تھا۔ مگر وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے گھروں سے نکال دیتے ان کا مال لوٹ لیتا۔ پھر جب لڑائی ہو چکتی تو مغلوب سے اپنے قیدی چھڑا لیتے اور کہتے کہ یہ تورات کے حکم کی وجہ سے ہم ایسا کرتے ہیں۔ اسی لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ تم کتاب کے بعض حصے کو تو مانتے ہو لیکن بعض کا انکار کرتے ہو۔ ہمارا تمہارا وعدہ تو یہ تھا نہ کسی کو قتل کرو گے نہ ان کے گھروں سے نکالو۔ نہ ان پر چڑھائی کرو، جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ﴾ ''کہ اپنے پروردگار کی طرف توبہ کرو پس اپنے نفسوں کو قتل نہ کرو۔ یہ تمہارے لیے تمہارے خالق کے ہاں بہتر ہے۔'' یہ اس لیے فرمایا کہ ایک دین والے ایک جان کی طرح ہوتے ہیں جس طرح کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی محبت و دوستی میں ایک جسم کی سی مثال ہے کہ اگر ایک عضو بیمار ہوا تو سارا جسم گرم ہو گیا۔ (بے چینی محسوس کرنے لگا)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴿۸۶﴾	یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی، سو نہ تو ان سے عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو اور طرح کی مدد ملے گی۔

فائدہ: پہلی آیت سے لے کر یہاں تک یہودیوں کی مذمت ہے کہ جس تورات کو وہ خود صحیح کہتے ہیں خود اس کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی اس تورات پر اور ان کی نقل پر کوئی اعتماد نہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا جو حال بعثت و مخرج و ہجرت کے حوالے سے مذکور تھا وہ سب کچھ چھپا گئے، گم کر دیا اور گذشتہ پیغمبروں نے نبی علیہ السلام کے متعلق جو خبریں دی تھیں ان نااہلوں نے آپس میں بھی اسے پوشیدہ رکھا۔ اسی لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ ان کے اس جرم کی سزا دنیا میں ذلت و رسوائی بتائی اور آخرت میں دردناک عذاب کی وعید سنائی۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ اللہ پر ان کے ایسے کام مخفی رہیں۔ بلکہ انہوں نے دنیا کو آخرت کے بدلے خریدا پھر اب ایک ساعت بھی ان کے عذاب سے تخفیف نہ کی جائے گی۔ اور نہ انہیں کوئی اس مصیبت سے نجات دے گا۔ فتح البیان میں فرمایا کہ دنیا میں یہ رسوائی ہوئی کہ مار پیٹ کا بازار گرم ہوا ذلت اٹھانا پڑی، جزیہ دینا منظور کیا، وطن چھوڑا، پھر بنو قریظہ قتل ہوئے، قید میں پھنسے اور بنو نظیر جلاوطن ہو کر اریحا اور ان کھیتوں میں چلے گئے جو شام کی زمین میں تھے۔ آخرت کا عذاب الگ ہے گویا انہیں دونوں جہاں کی ذلت و رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿٨٧﴾

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی اور ان کے پیچھے یکے بعد دیگرے پیغمبر بھیجتے رہے اور عیسیٰ بن مریم کو کھلے نشانات بخشے اور روح القدس (یعنی جبرئیل) سے ان کو مدد دی، تو جب کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسی باتیں لے کر آئے جن کو تمہارے جی نہیں چاہتا تھا تو تم سرکش ہو جاتے رہے اور ایک گروہ (انبیاء) کو تو جھٹلاتے رہے اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔

فائدہ: کتاب سے تورات مراد ہے۔ جس کو خود انہوں نے تبدیل کر ڈالا تھا۔ اس کے خلاف عمل کیا ، پھر جو رسول و نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے وہ انہیں کی شریعت کے موافق عمل کرنے کی تاکید کرتے رہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ﴾ "کہ ہم نے بلا شبہ تورات نازل کی ہے اس میں ہدایت اور نور ہے۔ جس کے ساتھ فرمانبردار نبی یہودیوں کو حکم دیتے رہے اور درویش اور عالم بھی (حکم دیتے رہے) اس لیے کہ انہیں کتاب کی حفاظت سونپی گئی تھی۔ اور وہ اس پر گواہ تھے۔" رسولوں کو اوپر تلے بھیجنے کا یہی مطلب ہوا۔ سدی نے کہا کہ قَفَّيْنَا کے معنی اتبعنا ہیں۔ کسی نے کہا أَرْدَفْنَا بہر حال مطلب دونوں کا قریب قریب ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَى ﴾ حتیٰ کہ انبیاء بنی اسرائیل کا آخر حضرت عیسیٰ بن مریم رضی اللہ عنہما پر ہوا۔ یہ بعض ایسے احکام لاتے تھے جو تورات سے ہٹ کر تھے۔ اس لیے اللہ کریم نے انہیں معجزات بھی دیئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ مٹی کا پرندہ بنا کر اس میں روح پھونکتے تھے، بیمار کو تندرست کرتے اور حضرت روح القدس کی تائید سے غیب کی خبریں دیتے۔۔ روح القدس سے جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ وہ ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے اور یہ سب شان اس لیے دیا کہ بنی اسرائیل ان کی تصدیق کریں مگر انہوں نے تورات کے بعض احکام کی مخالفت کی وجہ سے ان سے حسد کیا۔ اور ان کو جھٹلا دیا اور ان کے دشمن ہو گئے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق خبر دیتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ﴾ "اور تاکہ میں تم پر وہ بعض چیزیں حلال کر دوں جو تم پر حرام تھیں اور تمہارے پاس تمہارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں۔" غرضیکہ بنی اسرائیل کا انبیاء سے بہت برا معاملہ رہا ہے۔ اگر ایک گروہ کو جھٹلاتے تو دوسرے کو قتل کر دیتے۔ اور

اس برتاؤ کی وجہ یہ تھی کہ وہ انہیں احکام تورات کو مضبوط تھامنے کا درس دیتے تھے اور جو تصرفات انہوں نے اپنی طرف سے تورات میں کر لیے تھے اس سے منع کرتے تھے۔ اسی بات نے ان پر جلتی پر تیل کا کام کیا اس لیے انہوں نے بعض کو تو صاف جھٹلا دیا اور بعض کو قتل ہی کر دیا۔ یہود کی یہ خصلت اس امت کے اخیر زمانہ میں پھیل گئی ہے جو اہل رائے و بدعت سے کہتا ہے کہ تم قرآن و حدیث پر چلو تو وہ اس کے جان و مال کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اس کو قتل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں جو ان کے تصرفات کی حقیقت مسائل شرع کی روشنی میں حل کر دیتا ہے اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ غرضیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نہ تم بالشت بالشت کے برابر یہود کی چال پر چلو گے۔ سچ ہوا کہ مقلدین مذاہب لوگوں نے ایسا ہی کیا۔

فائدہ: صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے کہا کہ اس جگہ روح القدس سے جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ اس قول کی دلیل پر ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ﴾ "اس کو لے کر روح الامین آپ کے دل پر نازل ہوئے تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔" بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے تعلیقاً روایت ہے کہ انہوں نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا: ((اَللّٰهُمَّ اَیِّدْ حَسَّانَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ)) بعض روایت میں یہ لفظ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((هَاجِهِمْ یا هُجُهُمْ وَجِبْرِیْلُ مَعَكَ))

فیض روح القدس ارباز مدد فرماید دیگران هم بکنند الخر سچا میکدو

شہر بن حوشب نے کہا کہ کچھ یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ہمیں بتائیے روح کیا ہے؟ فرمایا تمہیں اللہ کی قسم! اور بنی اسرائیل میں اللہ کے ایام کی قسم تم جانتے ہو کہ روح جبریل علیہ السلام ہیں۔ بولے، ہاں۔ صحیح ابن حبان میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ: ((ان روح القدس نفث فی روعی انه لن تموت نفس حتی تستکمل رزقها فاتقو الله احملو فی الطب)) ابن جریر نے کہا یہی قول راجح ہے۔ اس کے سوا اور بھی اقوال ہیں جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا روح القدس وہ اسم اعظم ہے جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ کسی نے کہا روح ملائکہ پر محافظ ہے۔ ربیع بن انس نے کہا کہ قدس سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات مراد ہے۔ حضرت مجاہد و حسن نے کہا کہ قدس اللہ تعالیٰ ہیں اور جبریل علیہ السلام اس کی روح ہیں۔

صدای شہپر جبیل عشق پر ساعت زجنبش دل پر اضطراب می شنوم

سدی نے کہا قدس بمعنی برکت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بمعنی طہر ہے۔ کسی نے کہا

کہ روح انجیل ہے جیسا کہ قرآن بھی روح ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ ''اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے تیری طرف روح بھیجا۔'' لیکن درست یہی ہے کہ پہلا قول زیادہ درست ہے۔ اس لیے کہ ﴿اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ سے بھی انجیل مراد لی جائے تو کلام اللہ میں بلا ضرورت تکرار لازم آئے گا۔ زمخشری نے کہا کہ روح کی صفت قدس ہے۔ یعنی روح مقدسہ۔ گویا کہ خود نفس مطہرہ عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ مگر درست بات اوپر مذکور ہو چکی ہے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: پیغمبروں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد لگا تار آنا بطریق تبعیت تھا۔ بطریق استقلال نہ تھا۔ زمانہ عیسوی تک مسلسل انبیاء آتے رہے۔ شریعت ایک ہی تھی۔ سب انبیاء تورات ہی کی طرف بلاتے رہے۔ جیسے شمویل، الیاس، منشائل، الیسع، یونس، زکریا، یحییٰ، شعیا، حزقیل، داؤد، سلیمان، ارمیا، عیسیٰ علیہم السلام۔ اللہ کریم نے ان سب کو امت موسیٰ میں سے چن لیا۔ ان سب سے یہ اقرار لیا تھا کہ محمد ﷺ اور ان کی امت کی صفات و تذکرہ لوگوں تک پہنچادو۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو معجزے عطا کیے تھے ان کا ذکر آل عمران اور مائدہ میں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام سریانی زبان میں یشوع ہے۔ مریم کے معنی خادم ہیں۔ یہ اللہ کے گھر کی خادمہ تھیں۔ عبرانی زبان میں مریم اس کو کہتے ہیں جو مرد سے لگاؤ نہ رکھے۔ سیوطی رحمہ اللہ نے ''تحبیر'' میں لکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ایک ہزار نو سو پچیس برس گذرے تھے۔

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ﴿۸۸﴾ اور کہتے ہیں ہمارے دل پردے میں ہیں، (نہیں) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت کر رکھی ہے، پس یہ تھوڑے ہی پر ایمان لاتے ہیں۔

فائدہ: یہود اپنی تعریف کے طور پر کہا کرتے کہ ہمارے دلوں پر پردہ ہے۔ اپنے دین کے سوا اس میں کچھ داخل نہ ہو سکتا ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا کہ حق بات کا اثر نہ کرنا ملعون ہونے کی علامت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا پردہ ہے سے مراد یہ ہے کہ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ دوسرا لفظ یہ ہے کہ دل پر مہر لگ گئی ہے۔ سدی نے کہا پردہ پڑ گیا ہے۔ یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ﴾ ''اور کہتے کہ ہمارے دل اس چیز سے پردے میں ہیں۔ جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے۔'' ابن جریر نے اسی کو راجح بتایا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں دل کی چار اقسام مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک اغلف ہے جو پردے میں ہے۔ جس پر اللہ کا غصہ نازل ہوا اور یہ کافر کا دل ہے۔ حضرت حسن نے فرمایا اس دل نہ فتنہ نہیں ہوا۔ یعنی خیر سے دور اور طہارت سے رکا ہوا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ (وہ کہتے ہیں کہ) ہمارے دل بھرے ہیں علم محمد

ﷺ کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے ہیں۔ اس پر اللہ نے لعنت کی، جیسے سورۃ نساء میں فرمایا: ﴿وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ "اور ان کے اس کہنے پر کہ ہمارے دل پردے میں ہیں، بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر مہر لگادی ہے۔ پس وہ تھوڑا ہی ایمان لاتے ہیں۔" یعنی ایماندار کم اور کفر پسند بہت ہیں یا ان کا ایمان تھوڑا ہے۔ یعنی قیامت اور جزاء و سزا پر کم ہی ایمان رکھتے ہیں۔ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام لائے اسے مانتے ہیں لیکن جو نبی کریم ﷺ لائے اس کو نہیں مانتے۔ پھر موجودہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر انکار کی صورت میں گذشتہ ایمان کا کیا فائدہ دے سکتا ہے۔ بعض نے کہا کہ قلیل سے مراد یہ ہے کہ وہ کچھ بھی ایمان نہ لائے ہیں۔ سب کے سب منکر ہو رہے ہیں جیسے یہ محاورہ: ((من زنی بارض فلما تبت یعنی لا تنبت شیئا)) یعنی جس زمین میں حرام کاری ہوتی ہے اس میں پیداواری نہیں ہوتی۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٨٩﴾	اور جب اللہ کے ہاں سے ان کے پاس کتاب آئی جو ان کی (آسمانی) کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے اور وہ پہلے (ہمیشہ) کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے، تو جس چیز کو وہ خوب پہچانتے تھے جب ان کے پاس آ پہنچی تو اس سے کافر ہو گئے پس کافروں پر اللہ کی لعنت۔

فائدہ: یہودی جب کافروں کا غلبہ دیکھتے تو دعا مانگتے کہ نبی آخر الزمان جلد ظاہر ہوں، پھر جب وہ آ چکے تو خود ہی ان کے منکر ہو گئے۔ کتاب سے یہاں قرآن مراد ہے۔ یہ قرآن تورات کی تصدیق کرتا ہے۔ محمد بن اسحٰق نے نقل کیا کہ یہ آیت انصار و یہود کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ وہ یہود جو انصار کے ہمسائیگی میں رہتے تھے، انصار فرماتے ہیں کہ ہم مدت تک زمانہ جاہلیت میں ان پر غالب رہے۔ ہم مشرک تھے اور وہ اہل کتاب وہ کہا کرتے تھے کہ اب عنقریب ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے ہم اس کے ساتھ مل کر تمہیں عاد و ارم کی طرح قتل کریں گے۔ جب کہ اللہ کریم نے رسول اللہ ﷺ کو قریش میں ظاہر کیا تو ہم نے ان کی پیروی کی تو یہ منکر ہو گئے۔ اس آیت کا یہی معنی ہے کہ پہچان کر بھی کافر بن گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب انہوں نے دیکھا کہ آخری نبی یہود میں سے نہیں بلکہ غیر یہود سے مبعوث ہوا ہے تو حسد کر کے کفر کر دیا۔ بقول ابو العالیہ ورنہ یہ کہا کرتے تھے کہ اے اللہ! اس آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کر جس کو ہم اپنے پاس تورات میں لکھا ہوا پاتے ہیں تاکہ ہم مشرکین کو قتل کریں اور انہیں سخت اذیت دیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہچان کر بھی نہ ماننا لعنت کا موجب ہے۔ یہ مقام

بڑے خوف کا ہے جسے انہوں نے ہلکا سمجھ لیا ہے۔ قرآن وحدیث کا اتباع فرض ہے۔اور اس فرض کو مسلمانوں نے اس دن سے سمجھ لیا ہے جس دن قرآن اترا اور سنت فراہم ہوئی۔ مگر اس معاملے میں مخلوق اکثر سستی کرتی ہے۔ جاہل لوگ تقلید کو واجب سمجھے بیٹھے ہیں۔ رائے اور قیاس کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ یہ یہودیت کا ایک شعبہ ہے جو بعض افرادِ امت میں آگیا ہے کیونکہ اصل میں تقلید یہود ہی کا کام تھا جیسا کہ قرآن کریم نے ثابت کیا۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ أَنْ يَكْفُرُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَنْ يُنَزِّلَ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ فَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَى غَضَبٍ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۹۰﴾

جس چیز کے بدلے انہوں نے اپنے تئیں بیچ ڈالا وہ بہت بری ہے یعنی اس جلن سے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنی مہربانی سے نازل فرماتا ہے، اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب سے کفر کرنے لگے تو وہ (اس کے) غضب بالائے غضب میں مبتلا ہو گئے، اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

فائدہ: حضرت مجاہد نے فرمایا کہ یہود نے حق دے کر باطل کو خرید لیا اور نبی علیہ السلام کی صفت چھپائی۔ سدی نے کہا کہ قرآن کا انکار کر دیا۔ تصدیق اور نصرت نبوی ﷺ سے کنارہ کش رہے۔ اور اسی کی وجہ وہ کراہیت وحسد اور سرکشی تھی کہ اللہ کا کلام ان لوگوں پر کیوں نازل ہوا اس سے بڑھ کر اور کیا حسد ہوگا ابن عباس نے فرمایا: ایک غضب اس لیے ہوا کہ انہوں نے تورات کو ضائع کر دیا، دوسرے غضب کا سبب نبی علیہ السلام کی رسالت کا انکار کرنا ہے۔ کمالا نے سے یہ مراد ہے کہ وہ اللہ کے دوہرے غضب کے مستحق ہو۔ ابو العالیہ نے کہا پہلا غصہ یہ ہے کہ انجیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا۔ دوسرا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قران کا انکار کیا۔ عکرمہ وقتادہ کا بھی یہی قول ہے ۔سدی نے کہا پہلا غضب بچھڑے کی عبادت پر تھا اور دوسرا غضب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے کی وجہ سے ہوا۔ ذلت کے عذاب کی وجہ یہ تھی کہ عذاب کا سبب حسد و سرکشی تھا جو تکبر کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔ اس لیے تکبر کے مقابلے میں ذلت کا عذاب ان کے لیے منتخب کیا گیا۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾ "یعنی ذلیل وخوار وحقیر ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔" آیت کا معنی بھی یہی ہے کہ وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب وہ ذلت کی حالت میں جہنم رسید ہوں گے۔ امام احمد نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ متکبر لوگ قیامت والے دن آدمیوں کی شکل میں چیونٹیوں جتنی جسامت میں میدان محشر میں لائے جائیں گے۔ ہر طرح کی ذلت و پستی میں گھرے ہوں گے۔ حتیٰ کہ جہنم میں بولس نامی ایک قید خانہ میں قید کر دیئے جائیں گے۔ وہاں ان پر سخت آگ ان پر مسلط کی جائے گی اور جہنمیوں کی پیپ انہیں پلائی جائے گی۔ اعاذ نا اللہ.

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَهُمْ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو (کتاب) اللہ نے (اب) نازل فرمائی ہے اس کو مانو تو کہتے ہیں کہ جو کتاب ہم پر (پہلے) نازل ہو چکی ہے ہم تو اسی کو مانتے ہیں (یعنی) یہ اس کے سوا اور (کتاب) کو نہیں مانتے، حالانکہ وہ (سراسر) سچی ہے اور جو ان کی (آسمانی) کتاب ہے اس کی بھی تصدیق کرتی ہے، (ان سے) کہہ دو کہ اگر تم صاحب ایمان ہوتے تو اللہ کے پیغمبروں کو پہلے ہی کیوں قتل کیا کرتے۔

فائدہ: یہود و نصاریٰ مراد ہیں ان کا قول یہ تھا کہ ہمیں تورات اور انجیل پر ایمان لانا کافی ہے۔ ہم قرآن کو نہیں مانتے۔ حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ یہ قران تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے۔ جب پھر اس کا مصدق ہونا معلوم ہو گیا تو حجت قائم ہو گئی۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتَابَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ﴾ "کہ وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اس کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔" پھر اللہ کریم نے ان پر الزام ثابت کیا کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ ہم تورات اور انجیل پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر انبیاء کو قتل کیوں کرتے تھے۔ آخر ان کی آواز بھی تو یہی تھی کہ تورات سچی ہے اور یہی بات تمہیں بھی معلوم تھی۔ پھر ان کے قتل کرنے کی وجہ اگر بغض و عناد نہ تھی تو اور کیا وجہ تھی کہ تم نے ان کو قتل کر دیا۔ معلوم ہوا کہ تم لوگ من مانی پسند کرتے ہو۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿اَفَکُلَّمَا جَآئَکُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ فَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ "کیا پھر جب بھی تمہارے پاس پیغمبر ایسی چیز لائے جس کی طرف تمہارے نفس نہ جھکتے تھے تو تم نے تکبر کر دیا پھر ایک گروہ کو جھٹلا دیا اور ایک گروہ کو قتل کر دیا۔" سدی نے کہا کہ اللہ کریم نے انہیں اس آیت میں قتل انبیاء پر عار دلائی ہے۔

فتح البیان میں ہے کہ اگرچہ بظاہر یہ حاضرین کو خطاب ہے مگر مراد ان کے اسلاف ہی ہیں۔ کیونکہ جب یہ ان کے فعل پر راضی ہو گئے تو گویا ان کی طرح ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ معصیت پر راضی ہونے والا بھی معصیت کرنے والے کی طرح ہے۔

وَلَقَدْ جَاءَكُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِ وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٩٢﴾

اور موسیٰ تمہارے پاس کھلے ہوئے معجزات لے کر آئے تو تم ان کے (کوہ طور پر جانے کے) بعد بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے اور تم (اپنے ہی حق میں) ظلم کرتے تھے۔

فائدہ: بیّنات سے واضح آیات اور قطعی دلائل مراد ہیں۔اس بات پر وہ دلائل ہیں کہ وہ اللہ کے پیغمبر علیہ السلام ہیں اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہ ہے۔وہ نشانیاں یہی طوفان کا آنا، ٹڈیوں کا عذاب، مینڈک، خون کا عذاب اور عصا، من و سلویٰ، بادلوں کا سایہ ،دریا پھٹنا، پتھر سے چشمے پھوٹنا وغیرہ تھیں۔اس کے باوجود جونہی حضرت موسیٰ علیہ السلام ہمارے وعدے پر طور پر گئے تو تم نے بچھڑے کی عبادت شروع کرلی۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا:﴿وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰی مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهٗ خُوَارٌ ﴾"اور قوم موسیٰ نے اس کے بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑے کا دھڑ بنالیا اس (میں) گائے کی آواز تھی۔ سو تم عبادت عجل میں ظالم ہو اس لیے کہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔" جیسے اللہ کریم نے فرمایا بلاشبہ شرک ظلم عظیم ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۝۹۳	اور جب ہم نے تم (لوگوں) سے عہد واثق لیا اور کوہ طور کو تم پر اٹھا کھڑا کیا (اور حکم دیا کہ) جو (کتاب) ہم نے تم کو دی ہے اس کو زور سے پکڑو اور (اور جو تمہیں حکم ہوتا ہے اس کو) سنو تو وہ (جو تمہارے بڑے تھے) کہنے لگے کہ ہم نے سن تو لیا لیکن مانتے نہیں اور ان کے کفر کے سبب بچھڑا (گویا) ان کے دلوں میں رچ گیا تھا (اے پیغمبران سے) کہہ دو کہ اگر تم مومن ہو تو تمہارا ایمان تم کو بری بات بتاتا ہے۔

فائدہ: ضمنی طور پر اس آیت کی تفسیر گذر چکی ہے۔اللہ کریم ان کی غلطیوں کو شمار کر رہا ہے۔ بچھڑے کا رچ بس جانا یہ ہے کہ دل میں اس کی محبت گھس گئی۔ حضرت ابو الدرداء کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ کسی چیز کی محبت تجھے اندھا بہرا کر دے گی۔ بروایت احمد۔ سدی نے کہا کہ حضرت موسیٰ نے اس بچھڑے کو ریتی سے رگڑ کر ریت بنایا اور اس برادے کو دریا میں پھینک دیا۔اس دن جو دریا بہتا تھا اس میں سے اس کے اندر جا ملا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اس کا پانی پیو۔ سب نے پانی پیا۔پھر جس کے دل میں بچھڑے کی محبت تھی اس کی مونچھوں پر سونے کا اثر ہوا۔اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے دلوں میں اس کی محبت پلائے گئے۔ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جس کسی نے وہ پانی پیا وہ بچھڑے سے محبت کرتے تھے۔اس کا چہرہ سونے کی طرح زرد ہو گیا۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا کہ ان کا چہرہ زعفران کی طرح ہو گیا۔ قرطبی نے کتاب قشیری سے نقل کیا ہے کہ جس بچھڑے کی محبت کرنے والے نے اس پانی کو پیا وہ دیوانہ ہو گیا۔پھر فرمایا کہ یہاں یہ مقصود نہ ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو اکہ اس کا اثر ان کے لب و چہرے پر ظاہر ہوا۔حالانکہ یہاں پر ذکر کرنا مراد ہے کہ ان کے دل میں بچھڑے کی

محبت گھس گئی۔ یعنی اس وقت کہ جب وہ بچھڑے کی عبادت کرتے تھے۔ پھر اللہ کریم نے فرمایا کہ اتنے برے کاموں کے باوجود تم ایمان کے دعوے دار ہو۔ در حقیقت تم مومن نہ ہو۔ اس لیے کہ کسی طرح بھی ایمان کا یہ تقاضا نہ ہے کہ تم بچھڑے کی عبادت کرو یا محمد ﷺ کی تکذیب کرو۔

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾

کہہ دو کہ کہ اگر آخرت کا گھر اور لوگوں (یعنی مسلمانوں) کے لیے نہیں اور اللہ کے نزدیک تمہارے ہی لیے مخصوص ہے تو اگر سچے ہو تو موت کی آرزو تو کرو۔ لیکن ان اعمال کی وجہ سے جو ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں یہ کبھی اس کی آرزو نہیں کریں گے اور اللہ ظالموں سے (خوب) واقف ہے۔ بلکہ ان کو تم اور لوگوں سے زندگی کے کہیں حریص دیکھو گے یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی، ان میں سے ہر ایک یہی خواہش کرتا ہے کہ کاش وہ ہزار برس جیتا رہے مگر اتنی لمبی عمر اس کو مل بھی جائے تو اسے عذاب سے نہیں چھڑا سکتی اور جو کام یہ کرتے ہیں اللہ ان کو دیکھ رہا ہے۔

فائدہ: وہ کہتے تھے کہ ہمیں عذاب نہ ہوگا اور جنت میں بھی ہمارے سوا کوئی نہ جائے گا۔ اللہ کریم نے فرمایا اگر تم یقیناً جنتی ہو تو پھر مرنے سے کیوں ڈرتے ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ تم ان سے یہ بات کہہ دو کہ موت کی دعا کرو۔ یعنی بددعا کرو کہ جو جھوٹا ہے وہ موت کو چکھے۔ انہوں نے یہ نہ مانا اور اگر ایک دن بھی وہ ایسی تمنا کر دیتے تو جتنے یہودی روئے زمین پر ہوتے تو ایک بھی زندہ نہ بچتا۔ تمنائے موت سے موت کا سوال مراد ہے۔ ابن جریر نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اگر یہودی موت کی تمنا کرتے تو یہ لوگ مر جاتے اور آگ میں اپنا ٹھکانا دیکھ لیتے۔ اور جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مباہلے کو گئے تھے وہ اگر پھرتے تو اہل و مال کچھ نہ پاتے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا پہلا قول متعین ہے۔ یعنی فریقین میں سے جو جھوٹا ہو اس پر مباہلے میں بددعا کرو۔ اسی طرح سورۃ جمعہ میں یہ آیت بھی مذکور ہے جو فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظّٰلِمِينَ ۝ قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِينَ تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَى عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ "کہ اے

یہودیو! اگر تم خیال کرتے ہو کہ تم اللہ کے دوست ہو لوگوں کے علاوہ تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔ اور وہ ہرگز اس کی تمنا نہ کریں گے اس وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو جاننے والا ہے۔ کہہ دیجئے! بے شک یہ وہ موت ہے جس سے تم بھاگتے ہو بلاشبہ وہ تمہیں ملنے والی ہے۔ پھر تم لوٹائے جاؤ گے اس غیب اور حاضر کے جاننے والے کی طرف، پھر وہ تمہیں تمہارے کیے اعمال کی خبر دے گا۔" غرضیکہ انہوں نے یہ گمان کر لیا تھا کہ وہ اللہ کے محبوب اور اس کے بیٹے ہیں۔ اور کہا کہ جنت میں صرف یہودی و عیسائی جائیں گے تو انہیں بد دعا اور مباہلہ کرنے کیلیے بلایا گیا۔ جب وہ نکل بھاگے تو سب نے جان لیا کہ وہی ظالم ہیں کیونکہ اگر انہیں اپنے صدق پر یقین تھا تو انہوں نے پیش قدمی کیوں نہ کی۔ اسپر معلوم ہوا کہ وہ جھوٹے اور دغا باز ہیں۔

ابن کثیر نے فرمایا یہ اسی طرح کی بات ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفدِ نجران کو قیامِ حجت کے بعد مناظرے میں مباہلے کی طرف بلایا اور مباہلہ کی آیت اتری تو انہوں نے آپس میں یہ بات کہی کہ اگر تم نے اس نبی ﷺ سے مباہلہ کیا تو تم میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہے گا۔ ناچار ہو کر صلح کر لی اور جزیہ ادا کرنے پر راضی ہو گئے۔ اسی کے قریب وہ آیت ہے جو مشرکین سے کہی گئی: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا﴾ "کہہ دیجئے کہ جو گمراہی میں ہے پس چاہئے کہ اس کو رحمٰن کھینچ لے لمبا۔" یعنی ہم میں اور تم میں جو گمراہ ہو گا اللہ اس کی گمراہی زیادہ کر دے گا۔

حافظ ابن القیم نے مسئلہ صفاتِ الٰہی میں منکرین صفات سے مباہلہ کرنا چاہا مگر وہ تیار نہ ہوئے۔ اسی طرح اہل علم کی ایک جماعت نے اہل بدعت سے ضلالت سے اپنے اپنے وقت میں مباہلے کا ارادہ کیا مگر اللہ اہل باطل اور گمراہوں کو ہمیشہ جھکا دیتا ہے۔ کوئی مباہلے پر راضی نہ ہوا۔ قیامت تک ہر زمانہ میں حق کے مددگاروں اور باطل کے مددگاروں میں اس طرح کا مباہلہ ہوتا رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ان کے دور کے ساتھ خاص نہ ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ معاملہ مباہلہ نہ تھا۔ ابن جریر بھی اسی طرف گئے ہیں لیکن ابن کثیر نے فرمایا کہ ابن عباس کے قول کے مطابق بطور مباہلہ تھی۔ اس لیے وہ لوگ میدان سے بھاگ نکلے۔ کیونکہ انہیں نبی علیہ السلام کے صدق اور اپنے کذب و افتراء کا حال معلوم تھا۔ اور جانتے تھے کہ مباہلہ میں جھوٹے برباد ہو جاتے ہیں۔ اس مباہلہ کو اس جگہ تمنی کہا گیا ہے کیونکہ ہر حق والا یہ چاہتا ہے کہ مناظرہ کرنے والا باطل گروہ ہلاک ہو۔ خصوصاً جبکہ اس کے پاس اظہارِ حق کے لیے دلیل بھی موجود ہو۔ وہ موت سے مباہلہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو جینا بہت عزیز تھا کہ مرنے کے بعد انجام بد ہو گا، اس لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ وہ ہرگز ایسی تمنا نہ کریں گے انہیں تو یہ امید ہے کہ وہ ہزار سال

زندہ رہیں۔ اور اتنی طویل عمر اس لیے چاہتے تھے کہ وہ اپنا برا انجام جانتے تھے کیونکہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔ اس معاملے میں ان کی حرص مشرکوں سے بھی زیادہ تھی۔ جو کہ اہل کتاب نہ تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا مشرکین سے اس جگہ اعاجم مراد ہیں۔ اس طرح حاکم نے ثوری سے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح کہا۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا: ﴿ أَحْرَصَ النَّاسِ ﴾ سے منافق مراد ہیں۔ وہ اہل شرک سے بھی حرص میں زیادہ تھے۔ ہر یہودی اور ہر مجوسی یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس زندہ رہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ پارسی کا قول ہے کہ ہزار سال بزی یا ہزار سال نوروز۔ یا میر جان بغری۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ انہیں ساری عمر گناہ کرنا محبوب تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ جینا انہیں عذاب سے نجات نہ دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرک بعث بعد الموت کے قائل نہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں جتنی زندگی لمبی ہوگی وہی غنیمت ہے۔ اور یہودی یہ جانتا ہے کہ آخرت میں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گی۔ اس لیے لمبی عمر چاہتا ہے یہ وہی یہودی تھے جو حضرت جبریل علیہ السلام کے دشمن تھے۔ سو جس طرح ابلیس کو اس کے کفر کی وجہ سے طویل عمر کچھ فائدہ نہ دے گی اسی طرح ان کی لمبی اور گناہوں سے آلودہ عمریں کچھ فائدہ نہ دیں گی۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٩٧﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ ﴿٩٨﴾

کہہ دو کہ جو شخص جبریل کا دشمن ہو (اس کو غصے میں مر جانا چاہئے) اس نے تو (یہ کتاب) اللہ کے حکم سے تمہارے دل پر نازل کی ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔ جو شخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبرئل اور میکائل کا دشمن ہو تو ایسے کافروں کا اللہ دشمن ہے۔

فائدہ: یہود نے کہا کہ یہ کلام جبریل علیہ السلام لاتا ہے اور وہ ہمارا دشمن ہے۔ کئی دفعہ ہمارے دشمنوں کو ہم پر غالب کر گیا۔ کوئی اور لے آتا تو ہم مان لیتے۔ اس پر اللہ کریم نے فرمایا کہ فرشتے جو کچھ بھی کرتے ہیں بغیر حکم کے نہیں کرتے۔ جو کوئی ان کا دشمن ہوگا تو بلاشبہ اللہ ایسے کافروں، بے دینوں کا دشمن ہے۔

ابن جریر نے فرمایا کہ اہل تفسیر اس پر متفق ہیں کہ یہ آیت یہود بنی اسرائیل کے جواب میں نازل ہوئی ہے۔ وہ جبریل علیہ السلام کو دشمن اور میکائیل کو دوست سمجھتے تھے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ بات انہوں نے کس طرح کہی تھی۔ بعض نے کہا کہ ان سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے امر نبوت میں مناظرہ ہوا تھا اس پر یہ گفتگو پیش آئی۔ پھر اس

مناظرے کی روایات لکھی ہیں جو بروایت امام احمد و ترمذی، تفسیر ابن کثیر میں مذکور ہیں۔ عکرمہ نے کہا: جبر میک اور ،اسراف بمعنی عبد ہے۔ایل بمعنی اللہ ہے۔اور سلف نے بھی ایسا ہی کہا۔ بعض نے کہا کہ ایل بمعنی عبد ہے اور باقی کلمات کا مطلب اللہ ہے اس لیے کہ ایل کا لفظ کسی جگہ نہ بدلتا ہے ۔ جیسے عبداللہ ، عبدالرحمٰن، عبدالملک ،عبدالسلام، عبدالباسط، عبدالجلیل وغیرہ اس سب میں لفظ عبد موجود ہے۔ مضاف الیہ تبدیل ہوا ہے۔ غیر عرب کلام میں مضاف الیہ پہلے اور مضاف بعد میں ہوتا ہے۔ سو اسی طرح وہ نام جبرائیل، میکائیل اور اسرافیل ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ گفتگو اس مناظرے پر ہوئی جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی بابت یہود سے ہوا تھا۔اس مناظرے کو ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔

فائدہ: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام روح امین ہیں اللہ کی طرف سے ذکر حکیم لے کر آئے اور یہ اللہ کے پیغمبروں میں سے پیغمبر تھے اور فرشتوں میں سے باعزت فرشتے ہیں۔ جس نے اللہ کے کسی ایک رسول سے دشمنی کی اس نے گویا سب سے دشمنی کی۔ جس طرح کہ ایک رسول پر ایمان لانے سے سب رسولوں پر ایمان لانا لازم آتا ہے۔ اور ایک رسول کا انکار کرنے سے تمام رسولوں کا انکار کرنا پڑتا ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ﴾ ”بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کے ساتھ تو ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔“ ان آیات میں بعض رسولوں پر ایمان لانے والوں اور بعض کا کفر کرنے والوں پر کفر کا حکم لگایا ہے اسی طرح جبریل علیہ السلام کا دشمن اللہ کا دشمن ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ آتے ہیں نہ اپنی طرف سے کوئی حکم لاتے۔ بلکہ اللہ کا پیغام لے کر اسی کے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ﴾ ”کہ ہم صرف آپ کے رب کے حکم سے اترتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ﴾ ”کہ یہ رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے اسے روح امین لے کر نازل ہوئے تاکہ آپ ﷺ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔“ بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ جس نے میرے کسی دوست کو دشمن رکھا۔اس نے میرے ساتھ اعلانِ جنگ کیا۔ اسی لیے اللہ کریم نے جبریل علیہ السلام کے دشمن پر اظہارِ غضب فرمایا ہے۔

فائدہ: اور فرمایا کہ ”جو اس کی تصدیق کرتا ہے جو آگے ہے۔“ اس سے پہلی کتابیں مراد ہیں۔ قرآن ان

سب کی تصدیق کرتا ہے۔ دلوں کو سیدھے رستے کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور جنت کی خوشخبری دیتا ہے اور یہ ہدایت خاص طور پر مومنین کے لیے ہے۔ جس طرح فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَ شِفَآءٌ﴾ ”کہ فرما دیجئے! وہ ایمان والوں کے لیے سر چشمہ ہدایت و شفا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ﴾ ”اور ہم قران سے وہ چیز نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے شفاء و رحمت ہے۔“ لفظ رسل ملائکہ اور بشر سب کے پیغمبروں کو شامل ہے۔ ﴿اللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾ ”کہ اللہ کریم فرشتوں اور انسانوں سے پیغمبر چن لیتا ہے۔“ اور حضرت جبریل اور میکائیل علیہما السلام کا علیحدہ ذکر اس لیے کہا کہ اس مقام پر خاص انہی کی مدد مقصود ہے۔ جبریل علیہ السلام اللہ کے سفیر و وکیل ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی طرف پیغام رسانی کا کام انجام دیتے ہیں۔ ساتھ حضرت میکائیل علیہ السلام کو اس لیے ملا لیا کہ یہودی انہیں اپنا دوست سمجھتے تھے۔ اللہ کریم نے انہیں یہ بتادیا کہ ایک کی دشمنی بعینہٖ دوسرے کی دشمنی ہے بلکہ خود اللہ رب العزت کی دشمنی ہے۔ حضرت میکائیل علیہ السلام بھی تو بعض اوقات پیغمبروں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ جس طرح ابتدائے بعثت میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے لیکن حضرت جبریل علیہ السلام اس لیے اکثر آیا کرتے تھے کیونکہ ان کا کام وحی لانا تھا۔ حضرت میکائیل علیہ السلام پانی اور زمین کی پیداوار پر مامور ہیں۔ وجس طرح کہ اسرافیل علیہ السلام قیامت والے دن صور پھونکنے پر مقدر ہیں۔ اس لیے صحیح حدیث ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اٹھتے تو فرماتے: ((اللهم رب جبريل و ميكائيل و اسرافيل فاطر السموت والارض عالم الغيب والشهادة انت تحكم بين عبادك فيما كانو فيه يختلفون، اهدنى لما اختلف فيه من الحق باذنك انك تهدى من تشاء الى صراط مستقيم)) بعض سلف نے فرمایا کہ ملائکہ میں جبریل علیہ السلام کا نام خادم اللہ ہے۔ سلیمان دارانی نے کہا کہ مجھے سارے دفتر سے زیادہ یہ حدیث پسند آئی۔ حضرت علی بن حسین نے فرمایا جس نام میں ایل ہے اس کی نسبت اللہ کی طرف ہے۔

فائدہ: اس آیت میں حضرت جبریل علیہ السلام کی عظمت و رفعت پر دلیل ہے۔ اور یہ کہ ان سے یہود کی دشمنی بے وجہ ہے۔ محبت سے ہٹ کر انہوں نے کوئی کام نہ کیا ہے۔ ان کا آنا اللہ کے حکم سے ہے اور اپنی رائے سے کچھ نہ لائے تھے۔ دل کا ذکر اس لیے کیا کہ دل علم و عقل کی جگہ ہے۔ حافظے کا خزانہ ہے۔ اللہ کا گھر ہے۔ کرمانی نے کہا ملائکہ کو رسل پر مقدم کیا۔ جس طرح اللہ کا ذکر سب سے مقدم رکھا۔ اس لیے کہ پیغمبروں سے کتابیں اترنے کی وجہ سے عداوت کرتے تھے اور کتابوں کا نزول بذریعہ فرشتوں کے ہوتا ہے۔ اور فرشتوں کا نزول اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ترتیب اختیار فرمائی۔

وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ﴿٩٩﴾ أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَّبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُم بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠٠﴾ وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٣﴾

اور ہم نے تمہارے پاس سلجھی ہوئی آیتیں ارسال فرمائی ہیں اور ان سے انکار وہی کرتے ہیں جو بدکردار ہیں۔ان لوگوں نے جب (اللہ سے)عہد واثق کیا تو ان میں سے ایک فریق نے اس کو (کسی چیز کی طرح) پھینک دیا حقیقت یہ کہ ان میں اکثر بے ایمان ہیں۔اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے پیغمبر (آخر الزماں) آئے اور وہ ان کی (آسانی) کتاب کی تصدیق بھی کرتے ہیں تو جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک جماعت نے اللہ کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا وہ جانتے ہی نہیں۔اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان کے عہد سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے) جو شہر بابل میں دو فرشتوں (یعنی) ہاروت و ماروت پر اتری تھیں اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (ذریعہ) آزمائش ہیں، تم کفر میں نہ پڑو، غرض لوگ ان سے ایسا (جادو) سیکھتے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں، اور اللہ کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے تھے، اور کچھ ایسے (منتر) سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے اور وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسی چیزوں (یعنی سحر اور منتر وغیرہ) کا خریدار ہوگا اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور جس چیز کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا وہ بری تھی، کاش وہ (اس بات کو) جانتے۔اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو اللہ کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا، اے کاش! وہ اس سے واقف ہوتے۔

فائدہ: یعنی یہود نے اپنے دین اور کتاب کا علم چھوڑ دیا تھا اور وہ سحر کے پیچھے پڑ گئے لوگوں میں جادو دو طرف سے آیا تھا ایک تو اس طرح کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں انسان اور شیطان اکٹھے رہتے تھے۔ انہوں نے تب ان شیاطین سے سیکھ لیا تھا۔ یہود اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اور کہتے کہ ہم تک یہ علم انہی کے ذریعے پہنچا ہے اور وہ خود بھی اسی کی بدولت جن وانس پر حکومت کرتے تھے۔ اس جگہ اللہ کریم نے واضح کر دیا کہ وہ تو کفر ہے حضرت سلیمان علیہ السلام ایسا نہ کرتے تھے۔ ان کے دور حکومت میں شیاطین نے انسانوں کو سکھا دیا ہے۔ دوسرے ہاروت اور ماروت کی طرف سے آیا تھا یہ دو فرشتے تھے۔ بابل شہر میں آدمیوں کی صورت میں رہتے تھے انہیں جادو کا علم معلوم تھا جو کوئی سیکھنے جاتا اس کو پہلے بتاتے کہ اس علم کو سیکھنے سے ایمان نہ رہے گا۔ پھر اگر وہ کہتا تو سکھا دیتے تھے۔ اس سے اللہ کو آزمائش مقصود تھی اللہ کریم نے بتا دیا کہ اسے علم سیکھنے کا آخرت میں کوئی فائدہ نہ ہے۔ بلکہ الٹا نقصان ہوگا۔ اور دنیا میں بھی نقصان کہ اللہ کے حکم کے بغیر کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ اگر علم دین اور کتاب کا علم سیکھتے تو اللہ کے ہاں ثواب پاتے۔

فائدہ: ابن جریر نے کہا کہ یہ بنی اسرائیل نے ابتدائی حالات اور ان کے مخفی علوم واسرار کے مطلب واضح آیات ہیں جن کو علمائے یہود کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔ انہوں نے ان آیات کو تبدیل کر ڈالا تھا جبکہ اللہ نے ان کو ظاہر کر دیا تھا۔ جس کو اللہ کریم نے عقل سلیم عطا کی ہے وہ جانتا ہے کہ یہ باتیں جنہیں کسی بشر سے سیکھے بغیر محمد ﷺ لائے ہیں وہ بلا شبہ سچی ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک رسول اللہ ﷺ اُمی تھے اور ان کی کتاب سے جو بات بھی کہتے وہ سچی ہوتی۔ جب ان سے کہا گیا کہ تم سے میری مدد اور مجھ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا تو کہنے لگے واللہ ہم سے اس قسم کا کوئی عہد نہ لیا گیا ہے۔ اس پر اللہ کریم نے فرمایا کہ ان کی یہی عادت ہے کہ آج وعدہ کیا تو کل توڑ دیا۔ اور جس پیغمبر علیہ السلام کی صفت اس میں درج ہے اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کی پیروی کرنے اور ان کی مدد کا عہد ہو چکا تھا۔ جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ﴾ "وہ لوگ جو اس بھیجے ہوئے اُمّی نبی کی پیروی کرتے ہیں جیسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔" اس جگہ ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اپنی کتاب تورات کو اس طرح خود سے الگ کر لیا کہ گویا ان کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہے۔ اس کے عوض جادو کرنا اور سیکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ لبید بن عاصم یہودی لعنہ اللہ نے نبی علیہ السلام پر بھی جادو کیا تھا۔ اللہ کریم نے انہیں اس سے نہ صرف آگاہ کر دیا بلکہ شفا بھی دے دی۔ یہ قصہ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مفصل طور پر مروی ہے۔ سدی نے کہا جبکہ

رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو یہود نے تورات سے ان کا مقابلہ کیا جب تورات کو قرآن کے موافق پایا تو چارو ناچار اس کو چھوڑ کر کتاب آصف اور ہاروت وماروت سے سحر سیکھنے لگے۔ وہ کتاب اور وہ جادو کلام پاک کے موافق نہ تھا۔ اللہ کریم نے فرمایا گویا وہ بہت بھولے اور سیدھے سادے ہیں کچھ جانتے ہی نہ ہیں۔ یعنی مراد یہ ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا کام اختیار کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی۔ بادشاہت جاتی رہی تو انسانوں اور جنوں کے کچھ لوگ مرتد ہو کر خواہشات کے پیچھے لگ گئے پھر جب اللہ نے بادشاہی لوٹادی تو انہوں نے ان سے سب کتابیں لے کر اپنی کرسی کے نیچے دفن کر دیں۔ اسی کے قریب زمانے میں ان کا انتقال ہو گیا۔ پھر جنوں اور انسانوں نے ان کتابوں کو نکال کر کہا کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس کو ہم سے چھپایا تھا۔ اور اس کو اپنا دین بنالیا ور جو شیطانی شہوات جنوں، شیطانوں نے نکالی تھیں جیسے باجا کھیل تماشا وغیرہ اس کو اختیار کر لیا۔ آصف، سلیمان علیہ السلام کا کاتب تھا اور اسم اعظم جانتا تھا۔ ہر چیز حضرت سلیمان علیہ السلام کی لکھتا پڑھتا تھا۔ پھر اسے اس کی کرسی کے نیچے دبادیتا تھا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے وہ نکال کر اس کے بین السطور سحر و کفر لکھ دیا۔ لوگوں سے کہا کہ سلیمان علیہ السلام اسی پر عمل کرتے تھے۔ اس پر جاہل لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کو برا بھلا کہنے لگے۔ علماء خاموش تھے اس لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ سلیمان علیہ السلام سحر و کفر سے بری تھے۔ کافر تو وہی شیطان تھے۔ حضرت ابن عباس سے دوسری روایت یوں ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت الخلاء جاتے یا اپنی کسی بیوی کے پاس جاتے تو اپنی انگوٹھی جرادہ نامی ایک عورت کو دے جاتے تھے۔ جب اللہ کریم نے ان کی آزمائش کا ارادہ کیا تو ایسا ہوا کہ ایک دن وہ اپنی انگوٹھی جرادہ کو دے کر گئے تھے کہ ایک شیطان ان کی صورت میں آیا اور جرادہ سے انگوٹھی لے کر پہن لی۔ سارے شیطان وانس اس کے تابع ہو گئے جب سلیمان علیہ السلام نے آکر انگوٹھی مانگی تو جرادہ نے کہا کہ تو سلیمان علیہ السلام نہیں ہے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ میں کسی آزمائش میں مبتلا کیا گیا ہوں۔ شیاطین نے انہی دنوں سحر و کفر لکھ کر ان کی کرسی کے نیچے دبادیا۔ پھر ان کی وفات کے بعد یہ ظاہر کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اسی کے سبب سے سب پر حکومت کرتے تھے۔ لوگوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو کافر کہا۔ بیزاری ظاہر کی۔ ان کتب کو یہود نے حاصل کیا حتیٰ کہ اللہ کریم نے نبی آخر الزمان علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور ان پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا﴾ کہ سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا لیکن شیاطین نے کفر کیا۔ ابن اسحٰق کا لفظ یہ ہے کہ شیاطین نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات معلوم کر کے

طرح طرح کے جادو لکھ دیئے کہ جو اس طرح کرنا چاہے وہ یہ کرے اور جو اس طرح کرنا چاہے وہ اس طرح کرے پھر اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی کی سی مہر لگائی اور اس کے شروع میں لکھ دیا: ((ھذا ما کتب آصف بن برضیا اصدیق للملك سلیمان بن داؤد من ذخائر کنوز العلم)) پھر اسے کرسی کے نیچے دفن کر دیا۔ اس کے بعد بقیہ بنی اسرائیل نے اسے نکال کر لوگوں میں پھیلا دیا۔ اور کہا کہ سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی اسی وجہ سے تھی۔ اور ان کو سب سے زیادہ یہودیوں نے سیکھا۔ **لعنھم اللہ**۔ اس باب میں اور بھی روایتیں ہیں۔ حضرت حسن نے فرمایا کہ جس چیز کی شیاطین تلاوت کرتے تھے وہ ایک حصہ شعر دوسرا حصہ جادو اور تیسرا حصہ کہانت کا تھا۔ معلوم ہوا کہ برا شعر اور بری نظم جادو اور کہانت کے حکم میں ہے۔ جیسے وہ اشعار جن میں شراب و کباب کی مدح، عشق پرستی، سماعِ غنا، زناکاری، فسق و کفر کی مدح و را عضاء معشوق وغیرہ قسم کی چیزیں ہوں۔ یہ سحر حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے سے پہلے بھی موجود تھا۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے پہلے آئے تھے۔ اور ان کے اور ساحروں کے درمیان تھا بلکہ ہوا تھا۔ اسی طرح حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے حضرت صالح علیہ السلام سے کہا: ﴿إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ﴾ ”کہ آپ سحر زدہ لوگوں میں سے ہیں۔“ یہ صالح علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی پہلے کے تھے معلوم ہوا کہ سحر کی کوئی اصل ہے، یہ نہیں کہ یہ بے اصل چیز ہے۔ یہی آیت اس باب کے متعلق قطعی نص ہے۔ گو کہ اس کو سیکھنا سکھانا کفر ہو یا گناہ کبیرہ ہو۔ قرطبی نے کہا کہ ما انزل میں مانا فیہ ہے۔ کہ نہ سلیمان علیہ السلام نے کفر کیا نہ فرشتوں پر جادو نازل ہوا۔ لیکن شیاطین بابل میں لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اس صورت میں مَلَكَيْنِ سے جبریل و میکائیل علیہما السلام مراد ہیں کیونکہ ساحران یہود کا خیال تھا کہ اللہ نے انہی کے ذریعے سلیمان علیہ السلام پر یہ جادو نازل کیا تھا۔ اس پر اللہ کریم نے ان کی تکذیب کی کہ نہ تو وہ دونوں جادو لائے اور نہ سلیمان علیہ السلام نے کفر کیا۔ یہ تو شیاطین کا کام ہے جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ کسی نے کہا کہ مَلَكَيْنِ میں لام مکسور ہے اور اس سے حضرت سلیمان اور داؤد علیہما السلام مراد ہیں۔ مگر ابن جریر نے فا کے نافیہ ہونے کا انکار کیا ہے۔ اور با بمعنی الذی کہا ہے۔ اور مَلَكَيْنِ سے ہاروت اور ماروت مراد لیے ہیں۔ پھر فرمایا کہ اللہ نے بندوں سے امتحان لینے کی خاطر انہیں زمین میں بھیجا تھا اور انہیں جادو سکھانے کی اجازت دی۔ اور جادو سکھانے میں یہ دونوں فرشتے حکم کے تابع تھے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ابن جریر کا موقف نہایت غریب ہے اس سے بھی غریب یہ بات ہے کہ بقول ابن حزم انہیں جناتِ کے دو قبائل کہا جائے۔ جمہور سلف کا مذہب یہی ہے کہ وہ دونوں فرشتے تھے اور آسمان سے زمین تک اتر آئے تھے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اتارے گئے تو فرشتوں نے کہا اے اللہ! تو اس مفسد اور سفاک کو زمین میں بھیجتا ہے۔ ہم تیری حمد و تسبیح بیان کرتے ہیں اللہ کریم نے فرمایا کہ جو مجھے معلوم ہے وہ تمہیں معلوم نہ ہے۔ کہا ہم بنی آدم سے زیادہ مطیع ہیں۔ فرمایا: تم میں سے دو فرشتے آئیں میں انہیں زمین پر بھیجتا ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہاروت و ماروت حاضر ہیں۔ انہیں زمین میں بھیج دیا اور ان کے لیے زہرہ کو اچھی صورت میں ظاہر کیا۔ انہوں نے اس سے زنا کا ارادہ کیا، اس نے کہا شرک کرو۔ نہ مانے پھر کہا: اسے بچے کو قتل کرو، وہ نہ مانے پھر کہا کہ یہ شراب کا پیالہ ہے اس کو پی لو انہوں نے شراب پی لی۔ اور نشے کی حالت میں اس سے زنا بھی کیا اور اس بچے کو قتل بھی کر دیا۔ جب ہوش میں آئے تو اس عورت نے کہا لو جو کام تم نہ مانتے تھے وہ سب میں نے تم سے کرا لیے ہیں۔ ان کو اختیار دیا گیا کہ یا دنیا کا عذاب لے لو یا آخرت کا۔ انہوں نے دنیا کا عذاب اختیار کر لیا۔ [بروایت امام احمد] ابن کثیر نے اس سند کے تمام طرق جمع کر کے اس کی سند اور مرفوع ہونے میں کلام کیا۔ پہلے یہ لکھا تھا: ((ذکر الحدیث الوارد فی ذالك ان صبح سنده و رفعه)) اور مختلف طرق ذکر کر کے لکھا کہ: ((دار الحدیث و رجع الی کعب الاحبار عن کتب بنی اسرائیل)) پھر اس سلسلے میں صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے اقوال و آثار نقل کیے ہیں۔ حضرت علی مرتضیٰ سے منقول ہے کہ زہرہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ اور اہل فارس سے تھی جس کی وجہ سے ہاروت و ماروت پھنس گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ زہرہ بیدخت کو کہتے ہیں اس کو ایک پارسن عورت کی شکل میں ہاروت و ماروت کے پاس بھیجا گیا جس سے وہ آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ زہرہ کو ایک خوبصورت عورت کی شکل میں نازل کرنے والی بات بہت غریب ہے اس سے تو قصہ زہرہ میں وہ بات قریب الفہم ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک عورت بڑی خوبصورت تھی جیسے تاروں میں زہرہ ہو۔ یہ دونوں شراب پی کر اس سے آزمائش میں پڑ گئے۔ ((فھذا اقرب ماروی فی شان الزھرہ)) حضرت قتادہ نے فرمایا وہ عورت تھی جو اپنے شوہر کا جھگڑا لے کر آئی تھی۔ اور یہ اس کے حسن میں کھو گئے۔ اس کا نام عربی میں زہرہ، نبطی زبان میں بیدخت اور فارسی میں اناپید تھا۔ وہ اسم اعظم سیکھ کر آسمان کی جانب اڑ گئی اور ستارہ بن گئی۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ جب پہلے سرخ تارے کو دیکھتے تو لعنت کرتے اور کہتے کہ اسی نے ہاروت و ماروت کو فتنے میں ڈالا تھا۔ الغرض ہاروت و ماروت کا قصہ تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت سے منقول ہے۔ سلف و خلف مفسرین نے اس سلسلے میں بڑے قصے بیان کیے ہیں اور سب کا مرجع اخبار بنی

اسرائیل ہیں۔اس باب میں کوئی صحیح مرفوع حدیث جس کی سند متصل ہو آنحضرت ﷺ سے منقول ہو کر نہ آئی ہے۔اور کلام پاک کا سیاق اجمالی قصے کا اشارہ کرتا ہے۔کسی قدر کشادگی سے بیان نہ کیا گیا ہے۔اس لیے اللہ کی مرضی کے موافق جس قدر اس نے واضح کیا اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔واللہ اعلم۔

فائدہ: فتح البیان میں بھی مفسرین کے اقوال سے مسخ زہرہ ہاروت و ماروت کا اترنا پھر فتنے میں مبتلا ہونا ثابت کیا اور کہا کہ یہ سب امور اللہ کی طاقت و قدرت میں ہیں ان میں کچھ استبعاد نہ ہے کہ ان کا وقوع عقل سے دور ہے۔

فائدہ: ابن جریر نے اپنی سند سے ایک عورت کا قصہ مفصل ذکر کیا۔جو بابل سے جادو سیکھ کر ایمان کھو کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی تھی۔وہ قصہ تفسیر ابن کثیر میں مذکور ہے۔پھر ابن کثیر نے فرمایا کہ ابن جریر نے مذکور اثر سے یہ استدلال کیا ہے کہ ساحر کو آنکھیں (نظریں) تبدیل کرنے پر اختیار ہوتا ہے۔جبکہ دوسروں نے کہا نہیں۔بلکہ وہ محض تخیل ہوتی ہے۔جیسے اللہ کریم نے فرمایا:﴿سَحَرُوْا اَعْیُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْا بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ﴾ ''کہ انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انہیں ڈرانے لگے اور بڑا عظیم جادو لائے۔'' اور فرمایا:﴿یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی﴾ ''ان کے جادو سے انہیں خیال گذرتا تھا کہ وہ بھاگ رہی ہیں۔'' اور اس سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ جس شہر بابل کا ذکر قرآن میں ہے وہ بابل عراق ہے ، بابل دَیْنَاوَند نہ ہے۔علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا بھی ہی قول ہے۔بلکہ حدیث مرفوع کے حوالے سے بابل ملعون کہا ہے۔وہاں نماز عصر کا وقت آگیا لیکن نہیں پڑھی بلکہ وہاں سے علیحدہ ہو کر نماز پڑھی۔معلوم ہوا کہ جس طرح دیار ثمود سے رونے کے بغیر گذرنے سے منع کیا ہے اس سے طرح بابل میں نماز پڑھنا مکروہ سمجھا،اصحاب ہیئت کہتے ہیں کہ بابل عراق کا صوبہ ہے اور بحر محیط جسے اوقیانوس کہتے ہیں سے ستر درجے دوری پر ہے۔یہ تو بابل کا طول ہوا رہا عرض سو بابل سے جنوبی طرف میں وسط زمین سے خط استواء کے مقابلہ میں بیس درجے ہے۔فتح البیان میں لکھا ہے کہ بابل سواد عراق میں یا زمین کوفہ میں ایک زمین یا شہر کا نام ہے۔بقول ابن مسعود کسی نے کہا وہ جبل دما وند سے نہاوند یا نصیبین یا مغرب ہے۔بابل کا نام اس لیے بابل ہوا کہ اس جگہ تبلبل السنہ ہوا تھا یعنی مخلوق کی زبانوں میں تفرقہ پڑ گیا تھا۔اہل علم نے اس آیت سے جادو کے کفر ہونے کی دلیل بھی لی ہے۔حضرت عبداللہ کی حدیث میں ہے کہ جو کسی کاہن یا جادوگر کے پاس آیا پھر اس کی بات کی تصدیق کی تو اس نے قرآن کا کفر کیا۔ [بروایت بزار بسند صحیح] حاکم نے کہا اس کی سند صحیح ہے۔

فائدہ: خاوند بیوی کے درمیان وہ جدائی ڈالنے کے لیے جادو کا استعمال کرتے تھے۔حالانکہ یہ اختلاط و

الفت کا رشتہ ہے۔ سو یہ شیطانوں کا کام ہوتا ہے۔ مسلم میں ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ شیطان اپنا تخت پانی پر رکھ کر اپنا لشکر بھیجتا ہے۔ یعنی بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اپنے لوگ بھیجتا ہے۔ پھر اس کے نزدیک سب سے قریب وہ ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ میں نے نہ چھوڑا اس کو حتیٰ کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی۔ تو شیطان اسے گلے لگاتا ہے اور اس کو کہتا ہے کہ تو بہت اچھا ہے۔[الحدیث] ابن کثیر نے فرمایا کہ بظاہر میاں بیوی میں تفریق کا سبب وہ خیالات ہوتے ہیں جو ایک کے ذہن میں دوسرے کی بد صورت یا بد خلقی وغیرہ کے متعلق آتے ہیں یا دوسرے عقد یا کسی اور دشمنی سے پیدا ہوتا ہے۔ فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ نے تفریق کو ساحروں کی طرف منسوب کیا ہے اور سحر کو تفرقہ کا سبب بتایا ہے۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جادو کا اثر دلوں میں محبت و بغض جمع و فرقت، قرب و بعد کے جذبات کی صورت میں ہوتا ہے۔ ایک گروہ نے کہا کہ ساحر کو صرف اسی تفرقہ پر قدرت ہوتی ہے اگر اس سے زیادہ قدرت ہوتی تو اللہ کریم اسے اس جگہ ضرور ذکر کرتے۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ اس سے زیادہ بھی قدرت ہوتی ہے یہاں صرف غالب تاثیر کا ذکر کیا ہے۔ اور کہا کہ جادو گر کو اس کے سوا کہ خود نقصان اٹھاتا ہے، کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا ہے۔ ابو السعود نے کہا کہ جس چیز کی آفات سے امن نہ ہو اس سے بچنا بہتر ہے۔ جیسے فلسفہ کا سیکھنا انجام کو گمراہ کر دیتا ہے۔

فائدہ: اور جو فرمایا کہ ساحر کسی کو اللہ کے اذن کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ حضرت حسن بصری نے اس کا مطلب یوں بیان کیا ہے کہ جس پر اللہ تعالیٰ جادو گروں کو مسلط کرنا چاہے کر دیتا ہے۔ مگر جس کو نہ قدرت دے تو وہ اللہ کی اجازت کے بغیر کیا کر سکتا ہے۔ سفیان ثوری نے کہا یعنی اللہ کے حکم سے۔ محمد بن اسحٰق نے کہا جبکہ وہ اللہ اسے ساحروں کے ارادے کے سپرد کر دے۔ ابن عباس، مجاہد و سدی نے کہا خلاق بمعنی نصیب ہے۔ حسن نے کہا دین معنی ہے۔ یعنی جادو گر بے نصیب و بے دین ہوتا ہے۔ اس لفظ سے: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا﴾ "کہ اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے۔" استدلال کیا ہے کہ جادو گر کافر ہے۔ امام احمد اور سلف کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے۔ بعض نے کہا کافر نہیں ہوتا ہے لیکن اس کی حد یہ ہے کہ قتل کر دیا جائے۔ یہ قول شافعی سے منقول ہے۔ رازی نے معتزلہ سے نقل کیا ہے کہ وہ وجود سحر کے منکر ہیں بلکہ کبھی معتقد سحر کو کافر کہہ دیتے ہیں۔ ہاں اہل سنت کے نزدیک ساحر کا اڑ جانا، یا آدمی کو گدھا بنا دینا یا گدھے کو آدمی بنا دینا جائز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس وقت ساحر اپنا منتر پڑھتا ہے تو اللہ کریم اس چیز کو پیدا کرتا ہے یہ بات نہ ہے کہ اس میں فلاسفہ و منجمین و صائبین کے قول کے موافق فلک یا نجوم اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر اس لفظ سے: ﴿وَمَا هُمْ

بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ”کہ وہ کسی کو بھی تکلیف نہیں دے سکتے مگر اللہ کے حکم سے۔کہ اللہ کے پیدا کرنے سے ہی سحر واقع ہوتا ہے۔“ رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا تھا۔ایک ساحرہ عورت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس شہر بابل سے آئی تھی۔اور بہت سی حکایات سحر کے اور بھی مروی ہیں۔پھر رازی نے کہا کہ سحر کو سیکھنا کچھ مذموم نہ ہے۔ایک علم ہے۔اگر یہ علم نہ ہو تو سحر اور معجزہ میں فرق کیسے معلوم ہو سکے۔ابن کثیر نے بخوبی اس قول کا رد کیا ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جو کوئی کاہن یا عراف کے پاس گیا وہ کافر ہو گیا۔صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین وائمہ کرام جن کو سحر کا علم معلوم نہ تھا وہ بخوبی معجزات کو جانتے پہچانتے تھے۔پھر ابو عبداللہ رازی سے بحوالہ کتاب سحر مکتوم سحر کی آٹھ قسمیں نقل کر کے ان میں کلام کیا ہے۔اس کے بعد کتاب الاشراف علی مذاہب الاشراف سے وزیر ابن ھبیرہ سے روایت کیا کہ سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ سحر کی حقیقت ہے۔امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سحر کو بے حقیقت کہتے ہیں۔رہا جاد سیکھنا، سو امام ابو حنیفہ ،مالک اور احمد کا مذہب یہ ہے کہ جادو گر کافر ہو جاتا ہے۔پھر مالک اور احمد کے نزدیک صرف فعل واستعمال سے واجب القتل ہے۔شافعی واحمد کے نزدیک فوراً قتل کرنے کی کچھ ضرورت نہ ہے۔مگر جب زیادہ دفعہ یہ کام کرے تو تب قتل کیا جائے۔رہی یہ بات کہ ساحر کی توبہ قبول ہوتی ہے یا نہیں تو شافعی فرماتے ہیں کہ قبول نہیں ہوتی جبکہ باقی ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ اس کی توبہ قابل قبول ہے۔

فائدہ: قرطبی نے وہب سے نقل کیا ہے کہ جس مرد کو کسی نے جادو کر کے کسی عورت سے باندھ دیا ہو تو بیری کے سات پتے لے کر دو پتھروں میں پیس کر پانی میں ملائیں اور آیت الکرسی پڑھیں۔پھر اس پانی کے تین گھونٹ مسحور کو پلا دیں اور باقی پانی سے نہلا دیں۔ان شاء اللہ اس جادو کا اثر جاتا رہے گا۔اس باب میں یہ عمل جید ہے۔حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سحر کا اثر زائل کرنے کا سب سے عمدہ وہ طریقہ ہے جو اللہ کریم نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کے دور میں خاص انہی کے لیے بھیجا تھا۔یعنی نزول معوذتین حدیث میں مذکور ہے کہ کسی نے ان سورتوں کی طرح کسی اور چیز کے ساتھ پناہ نہیں پکڑی۔اسی طرح آیت الکرسی شیطان کو دور کر دیتی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ

اے اہل ایمان (گفتگو کے وقت پیغمبر اللہ سے) راعنا نہ کہا کرو ،انظرنا کہا کرو اور خوب سن رکھو اور کافروں کے لیے دکھ دینے والا عذاب ہے۔جو لوگ کافر ہیں اہل کتاب یا مشرک وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے

أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۱۰۵﴾

طرف سے خیر و برکت) نازل ہو اور اللہ تو جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل کا مالک ہے۔

فائدہ: یہود نبی ﷺ کی مجلس میں بیٹھتے تھے اور باتیں سنا کرتے تھے جبکہ کسی چیز کے دوبارہ پوچھنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو کہتے رَاعِنَا، یعنی ہماری طرف توجہ کیجئے۔ ان سے سیکھ کر بعض مسلمان بھی کبھی ایسا لفظ کہہ دیتے جو اللہ کریم نے منع فرمایا کہ تم ایسا نہ کہو اگر ضرورت ہو تو انْظُرْنَا کہو۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ اور آئندہ سنو تو غور سے سنا کرو تا کہ دوبارہ سننے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ یہود کو تو دغابازی کی عادت تھی وہ زبان دبا کر کہا کرتے تھے وہ راعینا ہو جاتا۔ یعنی اے چرواہے۔ اور ان کی زبان میں راعنا احمق کو بھی کہتے ہیں۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ کریم نے ایمان والوں کو منع کیا کہ وہ قول و فعل میں کافروں کے مشابہ نہ ہوں۔ یہود ایسی باتیں بطریق توریہ کرتے اور اس سے ان کی مراد حقارت کرنا ہوتی تھی۔ اِسْمَعْ لَنَا کی جگہ رَاعِنَا کہتے جو رعونت سے ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ وَأَقْوَمَ وَلَكِنْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ "ان لوگوں میں سے جو یہودی ہوئے وہ باتوں کو اس کی جگہ سے تبدیل کر دیتے اور کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی اور سن نہ سنایا جائے اور راعنا زبان کو پیچ دے کر کہتے اور دین میں طعن کرتے ہوئے اور اگر وہ کہتے کہ ہم نے سنا اور فرمانبرداری کی اور سنئے اور ہماری طرف دیکھ (کہتے) تو ان کے لیے بہتر ہوتا اور زیادہ درست ہوتا۔ لیکن اللہ کریم نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی۔ پس وہ تھوڑا ہی ایمان لاتے ہیں۔" اسی طرح احادیث میں مروی ہے کہ جب سلام کہنا ہوتا تو السام علیکم کہتے تھے۔ سام بمعنی موت ہے۔ اس لیے ہمیں حکم ہوا ہے کہ ان کے جواب میں وعلیکم کہیں۔ یعنی یہ موت تمہی پر وارد ہو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ ﴿مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ﴾ [بروایت احمد] یعنی جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔ اس کو ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس میں کافروں کے لباس پوشاک وضع قطع، عبادت وغیرہ میں تشبیہ کی سخت ممانعت اور اس پر وعید مذکور ہے۔ جو کام کہ ہمارے لیے مشروع نہ ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کی شرح میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے جو کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفة

اصحاب الجحیم " لکھی ہے وہ لاجواب کتاب ہے۔ یہ حدیث اسلام کے بنیاد واصل ہے اور بالخصوص آجکل لوگوں نے اس پر عمل کرنا ترک کر دیا ہے۔ گویا وہ اسے منسوخ سمجھتے ہیں۔ انا للہ۔ ایک آدمی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ مجھ سے کسی بات پر عہد کیجئے۔ فرمایا جب تو سنے کہ اللہ کریم: یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہیں تو کان رکھ، وہ یا تو کسی خیر کا حکم ہو گا یا شر سے ممانعت ہو گی۔ خیثمہ نے کہا جہاں کہیں قرآن میں یا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہے تورات میں وہاں یا اَیُّھَا المَسَاکِین ہے۔

فائدہ: عطا نے کہا کہ انصار راعنا کہتے ہیں۔ اللہ کریم نے اس سے منع کر دیا۔ ابن جریر نے کہا درست بات یہ ہے کہ اللہ کریم نے مومنین کو یہ لفظ کہنے سے منع کیا ہے۔ اللہ کو یہ کلمہ ناپسند آیا۔ یہ ایسے ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انگور کو کرم نہ کہو بلکہ حبلہ کہو اور عبدی نہ کہو بلکہ فتاوی کہو۔

اس آیت میں دلیل ہے کہ جو الفاظ ناپسندیدہ ہوں یا ان سے برائی اور نقص کا اظہار ہوتا ہو تو ایسے الفاظ سے پرہیز کرے۔ گو کہ متکلم کا ارادہ برائی ظاہر کرنے کا نہ بھی ہو۔ اس میں برائی کا ذریعہ روکنا اور فساد کی جڑ کاٹنا مقصود ہے۔ پھر اللہ کریم نے کافروں کی دشمنی کا حال بتایا خواہ وہ مشرک ہوں یا اہل کتاب۔ اس لیے کہ ان میں اور مومنین میں محبت نہ ہونا چاہئے۔ باہم کسی طرح کا میل جول نہ ہو۔ رحمت سے اس جگہ قرآن و اسلام یا نبوت یا جنس رحمت مراد ہے۔ جو عام ہو اور انسانوں میں سے جس کسی کو بھی دین و دنیا کی جو خبر ملی ہے وہ اس میں کسی قسم کا کوئی حق نہ رکھتا تھا وہ محض اللہ کا فضل و رحمت ہے۔ وہی اللہ بڑے فضل والا ہے۔ جسے چاہتا ہے رحمت دیتا ہے اس میں مشرکین و یہود کا مومنین سے حسد کرنا بلا موجب صحیح ہے۔

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴿١٠٦﴾ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴿١٠٧﴾

ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ کی ہے اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔

فائدہ: یہ بھی یہود کا طعن تھا کہ تمہاری کتاب میں بعض آیتیں منسوخ ہیں اگر یہ اللہ کا کلام تھا تو اس میں کیا عیب تھا کہ اسے موقوف کر دیا۔ اللہ کریم نے فرمایا کہ عیب نہ پچھلی آیت میں تھا نہ پہلی آیت میں لیکن حاکم جب چاہے جو چاہے حکم دے سکتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اس جگہ نسخ سے تبدیل مراد ہے۔ حضرت

مجاہد نے فرمایا نسخ مٹانے کے معنی میں ہے۔ قرطبی نے کہا نسخ بمعنی نسیان ہے۔ ضحاک نے فرمایا ترک کے معنی میں ہے۔ سدی نے فرمایا قبض ہے یعنی اٹھالینا مراد ہے۔ جیسے یہ آیت ((الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھا)) البتہ یا یہ قول: ((لو کان لابن آدم و ادیان من ذھب لا تبغي لھما ثالثا)) ابن جریر نے کہا کہ نسخ سے آیت نقل کرنا مراد ہے۔ جیسے حلال کو حرام کرنا اور حرام کو حلال کرنا یا مباح کو محظور اور محظور کو مباح کرنا۔ یہ نقل و تبدیل اسی امر و نہی، خطر و اطلاق، منع و ابات میں ہوتا ہے۔ اخبار میں نسخ نہیں ہوتا ہے۔ نسخ خواہ حکماً ہو یا خطاً۔ باقی نسخ کے احکام، انواع و شروط اصول فقہ کی کتب میں مفصل مرقوم ہیں۔ یہاں ان کو ذکر کرنے کی حاجت نہ ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کو ایک سورت سکھائی وہ اسے پڑھا کرتے تھے ایک رات جبکہ وہ نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو ایک حرف بھی نہ پڑھ سکے۔ صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو فرمایا منسوخ ہو گئی ہے یا بھلا دی گئی ہے۔ اب تم اسے چھوڑ دو۔ [بروایت طبرانی] اس کی سند میں سلیمان بن ارقم ضعیف راوی ہے۔ زہری اسی روایت کی وجہ سے نُنسِهَا بضم نون خفیفہ پڑھا کرتے تھے۔ جس نے نَنسَاهَا پڑھا اس معنی تاخیر کے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بلکہ ترک و تبدیل کے معنی میں ہے۔ حضرت مجاہد نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ ہم اسے خط میں تو ثابت رکھتے ہیں مگر حکم میں بدل دیتے ہیں۔ جس نے نون کے ضمہ سے پڑھا اس نے اس کو نسیان سے لیا ہے۔ حضرت حسن نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ بعض قرآن پڑھتے پھر اسے بھول جاتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رات کو وحی اترتی تو دن کو فراموش ہو جاتی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

فائدہ: اور جو فرمایا کہ جو بھی ہم منسوخ کرتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر اور آیت لے آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری ایت نفع عاجل یا اجل میں زیادہ ہوتی ہے یا اس کا ایک نفع دونوں نفعوں سے زیادہ ہے۔ یا اس کی مثل ہوتا ہے زیادہ نہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات ناسخ و منسوخ میں غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ کبھی نسخ ہلکا ہوتا ہے تو عاجل میں اس کا نفع زیادہ ہوتا ہے اگر نسخ اثقل ہو تو اس کا نفع اجل میں زیادہ ہو گا۔ اگر وہ برابر ہے تو نفع میں بھی یکساں ہو گا۔ اور شافعی نے اس آیت سے جو استدلال کیا ہے کہ قرآن و سنت متواترہ سے منسوخ نہیں ہوتا۔ یہ درست نہ ہے بلکہ حق یہ ہے کہ کتاب اللہ کا سنت سے منسوخ ہو جانا جائز ہے۔ اور جو فرمایا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اس سے پتا چلا کہ نسخ بھی مقدورات الٰہی سے ہے۔ نسخ کا انکار کرنا گویا قدرت کا انکار ہے۔ اس میں جواز نسخ پر دلیل ہے۔ اور دوسرے ارشاد میں کہ اللہ کے لیے ہی آسمان و زمین کی بادشاہی ہے اس سے یہود کی

تکذیب ہے جو نسخ کے منکر ہیں۔

فائدہ: سارے اہل اسلام سلفاً وخلفاً اس بات پر متفق ہیں کہ نسخ ثابت و جائز ہے۔ عقلاً بھی واقع ہے اور سمعاً بھی کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا ہے۔ ہاں صرف یہود اسکے منکر ہیں۔ سو تورات اس پر حجت ہے کیونکہ اس سے نسخ کا قیام ثابت ہے۔ جب کہ حضرت نوح علیہ السلام کشتی سے اترے تو اللہ نے ان سے کہا کہ میں نے ہر جانور کو تیرے اور تیری اولاد کے لیے حلال کیا ہے۔ سو خون کے سوا تم اس کو نہ کھانا۔ پھر حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل پر کئی حیوانات حرام کر دیئے تھے اور یہ بھی تورات میں سے ثابت ہے کہ آدم علیہ السلام بہن بھائی کا ایک دوسرے سے نکاح کر دیتے تھے۔ پھر اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حرام کر دیا۔ یہ بھی تورات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا پھر کہا کہ اس کو ذبح نہ کرو۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی اسے قتل کرو لیکن پھر حکم دیا کہ اب تلوار روک دو۔ اسی طرح ان پر ہفتے کے دن کام کرنا حرام تھا جبکہ ان سے پہلے حلال تھا۔ تورات موجودہ میں ایسے بہت سے احکام موجود ہیں۔ قرآن کریم نے پہلی ساری کتابوں اور گذشتہ شریعتوں جیسے تورات اور انجیل وغیرہ کو منسوخ کر دیا۔ نسخ آیت کا یہ مطلب ہے کہ اس آیت کی تلاوت یا حکم یا دونوں چیزیں بطور عبادت ختم ہو چکی ہیں۔

فائدہ: بعض علماء نے کہا کہ منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو ہے لیکن محققین کے نزدیک ان کی تعداد پانچ سے زائد نہ ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دھلوی رحمہ اللہ نے "الفوز الکبیر" میں بھی یہی فرمایا۔ لیکن ان پانچ میں بھی نظر ہے۔ رہی حدیث سو ابن جوزی نے کہا کہ اکیس احادیث منسوخ ہیں۔ جبکہ ابن القیم نے کہا کہ نہیں بلکہ وہ دس سے بھی کم ہیں بلکہ پانچ سے بھی کم منسوخ ہیں۔ زرقانی نے شرح مؤطا میں لکھا کہ محدثین واصولیین وفقہاء کا مذہب یہ ہے کہ جہاں تک جمع ممکن ہو جمع واجب ہے۔ صاحب دراسات اللبیب نے مستقل ایک رسالہ اجتہادی نسخ کے بطلان پر لکھا ہے۔ پھر کہا کہ اکثر یہ دعویٰ فقہاء خصوصاً فقہاء حنفیہ کا ہے۔ متقدمین کے نزدیک معتبر نسخ وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع ہو کر آئے اور جو ان کے غیر تک پہنچتا ہے۔ وہ تعبُّد سے تشریع کی طرف زیادتی و تجاوز کرنا ہے۔

فائدہ: ابن کثیر نے فرمایا کہ اس آیت میں اللہ نے اپنے بندوں کو ارشاد فرمایا ہے کہ اس کی تمام مخلوقات میں وہی اکیلا تصرف کا حق رکھتا ہے۔ ساری مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔ جس کو جس طرح چاہا بنایا پھر جسے چاہا خوش بخت کیا اور جسے چاہا بد بخت بنا دیا۔ کسی کو تندرست کیا اور کسی کو بیمار کر دیا۔ کسی کو توفیق دی اور

کسی کو بے یار ومددگار چھوڑا۔ جسے چاہا حلال کیا اور جسے چاہا حرام کر دیا۔ جسے چاہا مباح کر دیا جسے چاہا پر خطر کر دیا۔ اللہ سے کون سوال کر سکتا ہے۔ سوال تو بندوں سے ہو گا کیونکہ اس کا فیصلہ کرنا تو مصلحت کے تحت ہے۔ جس کو صرف وہی جانتا ہے۔ اور نہی کی مصلحت بھی اسی کو معلوم ہے۔ ہم پر صرف اطاعت فرض ہے کہ سنتے ہی حکم بجا لائیں۔ رسول اللہ ﷺ کی تصدیق و پیروی میں رہیں اس مقام میں ایک بڑا رداور بلیغ بیان ہے۔ یہود کے اسحالۃ نسخ میں کفر کا دعویٰ عقلاان کا یہ دعویٰ جہل و کفر ہے اور نقلاً افتراء و تہمت ہے۔ ابن جریر نے کہا کہ یہود نے تورات کے احکام کے نسخ کا انکار کیا۔ اسی لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ کی نبوت کو نہ مانا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام کو تبدیل کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات وانجیل دونوں کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ مسلمانوں میں سے صرف ابو مسلم اصفہانی ایسا شخص ہے جس نے قرآن میں نسخ کا انکار کیا ہے۔ سو اس کا یہ قول ضعیف و مردود ہے۔ اور آیات منسوخہ کے متعلق اس کے جواب ناقابل قبول ہیں۔

اَمْ تُرِيدُونَ اَنْ تَسْئَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَى مِنْ قَبْلُ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿۱۰۸﴾

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے پیغمبر سے اسی طرح کے سوال کرو جس طرح کے سوال پہلے موسیٰ سے کئے گئے تھے، اور جس شخص نے ایمان (چھوڑ کر اس) کے بدلے کفر لیا وہ سیدھے رستے سے بھٹک گیا۔

فائدہ: اس میں ایمان والوں کو کثرت سوال سے منع کیا گیا ہے کہ وقوع سے پہلے کسی چیز کے متعلق سوال نہ کیا کرو۔ جیسے فرمایا: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَسْئَلُوا عَنْ اَشْيَاءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَاِنْ تَسْئَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَلَكُمْ﴾ "کہ ایمان والو! ایسی چیزوں کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر وہ تمہاری لیے ظاہر کی جائیں تو تمہیں بری لگیں اور کسی چیز کے متعلق تب سوال کرو جبکہ قران نازل ہو رہا ہو۔ تو وہ تمہارے لیے ظاہر کی جائے گی۔" یعنی اگر حکم کے آنے کے بعد پوچھو گے تو تفصیل کی جائے گی۔ ورنہ اگر اس کا حکم نازل نہ ہوا ہو تو اس کا سوال نہ کرو ایسا نہ ہو کہ ایک چیز حلال ہو مگر تکرار سوال سے وہ حرام کر دی جائے۔ اسی لیے صحیح حدیث میں آیا ہے کہ مسلمانوں میں سے بڑا مجرم وہ ہے کہ جس نے کسی غیر حرام چیز کا سوال کیا تو وہ اس کے سوال کی وجہ سے حرام ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس کسی مرد کو پائے تو کیا کرے اگر وہ اس متعلق بات کرے تو بڑی بات منہ سے نکالتا ہے اور اگر چپ کر رہتا ہے تو بڑی

بات پر چپ کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا۔ اس پر لعان کی آیت نازل ہوئی اور یہ اس سوال کا نتیجہ ہوا۔ صحیحین میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: قیل و قال اضاعت مال اور کثرت سوال سے منع فرمایا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جب تک میں تمہیں چھوڑ دوں تم مجھے چھوڑ دو۔ تم سے پہلے لوگ کثرتِ سوال اور اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہو گئے میں تمہیں جس بات کا حکم دوں بقدر استطاعت بجالاؤ اور جس چیز سے منع کروں اس سے بچو۔ اور یہ حدیث فرضیت حج پر ارشاد فرمائی۔ ایک شخص نے پوچھا کہ کیا ہر سال فرض ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے پھر تیسری دفعہ سوال پر فرمایا نہیں۔ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج واجب ہو جاتا اور اگر واجب ہو جاتا تو تم اس کی استطاعت نہ رکھتے۔ اسی لیے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم کثرتِ سوال سے منع کیے گئے اس لیے ہمیں یہ بات اچھی لگتی تھی کہ کوئی عقل مند دیہاتی آ کر سوال کریں اور ہم سنیں۔ اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا لفظ یہ ہے کہ مجھ پر ایک سال گذر جاتا کہ میں کچھ پوچھنا چاہتا مگر دہشت و ہیبت سے کچھ پوچھ نہ سکتا تھا اور تمنا کرتا کہ کوئی اعرابی آ جائے اور سوال کرے۔ [بروایت ابی یعلیٰ] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی کہ انہوں نے بارہ مسائل کے متعلق سوال کیا اور وہ کلام پاک میں مذکور ہیں۔ ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ "کہ وہ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں۔" اور: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ "اور آپ سے وہ حرمت والے مہینوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔" اور: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى﴾ "کہ وہ آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔" اور اسی طرح کی دوسری آیات بھی۔

فائدہ: اَمْ بمعنی هَلْ ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور یہ آیت مومنین و کافرین سب کو شامل ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب کی طرف مبعوث ہوئے جیسے فرمایا: ﴿يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ﴾ "کہ آپ سے اہل کتاب سوال کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے کوئی کتاب نازل کر دیں تو پھر انہوں نے حضرت موسیٰ سے اس بھی بڑا سوال کیا تھا کہ ہمیں اللہ کی ذات (واضح طور پر) جہراً دکھائیے۔ تو ان کو ان کے ظلم کی وجہ سے چیخ نے آ پکڑا۔" حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ رافع بن حریمہ اور وہب بن زید نے کہا تھا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہمارے لیے آسمان سے کوئی کتاب اتروا دو جس کو ہم پڑھیں، اور

نہریں چلادو تب ہم تیری تصدیق کریں گے اور تمہاری اطاعت کریں گے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی:﴿اَمْ تُرِیْدُوْنَ﴾ابو العالیہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے یہ سوال کیا تھا کہ کیا اچھا ہوتا کہ ہمارے کفارات بھی بنی اسرائیل کے کفارات کی طرح ہوتے۔اس پر آپ ﷺ نے فرمایا اے اللہ! میں یہ نہیں چاہتا۔پھر فرمایا جو تمہیں عطا کیا گیا ہے وہ ان سے کہیں بہتر ہے۔ان سے جب کوئی خطا ہوتی تو وہ کفارے سمیت اس کو اپنے دروازے پر لکھا ہوا پاتے۔اگر کفارہ دیتے تو دنیا میں رسوا اور اگر نہ دیتے تو آخرت میں رسوا ہوتے۔تو یہ کہا:﴿وَمَنْ یَعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَہٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہِ یَجِدَ اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا﴾"کہ جو کوئی برائی کرے یا اپنے نفس پر ظلم کرلے پھر اللہ سے بخشش مانگے تو اللہ کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔"پھر فرمایا کہ پانچ نمازیں اور جمعہ سے جمعہ تک درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہے۔جس نے برائی کا ارادہ کیا مگر عمل نہ کیا تو اس پر کوئی گناہ نہ لکھا جائے گا اور جس نے گناہ کرلیا تو اس پر ایک گناہ لکھا جائے گا۔اور جس نے نیکی کا ارادہ کیا مگر نہ کی تو اس پر ایک نیکی لکھی جائے گی جس نے نیکی کرلی اس پر دس گنا نیکی لکھی جائے گی اور اللہ پر صرف ھالک ہی ہلاک ہوتا ہے۔پھر اللہ کریم نے یہ آیت باب نازل کی۔حضرت مجاہد نے فرمایا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ سے یہ سوال کیا تھا کہ ہمیں اللہ کی ذات کھلم کھلا دکھادو۔اور قریش نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ کوہ صفا کو سونے کا بنادو۔مگر فرمایا: بہتر مگر یہ حضرت عیسیٰ کے اس مائدہ کی طرح ہوگا جو کہ بنی اسرائیل کے حق میں تھا۔اس پر وہ اس سے باز آگئے۔سدی اور مقاتل نے بھی ہی بات کہی ہے۔حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ کریم نے ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ سے ہٹ دھرمی کے انداز میں سوال کرتے تھے۔جس طرح کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بطور تکذیب وعناد سوال کیا تھا۔

فائدہ: سیدھی راہ سے صراط مستقیم مراد ہے اس راستے سے نکلنا یہ ہے کہ جہالت و گمراہی میں جا گرے۔حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کا بھی یہی حال ہے جو تصدیق واتباع انبیاء سے پھر گئے ہیں اور بلاضرورت کفر و سرکشی کے طور پر سوال کرکے مخالفت و تکذیب میں گرفتار ہوئے۔جیسے فرمایا:﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَھَنَّمَ یَصْلَوْنَھَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ﴾" کہ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہ دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو کفر (ناشکری) سے بدل دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں جا اتارا وہ جہنم میں داخل ہوں گے اور (وہ) برا ٹھکانا ہے۔"ابو العالیہ نے کہا مراد یہ ہے کہ نرمی کے بدلے سختی لے لی۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾

بہت سے اہل کتاب اپنے دل کی جلن سے یہ چاہتے ہیں کہ ایمان لا چکنے کے بعد تم کو پھر کافر بنا دیں، حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے، تو تم معاف کر دو اور در گذر کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا (دوسرا) حکم بھیجے، بے شک اللہ ہر بات پر قادر ہے۔

فائدہ: آخری نبی علیہ السلام کو حکم ہوا اس پر یہود کو مدینہ کے آس پاس سے نکال دیا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو خبر دار کیا کہ تم اہل کتاب کی پیروی میں نہ لگ جاؤ۔ وہ تو ظاہراً اور باطناً تم سے دشمنی رکھتے ہیں۔ اور باوجود اس بات کے کہ وہ جانتے ہیں کہ تم اور تمہارے پیغمبر علیہ السلام فضل والے ہیں وہ تم سے حسد کرتے ہیں۔ پھر تم فتح ونصرت تک خاموش رہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت حیی بن اخطب اور یاسر بن اخطب کے متعلق نازل ہوئی۔ جو یہودی تھے۔ اور جس قدر ایمان والوں سے انہیں حسد ہوتا تھا اور کسی کو نہ ہوتا تھا۔ ان کو جہاں تک موقع ملتا مومنین کو دین سے پھیرنے میں لگے رہتے تھے۔ زہری نے کہا کہ یہ آیت کعب بن اشرف یہودی شاعر کے متعلق اتری جو نبی علیہ السلام کی ہجو بیان کیا کرتا تھا۔

فائدہ: یہ آیت: ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ اس آیت کی طرح ہے جو فرمایا: ﴿وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا﴾ "اور تم ضرور ہی پہلے اہل کتاب سے اور مشرکوں سے بدگوئی سنو گے۔" سدی نے کہا کہ یہ عفو وصفح کی آیت منسوخ ہے اس کی ناسخ وہ آیت ہے: ﴿فَاقْتُلُوْا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ "کہ مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ انہیں قتل کر دو۔" اور یہ فرمان: ﴿وَقَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ "کہ ان لوگوں سے لڑو جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے۔" اکثر سلف کا یہی قول ہے کہ یہ آیت آیت سیف سے منسوخ ہے۔ چنانچہ ﴿حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ﴾ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم اسی آیت کی وجہ سے مشرکین اور اہل کتاب سے در گذر فرماتے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرتے۔ حتیٰ کہ جب اللہ نے ان سے لڑائی کی اجازت دے دی تو قریش کے بڑے بڑے سردار قتل کیے گئے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس کو ابن ابی حاتم نے روایت کیا۔ اس کی سند درست ہے مگر اس کو بعینہٖ کتب ستہ میں نہیں دیکھا ہاں اس

کی اصل صحیحین میں موجود ہے۔

فائدہ: جس طرح دورِ نبوی ﷺ میں اہل کتاب یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اسلام چھوڑ کر کتابی مشرک بن جائیں اور ان کی عزت و عظمت جاتی رہے اسی طرح اس زمانے میں وہ لوگ اسی فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح مسلمان اپنا دین چھوڑ کر کتابی ہو جائیں اور ان کا کوئی مقابل اس دنیا میں نہ رہے۔ پھر جس طرح ابتدائے اسلام میں مسلمانوں نے ان کی ایذاؤں پر صبر کیا تھا اسی طرح آج غربائے اسلام ان سے صدہا تکالیف لینے کے بعد بھی صابر ہیں اور درگذر کرتے ہیں۔ پھر جس طرح ایک مدت بعد رسول اللہ ﷺ کو ان سے قتال کا حکم ہوا تھا اسی طرح رسول اللہ علیہ السلام نے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ تم زمانہ مہدی و عیسیٰ علیہما السلام ان کو قتل کرو گے۔ سو سارے مسلمان اسی انتظار میں خاموش ہیں حتیٰ کہ ﴿يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ﴾ اگرچہ نبی علیہ السلام کے وعدہ کے موافق کوئی نہ کوئی گروہ کسی نہ کسی جگہ غالب رہتا ہے مخالف اس کو کوئی تکلیف نہیں دے سکتا مگر تکالیف غربتِ اسلام کا عمومی دورِ ظہور مہدی و نزول عیسیٰ کے بغیر ختم ہوتا نظر نہیں آتا ہے۔ اس آیت پر پہلے پارے کا ثلث مکمل ہوتا ہے۔

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّٰهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٠﴾	اور نماز ادا کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور جو بھلائی اپنے لیے آگے بھیج رکھو گے اس کو اللہ کے ہاں پالو گے، کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ کریم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ تم ایسے کاموں میں مشغول رہو جو تمہیں آخرت کا فائدہ دیں۔ دنیا میں فتح و نصرت حاصل ہو اور اس دن گواہ حاضر ہوں جس دن کہ ظالموں کو عذر خواہی کچھ فائدہ نہ دے گی۔ بلکہ ان پر لعنت اور برا انجام ہو گا۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ ہم تمہارا عمل دیکھتے ہیں۔ یعنی تمہارے ہر کام سے باخبر ہیں۔ وہ اچھا ہو یا برا ہو ہر کام کرنے والے کو اس کے کیے کی جزاء ملے گی۔ یہ آیت اگرچہ مخرج خبر سے خارج ہے مگر اس میں وعدہ وعید اور امر و زجر سب کچھ موجود ہے۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے جو فرمایا: ﴿وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّٰهِ﴾ ''کہ تم اپنے نفسوں کے لیے جو بھی خیر آگے بھیجو گے اس کو اللہ کے ہاں پاؤ گے۔'' گویا سب کو یہ بتا دیا گیا کہ تم جو بھی اطاعت کرو گے ثواب پاؤ گے۔ اور معصیت سے بچو عذاب سے نجات پاؤ گے۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۱۱﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۱۲﴾

اور (یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے سوا کوئی بہشت میں نہیں جانے کا ہے، ان لوگوں کے خیالات باطل ہیں (اے پیغمبر ان سے) کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو دلیل پیش کرو ۔ہاں جو شخص اللہ کے آگے گردن جھکادے (یعنی ایمان لے آئے)اور وہ نیکو کار بھی ہو تو اس کا صلہ اس کے پروردگار کے پاس ہے اور ایسے لوگوں کو (قیامت کے دن) نہ کسی طرح کا خوف ہو گا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس آیت میں اہل کتاب کا غرور ذکر کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک گروہ اس بات کا دعوے دار تھا کہ صرف جنت میں وہ جائے گا جو ان کے دین پر ہو گا۔ جیسے سورۃ مائدہ میں فرمایا:﴿قَالُوْا نَحْنُ اَبْنٰٓءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآءُ هٗ﴾ ”کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔“لیکن اللہ کریم نے فرمایا کہ وہ جھوٹے اور فریبی ہیں۔ یہ ان کی فقط تمنا ہے جس کی حقیقت نہ ہے وہ اپنے گناہوں کی سزا پائیں گے اور جہنم کو چکھیں گے۔ اگر وہ سچے ہوتے تو عذاب نہ دیئے جاتے۔ یہ ان کا ایسا ہی دعویٰ ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ:﴿لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً﴾ ”کہ ہمیں ہرگز آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔“ پھر جس طرح اللہ نے اس جگہ ان کی تردید کی اسی طرح اس جگہ بھی ان کا رد کر دیا۔ کہ ان کا دعوے باطل ہے اور بلا حجت ہے۔ ابو العالیہ نے کہا کہ یہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ناحق تمنا ہے اس لیے اس کی سند طلب کی ہے۔ کہ تم دلیل پیش کرو اور گواہ لاؤ۔ پھر فرمایا کہ جس نے اللہ کے لیے اپنا دین خالص کیا اور وہ محسن یعنی رسول کا پیرو ہوا تو اس کے انجام خیر سے ہو گا۔ ابن کثیر نے کہا کہ متقبل عمل کی دو شرائط ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خالص اللہ کے لیے ہو، دوسری یہ کہ وہ سنتِ مطہرہ کے موافق ہو۔ اگر خالص ہو لیکن موافق سنت نہ ہو تو بھی مقبول نہ ہو گا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کوئی ایسا کام کیا جس پر ہمارا حکم نہ ہے تو وہ مردود ہے۔ [بروایت مسلم من حدیث عائشہ] سو ان درویشوں کا عمل اگرچہ فرض کیا جائے کہ وہ مخلص ہیں لیکن تب تک قبول نہ ہو گا جب تک کہ سنت کے مطابق نہ ہو۔ وہ رسول جنہیں تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیا گیا۔ انہی طرح کے لوگوں کے متعلق فرمایا:﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ ”اور ہم نے ان اعمال کی گئے جو انہوں نے کیے تھے۔ پس ہم نے انہیں بکھری خاک کی طرح کر دیا۔“ اور فرمایا:﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ

لَمۡ یَجِدۡہُ شَیۡئًا﴾" اور کافروں کے اعمال چٹیل میدان میں ریت کی طرح ہوں گے جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے حتیٰ کہ جب اس کے پاس آیا تو اس کو کچھ نہ پایا۔" اور فرمایا:﴿وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَۃٌ ۝ عَامِلَۃٌ نَّاصِبَۃٌ ۝ تَصۡلٰی نَارًا حَامِیَۃً ۝ تُسۡقٰی مِنۡ عَیۡنٍ اٰنِیَۃٍ ۝﴾"اس دن کئی چہرے جھکے ہوں گے بڑی محنت اور عمل کرتے تھکے ہوں گے (اور) دھکتی آگ میں داخل ہوں گے اور کھولتے ہوئے چشمے سے پانی پلائے جائیں گے۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر انہی رہبان کے متعلق کی ہے۔ رہی یہ بات کہ جس کی ظاہری صورت موافق شریعت ہو لیکن خالص لوجہ اللہ نہ ہو تو ایسا عمل بھی مردود ہے۔

کالائے بد بریش خاوند　　　　وار یہ حال اھل ریا و نفاق کا ھے

فائدہ: جیسے فرمایا:﴿اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰہَ وَہُوَ خَادِعُہُمۡ وَاِذَا قَامُوۡۤا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوۡا کُسَالٰی یُرَآءُوۡنَ النَّاسَ وَلَا یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیۡلًا﴾"کہ بلا شبہ منافق اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ اللہ انہیں دھوکے میں رکھے گا۔ اور جب وہ نماز کی طرف کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں اور اللہ کو نہیں یاد کرتے مگر تھوڑا سا۔" اور فرمایا:﴿فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ سَاہُوۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ ہُمۡ یُرَآءُوۡنَ ۝ وَیَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ۝﴾"کہ ان نمازیوں کے لیے بربادی ہے جو اپنی نمازوں کو بھولے ہوئے ہیں وہ جو ریا کرتے ہیں اور عام استعمال کی چیزوں سے روکتے ہیں۔" اسی لیے یہ ارشاد فرمایا:﴿فَمَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلۡیَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشۡرِکۡ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖۤ اَحَدًا﴾ "کہ جو کوئی اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہو اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔" اور اس مقام پر فرمایا:﴿بَلٰی مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡہَہٗ لِلّٰہِ وَہُوَ مُحۡسِنٌ﴾"کہ کیوں نہیں جس نے اپنا چہرہ اللہ کے لیے مطیع کیا اور وہ محسن بھی ہوا۔" دونوں آیات کا مطلب ایک جیسا ہے۔ پھر اسی اخلاص و ثواب پر یہ وعدہ کیا کہ نہ کسی گذشتہ امر پر غم ہوا اور نہ آئندہ معاملے کا کچھ خوف ہوگا۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یعنی نہ مرتے وقت غم ہوگا نہ آخرت کا فکر ہوگا۔

وَقَالَتِ الۡیَہُوۡدُ لَیۡسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیۡءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَیۡسَتِ الۡیَہُوۡدُ عَلٰی شَیۡءٍ وَّہُمۡ یَتۡلُوۡنَ الۡکِتٰبَ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِہِمۡ فَاللّٰہُ

اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی رستے پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی رستے پر نہیں، حالانکہ وہ کتاب (الٰہی) پڑھتے ہیں، اسی طرح بالکل انہیں کی سی بات وہ لوگ کہتے ہیں جو (کچھ) نہیں جانتے (یعنی مشرک) تو جس بات میں یہ لوگ

يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۱۳﴾ اختلاف کر رہے ہیں، اللہ قیامت کے دن اس کا ان میں فیصلہ کر دے گا۔

فائدہ: اس آیت مبارکہ میں اللہ کریم نے اہل کتاب کا باہم بغض و عناد اور دشمنی بیان کی کہ ان میں آپس میں بہت دشمنی و بغض ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب نجران کے عیسائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو علمائے یہود بھی حاضر ہوئے اور آپس میں ایک دوسرے سے جھگڑا اور بحث کرنے لگے۔ رافع بن حذیمہ یہودی نے کہا کہ تم کوئی چیز نہ ہو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کیا اس پر ایک نجرانی عیسائی نے کہا کہ تم بھی کچھ نہیں ہو اور موسیٰ علیہ السلام اور تورات کا انکار کر دیا۔ اس پر اللہ کریم نے یہ آیت نازل کی۔ فرمایا یہ دونوں کتاب پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق اپنی کتابوں میں پاتے ہیں۔ یہود کا حضرت عیسیٰ کا انکار کرنا بالکل غلط ہے اس لیے کہ اللہ کریم نے تورات میں زبان موسیٰ علیہ السلام سے ان سے اقرار لیا تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدقی کریں اسی طرح انجیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کی تصدیق موجود ہے۔ پھر ایک کا دوسرے کو کافر کہنا کیسا ہوا؟ حضرت مجاہد و قتادہ نے کہا کہ پہلے یہود اور نصاریٰ کسی حد تک رستے پر تھے۔ اور ان یہود و نصاریٰ سے وہ لوگ مراد ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے۔ انہوں نے بدعات نکال لیں اور متفرق ہو گئے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ اس سے سب مراد ہیں ایک نے دوسرے کا مقابلہ فاسد بالقاسد کیا اور وہ سب کچھ بطریق کفر و عناد تھا۔

فائدہ: بقول قتادہ لَا يَعْلَمُونَ سے نصاریٰ مراد ہیں۔ جنہوں نے یہود سے بات چیت کی۔ حضرت عطاء نے کہا کہ یہ وہ امتیں ہیں جو یہود و نصاریٰ سے پہلے تھیں جبکہ تورات اور انجیل موجود نہ تھیں جیسے قوم نوح ہود صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کو ان اقوام نے اپنے انبیاء کے متعلق کہا کہ وہ کسی راہ پر نہ ہیں۔ سدی نے کہا اس سے عرب مراد ہیں۔ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وہ کسی راہ پر نہ ہیں۔ موضح القرآن کا لفظ یہ ہے کہ جن کے پاس علم نہ ہے وہ عرب کے لوگ ہیں ابتداء میں یہ دین ابراہیمی کے پیرو تھے لیکن آخر میں بہک کر بت پرست ہو گئے۔ ایسے شخص کو مشرک کہتے ہیں وہ اپنا رستہ بتاتے تھے کہ وہ سیدھی راہ پر ہیں۔ ابن جریر نے کہا کہ آیت عام ہے اور سب کو شامل ہے کسی ایک کے تعین میں کوئی قطعی دلیل موجود نہ ہے۔ اس لیے آیت کو عام رکھنا زیادہ مناسب ہے۔ واللہ اعلم۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ یا آیت پہلی امتوں یا گذشتہ عرب کے ساتھ خاص نہ ہے۔ بلکہ ہر زمانے کے بے علم لوگ اپنے اپنے وقتوں میں اسی طرح کی گفتگو کرتے ہیں۔ باوجود قرآن پڑھنے کے

روافض کو دیکھئے کہ وہ ((خوارج نواصب کو لا علی شیء)) کہتے ہیں اور کافر سمجھتے ہیں اور خوارج روافض کو کافر کہتے ہیں۔ اور اسلام کے بہتر فرقوں میں سے ایسے بہت سے فرقے نکلیں گے۔ جن میں باہم ایک دوسرے کو کافر کہنے کا سلسلہ جاری رہا یا جاری ہے۔ اور مقلدین مذاہب کا بھی یہی حال ہے کہ ہر مقلد دوسرے کو گمراہ اور بدعتی بتاتا ہے بلکہ کافر تک کا فتویٰ لگاتا ہے۔ ہاں اللہ کریم نے اہل السنۃ والجماعۃ کو اس مصیبت سے بچالیا ہے کہ وہ نہ تو کسی مسلمان کو لَا شَیٔ کہتے ہیں اور نہ کسی پر تب تک کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں جب تک کے صریح کفر موجود نہ ہو۔ ﴿وَذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ امام رازی نے فرمایا کہ یہ واقعہ یقیناً اس امت میں واقع ہوا کہ ایک گروہ دوسرے کو کافر کہتا ہے۔ باوجود اس بات کے کہ تلاوت کلام پر سب کا اتفاق ہے۔

فائدہ: اور جو فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ ان کا فیصلہ کرے گا اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس دن عدل کا ترازو قائم ہوگا اور ذرہ برابر بھی کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔ جس طرح کہ سورۃ حج میں فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئِيْنَ وَالنَّصَارٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾ ”کہ بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور جو صابی اور نصاریٰ اور جو مجوس ہوئے اور وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا بلاشبہ اللہ کریم قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کردے گا بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔“

یہ چھ گروہ ہوئے جن کے درمیان قیامت والے دن فیصلہ کیا جائے گا۔ جس طرح فرمایا: ﴿قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ﴾ ”کہ فرما دیجئے! ہمارا رب ہمیں جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کردے گا اور وہ فیصلہ کرنے والا جاننے والا ہے۔“ فتح سے اس جگہ حکم و فیصلہ مراد ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے اس وقت تک جتنی امتیں گذری ہیں اور جو ان میں باہم اختلاف ہوئے ہیں قیامت کے دن ان سب کا فیصلہ اللہ رب العزت کے سامنے ہوگا۔ تم بھی منتظر رہو ہم بھی منتظر ہیں تب سب کچھ معلوم ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴿۱۱۴﴾	اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام کا ذکر کیے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو، ان لوگوں کو کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہی اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

فائدہ: نصاریٰ آپ ﷺ کو منصف جانتے تھے اور یہودیوں کو ظالم سمجھتے تھے کیونکہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دشمنی کی اور ہم نے ان کی تصدیق کی۔ اللہ کریم نے فرمایا کہ جب عیسائیوں نے غلبہ حاصل کر لیا تو یہودیوں کی مساجد کو خراب کر دیا اور مسجد بیت المقدس کو ویران کر دیا۔ اور یہ سب عمل یہودیوں کی مخالفت کا نتیجہ تھا۔ پھر یہ کون سا انصاف ہوا کہ (یہودیوں) انسانوں کے مخالفت میں اللہ کے گھر کو برباد کیا جائے پھر فرمایا کہ یہ بھی ان کے لائق نہ ہے کہ وہ وہاں حاکم کی حیثیت سے رہیں۔ آخر میں اللہ کریم نے وہ ملک شام مسلمانوں کو سونپ دیا۔ جب سے اب تک اللہ کے فضل و کمال سے وہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ چند روز کے لئے وہ ان سے چھن گیا تھا پھر واپس آ گیا۔ اب وہ ترکیوں کے قبضے میں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا لفظ یہ ہے کہ ان مانعین مساجد سے کون لوگ مراد ہیں ان کی تعیین میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے نصاریٰ مراد ہیں۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ وہ مسجد بیت المقدس میں پریشان کن چیزیں ڈال دیتے تھے۔ اور لوگوں کو نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ بربادی کی کوشش کرنے والے سے بخت نصر مراد ہے۔ اس کے لشکر والوں نے بیت المقدس کو خراب کیا اور یہودیوں کی دشمنی کی وجہ سے عیسائیوں نے اس کام پر ان کی مدد کی یہ بخت نصر بابلی مجوسی تھا۔ لیکن اس قول میں اتنی بات ہے کہ بخت نصر کا دور بالاتفاق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے کا ہے جب کہ نصاریٰ کا دور عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کا ہے۔

پھر وہ کیسے اس کے مددگار ہو سکتے ہیں۔ سدّی نے کہا کہ روم نے بخت نصر کی مدد کی اور مسجد میں مردار لا کر ڈال دیتے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل نے یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو قتل کیا تھا۔ حضرت حسن بصری کا بھی یہی قول ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مانعین مساجد سے وہ مشرک مراد ہیں جو حدیبیہ کے دن رسول اللہ ﷺ اور مکہ معظمہ کے درمیان حائل ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ ذی طویٰ مقام پر قربانی کے اونٹ ذبح کر کے چلے گئے انہیں کتنا ہی کہا کہ یہ وہ گھر ہے اس جگہ کبھی کسی نے کسی کو نہیں روکا۔ حتیٰ کہ کوئی شخص اپنے باپ کے قاتل کو بھی پائے تو اسے بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ انہوں نے ایک نہ مانی اور کہا کہ جنہوں نے بدر کے دن ہمارے آباء و اجداد کو قتل کیا وہ ہرگز ہمارے شہر میں داخل نہ ہونے پائیں گے۔ ہم زندہ ہوں اور وہ اس جگہ آ جائیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بربادی کی کوشش سے مراد یہ ہے کہ جو کوئی مسجد الحرام میں حج یا عمرہ کی غرض سے آتا اس کو آنے نہ دیتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کو خانہ کعبہ کے قریب نماز پڑھنے سے روک دیا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر نے پہلا قول اختیار کیا ہے کہ قریش نے بیت اللہ کی خرابی میں

کوئی کوشش نہ کی بلکہ رومیوں نے بیت المقدس کو ویران کیا۔ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دوسرا قول ظاہر ہے۔اس دلیل پر کہ جب عیسائیوں نے یہودیوں کو بیت المقدس میں نماز پڑھنے سے روکا اس وقت عیسائیت یہودیت پر غالب تھی۔اور یہی لوگ اقرب تھے۔اس وقت یہود کا ذکر مقبول نہ تھا۔اس لئے کہ اس سے پہلے وہ زبان داؤد عیسیٰ علیہما السلام پر ملعون ٹھہر چکے تھے۔اس کے علاوہ یہ بھی کہ جب اللہ یہود و نصاریٰ کے ذکر سے فارغ ہوا تو ان مشرکین کی مذمت کی جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو مکہ سے نکال دیا تھا اور انہیں بیت اللہ میں نماز پڑھنے سے روک دیا۔رہی یہ بات کہ قریش نے مکہ کی خرابی میں کوئی کوشش نہیں کی۔سو اس سے بڑھ کر اور کیا خرابی ہو گی کہ اصل دین حق والوں یعنی نبی علیہ السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو وہاں سے نکال کر خود بت لے کر مکہ کے اصل مالک بن بیٹھے اور اپنے کفر و شرک اور شرک کا رواج دیا جیسے فرمایا: ﴿وَمَا لَهُمْ اَلاَّ يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْا اَوْلِيَآءَهٗ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗ اِلاَّ الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ''کہ اور انہیں کیا ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ کرے اور حالانکہ وہ مسجد الحرام سے روکتے ہیں اور نہ وہ اس کے مالک تھے۔اس کے مالک تو متقین ہیں لیکن وہ اکثر نہیں جانتے۔'' اور فرمایا کہ: ﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ شَاهِدِيْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُوْنَ۔اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلاَّ اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ﴾ ''اور مشرکین کے لائق نہ ہے کہ وہ اللہ کی مساجد کو آباد کریں جب کہ وہ اپنے نفسوں پر کفر کے گواہ بھی ہیں۔یہی لوگ ہیں کہ جن کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔بلاشبہ اللہ کی مساجد تو وہ آباد کرتا ہے جو اللہ پر ایمان لایا اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی اور صرف اللہ سے ڈرا۔پھر امید ہے کہ یہ لوگ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہوں۔'' اور فرمایا: ﴿هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ ''یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تمہیں مسجد الحرام سے روکا اور روکی ہوئی قربانی کو لے کر وہ اپنی جگہ پہنچے اور اگر کچھ مومن مرد اور کچھ مومنہ عورتیں نہ ہوتیں جن کو تم نہ جانتے تھے کہ تم انہیں روندھ دیتے پھر تمہیں ان کی طرف سے عیب لگتا بغیر علم کے۔(یہ اس لئے) تاکہ اللہ جسے چاہے اپنی

رحمت میں داخل کردے گا وہ علیحدہ ہوتے تو ہم ان میں سے کافروں کو دردناک عذاب دیتے۔" پھر جب نماز ادا کرنے والوں اور زکوٰۃ دینے والوں کو وہاں سے نکالا گیا تو اس سے بڑھ کر اور کیا بربادی ہوگی۔ اور تعمیر و آبادی یہ نہ ہے کہ اس کو اچھی صورت میں بنائیں اور اس پر نقش و نگار کریں بلکہ اس کی آبادی یہ ہے کہ اس میں اللہ کا ذکر کیا جائے اور شرع قائم کی جائے اور یہ کفر و شرک کی نجاسات و بے ہودگیوں سے پاک رہیں۔

فائدہ: اور جو فرمایا کہ نہ وہ داخل ہوں مسجد میں مگر ڈرتے ہوئے اس کا مطلب یہ ہے کہ اے مومنو! جب تمہیں ان پر غلبہ ہو تو انہیں بطور صلح یا جزیہ لینے کے سوا کسی حالت میں اس میں داخل نہ ہونے دو۔ جب مکہ فتح ہو گیا تو آنحضرت ﷺ نے آئندہ یعنی نو ہجری میں حکم دیا اور منیٰ میں اعلان کروادیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کو نہ آئے۔ اور نہ کوئی برھنہ اس گھر کا طواف کرے اور جس کی کوئی مدت باقی ہو وہ اس کو پورا کرے۔ اور یہ اعلان اس فرمان کی تصدیق میں تھا۔ ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا﴾ "کہ اے ایمان والو! بلاشبہ مشرک لوگ ناپاک ہیں پس وہ اپنے اس برس کے بعد مسجد الحرام کے قریب نہ آئیں۔"

بعض نے کہا بلکہ مطلب یہ ہے کہ نہ آئیں مسجد میں مگر اس بات سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں مومنین انہیں پکڑ نہ لیں چہ جائیکہ وہ ان مساجد پر قابض و غالب ہوں۔ اور مومنین کو مساجد سے روکیں۔ اگر کفار کا ظلم و ستم نہ ہو تو حق تو یہ ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو بشارت ہے کہ عنقریب وہ مسجد الحرام اور دوسری مساجد پر غالب ہوں گے۔ اور مشرک اس قدر ذلیل و رسوا ہوں گے کہ کوئی بے خوف ہو کر مساجد میں نہ آسکے گا۔ ہر کسی کو یہ خوف ہوگا کہ کہیں مومنین کے ہاتھوں پکڑے یا غیر مسلم ہونے کی صورت مارے نہ جائیں۔ سو اللہ کریم نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا اور مشرکین کو مسجد الحرام کے داخلے سے روک دیا۔ آنحضرت ﷺ نے وصیت فرمائی کہ جزیرہ عرب میں دو دین باقی نہ رہنے پائیں۔ یہود و نصاریٰ کو یہاں سے نکال دو۔ وللّٰہ الحمد والمنة۔

اگر یہ آنحضرت ﷺ کی نسبت سے بیت الحرام کو پاک کرنے کا عظیم کارنامہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ اور یہ تو ان کی دنیا میں رسوائی ہوئی کہ جزاء جنس عمل سے ہوئی کہ جس طرح انہوں نے مسلمانوں کو بیت الحرام سے روکا اس طرح انہیں بھی بیت اللہ کے داخلے سے روک دیا گیا اور جس طرح انہوں نے مومنین کو مکہ سے نکالا انہیں بھی وہاں سے نکال دیا گیا۔ لیکن آخرت میں انہیں بیت الحرام کی حرمت کو پامال کرنے اس میں بت نصب کرنے

اور وہاں برہنہ طواف کرنے اور اللہ کے گھر میں غیر اللہ سے مانگنے پر جو عذاب عظیم اور سزا ہوگی وہ اس سے مزید ہے۔ جس نے مسجد سے بیت المقدس مراد لیا ہے۔

اس نے کعب الاحبار کے حوالے سے کہا کہ جب نصاریٰ اس پر غالب ہوئے تو انہوں نے اس کو ویران کر دیا۔ پھر اللہ کریم نے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا اور ان پر یہ آیت نازل کی۔ سو زمین پر کوئی عیسائی ایسا نہ ہے جو بے خوف ہو کر مسجد بیت المقدس میں آئے۔ سدی نے کہا کہ کوئی عیسائی نہ ہے مگر اس کو خوف ہے کہ کہیں وہاں اس کو قتل نہ کر دیا جائے یا اس سے زبردستی جزیہ نہ وصول کیا جائے۔ حضرت قتادہ نے کہا کہ نہیں آتے مساجد میں مگر چھپ کر حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ کچھ اس آیت کے منافی نہ ہے۔ کہ عموم آیت میں داخل ہو۔ اس لئے کہ عیسائیوں نے جب بیت المقدس کی بے حرمتی کی اور جس صخرہ کی طرف یہود عبادت کے لئے رخ کیا کرتے تھے اس کی بھی بے حرمتی کی تو بعض اوقات زمانہ میں اللہ نے انہیں ذلت سے دوچار کیا جب کہ وہ جگہ انہی سے بھر گئی تھی۔ اسی طرح جب کہ وہاں یہودیوں نے اللہ کی نافرمانی پر کمر کس لی اور عیسائیوں سے بھی آگے نکل گئے۔ تو اللہ نے ان کو بہت بڑی سزا دی۔ اسی لئے ان مفسرین نے خزی دنیا کو خروج مہدی سے تعبیر کیا۔ سدی، عکرمہ، وائل بن داود کا یہی قول ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا اس رسوائی سے یہ مراد ہے کہ وہ ذلت و رسوائی سے خود اپنے ہاتھوں جزیہ دیں گے مگر درست بات یہ ہے کہ اس سے عام مفہوم مراد ہے۔ بہر حال حدیث پاک میں ((خزی الدنیا والاخرۃ)) سے پناہ مانگی ہے۔ بشر بن ارطاۃ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: ((اللھم احسن عاقبتنا فی الامور کلھا واجرنا من خزی الدنیا وعذاب الاخرۃ)) [بروایت احمد] یہ حدیث حسن ہے مگر کتب ستہ میں نہیں ہے۔ ان سے فقط یہی ایک حدیث یا حدیث ((لا تقطع الایدی فی العزو)) مروی ہیں اور ان کو ابن ابی ارطاۃ بھی کہتے ہیں۔

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ مساجد کی ویرانی سے یا یہ مراد ہے کہ انہیں گرا دیں یا ان کو اس مقصد سے بند کر دیں جس کے لئے وہ بنائی گئیں ہیں۔ جیسے علم سیکھنا سکھانا، اعتکاف کرنا، نماز کے انتظار میں رہنا۔ پھر ایسے ظالموں کو چاہئے کہ جس حالت میں بھی آئیں یہ خوف انہیں ہر حال میں دامن گیر رہنا چاہئے۔ اور وہ اس خوف سے لرزتے اور کانپتے ہوئے آئیں کہ کہیں پکڑے نہ جائیں۔ کیونکہ بیت المقدس نصاریٰ کے حج و زیارت کا مقام ہے۔ کسی نے کہا کہ خوف سے مراد ذمی سے جذیہ لینا اور حربی کو قتل کرنا ہے۔ کسی نے کہا کہ اس سے فتح قسطنطنیہ وروميه و عموریہ مراد ہیں۔ مگر پہلا قول زیادہ مناسب ہے اس آیت میں بندوں کو یہ ارشاد ہے کہ مساجد کو اہل کفر

سے پاک رکھیں وہ کوئی بھی مسجد ہو اور کیسا بھی کافر ہو۔ اس لئے کہ لفظ عام ہے گو سبب خاص ہو۔ ان کے لئے دنیا میں ذلت ورسوائی قتل وقید وجزیہ وغیرہ اور آخرت میں دوزخ کی صورت میں عظیم عذاب ہوگا۔

وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴿۱۱۵﴾ اور مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کا ہے تو جدھر تم رخ کرو ادھر اللہ کی ذات ہے، بے شک اللہ صاحب وسعت اور باخبر ہے۔

فائدہ: یہود ونصاریٰ کا ایک یہ بھی جھگڑا تھا کہ ہر گروہ اپنے اپنے قبلے کو بہتر بتاتا تھا اس پر اللہ کریم نے فرمایا کہ وہ کسی ایک سمت مخصوص نہ ہے بلکہ اس کے حکم سے جس طرف بھی منہ کرو وہ متوجہ ہوتا ہے۔

فائدہ: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے تسلی ہے۔ جنہیں کفار نے مکہ سے نکال دیا تھا اور مسجد و مصلیٰ علیحدہ کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں کعبہ کے سامنے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جب مدینہ آئے تو سولہ یا سترہ ماہ اس طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے پھر اللہ کریم نے کعبہ کی طرف پھیر دیا اور یہ آیت نازل کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سب سے پہلے منسوخ ہونے والا حکم یہی تھا اس کی ناسخ یہ آیت ہے: ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾ "اور جہاں سے تم نکلے پس اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف پھیر لیجئے۔ اور تم جہاں بھی ہو تو اپنا منہ اس طرف پھیر لو۔" پھر فرمایا کہ وجہ اللہ سے قبلۃ اللہ مراد ہے۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ تم جہاں کہیں ہو منہ قبلہ کی طرف پھیر لو۔ یعنی کعبہ کی طرف۔ ابن جریر نے بعض کا قول نقل کیا فرمایا کہ اس آیت کا نزول کعبہ کی طرف توجہ کی فرضیت سے پہلے کا ہے۔ یعنی جب مشرق ومغرب کی نسبت اللہ کی طرف ہوئی تو کوئی جگہ اس سے مستثنیٰ نہ رہی۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَا أَدْنَىٰ مِنْ ذَالِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَمَا كَانُوا﴾ "اور نہ اس سے کم نہ زیادہ مگر وہ جہاں بھی ہوں وہ ان کے ساتھ ہے۔ پھر جس سمت بھی تمہارا منہ ہوگا وہ اللہ ہی کی طرف ہے۔" پھر جب بیت الحرام کی طرف متوجہ ہونا فرض ہوا تو ہر سمت کا حکم منسوخ ہو گیا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ بات کہ کوئی جگہ اللہ سے خالی نہ ہے۔ اس سے اگر اللہ کا علم مراد ہو تو صحیح ہے کیونکہ اس کا علم تمام معلومات کو محیط ہے۔ رہی اس کی ذات تو وہ مخلوقات میں سے کسی میں محصور نہیں ہو سکتی۔ ((تعالیٰ عن ذالك علوًا كبيراً)) "پھر ابن جریر سے نقل کیا ہے کہ بعض کے نزدیک یہ آیت رسول اللہ ﷺ کو بحالت سفر وشدت وخوف نماز مشرق ومغرب جس طرف چاہیں ادا کر لینے کی اجازت ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ سواری جس طرف چاہے چلتی

رہے۔اس آیت کے یہی معنی ہیں۔ فرماتے تھے کہ اس حدیث کی اصل صحیحین میں ہے۔بخاری شریف میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ تم خوف کی صورت میں نماز پڑھو خواہ سواری پر یا پیدل یا قبلہ رخ یا غیر قبلہ رخ۔نافع نے کہا میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس بات کو رسول اللہ ﷺ سے ذکر کرتے تھے۔

مسئلہ: ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام شافعی نے عام سفر میں اور بغرض جہاد کیے گئے سفر میں کوئی فرق نہیں رکھا سب میں نفل نماز سواری پر پڑھی۔امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے مگر مالک و مالکیہ اس کے خلاف کہتے ہیں۔ابو یوسف و ابو سعید اصطخری نے یہ اختیار کیا ہے کہ سواری پر نفل نماز صرف شہر میں ہو گی بحالت سفر طویل میں نہیں۔ حضرت انس بن مالک سے بھی یہی مروی ہے۔ طبری نے بھی اسے اختیار کیا ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ آیت ایک ایسی قوم کے متعلق نازل ہوئی ہے جنہیں قبلے کا علم نہ تھا۔ہر ایک نے کسی نہ کسی سمت منہ کر کے نماز پڑھ لی۔اس پر اللہ کریم نے آگاہ کر دیا کہ تمہاری یہ نماز قابل قبول ہو گی۔جو تم نے قبلہ کو تلاش کرنے کے بعد ادا کی۔ گو کہ قبلہ کی طرف نہ ہوئی۔

عبید اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک اندھیری رات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔لوگوں نے پتھر جمع کر کے نماز ادا کی۔ صبح معلوم ہوا کہ اس جانب قبلہ نہ تھا۔انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی کہ آج رات ہم نے غیر قبلہ کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ابن کثیر نے اس کو اپنی سند سے لکھا ہے۔اس کی سند میں کچھ ضعیف راوی ہیں اسی کے لگ بھگ اور حدیثیں بھی مختلف طرق و الفاظ سے مروی ہیں۔ابن کثیر نے فرمایا گو کہ ان میں ضعف ہے مگر ایک دوسرے کو قوی کرتے ہیں۔رہی یہ بات کہ جو نماز قبلے کی طرف نہیں پڑھی اس کی قضا کرے یا نہ کرے اس سے متعلق دو اقوال ہیں اور یہ رویات قضاء نہ کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ نجاشی کے حق میں اتری۔جب آنحضرت ﷺ نے نجاشی کی خبر موت سنائی پھر نماز جنازہ پڑھنی چاہی تو لوگوں نے کہا کہ وہ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز نہ پڑھتا تھا۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ وہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتا تھا۔اس کو قبلہ کے منسوخ ہونے کی اطلاع نہ ملی تھی۔ قرطبی نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے اس پر نماز جنازہ پڑھی۔اس سے غائبانہ نماز جنازہ کا جواز ثابت ہوا۔ پھر کہا کہ نماز آنحضرت ﷺ کے ساتھ خاص تھی۔ میں کہتا ہوں کہ خصوصیت پر کوئی لائقِ اعتبار دلیل نہ ہے۔جب ایسا نہ ہے تو ہر غائب پر نماز جنازہ پڑھنا مسنون ہوا اور یہی بات زیادہ درست ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اہل مدینہ ،اہل شام و اہل عراق کا قبلہ مشرق و

مغرب کے درمیان ہے ۔[بروایت ابن مردویہ] ابن کثیر نے فرمایا کہ اس حدیث کو اس مقام سے ایک مناسبت ہے ۔اس کو ترمذی نے بھی مختصر بیان کیا اور حسن صحیح کہا۔پھر فرمایا کہ کئی صحابہؓ سے مروی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے ۔ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب تو مغرب کو دائیں اور مشرق کو بائیں طرف کرے گا تو قبلہ درمیان میں ہو گا۔[بروایت دار قطنی و بیہقی] مدینہ کے لوگ جنوب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ہند کے لوگ مغرب کی طرف منہ کرتے ہیں۔اور مکہ کے رہنے والے مسجد الحرام کے ہر چار اطراف کی جانب منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ابن جریر نے ایک یہ قول بھی نقل کیا کہ یہ آیت دعا کے متعلق اتری ہے۔حضرت مجاہد نے فرمایا جب آیت:﴿اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾"کہ مجھے پکارو میں تمہاری پکار قبول کروں گا۔"نازل ہوئی تو لوگوں نے پوچھا کہ ہم کس طرف رخ کر کے مانگا کریں۔تو نازل ہوئی:﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾"کہ جس طرف بھی تم منہ پھیر لو وہیں اللہ کا چہرہ ہے۔"معلوم ہوا کہ جس طرف بھی رخ کر کے مانگ لیا جائے درست ہے لیکن قبلہ رخ ہونا گو کہ افضل ہے۔

فائدہ: وَاسِعٌ وہ ذات ہے جو بندوں کو ان کے دین میں آسانی اور گنجائش عطا کرے اور جو بات ان کی طاقت سے باہر ہے اس کی تکلیف انہیں نہ دے اور اس کا علم سب پر حاوی ہو۔جیسے فرمایا:﴿وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا﴾"کہ اس نے ہر چیز کا علم سے احاطہ کر رکھا ہے۔"فراء النحوی نے کہا وَاسِعٌ وہ ہے جس کا جود و سخا ساری مخلوقات پر چھا جائے۔اور عَلِیْمٌ وہ ہے جس کا علم سب پر حاوی ہو کچھ بھی اس کے علم سے غائب نہ ہو سکے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ ﴿١١٦﴾ بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿١١٧﴾

اور یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے (نہیں) وہ پاک ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہی اور سب اس کے فرمانبردار ہیں۔(وہی) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کو ارشاد فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

فائدہ: اس آیت میں اور اس طرح کی آیت میں نصاریٰ اور ان جیسے لوگوں یعنی یہود و مشرکین کا رد ہے۔جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں ٹھہراتے تھے۔اللہ نے ان سب کو جھٹلا دیا اور اپنی تقدیس بیان کرنے کے بعد ان کے دعوے کو باطل کر دیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمینوں کے اندر ہے وہ سب اس کے اختیار میں ہے۔سب کا خالق و رازق اور مختار ہستی ہے۔جو چاہے ان میں نافذ کر لے وہ سب اسی کی مخلوق و ملکیت ہیں۔

پھر ایسے میں اس کی اولاد کہاں ہو سکتی ہے۔ اولاد تو ہم جنس ہوتی ہے اس کی ذات پاک کی کبریائی و عظمت کا نہ کوئی شریک ہے نہ اس کی اولاد بننے کا اہل۔ گویا یہ ناممکن ہے نہ اس کی بیوی ہے جو کہ اولاد کا ذریعہ ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ "کہ وہ آسمانوں ورزمینوں کو پہلی دفعہ پیدا کرنے والا ہے اس کے لیے اولاد کہاں ممکن ہے اور اس کی بیوی بھی نہیں ہے۔ اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہ ہر چیز کا علم (بھی) رکھتا ہے۔" اور دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا o تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا o اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا o وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا o اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا o لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا o وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا o ﴾ "اور انہوں نے کہا کہ رحمٰن نے اولاد پکڑی ہے۔ تحقیق تم بہت بھاری چیز لائے ہو (اس سے) قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائے زمین شق ہو جائے اور پہاڑ پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے اولاد کا دعویٰ کیا اور رحمٰن کو یہ لائق نہ ہے کہ وہ اولاد پکڑے۔ آسمان و زمین میں کوئی چیز نہ ہے مگر وہ رحمٰن کے پاس اس کے بندے بن کر آنے والے ہیں۔ اس نے ان کو گھیر رکھا ہے اور خوب شمار کر لیا ہے اور ان کا ہر ایک قیامت والے دن اس کے پاس اکیلا اکیلا آئے گا۔" اور ایک مقام پر یوں فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ o اَللّٰهُ الصَّمَدُ o لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ o وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ "آپ فرما دیجئے! اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ اس نے جنم دیا اور نہ اس کو جنم دیا گیا اور اس کی برابری کا کوئی ایک بھی نہ ہے۔" ان آیات میں اللہ کریم نے یہ بیان فرمایا کہ وہ عظیم ذات ایسی ہے کہ نہ کوئی شریک ہے نہ ہم مثل۔ اور اس کے سوا ہر چیز مخلوق ہے۔ پھر اس کی اولاد کیسے ممکن ہے۔ اس لیے بخاری شریف میں اس آیت کی تفسیر کے تحت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ کریم نے فرمایا: ابن آدم مجھے جھٹلاتا ہے۔ حالانکہ یہ اس کے لائق نہ تھا اور وہ مجھے گالی دیتا ہے اور اسے ایسا نہ کرنا چاہئے تھا، اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ میں اس کو دوبارہ لوٹانے پر قادر نہیں ہوں، اور گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میری اولاد ہے۔ جبکہ میں تو بیوی بچوں سے پاک ہوں۔ بخاری اس حدیث کے اس طریق سمیت روایت کرنے میں مفرد ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابن آدم نے میری تکذیب کی حالانکہ یہ اس کے لائق نہ تھی اور اس نے مجھے گالی دی حالانکہ اسے ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ تکذیب یہ کرتا ہے کہ وہ مجھے دوبارہ لوٹانے پر قادر نہیں سمجھتا ہے، جس طرح کہ میں نے اس کو پہلی دفعہ پیدا کیا ہے حالانکہ اس کا پہلی دفعہ پیدا کرنا دوسری دفعہ کی تخلیق سے آسان نہیں ہے۔ اور گالی

اس طرح دیتا ہے کہ اللہ نے اولاد پکڑی ہے۔ جبکہ میں تنہا معبود ہوں۔ میں کسی کا محتاج نہیں ہوں نہ میری بیوی بچے ہیں۔ نہ میرا کوئی ہم مثل ہے۔ [بروایت ابن مردویہ] صحیحین میں مرفوعاً آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر تکلیف دہ بات سن کر کوئی صبر کرنے والا نہ ہے۔ وہ لوگ تو اللہ کے لیے اولاد ٹھہراتے ہیں اور وہ انہیں رزق بھی دیتا ہے اور تندرسی بھی دیتا ہے۔ اور یہ اولاد ٹھہرانے والے یہود و نصاریٰ ہیں۔ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا اور عرب کے کفار کے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بنادیا۔

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قانت کے معنی نمازی کے ہیں۔ عکرمہ نے کہا کہ قانت اس کو کہتے ہیں جو اپنی زندگی کا اقرار و اظہار کرے۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا قنوت بمعنی اخلاص ہے۔ ربیع بن انس نے کہا کہ قانت قیامت والے دن کھڑے ہونے والے کو کہتے ہیں۔ یعنی جو حشر کے دن کو ماننے والا ہو۔ حضرت مجاہد نے فرمایا تابعدار مراد ہے یعنی جب کہا کہ انسان بن جا تو وہ بن گیا۔ حضرت مجاہد کا دوسرا قول یہ ہے کہ کافر کی اطاعت یہ ہے کہ اس کا سایہ نہ تو سجدہ ریز ہوتا ہے لیکن وہ دل میں ناخوش ہوتا ہے۔ ابن جریر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ اس میں سب قول سما جاتے ہیں کیونکہ قنوت و اطاعت اور اللہ کی طرف سکون و رجوع شرعی و قدری ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ "اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ اور ان کے سائے خوشی اور نہ خوشی سے صبح و شام اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔" حضرت ابو سعید خدری کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ قرآن میں جہاں بھی لفظ قنوت ہے اس سے اطاعت مراد ہے۔ [بروایت ابن ابی حاتم] اسی طرح امام احمد نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ قابل اعتماد نہ ہے۔ کچھ تعجب نہیں کہ یہ کسی صحابی و تابعی کا قول ہو۔ اس قسم کا اسانید تفاسیر میں بہت آتے ہیں۔ اس میں اکثر غیر معروف ہوتی ہیں ان پر دھوکے سے اعتماد نہ کرنا چاہئے کیونکہ سند ضعیف ہے۔

فائدہ: بدیع وہ ہے جو کسی چیز کو بغیر مثل کے پیدا کرے۔ یعنی اس کو بغیر کسی نمونے کے نئے سرے سے پیدا کرے۔ حضرت مجاہد و سدی نے کہا کہ بتقاضائے لغت یہی معنی درست ہیں۔ اس لیے نئی چیز کو بدعت کہا جاتا ہے۔ جس طرح صحیح مسلم میں ہے۔ ان کل محدثة بدعة کہ ہر نئی بات بدعت ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ بدعت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک بدعت شرعیہ ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) دوسری بدعت لغویہ ہے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز تراویح کے متعلق فرمایا: ((نِعْمَتِ الْبدعة

ھذا﴾ کہ یہ اچھا نیا طریقہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب لوگوں کو اس طریقے پر جمع کیا۔اس پر یہ بات ارشاد فرمائی۔ابن کثیر رحمہ اللہ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ ہر بدعت شرعی گمراہی ہے سیئہ و حسنہ کی کوئی تقسیم نہ ہے۔ اگر ہے بھی تو اس سے بدعت لغویہ و شرعیہ مراد ہیں۔ سو یہی بات ہی درست ہے اس لیے کہ حدیث میں کہیں بھی بدعت کی تقسیم کا تصور نہ ہے۔ یہ کلیہ اپنے جملہ افراد کو شامل ہے۔ سلف و خلف علماء میں سے جس نے بھی بدعت کو پانچ یا اس سے کم و بیش عدد پر تقسیم کیا ہے۔ یہ محض ان کی رائے اور قیاس ہے۔ سو یہ دونوں حجت نہ ہیں۔ اس تقسیم کی امثال میں کچھ ایسی چیزیں بھی ذکر کر دی ہیں جو سرے سے نہ بدعت شرعی میں شمار ہیں نہ بدعت لغویہ میں۔ جیسے کتابت علم وغیرہ۔اس کا ثبوت خود کتاب و سنت سے ہے۔اس کے علاوہ جو بدعت حسنہ وسیئہ کے قائل ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ادنیٰ سنت بھی بدعت حسنہ سے بہتر ہے مثلاً سنت کے آداب کے موافق استنجاء کرنا، اصطبل بنانے یا مدرسہ و خانقاہ بنانے سے بہتر ہے۔اس مثال کو ملا علی قاری حنفی شیخ عبدالحق دھلوی نے شرح و ترجمہ مشکوٰۃ میں لکھا ہے۔ بدعت سے دل تاریک ہونا اور زنگ لگنا اور مہر لگنا بیان کیا اور سنت سے دل کا روشن ہونا اور نور کا بڑھنا بیان فرمایا ہے۔ابن جریر نے فرمایا کہ بدیع بمعنی مبدع ہے۔ مبدع وہ ہے جس نے ایسی چیز بنائی ہو جس جیسی چیز اس سے پہلے کسی نے نہ بنائی ہو۔اس وجہ سے مبدع فی الدین کو مبدع کہتے ہیں کہ جو چیز اور کسی نے نہیں نکالی وہ اس نے ایجاد کر دی۔اس طرح ہر نیا کام کرنے والے کو یا بات کہنے والے کو جو اس سے پہلے کسی نے کہی یا کی نہ ہو مبدع کہتے ہیں۔اور یہ لغوی معنی ہے۔ پھر ابن جریر نے کہا اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ کریم اس بات سے پاک ہے کہ وہ اولاد پکڑے بلکہ وہ تو زمین و آسمان کا خالق ہے یہ سب اس کی ملکیت ہیں اور اس کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں۔ اور اس کی اطاعت گذاری کا دم بھرتے ہیں۔ وہ سب کا موجد ہے اس نے انہیں بغیر کسی اصل یا مثال کے پیدا کیا ہے۔اور اس میں بندوں کو اس بات سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ جس مسیح علیہ السلام کو وہ اللہ کا بیٹا تصور کرتے ہیں وہ خود اس کی بندگی کرتے ہیں۔ اور جس ذات نے زمین و آسمان کو بغیر کسی مثال کے پیدا کیا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔ابن کثیر نے فرمایا کہ ابن جریر کا یہ قول عمدہ ہے اور یہ عبارت درست ہے۔

فائدہ: اور اس ارشاد میں جب ہم کوئی حکم کرتے ہیں تو کُنْ کہہ دیتے ہیں تو وہ موجود ہوتی ہے۔اس میں کمال قدرت اور عظیم بادشاہت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہمارا ایک دفعہ کُنْ کہہ دینا اس کی تخلیق و وجود کے لیے کافی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ﴾ اس کا امر یہ ہے کہ جب کسی چیز

کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کُنْ کہتا ہے تو ہو جاتا ہے۔اور فرمایا:﴿اِنَّمَا قَوْلُنَا بِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنَاهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَيَكُوْنُ ﴾"کہ جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو ہمارا صرف اس کو یہ کہنا ہوتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔"اور فرمایا:﴿وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴾"اور ہمارا کام یہی ایک دفعہ کی بات ہے جیسے پلک کا جھپکنا۔"جیسے شاعر نے کہا:

اذا ما اراده الله امرا فانما ، يقول له كن قولة فيكون

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق بھی کُنْ کے ذریعے ہوئی۔جیسے ایک مقام پر اس کی وضاحت کی:﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾"کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال ہمارے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی سی ہے کہ اس کو مٹی سے بنایا پھر فرمایا ہو جا تو وہ ہو گیا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حقیقتاً حرف کُنْ ارشاد بھی ہوتا ہے۔یہ بات نہیں کہ یہ صرف مجاز ہو حقیقت نہ ہو کیونکہ کوئی امر محمول کرنے سے اس کی حقیقت سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔نہ کوئی ایسی تاویل ہے جو کہ موجب تاویل ہو۔اور بیضاوی کا یہ کہنا کہ وہاں کوئی قول نہیں ہے فقط قضا کو اس لفظ کُنْ سے تعبیر کیا ہے۔یہ بات محض فلسفیانہ ہے اور کچھ نہیں۔**اللهم احفظنا**.

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴿۱۱۸﴾	اور جو لوگ (کچھ) نہیں جانتے (یعنی مشرک) وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی،اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ بھی انہی کی سی باتیں کیا کرتے تھے ان لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں جو لوگ صاحب یقین ہیں ان کے (سمجھانے کے) لیے ہم نے نشانیاں بیان کر دی ہیں۔

فائدہ: یعنی پہلی امتوں یعنی یہود نے بھی اپنے نبی سے ایسا ہی کہا تھا جیسے ان لوگوں نے کہا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رافع بن حریملہ نے نبی ﷺ سے کہا کہ اے محمد! ﷺ اگر واقعی ہی نبی ہو جیسا کہ تم خیال کرتے ہو تو اللہ سے کہو کہ وہ ہم سے ہمکلام ہو تو ہم اس کی باتوں کو سنیں۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔حضرت مجاہد نے کہا کہ یہ عیسائیوں نے کہا۔اور ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا۔اس لیے کہ سیاق آیت انہی کے متعلق ہے۔لیکن ابن کثیر نے فرمایا کہ اس میں نظر ہے۔قرطبی نے کہا معنی یہ ہیں کہ اے محمد! ﷺ اللہ تعالیٰ ہمیں تیری نبوت کے ساتھ مخاطب کیوں نہیں کرتا۔سو ظاہر سیاق یہی ہے۔**واللہ اعلم**. حضرت ابو العالیہ،ربیع

بن انس، قتادہ و سدی نے کہا کہ یہ قول تو کفار عرب کا تھا اس سے پہلے یہود و نصاریٰ تھے۔ اس دلیل سے جو فرمایا:﴿وَاِذَا جَآءَ تْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ﴾ ''اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی تو کہتے ہم ہر گز اس پر ایمان نہ لائیں گے حتیٰ کہ ہم اس کی مثل دیئے جائیں جو اللہ کے پیغمبر دیئے گئے۔'' اور یہ فرمان:﴿وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا﴾ ''اور انہوں نے کہا ہم ہر گز تیرے ساتھ ایمان نہ لائیں گے حتیٰ کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ (پھاڑ دے) جاری کر دے۔'' ﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ ''کہ فرمادیجئے! کہ میرا رب پاک ہے میں تو صرف بشر پیغمبر ہوں۔'' اور اللہ کا یہ فرمان:﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْنَرٰى رَبَّنَا﴾ ''اور ان لوگوں نے کہا جو ہماری ملاقات کا یقین نہ رکھتے تھے کہ ہم پر کیوں فرشتے نہیں اتر آتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں۔'' اور جو فرمایا:﴿بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً﴾ ''کہ بلکہ ہر شخص ان میں سے چاہتا ہے کہ اس کو کھلا ہوا صحیفہ دیا جائے۔'' اس طرح کی اور بہت سی آیات ہیں جو مشرکین عرب کے کفر و عناد اور سوال پر دلالت کرتی ہیں۔ اور ان کا قول یہود و نصاریٰ کے کفر کی طرح تھا جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتَابِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ ''کہ اہل کتاب آپؐ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے کوئی کتاب اتار لائیں تو تحقیق انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا۔ سو انہوں نے کہا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سامنے دکھایئے۔'' اور یہ فرمان:﴿تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ ''کہ ان کے دل مل گئے ہیں۔'' یعنی مشرکین عرب اپنے سے پہلے لوگوں کی طرح ہو گئے۔ جیسے فرمایا:﴿كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ اَتَوَاصَوْا بِهٖ﴾ ''اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس کوئی رسول نہ آیا مگر انہوں نے کہا جادوگر یا دیوانہ ہے کیا انہیں اسی بات کی وصیت کی گئی ہے۔'' (آخر تک)

فائدہ: اس کے بعد یہ فرمایا کہ ہم رسل علیہم السلام کی تصدیق میں جو دلائل دیتے ہیں وہ بالکل واضح ہیں۔ اس کے بعد مزید کسی سوال اور عین الیقین کی ضرورت نہ ہے اور اس شخص کے لیے یہ مقدار کافی ہے جو یقین کی دولت لایا اور نبی کی تصدیق کی رسول کی پیروی کی اور اللہ کی باتوں کو سچا جانا۔ لیکن جن کے دل زنگ آلود ہیں اور ان کے دلوں اور کانوں پر مہر اور آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے متعلق فرمایا:﴿اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَلَوْ جَآءَ تْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ○﴾ ''بلا شبہ وہ لوگ جن

پر تیرے رب کی بات ثابت ہو گئی وہ ایمان نہیں لا سکتے۔ اگرچہ ان کے پاس ہر نشانی آجائے حتیٰ کہ وہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔"

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ﴿۱۱۹﴾

(اے محمدؐ) ہم نے تم کو سچائی کے ساتھ خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور اہل دوزخ کے بارے میں تم سے کچھ پرسش نہیں ہوگی۔

فائدہ: بروایت ابن ابی حاتم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ خوشخبری سے مراد جنت کی خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا سے مراد دوزخ سے ڈرانے والا مراد ہے۔ اور عدم سوال کا مطلب یہ ہے کہ کافر کے کفر کا سوال تجھ سے نہ ہوگا۔ جیسے فرمایا: ﴿فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ○﴾ "کہ آپ کے ذمہ پیغام پہنچانا ہے اور حساب کی ذمہ داری ہم پر ہے۔" اور جیسے فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ○ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ○﴾ "کہ آپ نصیحت کیجئے بلاشبہ آپ نصیحت کرنے والے ہیں کوئی ان پر داروغہ نہ ہیں۔" اور جیسے فرمایا: ﴿نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ○ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ﴾ "کہ ہم نے ان کی بات کو خوب جانتے ہیں آپ ان پر جبر کرنے والے نہ ہیں پس قرآن کے ذریعے اس شخص کو نصیحت کیجئے جو وعید سے ڈرتا ہے۔" یہ اور اس کی ہم مثل آیات اس مفہوم پر دلیل ہیں۔ اور یہ معنی تب ہوں گے جب تسال کی تاء مضموم ہو لیکن اگر مفتوح ہو تو معنی یہ ہوں گے آپ ان کا کچھ حال نہ پوچھیں۔ جس طرح کہ عبدالرزاق نے محمد قرظی سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (ایک دفعہ) عرض کیا کاش میں جانتا کہ میرے ماں باپ نے کیا کیا یعنی ان کا کیا انجام ہوا تو اس پر اللہ کریم نے یہ آیت نازل کی۔ پھر آپ نے وفات تک کبھی ان کا ذکر نہ کیا۔ قرطبی نے کہا یہ ایسے ہی ہے جیسے عرف میں کہا جاتا ہے کہ تو فلاں شخص کا حال کیا پوچھتا ہے؟ مت پوچھ یعنی وہ تیرے خیال و گمان سے بھی بڑھ گیا ہے۔ پھر کہا کہ ہم نے تذکرے میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اللہ کریم نے آپ ﷺ کے ماں باپ کو زندہ کر دیا تھا اور وہ ایمان لے آئے تھے اور وہ حدیث جس میں فرمایا کہ میرا اور تیرا باپ آگ میں ہے کا جواب دیا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جو حدیث والدین کی زندگی کے متعلق ہے وہ نہ کتب ستہ میں ہے اور نہ غیر صحاح ستہ میں۔ اس کی سند ضعیف ہے۔

ابن کثیر نے درست فرمایا کہ یہ حدیث بلکہ جو حدیثیں اس باب میں آئی ہیں جن سے سیوطی وغیرہ نے تمسک کیا ہے سب اسی طرح بے اصل و شاذ اور موضوع ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہ ہے کہ کسی نبی کے

والدین کے ایمان نہ لانے سے اس کے پاک دامنِ رسالت پر کوئی دھبہ نہیں لگتا ہے۔ پھر ان احادیث بے بنیاد کو وضع کرنے کی کیا خاص ضرورت تھی۔ وہ محض بے محل تکلفات ہیں۔ ابن جریر نے قرظی کے قول کو جو اس بنیاد پر رد کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا والدین کے معاملے میں شک کرنا محال ہے۔ اس لیے پہلی قرأت زیادہ درست ہے۔ اس کا رد ابن کثیر نے کیا اور کہا کہ احتمال ہے کہ یہ بات آنحضرت ﷺ نے والدین کے لیے استغفار کے وقت کہی ہو۔ جبکہ انہیں ان کا حال معلوم نہ تھا لیکن جب ان کا حال معلوم ہوا تو ان سے اظہار برأت کیا اور خبر دی کہ وہ اھل نار سے ہیں۔ جس طرح صحیح میں روایت ہے۔ اس کے اور بہت سے ہم مثل اقوال و روایات ہیں۔ ابن جریر کا قول کچھ لازم نہ ہے۔ اس تحریر سے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا موقف اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے والدین زندگی میں یا موت کے بعد ایمان نہیں لائے اور حدیث مسلم کے موافق تمام مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے۔ اس کا مخالف گویا صحیح حدیث کا مخالف ہے۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اس مسئلے میں بحث و مباحثہ کرنا شرع برحق کے مقصود کے خلاف ہے۔ ہمیں تو کلام پاک میں کہا گیا ہے:﴿ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ "یہ امت تحقیق گذر چکی اس کے لیے جو اس نے کمایا، اور وہ تمہارے لیے ہوگا جو تم کماؤ گے، اور تم سے ان اعمال کے متعلق سوال نہ کیا جائے گا جو وہ کرتے تھے۔" سو ہمیں اسی قاعدے کلیے پر کاربند رہنا چاہیئے بے جا غور و خوض میں اسلام کی خوبی نہ ہے۔

فائدہ: عطاء بن یسار نے ابن عمرو سے مل کر یہ کہا کہ بتاؤ تورات میں آنحضرت ﷺ کی کیا صفت مذکور ہے۔ کہا: واللہ! تورات میں آنحضرت ﷺ کی وہی صفت ہے جو قران میں موجود ہے:﴿ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ ﴾(وَحِرْزًا لِلْاُمِّيِّيْنَ وَاَنْتَ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَا خظ ولا غليظ ولا سخاب في الاسواق ولا يدفع باسية والسيئة ولكن يعفوا ويغفر ولن يقبض حتىٰ يقيم به اعلة اهوا جآء بان يقولوا لا اله الا الله فيفتح به اعينا عجباً واذانًا صمًّا وقلوباً غلفاً)[بروایت احمد و بتفرد بخاری] کہ "اے پیغمبر! علیہ السلام ہم نے آپ کو گواہ اور خوشخبری دینے والا ڈرانے والا اور ان پڑھوں کا پناہ دینے والا بنا کر بھیجا تو میرا بندہ اور میرا رسول ہے۔ میں نے تیرا نام متوکل رکھا ہے نہ سخت مزاج، نہ سخت دل، نہ بازاروں میں شور کرنے والا اور نہ وہ برائی کو برائی سے دور کرنے والا ہوگا۔ لیکن درگذر کرے گا اور معاف کردے گا اور اللہ انہیں وفات نہ دے گا حتی کہ اس کے ذریعے ٹیڑھی ملت (امۃ) کو سیدھا کر دے اس طرح کہ وہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ کہہ دیں، پھر وہ اس کے ذریعے اندھی آنکھیں، بہرے کان اور پردے والے دلوں کو کھول دے گا۔" اس کو ابن

مردویہ نے بھی روایت کیا مگر اس میں اتنا زیادہ کیا کہ عطاء نے کہا پھر میں کعب الاحبار سے ملا اس سے بھی یہ سوال کیا اس کے بتانے میں بھی کوئی اختلاف نہ ہوا مگر کعب نے اپنی زبان میں یوں کہا:((اعینا عمومی و اذانا صمومی و قلوبا غلوفا))

وَلَنْ تَرْضَى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۱۲۰﴾ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولَئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَنْ يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿۱۲۱﴾

اور تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے اور نہ عیسائی یہاں تک کہ ان کے مذہب کی پیروی اختیار کر لو (ان سے) کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت (یعنی دین اسلام) ہی ہدایت ہے اور (اے پیغمبر) اگر تم اپنے پاس علم (یعنی وحی اللہ) کے آجانے پر بھی ان کی خواہشوں پر چلو گے تو تم کو (عذاب) اللہ سے (بچانے والا) نہ کوئی دوست ہو گا نہ کوئی مددگار۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو (ایسا) پڑھتے ہیں جیسا اس کے پڑھنے کا حق ہے، یہی لوگ اس پر ایمان رکھنے والے ہیں، اور جو اس کو نہیں مانتے وہ خسارہ پانے والے ہیں۔

فائدہ: یہود میں کئی لوگ انصاف پسند بھی تھے جو اپنی کتاب کو سمجھ کر پڑھتے تھے۔ وہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے ان کے ایک عالم حضرت عبداللہ بن سلام تھے۔ وہ دونوں اور ان کے کئی ساتھی مسلمان ہوئے۔

ابن جریر نے کہا اللہ کریم نے فرمایا کہ اے پیغمبر! علیہ السلام یہ دونوں فریق تم سے کبھی راضی و خوش نہ ہوں گے آپ ان کی رضا چاہنے کی بجائے ان کو اس حق کی طرف بلا کر جو بھیجا گیا ہے اللہ کی رضا حاصل کیجئے۔ جو راہ اللہ کریم نے تمہیں دکھادی ہے اس پر کاربند رہ کیونکہ وہی سیدھی اور کامل راہ ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ یہ ایک مناظرانہ نکتہ ہے جو اللہ کریم نے اپنے پیغمبر اور اس کے صحابہ کو سکھائی کہ اسطرح اہل باطل سے بحث کیا کریں۔ پھر حضرت قتادہ نے کہا کہ مجھے یہ حدیث پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمیشہ میری امت کا ایک گروہ حق پر لڑے گا اور غالب رہے گا ان کا مخالف انہیں کچھ نقصان نہ دے سکے گا۔ حتیٰ کہ اللہ کا حکم آئے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ حدیث ابن عمرو سے بخاری شریف میں مروی ہے۔

فائدہ: اور جو فرمایا کہ اگر تو نے اہل کتاب کی پیروی کی تو تیرا کوئی حامی و ناصر نہ ہو گا۔ اس میں امت کو

اس بات پر بڑی وعید ہے کہ کہیں وہ یہود و نصاریٰ کے رستوں کی پیروی کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں جبکہ وہ قرآن و سنت کو معلوم کر چکے ہوں۔ گویہ خطاب آنحضرت علیہ السلام کو ہے مگر درحقیقت امت کو حکم ہے۔ فتح البیان میں فرمایا کہ اس آیت میں ایسی سخت وعید ہے جس سے دل کانپتے ہیں۔ اہل علم جو شریعت کو قائم کرنے کے ذمہ دار ہیں یہ آیت ان پر یہ بات واجب کرتی ہے کہ وہ ایسے اہل بدعت اور خلاف کتاب و سنت والے مذاہب کو اختیار کرنے والوں کے معاملے میں کسی سستی اور نرمی کا مظاہرہ نہ کریں۔ اگرچہ یہ لوگ بظاہر حق کو قبول کرتے ہیں اور نرم اخلاق سے پیش آتے ہیں مگر حقیقت میں انہیں بدعت کی پیروی اور گمراہی میں گھسنے کے سوا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ پھر جب کہ کوئی کتاب و سنت کو جاننے کے باوجود ان کی بدعت و تقلید کے علم کے باوجود ان سے نرمی والا معاملہ ترک نہ کرے گا تو اس کے لیے اللہ سے نہ کوئی دوست ہے نہ مددگار ہے۔

فائدہ: اکثر فقہاء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ سارا کفر ایک ملت ہوتا ہے کیونکہ آیت میں ملت کا لفظ مفرد آیا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝﴾ "کہ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔" اس بناء پر مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ہر کافر اپنے ساتھی کا وارث ہوتا ہے۔ خواہ ہم مذہب ہو یا نہ ہو۔ اس لیے کہ یہ سب کے سب ایک ملت ہیں۔ شافعی، ابو حنیفہ اور امام احمد کا یہی مذہب ہے۔ احمد کا دوسرا قول اور مالک رحمہ اللہ کے موافق ہے کہ مختلف مذاہب والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے جس طرح کہ حقیقت میں آیا ہے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: اہل کتاب سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ ابن زید کا یہی قول ہے اور ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب مراد ہیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تلاوت کے حق سے یہ مراد ہے کہ جب جنت کے ذکر والی آیت سے گذرتے ہیں تو اس کا سوال کرتے ہیں اور جب جہنم کے ذکر والی آیات سے گذرتے ہیں تو اس سے پناہ مانگتے ہیں۔ اور مرفوعاً بھی یہ بات مروی ہے وہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت والی آیت سے گذرتے تو رحمت کا سوال کرتے اور جب عذاب والی آیت پڑھتے تو پناہ مانگتے۔ ابن مسعود نے فرمایا کہ تلاوت کا حق یہ ہے کہ اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانے۔ جس طرح اترا ہے اسی طرح پڑھے۔ یہ نہ کرے کہ ان کے کلمات کو اس کی جگہ سے بدل دے۔ یا قرآن کو اس کے غیر مطلب پر محمول نہ کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی بات منقول ہے۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ محکم پر عمل کرے متشابہ پر ایمان لائے جو مشکل ہو اس کو اللہ پر چھوڑ دے۔ یہ بھی ابن عباسؓ و ابن مسعودؓ کا قول

ہے۔اور حق تلاوت سے پورا اتباع کرنا مراد ہے۔پھر یہ آیت پڑھی:﴿وَالْقَمَرِ اِذَا تَلَاهَا ۝ ﴾یعنی اتبعھا اسی طرح عکرمہ،عطاء اور مجاہد وغیرہ سے مروی ہے۔بلکہ عمرؓ نے اس مطلب کو مرفوعاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے﴿يَتْلُوْنَه' حَقَّ تِلَاوَتِهٖ﴾میں یہ فرمایا:((يَتَّبِعُوْنَه' حَقَّ اِتِّبَاعِهٖ))اس کی سند اگرچہ بہت ضعیف ہے مگر ابن کثیر نے فرمایا کہ اس کے معنی صحیح ہے۔ابو موسیٰ اشعری نے فرمایا کہ جو کوئی قرآن کا اتباع کرتا ہے وہ اس کے سبب سے ریاض الجنت میں اتارا جاتا ہے۔

فائدہ: یہ ارشاد فرمایا کہ کتاب پڑھنے والے ہی یقین لاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو کوئی کتاب پر کما حقہ اقامت اختیار کرتا ہے،اے پیغمبر وہ آیت پر بھی ایمان لاتا ہے۔جیسے فرمایا:﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۝ ﴾"اور اگر وہ تورات اور انجیل پر اقامت اختیار کرتے اور جو ان کے رب کی طرف سے ان کی طرف اتارا گیا تو وہ اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔"اور فرمایا:﴿قُلْ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ ۝ ﴾"کہہ دیجئے!اے اہل کتاب تم کسی چیز پر نہیں ہو حتیٰ کہ تورات اور انجیل پر اقامت اختیار کرو اور اس پر جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اتارا گیا۔"یعنی جب تم تورات اور انجیل کو مکمل طور پر قائم کرو گے اس کے اخبار اور رسول اللہ ﷺ کی صفات جو اس میں موجود ہیں کی تصدیق کرو گے۔تو یہ بات تمہیں حق کی طرف کھینچ لائے گی۔تم دارین میں خیر کی اتباع کرنے لگو گے۔جیسے فرمایا:﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَه' مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۝ ﴾"وہ لوگ جو اس امی نبی کی پیروی کرتے ہیں جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔"﴿قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖ اَوْلَا تُؤْمِنُوْا اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا۝وَيَقُوْلُوْنَ سُبْحَانَ رَبِّنَا اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا﴾"کہہ دیجئے!کہ اس کے ساتھ ایمان لاؤ یا نہ لاؤ بلاشبہ وہ لوگ جو علم دیئے گئے اس کے آگے سے جب ان پر تلاوت کی جاتی ہے تو ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب البتہ ہمارے رب کا وعدہ کیا جانے والا ہے۔"یعنی محمد ﷺ کے جس حال کا وعدہ ہم سے کیا تھا وہ واقع ہوا۔اور اللہ کریم نے فرمایا:﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ۝وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْا اٰمَنَّا بِهٖ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَا اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

یُنْفِقُوْنَ ﴾ ''وہ لوگ جن کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی وہ اس کے ساتھ ایمان لانے والے ہیں اور جب ان پر پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لائے۔ بلاشبہ وہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے۔ ہم اس سے پہلے فرمانبردار ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو دوہرے اجر دیئے جائیں گے۔ صبر کی وجہ سے اور وہ برائی کا اچھائی سے بدلہ دیتے ہیں اور جو ہم نے ان کو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا لْکِتَابَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَ اَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلَاغُ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ٥ ﴾ ''اور ان لوگوں کو کہہ دیجئے جو کتاب دیئے گئے اور ان پڑھوں کو بھی کہ کیا تم فرمانبردار ہوتے ہو۔ پس اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو تحقیق ہدایت پا جائیں گے اور اگر وہ منہ پھیریں تو آپ کے ذمہ پیغام پہنچانا ہے ،اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔'' اسی لیے اس کے بعد فرمادیا کہ جو کافر ہو گا تو اس کا نقصان خود انہیں پر ہو گا ۔جیسے فرمایا: ﴿وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ ''کہ فرقوں میں سے جو اس کا منکر ہو گا تو آگ کا وعدہ ہے۔'' حدیث صحیح میں آیا ہے کہ قسم ہے اللہ کی کہ کوئی عیسائی یا یہودی مجھے نہ سنے گا اس امت میں سے پھر مجھ پر ایمان نہ لائے گا مگر وہ دوزخ میں جائے گا۔

یَابَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ﴿۱۲۳﴾

اے بنی اسرائیل میرے وہ احسان یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور یہ کہ میں نے تم کو اہل عالم پر فضیلت بخشی۔ اور اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی شخص کے کچھ کام نہیں آئے اور نہ اس سے بدلہ قبول کیا جائے اور نہ اس کو کسی کی سفارش کچھ فائدہ دے اور نہ لوگوں کو (کسی اور طرح کی) مدد مل سکے۔

فائدہ: اس کی ہم مثل آیت سورت کے شروع میں گذر چکی ہے۔ اس جگہ مکرر آنے کی وجہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع پر رغبت دلانا مقصود ہے۔ جس کی صفت وہ اپنی کتابوں میں پاتے ہیں۔ اس کی صفت و امر اور امت کے حال سے بخوبی آگاہ ہیں۔ سوا نہیں اس بات سے ڈرایا کہ تم ان دینی و دنیاوی نعمتوں کو یاد کرو جو تم پر ہوئی ہیں اور اپنے چچازاد قوم عرب پر حسد نہ کرو۔ کہ اس نے نبی آخر الزمان کو ان میں کیوں مبعوث کیا اور یہ حسد و حقد تمہیں پیغمبر علیہ السلام کی مخالفت پر آمادہ نہ کرے۔ فتح البیان میں فرمایا کہ اس عام سے خاص مراد ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَا یَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ﴾ ''کہ اس کے ہاں کوئی سفارش فائدہ نہ دے گی مگر جس کو وہ اجازت دے گا۔'' یعنی جب کسی کے لیے عذاب واجب ہوتا ہے اور سوائے عتاب و سزا کے وہ کسی چیز کا مستحق نہیں رہتا تو

تب کسی کی کوشش وسفارش اس کے حق میں قابل قبول نہ ہو گی۔

وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴿۱۲۴﴾

اور جب پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیم کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے، اللہ نے کہا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا ،انہوں نے کہا کہ (پروردگار) میری اولاد میں سے بھی (پیشوا بنائیو) اللہ نے فرمایا کہ ہمارا اقرار ظالموں کے لیے نہیں ہوا کرتا۔

فائدہ: بنی اسرائیل اس بات پر بڑے مغرور تھے کہ ہم اولاد ابراہیم سے ہیں۔اللہ کریم نے حضرت خلیل الرحمٰن کو وعدہ دیا تھا کہ نبوت و عزت تیرے گھر (نسل) میں رہے گی۔ہم ابراہیم علیہ السلام کی دین پر ہیں ۔ان کا دین ہر شخص مانتا ہے۔اب اللہ کریم نے انہیں سمجھایا کہ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ ان لوگوں کے حق میں کیا تھا جو خیر کی راہ پر چلیں گے۔پھر ابراہیم علیہ السلام کے دونوں بیٹے پیغمبر تھے۔ایک مدت تک یہ اعزاز حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد میں رہا اب اولاد اسماعیل میں منتقل ہو گیا۔ابراہیم علیہ السلام کی دعا دونوں کے حق میں تھی۔دین اسلام ہمیشہ سے ایک ہے سب پیغمبروں اور امتوں کا مرکز وہ رہا کہ جو بھی اللہ کریم پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ بھیجیں اسے قبول کرنا۔اب مسلمان تو اس راہ پر ثابت ہیں جبکہ تم اس سے پھر گئے ہو۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ کریم نے اپنے خلیل علیہ السلام کی فضیلت و شرف سے آگا کیا کہ ہم نے انہیں توحید اور دین میں امام کی حیثیت عطا کر دی۔اس لیے کہ وہ ہمارے اوامر و نواہی بجا لایا۔گویا رسول اللہ علیہ السلام کو خطاب ہے کہ تم مشرکین واہل کتاب کو اس بات کی یاد دھانی کروادو کہ تم دین ابراہیمی کا دعویٰ تو کرتے ہو مگر اس پر عمل نہ کرتے ہو۔بلکہ جس راہ پر مومنین ہیں یہی ابراہیم علیہ السلام کا راستہ ہے اور وہ ابراہیم علیہ السلام اس آزمائش میں پورے اترے۔جس میں وہ مبتلا کیے گئے۔جیسے اللہ کریم نے فرمایا:﴿وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى﴾ "کہ وہ ابراہیم جنہوں نے وفا کی۔" یعنی تمام شریعت پر پورا اترے۔اور اللہ کریم نے فرمایا:﴿اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا حَنِيْفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ o شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ o وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ اِنَّهُ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ o ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ "بلاشبہ ابراہیم اللہ کا فرمانبردار راہ دکھانے والا یک طرفہ تھا اور وہ مشرکین میں سے نہ تھا۔اس کی نعمتوں کا شکر گزار تھا۔(اللہ نے) اس کو چن لیا اور اس کو سیدھے راستے کی

ہدایت دی اور ہم نے اسے دنیا میں بھی بھلائی دی اور وہ آخرت میں نیکو کاروں سے ہوگا۔ پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ دین ابراہیم کی پیروی کیجئے جو یک طرفہ تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔" اور ایک اور جگہ فرمایا:

﴿مَا كَانَ اِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٥ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرَاهِيمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ "کہ ابراہیم یہودی تھے نہ عیسائی تھے لیکن وہ یک طرف مسلمان تھے۔ اور مشرکین میں سے نہ تھے کہ لوگوں میں سے ابراہیم علیہ السلام کے نزدیک قریبی وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی ﷺ اور ایمان والے لوگ۔ اور اللہ مومنین کا دوست ہے۔"

فائدہ: کلمات سے شریعت کے اوامر و نواہی مراد ہیں۔ اس لیے کہ کبھی لفظ کلمات بول کر کلمات قدریہ مراد لیے جاتے ہیں جس طرح کہ حضرت مریم علیہا السلام سے نقل کیا ہے۔ ﴿وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ﴾ "کہ اس نے اپنے رب کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گذاروں میں سے تھی۔ اور کبھی کلمات شرعیہ مراد ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا﴾ "کہ تیرے رب کی بات صدق و عدل سے مکمل ہوئی۔" کبھی وہ سچی خبر ہوتی ہے کبھی طلب عدل ہوتی ہے جبکہ امر یا نہی ہو۔ یہ آیت باب بھی اسی جنس سے ہے۔ کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو چند باتوں سے آزمایا تو انہوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا۔ پھر انہیں لوگوں کا امام بنا دیا گویا یہ عمل کی جزاء ہے۔ کہ جس طرح تم نے اوامر پر عمل کیا اور نواہی کو ترک کیا اس طرح لوگ تیری پیروی کریں گے اور تیری راہ پر چلیں گے اور تم ان سب کے امام ہو گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کلمات سے مناسک مراد ہیں اور ان کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ انہیں دس قسم کی طہارت کا حکم دیا۔ پانچ قسم کی طہارت سر میں اور پانچ باقی جسم میں۔ مونچھیں کترانا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، مانگ نکالنا یا سر منڈانا اور بغل کے بال صاف کرنا، زیر ناف بال اتارنا، استنجاء کرنا، اور ناخن تراشنا۔ حضرت سعید بن مسیب، مجاہد، شعبی، نخعی وغیرھم کا قول بھی یہی ہے۔ اسی کے قریب حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دس چیزیں فطرت سے ہیں: مونچھیں کاٹنا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن تراشنا، براجم دھونا، بغل کے بال اتارنا، زیر ناف بال اتارنا، پانی سے استنجاء کرنا۔ مصعب فرماتے ہیں کہ دسویں چیز میں بھول گیا شاید وہ مضمضہ ہو۔ [بروایت مسلم] صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا لفظ یوں ہے

کہ خصال فطرت پانچ ہیں: ختنہ کرنا، لوہے کا استعمال کرنا، مونچھیں کترنا، بغل کے بال صاف کرنا اور ناخن تراشنا۔ یہ مسلم کا لفظ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ دس باتیں ہیں چھ انسان کی ذات میں اور چار مناسک حج میں۔ جو چھ انسان میں ہیں وہ: زیر ناف بال صاف کرنا، بغلوں کے بال اتارنا، ختنہ کروانا، ناخن تراشنا۔ ابن ہبیرہ نے کہا در اصل یہ چاروں ایک ہی چیز ہیں اور پانچویں چیز مونچھیں کاٹنا اور چھٹی چیز مسواک کرنا اور جمعہ کے دن غسل کرنا ہیں اور مناسک حج میں طواف، صفا و مروہ کی سعی، رمی جمار اور طواف افاضہ۔ پھر کہا کہ وہ شخص جس کو اس کے دین میں آزمایا گیا ہو اور وہ اس پر پورا بھی اترے وہ ابراہیم علیہ السلام تھے۔ ان کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ اسلام کے تیس حصے ہیں۔ دس اقسام سورۃ برات میں ہیں: ﴿اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ﴾ سے آخر تک اور دس اقسام: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُومِنُوْنَ﴾ سے یعنی ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُوْمِنُونَ﴾ "کہ ایمان والے کامیاب ہوئے۔" اور دس اقسام سورۃ الاحزاب میں ہیں: ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ ﴾ (سے آخر تک) ابراہیم علیہ السلام نے ان سب کو پورا کیا تو اللہ نے ان کے لیے برأت لکھ دی۔ ان کا تیسرا لفظ یہ ہے کہ ان کلمات سے مراد ایک تو قوم سے جدا ہونے کا حکم ہے کہ جب اللہ نے قوم سے علیحدہ ہونے کا حکم دیا تو فوراً ان سے علیحدہ ہو گئے، دوسرا نمرود سے اللہ کی راہ میں لڑنا، تیسرا آگ میں گرنے پر صبر کرنا، چوتھا وطن اور شہر سے ہجرت کرنا، پانچواں مہمان نوازی کرنا اور چھٹا بیٹے کو ذبح کرنے پر تیار ہونا۔ حضرت حسن بصری نے کہا کہ وہ آزمائش یہ تھی کہ انہیں ستارا، چاند، سورج، آگ، ہجرت، ختنہ کرنا اور بیٹے کو ذبح کرنے کے حکم سے آزمایا پھر وہ ہر حال میں اللہ سے راضی رہے۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ وہ کلمات یہ تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اے اللہ! مجھے لوگوں کا امام بنا، فرمایا جی ہاں! کہا: میری اولاد میں بھی امامت مقرر فرما۔ کہا: میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا۔ کہا اس گھر کو لوگوں کے لیے بار بار آنے کا مقام بنا۔ فرمایا جی ہاں۔ کہا امن والا بنا دے فرمایا جی ہاں کہا ہمیں اور ہماری اولاد کو اپنا فرمانبردار بنا۔ فرمایا: جی ہاں۔ کہا جو اس میں اہل ایمان ہوں انہیں رزق دے۔ فرمایا: جی ہاں۔ (ایسا ہی ہوگا)۔ ربیع بن انس نے کہا وہ کلمات یہ تھے: ﴿اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ "کہ میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔" اور یہ فرمان کہ: ﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَاَمْنًا﴾ "کہ جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے آنے کی جگہ اور امن کا مقام بنا دیا۔" اور یہ فرمان: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى﴾ "کہ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ بناؤ۔" اور یہ فرمان کہ: ﴿وَعَهِدْ نَا اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ "کہ ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو تاکیدی حکم دیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے

والوں کے لیے پاک کرو۔" اور یہ فرمان:﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ﴾" کہ جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔" یہ سب انہی کلمات سے ہیں جن پر ان کی آزمائش کی گئی تھی۔

سدی نے کہا وہ کلمات یہ تھے:﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ۝﴾" کہ اے ہمارے رب! ہم سے (یہ) قبول فرما بلا شبہ تو سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا مطیع کر دے اور ہماری اولاد کو بھی اپنی فرمانبردار امت بنا۔ اے ہمارے رب اور ان میں انہیں میں سے ایک رسول مبعوث فرما۔" حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جس نے ختنہ کیا، مہمان نوازی کی، ناخن تراشے، مونچھیں کاٹیں اور بوڑھے ہوئے وہ ابراہیم علیہ السلام تھے۔ انہوں نے سفید بال دیکھ کر پوچھا اے رب! یہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ وقار ہے۔ کہا: ﴿یَارَبِّ زِدْنِیْ وَقَارًا﴾" کہ اے رب! مجھے وقار میں زیادہ کر۔" کسی نے کہا کہ سب سے پہلے منبر پر جس نے خطبہ پڑھا وہ ابراہیم علیہ السلام تھے۔ ڈاک کی چوکی مقرر کی، تلوار چلائی، مسواک کی، پانی سے استنجاء کیا اور انہوں نے ہی سب سے پہلے ازار پہنی۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ اس سے تمام امور مراد لیے جائیں مگر بعض پر تعین کرنا درست نہ ہے۔ کہ وہ فلاں بات ہی مراد ہے مگر یاں اس میں کوئی حدیث سے یا اجماع امت ہو لیکن اس باب میں کوئی حدیث نہ کسی ایک راوی سے مروی ہے نہ جملہ رواۃ سے کہ جس کا ماننا واجب ہو۔ ابن جریر نے کہا کہ ربیع بن انس اور حضرت مجاہد کا قول زیادہ درست ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اس سے قوی وہی بات تھی کہ لفظ کلمات تمام امور کو شامل ہے۔ کیونکہ حضرت مجاہد کے قول سے ہٹ کر سیاق کلام سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے ۔فتح البیان میں اہل علم کے اقوال کا اختلاف نقل کرنے کے بعد کلمات کے متعلق لکھا ہے کہ حق یہ ہے کہ جب اس باب میں نہ کوئی حدیث رسول ﷺ وارد ہے نہ کسی اور طریق سے کلمات کی تعین سمجھ آتی ہے تو ہمارے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اس سے مراد ہم یہ لے لیں۔ جو فرمایا:﴿اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾" کہ میں تجھے لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔" یعنی اس کو کلمات کا بیان سمجھ لیں یا سکوت اختیار کریں۔ اور اللہ پر چھوڑ دیں اور جو حضرت ابن عباس وغیرہ صحابہ اور تابعین سے اس کے متعلق منقول ہے۔ اول تو وہ اقوال صحابہ ہیں، ان سے حجت کیسی، اسی طرح اقوال تابعین بھی حجت نہ ہوئے۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اس میں اجتہاد کا دخل نہ ہے بلکہ وہ حکم مرفوع میں ہیں تو بھی تعیین کلمات میں اتنا زیادہ اختلاف ہے۔ جو بعض پر عمل کرنے سے منع کرتا ہے۔ اب

پھر وہ کس پر عمل کرے اور کس کو چھوڑے۔ بلکہ خود ایک صحابی جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہیں سے مختلف روایات مروی ہیں پھر کیسے عمل ممکن ہو سکتا ہے۔ یہاں سے یہ بھی بات ثابت ہوئی کہ جس نے اس کو عموم پر محمول کیا اور کہا کہ اس سے تمام کلمات مراد ہیں تو اس کا قول بھی ضعیف ہے۔ اس لیے کہ اس قول سے یہ بات لازم آتی ہے کہ قرآن کی تفسیر ضعیف اور باہم مختلف اقوال سے کی گئی ہے۔ جو حجت کے ثبوت کے بھی لائق نہ ہے۔ پھر اس میں یہ بھی اختلاف ہے کہ وہ آزمائش نبوت سے پہلے تھی یا بعد میں۔ جس نے کہا کہ وہ آزمائش پہلے تھی اس نے کہا کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ انہیں اس آزمائش کے صلے میں اور اس سبب سے ہی امام بنایا گیا اور سبب مسبب پر مقدم ہوتا ہے۔ اور جس نے کہا نبوت کے بعد ہوئی اس نے یہ دلیل دی کہ ان تمام اقوال واعمال کا مکلف بنانے کا علم وحی الٰہی کے بغیر ممکن نہ ہے۔ نبوت کے بعد تکلیف امور ہوتی ہے۔ کسی نے کہا کہ اگر اس آزمائش سے چاند ستاروں اور سورج والی آزمائش مراد ہے تو پھر نبوت سے پہلے تھی اور اگر اس سے مراد شریعت کے امور والی ابتلاء ہے تو نبوت کے بعد تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اس بحث کی بھی ضرورت نہ ہے۔ ہمیں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا۔ پھر جب بھی آزمائش کی اور جس امر میں بھی کی بہر صورت وہ اس میں کامیاب ہوئے اور صابر رہے۔ اللہ نے انہیں امام بنادیا۔ پھر جو ان کے بعد پیغمبر آیا وہ انہی کی نسل میں سے تھا۔ وہ انہی کی اتباع پر مامور تھا۔ ابراہیم علیہ السلام وہ شخص ہیں جن کو دنیا بھر کے پہلے اور پچھلے لوگ مانتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ بھی ان کے فضل کا اقرار کرتے تھے۔ ان کی یا ان کی اولاد کی طرف منسوب ہونے کو اپنا شرف سمجھتے تھے۔ دوسروں پر اس بات کا فخر کرتے تھے کہ ہم ان کی اولاد ہیں۔ کہ حرم کے رہنے والے کعبہ کے خادم ہیں۔ جب اسلام آیا تو اللہ کریم نے ابراہیم علیہ السلام سے وہ امور نقل کیے جن سے مشرکین اور اہل کتاب پر قبول کرنا اور نبی علیہ السلام پر ایمان لانا، دین اسلام کا فرمانبردار ہونا واجب ہوتا تھا۔ اس لیے کہ جو چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر واجب تھیں وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص دین تھے۔ اس میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب پر حجت کا قیام ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور ان کی تصدیق کریں۔

فائدہ: اللہ کریم نے جب حضرت ابراہیم کے سر مبارک پر امامت کا تاج رکھا تو انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ جو میرے بعد امام ہو وہ میری نسل سے ہو اللہ کریم نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔ مگر یہ بھی بتادیا کہ تیری اولاد میں سے بعض ظالم بھی ہوں گے۔ سو یہ عہد ان کو نہ پہنچے گا۔ نہ وہ امام و پیشوا بنیں گے اور اس سوال کی مقبولیت پر سورۃ عنکبوت کا یہ حصہ دلالت کرتا ہے کہ: ﴿وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابِ﴾ ”کہ ہم

نے ان کی اولاد میں نبوت و کتاب رکھی۔" سو ابراہیم علیہ السلام کے بعد جو بھی نبی آیا اور جو کتاب اتری وہ انہی کی اولاد میں ہوا۔ حضرت مجاہد نے فرمایا اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تمہاری اولاد میں نا انصاف بھی ہوں گے۔ سو ظالم آدمی امام نہیں ہو سکتا۔ اور ہم ظالم کی اقتدا نہیں کر سکتے۔ ہاں جو ان میں سے نیک ہو گا ہم اسے امام بنائیں گے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا مراد یہ ہے کہ مشرک امام نہیں ہو سکتا۔ حضرت قتادہ نے کہ کہ اس سے آخرت مراد ہے رہی دنیا تو دنیا میں کبھی ظالم بھی امام بن جاتا ہے۔ حضرت عطاء، حسن، نخعی اور عکرمہ کا بھی یہی قول ہے۔ ربیع بن انس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں کی طرف عہد دین یہی ہے۔ یعنی وہ دین ظالموں کو نہیں ملتا۔ اور ظالم بے دین رہتا ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَبَارَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰى اِسْحٰقَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ﴾ "اور ہم نے اس پر اور اسحٰق پر برکت دی اور ان کی اولاد میں سے بعض نیک ہیں اور بعض اپنے نفس پر صریح ظلم کرنے والے ہیں۔" یعنی اے ابراہیم! تیری ساری اولاد حق پر نہ ہو گی۔ ابو العالیہ عطاء اور ابن حبان کا بھی یہی قول ہے۔ ضحاک نے کہا یہ مراد ہے کہ میری اطاعت میرے کسی دشمن میرے نافرمان کو نہ پہنچے گی بلکہ جو میرا دوست ہو گا اس کو ملے گی۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت علی مرتضیٰ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نہیں اطاعت مگر معروف میں۔ [بروایت ابن مردویہ] سدی نے کہا عہد سے اس جگہ نبوت مراد ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ مفسرین سلف کے اقوال ہیں۔ جن کو ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے نقل کیا۔ پھر ابن جریر نے یہ بات اختیار کی کہ اگرچہ یہ آیت بظاہر خبر ہے کہ میرا عہد ظالموں میں نہ جائے گا۔ مگر اس میں ابراہیم علیہ السلام کو یہ بات بتائی ہے کہ آپ کی نسل میں اپنے نفس پر ظلم کرنے والے بھی ہوں گے۔ مگر اس بیان میں کوئی فائدہ نہیں اگر ابن جریر یوں کہتے کہ یہ خبر امر کے مقام پر ہے تو بہتر ہوتا معنی یہ ہوتا کہ بندوں کو چاہیئے کہ شرع کے امور پر کسی ظالم کو حکمرانی نہ دیں۔ اور ہم نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ اللہ کی خبر غلط نہیں ہو سکتی ہے۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ عہد امامت بہت سے ظالموں کے ہاتھوں میں جا چکا ہے۔ ابن خویز منداد مالکی نے کہا کہ ظالم اس لائق نہ ہیں کہ خلیفہ، حاکم، راوی، شاہد یا مفتی ہو۔ فتح البیان میں ہے کہ علماء کی ایک جماعت نے اس آیت سے یہ دلیل لی ہے کہ امام کا عادل و عالم باحکام شرع ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ جب وہ عدل و عمل باشرائع پر عمل نہ کرے گا تو ظالم ٹھہرے گا بلکہ اضافت عہد تقاضا اس بات کا کرتی ہے کہ دین کے تمام معاملات میں ان کے امام کو ظلم سے پاک ہونا چاہیئے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ دعائیہ یا استفہامیہ ہو۔ جس کے جواب میں بعض اولاد کا ظالم ہونا ارشاد فرمایا۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى

اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا اور (حکم دیا کہ) جس مقام پر ابراہیم کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنالو

فائدہ: حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ جب لوگ اس گھر سے اپنی ضروریات پوری کر کے اپنے اہل و عیال کو جاتے ہیں تو پھر اس گھر میں آتے ہیں یعنی بار بار اس جگہ جمع ہوتے ہیں۔ صحابہ و تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے بھی یہی کہا ہے کہ جو کوئی یہاں سے ہو کر گھر جاتا ہے تو اس کو اس کی دوبارہ حاضری کا شوق لگا رہتا ہے۔ ہر ملک و شہر سے لوگ دوڑ دوڑ کر یہاں آتے ہیں۔ شاعر نے کہا: ؎

جعل البیت مثاباهم لیس منه الدهر یقضون الوط

یعنی:- یك بار ویدم و بارگ گر هوس دارم

دوباره می طلبم طوف کعبه اے تواب خداوهد به پروبال من هواء دگر

حضرت عکرمہ، عطاء و قتادہ وغیرہم نے مثابہ کا معنی مجمع سے کیا ہے: ؎

مت پوچھو اہل موقف ہم سے دیوانوں کی بے تابی یہاں مجمع سنا یہاں بھی تلاش یار میں آئے

امن سے مراد یہ ہے کہ یہاں لوگ بغیر کھٹکے کے رہتے ہیں۔ اللہ کی پناہ میں ہوتے ہیں۔ ابوالعالیہ نے کہا یعنی دشمن ہتھیار اٹھانے سے امن میں ہیں۔ جاہلیت میں مکہ کے ارد گرد سے لوگوں کو اچک لیا جاتا تھا مگر جو حرم میں ہوتے وہ امن میں رہتے تھے۔ نہ کوئی انہیں پکڑتا نہ تنگ کرتا تھا۔ حضرت مجاہد، عطاء، سدی و قتادہ وغیرہ نے کہا کہ جو اس جگہ آیا وہ امن میں ہوا۔ اہل علم کی ایک جماعت نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ جو حرم میں پناہ گزیں ہوا اس پر حد نہ لگائی جائے۔ اللہ کا قول: ﴿وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا﴾ "کہ جو بھی اس میں داخل ہوگا امن میں ہوگا۔" بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ بعض نے کہا یہ حکم منسوخ ہے مگر درست یہ بات ہے کہ یہ حکم محکم ہے۔ اس کو اتنا تنگ کریں کے وہ باہر آجائے حرم سے باہر اس کو پکڑ کر سزا دی جائے۔ اسی لیے حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ امن سے پناہ کی جگہ مراد ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اس میں اللہ کریم نے کعبہ کی شرف و عزت بیان فرمائی ہے اور اس کا جو وصف شرعاً و قدراً تھا اس کو بیان کیا ہے کہ یہ ایسی جگہ ہے کہ ارواح کو اس کا شوق ہے۔ کوئی اگر ہر سال بھی یہاں آئے تو بھی اس سے اس کا دل سیر نہیں ہوتا۔ گویا اللہ کریم نے ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو قبول فرمایا جو انہوں نے کی تھی کہ: ﴿فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ ۔ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَائِي﴾ "کہ (اے

اللہ)لوگوں کے دل ان کی طرف جھکا دے۔(سے یہاں تک کہ)اے ہمارے رب میری دعا کو قبول کر۔" پھر اللہ نے فرمایا کہ کوئی جیسا بھی ہو اس جگہ آجائے تو اس کو پناہ مل جاتی ہے۔ابن زید نے کہا کہ آدمی اپنے باپ بھائی کے قاتل کو وہاں دیکھتا مگر کوئی تعرض نہ کر سکتا۔جیسے اللہ کریم نے سورۃ مائدہ میں فرمایا:﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِلنَّاسِ﴾"کہ اللہ نے کعبہ کو حرمت والا گھر لوگوں کے لیے ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔"یعنی اس گھر کی تعظیم کے سبب سے برائی دور کی جاتی ہے۔اسی لیے حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اگر لوگ اس گھر کا طواف کرنا چھوڑ دیں تو اللہ کریم آسمانوں کو زمین پر گرا کر ایک طبق کر دے سو یہ شرف اس کو اس کے بانی کی وجہ سے حاصل ہوا۔وہ بانی حضرت خلیل الرحمٰن ہیں۔جیسے فرمایا:﴿وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا﴾"اور (وہ وقت یاد رکھ) کہ جب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی جگہ دی کہ میرے ساتھ کچھ بھی شرک نہ کرو۔"اور فرمایا:﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا﴾"بے شک پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لیے بکہ کے مقام پر مقرر کیا گیا۔جو بابرکت ہے اور جہاں والوں کے لیے ہدایت ہے۔اس میں واضح نشانیاں ہیں۔مقام ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہوگا امن میں ہوگا۔"

حضرت ابن عباس مرفوعاً فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ یہ وہ شہر ہے جس کو اللہ کریم نے آسمان و زمین کی تخلیق کے دن حرام کیا سو اللہ کی حرمت سے یہ قیامت تک حرام ہے۔یہاں مجھ سے پہلے کسی شخص کے لیے قتال حلال نہ ہوا۔اور مجھے بھی صرف ایک ساعت قتال کی اجازت دی گئی ہے۔اب وہ قیامت تک حرام ہے نہ یہاں کا کانٹا کاٹا جائے،نہ شکار بھگایا جائے،نہ اس کی گری پڑی چیز اٹھائی جائے۔مگر اس کے لیے اٹھانا جائز ہے جو اس کا اعلان کرانا چاہئے۔نہ اس کی گھاس اکھیڑی جائے۔حضرت عباس نے فرمایا: اے اللہ کے پیغمبر! مگر اذخر گھاس کہ وہ لہاروں کے گھروں میں استعمال ہوتی ہے۔فرمایا مگر اذخر۔[بتخریج الشیخان]
اس حدیث سے نبی علیہ السلام کے متعلق اجتہاد کا درست ہونا ثابت ہوا کہ ان کا اجتہاد بھی وحی کے حکم میں تھا۔

فائدہ: اس آیت میں مقام ابراہیم کی خبر دینے کے بعد حکم دیا کہ اس کے پاس نماز پڑھا کرو۔اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ اس سے مراد کون سی جگہ ہے اور وہ کیا ہے؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا سارا حرم مقام ابراہیم ہے۔حضرت مجاہد و عطاء سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔حضرت عطاء نے فرمایا کہ سارا حج مقام ابراہیم ہے۔حضرت سعید بن جبیر نے کہا کہ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر وہ اسماعیل کو پتھر پکڑاتے تھے۔اللہ نے

اس پتھر کو رحمت بنایا۔ سدی نے کہا کہ یہ پتھر اسماعیل کی بیوی نے حضرت ابراہیم کے پاؤں کے نیچے اٹھا کر رکھا اور ان کا سر دھویا تھا۔ اس کو بعض نے راجح کہا اور قرطبی نے ضعیف کہا۔ رازی نے اس کو حسن، بصری، قتادہ، ربیع بن انس سے بیان کیا ہے۔ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے حج میں طواف کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ ہمارا باپ ابراہیم کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ فرمایا: ہاں۔ کہا کیا ہم اس پر نماز نہ پڑھیں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [بروایت ابن ابی حاتم] یہ وہی حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق آئی۔ اس کے علاوہ اور کئی مقامات پر وحی الٰہی نے حضرت عمر کی رائے کی موافقت کی۔ یہ کل اٹھارہ مقامات ہیں جن کو سیوطی رحمہ اللہ نے ایک مستقل رسالے کی شکل دی ہے۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ اور ابن مردویہ نے بھی روایت کیا ہے۔ لفظ کا کچھ فرق ہے مگر معنی ایک ہی ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تین باتوں میں اپنے رب سے موافق ہوا یا میرے رب نے مجھ سے موافقت کی۔ میں نے کہا: کاش اے اللہ کے پیغمبر! آپ اس مقام ابراہیم کو اختیار کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور میں نے کہا کہ اے اللہ کے پیغمبر! علیہ السلام آپ کے پاس ہر نیک و بد قسم کے لوگ آتے ہیں کاش آپ امہات المومنین کو پردے کا حکم دیتے۔ اس پر یہ آیتِ حجاب نازل ہوئی اور میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بعض بیویوں پر ناراض ہوئے ہیں۔ میں نے آکر کہا کہ اے بیبیو! تم باز رہو ورنہ اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے بہتر بیویاں عطا کر دے گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿عَسٰی رَبُّہٗ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَہٗ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمَاتٍ﴾ "کہ اگر وہ تمہیں طلاق دے دے تو شاید اس کا رب اس کو تم سے بہتر بیویاں دے جو مسلمان ہوں۔" اس حدیث کو امام احمد نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اس کو حسن صحیح کہا یہ حدیث صحیح مسلم میں آئی ہے۔ علی بن المدینی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ ابو حاتم کی روایت میں تیسری بات یہ آئی ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو عبداللہ بن ابی پر نماز جنازہ پڑھنے سے منع کیا لیکن وہ نہ مانے اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْھُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ﴾ "کہ اگر ان میں سے کوئی فوت ہو جائے تو اس پر نہ نماز جنازہ پڑھئے اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔" یہ سند صحیح ہے اس میں کوئی تعارض نہ ہے۔

فائدہ: حضرت ﷺ اور ابو بکر کے زمانہ میں یہ پتھر کعبہ کی دیوار میں لگا ہوا تھا۔ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو اس جگہ سے اکھیڑ کر وہاں نصب کیا جہاں اب تک موجود ہے۔ اس کو بیہقی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس کو خلیفہ مہدی راشد کے اس جگہ رکھا ہے۔ ہمیں ان کی اقتداء کا حکم

ہے۔((اقتدو ابالذین من بعدی ابی بکر و عمر)) یہ وہ شخص ہیں جن کی رائے کی موافقت کرتے ہوئے قرآن نے اس جگہ نماز پڑھنے کا حکم دیا۔اس لیے کسی صحابی نے اس پر انکار نہ کیا۔ یہ مقام دیوار کعبہ سے ملتا تھا۔اس کی جگہ معروف ہے۔جو دروازے سے داخل ہو کر سامنے کو جائے تو اس کی دائیں جانب بابِ حجر اسود سے ملتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام جب کعبہ بنا چکے تو اسے دیوار کے پاس یا جہاں عمارت مکمل ہوئی وہاں رکھ دیا۔اس لیے حکم ہوا کہ طواف مکمل کرنے کے بعد اس جگہ (دو رکعت) نماز پڑھو۔اور مناسب بھی یہی تھا کہ اس کو عمارت کے آخرت میں رکھا جاتا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی جگہ بدل دی۔اس پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کی انگلیوں کے نشان تھے،اس پر بار بار استعمال سے وہ نشانات مٹ گئے۔اس کے پاس نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا وہ خواہ چاروں اطراف سے کسی طرف بھی منہ کرلے۔ لیکن مقامِ ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھنے کی خصوصیت نبی علیہ السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل سے معلوم کی گئی اور اس کو ہاتھ لگانے اور بوسہ دینے کا حکم نہ ہے۔ بخاری نے اس مقام کے قصہ کے شروع میں حضرت ابن عباس سے منقول طویل اثر (قول) نقل کیا ہے۔ ترمذی کی حدیث میں ہے کہ رکن اور (مقام ابراہیم) جنت کے یاقوت ہیں۔اللہ نے ان کے نور کو مٹا دیا ہے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین چکروں میں دوڑ کر چلے اور چار چکروں میں برابر چال چلے۔ پھر طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر یہ آیت تلاوت کی۔ابن جریر کی روایت میں اتنا زیادہ ہے کہ مقام ابراہیم کو اپنے اور خانہ کعبہ کے درمیان کر کے دو رکعت نماز پڑھی۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ اس طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جو صحیح مسلم میں حاتم بن اسماعیل کی حدیث سے آئی ہے۔ بخاری شریف میں عمرو بن دینار سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور سات دفعہ طواف کیا، پھر مقام ابراہیم کے پیچھے کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ادا کی۔ یہ سب احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ مقام سے وہی پتھر مراد ہے جس پر حضرت ابراہیم کھڑے ہو کر کعبہ کی دیواریں بناتے تھے۔جب دیوار اونچی ہو گئی تو حضرت اسماعیل علیہ السلام وہ پتھر اٹھا لائے تاکہ اس پر چڑھ کر ہاتھ سے پتھر پکڑائیں۔جب ایک طرف کی دیوار بن چکی تو دوسری طرف کی بناتے۔وہ پتھر ہر طرف میں پھر جاتا۔اس پر کھڑے ہو کر دیوار بناتے حتیٰ کہ کعبہ کی چاروں دیواریں بن گئیں۔ بخاری شریف میں یہ قصہ حضرت ابن عباس سے مفصل مذکور ہے۔اس میں پاؤں کے نشانات واضح تھے اور کچھ نشانات مسلمانوں نے بھی پائے تھے۔ حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ میں نے مقام ابراہیم میں انگلیوں اور تلوے کے نشانات دیکھے۔لوگوں نے ہاتھ پھیر پھیر کر انہیں مٹا دیا۔ حضرت قتادہ نے کہا کہ اس جگہ نماز پڑھنے کا حکم ہے ہاتھ رگڑنے کا نہیں لیکن

جو تکلفات پہلی امتوں نے کیے وہی اس امت نے بھی شروع کر دیئے۔ ہمیں اس نے اس کی خبر دی ہے جس نے وہاں ایڑی اور انگلیوں کے نشانات دیکھے لیکن اس امت کے لوگوں نے اس پر ہاتھ پھیر پھیر کر اسے پرانا کر دیا۔ حضرت سفیان بن عیینہ نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منتقل کرنے کے بعد ایک دفعہ سیلاب آیا جو کعبہ کو بہا لے گیا تھا لیکن اس کو پھر اٹھا کر نصب کیا گیا۔ اور فرماتے ہیں، ہمارے علم میں نہیں کہ اس کو دوبارہ لانے میں کتنی مدت کا فاصلہ ہے نہ ہم یہ جانتے ہیں کہ آیا وہ کعبہ کی دیوار سے چپکا ہوا تھا یا نہیں۔ مگر حضرت مجاہد کی ایک روایت میں یوں ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اس کی جگہ تبدیل کی۔ مگر پہلا قول زیادہ درست ہے۔ **واللہ اعلم**۔

وَعَهِدْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿١٢٥﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٢٦﴾ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾

اور ابراہیم اور اسماعیل کو کہا کہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔ اور جب ابراہیم نے دعا کی کہ اے پروردگار اس جگہ کو امن کا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں میں سے جو اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں ان کے کھانے کو میوے عطا فرما تو اللہ نے فرمایا کہ جو کافر ہو گا میں اس کو بھی کسی قدر متمتع کروں گا (مگر) پھر اس کو (عذاب) دوزخ کے (بھگتنے کے) کے لیے ناچار کر دوں گا اور وہ بری جگہ ہے۔ اور جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے (تو دعا کیے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار! ہم سے یہ خدمت قبول فرما بے شک تو سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔ اے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیو، اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بنائے رہیو اور (پروردگار) ہمیں ہمارے طریق عبادت بتا اور ہمارے حال پر (رحم کے ساتھ) توجہ فرما بے شک تو توجہ فرمانے والا مہربان ہے۔

فائدہ: حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ پاک کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہاں کوئی نجاست یا ناپسندیدہ چیز نہ ہو اور عہد بمعنی حکم و وحی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا یعنی بتوں سے پاک کرو۔ حضرت مجاہد نے اتنا زیادہ کیا کہ بے حیائی کی بات جھوٹی بات اور ناپاکی سے صاف رکھو۔ ابو العالیہ، عطاء اور قتادہ نے کہا یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ کر کفر و

شرک سے پاک کرو اور طواف کے معنی ہیں ارد گرد گھومنا۔ اس کو سب جانتے ہیں اور اس میں طائف سے وہ مراد ہے جو مسافر کی حیثیت سے آیا اور عاکف سے مراد وہاں کا رہنے والا ہے۔ حضرت قتادہ اور ربیع بن انس کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عطا نے کہا وہ آدمی مراد ہے جو دوسرے شہروں سے آکر وہاں ٹھہرتا ہے۔ کہتے ہیں میں مجاور ہوں اور تم عاکف ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ جب کوئی مسافر مکہ میں رہا تو گویا عاکفین سے ہوا۔ صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ مسجد نبوی میں سوتے تھے جبکہ وہ غیر شادی شدہ تھے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جو وہاں نماز پڑھتے ہیں وہ رُکّع و سجود میں سے ہیں۔ پھر ابن جریر نے ان دونوں روایتوں کو ضعیف کہا۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ پہلی بات درست ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ کریم نے ان باپ بیٹا دونوں کو حکم دیا تھا کہ تم اسے اللہ وحدہ لاشریک لہ کے نام پر بناؤ۔ جیسے فرمایا: ﴿وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْقَائِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ "اور جب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی جگہ دی کہ میرے ساتھ کچھ شرک نہ کر اور میرا گھر طواف کرنے والوں اور کھڑے رہنے والوں کے لیے اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک کرو۔" فقہاء میں اس بات کا اختلاف ہے کہ کیا کعبہ کا طواف افضل ہے یا وہاں نماز پڑھنا افضل ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ بیرون شہروں اور ملکوں سے آنے والوں کے لیے طواف افضل ہے جبکہ جمہور نے کہا کہ مطلقاً نماز افضل ہے۔ ابن کثیر نے اپنی کتاب الاحکام میں ہر ایک کے قول کی توجیہ ذکر کی ہے۔ اوا س آیت سے ان مشرکوں کا رد مقصود ہے جو کعبہ کے پاس شرک کے مرتکب ہوتے تھے اور مومنین کو وہاں آنے سے روکتے تھے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءَ نِ الْعَاكِفُ وَالْبَادِ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾ "وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور وہ اللہ کے راستے سے اور مسجد الحرام سے روکتے ہیں وہ جس کو ہم نے لوگوں کے لیے برابر کیا (اس کے لیے) جو اس میں رہنے والا ہے اور جو باہر سے آیا ہے اور جو یہاں ظلم سے ٹیڑھی راہ پر چلے تو ہم اس کو دردناک سزا دیں گے۔" پھر ذکر کیا کہ یہ مسجد خالص اللہ کی عبادت طواف و نماز کے لیے بنائی گئی ہے۔ سورۃ حج میں نماز کے تینوں ارکان قیام، رکوع و سجدہ ذکر کیے ہیں اور عاکفین کا ذکر اس لیے نہیں کیا کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اس آیت میں طائفین و عاکفین اور رکوع و سجدہ کا ذکر کیا قیام کا ذکر چھوڑ دیا اس لیے کہ یہ بات معلوم ہے کہ رکوع و سجدہ قیام کے بعد ہونے کی وجہ سے اس کے بغیر ممکن نہ ہے۔ نیز اس آیت میں ان یہود و نصاریٰ کا بھی رد ہے جو کعبہ کا حج نہیں کرتے کیونکہ وہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی فضیلت کا اعتقاد تو رکھتے ہیں اور یہ بھی جانتے

ہیں کہ انہوں نے یہ گھر حج وعمرے کے لیے ہی بنایا ہے۔ اعتکاف ونماز کے لیے تیار کیا ہے۔ حالانکہ اہل کتاب ان کاموں میں سے کچھ بھی نہیں کرتے پھر یہ کس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار بن سکتے ہیں۔ حالانکہ جو کام اللہ کریم نے ان کے لیے مشروع کیے ہیں وہ ان سے ادا نہیں ہوتے۔ موسیٰ بن عمران وغیرہ انبیاء علیہم السلام نے اس گھر کا حج کیا ہے جس طرح کہ آنحضرت ﷺ نے اس بات کی خبر دی ہے۔

فائدہ: مساجد کی تطہیر کا موقف اسی آیت سے لیا گیا اور اس آیت سے جہاں فرمایا:﴿أَذِنَ اللّٰهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ﴾ ”اللہ نے اجازت دے دی کہ انہیں بلند کیا جائے اور اس میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے۔“ اس میں اس کی صبح وشام تسبیح بیان کرتے ہیں۔ رہی سنت مطہرہ تو بہت سی احادیث میں مسجد کو صاف کرنے اور ان کو مزین کرنے اور خوشبو لگانے اور اسے ناپسندیدہ چیزوں سے پاک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اسی لیے فرمایا:﴿إِنَّمَا بُنِيَتِ الْمَسَاجِدُ لِمَا بُنِيَتْ لَهُ﴾ ”کہ مساجد اسی مقصد کے لیے ہیں جس کے لیے بنائی گئی ہیں۔“ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ میں نے اس باب میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ **وللہ الحمد ذالمنه.**

فائدہ: اس میں اختلاف ہے کہ کعبہ کو سب سے پہلے کس نے بنایا۔ امام محمد باقر نے کہا کہ فرشتوں نے اس کو سب سے پہلے بنایا لیکن اس قول میں غرابت ہے۔ عطاء وسعید بن المسیب نے کہا کہ آدم علیہ السلام نے اس کو پانچ پہاڑوں حراء، طور سیناء، طور زیتا، جبل لبنان اور جودی سے بنایا لیکن یہ قول بھی غریب ہے۔ ابن عباس کعب الاحبار، قتادہ وغیرہ نے کہا کہ اس کو سب سے پہلے شیث علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ اس کے متعلق اقوال ذکر کرنے والے اکثر اہل کتاب سے روایات لینے والے ہیں جو نہ تصدیق کے لائق ہیں نہ تکذیب کے لائق نہ یہ معتبر ہیں۔ ہاں اگر اس بات میں کوئی صحیح حدیث وارد ہو تو سر آنکھوں پر۔

فائدہ: جابر بن عبداللہ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ ابراہیم نے بیت اللہ کو حرم بنایا اور میں دونوں ریگستان کے درمیان مدینہ کو حرم مقرر کرتا ہوں۔ نہ اس کا شکار شکار کیا جائے نہ وہاں کی جھاڑیاں کاٹی جائیں اس کو ابن جریر، نسائی اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ صحابہؓ کی ایک جماعت سے یہی مضمون کئی طریق سے مروی ہے۔ آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے کہ فرمایا کہ اللہ نے مکہ کو اس دن سے حرمت دی جس دن آسمان وزمین کو پیدا کیا سو اب یہ قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ اس کو بخاری اور اہل سنن نے ابوہریرہ کی حدیث سے تعلیقاً روایت کیا۔ ابن ماجہ نے یہی مضمون صفیہ بنت شیبہ کی حدیث سے لیا ہے۔ اس باب میں اور بھی بہت سی احادیث مروی ہیں جن میں باہم کوئی تعارض وتناقض نہ ہے۔ اس لیے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کو یہ بات پہنچادی کہ اللہ نے اس کو حرام

کیا ہے اور یہ ہمیشہ سے امن والا حرم تھا۔ تو ابراہیم علیہ السلام کی طرف تحریم کی نسبت بظاہر ہوئی یعنی اس حکم الٰہی کو ظاہر کرنے والے ابراہیمؑ ہیں۔ ابن عطیہ و ابن کثیر نے اسی تطبیق کو اختیار کیا ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہ پہلے ہی سے حرم تھا لیکن اللہ نے مخلوق کو عبادت کا حکم نہ دیا تھا۔ حتیٰ کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا تو تب اس کو حرام کیا اور عبادت کا حکم دیا یہ جمع و تطبیق بھی مناسب ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں بھی مرفوعاً آیا ہے کہ ابراہیم اللہ کے بندے اور خلیل تھے اور میں اس کا بندہ اور رسول ہوں۔ انہوں نے مکہ کو حرم مقرر کیا اور اس میں دونوں پہاڑوں کے درمیان مدینے کو حرم مقرر کرتا ہوں۔ یہاں کا شکار حرام ہے اور خار دار درخت کاٹنا بھی حرام ہے۔ یہاں لڑائی کے لیے ہتھیار اٹھانا بھی حرام ہے۔ یہاں کا کوئی درخت نہ کاٹا جائے۔ مگر اونٹ کے چارے کے لیے جائز ہے۔ اس کو ابن جریر نے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔ ابن کثیر نے اس طریق کو غریب ٹھہرا کر یہ لکھا کہ اگرچہ یہ حدیث کتب ستہ میں موجود نہ ہے۔ مگر اس کی اصل صحیح میں اور طریق سے ابوہریرہ سے مروی ہے کہ لوگ جب پہلا پھل دیکھتے تو رسول اللہ ﷺ کے پاس لاتے۔ یعنی اے اللہ اس ہمارے پھل میں اور ہمارے شہر میں اور مد اور صاع میں برکت دے۔ اے اللہ! بے شک ابراہیم تیرے خلیل و نبی تھے میں بھی تیرا بندہ و نبی ہوں۔ انہوں نے تجھ سے مکہ کے لیے دعا کی میں تجھ سے مدینہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ ویسی ہی دعا اور مثل اس کی اس کے ساتھ۔ یعنی اس سے دو چند پھر کسی چھوٹے بچے کو بلا کر وہ پھل کھلاتے۔ دوسرا لفظ یہ ہے کہ برکت ساتھ برکت کے پھر جو سب سے چھوٹا بچہ ہو تا وہ پھل اسے دے دیتے تھے۔ یہ لفظ مسلم کا ہے۔ رافع بن خدیج کا لفظ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ ابراہیم نے مکہ کو حرم مقرر کیا میں دو پہاڑوں کے درمیان مدینہ کو حرام کرتا ہوں۔ [بروایت ابن جریر و مسلم] صحیحین میں حضرت انسؓ سے مرفوعاً آیا ہے کہ: اے اللہ! میں اس کو حرام کرتا ہوں جو مدینہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیان کا۔ جیسے ابراہیم نے مکہ کو حرام کیا۔ اے اللہ! ان کے مد اور صاع میں برکت دے، اے اللہ! ان کے مکیال و سیر اور پنسیری میں برکت دے۔ بخاری نے فرمایا کہ اس سے اہل مدینہ مراد ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ: اے اللہ! مدینہ کو مکہ سے دو چند برکت دے۔ [بروایت شیخان] حضرت عبداللہ بن زید مرفوعاً کہتے ہیں کہ ابراہیم نے مکہ کو دعا کے ذریعے حرام کیا اور میں ویسا مدینہ کو حرام کرتا ہوں۔ جیسے ابراہیم نے مکہ کو اور میں نے مدینہ کے مد و صاع کے لیے ویسے ہی دعا کی جیسے ابراہیم نے مکہ کے لیے دعا کی۔ [بروایت بخاری] مسلم کا لفظ یہ ہے کہ ابراہیم نے مکہ کو حرام کیا اور مکہ والوں کے لیے دعا کی اور میں نے مدینہ کو حرام کیا جیسے ابراہیم نے مکہ کو حرام کیا اور میں نے مدینہ کے مد و صاع میں دو چند برکت کی دعا کی جیسے ابراہیمؑ نے مکہ کے

لیے دعا کی تھی۔ ابو سعید کا لفظ یہ ہے کہ اے اللہ! ابراہیم نے مکہ کو حرام کیا اور میں مدینہ کو حرم ٹھہراتا ہوں۔ جو دو پہاڑوں کے درمیان ہے نہ یہاں خون بہایا جائے نہ ہتھیار اٹھایا جائے۔ نہ درخت کے پتے جھاڑے جائیں۔ مگر چارے کے لیے۔ اے اللہ! ہمارے شہر، مد اور صاع میں برکت دے اے اللہ! ایک برکت کے ساتھ دو برکتیں عطا کر دے۔ [بروایت مسلم] ایک بزرگ نے مدینہ منورہ میں ایک سبزی فروش کو دیکھا وہ مدینہ کے بازار میں ساگ بیچتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ: ((یا برکۃ النبی تعالیٰ و انزلی و لا تر تحلی)) "کہ اے پیغمبر علیہ السلام! کی برکت تو آ اور نازل ہو اور واپس نہ جا۔" ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حدیث مدینہ میں اور بھی بہت سی احادیث مروی ہیں۔ یہاں صرف وہ احادیث ذکر کی گئی ہیں جن کو مکہ معظمہ کے حق میں ابراہیم کی دعا سے تعلق تھا۔ کیونکہ اس میں آیت باب سے مطابقت ہے۔ بعض نے تو کہا کہ مکہ کی حرمت زبانِ خلیل علیہ السلام سے ہوئی جبکہ بعض نے کہا کہ جب سے ہی یہ زمین بنائی تب ہی سے اس کی حرمت مقرر ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا یہی بات زیادہ مناسب ہے۔ احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ نے مکہ کو زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے حرمت دی تھی۔ ابن عباس نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ اللہ نے آسمان و زمین کی تخلیق کے دن اس شہر کو حرمت دی تھی۔ سو یہ اللہ کے حرام کرنے سے قیامت تک حرام ہے۔ [الحدیث بروایت مسلم]

ابو شریح عدوی فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دوسرے دن کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ مکہ کو اللہ نے حرمت دی ہے لوگوں نے حرام نہیں کیا کسی ایسے شخص کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن کا یقین رکھتا ہو حلال نہ ہے کہ وہاں خون بہائے یا درخت کاٹے۔ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتال سے رخصت کی دلیل پکڑے تو اس سے کہہ دو کہ اللہ نے اپنے رسول علیہ السلام کو اجازت دی تھی تمہیں تو اجازت نہیں دی ہے۔ اور وہ اذن بھی دن کی کسی گھڑی تھا پھر اس کی حرمت پہلے کی طرح لوٹ آئی ہے۔ حاضر شخص غیر حاضر کو پہنچا دے یہ مسلم کا لفظ ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کی حرمت حضرت ابراہیمؑ کی بناء سے پہلے کی ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نزدیک پہلے سے خاتم النبیین لکھے ہوئے تھے۔ حالانکہ تب آدم علیہ السلام مٹی کے پتلے تھے۔ اس کے باوجود ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا بھی کی تھی کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج۔ اللہ کریم نے اپنے علم و قدرتِ سابقہ کے مطابق اس دعا کو قبول فرمایا۔ اسی لیے حدیث میں ہے کہ جب آپؐ سے سوال کیا گیا کہ اپنے ابتدائے امر کے متعلق خبر دیجئے۔ تو فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں اور حضرت عیسیٰ بن مریم کی بشارت ہوں۔ میری ماں نے خواب میں دیکھا کہ اس سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محلات چمک اٹھے۔

پیغام خدا نخست آدم آورد انجام بشارت ابن مریم آورد

باجمله رسل نامئه خاتم بود احمد بر مانامۂ خاتم آورد

رہی یہ بات کہ مکہ افضل ہے یا مدینہ۔ جمہور کے نزدیل مکہ افضل ہے۔ مالک اور مالکیہ کے نزدیک مدینہ افضل ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ہم اس کو بادلیل کسی اور مقام پر بیان کریں گے۔ میں کہتا ہوں کہ سرے سے ایسی بات میں غور و بحث ہی بے فائدہ ہے۔ اس لیے کہ فضائل حرمین شریفین علیحدہ علیحدہ مذکور ہیں۔ جو جس کی فضیلت ہے وہ اپنی جگہ ثابت و ساکن ہے۔ ایک کی دوسرے پر تفضیل میں کوئی مرفوع حدیث مروی نہ ہے۔ جس پر اعتماد کیا جائے مکہ میں اگر اللہ کا گھر ہے تو مدینہ میں رسول اللہ علیہ السلام کا گھر ہے۔ سب سے بڑی ذات اللہ کی ہے پھر اس کے رسول ﷺ کا مقام ہے۔

زھی سعادتِ آں بندہ کہ کرد نزول گھے بہ بیت خدا و گھے بہ بیت رسولؐ

مدینہ کو رسول اللہ ﷺ نے حرم ٹھہرایا۔ جو مکہ سے دو گنا زیادہ تھا۔ ہمیں اس حکم کو ماننا واجب ہے۔ اسی طرح اپنی مسجد کا ذکر مکہ اور بیت المقدس کے ساتھ کیا۔ ہر ایک کی فضیلت بیان فرمائی۔ ہمیں چاہئے کہ مذکورہ فضیلت کو مدنظر رکھیں اور حج و عمرے کے بعد مسجد نبوی کا سفر کریں۔ وہاں پہنچ کر مسجد رسول اللہ کی زیارت سے مشرف ہوں۔

فائدہ: اور جو فرمایا کہ اے اللہ اس شہر کو امن والا کردے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے رہنے والوں کو رعب و خوف سے محفوظ رکھ۔ سو اللہ کریم نے شرعاً و قدراً ایسا ہی کیا۔ جیسے فرمایا: ﴿وَمَنْ دَخَلَه‘ كَانَ اٰمِنًا﴾ کہ جو اس میں داخل ہو گا امن میں ہو گا۔ اور فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَيَتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ﴾ کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ ہم نے حرم کو امن والا بنایا جبکہ لوگ اس کے اردگرد سے اچکے جاتے ہیں۔ "حرمتِ قتال کی احادیث اوپر گذر چکی ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ کسی کے لیے حلال نہ ہے کہ وہ مکہ میں ہتھیار اٹھائے یعنی یہ اس کے امن کے خلاف ہے۔ اللہ نے مکہ کو امن کی جگہ بنایا ہے۔ یہاں کوئی بھی ایسا کام کرنا منع ہے جس سے اہل مکہ میں خوف و ہراس پھیلے۔ اس سورت میں یوں فرمایا ہے: ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾ "کہ اے اللہ! اس شہر کو امن والا بنادے۔" اس جگہ بلد سے بقعہ مراد ہے یعنی اے اللہ! اس خطے کو امن والا بنادے۔ یہاں یہی مناسب ہے اس لیے کہ یہ دعا بیت اللہ بنانے سے پہلے کی تھی۔ سورۃ ابراہیم میں ارشاد ہے کہ: ﴿وَاِذْ

قَالَ اِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا﴾ "کہ رب اس شہر کو امن والا کر دے۔" وہاں یہی مناسب ہے کیونکہ یہ دعا دوسری دفعہ کی جبکہ بیت اللہ تعمیر ہو چکا تھا۔ اہل مکہ قیام پذیر تھے اور حضرت اسحٰق علیہ السلام بھی پیدا ہو چکے تھے جو کہ اسماعیل سے تیرہ برس چھوٹے تھے جیسے اس دعا کے آخر میں یوں فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَاءِ﴾ "کہ اللہ ذات کی حمد ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحٰق عطا کیے۔ بلاشبہ میرا رب دعاؤں کو سننے والا ہے۔"

فائدہ: حضرت ابی بن کعب نے فرمایا کہ: ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا﴾ کہ اللہ کریم نے فرمایا اور جس نے کفر کیا تو میں اس کو تھوڑا فائدہ دوں گا۔ اللہ کا کلام ہے۔ حضرت عکرمہ و مجاہد اور ابن جریر نے اسی کو درست کہا۔ بعض نے کہا کہ بلکہ وہ تمام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے۔ ابن عباس اسی طرف گئے ہیں کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے وہ سوال کرتے تھے کہ وہ کافروں کو بھی کچھ فائدہ دے۔ حضرت ابن عباس کا دوسرا قول یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے صرف مومنین کی دعا پر اکتفا کیا تھا۔ لیکن اللہ کریم نے فرمایا: نہیں بلکہ جو کافر ہو گا میں اس کو بھی تھوڑا سا فائدہ دوں گا۔ کہا ایک مخلوق تو پیدا کروں مگر اس کا رزق نہ دوں۔ تھوڑے دن اس کو فائدہ دوں گا پھر اس کو آگ کے عذاب کی طرف لے جاؤں گا۔ پھر حضرت ابن عباس نے یہ آیت پڑھی: ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾ "اور ہم تیرے رب کی عطاء سے ان کو بھی پہنچاتے ہیں اور ان کو بھی اور تیرے رب کی عطاء گھیری ہوئی نہ ہے۔" حضرت عکرمہ و مجاہد سے بھی یہی مروی ہے۔ یہ آیت اللہ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ فِی الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ﴾ "کہ بلاشبہ وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کامیاب نہ ہوں گے۔ دنیا میں کچھ فائدہ ہو گا پھر ہماری طرف ان کا لوٹنا ہو گا پھر ہم انہیں سخت عذاب چکھائیں گے اور جس سے جو وہ کفر کرتے تھے۔" اور یہ فرمان: ﴿وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۝ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝﴾ "اور جس نے کفر کیا تو آپ کو اس کا کفر پریشان نہ کرے ہماری طرف ان کا لوٹنا ہے پھر ہم انہیں ان کے اعمال کی خبر دیں گے بلاشبہ اللہ تعالیٰ سینے والی باتوں کو جانتا ہے، ہم انہیں تھوڑا سا فائدہ دیں گے پھر ہم انہیں سخت عذاب کی طرف مجبور کریں گے۔" اور اس کا یہ فرمان: ﴿وَلَوْ لَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا

وَسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِئُونَ ○ وَزُخْرُفًا وَإِنْ كُلُّ ذَالِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ○ ﴾ "اور اگر یہ نہ ہو تا کہ لوگ ایک ہی دین پر ہو جائیں تو ہم ان لوگوں کے لیے جو رحمٰن کا کفر کرتے ہیں گھروں کی چھتوں کو چاندی کا بنادیتے اور ان سیڑھیوں کو بھی جس پر وہ چڑھتے ہیں اور ان کے گھروں کے دروازوں اور تختوں کو جن پر وہ ٹیک لگاتے ہیں۔ اور سونا بھی دے دیں اور نہیں ہے یہ سب مگر دنیا کی زندگی کا فائدہ ہے۔ اور آخرت تیرے رب کے ہاں متقین کے لیے ہے۔" اور اللہ کا یہ فرمان کہ: ﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ "کہ آپ کو کافروں کا بار بار شہروں میں پھرنا دھوکے میں نہ ڈالے تھوڑا سا فائدہ ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور (وہ) بہت برا ٹھکانا ہے۔"

فائدہ: اور جو یہ ارشاد ہے کہ پھر ہم انہیں دوزخ کے عذاب اور برے ٹھکانے کی طرف مجبور کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب کافروں نے دنیا میں کچھ فائدہ اٹھالیا تو اب ہر صورت اس کو جہنم کے عذاب میں داخل ہونا پڑے گا۔ یعنی اللہ انہیں تھوڑی دیر ڈھیل دیتا ہے۔ پھر انہیں ایک دم پکڑ لے گا۔ جیسے اللہ کریم کا فرمان ہے: ﴿وَكَاَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ﴾ "اور کتنی ہی بستیاں تھیں جن کو میں نے ڈھیل دی اور وہ ظالم تھیں پھر میں نے ان کو پکڑا اور میری طرف ہی لوٹنا ہے۔" صحیحین میں ہے کہ اللہ رب العزت سے بڑھ کر ایذا پر صبر کرنے والا کوئی نہ ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جبکہ وہ انہیں رزق اور تندرستی عطا کرتا ہے۔ یہ بھی حدیث صحیح میں مروی ہے کہ اللہ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے۔ حتیٰ کہ جب اس کو پکڑ لیتا ہے تو چھوڑتا نہ ہے۔ پھر یہ آیت تلاوت کی: ﴿وَكَذَالِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ﴾ "اور تیرے رب کی پکڑ اسی طرح ہے جو وہ کسی بستی کو پکڑتا ہے جبکہ وہ ظالم ہوتی ہے۔ اس کی پکڑ بڑی اندوہ ناک ہے۔" ابن کثیر نے فرمایا کہ جس نے اس آیت کو حضرت ابراہیم کی دعا کہا، اس نے ضمیر قال کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف عائد کیا۔ یہ قرأت قراء سبعہ کے مخالف ہے۔ سیاق کی ترکیب بھی اس کو غیر معروف قرار دیتی ہے۔ اور یہ کلام کے نظم کے بھی خلاف ہے۔ واللہ اعلم.

قواعد قاعدہ کی جمع ہے اس کا معنی بنیاد ہے۔ اللہ کریم نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا کہ اپنی قوم کو یاد دلائیں کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی بنیادیں کھڑی کیں تو اللہ کریم سے یہ دعا کی کہ تو اس کام کو ہماری طرف سے شرف قبولیت عطا کر۔ قرطبی وغیرہ نے ابی اور ابن مسعود وغیرہ سے نقل کیا وہ اس آیت کو اس طرح پڑھتے تھے: ﴿وَيَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا﴾ "کہ وہ دونوں کہتے تھے کہ اے اللہ! اس کو ہماری طرف سے قبول فرما۔" ابن کثیر

نے فرمایا:﴿رَبَّنَا وَجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ﴾ ”کہ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار بنا۔“ کے بعد ان کا یہ قول اس بات پر دلیل ہے کہ وہ دونوں بزرگ اس کام میں مشغول تھے اور اس کی قبولیت کے لیے دعا گو بھی تھے۔ وھیب بن ورد جب اس آیت کو پڑھتے تو روتے اور کہتے اے خلیل الرحمٰن! تم اللہ کا گھر بناتے ہو اور عدم قبول سے ڈر رہے ہو۔ یہ اسی طرح ہے کہ جس طرح اللہ کریم نے خالص مومنین کا ذکر فرمایا:﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ ”کہ وہ لوگ جو دیتے ہیں جو بھی دیتے ہیں اور حال یہ ہے کہ ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں۔“ یہ صدقات وغیرہ دیتے ہیں مگر دل اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ دینا ان سے قبول نہ ہو۔ اس باب میں حضرت عائشہ سے ایک صحیح حدیث مروی ہے کہ (قواعد) بنیادیں حضرت ابراہیمؑ اٹھا رہے تھے اور دعا حضرت اسماعیل علیہ السلام کر رہے تھے۔ مگر درست یہ ہے کہ دونوں مل کر تعمیر بھی کر رہے تھے اور دعا بھی کر رہے تھے۔ بخاری شریف میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اسماعیل اور ان کی والدہ کو (شیر خوارگی کی حالت میں) لاکر کعبہ کے پاس چھوڑ دیا جبکہ وہاں زمزم پر مسجد کی اوپر جانب ایک درخت تھا اور اس وقت مکہ میں نہ پانی تھا نہ کوئی آدمی۔ انہوں نے ان کے ہاتھ پر کچھ کھجوریں اور مشک میں کچھ پانی دے کر مڑنے لگے۔ اسماعیل کی والدہ ان کے پیچھے چلیں اور کہا: اے ابراہیم علیہ السلام! ہمیں اس ویرانے میں چھوڑ کر آپ کہاں جا رہے ہیں؟ جہاں نہ کوئی چیز ہے نہ کوہم جنس جس سے ہم مانوس ہو سکیں۔ انہوں نے کئی دفعہ یہی بات دھرائی لیکن خلیل الرحمٰن متوجہ نہ ہوئے۔ آخر انہوں نے پوچھا: کیا اللہ نے یہ حکم دیا ہے؟ کہا: ہاں۔ کہا پھر اب وہ ہمیں ضائع نہ کرے گا یہ کہہ کر وہ واپس لوٹ آئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب گھاٹی کے نزدیک پہنچے جہاں انہیں کوئی نہ دیکھ سکتا تو بیت اللہ کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ بلند کر کے فرمایا:﴿رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۝﴾ ”کہ اے ہمارے رب! بلاشبہ میں نے اپنی اولاد کو ایسی وادی میں سکونت دی جو غیر زراعت والی ہے تیرے حرمت والے گھر کے پاس۔“ (یشکرون تک) فرمایا: اسماعیل علیہ السلام کی والدہ خود پانی پیتیں اور اسماعیل کو دودھ پلاتیں جب پانی ختم ہو چکا تو خود بھی پیاسی رہیں اور اسماعیل بھی پیاسے رہے۔ جب دیکھا کہ ان کی زبان خشک ہوئی جاتی ہے تو دیکھا نہ گیا۔ صفا کی پہاڑی قریب تھی، دوڑ کر اس پر چڑھ گئیں اور جنگل کی طرف دیکھنے لگیں کہ شاید کوئی شخص نظر آ جائے مگر کوئی نظر نہ آیا۔ وہاں سے اتر کر جب وادی میں پہنچیں تو کرتے کا دامن اٹھا کر خوب تیزی سے دوڑیں اور مروہ پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے لگیں مگر کوئی نظر نہ آیا حتیٰ کہ سات دفعہ اسی طرح کیا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا: اسی لیے لوگ ان کے درمیان دوڑتے ہیں

جب مروہ پر چڑھ گئیں تو ایک آواز سنی۔اپنے دل میں کہا ذرا ٹھہرو، پھر دوبارہ وہی آواز سنی تو کہا کہ اے آواز والے کیا تیرے پاس کوئی فریاد رسی ہے۔دیکھا کہ مقامِ زمزم پر ایک فرشتہ کھڑا ہے اس نے ایڑی لگائی یا بازو سے کریدا تو وہاں سے پانی جاری ہو گیا۔یہ اس کو حوض کی شکل میں روکنے لگیں، ہاتھ سے سمیٹنے لگیں اور چلو بھر بھر کے مشک میں ڈالنے لگیں۔اور وہ اسی طرح جوش مار تا تھا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ ام اسماعیل پر رحم کرے اگر وہ اس کو چھوڑ دیتیں، یا کہا کہ چلو بھر بھر کر نہ لیتیں تو یہ ایک صاف چشمے کا پانی ہو تا غرضیکہ انہوں نے خود پانی پیا اور اپنے بیٹے کو دودھ پلایا۔فرشتے نے ان سے کہا کہ تو ضائع ہونے کا خوف نہ کر اس جگہ اللہ کا گھر ہو گا جس کو یہ بچہ اور اس کا باپ تعمیر کرے گا۔اور اللہ اس گھر والوں کو ضائع نہ کرے گا۔یہ گھر زمین سے اتنا بلند تھا جس طرح کوئی ٹیلہ ہو۔وہاں سیلاب آتا تو دائیں بائیں نکل جاتا اور وہ جگہ ویسے ہی رہی حتی کہ وہاں سے جرہم قبیلے یا ان کے کسی گھر والوں کا گذر ہوا تو وہ کدا کے رستے سے مکہ کی نچلی جانب ٹھہرے۔ایک اڑتا ہوا پرندہ دیکھا تو کہا کہ یہ پرندہ پانی کے گرد چکر لگا تا ہے۔ہم بارہا اس جنگل میں آئے لیکن پانی نہیں پایا۔آخر کسی شخص کو بھیجا تو پتا چلا کہ وہاں پانی موجود ہے جب پانی پر آئے تو وہاں اسماعیل کی والدہ موجود تھیں، ان سے پوچھا کیا ہم کو اجازت ہے کہ ہم آپ کے پاس ٹھہریں۔فرمایا ٹھیک ہے لیکن اس پانی پر تمہارا حق ملکیت نہ ہو گا۔انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت اسماعیل کی والدہ کوئی ساتھی چاہتیں تھیں جن سے وہ مانوس ہوں تو وہ لوگ جب اس جگہ اترے انہوں نے اپنے گھر والوں کو بھی بلا بھیجا ۔جب وہاں کئی گھر جمع ہو گئے ادھر حضرت اسماعیل جوان تھے۔ان سے عربی زبان بھی سیکھ لی اور انہیں بڑا اچھا لگا ۔پھر جوان ہونے پر ان کی کسی عورت سے شادی کر دی اس دوران حضرت ام اسماعیل علیہ السلام کا انتقال ہو گیا۔پھر حضرت اسماعیل کی شادی کے بعد حضرت ابراہیم اپنے لڑکے کو دیکھنے آئے تو اسماعیل کو نہ پایا اس پر انکی بیوی سے ان کا حال پوچھا۔کہا: وہ ہمارے لیے کچھ لینے گئے ہیں۔گذر اوقات کا پوچھا تو بولی کہ ہم بڑی تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔یعنی گذران زندگی کی شکایت کی۔فرمایا: جب تیرا خاوند آئے تو اس کو میرا سلام کہنا اور یہ پیغام دینا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دے۔جب حضرت اسماعیل آئے انہیں کچھ انس محسوس ہوا تو پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی آیا تھا۔کہا: ہاں۔اس اس صورت کا ایک بزرگ آیا تھا اس نے ہم سے تمہارا حال پوچھا۔ہم نے بتا دیا پھر ہم سے گذران اوقات کا حال پوچھا ہم نے اس طرح کہا کہ ہم بڑی تنگی میں ہیں۔پوچھا کوئی وصیت بھی کر گئے تھے۔کہا ہاں۔تمہیں سلام کہتے تھے اور پیغام دیا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دے۔فرمایا: وہ میرے والد

گرامی تھے اور مجھے حکم دیا کہ میں تجھے جدا کر دوں سو تو اپنے گھر والوں کے پاس چلی جا۔ پھر طلاق دے دی۔ پھر قبیلہ جرہم کی کسی اور عورت سے نکاح کیا۔ ابراہیم علیہ السلام چند روز تک غائب رہے۔ جب اللہ نے چاہا ان کے پاس آئے اور انہیں نہ پا کر ان کی بیوی سے ان کا حال پوچھا۔ کہا وہ کچھ کھانے پینے کی چیزیں لینے گئے ہیں۔ فرمایا تمہاری گذران کیسی ہے؟ کیسا وقت چل رہا؟ کہا ہم بڑی وسعت و فراوانی میں ہیں اور بڑی ثناء بیان کی۔ پوچھا: تمہارا کھانا کیا ہے؟ فرمایا: گوشت۔ پوچھا: پیتے کیا ہو؟ کہا: پانی پیتے ہیں۔ فرمایا: اے اللہ! ان کے گوشت اور پانی میں برکت دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان دنوں ان کے پاس کوئی غلہ نہ تھا ورنہ اس کے لیے دعائے برکت کرتے۔ کہا کہ مکہ کے سوا کوئی ان دونوں چیزوں پر کفایت نہیں کرتا مگر وہ اس کو موافق نہیں پڑتیں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ جب تیرا خاوند آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ تم اپنے گھر کی چوکھٹ قائم رکھو۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو پوچھا: کیا تمہارے یہاں کوئی شخص آیا تھا۔ بولیں جی ہاں۔ ایک اس طرح کی شکل و صورت والے بزرگ آئے تھے اور ان کی اچھی صفت کی اور کہا کہ انہوں نے آپ کا حال پوچھا تھا۔ پھر پوچھا کہ تمہاری گذر اوقات کیسے چل رہی ہے؟ میں نے کہا اچھی بسر ہو رہی ہے۔ کہا کیا تم سے کچھ اور بھی کہہ گئے تھے۔ بولیں جی ہاں۔ آپ کو سلام کہتے تھے اور کہا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ قائم رکھو۔ کہا: وہ میرے والد گرامی علیہ السلام تھے اور میرے گھر کی چوکھٹ تم ہو۔ اور حکم دے گئے ہیں کہ میں تجھے اپنے پاس رہنے دوں۔ پھر جب تک اللہ نے چاہا حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ آئے۔ پھر ایک دفعہ جو آئے تو دیکھا کہ اسماعیل اس درخت کے نیچے جو زمزم کے پاس تھا، تیر بنا رہے ہیں۔ جب انہوں نے والد محترم کو دیکھا تو انکی طرف کھڑے ہوئے اور اس طرح پیش آئے جس طرح ایک باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے پیش آتا ہے۔ یعنی ان سے ادب و تعظیم سے پیش آئے۔ فرمایا: اے اسماعیل! اللہ نے مجھے ایک کام کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: جو اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے اس کو بجا لائیے۔ فرمایا: کیا تو میری مدد کرے گا۔ کہا: جی ہاں کروں گا۔ فرمایا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہاں اس کا گھر تعمیر کروں اور اس اونچے ٹیلے کی طرف اشارہ کیا۔ تب ان دونوں نے بیت اللہ کی بنیاد اٹھائی۔ ابراہیم علیہ السلام تعمیر کر رہے تھے اور اسماعیل پتھر لا کر دیتے تھے۔ جب بنیاد اونچی ہو گئی تو (اسماعیلؑ) یہ پتھر اٹھا لائے۔ پھر ابراہیم علیہ السلام اس پر کھڑے ہو کر عمارت بناتے تھے۔ اور اسماعیل پتھر پکڑاتے تھے۔ اور دونوں بزرگ یہ فرما رہے تھے: ﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ "کہ اے ہمارے رب! ہماری طرف سے اسے قبول فرما بلاشبہ تو سننے والا جاننے والا ہے۔" غرضیکہ وہ ہر طرف تعمیر کے لیے گھومتے تھے اور یہ دعا کرتے تھے۔ اس کو عبدالرزاق نے مطولاً اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے مختصراً بیان کیا ہے۔ اسے

روایت کرنے والے ابن مردویہ ہیں۔ پھر ابن کثیر نے اس کو دوسرے طریق سے بخاری سے روایت کرنے کے بعد کہا کہ بخاری نے اس کو کتاب الانبیاء میں ان دو طریق سے روایت کیا۔ حاکم سے بڑا تعجب ہے کہ اس نے مستدرک میں اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ شیخین کی شرط پر صحیح حدیث ہے مگر ان دونوں نے اس کو تخریج نہیں کیا۔ حالانکہ بخاری نے اس کو روایت کیا ہے مگر بغرضِ اختصار اس میں ذبح کا ذکر نہ ہے۔ اگرچہ صحیح میں دوسرے مقام پر آیا ہے کہ اس بکرے کے سینگ کعبہ میں لٹکتے تھے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ابراہیم اپنے اہل و عیال کو دیکھنے کے لیے براق پر بڑی تیزی سے تشریف لاتے تھے۔ پھر بلاد مقدسہ تشریف لے جاتے تھے۔ واللہ اعلم۔

ابن جریر نے اپنی سند سے حضرت علی مرتضیٰ سے کعبہ کی تعمیر کے متعلق جو روایت بیان کی ہے اس سے یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے۔ کہ کعبہ کو مفارقت سے قبل ہاجرہ و اسماعیل نے تعمیر کیا تھا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جگہ کو احاطہ کر رکھا ہو۔ پھر جب اسماعیل علیہ السلام بڑے ہوئے پھر مل کر وہاں گھر بنایا جیسا کہ اللہ کریم نے ارشاد فرمایا ہے۔ پھر سدی نے بیت اللہ کی عمارت کا قصہ ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اس کے سیاق سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ وہ بنیادیں حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کرنے سے پہلے کی بنی تھی۔ لیکن یہ ہے کہ اللہ نے انہیں ان کی نشان دہی کر دی تھی۔ جمہور اسی طرف گئے ہیں۔ جیسے حضرت ابن عباس، عطاء بن ابی رباح نے کہا کہ پہلے اس کو حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا حجر اسود جنت کا ایک یاقوت ہے۔ پھر اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں اس کی ترمیم کرائی۔ اس باب میں اور بھی کئی روایتیں مروی ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا کہ اس کو اللہ نے دنیا کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے پانی کے اوپر چار رکن سے بنایا۔ پھر اس کے نیچے سے زمین کو پھیلا دیا۔ حضرت مجاہد نے کہا کہ اس گھر کا ارکان ساتویں زمین میں ہیں۔ ازرقی نے تاریخ مکہ میں ذکر کیا کہ ذوالقرنین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مل کر اس کا طواف کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا زمانہ بہت طویل ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نہیں دیکھتی کہ جب تیری قوم نے کعبہ کو تعمیر کیا تو اس کو قواعد ابراہیم سے کم کر دیا ہے۔ فرمایا: آپ پھر اس کو ویسا کیوں نہیں کر دیتے۔ فرمایا: تیری قوم اگر زمانہ کفر کے قریب نہ ہوتی (تو میں اس کو ویسا ہی بنا دیتا) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میرا خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ سے متعلق دونوں ارکان کا استلام اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ قواعدِ ابراہیم پر مکمل نہ ہوئے تھے۔ [بروایت شیخین] حضرت عائشہ کی حدیث کا لفظ یہ ہے کہ اگر تیری قوم زمانہ جاہلیت یا کفر سے نئی نئی نہ نکلی ہوتی تو میں

کعبہ کے نیچے موجود خزانوں کو تقسیم کر دیتا اور کعبہ کا دروازہ زمین کے برابر رکھتا اور حطیم کو بھی اس کے اندر داخل کر دیتا۔ بخاری شریف میں ہے کہ پھر حضرت عبداللہ بن زبیر نے اس حدیث کی بنیاد پر کعبہ کے دو دروازے بنائے ایک داخل ہونے کے لیے اور دوسرا نکلنے کے لیے۔ ابن کثیر نے حضرت عائشہ کی اس حدیث کو کئی طریق سے نقل کیا ہے اس کے بعد حضرت ابراہیم کے بعد قریش کی تعمیر کعبہ کا ذکر کیا ہے۔ کہ انہوں نے طویل مدت بعد آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پانچ سال قبل اس کی دوبارہ تعمیر کی۔ جس میں بذات خود رسول اللہ ﷺ بھی پتھر پکڑاتے تھے۔ جبکہ آپ کی عمر مبارک پینتیس برس تھی۔ پھر حجر اسود کو ایک چادر میں ہر قبیلے نے اٹھایا۔ پھر جب وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس کو نصب کرنا تھا تو خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اٹھا کر اس کی جگہ رکھا۔ ابن اسحٰق نے کہا کہ نبی علیہ السلام کے زمانہ میں کعبہ اٹھارہ گز تھا۔ اور اس کو قباطی پہناتے تھے۔ پھر اس پر چادر ڈالی گئی۔ سب سے پہلے اس کو حجاج بن یوسف نے دیجاج پہنایا ہے۔ پھر وہ قریش کی تعمیر کی ہوئی عمارت حضرت ابن زبیر کے زمانہ خلافت کے اول میں اور یزید بن معاویہ کی خلافت کے آخر سنہ ساٹھ میں وہ جل گئی تھی جبکہ حضرت ابن زبیر کا محاصرہ کیا گیا تھا۔ پھر حضرت عبداللہ بن زبیر نے اس کو گرا کر دوبارہ حضرت ابراہیم کی بنیادوں پر تعمیر کیا اور حطیم کو بیت اللہ میں داخل کیا اور مشرق و مغرب میں دو دروازے زمین کے برابر رکھے جس طرح کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا تھا۔ ویسا بنا دیا پھر جب تک وہ امیر رہے کعبہ اسی صورت پر رہا۔ پھر جب حجاج بن یوسف نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل کروا دیا۔ تو عبدالملک بن مروان کے حکم سے اس کو پھر پہلی سی صورت میں بنا دیا۔ اس قصے کو مسلم اور نسائی نے ذکر کیا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ سنت تو یہ تھی کہ حضرت ابن زبیر کے طریقے تعمیر پر اس کو برقرار رکھا جاتا کیونکہ آنحضرت ﷺ اسی کو پسند فرماتے تھے۔ لیکن اس خوف سے اس کام کو عملی صورت نہ دی گئی کہ چونکہ لوگ نئے نئے زمانہ جاہلیت سے نکلے ہیں کہیں وہ اس کو ناپسند نہ کریں۔ مگر عبدالملک پر یہ سنت مخفی رہی۔ اس لیے جب اس پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے تو کہا: ((وددت انی ترکت و ما تحمل)) کہ اگر میں اسی حال پر چھوڑ دیتا تو اچھا تھا۔ [بروایت مسلم]

پھر ابن کثیر نے کہا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث کئی طریق سے مروی ہے یہ اس امر پر دلیل ہے کہ جو کام حضرت ابن زبیرؓ نے کیا تھا وہ مکمل سمجھداری اور عمدگی سے کیا تھا۔ اگر کعبہ اسی نقشہ پر برقرار رکھا جاتا تو کہیں بہتر تھا لیکن جب اس کا موجودہ نقشہ بن چکا تو علماء کے نزدیک اب اس کو بدلنا ناپسندیدہ ہے۔ مہدی یا ہارون الرشید

نے امام مالک سے پوچھا تھا کہ ہم کعبہ کو گرا کر اس کو حضرت عبداللہ بن زبیر کے بنائے ہوئے نقشے کے موافق بنا دیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: یا امیر المومنین! تم کعبۃ اللہ کو بادشاہوں کا کھیل تماشانہ بناؤ کہ جو آئے اس کو گرا کر نیا بنادے اس پر ہارون الرشید نے اس کی تعمیر روک دی۔ اس حکایت کو عیاض ونووی نے ذکر کیا ہے اور واللہ اعلم یہ آخر زمانہ تک اسی طرح رہے گا۔ حتیٰ کہ دو سوکھی پنڈلیوں والا حبشی اس کو گرائے گا جس طرح صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ: ((یخرب الکعبۃ والسویقیتین من الحبشۃ)) ''کہ کعبہ کو دو دبلی پنڈلیوں والا حبشی خراب کرے گا۔'' اور یہ واقعہ یاجوج وماجوج کے نکلنے کے بعد پیش آئے گا اس دلیل سے کہ بخاری میں حضرت سعید خدری سے مرفوعاً آیا ہے کہ یاجوج وماجوج کے آجانے کے بعد بیت اللہ کا حج وعمرہ منقطع ہو جائے گا ۔میں کہتا ہوں قسطلانی نے ذکر کیا ہے کہ کعبہ دس دفعہ بنایا گیا ایک دفعہ فرشتوں نے بنایا، دوسری دفعہ آدم علیہ السلام نے اور تیسری دفعہ شیث علیہ السلام نے بنایا۔ یہ مٹی اور پتھر سے بنا تھا جو سیلاب میں ڈوب کر بہہ گیا۔ چوتھی دفعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے، پانچویں دفعہ عمالقہ قوم نے، چھٹی دفعہ جرہم قبیلہ کے حارث بن مضاض نامی شخص نے بنایا۔ ساتویں دفعہ قصی بن کلاب نے جو نبی علیہ السلام کا پانچویں پشت میں دادا تھا۔ آٹھویں دفعہ قریش، نویں دفعہ حضرت ابن زبیر نے ۶۴ھ کے شروع میں اور دسویں دفعہ حجاج نے تعمیر کیا۔ سلیمان جمل نے کہا اس کے بعد کسی بادشاہ نے ۱۲۹ھ میں بنایا۔ رازی نے کہا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسجد کا بنانا اللہ کے قرب کا ذریعہ ہے اور اس کی قبولیت کی دعا کرنا مستحب ہے۔

فائدہ: اور جو فرمایا: کہ ہمیں مسلمان بنا اور حج کے طریقے سکھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنا فرمانبردار بنا کہ ہم تیری عبادت وطاعت میں کسی کو شریک نہ کریں۔ کسی نے کہا مراد یہ ہے کہ اپنے لیے مخلص کر۔ کسی نے کہا کہ اس سے استقامت مانگنا مراد ہے۔ کیونکہ مسلمان تو تھے ہی۔ حضرت عکرمہ نے کہا کہ اللہ کریم نے اس دعا پر فرمایا کہ میں نے ایسا ہی کیا۔ سدی نے کہا کہ ذریت عرب مراد ہیں۔ ابن جریر نے کہا: ٹھیک بات یہ ہے کہ ذریت عرب اور اس کے سوا تمام لوگوں کے لیے عام ہے۔ اس لیے کہ بنی اسرائیل بھی انکی اولاد میں سے تھے۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوسٰىٓ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ﴾ ''اور قوم موسیٰ سے ایک جماعت ایسی بھی تھی جو حق کی ہدایت دیتی تھی اور اسی کے ساتھ وہ انصاف کرتے تھے۔ ابن کثیر نے کہا ابن جریر کا قول سدی کے قول کے منافی نہ ہے کیونکہ عرب کی تخصیص دوسروں کی نفی نہیں کرتا اور آیت کا سیاق عرب ہی کے متعلق ہے۔ اسی لیے اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عرب میں سے ہونے کی درخواست کی۔ وہ محمد

رسول اللہ ﷺ ہیں جو عرب میں مبعوث ہوئے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ ”کہ وہی ذات ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے رسول بھیجا۔“ اس کے ساتھ ساتھ یہ خبر آپ ﷺ کی رسالت کے عموم کی منافی نہ ہے۔ اس پر اللہ کا یہ قول دلیل ہے: ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۝﴾ ”کہ فرمادیجئے! اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔“ اس کے سوا اور بھی بہت سی قاطع دلیلیں ہیں۔ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی یہ دعا ویسی ہی تھی جیسے اللہ کریم نے متقین کے حال کی خبر دی: ﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ ”اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں اپنی ازواج اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر اور ہمیں متقین کا امام بنا۔“ شرعاً ایسی دعا میں رغبت رکھنی چاہیے۔ کیونکہ اللہ کریم کی پوری محبت یہی ہے کہ وہ اس بات کو پسند کرے کہ اس کی نسل سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو خالص اللہ کی عبادت کریں اور شرک کی نجاست و نحوست سے پاک رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا تھا کہ میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں تو انہوں نے فرمایا کہ میری اولاد میں سے بھی امام بنا۔ فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا اور وہ اللہ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ﴾ ”اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔“ حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین کام جاری رہتے ہیں۔ ایک صدقہ جاریہ، دوسرا علم، جس سے نفع حاصل ہو، تیسرا نیک اولاد جو اس کے لیے دعائے خیر کرے۔

فائدہ: حج کے مناسک سے مراد یہ ہے کہ ہمیں وہ قاعدے سکھادے جن سے حج کیا جاتا ہے۔ یہ حضرت عطاء کا قول ہے۔ حضرت مجاہد اور قتادہ کا قول یہ ہے کہ ہمیں ذبح کی جگہ بتادے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مناسک کا حکم ہوا تو سعی میں شیطان ان کے سامنے آیا تو وہ اس پر سبقت لے گئے۔ پھر حضرت جبریل انہیں لے کر منیٰ میں آئے اور فرمایا کہ یہ لوگوں کے اونٹ بٹھانے کی جگہ ہے۔ جب جمرہ عقبہ کے پاس گئے تو پھر شیطان سامنے آیا اس کو سات کنکریاں ماریں۔ پھر جمرہ وسطیٰ پر آئے شیطان پھر سامنے آیا تو اس دفعہ بھی اس کو سات کنکریاں ماریں۔ پھر جمرہ قصویٰ پر آئے۔ یہاں بھی اس کے سامنے آنے پر اسے سات کنکریاں ماریں۔ تب وہ وہاں سے ہٹا۔ پھر جبریل علیہ السلام انہیں لے کر مزدلفہ گئے۔ کہا یہ مشعر ہے۔ پھر عرفہ میں لائے اور کہا کہ یہ عرفہ ہے۔ پھر فرمایا کہ اب تو آپ نے پہچان لیا۔ اس کو ابوداؤد الطیالسی نے روایت کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ

ملت اسلام میں حج کے جو مناسک اب مقرر ہیں یہ سب حضرت جبریل علیہ السلام کے سکھائے ہوئے ہیں۔ جبریل علیہ السلام سے آنحضرت ﷺ کے ذریعے آئے۔ وللّٰہِ الحمد و المنة.

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾

اے پروردگار ان (لوگوں) میں انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجیو جو ان کو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے اور ان کے دلوں کو پاک صاف کیا کرے بے شک تو غالب (اور) صاحبِ حکمت ہے۔

فائدہ: اللہ کریم نے یہاں اہل حرم کے متعلق ابراہیم علیہ السلام کی باقی دعا بیان فرمائی وہ دعا یہ تھی کہ اے اللہ! میری اولاد میں انہی سے ایک رسول بھیج دے اور ان کی یہ دعا سابقہ تقدیر الٰہی کے موافق ہو گئی۔ اور وہ تقدیر محمد ﷺ کی تعین کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جن کو تمام امیوں اور عجمیوں کی طرف بھیجا گیا۔ بلکہ تمام جن وانس کی طرف ان کو مبعوث کیا گیا تھا۔ جیسے حضرت عرباض بن ساریہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ کے نزدیک خاتم النبیین تھا جبکہ ابھی آدمؑ مٹی کے پتلے تھے۔ میں تمہیں اس امر کی ابتداء بتاؤں۔ میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا ہوں۔ عیسیٰ بن مریم کی بشارت ہوں اور اپنی ماں کا خواب ہوں۔ اسی طرح سب پیغمبروں کی مائیں دیکھا کرتی ہیں۔ [بروایت احمد] مراد یہ ہے کہ جس نے سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کا ذکر مبارک کیا اور انہیں مشہور کیا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور آپ کی یہ معرفت مسلسل لوگوں میں رہی۔ حتیٰ کہ انبیائے بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے اپنی قوم میں کھڑے ہو کر یہ خطبہ پڑھا: ﴿ اِنِّی رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ﴾ ”کہ میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں اور اس تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے آگے ہے اور اس رسول علیہ السلام کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد ہو گا اس کا نام احمد ہو گا۔“ اسی لیے حدیث مذکور میں فرمایا کہ میں ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی بشارت ہوں۔ رہے آپ علیہ السلام کی ماں کے خواب تو اس کی صورت یہ ہے کہ انہوں نے زمانۂ حمل میں یہ خواب دیکھے تو اس کو اپنی قوم سے ذکر کیا اس وقت سے آنحضرت ﷺ کی شہرت بطور تمہید شروع ہو گئی۔ اور ملک شام کی تخصیص اس لیے کی کہ شام میں آپ کے دین کو قرار ملے گا۔ اسی لیے شام آخری زمانہ میں اسلام اور اہل اسلام کا مرکز ہو گا وہیں دمشق میں سفید منارۂ شرقی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے۔ صحیحین میں مرفوعاً ہے کہ اس امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر

غالب رہے گا جو اس کا مددگار نہ ہوگا وہ اس کو کچھ نقصان نہ دے سکے گا۔نہ کوئی اور مخالف (نقصان دے گا) حتیٰ کہ اللہ کا حکم آئے اور وہ اسی حال پر ہو۔بخاری نے فرمایا یہ گروہ شام میں ہوگا۔میں کہتا ہوں کہ مطلب یہ نہیں کہ ہمیشہ سے وہ گروہ شام میں ہوگا بلکہ شام کے متعلق غالب گمان ہے۔دنیا کے اطراف میں بھی ایسے گروہ ہو چکے ہیں اور تا قیامت ہوتے رہیں گے۔اس میں ایک بشارت یہ بھی ہے کہ اسلام قیامت تک قائم رہے گا۔کوئی ظالم دشمن اس کو روئے زمین سے ختم نہ کر سکے گا۔خواہ غربت کے ساتھ باقی رہے۔اور یہ نہیں کہ جب غریب ہوگا تو ہر جگہ اسی تناسب سے رہے گا بلکہ کوئی نہ کوئی گروہ مکمل غلبے سے بھی باقی رہے گا۔وللہ الحمد ۔لفظ گروہ عام ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ فرقہ جو ہمیشہ غالب رہے گا وہ اہل علم کو بھی شامل ہے اور اہل ملک کو بھی۔چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ اہل علم جاہلوں ور اہل رائے و قیاس پر غالب رہے اور ملوک و روساء لوگ فجاء واشرار پر غالب رہے ہیں۔ابو العالیہ نے کہا کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے نبی ﷺ کی بعثت کی دعا کی تو ان سے کہا گیا کہ آپ کی دعا مقبول ہوئی ہے اور وہ آخری زمانہ میں پیغمبر ہوں گے۔سدی و قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔کتاب سے قرآن اور حکمت سے حدیث مراد ہے۔اسی کو صفت کہتے ہیں۔حضرت حسن، قتادہ، مقاتل، ابن حبان اور ابو مالک وغیرھم کا یہی قول ہے۔کسی نے کہا حکم حکمت سے مراد دین کا فہم ہے۔ابن کثیر نے کہا ان اقوال میں کچھ منافات نہ ہے۔کسی نے کہا حکمت سے مراد حق اور باطل میں فرق کرنا ہے۔ابن قتیبہ نے کہا اس سے علم و عمل مراد ہے۔آدمی جب تک ان دونوں کا جامع نہ ہو حکیم نہیں ہو سکتا۔ابن درید نے کہا کہ ہر نصیحت کی بات جو تجھے عزت کی دعوت دے اور برائی سے بچائے وہ حکمت ہے۔میں کہتا ہوں حکمت کی تمام مذکورہ اقسام سنتِ مطہرہ میں موجود ہیں۔جس نے قرآن و حدیث کو مضبوطی سے پکڑا وہی صاحب فہم و علم ہے۔قرآن میں جہاں کہیں حکمت کا لفظ آیا ہے اس سے سنت ہی مراد ہے۔قرآن کریم سنت پر عمل کو لازم کرتا ہے اور سنت قرآن کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیتی ہے۔دین کے اصول یہی دو ہیں ایک کلام اللہ، دوسرا کلام رسول اللہ۔اجماع کا ثبوت نہایت مشکل ہے اور بغیر کسی منقول حجت کے قیاس نہ علم کے لائق ہے نہ عمل کے۔حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ سنوارنے اور پاک کرنے سے طاعت و اخلاص مراد ہے۔محمد ابن اسحٰق نے کہا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ انہیں خیر کی خبر دیتا ہے تاکہ وہ اس پر عمل کریں اور شر کی خبر دیتا ہے تاکہ وہ اس سے بچیں۔اور انہیں اس بات کی خبر دیتا ہے کہ اگر وہ اللہ کی اطاعت کریں گے تو وہ ان سے خوش ہوگا۔عزیز اس کو کہتے ہیں جس کو کوئی چیز عاجز نہ کرے اور وہ ہر چیز پر قادر ہو۔اور حکیم وہ ہے جو بڑا سمجھ دار ہو۔ہر چیز کو علم و عدل سے اس کے مقام پر رکھے۔کسائی نے کہا عزیز

غالب کو کہتے ہیں اور حکیم عالم کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ حکیم وہ ہے جو کتاب عزیز اور سنت مطہرہ کا عالم ہو نہ وہ کہ جو فنونِ یونان کو سیکھنے والا ہے۔ حکمت ہر صاحب رائے وقیاس کو نہیں بلکہ بڑی قسمت والوں کو ملتی ہے۔

وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٣٠﴾ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٣١﴾ وَوَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَابَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَى لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٢﴾

اور ابراہیم کے دین سے کون روگردانی کر سکتا ہے بجز اس کے جو نہایت نادان ہو، ہم نے ان کو دنیا میں بھی منتخب کیا تھا اور آخرت میں بھی وہ (زمرہ) صلحاء میں ہوں گے۔ جب ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ اسلام لے آؤ تو انہوں نے عرض کی کہ میں رب العالمین کے آگے سر اطاعت خم کرتا ہوں۔ اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی (اپنے فرزندوں سے یہی کہا) کہ بیٹا اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند فرمایا ہے تو مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔

فائدہ: اللہ کریم نے کافروں کی تردید کی کہ جو تم نے شرک کی نحوست نکالی ہے یہ ابراہیمی دین کے مخالف ہے۔ جو کہ سب حنفاء کے امام تھے کیونکہ انہوں نے صرف اللہ کی توحید کو اختیار کیا۔ کسی اور کے پیچھے نہ لگتے تھے اور کبھی پلک جھپکنے تک بھی اس کے ساتھ شرک نہ کیا۔ بلکہ اللہ کے سوا ہر معبود سے بیزار تھے اور اسی توحید کی وجہ سے ساری قوم سے مخالفت مول لی۔ حتی کہ باپ سے بھی علیحدہ ہو گئے۔ کہا: ﴿ يَا قَوْمِ اِنِّيْ بَرِيٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ "کہ اے قوم! میں اس سے بری ہوں جو تم شرک کرتے ہو اور بلاشبہ میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا یک طرفہ ہو کر اور میں مشرکین سے نہیں ہوں۔" اور فرمایا: ﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴾ "کہ جب ابراہیم نے اپنی قوم اور اپنے باپ سے کہا کہ میں اس چیز سے بے زار ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ مگر اس ذات سے جس نے مجھے پیدا کیا تو بلاشبہ عنقریب مجھے ہدایت دے گا۔" اور فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴾ "اور نہیں تھا استغفار کرنا ابراہیم کا اپنے والد کے متعلق مگر ایک وعدے سے جو (اللہ نے) اس سے وعدہ کیا تھا پھر جب اس پر ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بے زار ہو گئے۔ بلاشبہ ابراہیم نرم دل تحمل والا ہے۔ اور اللہ کریم نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا

لِلّٰهِ حَنِيْفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ شَاكِرًا لِاَنْعُمِهِ اجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ وَاٰتَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَ اِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ ''کہ بلا شبہ ابراہیم اللہ کا اطاعت گذار، راہ بتانے والا تھا جو یک طرفہ تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا جو اس کی نعمتوں کا شکر گذار تھا اللہ نے اس کو چن لیا اور اس کو سیدھے رستے کی ہدایت دی اور ہم نے اس کو دنیا میں اچھائی دی اور بلا شبہ وہ آخرت میں نیکو کاروں سے ہوگا۔'' اسی لیے اس جگہ فرمایا کہ دین ابراہیم سے وہی شخص پھرتا ہے جو احمق ہے۔ جس نے اپنی بے وقوفی کی وجہ سے حق کو چھوڑ کر گمراہی لے کر ظلم کیا، کیونکہ جس کو کم سنی میں ہی اللہ نے ہدایت کے نور سے نوازا اور اس کو اپنا خلیل بنالیا اور آخرت میں بھی وہ صالحین سے ہوگا جو پھر اس کے دین و مسلک کو چھوڑ کر گمراہی کا راستہ اختیار کرلے تو اس سے بڑھ کر حماقت اور ظلم کیا ہوگا۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾ ''بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔'' ابو العالیہ و قتادہ نے کہا کہ یہ آیت یہود کے متعلق نازل ہوئی انہوں نے ایک ایسا طریقہ نکالا جو کہ اللہ کی طرف سے نہ تھا۔ انہوں نے دینِ ابراہیمؑ کو چھوڑ کر بدعت نکالی۔ چنانچہ اللہ کا یہ قول اس پر گواہ ہے: ﴿ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِىُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ ''کہ ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی تھے لیکن وہ یکطرفہ مسلمان تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے بلا شبہ ابراہیم کے قریب ترین وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور یہ نبی اور ایمان والے اور اللہ مومنین کا دوست ہے۔'' ابو العالیہ نے کہا کہ یہود و نصاریٰ دینِ ابراہیم سے پھر گئے تھے اور انہوں نے یہودیت و نصرانیت کی بدعت نکال لی۔ یہ اللہ کی طرف سے نہ تھی۔ وہ دینِ ابراہیم کو چھوڑ چکے تھے۔ اللہ کریم نے پیغمبر علیہ السلام کو ان کی ہدایت کے لیے بھیجا۔ حضرت قتادہ نے کہا کہ جو اس رسول پر ایمان لانے سے پھر گیا جو عین دین ابراہیم کے موافق ہے وہی دین ابراہیمی سے بھی ہٹا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ ملتِ ابراہیم کے جو امور منسوخ نہ ہیں ان پر ایمان لانا واجب ہے۔

فائدہ: جب اللہ کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کہا کہ تو خالص فرمانبردار ہو جا، تو انہوں نے فوراً شرعاً و قدراً فرمایا کہ میں مطیع ہو گیا۔ ابو السعود کہتے ہیں کہ جو رتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملا وہ اس امر پر ملا کہ حکم ملتے ہی اس کے آگے سر تسلیم خم ہو گئے اور سچے دل سے مخلص ہو گئے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اللہ نے انہیں یہ حکم اس وقت دیا جبکہ وہ تہ خانہ سے باہر آئے تھے اور کواکب سے استدلال کر کے توحید پر ثابت ہوئے تھے اور سمجھ لیا کہ ان ستاروں کی تخلیق و تدبیر کسی طاقت کے ہاتھ میں

ہے سو جس ذات کی انہیں ضرورت ہے وہی اس کو بنانے والا ہے۔ پھر اسی لیے سب کو چھوڑ کر اس کو ماننا چاہیے۔

خلیل کعبه ملك یقین گشت مقر لا احب الآفلین گشت

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو بھی اسی کی وصیت کی۔ یعنی دینِ ابراہیم کی یا اس کلمے کی کہ: ﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾ "کہ میں رب العالمین کے لیے مطیع ہوا۔" کیونکہ انہیں اس دین اور کلمے سے بڑی محبت تھی۔ مرتے دم تک اس کی حفاظت پر لگے رہے۔ قرطبی نے کہا مراد کلمہ ہے۔۔ اس لیے کہ یہی معنی قریب ہے۔ یعنی کہو کہ ہم مسلمان ہوئے لیکن راجح یہ بات ہے کہ ملت حنیفیہ مراد ہے۔ اس لیے کہ پچھلوں سے اتباع ملت مطلوب ہے صرف کلمہ کا زبانی اقرار مطلوب نہ ہے۔ تو دینِ ابراہیم کی وصیت ابراہیم سے اولیٰ تر ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بیٹے آٹھ تھے ان میں سے ایک اسماعیل تھے۔ یہ سب سے بڑے تھے۔ کسی نے کہا چودہ بیٹے تھے۔ واللہ اعلم. پھر ان کے بیٹے اپنے بعد اسی کی وصیت کر گئے تھے۔ جس طرح اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ﴾ "کہ پھر بھی اس کو اس کے بعد باقی رہنے والا کلمہ بنا دیا۔" بعض سلف نے لفظ یعقوب کو منصوب پڑھا ہے اور لفظ بنیہ پر معطوف کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹوں اور پوتے یعقوب بن اسحٰق کو یہ وصیت کی تھی وہ اس وقت حاضر تھے۔ اور قشیری کا یہ قول ہے کہ حضرت یعقوب ابراہیم کی وفات کے بعد پیدا ہوئے یہ دلیل کا ضرورت مند ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم و سارہ علیہما السلام کی زندگی میں اسحٰق کے ہاں یعقوب پیدا ہوئے۔ کیونکہ دونوں کی بشارت ایک ساتھ دی گئی تھی۔ ﴿فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوبَ ۝﴾ "کہ ہم نے ان کو اسحٰق کی خوشخبری دی اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی بشارت دی۔" سو اگر یعقوب اس وقت موجود نہ ہوتے تو ان کا اولاد اسحٰق میں ذکر کرنا بے فائدہ ہوتا۔ اس کے علاوہ اللہ کریم نے سورۃ عنکبوت میں فرمایا: ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ﴾ "اور ہم نے اس کو اسحٰق اور یعقوب عطا کیے اور ہم نے اس کی اولاد میں نبوت و کتاب رکھی۔" دوسری آیت میں فرمایا: ﴿وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً﴾ "کہ ہم نے اس کو اسحٰق عطا کیا اور یعقوب زائد عطا کیا۔" یہ آیات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ حضرت یعقوب ابراہیم کی زندگی میں تھے

فائدہ: اور جو فرمایا کہ تم نہ مرنا مگر مسلمان ہو کر اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں اسلام کو شعار بناؤ اور پکے سچے مسلمان بنو اور اس کے تابع فرمان رہو۔ اور اس کو اتنا مضبوط پکڑو کہ اسی حالت میں تمہیں موت آئے کیونکہ آدمی غالباً اسی حالت میں فوت ہوتا ہے جس میں زندگی گذارتا ہے۔ پھر وہ اسی حال میں اٹھایا جائے گا۔ اللہ

کی قدیم عادت ہے کہ جو کوئی خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو خیر کی توفیق بھی عطا کرتا ہے اور اس پر خیر کو آسان کر دیتا ہے۔ جس نے خیر کی نیت کی تو وہ اس پر ثابت رہے گا۔ رہی یہ بات کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ کوئی آدمی اہل جنت کا سا کام کرتا ہے حتیٰ کہ اس آدمی اور جنت کے درمیان ایک ذراع یا باع کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر اس کی تقدیر غالب آجاتی ہے کہ وہ اہل نار والے عمل کرنے لگ جاتا ہے اور جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور کوئی شخص جہنمیوں والے کام کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ذراع یا باع کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر اس کا لکھا ہوا غالب آجاتا ہے تو وہ جنتیوں والے کام کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ سو یہ حدیث آیت باب کے مخالف نہ ہے کیونکہ بعض روایت میں اس حدیث کے متعلق یوں آتا ہے کہ وہ اہل جنت اور اہل جہنم والے کام بظاہر (لوگوں کی نظر) میں کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴾ ''پھر جس نے دیا اور پرہیز گاری اختیار کی اور اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم اس کے لیے آسانی میسر کر دیں گے اور جس نے بخیلی کی اور مستغنی ہوا اور اچھی بات کو جھٹلایا تو ہم عنقریب اس کے لیے تنگی میسر کریں گے۔'' فضیل بن عیاض نے کہا کہ بحالت اسلام مرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ اچھا گمان رکھو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے تین دن پہلے فرمایا کہ نہ وفات پائے کوئی شخص مگر وہ اپنے رب کے ساتھ نیک گمان رکھتا ہو۔ [بروایت الشیخان]

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

بھلا جس وقت یعقوب وفات پانے لگے تو تم اس وقت موجود تھے جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے تو انہوں نے کہ آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے اور ہم اسی کے حکم بردار ہیں۔ یہ جماعت گزر چکی ان کے اعمال (کا بدلہ ملے گے) اور تم کو تمہارے اعمال (کا) اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پرسش تم سے نہیں ہو گی۔

فائدہ: اس میں اللہ کریم نے بنی اسرائیل پر اور عرب پر جو اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہیں حجت قائم کی ہے

کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو وفات کا وقت حاضر ہوا تو انہوں نے یہ وصیت کی تھی کہ صرف اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرنا اسی کی اطاعت میں لگے رہنا اور حضرت اسماعیل کو آباء میں تغلیباً شامل کیا ہے کیونکہ یہ یعقوب کے والد نہ تھے بلکہ چچا تھے اور چچا بمنزلہ باپ ہوتا ہے۔ نحاس نے کہا کہ عرب چچا کو باپ اور خالہ کو ماں کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے: ((عَمّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِیْہِ کھعمُّہ الرحل ضوابیہ)) "کہ آدمی کا چچا اس کے باپ کی (طرح) برابر ہے۔" ((وَالخالۃ بمنزلۃ الام)) "اور خالہ ماں کے مرتبہ پر ہوتی ہے۔" اسی آیت سے بعض نے دادا کو باپ کے مرتبہ پر رکھ کر بھائیوں کو وراثت سے محروم رکھا۔ بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت صدیق اکبر نے اسی طرح فرمایا۔ حضرت عائشہ، حسن بصری، طاؤس، عطاء، ابو حنیفہ اور بہت سے سلف و خلف اسی طرف گئے ہیں جبکہ مالک، شافعی، احمد اور صحابہ میں سے حضرت عمر، عثمان، علی، ابن مسعود، زید بن ثابت اور سلف و خلف کے ایک جماعت جیسے امام ابو یوسف اور محمد کا موقف یہ ہے کہ بھائی بھی اپنا حصہ وصول کریں گے۔

فائدہ: اس میں یہود و نصاریٰ کو خطاب ہے وہ اپنے آپ کو ابراہیم اور ان کی اولاد کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کہتے تھے کہ ان کا دین یہی یہودیت و نصرانیت ہے۔ لیکن اللہ نے ان کا رد کیا ہے۔ فرمایا کہ تم مفسدی ہو ان کا دین تو خالصتاً توحید و اخلاص کا دین تھا جس کو دین اسلام کہا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب اور عیص جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن عیص پہلے پیدا ہوئے جبکہ یعقوب بعد میں اسی بعد میں آنے کی وجہ سے انہیں یعقوب کہا گیا۔ ان کے بارہ بیٹے تھے اور اسحٰق سے پہلے اسماعیل کا نام اس لیے لیا کہ یہ اسماعیل حضرت اسحٰق سے چودہ برس بڑے تھے اور پیغمبر علیہ السلام کے جد اعلیٰ ہیں۔ اور ایک ہی معبود ہے کہنے کے بعد جو یہ کہا کہ ہم اسی کے حکم پر ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم توحید الوہیت پر ہیں اور اللہ کے لیے فرمانبردار اور عاجز ہیں۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ﴾ "کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اسی کے لیے خوشی سے یا زبردستی مطیع ہے۔ اور وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔" ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اسلام تمام انبیاء کا دین ہے گو کہ زمانہ و وقت کے لحاظ سے ان کے طریقے اور شرائع مختلف تھیں جیسے فرمایا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ "اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہ بھیجا مگر ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہ ہے پھر میری ہی عبادت کرو۔" اس باب میں بہت سی آیات منقول ہیں۔ حدیث پاک میں ہے کہ ہم انبیاء علاتی (بھائی) اولاد ہیں، ہمارا دین ایک ہی ہے۔

فائدہ: پچھلی آیت کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے اسلاف جو کہ انبیاء و صلحاء تھے اور تم اپنی نسبت ان کی طرف کرتے ہو تو یہ نسبت تمہیں کچھ فائدہ نہ دے گی۔ جب تک کہ تم خود نیک عمل نہ کرو۔ ان کے عمل ان کے ساتھ ہوں گے اور تمہارے عمل تمہارے ساتھ ہیں۔ تم سے تمہارے اعمال کا مواخذہ ہوگا اور ان کے اعمال کے متعلق تم سے کچھ نہ پوچھا جائے گا۔ ابو العالیہ اور قتادہ نے کہا کہ امۃ سے مراد حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد اسماعیل، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام مراد ہیں۔ فتح البیان میں فرمایا کہ اس میں اس شخص کے اعتقاد کا رد ہے جو اپنے اسلاف کے نیک اعمال پر بھروسہ کر کے اپنی باطل خواہشات سے نفس کو تسکین دے لیتے ہیں۔ اس لیے حدیث پاک میں ہے کہ جس کے اعمال نے دیر کی تو اس کا نسب جلدی نہ کرے گا یعنی ان کی نیکیاں کچھ تمہارے کام نہ آئیں گی اور ان کی بد اعمالیوں کا تم کو حساب نہ دینا پڑے گا اور اس میں اس شخص کے موقف کی بھی پر زور تردید ہے جو کہتا ہے کہ مشرکین کی اولاد کو ان کے والدین کی طرف سے عذاب دیا جائے گا۔ ابن فارس نے کہا اس میں انسان کے عامل ہونے کا اثبات ہے کہ اس عمل کی وجہ سے ہی وہ ثواب و عتاب اور جزاء و سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾	اور (یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ یہودی یا عیسائی ہو جاؤ تو سیدھے رستے پر لگ جاؤ (اے پیغمبر ان سے) کہہ دو (نہیں) بلکہ ہم دین ابراہیم اختیار کئے ہوئے ہیں) جو ایک اللہ کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

فائدہ: حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ابن صوریا اعور یہودی نے آنحضرت ﷺ کو کہا کہ ہدایت وہی ہے جس پر ہم ہیں سو تم ہماری پیروی کرو تب ہی ہدایت پاؤ گے۔ اسی طرح نصاریٰ نے بھی کہا اس پر اللہ کریم نے یہ آیت نازل فرمائی ان کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ یہ آیت یہود کے رؤساء کے متعلق اتری ہے جیسے کعب بن اشرف ، مالک بن صیف، وھب بن یہوذا اور نصاریٰ کے متعلق بھی جیسے سید و عاقب اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

یہ مذکورہ لوگ مومنین سے دین کے متعلق بحث کرتے ان میں سے ہر ایک خود کو دین حقہ کا وارث سمجھتا تھا۔ اسی طرح آجکل کے مقلدین مذاہب کے لوگ اہل السنہ والجماعۃ کو کہتے ہیں کہ ہم حق پر ہیں تم بھی اسی مذہب خاص کے مقلد بن جاؤ تو ہدایت پر آجاؤ گے۔ سو اس کا جواب بھی وہی ہے جو اللہ کریم نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کو سکھایا ہے کہ جس یہودیت و نصرانیت کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو ہم اس کی طرف نہیں آنا چاہتے بلکہ ہم دین ابراہیم کے پیروکار ہیں وہ اپنے دین میں بالکل سیدھے اور یکطرفہ تھے۔ اور اہل تقلید کو ہم بھی یہی جواب دیتے

ہیں کہ ہم بھی کسی امام کی تقلید اور بندوں کے بندے بننا نہیں چاہتے ہم تو رسول اللہ علیہ السلام کی اطاعت کو کافی سمجھتے ہیں۔ جس پر قرآن جیسا معجز کلام اترا۔ اسی قرآن میں تقلید کی مذمت ہے۔ تقلید کی طرف بلانا بالکل ایسے ہی ہے جیسے یہودیت و نصرانیت کی طرف بلانا ہے۔ اس لیے کہ تقلید کی اصل یہودیت سے ہے۔ قرآن کریم میں دو ہی فرقوں کے متعلق تقلید کی نسبت بتائی گئی ہے۔ ایک اہل کتاب کے متعلق دوسرا مشرکین کے متعلق۔ اسی وجہ سے علماء اسلام نے تقلید کو شرک کہا اور حرام قرار دیا۔ اگر یہ تقلید اصول (ایمان) میں ہے تو اللہ کے ساتھ شرک ہے اور اگر فروع (احکام) میں ہے تو رسالت کے معاملے میں شرک ہے۔ جیسا کہ مشرک دنیا میں اللہ کا قدر شناس اور مخلص نہ ہے۔ اسی طرح کوئی مقلد آنحضرت ﷺ کا محب نہیں ہو سکتا۔ مشرکین نے اللہ کی یہ قدر کی کہ اس کی بنائی ہوئی چیزوں کو جو عاجز ہیں اور خود معبود کی ضرورت مند ہیں، معبود بنا لیا اور حقیقی معبود کو چھوڑ بیٹھے۔ معبود برحق تو وہی اللہ تھا یہ کسی اور ہی کو تلاش کرنے لگے تو ایسے متلاشی ناکام ہی ہوا کرتے ہیں۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَمَا قَدَرُ اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ "کہ انہوں نے اللہ کا حق قدر اس طرح نہ پہچانا جیسا کہ اس کا حق تھا۔" اور مقلدین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ قدر کی کہ ان کی باعزت باتوں اور عمدہ افعال کو چھوڑ کر عام لوگوں کی باتوں کو سند بنا لیا۔ امت تو تھے آنحضرت ﷺ کی اور بن گئے اعتیوں کی امت۔ ((بندہ بنگان درگاہیم لا حول و لاقوۃ الا باللہ)) قرطبی و مجاہد وغیرہما نے کہا کہ حنیف مخلص کو کہتے ہیں۔ ابن عباس نے فرمایا کہ حنیف حاجی کو کہتے ہیں۔ ابو العالیہ نے کہا کہ حنیف وہ ہے جو قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے حج کو واجب سمجھتا ہے۔ ربیع بن انس نے کہا کہ تابعدار کو حنیف کہتے ہیں۔ ابو قلابہ نے کہا حنیف وہ ہے جو اللہ کے سارے رسولوں پر ایمان رکھتا ہو وہ رسول پہلے ہوں یا پیچھے۔ حضرت قتادہ نے کہا حنیفیت لا الہ الا اللہ کا قرار کرنا ہے اس میں امہات و بنات و خالات و عمات کی تحریم داخل ہے اور جو چیزیں اللہ نے حرام کی ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں۔ فتح البیان میں کہا کہ حنیف وہ ہے جو باطل دین سے حق دین کی طرف مائل ہو۔ بخاری رحمہ اللہ نے ادب مفرد میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ اللہ کو کونسا دین زیادہ محبوب ہے؟ فرمایا: جو حنیفیہ اور آسان ہو۔ [بتخریج احمد و ابن منذر] یعنی ملت ابراہیم جس میں کسی شرک و بدعت کا شائبہ نہ ہے خالص توحید اور اتباع ہے اور جو ارشاد فرمایا کہ ابراہیم مشرکین میں سے نہ تھے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف اشارہ ہے کہ یہود عزیر ابن اللہ کہہ کر اور عیسائی عیسیٰ ابن اللہ کہہ کر شرک کے مرتکب ہوتے تھے۔ انہیں بتایا کہ ان کی یہ حالت نہ تھی جو تمہاری حالت ہے کہ شرک میں لت پت ہوئے ہو۔

قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۱۳۶﴾

(مسلمانو) کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو (کتاب) ہم پر اتری اس پر اور جو (صحیفے) ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے ان پر اور جو (کتابیں) موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں ان پر اور جو اور پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملیں ان پر (سب پر ایمان لائے) ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (اللہ واحد) کے فرمانبردار ہیں۔

فائدہ: اس میں اللہ کریم نے مومنین سے خطاب فرمایا کہ جو نبی علیہ السلام کے ذریعہ تم پر اترا ہے اس پر مفصل ایمان لاؤ اور جو تم سے پہلے نازل ہو چکا اس پر مجمل ایمان لاؤ۔ بڑے بڑے انبیاء کے نام لے دیئے اور جو دوسرے تھے ان کا اجمالی ذکر کر دیا اور فرمایا: کہ کسی میں فرق نہ کرو بلکہ سب پر برابر ایمان لاؤ۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جن کے متعلق فرمایا: ﴿وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا o أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا﴾ "کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول میں فرق نکالیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ اس کے درمیان ایک (اور) راہ نکالنا چاہتے ہیں۔ یہی لوگ پکے کافر ہیں۔" حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھ کر عربی زبان میں تفسیر کرتے تھے اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کہ نہ تم ان کی تصدیق کرو اور نہ جھٹلاؤ بلکہ کہو: ﴿آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾ [بروایت بخاری] حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ سنت فجر میں اکثر یہی فرماتے تھے: ﴿آمَنَّا بِاللَّهِ﴾ اور دوسری رکعت میں ﴿آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ پڑھتے۔ [بروایت مسلم، ابو داؤد، نسائی] حضرت ابو العالیہ، ربیع اور قتادہ نے کہا کہ اسباط سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے مراد ہیں وہ بارہ بیٹے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی نسل سے بڑے گروہ پیدا ہوئے انہیں اسباط کہا جاتا ہے۔ خلیل بن احمد نے کہا کہ جیسے بنی اسماعیل میں قبائل تھے اسی طرح بنی اسرائیل میں اسباط ہوئے۔

زمخشری کا لفظ یہ ہے کہ اسباط سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پوتے مراد ہیں جو بارہ بیٹوں کی اولاد تھے۔ اسکو رازی نے مقرر رکھا اور کوئی مخالفت نہ کی۔ بخاری کا لفظ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے قبائل اسباط تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں اسباط سے بنی اسرائیل کے شعبے مراد ہیں۔ ان میں جو انبیاء ہوئے اللہ نے ان پر وحی نازل کی جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ: ﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ

وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا ﴾ "اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر کی جبکہ تم میں انبیاء بھیجے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔" اور اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَقَطَّعْنَا هُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا أُمَمًا﴾ "اور ہم نے ان کو بارہ نسلوں کی صورت میں گروہ بنادیا۔ قرطبی نے کہا اسباط سے سبط مشتق ہے۔ بسکون باء موحدہ، سبط کا لفظ معنیٰ لگا تار ہے۔ سو یہ اسباط جماعات تھے۔ یا یہ سبط سے ماخوذ ہے اور اس کا مطلب درخت ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ لوگ کثرت میں درختوں کی طرح تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ دس انبیاء کے سوا سارے نبی بنی اسرائیل میں ہوئے۔ وہ دس نبی جو غیر بنی اسرائیل سے تھے وہ حضرت نوح، ہود، صالح، شعیب، لوط، ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، اسماعیل اور محمد ﷺ ہیں۔ قرطبی نے کہا سبط اس جماعت اور قبیلے کو کہتے ہیں جو ایک اصل کی طرف لوٹیں۔ حضرت قتادہ نے فرمایا اللہ کریم نے حکم دیا کہ سب مومنین اللہ پر اور سب کتابوں اور رسولوں پر ایمان لائیں۔ سلیمان بن حبیب نے کہا کہ ہمیں صرف اتنا حکم ہے کہ تورات اور انجیل پر ایمان لائیں یہ حکم نہ ہے کہ اس پر عمل بھی کریں۔ حضرت معقل بن یسار کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تورات، زبور اور انجیل پر ایمان لاؤ لیکن قرآن تمہیں گنجائش کرے۔ [بروایت ابن ابی حاتم] یعنی سب کتابوں پر عمل نہیں کرنا بلکہ فقط قرآن پر عمل واجب ہے۔ تمام اہل سنت، اہل بدعت و تقلید یہی بات کہتے چلے آئے ہیں کہ تم سب علماء و اولیاء اور ائمہ دین کو مانو، انہیں اللہ کا مخلص و مقبول بندے سمجھو مگر اللہ اور اس کے رسول کی بات کے سوا کسی کی سند نہ پکڑو۔ سند کے لیے صرف کتاب و سنت کافی ہیں۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾

تو اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں، جس طرح تم ایمان لے آئے ہو تو ہدایت یاب ہو جائیں اور اگر منہ پھیر لیں (اور نہ مانیں) تو وہ (تمہارے) مخالف ہیں اور ان کے مقابلے میں تمہیں اللہ کافی ہے اور وہ سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔ (کہہ دو کہ ہم نے) اللہ کا رنگ (اختیار کر لیا ہے اور اللہ سے بہتر رنگ کس کا ہو سکتا ہے، اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔

فائدہ: نصاریٰ کا دستور تھا کہ جو شخص ان کے دین میں داخل ہوتا تو اس کو زرد رنگ چڑھادیتے اور زرد رنگ کے کپڑے اس کو پہناتے تھے۔ اللہ نے ان کے مقابلے میں فرمایا۔

فائدہ: اس آیت میں فرمایا کہ اگر اہل کتاب بھی تمہاری طرح تمام انبیاء اور کتب سماویہ پر بلا فرق ایمان

لے آئیں تو سمجھو کہ ہدایت پاگئے اور سیدھی راہ پر لگ گئے۔ لیکن اگر قیامِ حجت کے باوجود وہ باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف نہ آئیں تو گویا وہ ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ اللہ انہیں جان لے گا اور تمہیں کامیابی عطا کرے گا۔ بعینہٖ یہی حال مقلدین حضرات کا بھی ہے کہ اگر وہ اھل سنت کی طرح قرآن و حدیث کو مان لیں تو سمجھو کہ وہ ہدایت پر آگئے ہیں لیکن اگر نہ مانیں تو ضد پر ہیں۔ تم اپنی ضد پر جمے رہو اللہ اپنے پیروکاروں کو کافی ہوگا۔ لفظ شقاق شق سے مشتق ہے۔ جس کے معنی جانب کے ہیں۔ کیونکہ ہر فریق اپنے مخالف کے ایک جانب میں ہوتا ہے۔ یہ صعوبت سے ماخوذ ہے کیونکہ ہر فریق ایسا کام کرتا ہے جو دوسرے فریق پر دشوار ہوتا ہے۔ اور آیت کو دونوں معانی پر محمول کرنا درست ہے۔

ابو العالیہ نے کہا کہ شقاق بمعنی فراق ہے کسی نے کہا مخالفت مراد ہے کسی نے کہ دشمنی اور لڑائی مراد ہے۔ یہ آیت بھی نبی علیہ السلام کا معجزہ ہے کہ جو بات غیب سے ان کے متعلق کفایت الٰہی کے بارے میں کہی وہ پوری ہوئی اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا کہ آنحضرت ﷺ کو بنو قریظہ، بنو قینقاع اور بنو نضیر پر فتح دی اور یہود و نصاریٰ کو ذلیل و خوار کر دیا۔ وَلِلّٰهِ الْحمد. نافع نے کہا کہ میں نے بذات خود دیکھا کہ بوقت شہادت حضرت عثمان کا خون اسی آیت پر گرا تھا۔ [بروایت ابن ابی حاتم] حضرت ابن عباس نے کہا کہ اللہ کے رنگ سے اللہ کا دین مراد ہے۔ صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے کسی نے تطہیر مراد لی اور کسی نے ایمان مراد لیا ہے کسی نے کہا اللہ کی وہ فطرت مقصود ہے جس پر بندوں کو پیدا کیا۔ نصاریٰ کے گھر جب بچہ پیدا ہوتا تو اس کو رنگ والے پانی میں نہلاتے تھے اور اس عمل کو معمودیہ کہتے تھے۔ اور اسی کو وہ اپنی اولاد کی تطہیر سمجھتے تھے۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوتے تو کہتے اب یہ حقیقتاً عیسائی ہوا ہے اس لیے اللہ نے ان کا رد کیا۔ فرمایا کہ بہتر رنگ تو اللہ کا ہے جو اس کے دین کا رنگ ہے جسے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ بن مریم تک سب پیغمبر لائے تھے۔ اس رنگ سے زیادہ تطہیر کسی چیز میں نہیں یہ رنگ اللہ کی طرف سے ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے موسیٰ علیہ السلام کیا تیرا رب رنگتا بھی ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا: اللہ سے ڈرو۔ اللہ نے حضرت موسیٰ کو پکار کر کہا موسیٰ تم کہو کہ ہاں میرا رب سرخ و سفید اور سیاہ رنگ رنگتا ہے۔ یہ سارے رنگ میرے ہی ہیں۔ پھر آنحضرت ﷺ پر اسی مضمون کی یہ آیت نازل کی۔ اس کو ابن ابی حاتم نے موقوفاً اور ابن مردویہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ ابن کثیر نے شرط صحت کے ساتھ اس کا موقوف ہونا درست قرار دیا ہے۔ کسی نے کہا کہ رنگ سے ختنہ مراد ہے جس کے خون میں مختون رنگ جاتا ہے۔ مگر پہلا قول زیادہ درست ہے۔

قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ﴿۱۳۹﴾ أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَى قُلْ أَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴿۱۴۱﴾

(ان سے) کہو کیا تم اللہکے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ وہی ہمارا اور تمہارا پروردگار ہے اور ہم کو ہمارے اعمال (کا بدلہ ملے گا)اور تم کو تمہارے اعمال (کا)اور ہم خاص اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔اے یہود و نصاریٰ کیا تم اس بات کے قائل ہو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور انکی اولاد یہودی یا عیسائی تھی (اے محمدؐ ان سے) کہو کہ بھلا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ ؟اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی شہادت کو جو اس کے پاس (کتاب میں موجود) ہے چھپائے اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اللہ اس سے غافل نہیں۔یہ جماعت گزر چکی،ان کو وہ (ملے گا)جو انہوں نے کیا اور تم کو وہ جو تم نے کیا اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پرسش تم سے نہیں ہو گی۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس جگہ پیغمبر علیہ السلام کو یہ بات بتائی کہ تم ان مشرکین کے جھگڑے کو ختم کرو اور ان سے کہہ دو کہ کیا تم مجھ سے توحید واخلاص اور اتباع،امر و نہی کے متعلق مناظرہ کرتے ہو حالانکہ ہم میں اور تم میں سے ایک ہی خالق کا اختیار چلتا ہے۔جو خالص الوھیت کا مستحق ہے۔اور تنہا مالک ہے۔تم ہمارے کام سے بری الذمہ ہو اور ہم تمہارے کاموں سے بری ہیں ۔جیسے فرمایا:﴿ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْئُوْنَ مِمَّا اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾"پس اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہہ کہ میرے لیے میرا عمل اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں۔تم اس سے بری ہو جو میں عمل کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم عمل کرتے ہو۔"اور اللہ کریم نے فرمایا:﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ﴾"کہ پس اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو کہہ کہ میں نے اپنا چہرہ اللہ کے لیے مطیع کیا اور جس نے میری پیروی کی۔"اور فرمایا:﴿اَتُحَاجُّوْنِّيْ فِي اللّٰهِ ﴾"کہ کیا تم مجھ سے اللہ کے متعلق جھگڑا کرتے ہو۔یہ قول حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے جو انہوں نے قوم سے بحث کرتے ہوئے کہا اور اللہ کریم نے فرمایا:﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرَاهِيْمَ فِيْ رَبِّهٖ ﴾"کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے متعلق جھگڑا کیا۔"اسی طرح اس آیتِ باب میں فرمایا کہ ہم تم سے بری ہیں اور تم ہم سے بری ہو۔ہم تو اسی

اکیلے رب کی عبادت کرتے ہیں۔

پھر اللہ کریم نے ان کے اس دعوے کو بھی باطل قرار دیا جو وہ کہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد و اسباط یہودیت و نصرانیت پر تھے۔اور فرمایا کہ کیا تمہیں اللہ سے بھی زیادہ خبر ہے جو اس طرح کا دعویٰ کر رہے ہو۔ حالانکہ اللہ کریم نے خود خبر دی کہ نہ وہ یہودی تھے نہ عیسائی تھے۔جیسے کہا:﴿ مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا ۝ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴾"کہ ابراہیم نہ یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ وہ یکطرفہ مسلمان تھے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔

فائدہ: حضرت حسن بصری نے کہا کہ جو کتاب ان کی طرف نازل ہوئی تھی وہ اس میں پڑھتے تھے کہ بلا شبہ دین اسلام ہی ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ابراہیم،اسماعیل،اسحٰق اور یعقوب اور اسباط یہودیت و نصرانیت سے بالکل الگ تھلگ تھے۔گویا اپنے نفس میں تو اس بات کا اقرار کر چکے تھے لیکن وقت پر اس گواہی کو چھپا گئے۔ اللہ کریم نے فرمایا تم چھپالو ہم کیا تمہارے اعمال سے بے خبر ہیں۔اس میں بڑی سخت وعید اور ڈانٹ ہے کہ جب یہ بات طے شدہ ہے کہ اللہ کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے تو پھر ضرور وہ تمہیں تمہارے ان اعمال کی جزاء دے گا۔ پھر فرمایا کہ تابعداری کے بغیر صرف ان کی طرف اپنی نسبت کرنا تمہیں کچھ فائدہ نہ دے گا۔اسی نسبت پر دھوکے میں مت رہنا کیونکہ جس نے کسی ایک نبی کا انکار کیا اس نے گویا سب کا انکار کر دیا۔اور خصوصاً سید المرسلین محمد رسول اللہ علیہ و اله وصحبه صلوات الله کا منکر ہوا۔

((اس آیت مبارکہ پر کلام پاک کا پہلا پارہ رمضان المبارک ۱۳۰۲ ہجری کو ختم ہوا۔اَلْحَمْدُلِلّٰهِ وَالْمِنَّة))

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ
پارہ الٓمٓ مکمل ہوا
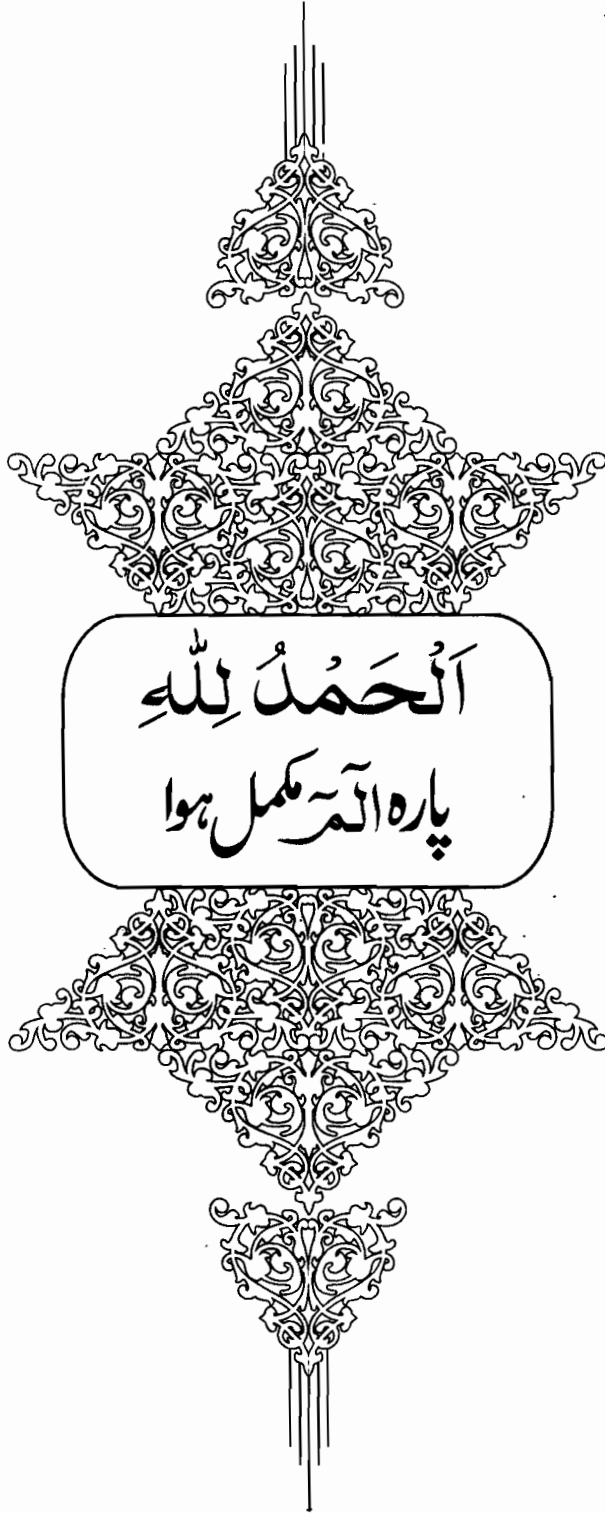
سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١٤٣﴾

احمق لوگ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلے پر (پہلے سے چلے آتے) تھے (اب) اس سے کیوں منہ پھیر بیٹھے تم کہہ دو کہ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کا ہے وہ جس کو چاہتا ہے سیدھے رستے پر چلاتا ہے۔ اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزمان) تم پر گواہ بنیں، اور جس قبلے پر تم (پہلے) تھے اس کو ہم نے اس لیے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں کہ کون (ہمارے پیغمبر) کا تابع رہتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے اور یہ بات (یعنی تحویل قبلہ لوگوں کو) گراں معلوم ہوئی مگر جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے وہ اسے گراں نہیں سمجھتے، اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یونہی کھو دے، اللہ تو لوگوں پر بڑا مہربان (اور) صاحب رحمت ہے۔

فائدہ : آنحضرتؐ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سولہ سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ پھر کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم آیا تو اس پر بعض نو مسلم اور یہودی اس بات میں شبہ ڈالنے کے لیے باتیں بنانے لگے کہ وہ تو سب نبیوں کا قبلہ ہے۔ اس کو چھوڑنا کسی نبی کو زیبا نہیں ہے۔ ابن کثیر نے کہا کہ بیوقوفوں سے مشرکینِ عرب مراد ہیں۔ یہ قول زجاج کا ہے جبکہ حضرت مجاہد کہتے ہیں کہ اس سے علمائے یہود مراد ہیں۔ سدی نے کہا اس سے منافقین مراد ہیں۔ مگر درست بات یہ ہے کہ آیت عام ہے سب کو شامل ہے۔ بخاری نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ آکر سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی مگر آپ علیہ السلام کی چاہت یہ تھی کہ قبلہ کعبہ مقرر ہو۔ چنانچہ سب سے پہلے کعبہ کی طرف جو نماز پڑھی گئی وہ نماز عصر تھی۔ آپؐ کے ساتھ ایک عظیم جماعت نے نماز ادا کی۔ انہی میں سے ایک آدمی مسجد والوں پر سے گذرا تو وہ رکوع کی حالت میں تھے اس نے کہا میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ مکہ (کعبہ) کی طرف نماز ادا کی ہے۔ اس پر وہ سب لوگ کعبہ کی طرف پھر گئے کچھ لوگوں نے جو کہا کہ لوگ قبلہ کی تبدیلی سے پہلے فوت ہو گئے ہیں ہم ان کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس پر اللہ

کریم نے یہ آیت نازل کی۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر گز تمہاری نمازوں کو ضائع نہ کرے گا اس طریق سے یہ روایت مفردات بخاری میں سے ہے۔ مسلم نے اس کو اور طرح روایت کیا ہے اور اس باب میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ آنحضرتؐ کو حکم ہوا تھا کہ وہ صخرہ بیت القدس کی طرف منہ کیا کریں۔ وہ مکہ میں دونوں رکن کے درمیان نماز پڑھتے۔ کعبہ بھی سامنے رہتا اور صخرہ کی طرف بھی متوجہ ہوتے۔ جب مدینہ تشریف لائے تو دونوں کو بیک وقت رخ کرنا مشکل ہوا۔ تو اللہ کریم نے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ یہ حضرت ابن عباس سمیت جمہور کا قول ہے۔ پھر اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا اس کا حکم قرآن میں آیا ہے یا کسی اور طریقے سے حکم ملا۔ اس کے متعلق دو اقوال ہیں۔ قرطبی نے عکرمہ، ابو العالیہ اور حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ بیت المقدس کی طرف رخ کرنا ان کا اجتہاد تھا۔ مطلب یہ کہ دس مہینوں سے کچھ اوپر عرصہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے لیکن اللہ سے دعا اور عاجزی کرتے رہے کہ قبلہ کعبہ مقرر ہو۔ کیونکہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا۔ آنحضرت ﷺ کی دعا قبول ہوئی اور حکم آیا کہ آپ کعبۃ اللہ کی طرف رخ پھیر لیجئے۔ آپ علیہ السلام نے خطبہ پڑھا اور لوگوں کو اس سے آگاہ کیا اور سب سے پہلے قبلہ کی تبدیلی میں جو نماز ادا کی گئی وہ نماز عصر تھی۔ جس طرح کہ بحوالہ صحیحین اوپر گذر چکا ہے۔ نسائی نے ابو سعید بن معلی سے یوں روایت کیا ہے کہ وہ نمازِ ظہر تھی۔ سب سے پہلے میں نے اور میرے صاحب نے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی۔ بہت سے مفسرین کا بھی یہی قول ہے کہ جب آنحضرت علیہ السلام پر تبدیلی قبلہ کا حکم نازل ہوا تب آپؐ نماز ظہر کی دو رکعت پڑھ چکے تھے اور یہ حکم مسجد نبی سلمہ میں نازل ہوا۔ اسی لیے اس کا نام مسجد القبلتین پڑ گیا۔ حضرت نویلہ بنتِ مسلم کی حدیث میں ہے کہ جب انہیں یہ خبر ملی تو وہ نمازِ ظہر میں کھڑے تھے۔ حکم ملتے ہی لوگ پھر گئے مرد عورتوں کی جگہ اور عورتیں مردوں کی جگہ ہو گئیں۔ اس کو ابن عبد البر نے ذکر کیا ہے۔ رہے اھل قباء تو انہیں اگلے دن صبح کی نماز تک یہ خبر نہ ملی تھی۔ جس طرح صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ سے آیا ہے کہ مسجد قباء والے صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک آنے والے نے آکر کہا کہ آنحضرت ﷺ پر قرآن نازل ہوا جس میں کعبہ کو قبلہ بنادیا گیا ہے۔ ان کے چہرے شام کی طرف تھے۔ یہ سن کر وہ کعبہ کی طرف پھر گئے۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ ناسخ کا حکم علم کے بعد لازم آتا ہے۔ گو کہ ناسخ کا نزول پہلے ہی ہو چکا ہو۔ کیونکہ قباء والوں کو یہ حکم نہ دیا گیا کہ وہ نماز عصر، مغرب اور عشاء کو دوبارہ ادا کریں۔ **و اللہ اعلم**۔ جب قبلے میں اس طرح تبدیلی کا حکم ملا تو یہودیوں کے شک و نفاق والے لوگوں کو شک و شبہ میں مزید موقع ملا وہ صدق و کذب میں مبتلا ہو کر کہنے لگے کہ ان مسلمانوں کو

کیا ہو گیا ہے کہ کبھی اِدھر منہ کر لیتے ہیں اور کبھی اُدھر۔ اس پر اللہ کریم نے جواباً فرمایا مشرق و مغرب سب اللہ کا ہے سب جگہ اسی کا فیصلہ جاری ہوتا ہے۔ تم جس طرف بھی رخ پھیر لو اللہ ادھر ہی موجود ہے۔ نیکی کا مدار اور مرکز کچھ یہی بات نہیں ہے کہ تم شمالاً جنوباً رخ کرو۔ نیکی تو یہ ہے کہ تم اللہ پر ایمان لاؤ، اسی کی حکم برداری کرو سو اس نے ہمیں جس طرف پھیر دیا ہے ہم اسی طرف پھر گئے ہیں۔ اور اسی کے حکم کے آگے ہتھیار ڈالنے والے ہیں۔ وہ جدھر چاہے حکم دے ہم اس طرف پھر جائیں گے۔ اگر وہ ہر دن میں کئی دفعہ مختلف سمتوں میں منہ کرنے کا حکم بھی دے گا تو ہم اس کے بندے اور غلام ہیں اور غلاموں کو اطاعت ہی شایانِ شان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام اور ان کے امتیوں پر بہت بڑی مہربانی اور شفقت والا معاملہ کیا کہ ان کے لیے اس کعبہ کو قبلہ مقرر فرمادیا جس کو ان کے باپ ابراہیمؑ خلیل الرحمٰن نے خاص اللہ کے نام پر بنایا تھا۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اھل کتاب کے متعلق فرمایا کہ اھل کتاب کو ہم پر کسی اور معاملے میں اتنا حسد نہیں ہے کہ جتنا حسد جمعہ کے دن، قبلہ اور آمین بالجھر فاتحہ خلف الامام کے معاملے میں ہے۔ اللہ نے ہمیں ان کی ہدایت دی جبکہ انہیں اس میں گمراہ کر دیا۔ [بروایت احمد]

اس امت کو جو معتدل امت کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں ابراہیمؑ کے قبلہ کی طرف پھیر دیا تاکہ تم قیامت والے دن تمام امتوں سے بہتر ہو جاؤ۔ اور ان کے بارے میں ان پر گواہی دو کیونکہ وہ سب تمہارے فضل و عزت کے معترف ہیں۔ وَسَط کا معنی عمدہ ترین کے ہیں۔ محاورے میں کہا جاتا ہے کہ قریش نسب و دار کے لحاظ سے اوسطِ عرب ہیں یعنی قوم و خاندان میں وہ لوگ افضل و اعلیٰ ہیں۔ اور رسول اللہ ان سب میں سے وَسَط تھے۔ یعنی سب سے زیادہ شریف النسب تھے۔ اسی وجہ سے نماز عصر کو صلوٰۃ وسطیٰ کہتے ہیں۔ کہ وہ افضل الصلوٰت ہے۔ سو جب اس امت کو امتِ وسط ٹھہرایا تو اس کو کامل ترین اور جامع شریعت سے خصوصیت بھی دی۔ جس طرح فرمایا: ﴿هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ ''وہی ذات ہے جس نے تمہیں پسند کیا اور تم پر تمہارے دین میں کوئی مشکل نہیں رکھی (یہ) تمہارے باپ ابراہیم کا دین کا اسی نے تمہارا نام اس سے پہلے اور اس قرآن میں مسلمان رکھا۔ تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ۔'' حضرت ابو سعید کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت والے دن حضرت نوح علیہ السلام بلائے جائیں گے پھر ان سے کہا جائے گا کہ کیا تم نے ہمارا پیغام پہنچا دیا۔ وہ عرض کریں گے جی ہاں۔ پھر ان کی

قوم کو بلا کر کہا جائے گا کہ کیا نوح علیہ السلام نے تم تک ہمارا پیغام پہنچا دیا وہ کہیں گے کہ ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہ آیا۔ حضرت نوح علیہ السلام سے کہا جائے گا کہ تمہارا گواہ کون ہے، وہ کہیں گے کہ میرے گواہ محمد ﷺ اور ان کی امۃ زادھا اللہ شرفاً ہیں۔ اللہ کے اس قول کا: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ یہی مطلب ہے، پھر فرمایا کہ وسط عدل کو کہتے ہیں۔ یعنی معتدل امت کہ تم حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ پر بطور گواہ ہو گے اور میں تم پر گواہی دوں گا۔ [بروایت احمد، بخاری، نسائی، ابن ماجہ] حضرت ابو سعید خدری کا دوسرا مرفوعاً لفظ یہ ہے کہ قیامت کے دن کوئی نبی آئے گا اور اس کے ساتھ دو یا زیادہ آمی ہوں گے۔ پھر ان کی قوم کو بلا کر کہا جائے گا کہ کیا انہوں نے تم کو ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا۔ وہ کہیں گے کہ ہم تک پیغام نہیں پہنچا، پھر اس نبیؑ سے کہا جائے گا کیا آپؑ نے ان تک ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے: جی ہاں۔ کہا جائے گا کون آپؑ کی گواہی دیتا ہے؟ وہ کہیں گے محمدؐ اور ان کی امت میرے گواہ ہیں۔ پھر آنحضرت ﷺ کو ان کی امت سمیت بلایا جائے گا۔ ان سے پوچھا جائے گا کیا اس نبیؑ نے اس امت کو پیغام پہنچا دیا تھا وہ کہیں گے: جی ہاں، انہوں نے پیغام پہنچا دیا تھا۔ ان سے کہا جائے گا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا، وہ کہیں گے ہمارے پیغمبر علیہ السلام آئے انہوں نے ہمیں اس بات کی خبر دی کہ انبیاء علیہم السلام نے وہ پیغام پہنچا دیا جو انہیں دیا گیا تھا۔ اللہ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ [بروایت احمد] حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ ہم اور ہماری امت قیامت والے دن ایک ٹیلے پر چڑھے جھانکتے ہوں گے کوئی شخص نہ ہو گا مگر یہ چاہے گا کہ وہ ہمارے گروہ سے ہوتا اور کوئی نبی نہ ہو گا جسے اس کی قوم نے جھٹلا دیا مگر ہم گواہی دیں گے کہ انہوں نے قوم تک اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ [بروایت ابن مردویہ، ابن ابی حاتم]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ بنی سلمہ کے ایک جنازے سے آئے۔ اور میں رسول اللہ علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ بعض نے کہا یہ کیا اچھا آدمی تھا، بڑا نیک پارسا مسلمان تھا اور اس کی اچھی تعریف کی۔ فرمایا: کیا تو اس بات کا ذمہ دار ہے۔ اس نے کہا باطن تو اللہ جانتا ہے جو ہم پر واضح ہوا وہ ایسا ہی حال تھا۔ فرمایا: جنت واجب ہو گئی۔ پھر بنی حارثہ میں سے ایک جنازے پر آئے اور میں آپؐ کے ساتھ تھا۔ کسی نے کہا اے اللہ کے پیغمبر یہ بہت برا تھا، بڑا بد مزاج اور سخت طبیعت تھا اور اس پر بری تعریف کی۔ فرمایا کیا تو اس کا ذمہ دار ہے۔ کہا باطن تو اللہ جانتا ہے جو ہم پر ظاہر ہوا وہ یہی حال تھا۔ فرمایا: دوزخ واجب ہو گئی۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ محمد قرظی نے کہا رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ حاکم نے کہا اس کی سند صحیح ہے۔ شیخین نے اس کو روایت نہیں کیا ہے۔ ابو الاسود کہتے ہیں میں مدینہ میں تھا وہاں کوئی بیماری

پھیلی ہوئی تھی لوگ کثرت سے مر رہے تھے۔ میں حضرت عمر بن خطاب کے پاس بیٹھا تھا ایک جنازہ گزرا لوگوں نے اس کو اچھا کہا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا واجب ہو گئی۔ پھر دوسرا جنازہ گزرا، اس پر بری تعریف کی گئی، تو آپ نے فرمایا: واجب ہو گئی۔ میں نے پوچھا: امیر المومنین! کیا چیز واجب ہو گئی۔ فرمایا: جو بات رسول اللہ علیہ السلام نے کہی میں نے وہی کہی ہے۔ جس شخص کی چار شخص خیر کی گواہی دیں اس کو اللہ کریم جنت میں داخل کرے گا۔ میں نے کہا تین بھی فرمایا: تین بھی، پوچھا دو بھی، فرمایا دو بھی۔ پھر ہم نے ایک کا حال نہیں پوچھا۔[بروایت احمد ،بخاری ،ترمذی ، نسائی]

ابو زہیر ثقفی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ علیہ السلام کو فرماتے سنا ہے۔ قریب ہے کہ تم اپنے بدوں میں سے نیکوں کو جان لو گے۔ عرض کیا: کس طرح۔ کہا لوگوں کی اچھی یا بری تعریف سے۔ تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ [بروایت ابن مردویہ ،ابن ماجہ احمد] شھادت امم میں علی کو ناس پر موخر کیا جبکہ شھادت رسول میں مقدم کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اول میں امتِ اسلام کی باقی امتوں پر گواہی کا ثبوت ہے جبکہ دوسری میں نبی علیہ السلام کی امت محمدیہ کے متعلق گواہی کا خصوص ہے۔ اسی کی طرح یہ آیت ہے: ﴿ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ "سو کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور آپؐ کو ان سب پر گواہ لائیں گے۔" موضح قرآن میں امت وسط اور شھادت کے ذکر کے نیچے یہ فائدہ لکھا ہے کہ:

فائدہ: جس طرح ان دو باتوں میں ہے کہ تمہارے پاس پوری بات ہے جبکہ تمہارے مخالفوں کے پاس ناقص بات ہے ایک یہ کہ تم تمام نبیوں کو مانتے ہو جبکہ یہود و نصاریٰ کچھ پر ایمان رکھتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ تمہارا قبلہ کعبہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں مقرر ہوا تھا۔ جو تمام لوگوں کے امام ہیں۔ جبکہ یہودیوں، عیسائیوں کا قبلہ بعد میں ثابت ہوا۔ اسی طرح تم ہر بات میں مکمل ہو جبکہ دوسری امتیں ناقص ہیں۔ انہیں اسکی ضرورت ہے کہ تم انہیں بتاؤ جبکہ تمہیں یہ ضرورت نہیں ہے کہ اور امتیں تمہیں خبر دیں۔ مگر صرف یہ کہ تمہارا نبی تمہیں بتائے۔ اس کے بعد اللہ کریم نے قبلہ کی تبدیلی کی مصلحت بیان کی کہ ہم نے جو پہلے بیت المقدس کو قبلہ مشروع کیا پھر اس کی بجائے کعبہ کو قبلہ مقرر کیا، یہ اس لیے تھا کہ ہم فرمانبردار اور نافرمان و مرتد کو پہچان لیں کہ کون تمہاری پیروی کر کے کعبہ کی طرف رخ کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر کر دین سے پلٹ جاتا ہے۔ پھر یہ قبلہ کی تبدیلی اگرچہ بہت بھاری بات ہے مگر جس کے دل کو اللہ ہدایت دے اور وہ رسول کی تصدیق کا یقین رکھتا ہے۔ اور جو رسول لائے ہیں اس کو حق جانتا ہے۔ ان پر یہ کچھ بھاری نہ ہے کیونکہ وہ یہ بات مان چکے ہیں کہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس کو مکلف کرنے کا بھی اختیار ہے اور تبدیل کرنے کا بھی اختیار ہے۔ اس کی حکمت تمام اور حجت بالغ ہے جبکہ جن کے دل میں کفر و نفاق کی بیماری ہے ان کا حال

دوسرا ہے۔ جب بھی کوئی نیا حکم آتا ہے ان کے دلوں میں شک کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ وَاِذَا مَا اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۞ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ ﴾ "اور جب بھی کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو بعض کہتے ہیں تم میں سے کس کو اس سورت نے ایمان میں زیادہ کیا، پس جو لوگ ایمان لائے وہ انہیں ایمان میں زیادہ کرتی ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔ اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے سو انہیں زیادہ کرتی ہے ناپاکی کی طرف ناپاکی میں۔" اور فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۚ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ﴾ "فرما دیجئے! کہ وہ ایمان والوں کے لیے ہدایت اور شفاء ہے اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ ان پر اندھاپن ہے۔" اور اللہ کریم نے فرمایا: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴾ "اور ہم قرآن سے نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے شفاء ورحمت ہے اور یہ نہیں زیادہ کرتا ظالموں کو مگر نقصان میں۔" اس لیے جو لوگ نبی علیہ السلام کی اطاعت پر ثابت قدم رہے اور جس طرف اللہ کریم نے پھرنے کا حکم دیا اس طرف پھر گئے۔ وہ عظیم صحابہ ٹھہرے۔ بعض علماء نے کہا کہ مہاجرین وانصار میں سے سابقین اولین نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی ہے۔ بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا کہ لوگ مسجد قباء میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے جبکہ ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ پر اس باب میں قرآن اترا ہے کہ کعبہ کو قبلہ بنالیں۔ وہ اسی وقت کعبہ کی طرف پھر گئے۔ اس کو مسلم نے بھی کچھ اور طرح روایت کیا۔ ترمذی کا لفظ یہ ہے کہ وہ رکوع کی حالت میں تھے۔ اسی طرح کعبہ کی طرف مڑ گئے۔ اسی طرح مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ ایمان سے اس جگہ نماز مراد ہے۔ جو کہ قبلہ کی تبدیلی سے پہلے وہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھا کرتے تھے۔ اللہ کریم نے فرمایا کہ ان نمازوں کا ثواب ضائع نہ ہو گا۔ صحیح میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ ایک قوم جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتی رہی وہ فوت ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے کہا ان کا کیا حال ہو گا اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ﴾ "کہ اللہ تمہارا ایمان لانا ضائع نہ کرے گا۔" [بروایت ترمذی عن عباس و صححہ]

موضح القرآن میں لکھا ہے کہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے قبلہ مقرر ہے۔ چند دن بیت المقدس کو لوگوں کی آزمائش کے طور پر قبلہ مقرر کیا جو اس میں کامیاب رہے ان کے لیے بہت اجر ہے۔ اللہ کریم نے یہاں

ایمان کہہ کر نماز مراد لی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو مسلمان نمازی ہے وہی مومن ہے۔ لیکن جو دعوے اسلام کے باوجود نماز نہیں پڑھتا یا کبھی کبھی پڑھتا ہے وہ مومن نہیں ہے۔ اسی لیے صحیح حدیث میں ہے کہ جس نے جان بوجھ کر فرض نماز چھوڑ دی وہ کفر کا مرتکب ہوا۔ اھل حدیث کے نزدیک یہی قول درست ہے نماز کو اس لیے ایمان کہتے ہیں کہ اس میں ایمان کے تینوں بنیادی اصول: نیت، قول و عمل جمع ہیں۔ گویا صفت ایمان ہی نماز ہے۔ واللہ اعلم۔

اس میں ان لوگوں کے موقف کی تردید ہے جو سنت کا نسخ قرآن سے غیر جائز سمجھتے ہیں کیونکہ بیت القدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا قرآن سے ثابت نہ تھا بلکہ یہ عملی سنت تھی۔ امت وسط ہونے سے یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ اجماع امت حجت ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ امت کسی باطل امر پر متفق ہو گی تو ان کی عدالت پر داغ لگے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ امت تمام امتوں سے افضل ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ﴿۱۴۴﴾

(اے محمدؐ) ہم تمہارا آسمان کی طرف منہ پھیر پھیر کر دیکھنا دیکھ رہے ہیں سو ہم تم کو اسی قبلے کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو منہ کرنے کا حکم دیں گے تو اپنا منہ مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو اور تم لوگ جہاں ہوا کرو (نماز پڑھنے کے وقت) اسی مسجد کی طرف منہ کر لیا کرو اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ (نیا قبلہ) ان کے پروردگار کی طرف سے حق ہے اور جو کام یہ لوگ کرتے ہیں اللہ ان سے بے خبر نہیں۔

فائدہ: آنحضرتؐ جتنی دیر بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے دل میں تبدیلی قبلہ کا شوق رہا نماز میں نگاہیں بلند کرتے کہ شاید فرشتہ کعبہ کے قبلہ ہونے کا حکم لے آئے۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی تب سے کعبہ قبلہ مقرر ہو گیا۔ اس آیت سے بطریق نص اللہ کا عرش پر مستوی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو حکم منسوخ ہوا وہ قبلہ کا حکم تھا۔ جب آنحضرتؐ مدینہ تشریف لائے یہاں کے اکثر لوگ یہودی تھے اللہ کریم نے بیت القدس کی جانب منہ پھیرنے کا حکم دیا اس پر یہودی خوش ہوئے۔ چند ماہ تک یوں ہی رہا۔ آنحضرت ﷺ کعبہ کو بطور قبلہ محبوب رکھتے تھے۔ دل میں دعا کیا کرتے اور نظریں اٹھا اٹھا کر فرشتے کی تحویلِ قبلہ کے سلسلے میں وحی کا انتظار فرماتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ تب یہود شک کرنے لگے کہ

ایسا کیوں ہوا۔ اس پر اللہ کریم نے فرمایا کہ مشرق و مغرب دونوں اطراف اللہ کی ہیں۔ تمہارا اس میں کیا حصہ ہے ۔جدھر چاہے رخ پھیرنے کا حکم دے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا مسجد الحرام کی طرف منہ پھیرنے سے کعبہ کی طرف منہ پھیرنا مراد ہے۔ ابن عمرؓ نے فرمایا: میزابِ کعبہ کی طرف منہ پھیرنا مراد ہے اور کئی علماء نے بھی یہی کہا اور امام شافعی کا ایک قول بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مکہ میں عین کعبہ کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ دوسرا قول جس کی طرف جمہور گئے ہیں کہ اس طرف متوجہ ہونا مراد ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ، ابو العالیہ، مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور ربیع وغیرھم، بھی اسی کے ہم خیال ہیں کہ طرف سے مراد کعبہ کا سامنا کرنا ہے۔ حدیث میں ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ یعنی اھل مدینہ کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان ہے۔ حضرت ابن عباس کی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ بیت اللہ اھل مسجد کا قبلہ ہے اور مسجد اھل حرم کا قبلہ ہے اور حرم اور اھل دنیا میں میری امت کا قبلہ حرم ہے۔ مشرق کیا اور مغرب کیا۔ [بروایت ابن جریج] صبح سویرے جاتے اور وہاں نماز پڑھتے ایک دن جو وہاں سے گذر ہوا تو دیکھا کہ آنحضرت ﷺ منبر پر بیٹھے ہیں ہم نے خیال کیا کہ کوئی نیا حکم آیا ہوگا۔ ہم بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے آیت مبارکہ تلاوت کی: ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ﴾ "جب پڑھ چکے تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا آؤ رسول اللہ ﷺ کے منبر سے اترنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لیں تاکہ ہم سب سے پہلے اس قبلہ کی طرف نماز پڑھنے والے ہوں پھر ہم نے چھپ کر (دو رکعت) نماز پڑھی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ منبر سے اترے اور ظہر کی نماز پڑھائی۔ ابن عمرؓ بھی اس نماز کو نمازِ ظہر بتاتے تھے اور اسی کو صلوٰۃ وسطیٰ کہتے تھے۔ مگر مشہور یہ ہے کہ وہ نماز نمازِ عصر تھی۔ اسی نماز کا نام صحیحین میں نمازِ وسطیٰ آیا ہے۔ یہی سبب تھا کہ قباء والوں کو دیر سے یعنی صبح کو تبدیلی قبلہ کی اطلاع ملی۔ نویلہ بنتِ مسلم کی حدیث میں یوں ہے کہ وہ نماز ظہر یا عصر کی تھی جبکہ مسجد بنی حارثہ والوں نے کعبہ کی طرف منہ پھیر لیے۔ جب آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ملی تو فرمایا: ﴿أُولٰٓئِكَ رِجَالٌ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ "کہ یہی وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔" [بروایت ابن مردویہ]

فائدہ: اللہ کریم نے اس آیتِ مبارکہ میں باب کعبہ کی طرف رخ کرنے کا عام حکم دیا ہے۔ ساری زمین والوں کو پورب کیا، پچھم کیا، مشرق کیا، مغرب کیا، جو کوئی جہاں بھی ہو اسی کی طرف منہ کر کے اللہ کے حکم برداری کرلے۔ مگر سواری پر نفل نماز کی رخصت ہے کہ سواری پر پڑھتے ہوئے دل کعبہ کی جانب ہی متوجہ ہو اگرچہ سواری کسی اور طرف رخ کرے تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح جنگ کی حالت میں جیسے نمازِ خوف کہا

جاتا ہے ہر حال میں پڑھ سکتا ہے۔اسی طرح اندھیرے وغیرہ میں یا قبلے کی لاعلمی والی جگہ میں قبلے کی تلاش کرنے کے بعد اگر غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھ لی تو وہ بھی ہو جائے گی۔اللہ کریم کسی نفس کو وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔مالکیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ نمازی نماز میں امام کی طرف دیکھے سجدہ کی جگہ نہ دیکھے۔امام شافعی،احمد اور ابو حنیفہ کا بھی یہی مذہب ہے۔مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر سجدہ کی جگہ دیکھے گا تو ایک طرح سے جھکنا پڑے گا جو کمال قیام کے منافی ہے۔بعض اہل علم نے کہا کہ اپنے سینے کی طرف دیکھے۔قاضی شریک نے کہا نہیں بلکہ سجدے کی جگہ نظر رکھے جیسا کہ جمہور کا مسلک ہے۔اس لیے کہ اس طرح زیادہ خشوع ممکن ہوتا ہے۔اس کے متعلق ایک حدیث بھی ہے کہ جب رکوع کرے تو پاؤں والی جگہ کو دیکھے اور جب سجدہ کرے تو نظر کی جگہ دیکھے جب بیٹھے تو جانب کنار نظر رکھے۔پھر اللہ کریم نے فرمایا کہ جو یہودی تمہارے کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا انکار کرتے ہیں اور تمہیں شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں انہیں یہ بات بڑی اچھی طرح معلوم ہے کہ اللہ کریم آنحضرت ﷺ کو کعبہ کی طرف منہ پھیرنے کا حکم دے گا۔اس لیے کہ انہوں نے اپنے انبیاء کے ذریعے اپنی کتابوں میں نبیؑ کی صفت اور ان کی امت کی صفات اور اس امت کے خصائص آنحضرت ﷺ کی شریعت کاملہ کا حال اور دین میں نسخ کا حال سن رکھا تھا لیکن حسد و بغض سے ان کو چھپاتے تھے۔اسی لیے اللہ کریم نے انہیں دھمکی دی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔وہ ضرور تمہیں تمہارے حسد و عناد کی سزا دے گا۔

وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٥﴾	اور اگر تم ان اہل کتاب کے پاس تمام نشانیاں بھی لے کر آؤ تو بھی یہ تمہارے قبلے کی پیروی نہ کریں،اور تم بھی ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں ہو اور اگر تم باوجود اس کے کہ تمہارے پاس دانش (یعنی وحی اللہ) آچکی ہے ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو ظالموں میں (داخل) ہو جاؤ گے۔

فائدہ: اس آیت میں اس بات کی خبر دی ہے کہ یہ یہود آنحضرت ﷺ کو پہچاننے کے باوجود انکار کرتے ہیں یہ بڑے کافر و مخالفت پسند ہیں۔ان کے پاس دین اسلام کی صحت پر ہزار دلیلیں بھی لا دو تو بھی یقین نہ کریں گے اور نہ اپنے نفس کی خواہش کی مخالفت کو تیار ہیں۔جیسے فرمایا:﴿إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾ ”کہ وہ لوگ جن پر تیرے رب کی بات صادق آچکی ہے وہ تب تک ایمان نہ لائیں گے اگرچہ ان کے پاس ہر نشانی بھی آجائے حتیٰ کہ وہ عذاب الیم کو

دیکھ نہ لیں۔" اسی لیے اس جگہ فرمایا ہے کہ اگر تو ان کے پاس ہر نشانی بھی لے آئے تو بھی تیرے قبلے کی پیروی نہ کریں گے اور نہ آپؐ ان کے قبلے پر چلیں گے اس میں رسول اللہ ﷺ کی حکم ربی پر استقامت کی خبر دی گئی ہے کہ اگر اھل کتاب اپنی خواہشات کو پکڑے ہوئے ہیں تو آپ علیہ السلام اپنے رب کی اطاعت گذاری میں مضبوط رہیں۔ اور خواہ قبلہ کا معاملہ ہو یا کوئی اور کسی حال میں بھی رسول اللہ ﷺ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں گے اور آیت باب سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ اگرچہ وہ بظاہر نبی علیہ السلام کی اطاعت کی حرص ظاہر کرتے ہیں جبکہ یہ لوگ خود آپس میں بھی ایک دوسرے سے متفق و موافق نہیں ہیں۔ دیکھو یہی قبلے کا مسئلہ ہے کہ یہودی تو بیت القدس کی طرف چہرہ کرتے ہیں جبکہ عیسائی مشرقی جانب منہ کرتے ہیں۔ ابن القیم نے "بدائع الفوائد" میں لکھا ہے کہ اھل کتاب کا قبلہ کسی وحی یا توقیف الٰہی سے نہیں بلکہ باہمی مشورے اور اجتہاد سے مقرر ہوا تھا۔ جبکہ عیسائیوں کو یقینی طور پر مشرق کو قبلہ مقرر کرنے کا حکم اللہ نے نہ دیا تھا وہ خود اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کا قبلہ وہی صخرہ بیت المقدس ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے بڑوں نے یہ قبلہ تجویز کیا تھا۔ سو نصاریٰ یہود کے ساتھ اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ نے کبھی اپنے رسول کو بیت القدس کی طرف رخ کرنے کا حکم نہیں دیا اور نہ ان کے لیے یہ قبلہ مشروع کیا اس بات پر مسلمان بھی گواہ ہیں۔ تورات میں کسی جگہ بھی صخرہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم نہیں ہے۔ تابوت کو رکھ کر نماز پڑھتے۔ جب واپس آتے تو صخرہ پر تابوت رکھ دیتے۔ جب تابوت اٹھالیا تو اس چٹان کو قبلہ بنالیا گیا۔ پھر اللہ کریم نے عالم کو جس پر زیادہ حجت قائم ہو سکتی ہے غیر عالم کی نسبت ڈرلیا ہے کہ جس حق کو وہ جان چکا ہے اس کی مخالفت نہ کرے۔ اس لیے آنحضرت علیہ السلام اور امت کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تم ظالم ٹھہرو گے۔ فتح البیان میں اس مقام پر اھل بدعت وھویٰ کے رد میں بڑا عمدہ بیان ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ علم تین چیزوں کا نام ہے: ایک آیت محکمہ، دوسرا سنتِ قائمہ، تیسرا فریضہ عادلہ یعنی احکامِ میراث۔ پھر فرمایا کہ جو کچھ ان کے علاوہ ہے وہ فضول ہے۔ یعنی زائد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقلید مذاہب دائرہ علم سے باہر ہے۔ جو شخص تقلید پر عمل کرنے والا اور اس کا قائل ہے وہ (مردوں) انسانوں کی خواہشات کا پیرو ہے۔ سو یہ تقلید جب علم کے بعد ہو گی تو وہ ظالمین سے ہو گا۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿١٤٦﴾	جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ ان (پیغمبر آخر الزمان) کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانا کرتے ہیں، مگر ایک فریق ان میں سے سچی بات کو جان بوجھ کر چھپا رہا ہے۔

الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١٤٧﴾

(اے پیغمبر یہ نیا قبلہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے تو تم ہر گز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔

فائدہ: عرب کسی چیز کی صحت کے لیے یہ مثال بولتے تھے۔ جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ تھا آنحضرت ﷺ نے اس سے پوچھا کیا یہ تیرا بیٹا ہے اس نے کہا ہاں آپ گواہ رہئے۔ فرمایا یہ تم پر اور تم اس پر کچھ مخفی نہ ہو۔ قرطبی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن سلام سے کہا یا تم محمد ﷺ کو ایسا ہی پہچانتے ہو جیسے اپنے بیٹوں کو۔ کہا: ہاں بلکہ اس سے بھی زیادہ پہچانتا ہوں۔ آسمان کا امین زمین کے امین پر اس کی صفت لے کر نازل ہوا۔ میں نے ان کو پہچان لیا میں نہیں جانتا کہ ان کی ماں کون ہیں۔ یا یہ مراد ہے کہ جس طرح آدمی دوسروں کو بیٹوں سے اپنے بیٹے کو پہچان لیتا ہے کسی طرح کا شک نہیں کرتا۔ اسی طرح اہل کتاب آنحضرت ﷺ کو ان کی صفات سے پہچانتے تھے۔ مگر اس تحقیق و پختگی علم کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی سے اس حق کو جو ان کی کتابوں میں تھا لوگوں سے چھپاتے تھے۔ اس پر اللہ کریم نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کو تسلی دی کہ اگر یہ لوگ جاننے کے باوجود حق کو چھپاتے ہیں تو تم کسی طرح کے شک میں نہ پڑو۔ حق یہی ہے جو آپ ﷺ پر اتارا گیا ہے اور آپ کو بتایا گیا۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٤٨﴾

اور ہر ایک (فرقے) کے لیے ایک سمت (مقرر) ہے جدھر وہ (عبادت کے وقت) منہ کیا کرتے ہیں تو تم نیکیوں میں سبقت حاصل کرو تم جہاں ہو گے اللہ تم سب کو جمع کرے گا بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

فائدہ: یعنی یہ ضد کرنا کہ ہمارا قبلہ بہتر ہے یا تمہارا یہ بے فائدہ ہے بلکہ خیر تو اسی کے لیے ہے جس کی نیکیاں زیادہ ہیں۔ ہر امت کو ایک ایک قبلے کا حکم ہوا تھا۔ آخر تو سب کو ایک جگہ ہی جمع ہونا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اہل ادیان مراد ہیں۔ ہر قبیلے نے ایک قبلہ چن لیا تھا۔ اللہ کا چہرہ اسی طرف ہے جس طرف مومنین کا منہ ہے۔ ابو العالیہ نے کہا کہ یہود بھی (بغیر حکم کے) ایک طرف منہ کرتے ہیں۔ عیسائی بھی ایک سمت میں جبکہ تمہیں اللہ نے ایک قبلہ بتا دیا ہے تم اس طرف منہ کرو۔ حضرت مجاہد، عطاء، سدی، ربیع اور ضحاک نے بھی یہی بات کہی۔ حضرت حسن نے کہا ہر قوم کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم ہوا تھا۔ یہ آیت اسی آیت کی طرح ہے جو فرمایا: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ۝ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً

وَلٰكِنْ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ إِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ﴾ "تم میں سے ہر ایک کو ہم نے ایک دستور اور راہ دے دی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں ایک ہی امت بنا دیتا۔ لیکن تا کہ تمہیں اس چیز میں آزمائے جو اس نے تمہیں دی۔ پھر نیکیوں میں سبقت لے جاؤ تم سب کا لوٹنا اللہ کریم کی طرف ہی ہے۔" مطلب یہ ہے کہ تم سب کو اس زمین سے جمع کرنے پر وہ ذات قادر ہے۔ اگرچہ بدن جدا جدا بکھر گئے ہوں اور مردے خاک میں مل گئے ہوں۔ فتح البیان میں آیت باب کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر صاحبِ ملت کا ایک قبلہ ہے۔ وہ اس طرف منہ کرتا ہے مسلمانوں کا قبلہ کعبہ ہے۔ یہود کا قبلہ بیت القدس ہے، نصاریٰ کا قبلہ مطلع شمس ہے۔ اے امتِ محمد ﷺ تم میں سے ہر ایک کا ایک قبلہ ہے جس طرف وہ نماز پڑھتا ہے۔ مشرق ہو یا مغرب، جنوب ہو یا شمال یہ معنی اس بنیاد پر ہیں جبکہ اھل اسلام کو خطاب ہو۔ سو، اے مسلمانو! تم بیت الحرام کی طرف منہ کرنے میں جلدی کرو۔ یعنی اول وقت میں نماز ادا کرو کیونکہ یہ افضل ہے کیونکہ امر کا صیغہ ظاہر اُ وجوب کے لیے ہے جب وجوب نہ ہو گا تو اس صیغے کا آخری تقاضا استحباب ہے۔ یہ آیت مذہب شافعی پر دلیل ہے کیونکہ وہ اول وقت میں نماز کی افضلیت کے قائل ہیں۔ سبق یہی ہے کہ کسی چیز کے پاس جلدی پہنچ جائے۔ اس میں جلدی کرے تاخیر نہ کرے مختلف سمتوں میں سے جس بھی سمت میں تم ہو گے اللہ قیامت والے دن کے لیے تم سب کو جمع کرے گا۔ اس میں اطاعت گذاروں کے لیے ثواب اور گناہگاروں کے لیے عذاب کا وعدہ ہے۔ یا یہ کہ تمہارا مختلف سمتوں میں نماز پڑھنا وہ ایک ہی طرف نماز پڑھنے کی طرح کر دے گا۔ جبکہ اللہ کریم ہر چیز پر قادر ہے تو تمہارے مرنے کے بعد زندہ کرنے پر بھی وہ قادر ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي

اور تم جہاں سے نکلو (نماز میں) اپنا منہ مسجد محرم کی طرف کر لیا کرو، بے شبہ وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے، اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ اور تم جہاں سے نکلو مسجد محرم کی طرف منہ (کر کے نماز پڑھا) کرو، اور مسلمانو تم جہاں ہوا کرو اسی (مسجد) کی طرف رخ کیا کرو (یہ تاکید) اس لیے (کی گئی ہے) کہ لوگ تم کو کسی طرح کا الزام نہ دے سکیں، مگر ان میں سے جو ظالم ہیں (وہ الزام دیں تو دیں) سو ان سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا، اور یہ بھی

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾ مقصود ہے کہ میں تم کو اپنی تمام نعمتیں بخشوں اور یہ بھی کہ تم راہِ راست پر چلو۔

فائدہ: مکہ کی مسجد کو مسجد الحرام کہتے ہیں۔ حرام کے معنی اس مقام کے ہیں جہاں بندر ہنا چاہئے اس کو کئی ممنوعات کی وجہ سے حرام کہا جاتا ہے۔ یعنی وہاں انسانی قتل و غارت، جانوروں کو ستانا، درخت کاٹنا، گھاس اکھیڑنا اور گری پڑی چیز اٹھانا وغیرہ۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت میں تیسرے مقام پر زمین کے تمام اطراف سے مسجد الحرام کی طرف منہ کرنے کا حکم ہے اور اس تکرار کی حکمت میں مختلف اقوال ہیں۔ کسی نے کہا تاکید کے لیے ہے کیونکہ اسلام میں سب سے پہلا نسخ حکم قبلہ میں ہوا۔ کسی نے تقسیم یوں کی کہ پہلا حکم اس کے لیے ہے جو کعبہ کو دیکھ رہا ہو۔ دوسرا حکم اسے ہے جو مکہ میں تو موجود ہے لیکن کعبہ سے غائب ہے، اور تیسرا حکم اس کے لیے ہے جو باقی شہروں میں رہتا ہے۔ رازی نے اسی کو مناسب کہا ہے کہ یہ توجیہہ قابل التفات ہے۔ جبکہ راجح یہ ہے کہ پہلا حکم اس کے لیے ہے جو مکہ میں ہو اور دوسرا حکم باقی علاقوں اور سمتوں میں رہنے والوں کو ہے۔ اور تیسرا حکم مسافر کو ہے۔ اس کے علاوہ اور حکمتیں بھی رازی نے لکھی ہیں۔

فائدہ: اور جو فرمایا کہ تمہیں لوگوں سے مقامِ حجت نہ رہے لوگوں سے اہل کتاب مراد ہیں کیونکہ انہیں علم تھا کہ اس امت کی صفات میں سے ان کی ایک یہ بھی صفت مذکور ہے کہ ان کا قبلہ کعبۃ اللہ ہو گا۔ سو جب یہ مسلمان اس طرف منہ نہ کریں گے تو اہل کتاب کو بحث مباحثہ کا موقع ہاتھ لگے گا۔ یا وہ یہ دلیل لے سکیں گے کہ مسلمان ہمارے موافق ہیں یعنی وہ بھی بیت القدس کی طرف منہ کرتے ہیں۔ ابن کثیر نے اسی کو ظاہر تر کہا۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں جب آپ ﷺ کعبہ کی طرف متوجہ ہوئے تو اہل کتاب نے کہا اس کو اپنی قوم اور اپنے باپ دادا کے گھر کا شوق چرایا ہے۔ اور اس سے پہلے جبکہ آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کیا کرتے تھے تو یہ کہتے عنقریب یہ ہمارے دین میں آ جائے گا۔ جس طرح کہ یہ ہمارے قبلے کو مانتا ہے۔ حضرت مجاہد، عطاء، ضحاک، سدی، قتادہ اور ربیع نے بھی یہی کہا کہ ظالموں سے اس جگہ مشرکین قریش مراد ہیں۔ جنہوں نے یہ بات کہی تھی کہ آخر ہمارے ہی قبلے کی طرف رجوع کیا اور اتمام نعمت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ بتا کر دین حنیف کو آپ کے لیے مکمل کر دیا۔ یا دین پر فوت ہونا یا دخول جنت یا حشر کے دن اللہ تعالیٰ کو دیکھنا مراد ہے۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾

جس طرح (منجملہ اور نعمتوں کے) ہم نے تم میں تمہیں میں سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کے سناتے اور تمہیں پاک بناتے اور کتاب (یعنی قرآن) اور دانائی سکھاتے ہیں اور ایسی باتیں بتاتے ہیں جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔ سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا اور میرا احسان مانتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس آیت میں مومنین پر یہ نعمت یاد دلائی کہ ذرا غور کرو ہم نے تم میں اپنا ایسا رسول بھیجا ہے جو تمہیں اللہ کی آیات بینات پڑھ کر سناتا ہے۔ تمہیں برے اخلاق نفس کی شرارتوں اور جاھلیت کے کاموں سے پاک کرتا ہے اور تمہیں اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ کتاب سے کلام پاک اور حکمت سے سنت یعنی حدیث مراد ہے۔ جو جاہلیت میں بیوقوفی کی باتیں کہا کرتے تھے اب برکت رسالت سے وہ اولیاء و علماء کے درجے میں جا پہنچے۔ جھال سے علماء، احمقوں سے عقل مند، ظالموں سے عادل، فاسقوں سے صالح بن گئے اور سب سے اعلیٰ صفات کے وارث ہو گئے۔ علم میں سب سے گہرے، دل میں بڑے، عملوں میں پاک باز، تکلف میں سب سے کم، لہجے میں سب سے سچے بن گئے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ "کہ اللہ نے مومنین پر احسان کیا جبکہ انہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا جو ان پر اس کی آیات پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے۔" سنت کے متعلق کہا۔

گر نہ ہوتی ذاتِ پاک انبیاء — حق سے باطل کس طرح ہو تا جدا

پھر ان لوگوں کی مذمت کی جو ان نعمت کی قدر نہیں جانتے۔ فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ﴾ "کہ کیا آپ نے ان لوگوں کو نہ دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کا ناشکری سے بدلا دیا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لے اترے۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس جگہ نعمت سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ اسی لیے اللہ کریم نے مومنین سے کہا کہ تم اس نعمت کا اقرار کرو اور مقابلے میں ذکر و شکر کرو۔ کلام پاک میں جہاں کہیں بھی کتاب و حکمت کا لفظ ایک ساتھ آیا ہے سلف نے اس کا ترجمہ قرآن و حدیث کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر و شکر یہ ہے کہ ان دونوں کو تھامے رکھو۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے

وہ ناشکرے لوگ ہیں اور بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمان کہلا کر بھی اللہ کی بات پر کان نہ دھریں اور اس کی بھیجی ہوئی کتاب سے چشم پوشی والا معاملہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی بات سننے ماننے کی بجائے ہر عام آدمی کی بات کو سند بنالیں۔ اور اللہ اور اس کے رسول کو علماء اولیاء کے مقابلے میں رکھیں۔ مخلوق کو خالق کے مقابلے میں اور امت کو رسول کے مقابلے میں لائیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ناشکر گذاری ہو گی۔ حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے کہا اے اللہ! میں تیرا کس طرح شکر کروں۔ فرمایا: مجھے یاد رکھ اور بھولنا مت یہی تیرا شکر ہے۔ جب تو مجھے بھول جائے گا تو ناشکرا ہو جائے گا۔ حضرت حسن بصری، ابوالعالیہ، سدی اور ربیع فرماتے ہیں کہ اللہ اس کو یاد کرتا ہے جو اس کو یاد کرتا ہے اور جو اس کا شکر ادا کرتا ہے اس کو بڑھا کر دیتا ہے۔ اور جو ناشکری کرتا ہے اس کو عذاب دیتا ہے۔ بعض سلف نے کہا کہ اتقوا اللہ حق تقاتہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے نافرمانی نہ کی جائے اس کا ذکر کیا جائے اسے بھولا نہ جائے۔ اس کا شکر ادا کیا جائے ناشکری نہ کی جائے۔ جنید سے کسی نے پوچھا کہ نعمت کا شکر کس طرح کیا جائے؟ کہا جو نعمت اللہ عطا کرے اس کو اللہ کی مرضی کے خلاف استعمال نہ کرے۔ یہی نعمت کا شکر ہے۔ مکحول ازدی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا قاتلِ نفس، شارب خمر، چور اور زانی اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ﴾ "کہ تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا۔" کہا: ہاں۔ جب یہ لوگ اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو اللہ بھی ان کا ذکر لعنت سے کرتا ہے حتیٰ کہ وہ خاموش ہو جائیں۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا کہ تم مجھے فرائض میں یاد کرو میں تمہیں اس امر میں یاد رکھوں گا جو میں نے اپنے نفس پر واجب کر لیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا تم مجھے اطاعت گذاری سے یاد رکھو میں تمہیں مغفرت ورحمت سے یاد کروں گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اللہ کو تمہارا ذکر کرنا تمہارے اللہ کے ذکر کرنے سے کہیں بڑا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ جو مجھے اپنے نفس میں یاد کرتا ہے میں بھی اسے اپنے نفس میں یاد کرتا ہوں اور جو مجھے مجلس میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس کی مجلس سے بہتر مجلس میں یاد کرتا ہوں۔
امام احمد کا حضرت انس سے مرفوعاً لفظ یوں ہے کہ اللہ کریم فرماتا ہے کہ اے ابن آدم! اگر تو مجھے اپنے نفس میں یاد کرے گا تو میں تمہیں اپنے نفس میں یاد کروں گا۔ اور اگر تو مجھے مجلس میں یاد کرے گا تو میں تمہیں فرشتوں کی مجلس میں یاد کروں گا یا تمہاری مجلس سے بہتر مجلس میں یاد کروں گا۔ اگر تو مجھے ایک بالشت قریب ہو گا تو میں ایک گز تیرے قریب ہوں گا اگر تو مجھ سے ایک گز قریب ہو گا تو میں تجھ سے ایک باع نزدیک ہوں گا۔ اور اگر تو میرے پاس چل کر آئے گا تو میں تیرے پاس دوڑ کر آؤں گا۔ یہ صحیح الاسناد ہے۔ اس کو بخاری نے بھی حضرت قتادہ سے

روایت کیا ہے۔ حضرت قتادہ کا لفظ ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمت سے قریب تر ہے۔

فائدہ: ذکر تین طرح کا ہے۔ایک زبان سے جیسے تسبیح، تحمید و تہلیل وغیرہ اذکار مسنونہ کا کرنا۔دوسرا دل سے اللہ کی عجائب مخلوقات میں غور و فکر کرنا ان کو وحدانیت کی دلیل سمجھنا۔تیسرا جوارح سے یعنی جن چیزوں کا حکم دیا ان کو اعضاء سے بجالانا جیسے نماز وغیرہ، طاعات و حسنات میں مصروف رہنا۔اس آیت میں اللہ کریم نے ذکر کے بعد شکر کا بیان کیا ہے۔یعنی اللہ نے شکر کا حکم دیا اور اس کو بجالانے پر خیر میں اضافے کا وعدہ کیا۔اللہ کریم نے فرمایا:﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝﴾ کہ ”اور جب تیرے رب نے اعلان کر دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں زیادہ دوں گا اور اگر کفر کرو گے تو میرا عذاب البتہ سخت ہے۔“ حضرت عمران بن حصین مرفوعاً فرماتے ہیں کہ جس بندے پر اللہ اپنی نعمت و احسان کرتا ہے تو وہ یہ بات پسند کرتا ہے کہ اس کا اثر اس بندے پر یا اس کی مخلوق پر ظاہر ہو۔[بروایت احمد]

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿١٥٣﴾ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿١٥٤﴾

اے ایمان والو!صبر اور نماز سے مدد لیا کرو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ مرے ہوئے ہیں (اور وہ مردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے۔

فائدہ: اللہ کریم نے شکر کے بعد صبر کا ذکر فرمایا اس لیے کہ بندہ یا تو نعمت و آسائش میں ہوتا ہے اس حالت میں اس پر شکر واجب ہوتا ہے یا نقمت و مصیبت میں ہوتا ہے تو اس پر صبر واجب ہوتا ہے۔حدیث میں ہے کہ مومن پر تعجب ہے کہ جب بھی اللہ اس کے حق میں کوئی فیصلہ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے اگر خوشی حاصل ہو اور اس پر شکر کیا تو بھی اچھا کیا اور اگر نقصان پہنچا اور اس پر صبر کیا تو بھی بہتر ہوا۔غرضیکہ بوقتِ مصائب صبر و نماز سے بڑھ کر مدد طلب کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔پہلے پارے میں گذرا:﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ﴾ ”کہ صبر اور نماز سے مدد مانگو بلاشبہ یہ بہت بھاری ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر۔“ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب غم ہوتا تو نماز پڑھنے لگتے۔سو صبر دو طرح کا ہوتا ہے ایک گناہوں اور محارم کو چھوڑنے پر، دوسرا طاعات و قربات بجالانے پر۔اس دوسرے صبر کا اجر زیادہ ہے کیونکہ اصل مقصود یہی ہے۔تیسرا صبر مصیبتوں اور مشکلات میں ہوتا ہے۔جیسا کہ کوتاہیوں اور گناہوں سے استغفار کرنا یہ صبر بھی واجب ہے۔حضرت عبدالرحمٰن بن زید نے کہا کہ صبر دو چیزوں میں ہے۔

ایک صبر اللہ کے لیے ان چیزوں میں ہے جنہیں وہ پسند کرتا ہے اور دوسرا اس چیز سے صبر کرنا جس کو اللہ کریم ناپسند کرتا ہے۔ گو کہ نفس اس طرف مائل ہو۔ سو جو شخص اس طرح کا صابر ہے وہ ان شاء اللہ ان لوگوں سے ہو گا جو صحیح سالم رہیں گے۔ امام زین العابدین فرماتے ہیں کہ جب اللہ کریم پہلے اور پچھلے لوگوں کو جمع کرے گا تو ایک ندا کرنے والا پکارے گا کہ صبر کرنے والے کہاں ہیں وہ حساب سے پہلے جنت میں چلے جائیں۔ لوگوں کا ایک گروہ اٹھ کھڑا ہو گا، فرشتے آگے بڑھ کر ان سے ملیں گے اور پوچھیں گے کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ وہ کہیں گے ہم جنت میں جا رہے ہیں۔ فرشتے کہیں گے کیا حساب سے پہلے؟ وہ کہیں گے: جی ہاں! وہ کہیں گے: تم کون ہو؟ وہ کہیں گے: ہم صابرین ہیں۔ کہا جائے گا تمہارا کون سا صبر تھا وہ کہیں گے کہ ہم اللہ کی اطاعت پر اور اس کی معصیت سے صبر کرنے والے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمیں موت آئی۔ فرشتے کہیں گے تم ایسے ہی ہو جیسا تم نے کہا۔ اب جنت میں جاؤ عمل کرنے والوں کا اجر بہت اچھا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آیت: ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ "کہ صابرین بغیر حساب کے اپنے اجر پورے پورے دیئے جائیں گے۔" اس روایت پر گواہ ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا کہ صبر بندے کا بوقت مصیبت اعتراف کرنا اور اللہ سے اجر کی امید رکھنا ہے۔ آدمی کبھی قوی دل ہوتا ہے جزع کرتا ہے مگر صبر نہیں چھوڑتا۔

صبر ست علاج دل بیمار تو واقف   افسوس کہ کم داری و بسیار ضرورست

اس کے بعد اللہ کریم نے جہاد اور مجاہدین کی فضیلت بیان فرمائی اور یہاں سے یہ اشارہ کیا کہ تم جہاد میں محنت و مشقت اٹھاؤ اور استقامت اختیار کرو۔ شہداء عالم برزخ میں زندہ ہوتے ہیں اور رزق پاتے ہیں۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہیں وہ جنت میں جہاں چاہتے ہیں اڑتے چگتے پھرتے ہیں۔ پھر شام کو پھر ان قندیلوں میں آ جاتے ہیں جو عرش کے نیچے لٹک رہی ہیں۔ تیرے رب نے ان کی طرف جھانک کر پوچھا تم کیا چاہتے ہو؟ وہ کہنے لگے اے رب ہم کیا چاہیں گے جبکہ تو نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جو کسی اور مخلوق کو نہ دیا ہے۔ اللہ کریم پھر وہی پوچھیں گے اور جب وہ دیکھیں گے کہ جواب دینا ہی پڑے گا تو کہیں گے کہ ہمیں پھر دنیا میں لوٹا دے۔ ہم تیری راہ میں لڑیں اور مارے جائیں اور یہ بات شہادت کا اجر و مقام دیکھ کر کہیں گے۔ اللہ کریم فرمائے گا میں نے لکھ دیا ہے کہ وہ پھر اس دنیا کی طرف نہ لوٹیں گے۔ حضرت کعب بن مالک مرفوعاً فرماتے ہیں کہ مومن کی جان ایک سبز پرندہ ہے جو جنت کے سبزہ زار میں چرتا ہے۔ حتیٰ کہ قیامت والے دن اللہ اس کو اس کے بدن میں لوٹا دے گا۔ [بروایت احمد] یہ آیت تمام مومنین کو شامل ہے۔ اگرچہ کلام مجید میں بطور شرف صرف شہداء کا ذکر کیا ہے۔

فائدہ: آیت باب بدری صحابہ کے متعلق نازل ہوئی یہ کل چودہ شہداء تھے۔ چھ مہاجر اور آٹھ انصار تھے۔ تفسیر خازن میں ان کے نام بھی لکھ دیئے ہیں۔ لوگ کہنے لگے کہ فلاں فوت ہو گیا، اس سے دنیا کا چین گیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کسی نے کہا کفار کہتے تھے کہ لوگ ناحق محمد ﷺ کی رضا کے لیے اپنی جانیں کھوتے ہیں اس میں کچھ فائدہ نہیں ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ کریم نے فرمایا کہ تمہارا یہ خیال باطل ہے جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں وہ تم سے کہیں اچھی زندگی قبر و برزخ میں بسر کر رہے ہیں۔ جنت کی سیر ہے، اچھے سے اچھا رزق ہے، اگر تم نہیں جانتے ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ فتح البیان میں لکھا ہے کہ اس آیت سے نافرمانوں کے لیے عذابِ قبر اور فرمانبرداری کے لیے ثواب قبر کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے متعلق بہت سی صحیح احادیث مروی ہیں جو تواتر معنوی کے درجے تک پہنچتی ہیں۔ اسی طرح یہ آیت ہے: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۝ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝﴾ ''کہ اور تم ان لوگوں کو ہرگز مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے رب کے ہاں رزق دیئے جاتے ہیں۔''

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿١٥٦﴾ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ﴿١٥٧﴾

اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (اللہ کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو۔ ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی مہربانی اور رحمت ہے اور یہی سیدھے رستے پر ہیں۔

فائدہ: اس آیت کریمہ میں اللہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ وَنَبْلُوَ اَخْبَارَكُمْ﴾ ''اور ہم تمہیں ضرور ہی آزمائیں گے حتیٰ کہ ہم جان لیں کہ تم میں سے مجاہدین اور صابرین کون ہیں اور تاکہ ہم تمہاری خبریں جانچ لیں۔'' سو کبھی یہ امتحان خوشی کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی غم کی صورت میں، جیسے ڈر یا بھوک کی صورت میں۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ﴾ ''پھر اللہ نے اس کو بھوک اور خوف کا پہناوا چکھا دیا۔'' کیونکہ بھوک اور ڈر ایسی حالتیں ہیں جو کہ اپنے صاحب پر مخفی نہیں رہتی ہیں۔ اسی لیے وہاں جوع

وخوف کا لباس کہا اور یہاں کچھ خوف وجوع کہا یعنی کچھ تھوڑا سا خوف اور کچھ تھوڑا سا احساس بھوک، مال کا نقصان اس کا تلف ہو جانا اور جان کا نقصان اس کا مر جانا ہے۔ میووں کے نقصان سے مراد یہ ہے کہ پھل معمول سے کم ہوں یا بالکل پیدا نہ ہوں۔ بعض سلف نے کہا کہ بعض کھجور کے درخت سال بھر میں ایک ہی دفعہ پھل دیتے تھے ، یہ بھی اللہ کی طرف سے بطور آزمائش تھا، پھر جس نے ان نقصانات پر صبر کیا بڑا اجر پایا اور جس نے ناامیدی ظاہر کی اس پر عذاب نازل کیا۔ اسی لیے فرمایا کہ صابرون کو خوشخبری سنا دے۔ مفسرین میں سے بعض کہتے ہیں کہ ڈر سے اللہ کا خوف مراد ہے اور بھوک سے رمضان کا روزہ مراد ہے۔ نقصان مال سے زکوٰۃ مراد ہے اور نقصان جان سے بیماری اور پھل سے اولاد مراد ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس تفسیر میں نظر ہے۔ بلا شبہ قران کا لفظ عام ہے۔ مذکورہ اقسام نقصان اور تمام نقصانات کو شامل ہے۔ کسی خاص قسم کو خاص و متعین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فتح البیان میں مذکور قول کو امام شافعی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ دونوں عدل وعلاوہ کیا اچھے ہیں۔ صلوٰت ورحم تو دو عدل ہوئے اور ھم المھتدون علاوہ ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ علاوہ وہ چیز ہے جو دو عدل کے بیچ میں رکھتے ہیں۔ جو ایک زیادہ وزن ہوتا ہے اسی طرح انہیں انا للہ پڑھنے اور صبر کرنے کا ثواب الگ ملا۔ اور ہدایت یافتہ ہونا زائد رہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ کہنے پر ثواب کے متعلق کئی احادیث مروی ہیں۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ایک بات میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تو میرا دل بہت خوش ہوا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ کسی مسلمان کو کوئی مصیبت نہیں پہنچتی پھر وہ ((انا للہ و انا الیہ راجعون)) پڑھ کر یہ کہتا ہے: ((اللھم اجرنی فی مصیبتی ھذہ واخلف لی خیراً منھا)) مگر اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا ہے۔ [الحدیث بروایت احمد] امام حسین رضی اللہ عنہ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ جس مرد و عورت مسلمان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے پھر وہ اس کو یاد کر کے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھتا ہے گو کہ مدت دراز گذر چکی ہو۔ تو اللہ اس کو اتنا ہی اجر دے گا جتنا اس مصیبت کے دن دیا تھا۔ [بروایت احمد] ابو موسیٰ نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کریم ملک الموت سے کہتے ہیں اے ملک الموت! تو نے میرے بندے کے لخت جگر کو قبض کیا اس کے دل کا پھل لے لیا اس کی آنکھ کی ٹھنڈک چھین لی وہ کہتا ہے ۔ جی ہاں۔ اللہ فرماتا ہے پھر اس نے کیا کہا۔ وہ کہتا ہے کہ تیری حمد کی اور ((انا للہ وانا الیہ راجعون)) پڑھا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ جنت میں اس کے لیے ایک گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔ [بروایت احمد] ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔ صابرین واھل بلاء کے ثواب میں بہت سی احادیث آئی ہیں اس جگہ سب کا ذکر کرنا مشکل ہے۔ اس کے متعلق لکھے گئے رسالے "عاقبۃ المتقین" میں وہ ذکر کی گئی ہیں۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٥٨﴾	بے شک (کوہ) صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر کچھ گناہ نہیں کہ دونوں کا طواف کرے (بلکہ طواف ایک قسم کا نیک کام ہے) اور جو کوئی نیک کام کرے تو اللہ قدر شناس اور دانا ہے۔

فائدہ: مکہ شہر میں صفا و مروہ نامی دو پہاڑیاں تھیں۔ عرب کے لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے ہمیشہ حج کرتے رہے ہیں لیکن زمانہ کفر میں اس میں اکثر غلطیاں آ گئی تھیں ان دونوں پہاڑیوں پر دو بت نائلہ اور اساف رکھے تھے۔ وہ لوگ ان کا بھی طواف کرتے تھے۔ جب لوگ مسلمان ہوئے تو خیال کیا کہ یہ بھی زمانۂ کفر کی غلطی تھی۔ اب ہمیں وہاں نہ جانا چاہئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ عروہ نے حضرت عائشہ سے کہا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان دونوں کا طواف نہ کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: بھانجے! تم نے بری بات کہی اگر اس کا وہی مطلب ہوتا جو تو نے کہا ہے تو آیت یوں ہوتی: ((فلا جناح علیه ان لا یطوف بهما)) یہ آیت اس طرح نازل ہوئی کہ انصار مسلمان ہونے سے قبل مناۃ نامی بت کے نام پر احرام باندھتے اور مشلل کے قریب اس کی پوجا کرتے۔ پھر جو بھی حج کرتا اس کی وجہ سے صفا و مروہ کی سعی سے رک جاتا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بابت کہا گیا تو یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

پھر حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کا طواف مسنون رکھا ہے پھر کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان دونوں کا طواف کرنا چھوڑ دے۔ یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ شعبی نے کہا: صفا پر اساف اور مروہ پر نائلہ کی مورتی تھی۔ دوران سعی ان کا استلام کرتے پھر جب مسلمان ہوئے تو اس کی سعی کو حرج سمجھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ محمد بن اسحٰق نے ذکر کیا ہے کہ اساف و نائلہ دو انسان تھے۔ انہوں نے کعبہ کے اندر زنا کیا تو مسخ ہو کر پتھر بن گئے۔ لوگوں نے اٹھا کر کعبہ کے سامنے رکھ دیا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔ ایک مدت دراز گزرنے پر لوگوں نے انہیں وہاں سے اٹھا کر صفا و مروہ پر رکھ دیا اور انہیں معبود بنا لیا۔ جو صفا و مروہ کا طواف کرتا ان کو بھی استلام کرتا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب طواف بیت اللہ سے فارغ ہوئے تو باب صفا سے یہ کہتے ہوئے نکلتے: ﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ﴾ ”کہ بلا شبہ صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔“ پھر فرماتے: ((ابدء بما بدء الله)) یہ مسلم کی روایت ہے جبکہ نسائی کا لفظ یہ ہے: ((ابدؤا بما بدأ الله)) حبیبہ بنت ابی تجراۃ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صفا و مروہ

کا طواف کرتے لوگ سامنے ہوتے۔ آپؐ ان کے پیچھے دوڑتے تھے۔ حتیٰ کہ میں آپ کے دونوں زانوں کو ازار لپیٹی تیزی سے دوڑنے کے سبب۔ فرماتے تھے کہ تیز دوڑو اللہ نے تم پر دوڑنا لکھا ہے۔ اس حدیث میں امام مالک ،احمد اور شافعی کے اس مسلک کی دلیل ہے کہ صفا و مروہ حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ کسی نے کہا واجب ہے رکن نہیں ہے۔ اگر یہ عمداً و سہواً ترک ہو گیا تو دم (کفارہ) دینا پڑے گا۔ ایک روایت میں امام احمد کا یہی قول ہے۔ ایک جماعت بھی اس طرف گئی ہے۔ ابو حنیفہ ثوری شعبی اور ابن سیرین کہتے ہیں کہ یہ مستحب ہے۔

قرطبی نے اس پر ﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا﴾ کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ جو کوئی خوشی سے کوئی نیکی کرے۔ مگر پہلا قول سب سے درست اور مناسب تر ہے کیونکہ خود آنحضرت ﷺ نے اس کا طواف کیا ہے اور فرمایا: ((خذوا عنی مناسلکم)) سو جو کام بھی آپ علیہ السلام نے حج میں کیے وہ واجب ہیں۔ مگر جو کسی دلیل سے اس سے خارج ہوا۔ واللہ اعلم ۔ اگلی حدیث کا لفظ یہ تھا: ((اسعوا فان الله كتب عليكم السعی)) کہ سعی کرنا واجب ہے۔ یہ اس بات پر بڑی واضح دلیل ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ بہر حال اللہ کریم نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے کہ صفا و مروہ کی سعی کرنا ان شرائع میں سے ہے جو اللہ کریم نے مناسک حج کی بابت ابراہیم علیہ السلام کو بتائے تھے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس طواف کی اصل طواف ہاجرہ علیہا السلام ہے۔ جو پانی کی تلاش میں دوڑتی پھرتی تھیں پھر ان کے لیے زمزم کا چشمہ جاری کیا۔ جس کا پینا ایک طعام بھی ہے اور بیماروں کے لیے شفا بھی۔ سو حاجیوں کو چاہئے کہ جس طرح حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے اپنا عجز و فقر اللہ کے سامنے ظاہر کیا وہ بھی اپنے اصلاح حال و اعمال کے لیے اور گناہوں کی بخشش کے لیے اللہ کے سامنے عجز و فقر اور ذلت کا اظہار کرے۔ اور اللہ سے یہ درخواست کرے کہ وہ اسے مرتے دم تک صراط مستقیم پر قائم رکھے اور گناہوں میں جو اس کا موجودہ حال ہے اس سے پھیر کر اس کو درست حال اور اصلاح اعمال میں تبدیل کر دے۔ اور اس کو استقامت کی طرف لے جائے۔ جس طرح کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ساتھ کیا۔ تطوع سے مراد یہ ہے کہ جو سعی میں واجب مقدار سے زیادہ سعی کرے یعنی آٹھویں نویں دفعہ چکر لگا لے تو بھی کچھ منع نہیں ہے۔ اللہ تو تھوڑے عمل پر زائد جزاء دیتا ہے کسی پر ذرہ برابر حق تلفی نہیں کرتا۔ ﴿وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ "اور اگر نیکی ہو تو اس کو کئی گنا بڑھاتا ہے اور اپنے پاس سے بڑا اجر عطا کرتا ہے۔" کسی نے تطوع کا یہ معنی بیان کیا کہ نفل حج و عمرہ میں سعی کرے۔ رازی نے نقل کیا کہ بعض کے نزدیک یہ ہے کہ ہر نیکی میں زیادتی کرے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿١٦٢﴾

جو لوگ ہمارے حکموں اور ہدایتوں کو جو ہم نے نازل کی ہیں (کسی غرض فاسد سے) چھپاتے ہیں باوجود یہ کہ ہم نے ان لوگوں کے (سمجھانے کے) کے لیے اپنی کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے ایسوں پر اللہ اور تمام لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ہاں جو توبہ کرتے ہیں اور اپنی حالت درست کر لیتے اور (احکام الٰہی کو) صاف صاف بیان کر دیتے ہیں تو میں ان کے قصور معاف کر دیتا ہوں اور میں بڑا معاف کرنے والے اور رحم والا ہوں۔جو لوگ کافر ہوئے اور کافر ہی مرے ایسوں پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت۔وہ ہمیشہ اسی (لعنت) میں (گرفتار) رہیں گے ان سے نہ تو عذاب ہلکا ہی کیا جائے گا اور نہ انہیں (کچھ) مہلت ملے گی۔

فائدہ: اس آیت میں ان لوگوں کے لیے بڑی سخت وعید ہے کہ جو واضح دلائل، مقاصد صحیحہ اور دلوں کو نفع مند ہدایت کو چھپاتا ہے جبکہ اللہ کریم نے اپنے پیغمبروں پر اتاری ہوئی کتابوں میں انہیں واضح کر دیا ہے۔ابو العالیہ نے کہا کہ یہ آیت اھل کتاب کے حق میں نازل ہوئی ہے۔جنہوں نے احکام تورات اور آنحضرت ﷺ کی صفتِ مبارکہ کو چھپایا ان پر ہر چیز لعنت کرتی ہے۔جس طرح عالم کے لیے ہر چیز حتیٰ کہ مچھلی پانی میں، پرندہ ہوا میں استغفار کرتا ہے اسی طرح ان پر ہر چیز لعنت کرتی ہے۔حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ جس عالم سے کوئی سوال کیا گیا مگر اس نے اس کو واضح نہ کیا بلکہ چھپایا تو اس کو قیامت کے دن آگ کی لگام پہنادی جائے گی۔ابن کثیر نے فرمایا کہ اس مسند حدیث کے طریق ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔بخاری و مسلم میں تو حضرت ابو ہریرہ سے یوں مروی ہے کہ اگر کتاب اللہ میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کسی سے حدیث بیان نہ کرتا۔ ایک یہ مذکورہ آیت اور دوسری: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ﴾ ''کہ اور جب اللہ نے اہل کتاب سے مضبوط عہد لیا کہ تم کتاب کو ضرور ہی لوگوں کے لیے بیان کرو گے اور اس کے کتمان کے مرتکب نہ ہو گے۔'' رہی یہ بات کہ آیا علوم دین کا اظہار فرض کفایہ ہے یا فرض عین۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب اس کو بعض پر ظاہر کر دیا جس تک ہر کوئی پہنچ سکتا ہے تو پھر وہ چھپا نہ رہا بلکہ ظاہر ہو گیا۔

کسی نے کہا جبکہ کسی عام سے پوچھیں تو تب اس پر اس کو ظاہر کرنا واجب ہے ورنہ نہیں۔اس آیت میں خبر واحد کے قبول قول پر وجوب کی دلیل ہے اس لیے کہ اگر اس ایک کی بات قبول کرنا واجب نہ ہوتی تو اس پر وہ بات بتانا واجب نہ ہوتی۔بینات و ھدیٰ کی تعیین سے یہ بھی بات سمجھ آتی ہے کہ غیر بینات و ھدیٰ کو چھپانا جائز ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ کافر پر اس کی موت کے بعد لعنت کرنا ممنوع نہیں ہے۔اور اس جگہ چھپانے والوں سے یہود و نصاریٰ کے درویش و علماء مراد ہیں۔کسی نے کہا بلکہ ہر کاتم حق کو شامل ہے۔اسی معنی کو شوکانی رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے کیونکہ لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے سبب کے خصوص کا نہیں۔حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جنازے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔آپ نے فرمایا کہ کافر کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک ایسی ضرب لگائی جاتی ہے جس کو جن و انس کے سوا ہر مخلوق سنتی ہے۔اور ہر سننے والا جانور اس پر لعنت کرتا ہے۔اللہ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے۔یعنی لعنت کرنے والوں سے زمین کے جاندار مراد ہیں۔ [بروایت ابن ابی حاتم ،ابن ماجہ] حضرت مجاہد فرماتے ہیں جب زمین پر قحط سالی ہوتی ہے تو زمین کے جاندار کہتے ہیں کہ یہ قحط بنی آدم کے نافرمانوں کے گناہوں کی وجہ سے ہوا۔اللہ ان نافرمانوں پر لعنت کرے۔ابو العالیہ، قتادہ اور ربیع فرماتے ہیں کہ لاعنون سے ملائکہ اور مومنین مراد ہیں۔حدیث پاک میں آیا ہے کہ عالم کے لیے ہر چیز مغفرت کی دعا کرتی ہے حتیٰ کہ مچھلیاں بھی دریاؤں میں اس کے لیے دعا کرتی ہیں اور اس آیت میں یہ مذکور ہے کہ علم کو چھپانے والے پر اللہ کریم اور فرشتے اور سب فصیح و اعجمی لعنت کرتے ہیں۔خواہ یہ لعنت زبان قال سے ہو یا زبان حال سے۔پھر اللہ کریم نے توبہ کرنے والوں اور اپنے معاملے اور گناہوں سے رجوع کر کے اپنی اصلاح کرنے والوں کو اس سے الگ کر لیا۔فرمایا ہم ان کی توبہ کو قبول کر لیتے ہیں۔**واللّٰہ الحمد**.

ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے جو بدعت و کفر کی طرف بلانے والا ہو لیکن پھر اپنے گناہ سے توبہ کر لے تو اس کی توبہ قابل قبول ہے۔پہلی امتوں میں اس قسم کے لوگوں کی توبہ قبول نہ ہوتی تھی۔یہ شرف خاص اسی امت زادھا اللہ شرفاً کے حصے میں آیا۔((والحمد للّٰہِ رب العالمین علی نعمہ الظاھرہ والباطن)) پھر اللہ کریم نے فرمایا کہ جس کو کفر کی حالت ہی میں موت آئی تو وہ بھی ملعون ہے اس پر ذاتِ جبار ملائکہ اور سب لوگ لعنت کرتے ہیں۔وہ قیامت تک انہی لعنت کے اندھیروں میں ڈھکا رہے گا۔پھر اس کے بعد وہ جہنم میں جائے گا نہ عذاب میں کمی ہوگی نہ وہ منقطع ہوگا۔((اللھم انا نعوذبك من ذالك)) ابو العایہ و قتادہ نے کہا کہ کافر کو قیامت کے دن کھڑا کیا جائے گا پھر اس پر اللہ لعنت کرے گا پھر فرشتے پھر تمام لوگ اور پھر باقی سب

مخلوقات لعنت کریں گی۔

مسئلہ : کافر پر بلا اختلاف لعنت کرنا جائز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور باقی ائمہ اسلام قنوت میں کفر پر لعنت کیا کرتے تھے۔ رہا کوئی خاص کفر کا ارتکاب کرنے والا تو اس پر لعنت نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس کے خاتمے کا حال معلوم نہ ہے۔ کیونکہ آیت باب بھی اسی مراد پر دلیل ہے کہ غیر معین کافروں پر لعنت کی جائے نام نہ لیا جائے۔ رہا آنحضرت ﷺ کا لعنت کرنا کسی خاص قوم پر تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو وحی کے ذریعے ایسی چیز معلوم ہو جاتی تھی جو دوسروں کو معلوم نہ ہوتی ہے۔ جبکہ دوسرے گروہ نے کہا کہ کافر معین پر بھی لعنت جائز ہے۔ ابن العربی اور مالکی کا یہی مسلک ہے۔ لیکن جس حدیث سے انہوں نے حجت پکڑی وہ حدیث ضعیف ہے۔ باقی آئمہ کا استدلال یہ ہے کہ حضرت ﷺ کے پاس ایک شراب میں مست شخص کو لاتے اور اس پر حد لگاتے ایک آدمی نے کہا: ((لعنه الله ما اكثر ما يوتىٰ به)) ''کہ اللہ اس پر لعنت کرے اکثر یہی حد کے لیے لایا جاتا ہے۔'' فرمایا: ((لَا تلعنه فانه يحب الله و رسوله)) ''کہ وہ تو اللہ اور پیغمبر علیہ السلام سے محبت کرتا ہے۔'' اس پر لعنت نہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ جو اللہ اور پیغمبر علیہ السلام سے محبت نہیں کرتا اس پر لعنت کرنا جائز ہے۔ مگر فتح البیان میں ابن العربی اور مالکی کی نسبت معین عاصی پر لعنت نہ کرنا لکھا ہے۔ اور دلیل یہی حدیث ہے کہ ایک شارب خمر بار بار لایا گیا تو حاضرین میں سے کسی نے کہہ دیا: ((لعنة الله ما اكثر به)) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((لا تكونوا اعوانا للشيطان على اخيكم)) یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ ابن العربی کے قول کا حاصل یہ ہے کہ کافر معین پر لعنت جائز ہے جبکہ فاسق معین پر جائز نہ ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٣﴾ اور (لوگو) تمہارا معبود اللہ واحد ہے اس بڑے مہربان (اور) رحم والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس میں اپنی توحید بیان فرمائی کہ میں تنہا بے نیاز ذات ہوں۔ میرا کوئی شریک و ساجھی نہ ہے۔ حضرت اسماء بنت یزید کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ اللہ کریم کا اسم اعظم انہی دو آیات میں ہے۔ ایک یہی آیتِ باب اور دوسری آیت: ﴿الٓمّٓ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ ''کہ کوئی معبود نہ ہے مگر وہی زندہ و قائم رہنے والا ہے۔'' [بتخريج ابن ابی شيبه، احمد، دارمی، ابو داؤد، ترمذی و صححه ابن ماجه] مگر اس حدیث کی سند میں شہر بن حوشب راوی ضعیف ہے۔ دیلمی نے اس سے مرفوعاً روایت کیا کہ سورۃ بقرہ کی ان دو آیات سے بڑھ کر سرکش جنوں پر کوئی چیز سخت تر نہ ہے۔ ﴿اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ ''کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔'' سے دو آیات

تک۔ پھر اللہ کریم نے زمین و آسمان کی تخلیق کے ساتھ اپنی الوہیت ذکر فرمائی کہ میں ہر کام میں تنہا ہوں ۔اور اسی کو وحدانیت کی دلیل ٹھہرایا۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴿۱۶۴﴾

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں اور کشتیوں (اور جہازوں) میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لیکر رواں ہیں اور مینہ میں جس کو اللہ آسمان سے برساتا اور اس سے زمین کو مرنے کے بعد زندہ (یعنی خشک ہوئے پیچھے سرسبز) کر دیتا ہے اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان گھرے رہتے ہیں عقل مندوں کے لیے (اللہ کی قدرت کی) نشانیاں ہیں۔

توحید بیان کرنے کے بعد اللہ کریم نے آٹھ ایسی مخلوقات کا ذکر کیا جو کفار کے معبودان باطلہ سے بن نہ سکتے تھے حتی کہ سب ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں تو بھی یہ ممکن نہ ہے۔وہ چیزیں: آسمان و زمین کی تخلیق ،رات دن کا لانا،دریا میں کشتیاں چلانا، آسمان سے بارش برسانا،زمین کا بوٹیاں اگانا یعنی زندہ کرنا اور جانوروں کا زمین میں پھیلا دینا اور ہواؤں کا ایک سے دوسری جانب پھرنا اور بادلوں کا تابع فرمان کرنا کہ جہاں مشیت ہو وہاں وہ جا برسے،خلاف چاہت مقام پر ہرگز نہ برسے۔سو ان مذکورہ چیزوں میں جو بھی غور کرے گا ان کے حقائق کے تصور سے اس کا دماغ و ذہن تنگ ہو گا۔اس پر اس بات کی تصدیق واجب ہو گئی کہ ان چیزوں کو بڑا حکیم کاریگر چلا اور بنا رہا ہے۔آسمانوں کو جمع کے صیغہ سے اس لیے تعبیر کیا کہ ہر آسمان جنس میں دوسرے سے مختلف ہے۔جبکہ زمینیں سب ایک ہی جنس کی ہیں۔یعنی سب مٹی سے بنی ہیں اور آسمان کی شکل و صورت کا انداز یہ ہے کہ بغیر کسی ذریعے،ستون اور تعلق کے کھڑا ہے۔پھر اس میں سورج جیسا چراغ اور چاند ستاروں اور سیاروں کی حسین نعمتیں پھر رہی ہیں اس وسعت و لطافت کا کیا ٹھکانا کہ ہر آسمان الگ الگ چکر لگا رہا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں ہفت آسمان ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

زمین میں اس کے کثیف و پست ہونے میں عظیم نشانی ہے۔پہاڑ،دریا جنگل، آبادی،کانیں،جوہر، ثمر اور نباتِ شجر میں بڑے فوائد ہیں۔رات دن کا تبدیل ہونا یہ ہے کہ ایک جونہی جاتا ہے بغیر تاخیر اور فرق کے وہ

دوسرا آجاتا ہے۔ فرمایا:﴿لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ o ﴾"نہ سورج کے لائق ہے کہ وہ چاند کو پالے اور نہ رات کو لائق ہے کہ دن سے آگے بڑھے ہر ایک چکر میں تیرتے پھر رہے ہیں۔ پھر کبھی رات کم اور دن زیادہ اور کبھی رات زیادہ اور دن کم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے معارضہ ہوتا رہتا ہے۔" جیسے فرمایا:﴿يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾"وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔" یعنی رات کا کچھ حصہ دن میں اور دن کا کچھ حصہ رات میں شامل کر دیا۔ ابن الخطیب نے کہا کہ رات اور دن جس طرح زمان میں مختلف ہوتے ہیں مکان میں بھی مختلف ہوتے ہیں۔ جس کے نزدیک زمین کروی ہے، اس کے نزدیک جس وقت کو مقرر کرو گے وہ ہر جگہ یکساں نہ ہوگا بلکہ کہیں صبح، کہیں ظہر، کہیں عصر، کہیں مغرب اور کہیں عشاء ہوگا۔ لیکن یہ اسطرح ہوگا جب طول میں مختلف شہروں کا اعتبار کریں گے لیکن جب اعتبار بلاد عرض میں ہوگا تو پھر جس شہر کا عرض شمال میں زیادہ ہوگا وہاں گرمی کے دن بڑے اور سردی کے دن چھوٹے ہوں گے یہ سب دن رات کا مختلف شہروں میں طول و عرض کے لحاظ سے بڑا عجیب و لطیف معاملہ ہے۔ رات کا ذکر اس لیے پہلے کیا کہ پہلے اندھیرا ہے پھر روشنی۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا:﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ o ﴾"اور ان کے لیے رات میں بھی ایک نشانی ہے ہم اس سے دن کو الگ کر لیتے ہیں۔" صحیح تر یہی قول ہے۔ دن رات کے آنے جانے میں یہ حکمت و قدرت ہے کہ دن کام کاج، اسباب معیشت مہیا کرنے، رکھنے، اٹھانے کے لیے ہیں اور راتیں آرام و سکون اور دن بھر کے کام کاج سے راحت حاصل کرنے کے لیے ہیں۔ غرضیکہ دن رات کا اختلاف بندوں کی مصلحتوں ہی کے لیے ہے۔ سورج کے غروب سے لے کر طلوع تک رات ہے اور طلوع سے غروب تک رات ہے اور فجر کے طلوع سے سورج کے طلوع تک کا وقت دن اور رات میں مشترک ہے کیونکہ اس میں کچھ رات کا اندھیرا ہے اور کچھ صبح کی روشنی۔ لیکن یہ تقسیم و اعتبار کچھ عرف شرعی میں نہ ہے بس عرف لغوی کی تقسیم ہے۔

خورشید و ماہ کا نکلنا دیکھو   تاروں کا ہجوم کر کے چلنا دیکھو
ہے دن کو سفید شب کو پوشاک سیاہ   گردوں کا ذرا رنگ بدلنا دیکھو

اور کشتی کے چلنے میں یہ عجب ہے کہ ہوا کے زور سے چلتی پھرتی ہے اور لوگوں کو ان کے مال اسباب سمیت پانی کی تہہ پر لیے چلتی پھرتی ہے اس کی تہہ میں نہیں بیٹھتی۔ دریا کو الگ کشتیوں کے تابع کر رکھا ہے کہ اپنے پانی کی موجوں اور اتار چڑھاؤ کے باوجود وہ کشتیوں کو اپنی سطح پر لیے پھرتے ہیں۔ اللہ کے سوا کون ہے جو انہیں بخیرو

عافیت ساحل تک پہنچائے۔لوگوں کے لیے اس میں فائدہ یہ ہے کہ کشتیوں پر چڑھ کر ایک سے دوسرے ملک کی سیر کرتے ہیں اور تجارت کا سامان ادھر ادھر لاتے لے جاتے ہیں۔اگر اللہ ان کشتی والوں کے دل قوی نہ کرتا تو یہ لوگ ہرگز اپنے تجارت و مسافتی فوائد حاصل نہ کر سکتے۔اللہ نے زمین کے مختلف اطراف کے لوگوں کو کسی نہ کسی نعمت سے خاص کیا ہے اور ایک کو دوسرے کا محتاج بنایا ہے۔دریا کی بھیانک موجوں کے خوف کے باوجود دریا کی سطح پر سفر کرنے کا سبب یہی ہے کہ اٹھانے والے کو اور اٹھوانے والے سب کو نفع حاصل ہوتا ہے۔اور پانی برسانے میں یہ نشانی ہے کہ اس سے زمین میں سبزگی وروئیدگی آتی ہے بوٹیاں اگتی ہیں اور درخت وزمین نکھر آتی ہے۔زمین کے سوکھ جانے کو مجازاً موت سے تعبیر کیا۔اور بارش سے صرف زمین ہی نہیں بلکہ سب جاندار تروتازگی محسوس کرتے ہیں۔پانی وقت پر اور بقدر ضرورت برستا ہے۔ضرورت کے وقت بقدر فائدہ برستا ہے۔پھر کسی جگہ برسا اور کسی جگہ نہ برسا۔پھر دعائے استسقاء کرنے پر وہاں بھی نازل ہوا۔اللہ کریم نے فرمایا:﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ۝ ﴾"اور ان کے لیے مردہ زمین میں بھی نشانی ہے ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس سے دانے نکال دیئے، پھر جس سے وہ کھاتے ہیں اور دواب کے پھیلانے اور بکھیرنے میں یہ نشانی ہے۔"کہ انسان کا اصل مرجع تو آدم علیہ السلام کی طرف ہے مگر صورت، شکل، رنگ، زبان اور طبائع و اخلاق سب کے الگ الگ ہیں۔ایک کا حال و قال دوسرے سے نہیں ملتا ہے۔پھر اس طرح سارے حیوانات کو قیاس کر لینا چاہیے۔حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ جو بھی چیز زمین پر چلتا پھرتا ہے وہ انسان ہو یا کچھ اور ہو وہ دابۃ ہے۔کوئی چھوٹا ہو یا بڑا۔اللہ کریم سب کو جانتا ہے اور سب کو رزق دیتا ہے۔اس پر کوئی بھی مخفی نہ ہے۔ جیسے فرمایا:﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾"اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا نہ ہے مگر اس کا رزق اللہ تعالیٰ پر ہے۔اور وہ اس کا ٹھکانا اور سونپے جانے کی جگہ بھی جانتا ہے۔سب کچھ ایک کھلی کتاب میں ہے۔"ہواؤں کے پھرنے میں یہ نشانی ہے کہ ہوائیں کبھی رحمت کی خوشخبری لاتی ہیں کبھی عذاب لاتی ہیں، کبھی بارش کی خبر لاتی ہیں، کبھی بادلوں کو ہانکتی ہیں ،پھر جمع کرتی ہیں، کبھی جنوبی جانب سے آتی ہیں، انہیں شامیہ کہا جاتا ہے، کبھی یمن کی جانب سے آتی ہیں، کبھی مشرقی جانب سے کعبہ کو ٹکراتی ہوئی گذرتی ہیں، انہیں صباء کہتے ہیں۔کبھی مغربی جانب سے آتی ہیں، انہیں ربور کہتے ہیں۔یعنی جو کعبہ کی پشت کی جانب سے آتی ہیں۔ہواؤں کو فرق اور ان کی اطراف کے نام کعبہ کو مرکز بنا کر رکھے گئے ہیں۔یعنی جو کعبہ کی مشرقی جانب سے آئیں یا جو غربی جانب سے آئیں۔ابن کثیر فرماتے ہیں کہ لوگوں

نے ہوااور پانی کی اقسام میں بڑی کتب تصنیف کی ہیں جن میں ہوا کی اقسام اور بارش کی اقسام واحکام کا ذکر کیا ہے۔ یہاں ان کا ذکر کرنا محض طول ہو گا۔ فتح البیان میں لکھا ہے: کہ وہ کبھی عقیم ہوتی ہے اور کوئی ٹھنڈی، کوئی صر صر ، کوئی نصر، کوئی ہلاک، کوئی تیز و گرم، کوئی ٹھنڈی و نرم، کوئی آندھی، کوئی بگولا، کوئی جنوبی، کوئی شمالی، کوئی ربوز ، کوئی قبول، کوئی صباء، ور کوئی نکباء ہوتی ہے۔ پھر جو کشتی یا جہاز چلتی ہوا برداشت کر سکتی ہے اس کو اسی مقدار سے ٹکراتی ہے۔ حدیث میں ہوا کی برائی نہ آئی ہے۔ اور یہ ہوا ایک بڑا لطیف جسم رکھتی ہے نہ نظر آتی ہے نہ ہاتھ میں پکڑی جاتی ہے۔ مگر اس کو ایسی قوت حاصل ہے کہ درختوں اور پتھروں کو جڑوں سے اکھیڑ دیتی ہے۔ گھروں کو گرا دیتی ہے اس کے باوجود ہر زندہ کی ضرورت ہے اگر ایک دم بھی ہوا رک جائے تو جاندار مر جائیں۔ اور سب کچھ روئے زمین پر گل سڑ جائے۔ بادل کو دیکھو کہ آسمان اور زمین کے درمیان بغیر تعلق کے پھرتے رہتے ہیں۔ اسی کا نام تسخیر ہے۔ ہر بادل میں اس قدر پانی بھرا ہوتا ہے کہ وہ جنگلات کے جنگلات سیراب کر سکتے ہیں مگر کیا ذکر کہ ان کے بوجھ سے گر پڑتے ہوں۔ بلکہ بغیر سہارے کے اسی طرح چلتا پھرتا رہتا ہے۔ اس کے سوا اور بہت سی نشانیاں ہیں جو مخفی نہ ہیں۔ اسی لیے اللہ کریم نے فرمایا ان میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ یعنی اللہ کی توحید میں یہ نشانیاں ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ o﴾ ''بلاشبہ آسمان وزمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اختلاف میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں جو لوگ کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے فائدہ پیدا نہیں کیا تو (اس) سے پاک ہے، پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔'' فتح البیان میں ہے کہ ان آٹھ چیزوں میں اللہ کی وحدانیت کی بڑی دلیل ہے کہ وہ کاری گر اپنی کاری گری میں تنہا و یکتا ہے اس کا کوئی ہم مثل نہ ہے اور آیات کا لفظ اس لیے جمع استعمال کیا کہ ان آٹھ چیزوں میں سے ہر ایک میں جدا جدا بہت سی نشانیاں ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ضرور ان کو تنظیم و تدبیر دینے والا کوئی خالق ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ قریش آنحضرت ﷺ کے پاس آکر کہنے لگے اے محمد! ﷺ تم دعا کرو کہ اللہ کریم کوہ صفا کو سونے کا بنا دے ہم اس سے گھوڑے اور ہتھیار خریدیں پھر ہم تم پر ایمان لا کر تمہارے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تم عہد کرو کہ اگر اللہ اس کو سونے کا بنا دیں تو تم ایمان لے آؤ گے۔ سب نے

اقرار کر لیا۔ آنحضرت ﷺ نے دعا کی۔ جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے اور فرمایا: اللہ کریم فرماتا ہے کہ ہم کوہ صفا کو سونے کا بنادیں گے لیکن اگر وہ اس کو دیکھ کر ایمان نہ لائے تو ہم تمہیں ایسا عذاب دیں گے جو اور کسی کو نہ دیا ہو گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: نہیں اے رب! تو مجھے اور میری قوم کو چھوڑ دے میں انہیں ہر روز دین کی دعوت دیتا رہوں گا۔ اس پر اللہ کریم نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس کو ابن مردویہ و ابن ابی حاتم وغیرہما نے کسی نے مختصر اور کسی نے طویل روایت کیا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا كَذَلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾

اور بعض لوگ ایسے ہیں جو غیر اللہ کو شریک (اللہ) بناتے اور ان سے اللہ کی سی محبت کرتے ہیں، لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ ہی کے سب سے زیادہ دوست دار ہیں اور اے کاش! ظالم لوگ جو بات عذاب کے وقت دیکھیں گے اب دیکھ لیتے کہ سب طرح کی طاقت اللہ ہی کو ہے اور یہ کہ اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے۔ اس دن (کفر کے) پیشوا اپنے پیروؤں سے بے زاری ظاہر کریں گے اور (دونوں) عذاب (الٰہی) دیکھ لیں گے اور ان کے آپس کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ (یہ حال دیکھ کر) پیروی کرنے والے (حسرت سے) کہیں گے کہ اے کاش! ہمیں پھر دنیا میں جانا نصیب ہو تاکہ جس طرح یہ ہم سے بیزار ہو رہے ہیں اسی طرح ہم بھی ان سے بے زار ہوں، اس طرح اللہ ان کے اعمال حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔

فائدہ: جن کو لوگ اللہ کے سوا معبود بنائے ہوئے ہیں وہ قیامت والے دن اپنے پوجنے والوں کو جواب دیں گے جواب سن کر ان کی امیدوں پر اوس پڑ جائے گی سب طرف سے امیدیں کٹ جائیں گی۔ پھر افسوس کریں گے لیکن وہ سب حسرت ہی ہو گی کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ اس آیت شریفہ سے مشرکین بت پرستوں کا ذکر شروع ہوا۔ انداد ند کی جمع ہے جس کا مطلب ہم مثل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین اور لوگوں کو اللہ کے برابر شریک ٹھہراتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے کرنی چاہئے۔ جبکہ اللہ کا نہ کوئی شریک نہ مد مقابل۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود سے آیا ہے کہ میں نے پوچھا اے اللہ کے پیغمبر! سب سے بڑا گناہ کونسا

ہے؟ فرمایا: یہ کہ تو اللہ کے ساتھ شریک مقرر کرے جبکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔ اور ایمان والوں کو جو اللہ سے زیادہ محبت ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اللہ کے قدر شناس ہیں۔ کسی چیز کو اس کا ہم مثل نہیں کرتے۔ صرف اکیلے رب کی عبادت کرتے ہیں۔ اسی اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ سب کاموں کا مرجع اسی کی طرف کرتے ہیں اسی کو اپنا نفع و نقصان دینے والے سمجھتے ہیں۔ کسی مخلوق کا خالق کے مقابلے میں کچھ اعتبار و رعایت نہیں کرتے ہیں۔ پھر اللہ کریم نے فرمایا: اگر یہ ظالم و مشرک لوگ اللہ کے عذاب کو دیکھ لیں تو سب جان لیں گے کہ قوت ساری اللہ ہی کی ہے۔ ساری کائنات اسی کے آگے مغلوب ہے اس کا عذاب بڑا سخت ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۝ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ۝﴾ "(پھر وہ اس دن ایسا عذاب دے گا) کہ اس جیسا نہ کوئی عذاب دے گا اور نہ اس کے قید کرنے کی طرح کوئی قید کرے گا۔" یعنی اگر ان مشرکوں ظالموں کو معلوم ہو جائے کہ اس دن اس شرک و کفر کی وجہ سے کیا عذاب آنے والا ہے تو دنیا میں وہ اس شرک سے باز رہیں۔ پھر خبر دی کہ وہ خود اپنے بتوں سے بے زار ہو جائیں۔ تابعین و متبوعین باہم لا تعلق ہو جائیں گے۔ مثلاً جن ملائکہ کو وہ اپنے زعم سے پوجتے تھے وہ کہیں گے: ﴿تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ ۝﴾ "کہ ہم تیری طرف اظہار بے زاری کرتے ہیں یہ ہماری عبادت نہ کرتے تھے۔" پھر اس طرح گذارش کریں گے: ﴿سُبْحَانَكَ أَنتَ وَلِيُّنَا مِن دُونِهِم بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُم بِهِم مُّؤْمِنُونَ ۝﴾ "تو پاک ذات ہے تو ان کے علاوہ ہمارا دوست ہے بلکہ یہ جنوں کی عبادت کرتے تھے۔ اکثر یہ انہی پر یقین کرتے تھے۔" اسی طرح دوسرے معبودان باطلہ بھی ان کی عبادت سے اظہار بے زاری کریں گے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُو مِن دُونِ اللَّهِ مَن لَّا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَن دُعَائِهِمْ غَافِلُونَ ۝ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ ۝﴾ یعنی "اور اس سے گمراہ کون ہے جو ان کو پکارتا ہے جو اسے قیامت تک جواب نہ دے سکیں گے اور وہ (تو) ان کے پکارنے سے بھی غافل ہیں ور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے۔ اور وہ ان کی عبادت سے انکار کریں گے۔" اور اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝﴾ "اور انہوں نے اللہ کے سوا اور معبود بنا لیے ہیں تا کہ وہ ان کے لیے مددگار بنیں۔ ہرگز (ایسا نہ ہوگا) انہیں عنقریب وہ ان کی عبادت سے انکار کر دیں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے۔" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: ﴿إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ٥ وَمَاْوٰكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِنْ نّٰصِرِيْنَ ٥ ﴾"کہ سوائے اس کے نہیں تم نے اللہ کے علاوہ بتوں کی زندگی میں دوستی کے لیے پکڑ رکھا ہے۔ پھر قیامت والے دن تمہارے بعض بعض کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمہارا ٹھکانا آگ ہے اور تمہارا کوئی مدد گار بھی نہیں ہے۔" اور فرمایا: ﴿وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ نِ الْقَوْلَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْ لَا اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ٥ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ٥وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَا اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗ اَنْدَادًا ٥ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ ﴾"اور کاش کہ آپ دیکھیں جب ظالموں کو ان کے رب کے پاس کھڑا کیا جائے گا ان کا بعض بعض کی طرف بات لوٹائے گا، کمزور سمجھے جانے والے لوگ متکبروں کو کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ایمان والوں سے ہوتے۔ متکبر لوگ کمزور سمجھے گئے لوگوں کو کہیں گے (کیا) جب تمہارے پاس حق آیا تو ہم نے تمہیں اس سے روکا تھا بلکہ تم ہی مجرم تھے۔ اور کمزور سمجھے گئے لوگ متکبروں کو کہیں گے بلکہ دن رات کی تدبیر تھی جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لیے شریک مقرر کریں اور وہ ندامت چھپائیں گے جبکہ عذاب دیکھیں گے اور ہم نے کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے۔ وہ اسی کا بدلہ دیئے جائیں گے جو وہ کرتے تھے۔" اور اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْا اَنْفُسَكُمْ مَا اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَا اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ٥ ﴾"جب معاملے کا فیصلہ ہو گیا تو شیطان نے کہا بلا شبہ اللہ نے تمہیں وعدہ دیا حق کا وعدہ اور میں نے تم کو (جھوٹ کا) وعدہ دیا۔ پھر میں نے خلاف کیا اور مجھے تم پر کوئی غلبہ نہ تھا الا یہ کہ میں نے تمہیں بلایا تو تم نے قبول کر لیا۔ پھر مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے نفس کو ملامت کرو۔ میں تمہاری فریادرسی کرنے والا ہوں اور نہ تم میری فریادرسی کرنے والے ہو۔ بلا شبہ میں اس کا انکار کرتا ہوں جو تم نے مجھے اس سے پہلے شریک بنالیا۔ بلا شبہ ظالموں کے لیے دکھ دینے والا عذاب ہے۔" اس جگہ تعلق سے حیلے مراد ہیں یا اسباب خلاصی و مودت مراد ہے۔ اور ان کا یہ کہنا کہ اگر ہم دوبارہ زندہ ہو جائیں تو صرف اللہ کی عبادت کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ یہ غلط ہے بلکہ

جس طرح اللہ کریم نے خبر دی کہ اگر انہیں دوبارہ زندگی دی جائے تب پھر پہلے ہی والے کام کریں گے: ﴿وَلَو رُدُّوْ لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ ﴾ "کہ اگر انہیں دوبارہ زندگی دی جائے تو وہی کام کریں گے جس سے منع کیے گئے ہیں۔" اسی لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ ہم انہیں ان کے برے کام حسرت دلانے کے لیے دکھائیں گے ان کے سب نیک عمل برباد ہو جائیں گے کچھ کار آمد نہ رہیں گے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَقَدِمْنَا اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَنْثُوْرًا﴾ "اور ہم ان کے کاموں کی طرف گئے جو انہوں نے کیے پھر ہم نے ان کو اڑتی ہوئی خاک بنادیا۔" اور اللہ کریم نے فرمایا: ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ کَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ یَوْمٍ عَاصِفٍ ﴾ "ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کے اعمال ریت کی طرح ہیں جن کو تیز آندھی کے دن میں ہوا اڑا لے جائے۔" اور فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ کَسَرَابٍ بِقِیْعَةٍ یَحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ﴾ "اور کافروں کے اعمال ایسے ہیں جیسے جنگل میں ریت ہو جیسے پیاسا پانی سمجھتا ہے، حتیٰ کہ جب اس کے پاس آیا تو اسے کچھ نہ پایا۔" اسی طرح پھر فرمایا کہ وہ آگ سے نکلنے نہ پائیں گے۔ معلوم ہوا کہ کافر ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ جس طرح اھل جنت ہمیشہ رہیں گے اسی طرح اھل نار بھی ہمیشہ رہیں گے۔ اس طرح نہ ہوگا کہ جہنم اپنے اھل والوں کے ساتھ کچھ مدت بعد ختم ہو جائے گی۔ جس طرح کہ بعض سلف و خلف کا مذہب ہے۔ و الله اعلم۔

آیات قرآنیہ و احادیث صحیحہ سے جو بات بظاہر بطور نص سمجھ آتی ہے وہ یہی خلود نار و جنت ہے۔ جس میں انقطاع نہ ہوگا۔ اس آیت سے بعض اھل علم نے تقلید کی مذمت پر دلیل لی ہے۔ اور یہ کہ جس طرح متبوعین تابعین سے بے زار ہوں گے اسی طرح ائمہ مجتہدین اپنے مقلدوں پر سخت ناراض ہوں گے اور اظہار برات کر دیں گے۔ اس لیے کہ ائمہ اربعہ رحمهم الله اپنی اور اپنے غیر کی تقلید سے منع کر گئے تھے۔ پھر جس کام سے انہوں نے دنیا میں امت کو منع کیا اس کے ارتکاب پر وہ ضرور ان سے قیامت والے دن ناراض ہوں گے۔ اور اپنے بے حکم مقلدوں سے ہرگز یہ پسند نہ کریں گے۔ ان شاء الله تعالیٰ۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ﴿۱۶۸﴾ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴿۱۶۹﴾	لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال طیب ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تم کو برائی اور بے حیائی ہی کے کام کرنے کو کہتا ہے اور یہ بھی کہ اللہ کی نسبت ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں (کچھ بھی) علم نہیں۔

فائدہ: جب یہ بات بیان ہو چکی کہ الہ و خالق اکیلا اللہ ہی ہے۔اب یہاں یہ فرمایا کہ ساری مخلوق کو رزق دینے والا بھی وہی تنہا ہے۔یہاں یہ احسان یاد کروایا کہ جو چیز بھی ہماری طرف سے حلال وطیب ہو ان سب کا کھانا تمہارے لیے جائز ہے۔طیب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ بدن اور عقل کو کسی طرح کا نقصان نہ دے۔پھر شیطان کے رستوں کی پیروی سے منع فرمایا۔جیسے جاہلیت میں لوگوں کو بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ وغیرہ حرام کر کے گمراہ کر دیا تھا۔حضرت عیاض بن حمار مرفوعاً فرماتے ہیں: اللہ کریم فرماتے ہے کہ جو مال میں نے بندے کو دیا وہ ان کے لیے حلال ہے۔میں نے اپنے بندے کو موحد بنایا لیکن شیطان نے آکر اس کو راستے سے ہٹادیا۔جو میں نے ان پر حلال کیا اس نے آکر وہ حرام کر دیا۔[الحدیث بروایت مسلم] حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت آنحضرت ﷺ کے پاس پڑھی گئی۔حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ علیہ السلام! اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے مستجاب الدعوات کر دے۔فرمایا: اے سعد! اپنے کھانے کو پاک کر تیری دعا قبول ہو گی۔اللہ کی قسم! آدمی اپنے پیٹ میں حرام کا ایک لقمہ ڈالتا ہے تو چالیس دن اس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے۔پھر جس کا گوشت حرام اور سود سے بڑھا پھولا ہے تو اس کے لائق یہی جہنم ہے۔[بروایت ابن مردویہ]

فائدہ: یہ آیت قبیلہ ثقیف، خزاعہ، عامر اور بنی مدلج کے متعلق نازل ہوئی۔انہوں نے اپنے نفوس پر حلال چیزوں کو حرام کر لیا تھا۔قرطبی نے کہا کہ مشہور یہی بات ہے۔بیضاوی نے کہا یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے اچھا کھانا اور اچھا پہننا اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا۔کرخی نے کہا یہ قول مرجوع ہے۔جبکہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے سبب کے خصوص کا نہیں۔موضح القرآن میں ہے کہ عرب کے لوگوں نے دین ابراہیم علیہ السلام کو کئی طرح سے بگاڑا۔سب سے پہلے یہ کہ غیر اللہ کی عبادت کرنے لگے پھر ان کے نام کی نیاز مان کر جانور ذبح کرنے لگے کہ وہ مردار ہوتا ہے اور کفر ہے۔اور جانوروں میں سے کئی چیزیں حرام کر لیں۔جن کا بیان سورہ مائدہ وانعام میں آیا ہے۔اور خوک کے گوشت کو حلال سمجھا۔اللہ نے انہیں اس بات میں الزام دیا۔حلال کو حلال اس لیے کہتے ہیں کہ خطر کا عقدہ حل ہو گیا۔طیب وہ ہے جو مزیدار ہو۔اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو چیزیں بھی زمین پر موجود ہیں جبکہ کوئی نص و ظاہر اس کی حرمت میں نہیں آئی تو اس کی اصل حلت میں ہے۔حتیٰ کہ تقاضائے حرمت میں کوئی دلیل آئے۔اس مقصد میں اس سے زیادہ یہ آیت دلیل ہے:﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا﴾ "اور وہی ذات ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا سب کچھ پیدا کیا۔

فائدہ: حضرت قتادہ وسدی نے کہا کہ جو بھی اللہ کی معصیت ہے وہ خطوات شیطان ہے۔حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ خطوات سے نزعاتِ شیطان مراد ہے۔حضرت مجاہد نے کہا: خطوت سے شیطان کے قدم یا اس کی خطائیں مراد ہیں۔ابو مجلز نے کہا کہ معاصی میں نذر و نیاز مراد ہے۔شعبی نے کہا کہ ایک شخص نے یہ نذر مانی کہ وہ

اپنے بیٹے کو ذبح کرے گا۔ مسروق نے اس کو فتویٰ دیا کہ اس کے بدلے ایک بکرا ذبح کرو اور کہا کہ تیری یہ نذر خطوات شیطان سے ہے۔ ابن مسعود کے پاس کوئی نمک اور (تھن) لایا وہ ضرع کھانے لگے تو ایک آدمی الگ جا بیٹھا انہوں نے فرمایا اس شخص کو بھی دو اس نے انکار کر دیا۔ پوچھا کیا روزہ دار ہے۔ کہا نہیں۔ کہا پھر نہ کھانے کا کیا سبب ہے؟ کہا میں نے ضرع کو ہمیشہ کی لیے حرام ٹھہرا لیا ہے۔ ابن مسعود نے فرمایا یہ خطوات شیطان سے ہے تو اس کو کھا لے اور نذر کا کفارہ دے۔ [بروایت ابن ابی حاتم] ابو رافع فرماتے ہیں کہ میں ایک دن اپنی بیوی پر ناراض ہوا تو وہ کہنے لگی میں ایک دن یہودیہ ہوں اور ایک دن نصرانیہ ہوں اور میرے تمام لونڈی غلام آزاد ہیں۔ اگر تو مجھے طلاق نہ دے۔ انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا: ((اِنَّمَا هٰذِهٖ مِنْ خُطُوٰتِ الشَّيْطَانِ)) حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بھی یہی فرمایا۔ یہ مدینے میں بڑی فقیہہ تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جو قسم یا نذر غصے میں ہوتی ہے وہ خطوات شیطان سے ہے اس کا کفارہ قسم ہی کا کفارہ ہے۔ غرضیکہ خطوت سے شیطان کا مزین کرنا اور اس کا راستہ و عمل ہے اور جو چیز بھی غیر شرع سے ہے وہ شیطان کی طرف منسوب ہے۔ کسی نے کہا خطوات سے چھوٹے گناہ مراد ہیں۔ کسی نے کہا شیطان کی آرائش مراد ہے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ لفظ کو عام رکھا جائے کسی ایک قسم کے ساتھ خاص نہ کیا جائے اور جو فرمایا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے یہ اس کی پیروی سے منع کرنے کی وجہ ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ "کہ وہ ظاہر گمراہ دشمن ہے۔" اور اللہ کریم نے فرمایا: اِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا اِنَّمَا يَدْعُوْ حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحَابِ السَّعِيْرِ "بلاشبہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے پس اسے دشمن سمجھو، بے شک وہ اپنے گروہ والوں کو بلاتا ہے تاکہ وہ جہنمیوں میں سے ہو جائیں۔" اللہ کریم نے جس آیت میں حضرت آدم کو سجدہ کرنے کا ذکر کیا، اس میں اس کی بنی آدم سے دشمنی ظاہر کر دی۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا﴾ "کیا پھر تم اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو اور حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں ظالموں کے لیے بہت برا بدلہ ہوا۔" پھر فرمایا کہ شیطان تمہیں بری باتوں اور برے کاموں کا حکم دیتا ہے سب سے بدتر یہ کہ وہ تمہیں زنا کا حکم دیتا ہے۔ اس سے بدتر یہ بات ہے کہ تم بغیر علم کے اللہ پر کوئی بات کہہ دو۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ہر کافر اور بدعتی اس میں داخل ہے۔ موضح القرآن کا لفظ یہ ہے کہ کوئی مسئلہ اپنی طرف سے بتا دے جیسے اب بھی بہت سے لوگ اس غلط روش کا ارتکاب کرتے ہیں۔

فتح البیان میں فرمایا کہ بغیر علم کے کہہ دے کہ یہ حلال ہے یہ حرام ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت، ہر اس بات پر صادق آتی ہے جو بغیر علم کے شرع میں کہی گئی ہو۔ یا یہ تمام فاسد مذاہب و قیاس و آراء و اجتہادوں کو شامل ہے۔ جن کی نہ اللہ نے اجازت دی ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت کی کوئی دلیل ہے۔ شیطان کا حکم اور وسوسہ انہی خطرات سے عبارت ہے جو آدمی کے دل میں گذرتے ہیں۔ اصل ان خیالات کا پیدا کرنے والا تو اللہ ہی ہے

شیطان بس بظاہر پیشی کے لیے ہوتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ شیطان انسان کی رگوں میں خون کی گردش کی طرح چلتا پھرتا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۷۰﴾

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو (کتاب) اللہ نے نازل فرمائی ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ سیدھے رستے پر ہوں (تب بھی وہ انہیں کی تقلید کئے جائیں گے۔)

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت یہودیوں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حق کی طرف بلایا تھا اور وہ کہتے کہ ہم تو اپنے باپ دادا کی راہ پر چلیں گے۔ ابوالسعود کا لفظ یہ ہے کہ یہ آیت مشرکین کے حق میں نازل ہوئی۔ انہیں حکم ہوا تھا کہ قرآن کے موافق چلیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے جیسے واضح آیات و دلائل وغیرہ۔ ان کی پیروی کرو، لیکن انہوں نے وہ تو نہ کیا لیکن الٹا تقلید پر جھک پڑے۔ یہ ابوالسعود مفسر حنفی مذہب تھے ان کے بیان سے ظاہر ہوا کہ تقلید اہل شرک سے آئی ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس کے قول سے بھی پتا چلتا ہے کہ اصل تقلید یہود سے نکلی ہے۔ غرضیکہ یہ تقلید مشرکین کا طرز عمل ہو یا یہودیوں کا بہر حال اس کی مذمت آئی اور ساتھ ساتھ یہ مقلدین کی جہالت پر مدلل ہے۔ اسی طرح ایک اور آیت ہے کہ: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا﴾ "کہ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف آؤ جو اللہ نے نازل کیا اور رسول کی طرف (بھی آؤ) کہتے ہیں ہمیں وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء واجدا کو پایا۔" کہ ہم تو اسی کو حلال یا حرام مانیں گے جس پر ہمارے آباء واجداد عمل کرتے رہے جو اللہ اور اس کے رسول کہتے ہیں اس کی پیروی ہرگز ہم سے نہ ہوگی۔ مقلدین مذاہب کا بھی یہی مقولہ ہے کہ جو ہمارے علماء وائمہ کتب فقہ واصطلاح و فتاویٰ میں لکھ گئے ہیں ہم صرف انہی کو مانتے ہیں جو قرآن و حدیث میں ہے وہ ہرگز عمل میں نہ لائیں گے۔ فتح البیان میں لکھا ہے کہ اس آیت میں تقلید کی مذمت و ممانعت کی دلیل ہے۔ پھر رازی نے اس جگہ ردِ تقلید میں بڑا عمدہ بیان سپرد قلم فرمایا۔ پھر انہوں نے فرمایا کہ اتباع شیطان سے زجر کے بعد اس آیت کے لانے میں یہی تنبیہ مقصود ہے کہ شیطان کے وساوس کی اتباع اور تقلید کی اتباع میں کچھ فرق نہ ہے۔ اور یہ آیت اس موقف کی بڑی قوی دلیل ہے کہ غور واستدلال کرنا واجب ہے۔ بغیر دلیل کے آنے والے اپنے وساوس یا کسی اور کی کہی ہوئی بات پر اعتماد نہ کرنے (بلکہ دلیل واجب ہے)

کتاب دین خالص میں اس رد تقلید پر تیس کے قریب آیات لکھی ہیں۔اس باب میں ائمہ کرام کی کتب آدب الطالب، رسالہ قول مفید اور فتاویٰ اعلام الموقعین بڑی عمدہ ہیں جو پڑھنے والے کو اپنے کثیر فوائد کی بناء پر کافی ہو سکتی ہیں۔اس آیت مذکور کے تحت بیضاوی کا لفظ یہ ہے کہ یہ آیت اس کے لیے ممانعت تقلید کی دلیل ہے جو خود بخود فکر اور قوت اجتہاد رکھتا ہے۔بیضاوی رحمہ اللہ کی یہ بات کچھ درست نہ ہے اس کی بات کا مطلب تو یہ ہوا کہ جو خود نظر و اجتہاد نہیں کر سکتا وہ تقلید کرے۔کیونکہ ہر شخص میں تو یہ صلاحیت نہ ہے۔حالانکہ احکام اصل و فروع میں کسی طرح بھی مسلمان کو تقلید کرنا درست نہیں خواہ مقلد عالم ہو یا جاہل ہو۔عالم پر تو غضب یہ ہوگا کہ وہ علم کے باوجود پھر جاہلوں میں جا گھسے گا۔﴿أَعُوذُ بِاللّٰهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ میں جاہل ہونے سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔اور علم سے نا آشنا شخص کو اتنا کافی ہے کہ کسی عالم دین سے پوچھ لے کہ فلاں مسئلے میں کتاب و سنت کا کیا ارشاد و حکم ہے۔اللہ کے اس فرمان کا معنیٰ و مقتضی یہ ہے :﴿فَاسْئَلُوٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ "کہ اھل ذکر سے پوچھ لیا کرو اگر تمہیں علم نہ ہو۔" ذکر کلام پاک کا نام ہے۔اہل ذکر سے علمائے دین مراد ہیں۔کتاب کا عالم وہی ہوتا ہے جو سنت مطہرہ پر عبور رکھتا ہے۔ایسا شخص کتاب و سنت کے مرکز سے ہر مسئلے کا حل بتا سکتا ہے خواہ وہ کوئی پرانا مسئلہ ہو یا دور جدید کا تقاضا ہو،وہ اس کامل و شامل مراکز علوم سے قیامت تک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔اسے کسی فقہ یا رائے و قیاس کی ضرورت نہ رہے گی۔

«شھوِ دیار مانع گردو از اغیار عاشق را»

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٧١﴾

جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ سن نہ سکے (یہ) بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔

یعنی ان کافروں کی مثال ان جانوروں کی سی ہے جنہیں جنگل میں کوئی شخص بلاتا ہے وہ اس کی آواز سنتے ہیں انہیں سمجھ کچھ نہیں آتا اسی طرح یہ کافر نہ خود علم کی بات جانتے ہیں نہ کسی کی سنتے ہیں اگر سن بھی لیں تو جانوروں کی طرح ان سنی کر کے رد کر دیتے ہیں۔

فائدہ: یہ مثال اللہ کریم نے تقلید کی مذمت پر بیان فرمائی ہے جیسے فرمایا:﴿لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۝﴾ "کہ آخرت کا انکار کرنے والوں کی بری مثال ہے۔" مطلب یہ ہے کہ جس سرکشی و گمراہی و تقلید میں یہ کافر گرفتار ہیں ان کی مثال جانوروں کی سی ہے۔کہ بات سنتے تو ہیں لیکن سمجھتے نہ ہیں۔حضرت ابن

عباس، ابو العالیہ، مجاہد، عکرمہ، عطاء، حسن، قتادہ اور ربیع بن انس کا یہی قول ہے۔ معلوم ہوا کہ اسلام میں تقلید نہ ہے بلکہ یہ اہل شرک واھل کفر سے دین حقہ میں بھی آ پہنچی ہے۔ اس لیے علمائے دین نے تقلید کو شرک وکفر وحرام قرار دیا اور اس کو نحوست سے تعبیر کیا۔ کسی نے کہا کہ ان کے پکارنے کی یہ مثال بتوں کے لیے ہے کہ وہ ان کو پکارتے ہیں جو سنتے بولتے اور سمجھتے نہ ہیں۔ ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے لیکن ابن کثیر نے پہلے معنی کو زیادہ درست قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ بت تو بالکل کوئی صلاحیت نہیں رکھتے نہ کچھ سنتے ہیں نہ بولتے اور نہ سمجھتے ہیں۔ نہ ان میں زندگی کے آثار ہیں۔ لیکن جنگل کے جانور اگرچہ کچھ سمجھتے تو نہ ہیں البتہ سنتے بولتے تو ہیں۔ اسی طرح مقلدین کا حال ہے کہ کتاب وسنت کی طرف بلانے والوں کی بات تو سنتے ہیں مگر سمجھتے نہ ہیں۔ حق کو قبول کرنے والی سماعت سے محروم ہیں اور حق کہنے سے گونگے، حق دیکھنے سے اندھے، اور سمجھنے سے بے عقل ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِی الظُّلُمٰتِ مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ وَمَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝﴾ "اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کے ساتھ کفر کیا وہ بہرے اور گونگے اندھیروں میں پڑے ہیں جس کو اللہ چاہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہے اس کو سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔"

فتح البیان کا لفظ یہ ہے کہ اس آیت میں کافروں کے داعی محمد رسول اللہ ﷺ کو راعی کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ جس طرح وہ اونٹ بکری کو بلاتا ہے تو وہ صرف کچھ سن سکتے ہیں سمجھ نہیں سکتے۔ کافروں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے جن کو رسول اللہ ﷺ اسلام کی طرف بلاتے ہیں۔ سلف کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ بیضاوی نے کہا مطلب یہ ہوا کہ کافر اپنی تقلید میں اس قدر غرق ہوتے ہیں کہ اپنے اوپر پڑھی جانے والی چیز پر ذہن حاضر ہی نہیں کرتے۔ یہ جانوروں کی طرح ہیں کہ صرف سنتے ہیں سمجھتے نہیں ہیں۔ حضرت عطاء نے کہا یہ یہود کے متعلق اتری ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۷۳﴾	اے اہل ایمان جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ اور اگر اللہ ہی کے بندے ہو تو (اس کی نعمتوں کا) شکر بھی ادا کرو۔ اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو اور سور کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام کر دیا ہے، ہاں جو ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے اس پر کچھ گناہ نہیں بے شک اللہ بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔

فائدہ: یعنی مویشیوں میں ان پر اتنی چیزیں حرام ہیں لیکن اگر اضطراری کیفیت ہو جائے تو ان کی بھی

گنجائش ہے لیکن نافرمانی نہ کرے یعنی اس کی حالت اضطراری درجے تک نہ پہنچتی ہو لیکن یہ کھالے اس طرح نہ کرے اور نہ ضرورت سے زائد کھائے۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس آیت میں مومنین کو حکم فرمایا کہ پاکیزہ رزق کھائیں۔اگر وہ اللہ کے بندے ہیں تو اسی کا شکرادا کریں۔رزق حلال کمانا کھانا، دعاو عبادت کی قبولیت کا سبب ہے۔ جیسا کہ حرام کھانا، کمانا، دعاو عبادت کو قبول نہیں ہونے دیتا۔ابو ہریرہ مرفوعاً فرماتے ہیں۔اے لوگو! اللہ کریم پاک ہے اور قبول نہیں کرتا مگر پاک کو اللہ نے مومنین کو وہی حکم دیا جو پیغمبروں کو حکم دیا۔ فرمایا اے رسولو! طیبات کھاؤ اور صالحات عمل کرو۔ میں تمہارے کاموں کو جانتا ہوں۔اسی طرح فرمایا: اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں دیئے وہ طیبات کھاؤ پھر ایک آدمی کا ذکر کیا جو کہ لمبا سفر کرتا ہے، پریشان حال ہے، بال گرد آلود ہو چکے ہیں، دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے کہتا ہے یارب! یارب! حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے، پینا حرام ہے، لباس حرام ہے، حرام سے وہ پلا ہے، بتاؤ اس کی دعا کیسے قبول ہو گی؟ [بروایت احمد، مسلم، ترمذی] معلوم ہوا کہ حلال کھانا عبادت کی قبولیت کے لیے شرط ہے۔اس کے ساتھ جب بات کی سچائی بھی ہو گی تو آدمی سراپا مقبول ٹھہر جاتا ہے۔ تمام تصور کا مرکز یہی دو حرف ہیں۔

فائدہ: اکل حلال و صدق مقال، جب یہ فرمادیا کہ رزق حلال کھاؤ تو اب حرام رزق سے منع فرمادیا۔ پھر حرام چیزوں کے نام لے کر بتادیا۔ مردار وہ جانور ہے جو بغیر حلال و ذبح کیے طبعی موت مر جائے۔ خواہ گلا گھونٹا گیا ہو یا پہاڑ وغیرہ سے گر گیا ہو۔ یا کسی لاٹھی وغیرہ سے ضرب لگایا گیا ہو یا درندے نے چیر پھاڑ دیا ہو۔ لیکن جمہور کے نزدیک دریا کا مردار بھی حلال ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُه‘﴾ ”کہ تمہارے لیے دریا کا شکار کرنا، اور اس کو کھانا حلال کیا گیا ہے۔“ حدیثِ عنبر کی دلیل سے جو کہ بخاری و مسند و موطا و سنن میں مروی ہے۔ اور نبی علیہ السلام نے فرمایا: ((هُوَ الطهور ماء ه و الحل میتته)) ”کہ اس کا پانی پاکیزہ اور مردار حلال ہے۔“ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ ہمارے لیے دو مردار اور دو خون حلال سے مراد مچھلی اور ٹڈی اور دو خون جگر اور کلیجی ہیں۔اس مسئلے کا مکمل بیان سورۃ مائدہ میں آئے گا۔

مسئلہ: مردار کا ملا ہوا دودھ اور انڈا شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک نجس ہے۔اس لیے کہ وہ بھی اسی کا جزء ہے۔مالک رحمہ اللہ نے ایک روایت میں پاک بتایا مگر ہمسائیگی کے سبب سے نجس ہوتا ہے۔اسی طرح انفحہ میتہ میں اختلاف

ہے۔ صحابہ نے مجوس کا پنیر کھایا ہے۔ قرطبی نے کہا وہ تھوڑے سے دودھ میں ملا ہوتا ہے۔ سو جب مائع چیز زیادہ ہو تو تھوڑی سی نجاست معاف ہوتی ہے۔ حضرت سلیمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ سے پوچھا گیا: سمن جبن فرا" (بھیڑ کا گھی، پنیر) کے بارے میں فرمایا: حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے اور حرام وہ ہے جو اس نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے۔ اور جس سے سکوت فرمایا وہ معاف ہے۔ [بروایت ابن ماجہ] اسی طرح جاری خون بھی حرام ہے گو کہ نجس نہ ہو اور خنزیر کے گوشت کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر ذبح کیا ہو تو بھی حرام، اگر خود مرا ہو تب بھی حرام، اسی طرح اس کی چربی بھی گوشت کی طرح حرام ہے یہ حکم تغلیبا ہے۔ یا اس لیے کہ گوشت چربی میں شامل ہوتا ہے یا قیاس کے طریق سے رائے سے حرام ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جو جانور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو وہ کسی تھان پانسے پر ذبح کیا جائے یا کسی بت وغیرہ کے نام پر جس کے لیے اہل جاہلیت کیا کرتے تھے بھی حرام ہیں۔

حضرت حسن بصری سے پوچھا گیا کہ ایک عورت نے اپنے کھیل تماشے کے لیے ایک (شادی) میلہ کیا اس میں اونٹ ذبح کیا فرمایا اس کو نہ کھاؤ، وہ تو بت کے نام پر ذبح کیا گیا ہے۔ قرطبی نے کہا کہ حضرت عائشہ سے پوچھا گیا کہ یہ عجمی لوگ جو میلوں پر اونٹ ذبح کرتے ہیں پھر اس میں سے مسلمانوں کو بطور ہدیہ بھیجتے ہیں ان کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: جو اس دن کے لیے ذبح کیا گیا ہو اس کو نہ کھاؤ لیکن ان کے درختوں پر لگا پھل کھالو۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ جو کسی تھان یا بت پر یا اسلام کے طریقہ کے خلاف کسی جلسے میلے پر ذبح کیا گیا ہو اس کو کھانا ناجائز ہے۔ بلکہ حرام ہے۔ اہلال کے معنی لغت میں آواز بلند کرنا ہیں۔ سو جو جانور جس بت یا طاغوت کے نام سے منسوب کیا گیا اور اس کے ذبح پر اس کا نام پکارا گیا وہ حرام ہو گیا۔ اگر وہ جانور اسی کے نام پر رکھا گیا لیکن ذبح کرنے کے وقت خواہ اللہ کا نام لیا جائے یا بت کا وہ حرام ہی ہے۔ وقتی طور پر اللہ کا نام لینے سے وہ حلال نہ ہو گا۔ مفسرین سلف و خلف نے اہلال کے جو معنی میں جو ذبح کا لفظ ذکر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ جاہلیت میں لوگ جس کے نام کا جانور رکھتے تھے ذبح کے وقت اسی کا نام پکار کر ذبح کرتے تھے۔ اللہ کا نام نہ لیتے تھے اللہ نے ان کے اس کام کا رد کیا۔ فرمایا: کہ جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا وہ سور، خون اور مردار کی طرح حرام ہے۔ اہل تفسیر نے شانِ نزول پر خیال کر کے لفظ ذبح کو اختیار کر لیا۔ لغوی معنی کو اختیار نہ کیا۔ حالانکہ لغت مقدم ہوتی ہے کلام پاک کی بلاغت کو تو دیکھو کہ آیت تو جاہلیت کے ذبح کے متعلق نازل ہوئی مگر وحی میں وہ لفظ بولا گیا جو صرف آواز بلند کرنے اور ذبح میں شامل ہے۔ تاکہ یہ نہ ہو کہ اگر کوئی غیر اللہ کی نذر و نیاز کو ذبح کے وقت اللہ کا نام لے لے تو اس کو لا علم مسلمان حلال سمجھ کر کھانہ جائیں بلکہ یہ بتا دیا کہ اصل اعتبار نیت کا ہے۔ جب نذر و نیاز والے کی نیت غیر اللہ کے لیے ہوئی تو بوقت ذبح اللہ کا نام

لینے سے وہ حلال نہ ہو گا۔ بلکہ یہ آیت بڑی عام ہے عام ذبح اور نذر و نیاز سب کو شامل ہے۔ اس لیے کہ عربی میں لفظ مَا بہت عام چیز کو تعبیر کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جانور ہو یا کچھ اور جس چیز پر بھی غیر اللہ کا نام لے لیا وہ حرام ہو گیا۔ کھانے کی ہے تو اس کا کھانا حرام، پینے کی چیز کا پینا حرام، اور پہننے کی چیز ہو تو اس کا پہننا حرام ہو گا۔ کیونکہ لفظ کے عموم کا اعتبار ہے سبب کے خصوص کا اعتبار نہ ہے۔ مگر جس چیز کو کسی دلیل نے خاص کر دیا ہو وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ فتح البیان میں فرمایا کہ مردوں کے معتقدین جو قبور پر ذبح کیا کرتے تھے وہ: ﴿وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کے تحت داخل ہے۔ اس ذبح میں اور بت کے لیے ذبح کیے گئے جانور کی حرمت میں کچھ فرق نہ ہے۔ نظام نے تفسیر نیساپوری میں لکھا کہ علماء نے فرمایا کہ اگر کسی مسلمان نے کوئی ذبیحہ کیا اور اس کی نیت غیر اللہ کی تھی تو وہ مسلمان مرتد ہو گیا اور اس کے ذبیحہ کا حکم مرتد کے ذبیحہ والا حکم ہے۔ صاحب روض نے کہا جس نے رسول اللہ ﷺ کے نام پر ذبح کیا تو وہ کافر ہو گیا۔ شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا جب لوگوں کے سردار آنحضرت ﷺ کے نام پر ذبح کرنے والا کافر ہے تو اور مردوں کے نام پر ذبح کرنا کس طرح درست ہو گا؟ اور ایسا کرنے والے کے کفر کا کیا درجہ ہو گا؟ عطاء و مکحول، حسن، شعبی کے نزدیک نصاریٰ کا باسم مسیح کیا ہوا ذبیحہ اس آیت: ﴿وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ﴾ "کہ اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔" کی رو سے جائز ہے مگر امام مالک، شافعی اور ابو حنیفہ اس کو حلال نہیں کہتے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب انہوں نے ذبح پر مسیح کا نام لے لیا تو وہ: ﴿مَا أُهِلَّ بِهِ لغير اللّٰه﴾ ہو گیا جب یہ ہوا تو حرام ہو گیا۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تم عیسائیوں کو اہلال لغیر اللہ کرتے سنو تو نہ کھاؤ اور جب نہ سنو تو کھاؤ کیونکہ اللہ نے ان کے ذبائح تمہارے لیے حلال کیے ہیں۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں اللہ کو معلوم ہے اگرچہ لفظ طعام عام ہے مگر آیت اہلال اس کی تخصیص کرتی ہے۔ معنی یہ ٹھہرے کہ یہود و نصاریٰ کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے مگر جو اللہ کے نام سے پکارا جائے وہ ذبیحہ ہو جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر ذبح کیا گیا ہو یا کوئی اور چیز ہو۔ پھر جن چیزوں کو کھانا اس آیت میں منع فرمایا ہے۔ مخلوق پر رحم کرتے ہوئے اضطراری حالت میں اس کا کھانا بھی جائز کر دیا۔ جب اس کے سوا کچھ نہ مل رہا ہو تو ان کو بقدر ضرورت کھانا جائز ہے۔ حضرت مجاہد نے فرمایا: ﴿غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ رہزن نہ ہو۔ امام سے جدا نہ ہو اور اللہ کی معصیت میں گھر سے نکلا نہ ہو تو ایسے شخص کو بوقت ضرورت کھانا جائز ہے۔ وگرنہ جو مذکورہ کام کرتا ہے اس کے لیے مجبور و لاچارگی میں بھی ان کا کھانا درست نہ ہے۔ حضرت سعید بن جبیر کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت مقاتل بن حبان نے کہا باغی نہ ہو کا مطلب ہے کہ اس کو حلال نہ سمجھے۔ سدی نے کہا مراد یہ

ہے کہ شہوت کے لیے نہ کھائے۔ حضرت عطاء نے فرمایا کہ مردار کو لذیذ کھانے کی صورت میں نہ کھائے بلکہ سادگی سے صرف زندگی کے بچاؤ کے لیے کھالے اور جب حلال مل جائے تو حرام کو گرادے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: یعنی پیٹ بھر کر نہ کھائے یہ زیادتی ہے۔ بلا ضرورت مردار نہ کھائے، یہ بغاوت ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا حلال میسر آئے تو حرام کی تلاش نہ کرے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں مضطر مکرہ ہے یعنی جس پر زبردستی کی گئی ہو اور اس کا بس نہ چلے۔ قرطبی نے کہا مضطر کو اگر مردار مال اور اس کے پاس کسی اور کا کھانا بھی موجود ہے جس میں قطع وازی نہ ہے تو وہ مردار نہ کھائے بلکہ بغیر اختلاف کے وہ دوسرے کھانا کھالے۔ رہی یہ بات کہ اس کھانے کو واپس دینا یا اس کے عوض اتنی قیمت دینا لازم ہے یا نہیں۔ سو اس کے متعلق امام مالک کے دو قول ہیں۔ عباد بن شرحبیل نے بھوک کے مارے کسی کے باغ سے ایک بالی توڑ کر دانے نکال کر کھالیے اور کچھ اپنی چادر میں بھی چھپا لیے۔ اس باغ کے مالک نے اس کو پکڑ لیا۔ اسے مارا پیٹا بھی اور وہ چادر بھی چھین لیے۔ انہوں نے آکر رسول اللہ ﷺ سے کہا: فرمایا کہ اے شخص! جس صورت میں یہ بھوکا تھا سائی نہ تھا تو تو نے اس کو کیوں نہ کھلایا یا یہ جاھل تھا تو تو نے اس کو کیوں نہ بتایا پھر انہیں چادر واپس دلوائی اور باغ والے کو ایک یا نصف وسق طعام دلوادیا۔ [بروایت ابن ماجہ] ابن کثیر نے اس کی سند کو صحیح اور جید بتایا ہے۔ اس کے سوا اس کے بہت سے شواہد ہیں۔ حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ جو پھل لٹکتا ہے اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا ضرورت مند نے کچھ کھالیا لیکن گود میں نہ بھرا تو اس پر کچھ گناہ نہ ہے۔ [الحدیث] مقاتل بن حیان نے کہا یہ حکم مجبور و لاچار کے لیے ہے۔ اور ہمیں یہ بات پہنچتی ہے کہ تین لقمے سے زیادہ نہ کھائے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا اللہ غفور ہے کہ اس نے حرام کھایا ہوا معاف کر دیا اور رحیم ہے کہ حرام کو لاچار کے لیے جائز کر دیا۔ مسروق نے فرمایا جس نے اضطراری حالت میں کچھ نہ کھایا نہ پیا اور مر گیا دوزخ میں گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مجبور کے لیے ضرورت کے وقت کھانا لازم ہے یہ فقط رخصت نہ ہے۔ کیا ہراسی رفیق غزالی نے کہا: ہمارے نزدیک یہی درست ہے جیسے بیمار کے لیے افطار کرنا۔ فتح البیان کا لفظ یہ ہے کہ مضطر وہ ہے جس کو مر جانے کا خوف ہو اگر زبردستی میں ہے تو اس کے خاتمے تک حرام کھانے کی رخصت ہے۔ اگر زبردستی میں ہے تو اس کے خاتمے تک حرام کھانے کی رخصت ہے۔ اگر بھوکا رہے اور ہمیشہ اسی بھوکے پن میں رہتا ہے تو پیٹ بھر کے کھایا کرے اگر کبھی ایسا ہو تو شافعی کے نزدیک زندگی بچانے کے لیے چند لقمے کھالیے۔ ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے جبکہ امام مالک فرماتے ہیں کہ پیٹ بھر کر کھانے میں بھی حرج نہ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿١٧٦﴾

جو لوگ (اللہ کی) کتاب سے ان (آیتوں اور ہدایتوں) کو جو اس نے نازل فرمائی ہیں چھپاتے اور ان کے بدلے تھوڑی سی قیمت (یعنی دنیاوی منفعت) حاصل کرتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھرتے ہیں ایسے لوگوں سے اللہ قیامت کے دن نہ کلام کرے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا اور ان کے لیے دکھ دینے والا عذاب ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی اور بخشش چھوڑ کر عذاب خریدا یہ آتش (جہنم) کی کیسی برداشت کرنے والے ہیں۔ یہ اس لیے کہ اللہ نے کتاب سچائی کے ساتھ نازل فرمائی اور جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا وہ ضد میں (آکر نیکی سے) دور (ہو گئے) ہیں۔

فائدہ: یہود نے اپنی کتاب میں سے نبی علیہ السلام کی صفت سمیت کئی آیات تبدیل کر دیں۔ اور صرف دنیا داری کی غرض سے کہ کہیں ان کی ریاست نہ جاتی رہے۔ وہ لوگ عرب سے ہدیہ وصول کیا کرتے تھے اور اس بات سے ڈرتے تھے کہ اگر ہم ان پر صفت مذکور ظاہر کر دیں گے تو یہ لوگ ہمیں چھوڑ کر پیغمبر علیہ السلام کے تابع ہو جائیں گے۔ اور آمدنی کا ذریعہ بند ہو جائے گا۔ اس تھوڑی سی آمدنی پر صفتِ پیغمبر کو چھپا لیا۔ اور اپنے نفسوں کو ہدایت وایمان اور تصدیق رسول کے عوض اس بے وقعت و حقیر آمدنی پر بیچ دیا۔ اور خود کو دنیا و آخرت کے نقصان میں ڈال دیا۔ دنیا میں اللہ کریم نے انہیں واضح دلائل دی کر اپنے بندوں پر حق ظاہر کر دیا۔ جو ان کو اس بات کا کھٹکا تھا تو ان پر غضب پر غضب آپڑا۔ اللہ کریم نے کئی مقامات پر ان کی مذمت فرمائی جس طرح کہ اس آیت میں فرمایا کہ انہوں نے حقیقت میں وہ حقیر قیمت وصول نہیں کی بلکہ جھنم کی آگ سے پیٹ بھرا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا﴾ "بے شک وہ لوگ جو یتیموں کے مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں اور عنقریب وہ واصل جھنم ہوں گے۔" حدیث صحیح میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتا ہے گویا وہ پیٹ میں جھنم کی آگ اتارتا ہے۔ اس مقام سے اردو محاورے میں پیٹ کو جھنم کہہ دیتے ہیں سو ایسے ہی پیٹ دوزخ ہوتے ہیں۔ جن میں حرام کھانا جاتا ہے۔ ورنہ حلال کھانا

پیٹ میں جاکر نور بن جاتا ہے اور حرام مال آگ بن جاتا ہے۔

فائدہ: اور اللہ کریم کا ان سے کلام منقطع کرنا اس وجہ سے ہوگا کہ انہوں نے حق بات کو چھپایا اور جانتے ہوئے چشم پوشی کی اس وجہ سے غضب کے مستحق ٹھہرے اور پاک نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ انہیں گناہوں سے بری نہ کرے گا بلکہ اسی حال میں موت دے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن سے اللہ کریم نہ بات کرے گا نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ ایک بوڑھا زانی، دوسرا منافقت والا بادشاہ، تیسرا (بھوکا) عیالدار متکبر۔ [بروایت ابن ابی حاتم] آگ پر صبر کرنے کا مطب یہ ہیکہ جو بھی انہیں دیکھے گا تعجب کرے گا۔ انہوں نے اس سخت عذاب کو کس طرح اپنے لیے گوارا کر لیا۔ انہیں اس عذاب و عبرت اور بے عزتی کی طوق پر کس طرح صبر آیا۔ کسی نے کہا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ پر خوب جمے ہوئے ہیں جس کا انجام دوزخ ہوگا اور یہ عذاب اس بات پر ہوگا کہ اللہ نے اپنے پیغمبروں پر کتابیں نازل کیں۔ جن میں حق کو حق اور باطل کو باطل قرار دیا۔ انہوں نے ان آیات کو مذاق میں اڑا دیا کتاب تو کہتی تھی کہ تم علم کو ظاہر کرو پھیلا دو لیکن انہوں نے اس کی مخالفت و تکذیب کی اور اس کو چھپا گئے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حق کی طرف دعوت دی نیکی کا حکم دیا، برائی سے منع کیا مگر یہ انہیں جھٹلانے لگے اور ان کی صفت پھر بھی ظاہر نہ کی اس پر اس مصیبت و عبرت ناک سزا میں گرفتار ہونا پڑا۔

فائدہ: صفت کو چھپانا یہ تھا کہ جو وصف اور وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت تورات میں لکھا تھا۔ اسے علمائے یہود نے چھپا لیا۔ یا اس کا مطلب اور طرح بیان کر دیا اگرچہ یہ آیت یہود کے متعلق اتری ہے مگر لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ سبب کے خصوص کا۔ اب علمائے اسلام میں سے جو ایسا کرتا ہے دنیا کے لالچ میں پڑ کر دین حقہ کو چھپاتا ہے اور جانتے ہوئے بھی کتاب و سنت کے مقابلے میں عام و خاص کے فتاویٰ کو رواج دیتا ہے اس کا حکم بھی علمائے یہود کا سا ہے۔ اور اسی مناسبت سے اس کے لیے بھی وہی سزا ہے جو ان کے لیے تھی۔ اور اس کتاب سے مراد جس میں اختلاف کیا (وہ) تورات ہے۔ نصاریٰ نے کہا اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفت ہے یہود نے انکار کر دیا۔ یا اس سے قرآن مراد ہے جس کی بابت کفار قریش مختلف ہو گئے کسی نے کہا یہ جادو اور کہانت ہے کسی نے پہلے قصے قرار دیا۔ یہاں پارہ سیقول کا ربع اول تمام ہوا۔ وللہ الحمد و اعنہ۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۱۷۷﴾

نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق و مغرب کو (قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کرلو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور فرشتوں پر اور (اللہ کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں (کے چھڑانے) میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کرلیں تو اسکو پورا کریں اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ ہیں جو (ایمان میں) سچے ہیں اور یہی ہیں جو (اللہ سے) ڈرنے والے ہیں۔

فائدہ: ابن ابی حاتم نے کہا کہ اس آیت میں بڑے جملے عام قاعدے، اور بڑے مضبوط عقائد جمع ہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ علیہ السلام نے جواباً یہی آیت پڑھی۔ پھر پوچھا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا جب تو نیکی کرے تو تیرا دل اس کو اچھا سمجھے اور جب تو برا کام کرے تو تیرا دل اسے برا سمجھے لیکن اس کی سند میں انقطاع ہے۔ اسی کے لگ بھگ ابن مردویہ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے طویل روایت بیان کی ہے۔ مگر وہ روایت بھی منقطع ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا پہلے اللہ کریم نے مومنین کو بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا پھر انہیں بیت اللہ کی طرف پھیر دیا۔ پھر یہ بات اہل کتاب اور بعض مسلمانوں پر شاق گذری اس پر اللہ کریم نے ان کے تالیف قلب کے لیے قبلہ کی تبدیلی کی حکمت بیان فرمائی ۔ کہ اصل بات تو اللہ کریم کی اطاعت ہی ہے۔ جس طرح بھی وہ چاہے حکم دے اسی طرف منہ پھیر لینا چاہیئے ۔ سب سے بڑی نیکی اور تقویٰ اتباع شریعت ہی ہے کچھ ایک ہی طرف یا مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنے میں نیکی نہیں ہے۔ اگر وہ اللہ کا نافرمان ہو اور یہ بات ایسی ہے جیسے قربانی کے متعلق فرمایا: ﴿لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَآءُ هَا وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ ”کہ ہر گز اللہ کو اس کا گوشت نہ خون پہنچے گا بلکہ تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچے گا۔“ حضرت ابن عباس نے فرمایا نیکی یہ نہ ہے کہ تم نماز پڑھ لو اور عمل نہ کرو۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ قبلہ پھیر دیا گیا فرائض و حدود نازل ہوتے تو اللہ کریم نے فرمایا کہ فرائض بجالاؤ

۔ضحاک اور مقاتل کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابو العالیہ نے فرمایا یہود کا قبلہ مغرب تھا اور عیسائیوں کا قبلہ مشرق تھا۔اللہ کریم نے فرمایا یہ جانبین کی طرف رخ کر لینا کوئی نیکی نہیں۔در حقیقت نیکی تو ایمان و عمل ہے ۔جو اس آیت میں مذکور ہے۔ حضرت حسن اور ربیع نے بھی یہی بات کہی ہے۔ثوری نے فرمایا کہ یہ نیکی کی تمام اقسام مذکور ہیں۔ حضرت ابن کثیر نے فرمایا یہ بات درست ہے جو بھی ان حسنات سے متصف ہے وہ بالکل دائرہ اسلام میں داخل ہے۔اس نے ساری خیر حاصل کر لی۔اللہ پر ایمان لایا،لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا قائل ہوا،اور ملائکہ کی تصدیق کی جو اللہ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان سفیر ہیں اور جو کتابیں اللہ کریم نے انبیاء پر نازل کیں ان کو تسلیم کیا کیونکہ کتاب کا لفظ اسم جنس ہے۔ سب کتابوں کو شامل ہے۔ خصوصاً اس کتاب کو شامل ہے جو سب سے آخری اور اشرف ہے۔ یعنی قرآن کریم جس پر ہر خیر ختم ہوتی ہے۔اس میں دین دنیا کی سعادت ہے۔اس نے سب کتابوں کو منسوخ کر دیا۔پھر سارے پیغمبروں پر ایمان لایا۔ جن کے آخری نبی آنحضرت ﷺ ہیں۔یہ اصول عقائد کا بیان ہے۔رہے فروع سو ان کا بیان اس کے بعد ہے۔مال دینے کا مطلب یہ ہوا کہ مال سے محبت تھی،اس میں رغبت کے باوجود اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا۔ حضرت ابن مسعود سعید بن جبیر وغیرہ سلف و خلف نے اسی معنی پر نص کی ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً آیا ہے کہ افضل صدقہ وہ ہے جو تو اس وقت دے جبکہ تو تندرست اور مال پر حریص ہو۔مالداری کی امید رکھتا ہو اور محتاجی سے ڈرتا ہو۔ مستدرک میں حاکم سے ابن مسعود سے لفظ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ تو صدقہ دے جبکہ تو تندرست اور لالچ رکھتا ہو۔مالداری کا امیدوار اور فقر سے ڈرتا ہو۔ پھر کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے اور شرط صحیحین پر ہے۔اگرچہ انہوں نے اس کو روایت نہ کیا ہے۔ابن کثیر نے فرمایا زیادہ صحیح اس کا موقوف ہونا ہے۔اور اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝﴾ ''اور وہ اس کی محبت پر مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں کہ ہم تمہیں اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں تم سے بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔'' اور فرمایا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ ''کہ تم ہرگز نیکی کو نہ پا سکو گے حتیٰ کہ اس چیز سے خرچ کرو جسے تم پسند کرتے ہو۔'' اور فرمایا: ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۝﴾ ''اور اپنے نفسوں پر انہیں ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انہیں بھوک بھی ہو۔'' پہلی امت میں یہ تھا کہ انہوں نے مال کی محبت کے باوجود اسے خرچ کر دیا۔ غریبوں کو کھانا کھلایا اور اس آیت میں

یہ ہے کہ اپنی بھوک سے قطع نظر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ مرتبہ پہلے مرتبہ سے بڑا ہے۔

فائدہ: ناتے والوں سے رشتہ دار مراد ہیں۔ انہیں صدقہ دینا زیادہ مناسب ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ عام مساکین پر صدقہ کرنا ایک صدقہ ہے لیکن رشتہ داروں پر صدقہ کرنا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے۔ تیری نیکی وخیر خواہی کے لائق تر یہ رشتہ دار لوگ ہی ہیں۔ اول خویش بعد درویش. کلام مجید میں کئی مقامات پر یہی حکم ہے کہ قرابت داروں سے احسان کرو۔ یتیم وہ ہے جس کے لیے کوئی کمانے والا نہ ہو باپ دادا فوت ہو گئے ہوں۔ وہ خود کمزور نابالغ ہو نہ کما سکتا ہو۔ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ بلوغت کے بعد یتیمی نہیں ہے۔ [بروایت عبدالرزاق] مسکین وہ ہیں جن کے پاس کھانا پہننے اور رہنے کو بقدر ضرورت چیزیں مہیا نہ ہیں۔ انہیں اس قدر دینا چاہئے کہ جس سے ان کی ضرورت پوری ہو سکے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً آیا ہے وہ شخص مسکین نہ ہے جو گلی کوچوں میں پھرتا ہے۔ ایک دو کھجوریں یا ایک دو لقمے اسے پھیر دیتے ہیں۔ اصل مسکین وہ ہے جو ضرورت کی چیز میسر نہیں کر پاتا۔ نہ اس کو کوئی جانتا ہے کہ اسے کچھ صدقہ دے دے۔ ابن السبیل وہ ہے جس مسافر کا زاد راہ ختم ہو جائے اسے اس قدر مال دیا جائے کہ وہ اپنے شہر پہنچ جائے۔ اسی طرح وہ شخص جو کسی کی فرمانبرداری میں سفر کرنا چاہے، کہنے والے کو چاہئے کہ اسے آنے جانے کا خرچ دے دے۔ اس میں مہمان بھی داخل ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ابن السبیل وہ مہمان ہے جو مسلمانوں کے پاس اترتا ہے۔ تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ سائلین وہ لوگ ہیں وہ مانگتے پھرتے ہیں۔ انہیں زکوٰۃ وصدقات سے کچھ دے دے۔ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ سائل کا حق ہے اگرچہ گھوڑے پر چڑھ کر آئے۔ بروایت احمد وابوداؤد۔ اس حدیث کو اگرچہ بعض محدثین نے سخت ضعیف کہا لیکن یہ محض بے اصل نہ ہے۔ ابن کثیر نے اس کو نقل کیا مگر کچھ کلام نہ کیا۔ گردن چھڑانے کا مطلب یہ ہے کہ مکاتبین کو دے جن کو مکاتبت کی قیمت ادا کرنے کی رقم میسر نہ ہے۔ سورۃ براءت میں نیکی کی اقسام میں سے صدقہ کے تحت اس پر طویل بحث آئے گی۔ ان شاء اللہ. حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اے اللہ کے پیغمبر! کیا زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں کچھ حق ہے۔ آپ علیہ السلام نے یہ آیت تلاوت کی۔ [بروایت ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابن ماجہ، ترمذی] اقامت صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو اس کے وقت پر صحیح وضو سے رکوع و سجدہ اور خشوع وخضوع کو کما حقہ ادا کرے۔ زکوٰۃ سے یہ مراد ہے کہ مال پر سال گذرنے پر جس حساب سے زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ ادا کرے یا یہ کہ اپنے نفس کو برے اخلاق سے پاک وصاف کرے۔ جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿قَدْ

اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾ ”کہ جس نے نفس کو پاک کرلیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو خاک میں ملا دیا وہ نامراد ہوا۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا تھا:﴿هَلْ لَكَ اِلٰى اَنْ تَزَكّٰى ٥ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ٥﴾ کہ کیا تجھے رغبت ہے کہ تو پاک ہو اور میں تجھے تیرے رب کی طرف راہ دکھاؤں کہ پھر تو ڈر جائے۔“ اور اللہ کا یہ فرمان:﴿وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ﴾ ”اور بربادی ہے مشرکین کے لیے جو زکاۃ نہیں دیتے۔“ یہ معنی ابن کثیر نے ذکر کیے ہیں۔ اگرچہ بجائے خود صحیح و درست ہیں۔ لیکن اگلے معنی اس جگہ زیادہ مناسب ہیں۔ اسی لیے پھر یہ کہا کہ یا اس سے زکوٰۃ مالی مراد ہے۔ حضرت سعید بن جبیر اور مقاتل بن حبان کا بھی یہی قول ہے۔ ان مذکورہ لوگوں کو دنیا بطور بر و صلہ ہے۔ جس طرح حضرت فاطمہ بنت قیس کی حدیث میں گذر چکا ہے کہ:﴿اِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ﴾ وفائے عہد کا ذکر قرآن میں کئی جگہ آیا ہے۔ جیسے فرمایا:﴿اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ﴾ ”وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور وعدہ توڑتے نہ ہیں اس کے برعکس صفت نفاق ہے۔ جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ منافق کے تین علامتیں ہیں۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف کرے ۔جب امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ دوسری حدیث میں یوں ہے کہ جب عہد کرے تو توڑ دے۔ جب جھگڑا کرے تو گالی دے۔ سختی میں صبر کرنے سے یہ مراد ہے کہ محتاجی میں جس کو باساء کہتے ہیں میں صابر رہے۔ بیماری میں جسے ضراء کہتے ہیں اور دشمنوں سے ملاقات کے وقت جسے حین الباس کہتے ہیں میں استقامت اختیار کرے۔ صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ یہ تینوں حالتیں چونکہ بڑی سخت ہوتی ہیں اس لیے صبر کے مقام میں ان تینوں کو بطور خاص ذکر کیا۔ پھر فرمایا: کہ جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں حقیقت میں وہی لوگ قول و فعل میں سچے ہیں۔ جنہوں نے اللہ سے ڈر کے محارم کو چھوڑا اور طاعات کو بجالائے۔ اور جو یہ واؤان صفات میں آئی ہیں یہ اس پر دلیل ہیں کہ ان سب صفات کو جمع کرنا چاہئے۔ اگر ان میں سے ایک وصف حاصل کیا ہے تو نیکی صفت سے موصوف نہ ہوگا۔ کسی نے کہا کہ یہ انبیاء کا خاصہ ہے۔ ان کے غیر میں یہ اوصاف جمع نہیں ہو سکتے ہیں۔ کسی نے کہا بلکہ یہ تمام مومنین میں عام ہے۔ فتح البیان میں اسی کو زیادہ مناسب کہا ہے کیونکہ تخصیص پر کوئی دلیل نہ ہے۔

فائدہ: آیت میں پہلے پانچ چیزوں پر ایمان لانا بیان کیا، پھر چھ مقامات پر خرچ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ پھر نماز، زکوٰۃ، عہد اور صبر کا ذکر کیا ہے۔ اور صبر کے تین مقامات ذکر کیے ہیں۔ یہ کل پندرہ وصف ہوئے لیکن اگر

صبر کے تین علیحدہ مقامات ذکر کیے ہوں تو اٹھارہ مقام ہوئے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَى بِالْأُنثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٨﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٧٩﴾

مومنو! تم کو مقتولوں کے بارے میں قصاص (یعنی خون کے بدلے خون) کا حکم دیا جاتا ہے (اس طرح پر کہ) آزاد کے بدلے آزاد (مارا جائے) اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت اور اگر قاتل کو اس کے (مقتول) بھائی (کے قصاص میں) سے کچھ معاف کر دیا جائے تو (وارث مقتول کو) پسندیدہ طریق سے (قرارداد کی) پیروی (یعنی مطالبہ خون بہا) کرنا اور (قاتل کو) خوش خوئی کے ساتھ ادا کرنا چاہئے، یہ پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے آسانی اور مہربانی ہے جو اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لیے دکھ کا عذاب ہے۔ اور اے اہل عقل (حکم) قصاص میں (تمہاری) زندگانی ہے کہ (قتل و خون ریزی سے) بچو۔

فائدہ: یعنی ہر شخص کی قدر و حرمت دوسرے کے برابر ہے۔ اونچی ذات اور کم ذات والے اور دولت منداور فقیر کا کچھ فرق نہ ہے۔ جیسا کہ کفر میں معمول رہا ہے۔ اگر مقتول کے وارث قصاص موقوف کر کے مال پر راضی ہوں تو قاتل کو چاہئے کہ انہیں راضی کر لے۔ اور ان کا احسان مان کر خون بہا ادا کر دے۔ پہلی امتوں پر قصاص ہی مقرر تھا اس امت کے لیے معاف کرنا اور مال دے کر صلح کرنا بھی جائز ہوا۔ پھر جو دیت دے کر صلح کرنے کے بعد پھر قتل کرنے کا ارادہ کرے تو اس کے لیے بڑا عذاب ہو گا۔ پھر فرمایا کہ تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم اس سے بچو۔ یعنی حاکموں کو چاہئے کہ قصاص دلانے میں قصور نہ کریں تاکہ آئندہ خون بہنا ختم ہو۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ آیت بنی قریظہ و بنی نضیر کے متعلق نازل ہوئی۔ بنو نظیر جاہلیت میں بنو قریظہ سے جھگڑتے تھے۔ جب کسی نظری کے ہاتھ سے کوئی قرظی مارا جاتا تو وہ اس کے بدلے قتل نہ کیا جاتا بلکہ سو وسق کھجور دے کر بچ جاتا تھا۔ اور جب کوئی قرظی کسی نضیر کو مار دیتا تو وہ اس کے بدلے قتل کر دیا جاتا تھا لیکن اگر خون بہا پر راضی ہوتا تو دو سو وسق ادا کرتا۔ یعنی قرظی کو دو گنا دیت ادا کرنا پڑتی تھی۔ اللہ کریم نے حکم دیا کہ قصاص میں برابری کرو۔ جاہلیت کا یہی طریقہ آج کل اکثر جگہ پر رائج ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا اسلام سے کچھ پہلے جاہلیت میں عرب کے دو قبائل بڑی طویل لڑائی میں پھنسے

رہے۔ آپس میں کسی کو قتل کیا کوئی زخمی ہوا حتیٰ کہ غلاموں اور عورتوں کو بھی قتل کیا گیا اور بعض نے بعض سے بدلہ نہ لیا تھا کہ اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہوئے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر مال و متاع میں دست درازی کرتا، اس پر قسم کھائی کہ جب تک ہمارے غلام کے بدلے ان کا آزاد قتل نہ کیا جائے گا ہم راضی نہ ہوں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ آزاد کے بدلے آزاد غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت کو قتل کیا جائے۔ پھر آیت: ﴿اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ نے اس کو منسوخ کر دیا۔ یعنی نفس، نفس کے بدلے ہے۔ حضرت ابن عباس نے: ﴿وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی﴾ "کہ عورت کے بدلے عورت۔" کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ عورت کے عوض میں مرد کو قتل نہ کرتے تھے بلکہ مرد کو مرد کے بدلے اور عورت کو عورت کے بدلے قتل کرتے تھے۔ اللہ کریم نے یہ آیت نازل کی: ﴿اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ﴾ "کہ بلا شبہ نفس نفس کے بدلے اور آنکھ آنکھ کے بدلے۔" قصاص عہد میں آزاد لوگوں کو برابر کر دیا مرد ہوں یا عورتیں۔ اسی طرح غلاموں کو بھی۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے کہ یہ آیت: ﴿اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسَ ﴾ سے منسوخ ہے۔

مسئلہ: ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ قاتل کو غلام کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ اس لیے کہ آیتِ مائدہ عام ہے۔ ثوری، ابن ابی لیلیٰ، داؤد، علی، ابن مسعود، سعید بن میسب، ابراہیم نخعی، قتادہ و حکم کا یہی قول ہے۔ امام بخاری اور علی بن المدینی فرماتے ہیں کہ سید غلام کے عوض قتل کیا جائے گا۔ کیونکہ حضرت حسن کی حدیث میں جو سمرہ سے آئی ہے وہ عام ہے کہ: ﴿وَمَنْ قَتَل عبده قتلناه و من جدع دجعنا ہ و من خصاه خصيناه﴾ جمہور کہتے ہیں کہ آزاد غلام کے عوض قتل نہ کیا جائے گا کیونکہ وہ ایک سامان ہے۔ اگر خطا سے قتل ہو گیا تو اس میں دیت واجب نہ ہے اگر واجب ہے بھی تو اس کی قیمت ہی واجب ہے۔

اسی طرح جمہور کا قول یہ بھی ہے کہ مسلمان کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے گا کیونکہ بخاری شریف میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ: لَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ۔ اب اس کے خلاف کوئی حدیث یا تاویل صحیح نہ ہو گی۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ مسلمان کافر کے عوض قتل کیا جائے گا کیونکہ سورۃ مائدہ کی آیت عام ہے۔ گویا کہ وہ عام ہے مگر صحیح حدیث سے اس عام کی تخصیص ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کہ بلا شک ایک حدیث کو بے معنی چھوڑ دیا جائے۔ غالباً امام صاحب کو یہ حدیث نہ پہنچی ہو گی ورنہ وہ ہر

گزاس کے خلاف نہ کہتے۔

مسئلہ: حضرت حسن و عطاء نے فرمایا کہ مرد کو عورت کے عوض قتل نہ کیا جائے گا۔اس آیت کی دلیل سے جمہور اس کے خلاف موقف رکھتے ہیں۔اس کی دلیل سورۃ مائدہ کی آیت ہے جس کا حکم عام ہے۔اور جو رسول اللہ ﷺ کا فرمان گرامی ہے۔((المسلون تتکا فا دماء ھم)) لیث نے کہا اگر شوہر نے اپنی بیوی کو مار دیا تو وہ صرف بیوی کے عوض قتل نہ کیا جائے گا۔

فائدہ: ائمہ اربعہ و جمہور کے مذہب کے موافق ایک شخص کے عوض ایک جماعت کو بھی قتل کیا جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں سات اشخاص نے ایک لڑکی کو قتل کیا۔(ان کو قصاصاً قتل کیا گیا)اور حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر پورے صفاء والے بھی اس قتل کی واردات میں ملوث ہوتے تو میں سب کو قتل کروادیتا۔ اور ان کے زمانہ میں کسی صحابی نے اس سے مخالفت نہ کی۔ گویا یہ حکم بمنزلہ اجماع ہے۔امام احمد سے ایک روایت میں یوں ہے کہ ایک شخص کے بدلے ایک جماعت کو قتل نہ کیا جائے گا بلکہ ایک نفس کے بدلے ایک نفس ہی قتل ہو گا۔ابن المنذر نے معاذ ،ابن زبیر ،عبدالملک بن مروان ،زہری ،ابن سیرین ،حبیب بن ابی ثابت سے بیان کر کے لکھا ہے کہ یہی بات زیادہ درست ہے اور جس نے ایک شخص کے عوض ایک جماعت کو قتل کرنا جائز کہا۔اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہے۔اور جب ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے یہ قول ثابت ہوا تو صحابہ کی رائے کا اختلاف محل غور ہو گا۔قصاص ،برابری و یکسانیت کو کہتے ہیں۔یعنی قتل و دیت و زخم وغیرہ میں۔سو شافعی اور مالک کے نزدیک قاتل کو اسی چیز سے قصاصاً قتل کیا جائے جس سے اس نے مقتول کو قتل کیا۔ابو حنیفہ و احمد کے نزدیک ایک روایت میں یوں ہے کہ صرف تلوار سے قتل کیا جائے کسی اور چیز سے نہیں اور یہی مذہب قوی ہے۔

فائدہ: حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ بھائی کو معاف کر دینا یہ ہے کہ قتل عمد میں جبکہ وہ قصاص لینے کا حق دار ہے اس صورت میں دیت لے لے۔ تابعین کی ایک جماعت کا یہ بھی قول ہے اور دینے والا پوری دیت ادا کرے۔حضرت ابن عباس کا لفظ یہ ہے کہ دیت احسان سے دی جائے یعنی قصاص سے درگذر کو احسان سمجھے تابعین کے ایک گروہ کا یہی قول ہے۔ائمہ اربعہ کہتے ہیں کہ قصاص کے ولی کو یہ حق نہیں کہ قاتل کی رضا کے بغیر دیت لے لے اور خون بہا معاف کر دے جبکہ باقی اھل علم کہتے ہیں کہ یہ عفو جائز ہے۔ اگرچہ قاتل راضی نہ بھی ہو۔ایک گروہ سلف کا یہ مذہب ہے کہ عورت کو حق عفو حاصل نہیں جبکہ دوسرے

نے کہا اسے معاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ پھر اللہ کریم نے فرمایا کہ جو ہم نے قتل عمد میں دیت کا حکم رکھا ہے یہ تمہارے لیے تخفیف و رحمت ہے۔ ورنہ پہلی امتوں پر قتل یا بالکل عفو واجب تھا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اللہ کریم نے بنی اسرائیل پر قصاص فرض کیا تھا ان میں عفو نہ تھا۔ اس امت پر قتل عمد میں دیت قبول کرنے کی آسانی فرمادی۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اللہ کریم نے اس امت پر رحم کیا انہیں دیت کا مال لینا جائز کہا۔ ان سے پہلے لوگوں میں سے یہ کسی کے کے لیے حلال نہ تھا تورات والوں کو قصاص یا عفو کا حکم تھا۔ دیت کا حکم نہ تھا۔ انجیل والوں میں صرف عفو تھا انہیں صرف اسی کا حکم دیا گیا تھا۔ جبکہ اس امت پر قصاص ، عفو، دیت سب کچھ جائز رکھا۔ تابعین کی جماعت کا بھی یہی قول ہے۔ پھر جس نے دیت لینے کے بعد قتل کیا وہ عذاب کا مستحق ٹھہرے گا۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، عطاء، عکرمہ، حسن، ربیع وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ کہ جو مارا گیا یا زخمی ہوا اس کو تین امور کا اختیار ہے۔ قصاص لے، دیت لے یا معاف کردے۔ اگر کوئی چوتھا کام کرنے لگے تو اس کے ہاتھ روک لو۔ یعنی وہ کام نہ کرنے دو، پھر جس نے اس بات کے بعد زیادتی کی وہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں گیا۔ [بروایت احمد] سمرہ سے حضرت حسن کا لفظ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دیت لینے کے بعد قتل بھی کردیا تو میں اس کو معاف نہ کروں گا یعنی اس سے دیت قبول نہ کروں بلکہ قتل ہی کروں گا۔

فائدہ: قصاص کے مقرر ہونے میں جو بڑی حکم ذکر فرمائی وہ حکمت یہ ہے کہ اس سے ناحق جانوں کا نقصان نہ ہوگا۔ جب قاتل کو یہ علم ہو کہ ضرور وہ اس کے بدلے میں قتل ہوگا تو ضرور وہ حتی الامکان قتل سے باز رہے گا۔ جب وہ اس عمل سے باز رہے گا تو جانیں بچ گئیں۔ پہلی کتابوں میں لکھا ہے: ((القتل انفی للقتل)) "کہ قتل کرنا (قصاصاً) قتل کے رواج کو خوب ختم کرتا ہے۔" کلام پاک کیوں نہ معجزہ ہو اس میں حکیم حقیقی نے اسی مضمون کو اس قدر فصاحت و خوبصورت سے ادا کیا۔ فرمایا: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ﴾ "کہ قصاص بجائے خود زندگی ہے۔" ابو العالیہ نے کہا کہ اللہ کریم نے قصاص کو زندگی کہا اور بہت سے شخص قتل کے ارادے سے اس لیے رک جاتے ہیں کہ بدلے میں انہیں بھی قتل ہونا پڑے گا۔ سلف کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ اہل عقل کو اس لیے مخاطب کیا کہ عقل کے بغیر یہ حکمت سمجھ نہیں آسکتی۔ عقل ہی گناہوں کے ترک اور محارم سے باز رکھتی ہے۔ اسی لیے تو عقل کو حجر کہتے ہیں۔ تقویٰ ایسا لفظ ہے جو طاعات کی بجا آوری اور منکرات کے ترک جامع ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے تو اگر وہ کچھ مال چھوڑ جانے والا ہو تو ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کر جائے (اللہ سے) ڈرنے والوں پر یہ ایک حق ہے۔ جو شخص وصیت کو سننے کے بعد بدل ڈالے تو اس (کے بدلنے) کا گناہ انہیں لوگوں پر ہے جو اس کو بدلیں اور بے شک اللہ سنتا جانتا ہے۔ اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے (کسی وارث کی) طرف داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو اگر وہ (وصیت کو بدل کر) وارثوں میں صلح کرادے تو اس پر کچھ گناہ نہیں بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم والا ہے۔

فائدہ: جاہلیت کی قبیح رسوم میں سے ایک رسم حق تلفی یہ بھی تھی کہ مردے کے وارث صرف اولاد ہوا کرتے تھے اور اولاد میں بھی صرف بیٹا حق دار ہوتا تھا۔ اگرچہ اللہ کریم نے اولاد کو پہلا حق دیا مگر مرنے والے کو چاہئے کہ اپنے سامنے ہی وہ قرابت داروں کو ان کے حصے دے جائے۔ پھر اگر مردے کی وصیت کے باوجود ورثاء نے ان کے حصے انہیں نہ دیئے تو مردے پر کچھ گناہ نہیں۔ خلاف وصیت عمل کرنے والوں پر بوجھ ہوگا۔ پھر اگر کسی نے دیکھا کہ مردے نے وصیت صحیح نہ کی اولاد کو بہت تھوڑا حصہ ملا ہے تو دوسروں کو سمجھا کر صلح کرادی اور حق دار کو اس کا صحیح حق دلوادیا۔ تو ایسی وصیت بدلنا گناہ نہ ہے۔ پہلے اللہ کریم نے یہی حکم دیا تھا۔ پھر سورۃ نساء میں ان کے حصے مقرر کردیئے۔ اب ورثاء کے حق میں مردے کو وصیت کرنا ختم ہوگیا۔

فائدہ: ابن کثیر فرماتے ہیں یہ آیت اس مدعا پر دلالت کرتی ہے کہ والدین اور اقربین کے لیے مردے کو وصیت کرنا چاہئے لیکن جب وراثت کے حصے مقرر ہوگئے تو یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ ورثاء کے حصے اللہ کی تقسیم سے فرض ہوگئے۔ مردے کی وصیت کے بغیر یہ لوگ اپنے حصہ لازمی طور پر لے سکتے ہیں۔ موصی کا احسان اٹھانا ضروری نہ ہے۔ اسی لیے حضرت عمر بن خارجہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبے میں فرمایا اب حق دار کو اللہ نے حق دے دیا ہے۔ مرنے والے کو وصیت کرنا ضروری نہ ہے۔ بروایت اہل سنن۔ حضرت ابن عباس ایک دن بیٹھے سورۃ بقرہ پڑھ رہے تھے جب اس آیت پر پہنچے تو فرمایا کہ یہ منسوخ ہو چکی ہے۔ ان کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ ماں باپ کی موجودگی میں کوئی اور وارث نہ ہوتا تھا۔ ہاں اگر مردہ کسی کے متعلق کوئی وصیت کر جائے

۔اس پر اللہ کریم نے آیت میراث نازل فرمائی۔ماں باپ کے حصے مقرر کر دیئے اور غیر مقرر شدہ اقربین کی وصیت کو بر قرار رکھا۔یعنی تہائی مال میں ان کا تیسرا۔ لفظ یہ ہے کہ اس منسوخ آیت کی ناسخ یہ آیت ہے:
﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا﴾ ''کہ مردوں کے لیے بھی اس سے حصہ ہے جو والدین اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا اور عورتوں کے لیے بھی اس سے حصہ ہے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا، وہ تھوڑا ہو یا زیادہ مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔''سلف کی ایک بڑی جماعت جن کے نام ابن کثیر نے ذکر کیے ہیں نے کہا کہ آیت مذکورکی ناسخ یہی آیت ہے۔ رازی سے تعجب ہے کہ انہوں نے ابو مسلم اصفہانی سے حکایت کیا کہ یہ آیت منسوخ نہ ہے بلکہ آیت مواریث اس کی تفسیر ہے۔یعنی جو وصیت اللہ نے ذکر کی وہ وصیت تم پر فرض ہے جو کہ وراثت والدین اور اقربین کی بابت ہے۔اور وہ وصیت یہ ہے: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ﴾ ''کہ اللہ تمہیں تمہاری اولادوں کے متعلق وصیت کرتا ہے۔''پھر کہا اکثر مفسرین وفقہاء کا یہی قول ہے۔ہاں بعض نے یہ کہا کہ یہ آیت وارث کے حق میں منسوخ ہے۔اور غیر وارث کے حق میں ثابت ہے۔حضرت ابن عباس، حسن، مسروق، طاؤس اور ضحاک وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حضرت سعید بن جبیر، ربیع، قتادہ ومقاتل بن حبان کا بھی یہی قول ہے۔ مگر ان کے قول کے موافق اس کا نام نسخ نہیں رکھا جاتا جیسا کہ ہماری قدیم اصطلاح ہے اس لیے کہ آیت مواریث نے چند افراد کا ذکر کر کے وصیت کا حکم کلی طور پر منسوخ نہیں کیا کیونکہ اقربین کا لفظ عام ہے۔وارث وغیر وارث سب کو شامل ہے۔پھر اس کی تخصیص سے وارثوں کا حکم اٹھ گیا کیونکہ ان کا حصہ مقرر ہو چکا ہے۔غیر وارث کا حکم باقی رہے گا جیسے پہلی آیت۔اس پر دلالت کرتی ہے لیکن یہ بات تب تسلیم ہو گی جب کہنے والے کا یہ موقف ہو کہ ابتدائے اسلام میں وصیت مستحب تھی پھر منسوخ ہو گئی۔ لیکن اگر موقف وصیت کی فرضیت کا مانا جائے جیسا کہ سیاق آیت اس پر دلیل ہے تو بھی آیتِ میراث سے اس کا نسخ متعین ہو جائے گا۔اکثر مفسرین وفقہاء کا یہی مذہب ہے کیونکہ والدین واقربین (ورثاء) کے حق میں وصیت کرنا بالاجماع منسوخ ہے بلکہ حدیث((ان اللہ قد اعطیٰ کل ذی حق حقه فلا وصية لوارث)) سے بھی اس کی ممانعت واضح ہوتی ہے۔پھر آیت میراث ایک مستقل حکم ہے جس کو اللہ نے اھل فروض وعصبہ کے لیے فرض کر دیا ہے۔ آیت باب کا حکم بالکل ختم کر دیا۔رہے وہ اقارب جن کے لیے حصہ مقرر نہ ہے تو مردے کے لیے مستحب ہے کہ ثلث مال سے بطریق وصیت کچھ انہیں بھی دلوایا جائے۔تاکہ آیت وصیت اور اس کے شمول سے مطابقت و

استیناس باقی رہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً آیا ہے کہ کسی مسلمان کو لائق نہ ہے کہ اس کے پاس وصیت کے لائق کوئی چیز ہو کہ اس پر دوراتیں بسر ہوں مگر ان کے متعلق اس کے پاس وصیت لکھی ہوئی تیار ہونی چاہئے۔ پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب سے میں نے یہ حدیث سنی ہے مجھ پر کوئی رات نہ گذری مگر میری وصیت میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہے۔ اور اقارب سے احسان کی بابت بہت سی آیات واحادیث مروی ہیں۔

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس جگہ لفظ خیر سے مال مراد ہے۔ ایک جماعت سلف کا بھی یہی قول ہے اور مال کو خیر کہنے سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ طیب مال خواہ زیادہ ہو یا کم اس میں وصیت کرنا مستحب ہے۔ بعض نے وصیت کے استحباب کو زیادہ مال کے ساتھ خاص کیا ہے۔ پھر کثیر کی مقدار میں اختلاف ہوا کہ وہ کتنا مال ہو جس پر کثیر کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ قریش کا فلاں شخص فوت ہو گیا ہے اور اس نے تین یا چار سو دینار چھوڑے لیکن اس میں وصیت نہ کی۔ فرمایا کوئی چیز نہیں۔ اللہ نے تو وصیت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ مال خیر چھوڑ جائے یعنی کثیر مال چھوڑے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی قوم کے کسی شخص کی عیادت کو تشریف لے گئے اس نے کہا: کیا میں وصیت کروں فرمایا اللہ نے مال کثیر میں وصیت کا حکم دیا ہے تم نے تو تھوڑا سا مال چھوڑا ہے وہ اپنی اولاد کو دے جاؤ۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جس نے ساٹھ دینار چھوڑے اس نے مال کثیر نہ چھوڑا۔ حضرت طاؤس نے فرمایا: جس نے اسی دینار نہ چھوڑے گویا اس نے کچھ نہ چھوڑا۔ حضرت قتادہ نے کہا جس نے ہزار دینار یا اس سے اوپر مال چھوڑا اس پر مال کا لفظ بولا جائے گا۔ کسی نے سات سو دینار کسی نے پانچ سو دینا کو مال کہا۔ غرضیکہ اکثر کا قول یہ ہے کہ مال کثیر کو خیر کہتے ہیں۔ مال قلیل خیر نہ ہے۔ معلوم ہوا جس کے پاس تھوڑا سا مال ہے اس پر وصیت واجب نہ ہے۔ پھر اگر میت مقروض ہے یا اس کے پاس کسی کی امانت ہے تو بالاتفاق اس پر وصیت واجب ہے اور جو ان مذکورہ حالات سے خالی ہے اس پر وصیت واجب نہ ہے۔ وہ فقیر ہو یا غنی ہو مگر ایک گروہ کے نزدیک یہ ہے کہ اگرچہ غنی شخص امین یا مقروض نہ بھی ہو تو بھی وصیت اس پر واجب ہے۔ اوپر جو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے وہ اسی موقف پر دلیل ہے۔

فائدہ: حضرت حسن نے کہا معروف سے یہ مراد ہے کہ اقرباء کے حق میں ایسی وصیت کرے جس سے ورثاء کے لیے نہ تنگی ہو نہ اسراف ہو اور نہ انہیں محروم کرنا مقصد ہو۔ جس طرح صحیحین میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی وایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا میرے پاس مال ہے مگر صرف ایک بیٹی کے سوا میرا

کوئی وارث نہ ہے اور فرمایا کیا میں دو تہائی مال کی وصیت کر جاؤں۔ فرمایا: نہیں۔ کہا: آدھے مال کی۔ فرمایا: نہیں۔ کہا: ایک تہائی مال کی وصیت کر جاؤں۔ کہا ہاں ایک تہائی بھی بہت ہے۔ تو اپنے رشتہ داروں کو غنی چھوڑ جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ تو انہیں ضرورت مند چھوڑ جائے اور وہ لوگوں سے مانگتے پھریں۔ یہ بھی بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اگر لوگ تہائی سے چوتھائی پر ٹھہر جائیں تو کیا اچھا ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ثلث مال کی وصیت کر لو اور ثلث بھی زیادہ ہے۔ حنظلہ بن جذیم بن حنفیہ نے کہا میرے دادا حنظلہ نے ایک یتیم کی سرپرستی کی اس کے لیے جاتے ہوئے سو اونٹ کی وصیت کی یہ بات اس کے بیٹوں پر شاق گذری انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا۔ حنظلہ نے کہا جی ہاں میں نے سو اونٹ کی وصیت کی ہے جن اونٹوں کو مطیبۃ کہتے ہیں وہ سواری کے کام آتے ہیں۔ فرمایا نہیں، نہیں، نہیں۔ صدقہ پانچواں حصہ ہوتا ہے ورنہ دسواں ورنہ پندرھواں ورنہ بیسواں، ورنہ پچیسواں، ورنہ تیسواں، ورنہ پینتیسواں اور اگر اس سے بھی زیادہ دے تو چالیسواں حصہ دے۔ [الحدیث بطولہ ،بروایت احمد]

فائدہ: اور جس نے درست وصیت کو بدل دیا کم یا زیادہ کیا تو بدلنے والوں پر ہی اس کا گناہ ہو گا۔ وصیت کرنے والا بری ہو گا اور اس میں وصیت کو چھپانا بطریق اولیٰ داخل ہو گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا کہ میت کا اجر وصیت اللہ پر رہا بدلنے والوں کا گناہ انہیں پر ہو گا۔ اللہ موصی کی وصیت کو بھی جانتا ہے اور بدلنے والوں سے بھی خوب واقف ہے۔ حضرت ابن عباس، ابو العالیہ، مجاہد، ضحاک، ربیع و سدی نے کہا کہ جنف سے خطا مراد ہے۔ یہ لفظ ہر قسم کی خطا کو شامل ہے جیسے کسی واسطہ یا وسیلہ سے ارث کو زیادہ کر دے مثلاً یوں کہے کہ فلاں چیز فروخت کر دینا یا میرے نواسے کو اتنا مال دے دینا۔ یا اسی طرح کوئی اور بات کہہ جانا۔ یہ خطا چاہے بطور ہمدردی و شفقت و بدون عمل کے طریق سے ہو بغیر ضرر کے ہو یا گناہ کی غرض سے ہو۔ اس صورت میں وصی کو یہ لائق ہے کہ اس فیصلے کو اس طرح سے تبدیل کرے کہ وصیت کو طریقۂ شرعی پر رکھے اور جو بات اس کی وصیت کے قریب قریب ہو شریعت کی روشنی میں اس کا فیصلہ کرے۔ تاکہ موصی کی وصیت کا مقصد اور طریقۂ شرعی بیک وقت قائم ہو سکیں۔ اس طرح کی اصلاح و موافقت تبدیل کے حکم میں نہ ہو گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وصیت میں جنف کبائر سے ہے۔ [بروایت ابن مردویہ] ابن کثیر فرماتے ہیں اس حدیث کے مرفوع ہونے میں نظر ہے اس باب میں سب سے بہتر حدیث وہ ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان گرامی ہے کہ ایک آدمی ستر برس تک اہل خیر کا سا کام کرتا ہے مگر وصیت میں ظلم کر جاتا ہے تو اس کا خاتمہ عمل بد پر ہوتا ہے تو وہ دوزخ میں چلا جاتا ہے اور کوئی آدمی ستر برس تک اہل شر کا سا عمل کرتا ہے لیکن قریب اجل وصیت میں انصاف کر جاتا ہے تو اہل جنت میں سے ہو جاتا ہے۔ اگر تمہارا دل چاہے تو یہ آیت

پڑھ لو: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا۔ کہ یہ اللہ کی حدود ہیں انہیں مت پھلانگو۔ [بروایت عبدالرزاق] وصیت واحکام وصیت کے بیان میں ابوالنصر میر علی حسن خان سلمہ اللہ تعالیٰ نے رسالہ "تخریج الوصاء" بڑا عمدہ لکھا ہے۔

فائدہ: فتح البیان میں لکھا ہے اس آیت میں اس شخص کے لیے بڑی سخت وعید ہے جو وصیت میں ظلم و نقصان کو شامل کر کے اسے خراب کر دے۔ قرطبی نے کہا اگر کوئی ایسی وصیت کر جائے جو جائز نہ ہے جیسے شراب کی یا سور کی یا اور کسی معصیت کی تو اس کو بدلنا جائز ہے۔ اس کو اس طرح جاری نہ کرنا چاہیئے۔ جس طرح تہائی مال سے زیادہ دینا بھی غیر جائز ہے۔ بقول ابو عمرو، پھر بدلنے والے یا تو وصی ہوں گے یا جنہوں نے کتابت قسامت یا شہود میں اس کا انکار کیا اس کو بدل دیا مثلاً گواہی پوشیدہ رکھی یا بدل دی۔ یا پھر تبدیل کرنے والا غیر وصی ہو گا۔ اس جگہ ایک اشکال ہے کہ کلام سابق جس میں والدین اور اقرباء ورثاء کے حق میں وصیت کا حکم منسوخ ٹھہرا اور تبدیل وصیت کا مضمون آخر آیت تک برقرار رہا اب تک اسی پر عمل جاری ہے۔ اس صورت میں آیتِ محکمہ کی ضمیر منسوخہ پر کسی طرح عائد ہو گی۔ سلیمان جمل نے کہا یہ بات قابل غور ہے میں نہیں جانتا کہ کسی مفسر نے اس اشکال پر آگاہ کیا ہو۔ لیکن یہ اشکال تو اس شخص کی بات پر لازم آتا ہے جو وصیت مذکور کے نسخ کا قائل ہے۔ حالانکہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ایک جماعت اس آیت کو محکم بتاتی ہے جب یہ محکم ٹھہری تو اس میں نہ کوئی اشکال قابل غور رہا نہ تنبیہ کی ضرورت رہی۔ اسی طرح فتح البیان میں بھی ہے لیکن قوی قول یہی تھا کہ یہ آیت محکم نہ ہے بلکہ منسوخ ہے۔ اس صورت میں کوئی امر اس سے مانع نہیں کہ اس آیت کا نصف محکم ہو اور نصف منسوخ ہو جیسا کہ بعض آیات حکماً منسوخ ہیں تلاوۃً باقی ہیں اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ واللّٰہُ اعلم۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

مومنو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم پرہیزگار بنو۔ (روزوں کے دن) گنتی کے چند روز ہیں تو جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کا شمار پورا کر لے، اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں اور جو کوئی شوق سے نیکی کرے تو اس کے حق میں زیادہ اچھا ہے اور اگر سمجھو تو روزہ رکھنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

فائدۃ: پہلے ہی حکم نازل ہوا تھا کہ کوئی بیمار و مسافر روزہ نہ رکھے تو جب چاہے تو اس کی قضا کر لے اور اگر بغیر عذر کے کوئی شخص روزہ نہ رکھے تو بالفعل ایک روزے کے بدلے ایک مسکین فقیر کو کھانا کھلا دے۔ اور اگر روزہ رکھ لیں تو وہ بھی بہتر ہے لیکن بعد والی آیت نے تندرستوں اور تیمیوں کو اس حکم سے خارج کر دیا۔ صرف بیمار اور مسافر کے لیے رخصت باقی رہی۔ ((کذا فی موضح القرآن))

فائدۃ: اس آیت میں اللہ کریم نے مومنین کو روزے کا حکم دیا کہ خالص اللہ کی رضا کے لے کھانے پینے ، جماع اور اخلاق بد سے رک جاؤ۔ اسی میں پاکیزگی ہے اور یہ روزہ صرف تمہی پر فرض نہیں کیا گیا بلکہ تم سے پہلے گذری ہوئی امتوں پر بھی فرض تھا۔ تمہیں اس کار خیر میں ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ بلکہ ان سے بڑھ کر تم اس نیکی میں کوشش کرو۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَ مِنْهَاجًا ○ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَاحِدَةً وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْمَا اٰتَاكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ ”کہ تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور رستہ مقرر کر دیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک جیسے کر دیتا لیکن اس لیے کہ تمہیں اس چیز میں آزمائے جو اس نے تمہیں دی ہے۔ پھر نیکیوں میں آگے نکل جاؤ۔“ اس لیے کہ روزے میں جسم کو پاک صاف بھی کرتا ہے اور شیطانی رستوں کو بھی بند کرتا ہے۔ اسی لیے صحیحین میں آیا ہے کہ اے نوجوانوں کے گروہ! جو تم میں سے نکاح کی طاقت رکھتا ہے وہ نکاح کر لے اور جو نہیں طاقت رکھتا وہ روزے رکھے یہ اس کے لیے خصی ہونا ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ روزہ کوئی ہمیشہ کے لیے فرض نہ ہے کہ اس سے طبیعت اکتا جائے اور اس کی بجا آوری میں کمزوری آجائے بلکہ یہ صرف گنتی کے چند دن ہیں۔ شروع اسلام میں ہر مہینے میں تین دن روزہ رکھا جاتا تھا۔ پھر رمضان کی فرضیت سے وہ منسوخ ہو گیا۔ حضرت معاذ، ابن مسعود، ابن عباس، عطاء، قتادہ و ضحاک نے کہا کہ زمانۂ نوح علیہ السلام سے اب تک ہر مہینے میں تین روزے رکھنے کا دستور تھا۔ لیکن رمضان کی فرضیت سے وہ ختم ہو گیا۔ مگر حضرت حسن بصری نے کہا واللہ! ہر امتِ گذشتہ پر پورے ایک ماہ کے روزے فرض تھے جیسا کہ ہمارے ہاں ہے۔ ایام معدودات سے عدد معلوم مراد ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ رمضان کے روزے اللہ نے پہلی امتوں پر بھی فرض کیے تھے۔ [الحدیث بطولہ بروایت ابن ابی حاتم] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا اگلی امتوں پر یہ بھی فرض تھا کہ شام کو جب نماز پڑھ کر سو جائیں تو ان پر کھانا پینا اور بیوی سے ملنا آئندہ رات تک حرام ہو جاتا تھا۔ صحابہؓ و تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ ابن عباس نے فرمایا کہ اس جگہ اگلوں سے اھل کتاب مراد ہیں۔ اسی طرح شعبی، سدی اور عطاء خراسانی سے بھی مروی ہے۔ پھر اللہ کریم نے ابتدائے

اسلام کا ذکر فرمایا کہ اس زمانے میں مرض و سفر کی حالت میں روزہ قضا کرنا درست تھا۔ اور جو تندرست طاقت ور ہوتا اسے اختیار ہوتا کہ چاہے روزہ رکھے یا روزہ چھوڑ دے اور ہر دن کے بدلے ایک فقیر کو کھانا کھلا دیا کرے۔ یا ایک سے زائد مساکین کو کھلا دے۔ لیکن روزہ رکھنا افضل ہے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، طاؤس وغیرہ سلف کا یہی قول ہے۔ امام احمد نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ نماز روزے نے تین حال تبدیل کیے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے۔ سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ پھر اللہ کریم نے کعبہ کا حکم دے دیا۔ یہ ایک حال تبدیل ہوا، پھر دوسری دفعہ نماز کے لیے لوگ ایک دوسرے کو بلایا کرتے تھے ، حتیٰ کہ ناقوس وغیرہ بجانے کی بات طے ہونا چاہتی تھی کہ عبداللہ بن زید نے خواب میں اذان سنی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کو جاری کیا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے خواب دیکھا تھا۔ تیسری حالت یہ تبدیل کی کہ جب اس حال میں نماز تک آتے کہ رسول اللہ ﷺ کچھ رکعات پڑھ چکے ہوتے تو وہ اشارے سے کسی نمازی سے پوچھتے کہ کتنی رکعت گذر چکی ہیں پھر وہ اشارے سے بتا تا تو اتنی نماز پوری کر کے پھر جماعت کے ساتھ ملتے تھے۔ حضرت معاذؓ آئے انہوں نے کہا کچھ نہیں جو رسول اللہ ﷺ کر رہے ہوں گے وہی رکن ہم ادا کریں گے پھر جو ہم سے چھوٹ گئی ہو گی وہ بعد میں پوری کریں گے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ تمہارے لیے معاذؓ نے یہ طریقہ نکالا ہے اسی کو اختیار کرو۔ یہ نماز کی تین حالتیں ہوئی۔ رہا روزے کا حال تو جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے ایک مہینے میں تین روزے اور عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے۔ پھر اللہ کریم نے آیتِ باب نازل کی اس پر یہ حکم ثابت ہوا کہ جس کا دل چاہے وہ روزہ رکھ لے ور جس کا دل نہ چاہے وہ ایک روزے کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اس کے بعد آیت: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ﴾ "کہ رمضان کا مہینہ وہ ہے .... "نازل ہوئی تو صرف بیمار اور مسافر کے لیے رخصت رہی ہر تندرست پر روزے رکھنا فرض ہوا، اور جو اتنا بوڑھا ہو جو روزے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو وہ ہر روزے کے بدلے ایک فقیر کو کھانا کھلا دے۔ پھر تیسری حالت یہ تبدیل ہوئی کہ جب تک رات کو نہ سوتے تب تک کھاتے پیتے اور عورتوں سے جماع کرتے لیکن جب سو جاتے تو ہر کام سے رک جاتے۔ ایک انصاری صدمہ نامی روزے رکھتا، سارا دن مزدوری کرتا، رات کو گھر آیا عشاء کی نماز پڑھ کر سو گیا۔ نہ کچھ کھایا نہ پیا اور صبح بھی روزے کی حالت میں اٹھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو سخت تکلیف میں دیکھ کر حال پوچھا اس نے یہ ساری بات ذکر کی۔ اور دوسری طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ سو کر اٹھنے کے بعد جماع کر بیٹھے، پھر آنحضرت ﷺ سے یہ حال ذکر کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى نِسَاءِ كُمْ﴾ "کہ

تمہارے لیے روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں کی طرف جانا حلال کیا گیا ہے۔" اس حدیث کو ابو داؤد نے سنن میں حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ عاشوراء کا روزہ فرض تھا لیکن رمضان کی فرضیت سے اس کی فرضیت منسوخ ہو گئی۔ جس کا دل چاہتا وہ رکھتا جس کا دل نہ چاہتا وہ نہ رکھتا۔ اس کو بخاری رحمہ اللہ نے ابن عمر و اور ابن مسعود سے بھی روایت کیا ہے۔

فائدہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اسلام کی ابتداء میں جو چاہتا روزہ رکھ لیتا لیکن جو نہ چاہتا نہ رکھتا اور اس کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا۔ بخاری نے سلمیٰ بن اکوع سے اتنا زیادہ کیا ہے کہ پھر اس کے بعد والی آیت نازل ہوئی۔ جس نے پہلے والا حکم منسوخ کر دیا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان بھی یہی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اسی طرح حضرت عبداللہ نے بھی کہا کہ آیت:﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ "کہ جو تم میں سے اس مہینے میں حاضر ہو اسے چاہئے کہ وہ اس کے روزے رکھے۔" اس کی ناسخ ہے۔ ہاں بخاری میں حضرت ابن عباس سے آیا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہ ہے بلکہ بوڑھے مرد و عورت کے لیے ہے۔ جن کو روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہے وہ ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ یہی روایت حضرت ابن عباس سے کئی طریق سے مروی ہے۔ ابن ابی یعلی فرماتے ہیں کہ میں رمضان میں حضرت عطاء کے پاس گیا۔ تو وہ کھانا کھا رہے تھے انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت: فَمَنْ شَهِدَ اتری اس نے پہلے حکم کو منسوخ کر دیا مگر بوڑھا شخص جس کی صحت کی امید نہ ہو وہ اگر چاہے تو ہر دن ایک مسکین کو کھانا کھلا دے اور خود روزہ نہ رکھے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حاصلِ کلام یہ ہوا کہ صحیح مقیم کے حق میں یہ منسوخ ہو گئی ہے اس پر روزہ واجب ہے۔ اللہ کے اس قول کی وجہ سے:﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ﴾ رہا کمزور بوڑھا جو روزہ نہیں رکھ سکتا وہ افطار کر لے اس پر قضاء نہ ہے۔ اس لیے کہ اس کی کمزوری تو دن بدن بڑھتی ہے اسے اتنی صحت کہاں ملے گی کہ وہ خود قضا کر سکے۔ رہی یہ بات کہ اگر وہ طاقت رکھتا ہو تو ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلانا واجب ہے یا نہیں؟ تو صحیح موقف جس کو جمہور نے اختیار کیے ہوئے ہیں وہ یہ ہے کہ اس پر کھانا کھلانا واجب ہے۔ جس طرح کہ حضرت ابن عباس وغیرہ سلف نے یطیقونہ کی تفسیر میں فرمایا:((ای یتجشمونه)) حضرت ابن مسعود کا بھی یہی قول ہے۔ بخاری نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ بخاری کا لفظ یہ ہے کہ جو بوڑھا روزے کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ کھانا کھلا دے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جب بوڑھے ہو گئے تو ایک یا دو سال ہر روز ایک مسکین کو گوشت روٹی کھلائی اور خود روزہ افطار کیا۔ جس بات پر امام بخاری ہیں اس کو ابو یعلی موصلی نے مسند کیا ہے۔ یعنی ایوب بن ابی تمیمہ نے کہا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ روزہ

رکھنے سے کمزور ہو گئے، انہوں نے ثرید کا ایک ہزار برتن بنوادیا اور تیس مسکینوں کو کھلا دیا۔ یہی روایت انس کئی طریق سے مروی ہے۔ حامل و مرضع کو بھی اسی حکم میں رکھا ہے کہ جب انہیں اپنی یا بچے کی جان کو نقصان کا خدشہ ہو تو روزہ نہ رکھیں۔ فدیہ دیں اور قضاء کریں۔ بعض نے کہا صرف فدیہ دیں قضاء نہ کریں۔ بعض نے کہا فدیہ کے بغیر صرف قضاء واجب ہے کسی نے کہا وہ روزہ چھوڑ دیں نہ ان پر فدیہ ہے نہ قضاء ہے۔

فائدہ: روزہ ایک قدیم عبادت ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آب تک فرض رہی ہے اللہ کریم نے کسی امت کو روزے کی فرضیت سے فارغ نہ رکھا۔ یہ بات نہ ہے کہ صرف مسلمانوں پر فرض ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ روزے کی مقدار اور وقت میں فرق رہا ہو۔ اہل کتاب پر تو یہی رمضان کا روزہ فرض تھا۔ مگر انہوں نے اس کو بدل ڈالا۔ ابن حنظلہ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ نصاریٰ پر رمضان کا روزہ فرض تھا۔ اتفاقاً ان کا بادشاہ بیمار ہوا انہوں نے کہا اگر اللہ اس کو شفا دے گا تو ہم دس روزے رکھیں گے۔ پھر دوسرے شخص بادشاہ ہوا اس نے گوشت کھایا اس پر اس کا منہ دکھنے لگا اس نے کہا اگر مجھے شفاء ہو گئی تو ہم سات روزے اور رکھا کریں گے۔ پھر تیسرا بادشاہ آیا اس نے کہا ان باقی تین دنوں کو بھی پورا کیا جانا چاہئے۔ ہم ربیع میں روزہ رکھیں گے۔ سو ایسا ہی کیا اور پچاس روزے ہو گئے۔ اگر کوئی ایسا بیمار ہے جو روزے کی طاقت نہ رکھتا ہے اس پر روزہ چھوڑنا فرض ہے اور جو کچھ مشکل سے طاقت رکھتا ہے تو رخصت ہے۔ جمہور کا قول یہی ہے۔ جمہور کہتے ہیں وہ سفر جس میں روزہ افطار کرنے کا جواز ہے وہ اتنی مسافت ہے جس تک نماز قصر ہوتی ہے۔ قدرِ مسافت میں اختلاف معروف ہے۔ اور بعض نے کچھ مقدار مسافت بیان کی جس پر کوئی دلیل نہ ہے۔ حق یہ ہے کہ جس قدر مسافت پر سفر کا لفظ بولا جا سکتا ہے اس سفر میں روزہ افطار کرنا جائز ہے۔ اسی طرح جس تکلیف کو بیماری کہا جا سکتا ہے اس میں بھی افطار کرنا جائز ہے۔ سفر طاعت میں روزے کے افطار پر اجماع ہے اور سفر مباح میں اختلاف ہے لیکن درست بات یہ ہے کہ اس میں بھی افطار کی رخصت ہے۔ رہا سفر معصیت تو اس میں اختلاف ہے۔ لفظ یطیقونہ کو مخفف اور مشدد دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ مخفف کی بنیاد پر آیت منسوخ ہے جبکہ واؤ مشدد کی صورت میں محکم ہے۔ تشدید کا معنی تکلیف و مشقت ہے۔ اگر باب افعال کا ہمزہ اس جگہ سلب کا ٹھہرایا جائے تو بھی ممکن ہے پھر اس وقت لا نفی کی تقدیر کی بھی ضرورت نہ ہو گی۔ آیت بھی محکم رہے گی ورنہ منسوخ ٹھہرے گی۔ فدیے کی مقدار میں اختلاف ہے کسی نے کہا گر گندم دے تو ہر دن کے بدلے نصف صاع دے، اگر کوئی اور چیز دے تو ہر دن کے بدلے ایک صاع دے۔ بعض نے کہا جو شہر میں رائج ہو وہ غلہ ایک مد دے دے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہر

مسکین کو صبح و شام کا کھانا دے۔ اور اپنی ام ولد سے جو کہ حاملہ یا مرضعہ تھی۔ کہا تو انہی لوگوں میں سے ہے جن کو روزہ افطار کرنے کی رخصت ہے۔ تو روزہ نہ رکھ اور اس کے عوض کھانا دے دے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک بیٹی حاملہ تھیں انہوں نے پوچھا کیا میں روزہ رکھوں؟ فرمایا تو روزہ افطار کر اور ایک مسکین کو ہر دن کے بدلے کھانا کھلادو۔ اسی طرح تابعین کی ایک جماعت سے بھی یہی مروی ہے۔ غرضیکہ حاملہ و مرضعہ شیخ فانی و شیخہ فانیہ فدیہ دے کر بغیر قضا روزہ افطار کر سکتے ہیں۔ اسی طرح سفر، مرض، حیض، نفاس بھی افطار کی رخصت رکھتے ہیں لیکن ان میں قضاء واجب ہے فدیہ نہ ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٨٥﴾

(روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ (ہے) جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور (جس میں) ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (جو حق و باطل کو) الگ الگ کرنے والا ہے، تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں (رکھ کر) ان کا شمار پورا کرے اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا ،اور (یہ آسانی کا حکم) اس لیے (دیا گیا ہے) کہ تم روزوں کا شمار پورا کر لو اور اس احسان کے بدلے کہ اللہ نے تم کو ہدایت بخشی یہ تم اس کو بزرگی سے یاد کرو اور اس کا شکر کرو۔

فائدہ: موضح قرآن میں کہا اس سے معلوم ہوا کہ رمضان کے مہینے کی عظمت اسی وجہ سے ہے کہ اس میں کلام ربی اترا۔ پس اس مہینے میں اسی نسبت سے کلام پاک کی تلاوت پر زیادہ توجہ دینی چاہئے۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کے اہتمام کی تاکید کی لیکن بذات خود اس کی فرضیت کے خوف سے چند دن کے بعد اس کو باجماعت پڑھنا ترک فرمادیا۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس آیت کریمہ میں تمام مہینوں سے زیادہ رمضان کی مدح فرمائی اور اس مہینے کو قران کے نزول کے لیے منتخب فرمایا۔ حدیث پاک میں ہے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں پیغمبروں پر کتابیں اترا کرتی تھیں ۔امام احمد نے واثلۃ بن الاسقع سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پر رمضان کی پہلی رات صحیفے نازل ہوئے۔ تورات رمضان کی چھ تاریخ میں اتری۔ انجیل تیرھویں تاریخ کو اور قران مجید چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔ حضرت

جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یوں ہے کہ زبور بارہ رمضان کو اور انجیل اٹھارہ رمضان کو نازل ہوئی اور باقی اوپر والی روایت کی طرح ذکر کیا۔ بروایت ابن مردویہ۔ باقی تینوں کتب آسمانی ایک ہی دفعہ ساری نازل ہوئیں۔ رہا قرآن کریم تو یہ آسمان دنیا سے بیت العزت میں لیلۃ القدر میں سارا نازل ہوا۔ جیسے فرمایا:﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ ”کہ ہم نے اس کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔“ اور فرمایا:﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ﴾ ”کہ ہم نے اس کو لیلۃ مبارکہ میں نازل فرمایا۔“ پھر حالات و واقعات کے موافق تھوڑا تھوڑا تیئس سال تک نازل ہوتا رہا۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی کئی طرح سے مروی ہے۔ اس آیت کا یہی مطلب ہے:﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۚ كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ○﴾ ”اور کہا کافروں نے اس پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتر آتا۔ اسی طرح تاکہ ہم اس کے ساتھ آپ ﷺ کے دل کو ثابت رکھیں اور ہم نے اس کو (آپ پر) ٹھہر ٹھہر کر پڑھا اور وہ آپ ﷺ کے پاس اس جیسی کوئی چیز نہیں لاتے مگر ہم آپ کے پاس حق لائے اور جو بہتر ہے۔“ تفسیر میں غرضیکہ جب مشرکین کوئی جھگڑا لے کر آتے تو اللہ کریم اس کا جواب ارشاد فرما دیتے، اس لیے یہ وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا۔ پھر رمضان کی عظمت کے بعد کلام پاک کی مدح فرمائی کہ یہ وہ نسخہ ہے جس سے لوگوں کے دلوں کو تو ہدایت نصیب ہوتا ہے اور جو بندے اور اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں وہ اس کے تابع فرمان ہیں ار نشانیوں سے صاف صاف حجتیں اور دلیلیں مراد ہیں جو اثبات ہدایت اور نفی ضلالت پر دلالت کرتی ہیں جو حق کو باطل سے اور حلال کو حرام سے جدا کرتی ہیں۔ اور جو بعض سلف نے کہا کہ اس کو رمضان نہ کہو بلکہ ماہ رمضان کہو یا شہر رمضان کہو کچھ درست نہ ہے۔ اس لیے کہ اس بات میں جو حضرت ابوہریرہ کی حدیث مروی ہے وہ ضعیف ہے۔ صحیح بخاری میں یوں ہے کہ:﴿مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ﴾ معلوم ہوا کہ دونوں طرح کہنا درست ہے۔

فائدہ: یہ آیت اس شخص پر روزے کی فرضیت کی دلالت کرتی ہے جو صحت مند حالت میں رمضان کا چاند دیکھے۔ اس سے پہلے جو تندرست شخص کو افطار و فدیہ کی رخصت تھی اس آیت نے اس کو منسوخ کر دیا۔ مگر وہ رخصت بیمار اور مسافر کے حق میں قائم و ثابت ہے کہ وہ اپنے افطار کیے ہوئے روزوں کی قضا کرے کیونکہ اللہ کو آسانی منظور ہے وہ تنگی نہیں چاہتا۔

مسئلہ: ابن حزم نے محلی میں صحابہ و تابعین کی جماعت سے نقل کیا ہے کہ جو شخص مہینے کی ابتداء میں مقیم تھا در میان میں مسافر ہوا، اس کے لیے افطار کی گنجائش نہ ہے کیونکہ اللہ نے فرمایا:﴿فَمَنْ شَهِدَ

مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ ”کہ جو تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہیے کہ وہ اس کے روزے رکھے۔“ افطار کا جواز اس مسافر کے لیے ہے جس نے بحالت سفر چاند دیکھا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ قول ضعیف ہے اس کی حکایت محل نظر ہے۔ اس لیے کہ سنت صحیحہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ رمضان میں غزوہ فتح مکہ کے لیے نکلے اور راستے میں مقام کرید پر خود بھی روزہ افطار کیا اور سب کو افطار کا حکم دیا۔ یہ حدیث صحیحین میں مروی ہے۔

مسئلہ: صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ سفر میں افطار کرنا واجب ہے۔ اللہ کے اس قول سے: ﴿فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ ”کہ اس کی گنتی دوسرے دنوں کے میں (قرض ہے۔)“ مگر صحیح موقف وہ ہے جس پر جمہور ہیں کہ یہ امر تخییر کے لیے ہے وجوب کے لیے نہ ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم رمضان میں آپؐ کے ساتھ غزوات میں نکلتے ان میں سے کچھ روزے سے ہوتے اور کچھ بغیر روزے کے اور کوئی ایک دوسرے پر عیب نہ لگاتا اگر افطار لازم ہوتا تو ضرور ایسی حالت میں روزے پر انکار کیا جاتا بلکہ اس کے خلاف خود بالفعل آنحضرت ﷺ کا ایسے مواقع پر صائم ہونا ثابت ہے۔ صحیحین میں مروی ہے کہ ایک دفعہ ہم سخت گرمی کے دنوں میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ غزوہ پر نکلے، مارے گرمی کے لوگ اپنے ہاتھ سروں پر رکھ لیتے تھے ہم میں سے کوئی روزہ سے نہ تھا مگر صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ۔

مسئلہ: ایک گروہ نے کہا جن میں امام شافعی بھی شامل ہیں کہ سفر میں افطار سے روزہ افضل ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں روزہ رکھا ہے لیکن دوسرا گروہ کہتا ہے کہ روزے سے افطار افضل ہے۔ انہوں نے رخصت کو اختیار کیا۔ اس لیے کہ حدیث میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ سے سفر میں روزے کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا: جس نے افطار کیا اچھا کیا اور جس نے روزہ رکھا اس پر بھی کچھ گناہ نہ ہے۔ دوسری حدیث میں یوں آیا ہے کہ تم اللہ کی دی ہوئی رخصت سے فائدہ اٹھاؤ جس کی اس نے تمہیں اجازت دی ہے۔ تیسری جماعت نے کہا کہ صوم وافطار برابر ہیں۔ اس لیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ جو صحیحین میں ہے کہ حمزہ اسلمی نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے پیغمبر! علیہ السلام میں زیادہ روزے رکھتا ہوں کیا میں سفر میں بھی روزہ رکھوں؟ فرمایا: چاہے رکھ لو چاہے افطار کر لو۔ ایک اور چوتھے گروہ نے کہا کہ اگر روزہ مشکل ہو تو افطار افضل ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی دلیل سے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا

جس پر چھتری سے سایہ کیا گیا تھا۔ فرمایا یہ کون ہے؟ کہا: روزہ دار ہے۔ فرمایا سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہ ہے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اگر وہ سنت سے منہ پھیرتے ہوئے افطار کو ناپسند کرے تو اس پر افطار واجب ہے اور روزہ رکھنا حرام ہے کیونکہ مسند امام احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور جابر رضی اللہ عنہ وغیرھما سے آیا ہے کہ: ((من لم یقبل رخصة الله کان علیه من الاثم مثل حیال عرفه)) "کہ جس نے اللہ کی رخصت کو قبول نہ کیا اس پر عرفہ کے پہاڑ جتنا گناہ ہے۔

گر طع فوائد زمن سلطان دین خاك بر فرق قناعت بعد ازین

مسئلہ: روزے کی قضا کے متعلق اختلاف ہے کہ آیا مسلسل رکھے یا الگ الگ بھی جائز ہیں۔ اس میں ایک قول یہ ہے کہ مسلسل روزے رکھے کیونکہ قضا ادا کے معنی میں ہے۔ دوسرا قول جس پر جمہور متفق ہیں کہ جس طرح دل چاہے رکھے چاہے متفق رکھے یا متفرق رکھے۔ دلیلیں بھی اسی موقف کی تائید کرتی ہیں۔ کیونکہ رمضان میں مسلسل روزوں کی وجہ ضرورت ادا کی ورنہ مہینے کا خاتمہ ہو جائے گا پھر جب رمضان رہا تو صرف گنتی صوم باقی رہا۔ پھر وہ جیسے چاہے اسے پورا کر لے۔ فرمایا: ﴿فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ "کہ دوسرے دنوں میں اس کی گنتی ہے۔" پھر فرمایا کہ اس سے آسانی مراد ہے کوئی تنگی یا مشقت میں ڈالنا مطلوب نہ ہے۔ ابو قتادہ ایک اعرابی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو فرماتے سنا: ((ان خیر دینکم ایسره ان خیر دینکم ایسره)) [بروایت احمد] ابو عروہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے منتظر تھے کہ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور اس کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا غسل یا وضو کی وجہ سے پھر نماز پڑھی اور لوگوں نے آنحضرت علیہ السلام سے پوچھنا شروع کیا کہ کیا اس کام پر اس کام میں ہم پر کچھ حرج ہے۔ آپ علیہ السلام نے تین دفعہ فرمایا: ((ان ادین الله فی یسر)) [بروایت احمد، ابن مردویه] انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں یہ روایت بیان فرمائی۔ حضرت انس بن مالک کا لفظ یوں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((یسروا و لا تعسروا، سکونوا و لا تنفروا)) [بروایت شیخین و احمد] صحیحین میں ہے کہ جب آپ علیہ السلام نے حضرت معاذ اور ابو موسیٰ کو یمن کی طرف بھیجا تو ان سے فرمایا: ((بشرا و لا تنفرا و یسرا و لا تعسرا و تطاوعا و لا تختلفا)) سنن و مسانید میں آیا ہے کہ آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا: ((بُعِثْتُ بالحنیفة السمحه)) محجن بن اورع کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہا ہے، تھوڑی دیر دیکھنے کے بعد فرمایا کیا یہ سچے دل سے نماز پڑھتا ہے انہوں نے کہا کہ مدینے میں سب سے زیادہ یہی شخص نمازی ہے۔ فرمایا اسکو یہ نہ سنانا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ پھر فرمایا: ((ان الله انما اراد بهذه الامة

ایسرولم و یرد بھم العسر ﴾[بروایت ابو بکر بن مردویہ] معلوم ہوا کہ اس کے نماز میں انہماک کو خلاف یسر سمجھا۔ کیونکہ ہر بات کو اختیار کرنا آسان ہے اس پر استقامت مشکل ہے۔ جس قدر دلجمعی سے عبادت کر سکتا ہے کرے مشکل میں نہ پڑے۔

فائدہ: اللہ کی بڑائی بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جب عبادت کر چکے تو اللہ کا ذکر کرے تکبیر کہے جس طرح رمضان کے بعد عید الفطر کو جاتے ہوئے تکبیر ذکر کیا کرتے ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَائَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ "کہ پھر جب تم حج کے طریقے سے پورے کرلو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح تم اپنے آباء کا ذکر کرتے ہو یا اس سے بھی زیادہ ذکر۔" اور فرمایا: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةَ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔" اور فرمایا: ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ "کہ اپنے رب کی تسبیح کیجئے سورج کے طلوع اور غروب سے پہلے اور رات کو بھی اس کی تسبیح کیجئے اور سجدوں کے بعد بھی۔" اسی لیے ہر فرض نماز کے بعد تسبیح، تحمید و تکبیر حدیث کی رو سے مستحب ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت ﷺ کی نماز کا ختم ہونا نہ سمجھتے تھے مگر تکبیر سے۔ اس لیے اکثر علماء فرماتے ہیں کہ عید الفطر میں تکبیریں کہنی چاہئے اور ان کی دلیل یہی آیت باب ہے۔ ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ "اور چاہئے کہ تم اللہ کی تکبیر بیان کرو۔ اس پر جو اس نے تمہیں ہدایت دی۔" حتیٰ کہ داؤد بن علی اصفہانی ظاہری اس طرف گئے ہیں کہ عید الفطر میں تکبیر کہنا واجب ہے کیوں کہ امر کا ظاہر وجوب ہی ہے۔ ابن کثیر نے کہا کہ امام ابو حنیفہ کا مذہب ان کے خلاف ہے کہ عید الفطر میں تکبیر کہنا مشروع ہی نہ ہے۔ جبکہ جمہور اس کو مستحب قرار دیتے ہیں۔ احسان ماننے کا مطلب یہ ہوا کہ جب تم نے اللہ کی اطاعت کے لیے فرائض پر عمل کیا محارم چھوڑے اس کی مقرر کردہ حدود کا پاس رکھا تو اب تم شکر گذاروں میں داخل ہو سکتے ہو۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾

اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں، جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہئے کہ میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ نیک رستہ پائیں۔

فائدہ: اوپر کی آیت میں فرمایا تھا کہ اللہ کی بڑائی بیان کرو، یعنی عید الفطر میں بلند آواز سے تکبیریں پڑھو۔اس لیے اس آیت میں وضاحت کر دی کہ اللہ تعالیٰ دور نہیں ہیں کہ آواز بلند کرو بلکہ آواز بلند کرنے کا اور مقصد ہے۔اللہ کریم کی ذات تو قریب ہی ہے۔

فائدہ: معاویہ قشیری کہتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ہمارا رب قریب ہے تو ہم اسے آہستہ پکاریں اگر دور ہے تو با آواز بلند پکاریں۔اس پر رسول اللہ علیہ السلام خاموش ہو رہے۔تب یہ آیت نازل ہوئی۔[بروایت ابن ابی حاتم] حسن سے ابن جریر اور ابن مردویہ کا لفظ یہ ہے کہ اصحاب رسول علیہ السلام نے کہا ہمارا رب کہاں ہے ؟اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمادی۔حضرت عطاء فرماتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی:﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾"اور تمہارے رب نے کہا مجھے پکارو میں تمہاری پکار کو قبول کروں گا۔"لوگوں نے کہا اگر ہمیں دعا کا وقت معلوم ہو تو ہم دعا کریں۔اس پر آیت باب نازل ہوئی ۔حضرت ابن عباسؓ نے کہا یہود مدینہ کہتے تھے :اے محمد! ہمارا رب کیونکر ہماری دعا سنے گا جبکہ تو خیال کرتا ہے کہ ہمارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہے اور ہر آسمان کی موٹائی اتنی ہی ہے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ابو موسیٰ اشعری نے کہا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک لڑائی کی طرف نکلے اور اس اونچی جگہ چڑھتے اترتے نہ تھے مگر اونچی آواز سے تکبیر پڑھتے۔آنحضرت ﷺ ہمارے پاس آئے اور فرمایا اے لوگو! اپنے نفسوں پر قابو پاؤ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکارتے ہو۔بلکہ تم سننے والے، دیکھنے والے کو پکارتے ہو۔وہ تمہاری اس سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔اے عبداللہ بن قیس کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتاؤں((لا حول ولا قوة الا بالله))[بتخریج الشیخان و بقیة الجماعة و احمد] حضرت انس کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ اللہ کریم فرماتے ہیں: میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوں اور میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔[بروایت احمد] حضرت ابو ہریرہ مرفوعاً فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے اور اس کے دونوں ہونٹ میرے ذکر میں حرکت کرتے ہیں۔[بروایت احمد] ابن کثیر فرماتے ہیں یہ اس آیت کی طرح ہے:﴿ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِيْنَ هُمْ مُحْسِنُوْنَ ﴾"بلاشبہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے، اور وہ نیکی کرنے والے ہیں۔"اور یہ فرمان:﴿اِنَّنِيْ مَعَكُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰى﴾"کہ بلاشبہ میں تمہارے ساتھ ہوں خوب سنتا اور دیکھتا ہوں۔"یہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو خطاب ہے۔مراد یہ ہے کہ اللہ دعا کرنے والے کی دعا کو ضائع نہ کرتا ہے۔اور کوئی چیز اس کو

دعا سننے سے باز نہیں رکھتی ہے۔بلکہ وہ سمیع الدعا ہے۔اس میں اس کی ترغیب ہے کہ تم دعا کرو ہم سنیں گے تمہاری دعا ضائع نہ ہو گی۔جس طرح حضرت سلمان فارسی کی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے شرماتا ہے کہ بندہ اس کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر خیر کا سوال کرے اور وہ اس کو بے مراد لوٹا دے۔ [بروایت احمد و اهل سنن] ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔مزید نے اس کے اطراف میں ایک تابع ذکر کیا ہے ۔حضرت ابو سعید کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ کوئی مسلمان ایسی دعا نہ کرتا ہے جس میں گناہ یا قطع رحم نہ ہو۔ مگر اللہ اس کو تین چیزوں میں سے ایک چیز عطا کرتا ہے۔یا جلد ہی اس کی دعا قبول کر لیتا ہے یا اس کے لیے آخرت میں جمع رکھتا ہے۔یا اس کے مثل اس سے کوئی شر دور کر دیتا ہے۔لوگوں نے کہا اب ہم کثرت سے دعا کریں گے ۔فرمایا:اللہ اس سے بھی زیادہ ہے۔[بروایت احمد] حضرت عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زمین کی پشت پر کوئی مسلمان اسے نہیں پکارتا مگر اللہ کریم یا تو اس کو عطا کر دیتا ہے یا اس سے اس کی مثل کوئی برائی روکتا ہے۔جب تک کہ وہ گناہ یا قطع رحم کی دعا نہیں کرتا۔[بروایت احمد] ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔امام مالک ابو ہریرہ سے مرفوعا روایت کرتے ہیں کہ تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول ہوتی ہے جب تک کہ جلدی نہ کرے۔یوں نہ کہے کہ میں نے دعا کی لیکن میری دعا قبول نہ ہوئی، پھر تھک کر بیٹھ رہے اور دعا کرنا چھوڑ دے۔حضرت انس کا مرفوعاً لفظ یہ ہے کہ بندہ ہمیشہ خیریت سے رہتا ہے جب تک کہ وہ جلدی نہ کرے ۔[الحدیث بروایت احمد] حضرت ابن عمرو نے مرفوعاً کہا ہے کہ دل یاد رکھنے والے ہیں۔بعض دل بعض سے زیادہ یاد رکھتے ہیں، سو جب تم اللہ سے مانگو تو قبولیت کا یقین رکھ کر مانگو اس لیے کہ اللہ غافل دل کی دعا قبول نہ کرتا ہے۔ [بروایت احمد] ابن ابی نافع فرماتے ہیں کہ میں اور عائشہ بیٹھے تھے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کی بابت پوچھا:﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ "کہ میں پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔" فرمایا اے رب! یہ (حضرت) عائشہ کا مسئلہ ہے۔جبریل علیہ السلام نے کہا:اللہ آپ کو سلام کہتا ہے اور فرمایا کہ میرا نیک بندہ سچی نیت اور پاک دل سے مجھے کہتا ہے:اے رب! تو میں لبیک کہتا ہوں اور اس کا کام کر دیتا ہوں۔[بروایت ابن مردویہ] یہ حدیث غریب ہے۔

فائدہ: اللہ کریم نے روزوں کے احکام کے درمیان یہ آیت اس لیے ذکر کی کہ روزوں کا وقت پورا ہونے پر یا ہر روزے کے افطار کے وقت دعا کی کوشش کرنا چاہیئے۔جس طرح کہ ابن عمرو رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ صائم کی دعا افطار کے وقت قبول ہوتی ہے۔ابن عمر جب افطار کرتے تو اہل و عیال کو بلا کر دعا

فرماتے۔[بروایت ابو داؤد الطیالسی]ابن ماجہ کے نزدیک ان کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ روزہ دار کی دعا افطار کے وقت لوٹائی نہیں جاتی ہے۔ابن عمرو افطاری کے وقت یہ دعا پڑھتے:((اللھم انی اسئلك برحمتك التی وسعت کل شیء ان تغفرلی)) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تین شخص ہیں جن کی دعا لوٹائی نہیں جاتی۔ایک امام عادل،دوسرا صائم جب افطار کرے،تیسرا مظلوم۔اللہ اس کی دعا کو بادل کے اوپر اٹھا لیتا ہے۔آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔فرماتا ہے مجھے اپنی عزت کی قسم میں تمہاری ضرور مدد کروں گا اگرچہ ایک مدت کے بعد ہو۔[بروایت احمد و اهل السنن]

تب آذ آه مظلومان که هنگام دعا کردن
اجابت از درهق بهر استقبال می آید
آتش سوزان نکند باسپند
انچه کند دو دل درد مند

بہر حال جب بندہ اپنے رب سے مانگتا ہے تو وہ اس کے قریب ہوتا ہے کسی نے کہا اس آیت میں اللہ کے قریب و بعید ہونے کا سوال ہے۔بعض نے کہا کہ دعا کی اجابت کے متعلق سوال تھا اس آیت کی دلیل سے:اُجِیبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ۔کہ میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔لیکن ظاہر یہ ہے کہ دونوں امر کے متعلق سوال تھا۔کسی نے کہا یہ قرب اجابت ہے۔کسی نے کہ قرب علم ہے کسی نے کہا قرب انعام ہے۔کشاف میں کہا کہ قرب کا لفظ قبولیت کی آسانی سے عبارت ہے۔[بتخریج ابو داؤد وغیرہ من ھدیث النعمان بن بشیر] مگر ظاہر یہ ہے کہ اجابت اس جگہ اپنے لغوی معنی پر باقی ہے۔دعا کے عبادت ہونے سے یہ بات لازم نہ آتی ہے کہ اجابت قبول دعا سے عبارت ہو۔یعنی عبادت کا متقبل ہونا اس سے یہ معنی ہو گا اجابت اور چیز ہے اور عبادت قبول ہونا اور چیز ہے۔مطلب صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے قبول کرتا ہے۔کبھی مطلوب جلد حاصل ہو جاتا ہے اور کبھی دیر سے یعنی دو وقت میں دعا کا مطلوب ملتا ہے اور کبھی دعا کرنے والے سے کوئی مصیبت ٹل جاتی ہے جس کا کہ وہ علم بھی نہ رکھتا ہے۔پھر فرمایا کہ مجھے پکارنے سے میری دعوت ایمان و طاعت کو قبول کر لو۔یا یہ مطلب ہے کہ یہ اللہ کے اوامر و نواہی پر ثابت رہ کر دعا مانگتے ہیں اور قبولیت کے امیدوار ہیں۔حضرت مجاہد نے کہا استجابت کے یہاں یہ معنی ہیں کہ تم میری اطاعت کرو اجابت کے معنی لغت میں یہ ہیں کہ بندے کی طرف سے اطاعت ہو اور اللہ کی طرف سے عطا ہو۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

روزوں کی راتوں میں تمہارے لیے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا ہے وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو ،اللہ کو معلوم ہے کہ تم (ان کے پاس جانے سے) اپنے حق میں خیانت کرتے تھے سو اس نے تم پر مہربانی کی اور تمہاری حرکات سے درگذر فرمائی ،اب (تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو اور اللہ نے جو چیز تمہارے لیے لکھ رکھی ہے (یعنی اولاد) اس کو (اللہ سے) طلب کرو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے، پھر روزہ (رکھ کر) رات تک پورا کرو اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو ان سے مباشرت نہ کرو، یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے پاس نہ جانا ،اسی طرح اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ وہ پرہیزگار بنیں۔

فائدہ: جب روزہ فرض ہوا تو مسلمان سارا مہینہ اپنی بیوی کے پاس نہ جاتے اور پہلی امتوں کی طرح سونے کے بعد کھاتے پیتے نہ تھے۔ اس دوران بعض اصحاب نہ رہ سکتے۔ اس پر آنحضرت ﷺ سے ذکر کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی تم اپنے نفسوں سے خیانت کر رہے تھے لیکن اللہ کریم نے تمہیں اس سے منع نہ کیا اور صبح تک کھانا جائز رکھا جب سفیدی ظاہر ہو جائے تو بھی صبح صادق ہے۔ جب تک ستون سے اونچی روشنی ہو وہ صبح کاذب ہے مگر حالت اعتکاف میں دن رات میں کسی وقت بھی بیوی کے پاس نہ جائے۔

فائدہ: ابن کثیر فرماتے ہیں اس میں اللہ کریم نے مسلمانوں کو رخصت دی۔ ابتدائے اسلام میں عشاء سے پہلے تک کھانا پینا اور بیوی کے پاس جانا حلال تھا جب نماز پڑھ لی یا سو گیا تو یہ سب کام حرام ہو گئے۔ حتیٰ کہ اسی حال میں دوسری شام ہوتی اس سے مسلمانوں کو بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ رفث سے جماع مراد ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت کا یہی قول ہے۔ لباس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے سکون کا سبب ہو اور وہ تمہارے سکون کا سبب ہیں۔ صحابہؓ و تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ ربیع بن انس نے کہا یعنی وہ تمہارا لحاف ہیں اور تم ان کا لحاف ہو۔ حاصل کلام یہ ہے کہ عورت اور مرد کے باہمی تعلق کی وجہ سے شارع نے

مناسب جانا کہ انہیں رمضان کی راتوں میں عورتوں کے پاس جانے کی اجازت عطا کر دی تا کہ طبعی میلان کی وجہ سے کچھ حرج واقع نہ ہو۔اس آیت کے سبب نزول کی بابت قیس بن صرمہ کا واقعہ گذر چکا ہے کہ وہ ایک رات بھوکے سو گئے اور صبح اسی حالت میں روزے سے اٹھے بھوک کی شدت برداشت نہ ہو پائی کہ غش آ گیا۔ان کی یہ حالت آنحضرت ﷺ سے ذکر کی گئی تو یہ آیت نازل ہوئی سب مسلمانوں کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔[بروایت ابو اسحق من ابراء بن عاذ ب بطوله] اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے رمضان میں جماع واقع ہو گیا تھا۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔بقول ابن عباس۔یہ دونوں قصے کئی طریق سے مروی ہیں۔صحابہؓ و تابعینؒ کے ایک گروہ نے کہا اللہ کے لکھے ہوئے تو تلاش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اولاد طلب کرو۔کسی نے کہا جماع مراد ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا لیلۃ القدر مراد ہے۔حضرت قتادہ نے فرمایا مراد یہ ہے کہ جو رخصت اللہ کریم نے تمہیں دی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔کسی نے کہا قرآن کے دیے ہوئے جوازوں سے فائدہ حاصل کرو۔کسی نے کہا بیویاں اور لونڈیاں رکھو۔مگر نظم قران کے موافق میں سے کوئی معنی بھی مفید نہ ہے۔نہ ان پر کوئی دلیل ہی ہے۔اس لیے ابن جریر نے ن سب امور میں آیت کے مطلوب کو عام رکھنا مناسب سمجھا ہے۔حضرت حسن بصری نے اس کو اتبعوا بعین مہملہ پڑھا ہے۔بخاری شریف میں سہیل بن سعد سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور لفظ مِنَ الْفَجْرِ ابھی نازل نہ ہوا تو کچھ روزہ رکھنے والے لوگ رات کو سفید اور سیاہ دھاگہ پاؤں میں باندھ کر سوتے تھے اور جب تک وہ واضح نظر نہ آنے لگتا تب تک کھاتے پیتے رہتے تھے جب لفظ مِنَ الْفَجْرِ نازل ہوا تب وہ سمجھے کہ اس سے رات اور دن مراد ہیں۔حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کام کیا پھر صبح کو آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:((ان و سادتك اذا لعریض)) اس سے دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی مراد ہے نہ کہ سفید اور سیاہ دھاگہ۔اور دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے دھاگے اپنے تکیے کے نیچے رکھے تب آپ علیہ السلام نے فرمایا تب تو تمہارا تکیہ بڑا چوڑا ہے۔[بروایت الشیخان] بعض روایات میں ((انك لعریض القضا)) آیا ہے اور بعض میں ((انك لعریض العقل)) مذکور ہے۔ابن کثیر نے فرمایا بعض نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ تو بلید الذھن ہو مگر یہ معنی ضعیف ہیں ۔بلکہ مطلب یہ ٹھہرا کہ جب تمہارا تکیہ عریض ٹھہرا تو تمہاری پشت اور عقل بھی عریض ہے۔لیکن ابن جریر اور حاتم کی روایت میں یوں ہے کہ جب حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے یہ بات ذکر کی تو آنحضرت ﷺ ہنس دیئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے ان کی کم فہمی مراد ہے۔واللہ اعلم . پھر جبکہ اللہ کریم نے صبح تک کھانا مباح کر دیا تو اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ سحری کھانا مستحب ہے۔اس لیے کہ یہ کھانا رخصت ہے اور رخصت سے فائدہ

اٹھانا مستحب ہے۔اس لیے رسول اللہ ﷺ سے ترغیب سحری منقول ہے۔حضرت انسؓ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ تم سحری کرو سحری میں برکت ہے۔ [بروایت الشیخان] صحیح مسلم میں عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں کے درمیان سحری کھانے کا فرق ہے۔امام احمد کے نزدیک ابو سعید کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ سحور لقمۂ برکت ہے۔تم اس کو نہ چھوڑو۔گو کہ کوئی ایک گھونٹ پانی ہی کیوں نہ پی لے۔اللہ اور فرشتے سحری کرنے والوں پر درود بھیجتے ہیں۔اس کے علاوہ اور بھی کئی احادیث ترغیب سحور پر دلیل ہیں حتیٰ کہ اگرچہ ایک گھونٹ پانی پی کر ہی سحری کھانے والوں میں شامل ہو جائیں۔فجر پھوٹنے تک سحری کرنا مستحب ہے۔جس طرح کہ صحیحین میں حضرت انس بن مالک نے حضرت زید بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کی پھر نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔حضرت انس رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اذان اور سحری کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟ کہا: پچاس آیات کے بقدر۔حضرت ابو ذرؓ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ میری امت خیر پر رہے گی جب تک کہ وہ سحری میں دیر اور افطار میں جلدی کرے گی۔[بروایت احمد] بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سحری کو مبارک کھانا فرمایا ہے۔حذیفہ رضی اللہ عنہ کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ ہم نے رسول اللہ علیہ السلام کے ساتھ سحری کی کہ دن نکل آیا مگر سورج نہ نکلا تھا۔[بروایت احمد ،نسائی ،ابن ماجہ] نسائی نے کہا کہ عاصم بن ابی النجود اس کے ساتھ منفرد ہیں اور یہ حدیث قرب نہار پر محمول ہے۔جیسے فرمایا:﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ اَوْفَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ ”کہ پھر جب وہ اپنے وقت مقرر کو پہنچ جائیں تو انہیں معروف طریقے سے رکھو یا معروف طریقے سے رخصت کر دو۔“اس جگہ بلوغ سے عدت کی تکمیل کے قریب ہونا مراد ہے۔ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا احتمال اس معنی پر متعین ہے۔یعنی ایسے وقت سحری کی کہ طلوع فجر کا یقین نہ تھا گو بعض کو طلوع فجر کا گمان ہوا ہو۔سلف کی ایک کثیر جماعت سے مروی ہے کہ انہوں نے سحور کی بابت فجر کے قریب کرنے میں انکار کیا ہے۔حضرات صحابہ ابو بکر، عمر، علی ،ابن مسعود، حذیفہ ،ابو ہریرہ،ابن عمرو،ابن عباس اور زید بن ثابت سے یوں مروی ہے۔اسی طرح تابعین رحمہم اللہ کا گروہ کثیر بھی اسی طرف مائل ہے جن کے نام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ”کتاب الصیام “پر بطور حوالہ ذکر کیے ہیں۔پھر فرمایا: کہ ابن جریر نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ طلوع شمس پر سحری سے رک جانا واجب ہے جس طرح کہ غروب شمس سے افطار جائز ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں کسی عالم کو خیال نہیں کرتا کہ اس کے قدم اس بات پر جم سکیں کیونکہ یہ بات نص قرآنی کے خلاف ہے۔﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ

الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ﴾ ''کہ کھاؤ اور پیو حتیٰ کہ تمہارے لیے سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے ظاہر ہو جائے۔ پھر رات تک روزے کو پورا کرو۔'' ہاں صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ تمہیں بلال کی اذان سحری سے نہ روکے کیونکہ وہ رات کو اذان دیتا ہے۔ تم کھاؤ پیو حتیٰ کہ ابن ام مکتوب اذان کہے۔ کیونکہ جب وہ اذان دیتا ہے تو فجر پھوٹ آتی ہے۔ یہ بخاری کا لفظ ہے۔ طلق نے مرفوعاً کہا کہ جو افق پر بمعنی پھیل جاتی ہے یہ فجر نہ ہے بلکہ فجر وہ ہے جو چوڑائی میں سرخی مائل ہوتی ہے۔ [بروایت احمد و ترمذی] ترمذی کا لفظ یہ ہے کہ کھاؤ پیو تمہیں یہ چمکنے والی چڑھنے والی سفیدی تمہیں کھانے سے نہ روکے۔ حتیٰ کہ تمہارے لیے سرخی چوڑائی میں پھیلے۔ حضرت سمرہ بن جندب کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ تمہیں بلال کی اذان دھوکے میں نہ رکھے اور نہ یہ سفیدی جب تک کہ یہ فجر نہ پھٹے یا نکلے۔ [بروایت ابن جریر سندہ] سمرۃ کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ تمہیں بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور لمبی سفیدی سحری سے منع نہ کرے۔ لیکن وہ فجر جو آسمان کے کنارے پر پھیلی ہو۔ ان کا تیسرا لفظ یہ ہے کہ تمہیں بلال کا اذان کہنا اور یہ سفیدی جو صبح کا ستون ہے دھوکہ نہ دے حتیٰ کہ یہ اسی کے لگ بھگ روشنی اور بکھیرے۔ صحیح مسلم میں بھی آیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ فجر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ فجر جو آسمان کی سطح پر پھیلتی ہے وہ کسی چیز کو حلال و حرام نہیں کرتی لیکن جو فجر پہاڑوں کی چوٹیوں پر روشن ہوتی ہے وہ کھانے پینے کو حرام کر دیتی ہے۔ حضرت عطاء نے کہا کہ آسمان پر پھیلنے والی وہ فجر ہے جو لمبی ہوتی ہے۔ اسے نہ روزے دار کا کھانا پینا حرام ہوتا ہے نہ نماز فوت ہوتی ہے نہ حج۔ لیکن جب وہ پہاڑوں پر پھیل جاتی ہے تو روزے دار کا پینا حرام اور حاجی کا حج فوت ہو جاتا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس اثر کی سند صحیح ہے۔ بہت سے سلف کا یہی قول ہے۔

مسئلہ: اللہ کریم نے کھانے پینے اور جماع کے جواز کو جو فجر کے اتنے قرب تک ثابت رکھا ہے اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جس نے حالت جنابت میں صبح کی تو وہ نہالے اور روزہ بدستور مکمل کر لے اس پر کچھ حرج نہ ہوگا۔ ائمہ اربعہ جمہور سلف و خلف کا یہی مسلک ہے کیونکہ شیخین کے نزدیک حضرت عائشہ و اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کرتے جبکہ وہ بغیر احتلام جماع سے جنبی ہوتے پھر نہاتے اور روزہ رکھتے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا لفظ یہ ہے کہ نہ افطار کرتے نہ اس کی قضا کرتے۔ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آیا ہے کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر نماز کا وقت ہو جاتا ہے اور میں جنبی ہوتا ہوں کیا روزہ رکھوں؟ فرمایا: یہی میرا بھی حال ہے، میں روزہ رکھ لیتا ہوں۔ اس نے کہا آپؐ ہماری طرح نہ ہیں۔ اللہ نے آپؐ کے سارے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ فرمایا: واللہ میں امید کرتا ہوں کہ میں تم سب

سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور بچنے کی چیز محرمات اور ممنوعات کو تم سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ مگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مرفوعاً یوں آیا ہے کہ جب صبح کی اذان ہو گئی اور تم میں سے کوئی جنبی ہے تو اس دن روزہ نہ رکھے۔[بروایت احمد] یہ حدیث جید اسناد ہے۔ شیخین کی شرط پر ہے اور صحیحین و نسائی میں مروی ہے۔اسی لیے بعض علماء نے اس کی علت بیان کی ہے۔اس سے پہلی حدیث کی وجہ سے موافقت کا پہلو تلاش کیا لیکن بعض بعینہٖ اسی طرف گئے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسری جماعت تابعین کا یہی مذہب ہے۔ بعض نے اس کو یوں تطبیق دی ہے کہ اگر سونے کی وجہ سے غسل نہ کر سکا حتیٰ کہ فجر ہو گئی تو کچھ حرج نہ ہے۔ حضرت ام سلمہ و عائشہ رضی اللہ عنہما کی حدیث کی دلیل سے۔ لیکن اگر جان بوجھ کر ایسا کیا تو روزہ نہ ہو گا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے۔ عروہ، طاؤس اور حسن کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا اگر وہ روزہ فرض ہے تو اس کو مکمل بھی کر لے اور اس کی قضاء بھی کر لے اور اگر نفل ہے تو کچھ حرج نہ ہو گا۔ابراہیم نخعی اور حسن بصری اسی موقف کی تائید کرتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حضرت ام سلمہ و عائشہ رضی اللہ عنہما والی حدیث سے منسوخ ہو گئی لیکن اس میں تقدیم و تاخیر کی تاریخ معلوم نہ ہے۔ابن حزم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حدیث کا نسخ مذکور آیت سے ہے لیکن یہ بھی بعید ہے کیونکہ نفی کی تاریخ بلکہ تاریخ سے ظاہر بھی اس کے مخالف ہے۔ بعض نے حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بھی کمال پر محمول کیا۔ پھر ام سلمہ و عائشہ رضی اللہ عنہما کی حدیث جو جواز پر دلیل ہے سے روزہ ہو گا۔ابن کثیر نے فرمایا کہ یہی موقف اقرب ہے۔

فائدہ: اور جو ارشاد فرمایا کہ روزے کو رات تک پورا کرو اس سے پتا چلا کہ غروب شمس کے وقت روزہ افطار کرنا حکم شرعی ہے جس طرح کہ صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب رات ادھر سے آئے اور دن ادھر سے جائے تو روزہ افطار کر لو۔اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ اللہ کریم فرماتا ہے کہ مجھے وہ بندہ بڑا محبوب ہے جو روزہ کھولنے میں جلدی کرتا ہے۔[بروایت احمد] ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔بشیر بن خصاصیہ کی بیوی نے دو روزے (بغیر افطار) رکھنے چاہئے تو بشیر نے اس کو منع کیا اور کہا کہ رسول اللہ علیہ السلام نے مواصلت سے منع کیا اور کہا کہ نصاریٰ ایسا کرتے ہیں تم اسی طرح روزہ رکھو جیسا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ "پھر رات تک روزے کو پورا کرو۔" جب رات ہو تو روزہ افطار کر لو۔احادیث صحیحۃ میں روزے کو ملانے سے منع فرمایا ہے۔وصال یہ ہے کہ مسلسل دن رات روزہ رکھے سحری نہ کھائے۔حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

تم وصال نہ کرو کہا آپ علیہ السلام تو وصال فرماتے ہیں فرمایا میں تمہاری طرح نہ ہوں۔ میں رات بسر کرتا ہوں جبکہ میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے لیکن لوگ وصال سے باز نہ رہے۔ حضرت ﷺ نے ان کے ساتھ دو دن رات وصال کیا پھر چاند دیکھ لیا تو فرمایا اگر چاند دیر کرتا تو میں تم سے اور زیادہ وصال کرتا اور یہ عمل ان سے ناراضگی اور ڈانٹ کے انداز میں انجام دیا۔ [بروایت احمد] یہ حدیث صحیحین میں بھی مروی ہے اور یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ وصال آپ علیہ السلام کے خصائص سے تھی انہیں اس پر مدد ملتی تھی اور قوت عطا کی گئی تھی۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جس کھانے کا آپؐ نے اپنی نسبت ذکر کیا اس سے معنوی کھانا مراد ہے حسّی نہیں۔ ورنہ اگر حسی ہوتا تو اس پر وصال نہ ہوتا جس طرح کسی شاعر نے کہا ۔

لها احاديث من ذكراك تشغلها عَنِ الشراب و تلهيها عن الزاد

ہاں جو افطار کے وقت سے سحری تک کھانا نہ کھائے تو یہ ہو سکتا ہے کیونکہ حضرت ابو سعید خدری کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وصال نہ کرو جو وصال کرنا چاہے وہ سحری تک کرلے۔ کہا آپ علیہ السلام تو وصال فرماتے ہیں۔ فرمایا میں تمہاری طرح نہ ہوں میں رات بسر کرتا ہوں اور ایک کھلانے پلانے والا مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ [بروایت الشیخان] ام ولد نے حاطب سے فرمایا کہ تو آل محمد کے سحر سے سحر تک وصال سے کہاں ہے؟ یعنی تجھے اس کی خبر نہ ہے۔ [بروایت ابن جریر] علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سحر سے سحر تک وصال فرماتے تھے۔ [بروایت احمد] حضرت ابن زبیر وغیرہ سلف چند روز تک وصال فرماتے تھے تو وہ بوجہ ریاضت نفس کرتے تھے اس کو عبادت سمجھ کر نہ کرتے تھے یا انہوں نے وصال کی نہی کو براہ شفقت سمجھا تھا۔ جس طرح کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ یہ نہی وصال براہ رحمت تھی۔ اس لیے حضرت ابن زبیر اور ان کے بیٹے عامر وغیرہ جو ان کے نقشِ قدم پر چلتے تھے وہ کئی کئی دن کا وصال کرتے۔ انہیں اس پر قوت بھی حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر سات دن لگا تار روزہ رکھتے اور ساتویں دن بھی اچھے خاصے مضبوط نظر آتے تھے۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں اللہ نے دن کو روزہ فرض کیا ہے۔ جب رات ہو جائے تو اب جس کا دل چاہے وہ کھائے اور جس کا دل نہ چاہے وہ نہ کھائے۔

فائدہ: ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اعتکاف میں اس شخص کے لیے منع مباشرت ہے جو رمضان یا غیر رمضان میں مسجد کے اندر اعتکاف کرے۔ اللہ کریم نے اس پر دن رات عورتوں پر جانا حرام کیا ہے۔ حتیٰ کہ اعتکاف مکمل ہو۔ ضحاک نے فرمایا کہ مسجد وغیر مسجد میں بحالت اعتکاف جماع حرام ہے۔ حضرت مجاہد، قتادہ اور

صحابہ و تابعین کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ جو شخص مسجد میں بغرض اعتکاف ٹھہرا ہوا ہے اس پر عورت حرام ہے اگر کسی ضرورت کے لیے گھر سے گیا تو فوراً ضرورت پوری کرے لے اور واپس لوٹ جائے۔بول و براز یا کھانے پینے کی جو بھی ضرورت ہے اس سے زیادہ نہ ٹھہرے نہ بیوی کا بوسہ لے نہ اسے گلے لگائے نہ اس کی بیمار پرسی کرے۔ہاں چلتے چلتے حال دریافت کرلے۔فتح البیان میں لکھا ہے کہ شرع میں اعتکاف مخصوص شرط پر مخصوص طاعت سے چمٹے رہنے کا نام ہے۔اور اس پر بھی اجماع ہے کہ اعتکاف واجب نہ ہے اور یہ مسجد ہی میں مشروع ہے۔ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے مرفوع فرمایا کہ مساجدِ ثلاثہ اور جماعت والی مسجد کے سوا اعتکاف نہ ہے۔[بروایت سعید بن منصور] اگر عورت اعتکاف کرے تو اس کو گھر کی نماز والی مخصوص جگہ تین اماموں کے نزدیک کافی ہے۔لیکن امام مالک اس کو کافی نہیں سمجھتے۔گھر کی نماز والی جگہ وہی ہے جسے گھر میں عورتوں کی نماز کے لیے مخصوص کیا گیا ہو لیکن اگر مسجد میں خیمہ لگا لے تو افضل ہے۔اس لیے کہ ازواج مطہرات نے مسجد میں بوریے سے حجرہ بنا کر اعتکاف فرمایا۔واللہ اعلم. ابن کثیر نے "کتاب الصیام "میں اعتکاف کے متفق و مختلف مسائل ذکر فرمائے ہیں۔

فقہائے مصنفین جو کتاب الصیام کے بعد کتاب الاعتکاف لکھتے ہیں اس کی وجہ کتاب اللہ کی اقتداء ہے کیونکہ اللہ کریم نے روزوں کے بعد اعتکاف کا ذکر فرمایا ہے۔اس ترتیب میں یہ ارشاد بھی ہے کہ تم روزے میں اعتکاف بھی کیا کرو۔روزوں کے مہینے کے آخر میں اعتکاف کرو۔جس طرح کہ رسول اللہ علیہ السلام سے ثابت ہوا ہے کہ آپ علیہ السلام رمضان کے آخری عشرے میں آخر تک اعتکاف کرتے رہے۔پھر آپ علیہ السلام کے بعد آپ علیہ السلام کی ازواج طاہرات رضی اللہ عنہن و عن سائرالمومنات اعتکاف کرتی رہیں۔صحیحین میں مروی ہے حضرت عائشہ راوی ہیں کہ حضرت صفیہ بنت حیی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو آیا کرتیں۔آنحضرت معتکف ہوتے، چند ساعت بات کر کے چلی جاتیں۔اب رات جبکہ آنحضرت علیہ السلام سے رخصت ہو کر گھر جانے لگیں ان کا گھر مدینہ کے جانب میں اسامہ بن زید کے گھر میں تھا۔رسول اللہ علیہ السلام انہیں گھر تک چھوڑنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔راستے میں دو انصاری ملے انہوں نے آنحضرت کو دیکھا۔دوسری روایت میں ہے کہ انہیں دیکھ کر شرم سے چھپنے لگے اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی بیوی تھیں۔فرمایا ذرا ٹھہرو۔یہ میری بیوی صفیہ بنت حیی ہے۔انہوں نے کہا: سبحان اللہ !اے اللہ کے پیغمبر علیہ السلام۔فرمایا شیطان انسان کے اندر رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں تمہارے دل میں کچھ اور خیال نہ آجائے۔[بروایت الشیخان]امام شافعی فرماتے ہیں کہ آنحضرت

ﷺ نے چاہا کہ اپنی امت کو تہمت کی جگہ سے بچنے کی تلقین فرمادیں تاکہ کسی ناپسند معاملے میں نہ واقع ہو جائیں۔ ورنہ وہ دونوں انصاری اللہ کے بڑے متقی بندے تھے۔ وہ ہرگز رسول اللہ علیہ السلام کے متعلق ایسا خیال نہ لا سکتے تھے۔ رہی یہ بات کہ اس آیت میں مباشرت سے کیا مراد ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا اس سے جماع وغیرہ یعنی بوسہ لینا، گلے لگانا مراد ہے۔ باقی کوئی چیز لینا دینا منع نہ ہے۔ کیونکہ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی کہ آپ علیہ السلام اپنا سر مبارک میری طرف کرتے اور میں کنگھی کرتی جبکہ میں حائضہ ہوتی۔ آنحضرت ﷺ حاجت طبعی کے علاوہ گھر تشریف نہ لایا کرتے۔ غرضیکہ اس میں جو بھی احکام رخصت و لزوم، حرمت و جواز وغیرہ بیان ہوئے وہ سب اللہ کی حدود و شرائع ہیں ان کے قریب بھی نہ جانا چاہیے۔ سو جس طرح اللہ کریم نے روزے کے احکام بیان فرمائے اسی طرح اللہ سارے احکام اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبان صدق سے بیان کرتا ہے۔ شاید کہ وہ لوگ سیدھی راہ پر آجائیں اور اطاعت اختیار کرلیں۔ جیسے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾ ”وہی ذات ہے جو اپنے بندے پر واضح آیات نازل کرتا ہے تاکہ تمہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے۔ بلاشبہ اللہ کریم تمہارے ساتھ شفقت کرنے والا مہربان ہے۔“

وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَی الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾	اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ اس کو (رشوۃ) حاکموں کے پاس پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طور پر کھا جاؤ اور (اسے) تم جانتے بھی ہو۔

فائدہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ آیت اس شخص کے حق میں ہے جس نے کسی شخص سے مال لینا ہو اور اس کا کوئی گواہ نہ ہو۔ یہ شخص اس مال کا انکار کر کے حاکم کے سامنے جھگڑتا ہے حالانکہ جانتا ہے کہ اس پر حق ثابت ہے۔ وہ اس مال کو حرام طریقے سے کھاتا ہے۔ تابعین کی ایک جماعت نے بھی یہی بات کہی ہے۔ پھر یہ کہا کہ تو اس صورت میں جھگڑا نہ کر جبکہ تو جانتا ہو کہ تو ظالم ہے۔ صحیحین میں حضرت ام سلمہ سے آیا ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا غور سے سن لو میں بھی بشر ہوں۔ میرے پاس کوئی جھگڑا لے کر آتا ہے اور شاید تمہارا بعض بعض سے بات چیت میں زیادہ تیز زبان ہو اور میں ظاہری بات پر فیصلہ دے دوں پھر میں اگر کسی مسلمان کا حق کسی اور کو دے دوں تو وہ اس کو آگ کا ٹکڑا سمجھے پھر چاہے تو لے لے اور چاہے تو چھوڑ دے۔ اس آیت کریم اور حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی حاکم کا فیصلہ کسی امر کو اس کی اصلیت سے

تبدیل نہیں کر دیتا اور نہ در حقیقت حرام چیز کو حلال یا حلال کو حرام کر دیتا ہے۔ بلکہ اصل حقیقت پر قائم رہے گا حاکم کو اجر ملے گا اور حیلہ باز پر جو بوجھ ہو گا۔ اسی لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ حالانکہ تم جانتے ہو یعنی تمہارے دعوے کا باطل ہونا اور حیلہ بازی تمہیں معلوم ہے جس کو تم صرف چکنی چپڑی باتوں سے حقیقت ثابت کرنا چاہتے ہو۔ حضرت قتادہ نے کہا: اے لوگو! قاضی کا فیصلہ نہ کسی حلال کو حرام کرتا ہے نہ حرام کو حلال کرتا ہے اور نہ باطل کو حق ثابت کرتا ہے۔ قاضی یا اس کے موافق فیصلہ کرتا ہے جو دیکھتا ہے یا جو لوگ گواہی دیتے ہیں ۔ قاضی بشر ہے اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور درست بات بھی کرتا ہے کسی کو کوئی باطل فیصلہ دیا گیا تو گویا وہ جھگڑا ابھی مکمل نہ ہوا۔ پھر قیامت کے دن اللہ دونوں کو جمع کرے گا اور ناحق سے حق والے کو اس کا حق دے گا اور یہ فیصلہ دنیا والے فیصلے سے کہیں درست اور چست ہو گا۔ جو باطل والے کے بارے میں حق والے پر کیا گیا تھا۔

فائدہ: یہ آیت ساری امت کو شامل ہے اور سب مال اس میں داخل ہے۔ مگر جس پر کوئی شرعی دلیل ہو کہ فلاں مال کا لینا درست ہے۔ اس وقت اس مال کو لینا حق ہو گا باطل نہ ہو گا اور وہ حلال ہو گا۔ گو صاحبِ مال ناخوش ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے قرض دلوانا وغیرہ جبکہ قرض دار نہ دے یا زکوٰۃ لینا جس کو اللہ کریم نے فرض کیا یا جس کسی کا نفقہ شرع میں واجب ہے۔ حاصل یہ ٹھہرا کہ جس مال کا مالک سے لینا شرع سے مباح نہیں کیا وہ باطل طریقے سے کھانے میں شامل ہے۔ گو کہ مال دینے والے کا دل خوش بھی ہو جیسے صبر یعنی یا حلوان کاہن یا قیمت شراب یا جوا یا رشوت یا جھوٹی گواہی یا امانت میں خیانت یا ظلم و غضب یا رہزنی و چوری اور غارت گری سے مال لے کر کھانا۔ یعنی یہ نہ کرو کہ باطل طریقے سے مال کھاؤ اور ادھر حاکموں تک جھوٹی بات پہنچاؤ۔ حاکم خواہ مال میں حکم دے یا خرچ میں جبکہ وہ حکم کسی جھوٹی گواہی یا جھوٹی قسم کی بنیاد پر ہو گا تو اس مال کا کھانا کسی طرح درست نہ ہو گا۔ اکل بالباطل یہی ہے۔ اسی طرح جبکہ حاکم نے رشوت لے کر فیصلہ کر دیا تو وہ رشوت بھی باطل کا مال ہے۔ امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حاکم کے (حکم) فیصلے سے جواز ثابت ہو جاتا ہے۔ سو یہ روایت یا تو ان سے ثابت نہ ہو گی اگر انہی سے ثابت ہے تو مردود ہے۔ جیسا کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی متقدم حدیث اور آیت کی نص سے ثابت ہے کسی نے کہا آیت سے یہ مراد ہے کہ تم حاکموں کے نام سے لوگوں مال نہ کھاؤ۔ لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب ہیں۔ قاضی شریح کہا کرتے تھے کہ میں تیرے موافق فیصلہ کرتا ہوں اور خیال کرتا ہوں کہ تو ظالم ہے لیکن جو دلیل حاضر ہے اس کے مطابق فیصلہ کرنے کے سوا میرے لیے کوئی چارہ نہ ہے مگر میرا حکم کسی حرام کو

تیرے لیے حلال نہ کرے گا۔

یَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَى وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۸۹﴾

(اے محمدؐ) لوگ تم سے نئے چاند کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ گھٹتا بڑھتا کیوں ہے) کہہ دو کہ وہ لوگوں کے (کاموں کی میعادیں) اور حج کے وقت معلوم ہونے کا ذریعہ ہے اور نیکی اس بات میں نہیں کہ (احرام کی حالت میں) گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ بلکہ نیکو کار وہ ہے جو پرہیز گار ہو اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ نجات پاؤ۔

فائدہ: لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے پیغمبر! ﷺ اس کی کیا وجہ ہے کہ چاند ایک حالت پر نہیں رہتا۔ اللہ کریم نے جواب دیا کہ اس پر حالات کی تبدیلی اس لیے رکھی ہے تاکہ اس سے مہینوں اور سالوں کی حد بندی ہو سکے۔ پھر اس کے موافق معاملات اور اللہ کی عبادت مقرر ہو۔ وہ عبادت جو ایک سال پر مقرر ہے وہ ایک روزہ ہے جس کا حکم مذکور ہوا ہے۔ دوسرا حکم حج ہے جس کا حکم اب شروع ہوتا ہے۔ کفر کی غلطیوں سے ایک یہ بھی تھی کہ جب کوئی بغرض حج گھر سے احرام باندھ کر نکل آتا پھر کسی ضرورت سے گھر آنا پڑا تو دروازے سے جانے کی بجائے چھت سے چڑھ کر جاتے تھے۔ اللہ کریم نے اس کی مذمت فرمائی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مواقیت سے مراد یہ ہے کہ لوگ اس سے قرض کی مدت کا ختم ہونا اور عورتوں کی عدت کا مکمل ہونا اور صبح کا وقت معلوم کرتے ہیں۔ ابو العالیہ نے کہا یہ مسلمانوں کے روزہ رکھنے افطار کرنے اور عورتوں کی عدت معلوم کرنے کے لیے وقت کا پیمانہ ہے۔ حضرت عطاء، سدی، قتادہ، ربیع اور ضحاک بھی یہی قول ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً فرمایا کہ اللہ نے چاند کو تمہارے وقت کے لیے مقرر کیا روزہ رکھو چاند دیکھ کر اور چاند دیکھ کر ہی افطار کرو اور اگر بادل ہوں تو تیس کی گنتی پوری کر لو۔ [بروایت عبدالرزاق] اس کو حاکم نے بھی ابن ابی رواد کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ پھر فرمایا وہ ثقہ، عابد، مجتہد اور شریف النسب تھا۔ اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔ اس کو شیخین نے روایت نہیں کیا۔ حدیث طلق میں بھی مرفوعاً یہی مضمون آیا ہے۔ ابو ہریرہ کی حدیث اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے کلام سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ معاذ بن جبل اور ثعلبہ بن عتمہ انصاری رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ علیہ السلام سے کہا تھا کہ چاند کا حال کیسا ہے؟ کہ جب نکلتا ہے تو دھاگے کا سا باریک ہوتا ہے پھر بڑھ کر مکمل ہوتا ہے اور پھر گھٹنا شروع ہو جاتا ہے اور باریک ہو کر پھر اسی طرح نکلتا ہے۔ اس کا جواب یہ

ملا کہ یہ بہت سے کاموں کا وقت بتاتا ہے۔ روزہ رکھنا افطار کرنا، صبح کے اوقات، اوقات حیض مشروط موجلہ ایمان و نذور وغیرہ۔ اس لیے اس کے اور سورج کے طریقہ کار میں فرق ہے وہ ایک حال پر رہتا ہے جبکہ یہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ خازن وابوالسعود نے کہا کہ یہ جواب سوال کے مطابق ہے۔ اس سے مہینوں اور سالوں کا حساب درست رہتا ہے۔ جیسے مالک حقیقی نے فرمایا: ﴿وَلِتَعْلَمُوْا عَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ﴾ ''تاکہ تم سالوں کی تعداد اور حساب جان لو۔'' کسی نے کہا یہ اور طرح جواب دیا اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ تم اس کے مختلف ہونے کا سبب کیا پوچھتے ہو وہ تو غیب کی خبر ہے اس سے تمہیں کچھ تعلق نہ ہے۔ بلکہ اس بات کا سوال کرو جو تم سے متعلق ہے جس طرح کہ ہمارے جواب کا انداز ہے۔ اس طرح دیئے گئے جواب کو اسلوب حکیم کہتے ہیں۔ بخاری شریف میں حضرت براء سے مروی ہے کہ جاہلیت میں جبکہ لوگ احرام باندھ لیتے پھر گھر میں پچھلی جانب سے آتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ گھروں میں دروازوں سے داخل ہو۔ ابو داؤد کا لفظ یہ ہے کہ انصار جب سفر سے واپس لوٹتے تو گھر کے دروازے سے داخل نہ ہوتے۔ حضرت جابر نے کہا قریش حمس کہلاتے تھے وہ حالت احرام میں دروازوں سے آتے جبکہ باقی عرب اور انصار پشتوں کی جانب سے گھر میں داخل ہوتے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ باغ سے باہر تشریف لائے ان کے ساتھ قطبہ بن عامر انصاری بھی تھے۔ لوگوں نے کہا یارسول اللہ علیہ السلام یہ شخص تاجر ہے اور آپ کے ساتھ دروازے سے باہر آیا ہے کہا تم نے ایسا کیوں کہا اس نے جواب دیا جیسا تمہیں کرتے دیکھا ویسا ہی میں نے کیا۔ انہوں نے کہا ہم تو حمس ہیں۔ اس نے کہا میرا دین بھی وہی جو تمہارا دین ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [بروایت ابن ابی حاتم] صحابہ و تابعین کی ایک جماعت سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا جو ان میں سے بغرض سفر گھر سے نکلتا لیکن اس سفر پر نہ جاتا تو واپس آتے ہوئے دروازے سے داخل نہ ہوتا بلکہ مکان کی پچھلی جانب سے داخل ہوتا۔ محمد بن کعب نے کہا جب ان میں سے کوئی اعتکاف کرتا تو دروازے کی جانب سے گھر نہ آتا۔ عطاء بن رباح نے کہا جب وہ لوگ عید سے واپس آتے تو پچھواڑے سے آتے اور اس کو اچھا کام سمجھتے۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ یہ ایک ضرب المثل ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ جاہلوں سے سوال نہ کرنا چاہئے۔ اچھی بات یہ نہیں کہ بلکہ تقویٰ ہے اور اہل علم سے سوال کرو کسی نے کہا یہ مثل ہے اس کے معنی ہیں کہ عورتوں کے پاس ان کے دبر سے نہ آو بلکہ قبل میں جماع کرو۔ اللہ سے ڈرو اور اس کے حکم بجالاؤ۔ اور جس سے منع کیا ہے اس سے رک جاؤ۔ شاید کہ جس دن اللہ تمہیں اپنے سامنے کھڑا کرے گا اس دن تم اس کی پکڑ سے بچ کر اپنی مراد و مقصد کو پاسکو۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿۱۹۱﴾ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿۱۹۳﴾

اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے لڑو، مگر زیادتی نہ کرنا کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور ان کو جہاں پاؤ قتل کر دو، اور جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے (یعنی مکے سے) وہاں سے تم بھی ان کو نکال دو، اور (دین سے گمراہ کرنے کا) فساد قتل و خون ریزی سے کہیں بڑھ کر ہے اور جب تک وہ تم سے مسجد محترم (یعنی خانہ کعبہ) کے پاس نہ لڑیں تم بھی وہاں ان سے نہ لڑنا، ہاں اگر وہ تم سے لڑیں تو تم ان کو قتل کر ڈالو، کافروں کی یہی سزا ہے۔ اور اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے اور (ملک میں) اللہ ہی کا دین ہو جائے اور اگر وہ (فساد سے) باز آجائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں (کرنی چاہئے۔)

فائدہ: حج کے ذکر کے ساتھ ساتھ یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے شہر مکہ امن کا مقام ہے وہاں کوئی شخص اپنے دشمن کو بھی پاتا تو بھی کچھ نہ کہتا۔ حج کے اول اور آخر میں ذوالقعدہ، ذوالحجہ محرم اور چوتھا مہینہ رجب ہے یہ بھی زیارت کا وقت ہے۔ یہ چار ماہ حرمت کی وجہ سے امن والے ہوتے اس میں عرب کی تجارت مراسم ہوتے لڑائیاں موقوف رہتیں اللہ نے ہی ان کی حرمت کا حکم فرمایا اور اس میں بھی جہاد کے کئی آداب سکھائے۔ اور جو فرمایا کہ اگر وہ تم سے لڑیں تو ان سے لڑو لیکن زیادتی نہ کرو اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑائی میں ارادۃً بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرو بلکہ نوجوانوں سے تم لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ مکہ امن کی جگہ ہے لیکن جب انہوں نے پہلے تم پر ظلم کیا اور ایمان لانے کی وجہ سے تمہیں ستانے لگے جو کہ قتل سے بھی سخت معاملہ ہے تو اب انہیں امن نہ رہا انہیں جہاں پاؤ قتل کر دو۔ آخر جب مکہ فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام اجازت دے دی کہ جو ہتھیار سامنے کرے اس کو اس سے مارو۔ لیکن جو مزاحمت نہ کرے اس کو امن دیا جائے۔ پھر اللہ کریم نے فرمایا کہ اگر ان سب باتوں کے باوجود وہ مسلمان ہو جائیں تو ان کی توبہ قبول ہے۔ پھر یہ فرمایا کہ کافروں سے لڑائی کا مقصد ظلم کا سد باب ہے۔ تاکہ کافر دوسروں کو دین سے گمراہ نہ کر سکیں۔ تنہا اللہ کا فیصلہ جاری رہے۔ اگر تابع ہو

کررہیں تو لڑائی کی ضرورت نہ ہے۔ ایمان کا مسئلہ دل پر مرکوز ہے تلوار کے زور سے مسلمان کرنے کا کیا فائدہ۔

فائدہ: ابوالعالیہ نے کہا قتال کی بابت جو آیت سب سے پہلے نازل ہوئی وہ یہی آیت تھی۔ اس کے نزول کے بعد جو آنحضرت ﷺ سے لڑتا اس سے وہ بھی لڑتے لیکن جو نہ لڑتے اس سے درگذر فرماتے تھے۔ حتی کہ سورۃ برأت نازل ہوئی۔ ابن زید کا بھی یہی قول ہے۔ انہوں نے کہا یہ آیت منسوخ ہے اس کی ناسخ یہ آیت ہے: ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوْهُمْ﴾ "کہ مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کردو۔" ابن کثیر فرماتے ہیں اس میں نظر ہے اس لیے کہ اللہ کا فرمان: ﴿اَلَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ "ان دشمنوں پر بھڑکانا ہے جو اسلام اور اہل اسلام سے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔" یعنی جس طرح وہ تم سے لڑتے ہیں اس طرح تم ان سے لڑو۔ جیسے فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَافَّةً﴾ "کہ تم بھی مشرکین سے ہر حال میں لڑو جیسے وہ تم سے ہر حال میں لڑتے ہیں۔" اسی لیے اس آیت میں یہ فرمایا: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ "کہ ان کو جہاں کہیں پاؤ مارو۔" یعنی تمہاری ہمت بھی لڑائی پر اس طرح بلند ہونی چاہیئے جس طرح وہ تم سے لڑائی کے وقت چست ہوتے ہیں اور جیسا کہ وہ تمہیں تمہارے شہروں سے نکالنے پر دلیر ہیں۔ یہ برابر کا بدلہ ہے لیکن زیادتی سے منع فرمایا۔ یعنی ممنوعات کے مرتکب مت ہو جیسے مثلہ کرنا، خیانت کرنا، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں سے لڑنا اور انہیں مارنا جن کو لڑائی کی طاقت نہ ہے۔ یا رہبان و راہبوں کو قتل کرنا، درختوں کو جلانا بغیر مصلحت کے جانوروں کو مارنا وغیرہ۔ حضرت ابن عباس، عمر بن عبدالعزیز، مقاتل بن حبان کا یہی قول ہے اسی لیے صحیح مسلم میں حضرت بریدہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام فرماتے تھے تم جاؤ اور کافروں سے لڑو اور خیانت نہ کرو، دھوکہ نہ دو، مثلہ نہ کرو، بچوں اور مندر والوں کو قتل نہ کرو۔ [بروایت احمد ایضاً] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا لفظ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب لشکر روانہ فرماتے تو کہتے اللہ کے نام سے جاؤ اور اللہ کی راہ میں کافروں سے لڑو لیکن زیادتی نہ کرو، خیانت نہ کرو، مثلہ نہ کرو، بچوں کو اور عبادت خانے والوں کو مت قتل کرو۔ [بروایت احمد] اسی طرح ابوداؤد نے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً کہا۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ بعض غزوات نبوی ﷺ میں ایک عورت مقتول پائی گئی اس پر آپ ﷺ نے بچوں اور عورتوں کے قتل انکار کیا ناپسند کیا اور منع کیا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے مثالیں بیان کیں ایک، تین، پانچ، سات، نو یا گیارہ ان میں سے ایک مثل فرمائی باقی چھوڑ دیں۔ فرمایا ایک کمزور اور محتاج قوم تھی ان کے ساتھ سرکش قوم لڑی تو اللہ نے ضعفاء و محتاجوں کو غلبہ دیا انہوں نے اپنے دشمنوں کو کام کاج پر لگایا اور ان پر جبر کیا مسلط ہو گئے اور قیامت کے دن کے لیے اپنے اوپر اللہ کو

ناراض کرلیا۔[بروایت امام احمد] ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث جید الاسناد ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ان کمزور لوگوں نے طاقت ور لوگوں پر قابو پایا تو ان پر زیادتی کرنا شروع کر دی اور بلاضرورت ظلم کیا جو کام ان سے لینا مناسب نہ تھا وہ بھی ان سے کرواتے۔ اللہ کریم ان کی اس زیادتی کی وجہ سے ان پر ناراض ہو گیا۔ اس باب میں احادیث و آثار بہت ہیں۔ جہاد میں جانوں کا قتل ہونا ہوتا ہے اس لیے اللہ کریم نے آگاہ کر دیا کہ ان کا اللہ کے ساتھ کفر و شرک کرنا اور اللہ کی راہ سے روکنا قتل سے کہیں سخت اور بڑا ہے۔ ابو العالیہ، مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، حسن، قتادہ، ضحاک اور ربیع نے کہا کہ شرک قتل سے بھی سخت تر ہے۔ یعنی اس جگہ فتنے سے شرک مراد ہے۔ پھر یہ فرمایا کہ مسجد الحرام کے پاس مت لڑو۔ صحیحین میں آیا ہے کہ اللہ نے اس دن سے اس کو حرمت دی جس دن آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ اللہ کر احرام کرنے سے یہ قیامت تک حرام ہے۔ اللہ نے میرے لیے دن میں ایک ساعت کے لیے حلال کیا تھا اور اب بھی وہ میری ساعت میں قیامت تک حرام ہے۔ نہ اس کا درخت کاٹا جائے نہ اس کا کانٹا اکھیڑا جائے، پھر جو اس میں رسول اللہ علیہ السلام کی لڑائی سے رخصت کی دلیل لے تو تم اس سے کہہ دو کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو اجازت دی تھی لیکن تمہیں تو اجازت نہیں دی ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں اس سے فتح مکہ کے دن لڑنا مراد ہے اس کو لڑ کر فتح کیا تھا۔ کچھ لوگ خندمہ کے قریب مارے گئے تھے کسی نے کہا بلکہ صلح سے فتح کیا تھا اس دلیل سے کہ جو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا وہ امن میں ہے جو مسجد میں داخل ہو اوہ امن میں ہے جو ابو سفیان کے گھر داخل ہو اوہ امن میں ہے۔ پھر اللہ کریم نے مسجد الحرام کے پاس لڑائی سے منع فرما دیا۔ مگر اس صورت میں اجازت ہو گی جبکہ ابتدائی حملہ کافروں کی طرف سے ہو۔ تو یہ گویا حملہ آور سے دفاع ہو گا جس طرح کہ آنحضرت علیہ السلام نے حدیبیہ کے دن درخت کے نیچے بیعت لی تھی۔ جبکہ قریش و ثقیف حملہ آور ہوئے تھے مگر اس وقت بھی اللہ نے قتال سے روک دیا۔ جیسے فرمایا:﴿وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ﴾ ”اور وہی ذات ہے جس نے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے اصل وادی میں روک دیئے بعد اس کے کہ تمہیں ان پر فتح دی۔“ اور فرمایا:﴿لَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِیْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَیْرِ عِلْمٍ لِیُدْخِلَ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ لَوْ تَزَیَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝﴾ ”اگر کچھ مومن مرد اور مومنہ عورتیں نہ ہوتیں جنہیں تم بغیر علم سے کچل دیتے پھر تمہیں ان کی طرف سے لاعلمی میں عیب پہنچتا تاکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے اگر وہ علیحدہ ہوتے تو ہم ان میں سے

کافروں کو دردناک عذاب دیتے۔" پھر اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اگر وہ لوگ حرم میں نہ لڑیں اور توبہ کر کے مسلمان ہو جائیں تو اللہ ان کے گناہ بخش دے گا۔ گو اس سے پہلے انہوں نے مسلمانوں کو حرم میں قتل کیا ہو کیونکہ اللہ کے نزدیک کوئی گناہ اتنا بڑا نہ ہے جو کہ توبہ کرنے سے بھی بخشا نہ جائے۔ پھر فرمایا کہ کافروں سے اتنا لڑو کہ فتنہ شرک نہ رہے۔ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے کہ اللہ کا دین سب دینوں پر غالب ہو جائے جس طرح کہ صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ کوئی شخص شجاعت کے لیے لڑتا ہے کوئی حمیت قبائل کی وجہ سے لڑتا ہے کوئی ریاء کے لیے لڑتا ہے تو ان میں سے کون سا لڑنا اللہ کی راہ میں ہے۔ فرمایا جو اس لیے لڑے کہ اللہ کی بات سب سے بلند تر ہو وہی اللہ کی راہ میں ہے۔ صحیحین میں ہے کہ مجھے حکم ہے کہ لوگوں سے لڑتا رہوں حتیٰ کہ وہ سب ((لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ)) کے قائل ہو جائیں۔ (جب ایسا کر لیں گے) تو وہ اپنے جان و مال مجھ سے بچا لیں گے مگر (اسلام کے) حق سے ان کا حساب اللہ پر ہے، پھر اگر وہ شرک اور مومنین کے قتال سے باز رہیں۔ پھر جو ان کے اس باز رہنے کے بعد ان سے لڑائی کرے گا وہ زیادتی کرنے والا ظالم ہو گا۔ اس جگہ زیادتی سے مقابلہ مراد ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ﴾ "کہ پھر جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اتنی زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی۔" اور اللہ کا یہ فرمان: ﴿جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ "کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے۔" اور اللہ کریم کا یہ فرمان: ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ "اور اگر تم بدلہ لینا چاہو تو اتنا بدلہ لو جتنا تم پر زیادتی کی گئی۔" حضرت عکرمہ و قتادہ فرماتے ہیں کہ ظالم وہ ہے جس نے ((لا اله الا الله)) کہنے سے انکار کیا۔ بخاری شریف میں مروی ہے کہ فتنہ ابن زبیر کے زمانہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک دو آدمی آئے اور کہا کہ لوگ ہلاک ہو رہے ہیں اور تم عمر کے بیٹے اور صاحبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو تمہیں لڑائی میں نکلنے سے کون سی چیز مانع ہے۔ انہوں نے فرمایا مانع امر یہ ہے کہ اللہ کریم نے میرے بھائی کا خون حرام کیا ہے۔ کہا اللہ نے یہ بھی تو فرمایا ہے: ﴿وَقَاتِلُوْا حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ "کہ یہاں تک لڑو کہ فتنہ نہ رہے۔" آپؓ نے فرمایا ہم نے جہاد کیا حتیٰ کہ فتنہ نہ رہا اور دین اللہ کا ہو گیا اور تم یہ چاہتے ہو کہ اس قدر لڑو کہ فتنہ برپا ہو جائے۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آکر کہا تم ایک سال حج کرتے ہو اور ایک سال گھر رہتے ہو کیا وجہ ہے کہ تم جہاد سے رک گئے ہو۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ اللہ نے جہاد کی ترغیب کس قدر دی ہے۔ کہا اے بھتیجے! اسلام کی بنیاد پانچ ارکان پر ہے۔ اللہ اور پیغمبر علیہ السلام پر ایمان لانا، پانچ وقت نماز ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا، حج کرنا اور زکوٰۃ ادا

کرنا۔اس نے کہا کیا تم نے کتاب اللہ کا فرمان نہ سنا جو فرمایا:﴿ وَاِنْ طَائِفَتَان مِنَ الْمُؤمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدَاهُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوْا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْءَ اِلٰی اَمْرِ اللّٰهِ وَقَاتِلُوْا هُمْ حتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ ﴾ "کہ اگر مومنین کی دو جماعتیں باہم جھگڑ پڑیں تو ان دونوں میں اصلاح کروادو پھر اگر ایک جماعت دوسری پر بغاوت کرے تو بغاوت کرنے والی سے لڑو حتیٰ کہ وہ اللہ کے امر کی طرف لوٹ آئے۔اور ان (کافروں) سے لڑو حتیٰ کہ فتنہ نہ رہے۔" انہوں نے فرمایا ہم یہ کام عہد رسالت میں کر چکے ہیں اسلام کم تھا آدمی فتنۂ دین میں پھنس جاتا یا مارا جاتا یا سزائیں دیا جاتا لیکن جب اسلام عام ہو گیا اور کوئی فتنہ نہ رہا وہ شخص بولا کہ آپؓ، علیؓ اور عثمانؓ کے متعلق کیا کہتے ہیں۔کہا اللہ نے تو عثمان کو معاف کر دیا ہے لیکن تمہیں معاف کرنا اچھا نہیں لگتا۔رہے حضرت علیؓ سو وہ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد اور داماد ہیں پھر ہاتھ سے اشارہ کیا کہ یہ ان کا گھر (مقام) ہے جسے تم دیکھ رہے ہو۔

فائدہ: فتح البیان کا لفظ یہ ہے کہ اس میں اختلاف علماء نہ ہے کہ قتال ہجرت سے پہلے منع تھا اس قول کی بنیاد پر کہا:﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ﴾کہ "انہیں معاف کیجئے اور درگذر کیجئے۔"اور یہ فرمان کہ:﴿ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلاً ﴾" اور انہیں اچھے طریقے سے چھوڑیے۔" اور یہ فرمان:﴿لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ﴾کہ "آپؐ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔" اور یہ فرمان:﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴾"کہ اچھے طریقے سے ان سے دفاع کیجئے۔" یعنی ان سے بھی بہتر انداز اپنائیے۔اس کے علاوہ جو اس قسم کی مکی آیات ہیں وہ بھی اسی مضمون پر دلیل ہیں پھر جب ہجرت فرما کر مدینہ تشرف لائے۔لڑائی کا حکم ہوا یہ آیت باب نازل ہوئی۔جبکہ کسی نے کہا سب سے پہلے قتال والی آیت:﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا﴾"کہ جن سے لوگ لڑتے ہیں انہیں اجازت (قتال) دے دی گئی اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے۔" حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی:﴿اقْتُلُوْا الْمُشْرِکِیْنَ ﴾کہ "مشرکوں سے لڑو۔" اور یہ فرمان:﴿وَقَاتِلُوْا الْمُشْرِکِیْنَ کَافَّةً ﴾کہ "مشرکین سے ہر صورت لڑائی کرو۔" کہا جاتا ہے کہ اس آیت سے ستر آیات منسوخ ہو گئیں۔ایک جماعت سلف نے کہا:﴿ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُم ﴾سے وہ لوگ مراد ہیں جو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں ،معذوروں، دیوانوں اور درویشوں کے علاوہ ہیں۔اور اس آیت کو محکم یعنی غیر منسوخ ثابت کیا۔پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ اگر کافر پیش قدمی کریں تو جواباً تم بھی لڑو لیکن دوسری آیت میں حکم دیا کہ اگر وہ لڑیں تو بھی لڑو لیکن اگر نہ بھی لڑیں تب بھی تم ان سے جنگ جاری رکھو۔مگر بیت الحرام کو اس سے مستثنیٰ ہے۔فتح مکہ کے وقت جو مسلمان نہ ہوا اس کو اَخْرِجُوْهُمْ کے حکم سے مکہ سے نکال دیا۔فتنے سے مراد وہ آفت بھی ہو سکتی ہے جو انسان پر اس کے جان و مال اور عزت کی بابت واقع ہوئی ہے۔وہ بھی قتل سے سخت ہے۔ظاہر یہی ہے کہ اس سے دین کا فتنہ مراد ہے وہ کسی بھی

صورت میں ہو۔اسی لیے اس سے کو اَشَدُّ تعبیر کیا۔ایک جماعت نے کہا یہ آیت محکم ہے یعنی حرم میں قتل کرنا حرام ہے ہاں اگر کوئی زیادتی کرے تو جواباً مقاتلہ سے مدافعت کر سکتا ہے۔امام شوکانی فرماتے ہیں یہی بات حق ہے۔ جس نے کہا کہ یہ آیت منسوخ ہے اس کے نزدیک اس میں جمع ممکن ہے کہ مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو مگر حرم میں یعنی وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔یعنی عام حکم سے خاص حکم سے مخصوص کر لیا۔وہ حدیث جس میں ایک جماعت کی حلت کا ذکر ہے وہ اسی کی تائید کرتی ہے جو نسخ کے قائل ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ابن اخطل کو قتل کرادیا جبکہ وہ کعبہ کے پردے سے لٹکا ہوا تھا۔اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قتل اس وقت ہوا جبکہ آنحضرت علیہ السلام کو ایک گھڑی کعبہ کو حلال کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔اب یہی حکم ہے کہ ابتدا نہ کرو لیکن اگر وہ حملہ کریں تو مشرکین کو قتل کرو گو حرم میں ہو۔واللہ اعلم۔

الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٩٤﴾	ادب کا مہینہ ادب کے مہینے کے مقابل ہے اور ادب کی چیزیں ایک دوسرے کا بدلہ ہیں پس اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی وہ تم پر کرے ویسی ہی تم اس پر کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ڈرنے والوں کے ساتھ ہے۔

فائدہ: یعنی اگر کوئی کافر حرمت والے مہینے کی حرمت تسلیم کر لے اور تم سے جنگ نہ کرے تو تم بھی باز رہو اور مکہ والے اس مہینے میں بھی ظلم کرتے رہے۔پھر مسلمان انہیں کیونکر معاف کریں۔بلکہ سفر حدیبیہ میں ماہ ذیقعدہ تھا۔آپ علیہ السلام عمرے کو تشریف لے گئے تھے اور کافر لڑنے کو تیار ہو گئے۔یہ آیت اس لیے نازل ہوئی کہ مسلمان خطرہ محسوس کرتے تھے کہ اگر حرمت والے مہینے میں کافر لڑنے لگے تو ہم کیا کریں گے۔

فائدہ: حضرت ابن عباس، ضحاک، سدی، قتادہ، مقسم، ربیع اور عطاء وغیرھم نے کہا جب آنحضرت ﷺ ہجرت کے چھٹے برس عمرے کے لیے مکہ تشریف لے گئے تو ماہِ ذیقعدہ ہونے کے باوجود مشرکین مکہ نے آپ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بیت اللہ میں آنے سے روک دیا۔حالانکہ حرمت والا مہینہ تھا۔پھر آخر کار آئندہ برس آنے پر صلح کر لی۔چنانچہ اگلے برس آنحضرت ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم سمیت مکہ میں داخل ہوئے۔ وللہ الحمد۔اللہ کریم نے اس قصہ کا ذکر فرمایا اور یہ آیت نازل فرمائی۔حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ آپ حرمت والے شہر میں تب تک نہ لڑتے جب تک آپ سے کوئی کافر مقابلہ نہ کرتا۔لیکن جب لڑتے اور حرمت والا مہینہ آجاتا تو لڑائی سے مہینہ گذرنے تک رک جاتے۔اس کو امام احمد نے بروایت صحیح بیان کیا ہے۔یہ واقعہ

اس طرح پیش آیا کہ آنحضرت علیہ السلام حدیبیہ میں صحابہؓ کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے کہ خبر آئی کہ عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے جبکہ آپ علیہ السلام نے انہیں مکہ کی طرف سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ وہاں آپ علیہ السلام نے ایک ہزار چار سو صحابہ رضی اللہ عنہم سے قتال مشرکین پر بیعت لی لیکن جب معلوم ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ زندہ ہیں تو رک گئے اور صلح کر لی۔ پھر جو ہوا سو ہوا۔ اسی طرح جب حنین کے دن ہوازن سے لڑائی کر کے فارغ ہوئے تو طائف کا محاصرہ کر لیا۔ اتنی دیر میں ذیقعدہ مہینہ شروع ہو گیا۔ اس محاصرے میں منجنیق (پتھر گرانے والا آلہ) سے پتھر برسائے جاتے تھے۔ اس مہینے کی وجہ سے چالیس دن محاصرہ رہا۔ صحیحین میں آیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بہت سے صحابہ شہید ہونے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے بغیر فتح کے واپس لوٹ آئے۔ مکہ کی طرف پھرے واپسی پر عمرہ جعرانہ کیا۔ جہاں حنین کی غنیمتیں تقسیم فرمائیں۔ یہ عمرہ بھی ٦ھ میں ماہ ذیقعدہ میں ہوا تھا۔

فائدہ: اس آیت میں عدل کا حکم فرمایا ہے کہ مشرکین سے بھی عدل ہی کرو۔ جیسے ارشاد فرمایا: ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ﴾ "کہ جب تم بدلہ لینا چاہو تو اتنا ہی لو جتنی تم کو سزا دی گئی۔" اور فرمایا: ﴿وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ "کہ برائی کا بدلہ اسی مقدار سے برائی ہے۔" حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی جہاں نہ جہاد تھا نہ کوئی تکلیف۔ پھر جہاد والی آیت جو مدینہ میں اتری اس نے اس کو منسوخ کر دیا۔ ابن جریر اس قول کا رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں بلکہ یہ آیت مدنی ہے اور عمرہ قضاء کے بعد نازل ہوئی اور اس قول کی نسبت حضرت مجاہد کی طرف کی ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ اپنی تائید و نصرت سے مومنین کے ساتھ ہے۔ سلف و خلف مفسرین نے سوائے آیتِ استواء کے تمام آیات جن میں قرب و معیت و احاطہ کا ذکر ہے ان سب کی تاویل مناسب مقام کے لحاظ سے مناسب الفاظ سے کی ہے۔ اہل مذاہب اربعہ اس کے متعلق ایک دوسرے کے ہم خیال اور ایک دوسرے کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔ ایسا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جو علو و فوق ذاتِ استواء سے سمجھا گیا ہے وہ اپنے حال پر قائم رہے اور آیات متشابہ محکم آیات کے موافق ہو جائیں لیکن محققین اہل حدیث کا طریقہ یہ ہے کہ وہ قرب و معیتِ صفات الٰہیہ کی اور نصر و تائید کی تاویل کیے بغیر ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس معیت و قرب کی کیفیت مستوی علی العرش کے حوالہ سے رکھتے ہیں کہ وہی جانے یہ معیت کیسی ہے اور یہ قرب کیسا ہے۔ یا اس صفت استواء جس کا متقضی یہ ہے کہ وہ ذاتِ پاک سے سارے عالم سے اوپر اور الگ تھلگ ہے۔ عرش جو کہ فقہائے مخلوقات اور عنایت کائنات ہے جس کے اوپر کوئی مخلوق نہ ہے کے سبب وہ سب سے بلند و برتر ہے۔ ہاں جس جگہ اللہ تعالیٰ نے خود علم کی تقیید کی ہے جیسے ہر چیز کو احاطہ کرنے کا باب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ

اس سے علمی احاطہ مراد ہے۔اسی دلیل سے بعض اہل علم نے قرب و معیت کے مقام پر بھی کسی مناسب لفظ سے تاویل کر دی ہے گو یہ تفسیر شرع کے مطلوب کے خلاف نہ ہے مگر اس میں بحث نہ کرنا زیادہ عمدہ ہے۔

فائدہ: فتح البیان میں فرمایا کہ دفاع و بدلے کے طور پر حرمت والے شہر میں لڑنا منع نہ ہے۔یہ آیت اس بات میں بڑی واضح ہے کہ حدیبیہ میں ان سے جنگ ہوئی تھی مگر اتنی سی کہ تھوڑی بہت سنگ باری اور تیر اندازی سے کچھ ہلچل سی ہوئی زیادہ گرما گرمی سے بچاؤ ہو گیا۔کسی نے کہا کہ ابتدائی اسلام میں بدلہ لینا جائز تھا پھر اس آیت سے منسوخ ہو گیا۔کسی نے کہا نہیں بلکہ اب بھی امت اسلامیہ میں یہ حکم باقی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے مال و جان کو نقصان دے یا آبرو ریزی کرے تو وہ اس سے بدلہ لے سکتا ہے۔شافعی وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔باقی دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ قصاص کے امور حکام پر لازم ہیں اگر وہ نافذ کریں گے تو ہو گا۔اموال کا بھی یہی حکم ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم سے اگر کسی نے خیانت کی تو جواباً خیانت نہ کرو بلکہ اس کی امانت ادا کرو۔ [بتخریج دار قطنی وغیرہ] امام ابو حنیفہ ،مالکیہ اور عطاء اسی طرف گئے ہیں جبکہ پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ابن منذر اسی کے قائل ہیں۔ابن العربی اور قرطبی بھی اسی کی تائید کرتے ہیں بلکہ داؤدی نے اس کو مالک سے بھی بیان کیا ہے۔آنحضرت ﷺ نے ابو سفیان کی بیوی سے کہا تھا کہ تو اس کے مال سے اس قدر لے لیا کر جتنا تجھے اور تیری اولاد کو کفایت کرے۔یہ صحیح حدیث اسی کی تائید کرتی ہے۔اس سے واضح تر آیت باب اس مضمون پر روشنی ڈالتی ہے :﴿فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ﴾ ”کہ جو تم پر زیادتی کرے ۔“اور یہ جملہ گویا پہلے جملے کی تائید ہے کہ ﴿وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ﴾ ”کہ ہر حرمت ریزی میں بدلہ ہے مگر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔یہ آیت منسوخ ہے اس کی ناسخ :﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا﴾ ”کہ جو شخص مظلوم مارا گیا تو ہم نے اس کے وارث کو غلبہ دیا ہے۔“ یہ آیت ہے کہ یعنی مقتول کا مددگار بادشاہ وقت ہے۔وہ قتل کا بدلہ قاتل سے لے گا۔پھر جس نے بادشاہ سے نہ پوچھا اور خود بدلہ لے لیا اس نے گناہ کیا اور زیادتی کی۔اسی نے جاہلیت کا سا کام کیا اور اللہ کا حکم نہ مانا۔اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ سلطان سے وہ غلبہ مراد ہے جو مقتول کے وارث کو قاتل پر حاصل ہوتا ہے۔اسی لیے قتل میں زیادتی کرنے سے منع فرمایا ہے۔اگر آیت کے یہی معنی ہوں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائے ہیں تو عام آیات میں سے یہ آیت قتل کی تخصیص کرنے والی مراد لی جائے گی۔ناسخ نہ ہو گی۔اس لیے کہ اس آیت میں صرف قتل پر ابھارنا ہے اور آیات مذکورہ قتل اور دوسری چیزوں کو شامل ہے۔یہ بات لغت سے معلوم ہے جس پر تفسیر کا مدار و مرکز ہے۔

وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٩٥﴾

اور اللہ کی راہ میں (مال) خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

فائدہ: یعنی جہاد ترک نہ کرو اسی میں تمہاری ہلاکت ہے۔ بخاری نے حضرت حذیفہ سے روایت کی اہے کہ یہ آیت نفقہ کے متعلق اتری ہے۔ یعنی جہاد میں خرچ کرنے کے متعلق۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ ابو عمران نے کہا کہ جنگ قسطنطنیہ میں ایک مہاجر دشمنوں کی صفوں کو پھاڑ کر اس میں گھس گیا۔ لوگوں نے کہا دیکھو اس نے اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالا ہے۔ ہمارے ساتھ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے انہوں نے فرمایا میں اس آیت کو خوب جانتا ہوں یہ ہمارے حق میں نازل ہوئی ہے۔ ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہے اور ان کے ساتھ مل کر لڑتے رہے حتیٰ کہ اسلام پھیل گیا اور غالب ہو گیا۔ ہم سب انصاری جمع ہوئے اور یہ بات طے پائی کہ اب تو جہاد موقوف ہے۔ اب اہل و عیال میں رہ کر گھر بار کو سنبھالیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی سو یہی ہلاکت ہے کہ اہل و عیال میں منہمک ہونا اور جہاد چھوڑ دینا۔ [بروایت اهل السنن، عبد بن حمید، ابن ابی حاتم، ابن جریر، ابن مردویه، ابو یعلیٰ، ابن حبان اور حاکم] اس کو ترمذی نے حسن صحیح غریب کہا اور حاکم نے شیخین کی شرط پر بتایا ہے۔ ابوداؤد نے اس کو اور طریق سے کچھ مختلف الفاظ سے بیان کیا ہے۔ حضرت براء بن عازب سے ایک شخص نے پوچھا کہ کیا اگر میں تنہا دشمن پر حملہ کروں بعد وہ مجھے قتل کر دیں تو کیا میں نے خود اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالا۔ کہا نہیں اللہ نے اپنے پیغمبر سے کہا: ﴿فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ﴾ "کہ اللہ کے راستے میں لڑو اور صرف اپنے نفس کو تکلیف دو۔" بلکہ یہ آیت باب تو جہاد میں خرچ کرنے کے متعلق آئی ہے۔ حاکم نے کہا یہ شیخین کی شرط پر ہے۔ ترمذی نے اتنا اور زیادہ کیا کہ تہلکہ یہ ہے کہ آدمی گناہ تو کرے لیکن توبہ نہ کرے۔ مگر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے اسی آیت کی بنیاد پر ایک شخص کو محاصرہ دمشق سے واپس بلا لیا وہ شخص از دشنوۂ سے تھا اس نے تنہا دشمنوں کا محاصرہ کیا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت نفس جہاد میں نہیں بلکہ انفاق فی سبیل اللہ میں ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو کہ کہیں ہلاکت میں نہ پڑو۔ ضحاک فرماتے ہیں کہ انصار صدقات دیا کرتے تھے ایک سال قحط پڑا تو انہوں نے اپنا ہاتھ روک لیا، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ تہلکہ سے بخل مراد ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر فرماتے ہیں کہ ہلاکت یہ ہے کہ آدمی گناہ کرنے کے بعد توبہ سے ناامید ہو کر میری توبہ قبول نہ ہو گی۔ عبیدہ، حسن اور ابن سیرین کا بھی یہی قول ہے۔ یعنی ناامیدی کی بنیاد پر

زیادہ گناہ کر کے ہلاک ہو جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایاتھلکہ سے اللہ کا عذاب مراد ہے۔ حضرت زید بن اسلم نے کہاتھلکہ یہ ہے کہ آدمی بھوکا پیاسا چلنے سے ہلاک ہو جائے۔

فتح البیان میں کہاہے حق یہ ہے کہ عموم لفظ کا اعتبار ہے سبب کے خصوص کا نہیں، پھر جس بات پر لفظ تھلکہ صادق آتا ہو وہ دین کی ہو یا دنیا کی وہ اس آیت میں داخل ہے۔ابن جریر کا بھی یہی قول ہے۔اسی آیت کے تحت وہ شخص بھی ہے جو تنہا ایک لشکر سے مقابلہ نہ کر سکتا ہو لیکن ان پر جا گھسے اور مجاہدین کو اس لحاظ سے اس کا کچھ نفع نہ ہو سکے۔

فائدہ: اس آیت میں سبیل اللہ سے تمام طاعات و قربات مراد ہیں۔ خصوصاً مالوں کا دشمنوں کے مقابلے و مقاتلے میں صرف کرنا جس سے دشمنوں کو کمزور اور مسلمانوں کو قوت حاصل ہو کہ اس کو ترک کرنا ہلاکت ہے۔ پھر احسان کا ذکر کیا جو مقامات طاعت کا اعلیٰ درجہ ہے۔

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذَلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١٩٦﴾

اور اللہ (کی خوشنودی) کے لیے حج اور عمرے کو پورا کرو اور اگر (رستے میں) روک لیے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو) اور جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے سر نہ منڈاؤ، اور اگر کوئی تم میں بیمار ہو یا اس کے سر میں کسی طرح کی تکلیف ہو، تو اگر وہ سر منڈا لے تو اس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے، پھر جب (تکلیف دور ہو کر) تم مطمئن ہو جاؤ، تو جو (تم میں) حج کے وقت تک عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے، اور جس کو (قربانی) نہ ملے وہ تین روزے ایام حج میں رکھے اور سات جب واپس ہو، یہ پورے دس ہوئے، یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جس کے اہل و عیال مکے میں نہ رہتے ہوں اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔

فائدہ: یہاں سے احکام حج کا آغاز کیا۔حج کا طریقہ یہ ہے کہ احرام باندھے اور عرفہ کے دن عرفات میں حاضر ہو۔ پھر وہاں سے چلے اور مشعر الحرام میں رات بسر کرے۔ پھر صبح قربانی کرے، منیٰ میں پہنچ کر کنکر مارے اور حجامت کے بعد احرام کھول دے۔ پھر مکہ میں جا کر طواف کعبہ کرے، پھر صفا مروہ کی سعی کرے، پھر منیٰ میں

آکر تین دن وہاں گذارے، ہر روز کنکریاں مارے، پھر مکہ جا کر طواف رخصت کرے اور چلا جائے۔ عمرے کا طریقہ یہ ہے کہ جن دنوں وہ چاہے احرام باندھے اور طواف کعبہ کرے پھر صفاء و مروہ کی سعی کر کے حلق راس یا قصر کروائے اور احرام کھول دے۔ حج اور عمرے میں قربانی ضروری نہ ہے مگر ہاں کسی سبب سے۔ یہاں اللہ کریم نے تین سبب بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ سبب کہ وہ احرام باندھ کر حج یا عمرہ کی غرض سے نکلے لیکن رستے میں بیماری یا دشمن کی وجہ سے روکا جائے تو وہ کسی کے ہاتھ قربانی بھیج دے جب مکہ میں قربانی ذبح ہو تب احرام سے آزاد ہو۔ اس سے پہلے حلق یا قصر نہ کروائے۔ دوسرا یہ کہ سر درد یا بالوں کی تکلیف سے بحالت احرام حجامت کروالے تو اس کا بدلہ دے یا قربانی پہنچائے یا تین روزے رکھے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ تیسرا سبب یہ بتایا کہ حج اور عمرہ اکٹھا کرے جسے حج قران کہا جاتا ہے تو اس میں قربانی ضروری ہے۔ اگر قربانی نہ ہو تو دس روزے رکھے تین دوران حج اور سات وطن واپسی پر۔ اور قربانی کم از کم ایک بکری ایک شخص سے کفایت کرے گی اور گائے، اونٹ سات شخصوں سے۔ اور حج قرآن میں جو قربانی لازم ہے وہ مکہ کے رہنے والوں کے لیے لازم نہ ہے۔ یہ موضح قرآن کا فائدہ ہے۔ حج و عمرہ کے فضائل اور باقی احکام رسالہ "ایضاح الحجه" میں لکھے گئے ہیں۔

فائدہ: اللہ کریم نے احکام صیام کے بعد جہاد کا ذکر کیا اس کے بعد اب احکام حج بیان فرمائے ہیں۔ فرمایا حج اور عمرہ کو پورا کرو۔ سیاق کا ظاہر یہ ہے کہ جب حج یا عمرہ کی ادائیگی شروع کرو تو پھر اس کو پورا کرو۔ ادھورا نہ چھوڑو اسی لیے اگر رکنے کی صورت پیدا ہو جائے تو اس کا حل بھی بتا دیا کہ اگر تم اس کو تمام نہ کر سکو تو پھر اس طرح کرو علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب حج و عمرہ شروع کر لیا تو وہ لازم ہو گیا۔ خواہ عمرے کو واجب کہیں یا مستحب کہیں۔ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اتمام یہ ہے کہ احرام گھر سے باندھ کر چلے۔ حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر ،طاؤس کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ اتمام یہ ہے کہ جب گھر سے احرام باندھ کر چلے تو حج و عمرے کے سوا اور کوئی نیت نہ ہو۔ میقات سے تکبیرات پڑھے، ایسے نہ ہو کہ تجارت وغیرہ کی غرض سے نکلے اور مکہ کے پاس سے گذرتے ہوئے کہے کہ حج یا عمرہ کرتا چلوں۔ یہ اگرچہ کافی ہے لیکن پورا کرنا وہی ہے کہ اسی کے ارادے سے نکلے اور کسی کام کے لیے نہ جائے۔ مکحول نے کہا اتمام یہ ہے کہ ان دونوں کو میقات سے شروع کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اتمام یہ ہے کہ عمرہ کو حج کے وقت کے علاوہ بجا لائے کیونکہ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ﴾ کہ "حج کے کئی معلوم مہینے ہیں۔" قاسم بن محمد نے کہا عمرہ حج کے مہینوں میں پورا نہیں ہوتا۔ کسی نے کہا محرم میں عمرہ کیسا ہے؟ کہا ہاں۔ وہ اس کو مکمل جانتے تھے۔ حضرت قتادہ سے بھی اسی طرح

مروی ہے مگر اس میں نظر ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ آپ علیہ السلام نے چار عمرے کیے اور چاروں ہی ذیقعدہ میں کیے ایک عمرہ حدیبیہ سنہ ۶ھ، دوسرے عمرہ قضاء سنہ ۷ھ عمرہ جعرانہ سنہ ۸ھ اس کے بعد سنہ ۱۰ھ میں حج کے ساتھ عمرہ کیا اس کا احرام ذیقعدہ میں باندھا۔ ان کے علاوہ ہجرت کے بعد کوئی عمرہ نہیں کیا۔ لیکن آپ علیہ السلام نے ام ہانیؓ سے فرمایا کہ رمضان میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے۔ اور میرے ساتھ اس لیے فرمایا تھا کہ انہوں نے آپ علیہ لسلام کے ساتھ حج پر جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن سواری نہ ملنے کی وجہ سے رہ گئیں۔ یہ قصہ بخاری شریف میں مفصل مذکور ہے۔ مگر حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ یہ ان کے خصائص میں تھا۔ سدی کا یہ قول ہے کہ اتمام سے مراد یہ ہے کہ حج و عمرے کو قائم کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اتمام یہ ہے کہ جس نے حج یا عمرے کا احرام باندھا ہو اس کے لیے یہ لائق نہ ہے کہ حج اور عمرے کو پورا کیے بغیر احرام کھول دے۔ نحر کے دن حج کا پورا ہونا یہ ہے کہ جمرے کو کنکر مارے پھر طواف کر کے صفا مروہ کی سعی کرے اب احرام اتار دے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ حج عرفہ ہے اور عمرہ طواف ہے۔ حضرت عبداللہ نے اس آیت کو اس طرح پڑھا ہے: ﴿اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ اِلَى الْبَیْتِ﴾ یعنی "عمرہ میں بیت اللہ سے آگے نہ بڑھے۔" علقمہ نے اَتِمُّوا کی جگہ اَقِیْمُوا پڑھا ہے۔ شعبی نے وَالْعُمْرَةُ کو مرفوع پڑھا ہے۔ یعنی عمرہ واجب نہ ہے۔ بہت سی احادیث میں کئی طریق سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حج اور عمرہ کا اکٹھا احرام باندھا تھا۔ صحیح میں آیا ہے کہ آپ علیہ السلام نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا جو قربانی ساتھ لایا ہو وہ دونوں احرام باندھے۔ صحیح میں یہ بھی ہے کہ عمرہ قیامت تک حج میں داخل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حج کی اقسام میں سب سے افضل قسم حج تمتع ہے۔ گو کہ کسی نے قران اور کسی نے افراد کو افضل کہا ہے۔ صحیحین میں مروی ہے کہ ایک شخص نے مقام جعرانہ میں آنحضرت ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا کہ ایک شخص نے عمرہ کا احرام باندھا ہے اور جبہ پہنے ہوئے اور خوشبو لگائی ہوئی ہے۔ آپ علیہ السلام خاموش رہے پھر وحی آئی، آپ علیہ السلام نے سر اٹھا کر پوچھا سائل کہاں ہے؟ اس نے کہا میں حاضر ہوں۔ فرمایا جبے کو اتار دے اور خوشبو کو دھو دے۔ پھر جو کام تو حج میں کرتا ہے وہی عمرے میں کرو۔ حج و عمرے کے فضائل میں بہت سی احادیث مروی ہیں یہ انکی تفصیلی ذکر کا مقام نہ ہے۔ اس کے متعلق ایک چہل حدیث علیحدہ لکھی گئی ہے۔ "طراز الخمرہ" اور "ایضاح الحجہ" میں بھی حج اور عمرہ کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

فائدہ: اس بات پر امت کا اتفاق ہے کہ قدرت والے پر حج واجب ہے۔ اس آیت سے بعض نے عمرے

کو وجوب پر دلالت کی ہے اس طرح کہ اتمام کا حکم گویا امر ہے۔ صحابہؓ و تابعین کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ شافعی و احمد وغیرہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ مالک، نخعی اور اصحاب الرائے کے نزدیک عمرہ سنت ہے واجب نہ ہے۔ امام ابو حنیفہ اس کے وجوب کے قائل ہیں۔ ابن مسعود ور جابر رضی اللہ عنہما بھی اس کو سنت کہتے ہیں۔ حضرت زید بن ثابت کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حج اور عمرہ دو فرض ہیں، کچھ حرج نہ ہے تو جسے چاہے پہلے شروع کر۔ [بتخریج الدار قطنی والحاکم] حضرت طلحہ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ حج جہاد ہے اور عمرہ نفل ہے۔ حضرت جابرؓ کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ ایک آدمی نے کہا کیا عمرہ واجب ہے؟ کہا نہیں۔ لیکن اگر تم عمرہ کرو گے تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ امام شوکانی اسی کے قائل ہیں کہ عمرہ سنت ہے واجب نہ ہے۔ آیت و احادیث اس بات پر دلیل ہیں کہ جب عمرہ کے افعال شروع کر دیئے تو اب اس کا پورا کرنا واجب ہو گا اس میں کوئی اختلاف نہ ہے۔ اس سے ان احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے جن کا مفہوم باہم کو مختلف ہے۔

فائدہ: حج کے پانچ ارکان ہیں۔ ایک احرام باندھنا، دوسرا عرفہ میں قیام کرنا، تیسرا طواف، چوتھا سعی کرنا صفا و مروہ کی، پانچواں سر کے بال منڈانا یا کترانا۔ اور عمرے کے چار ارکان ہیں۔ احرام، طواف، سعی کرنا، حلق راس یا قصر۔ جب ان ارکان کی ادائیگی ہو گئی تو حج و عمرہ تمام ہو گیا۔ رہا حصر سو اہل علم نے کہا کہ یہ آیت حصر سنہ ۶ھ میں حدیبیہ کے سال نازل ہوئی۔ جبکہ مشرکین مکہ نے آنحضرت ﷺ کو مکہ نہ جانے دیا۔ اور اللہ کریم نے سورۃ فتح مکمل نازل کی اور اصحاب رسول ﷺ کو رخصت دی کہ جو قربانی وہ ساتھ لائے ہیں انہیں ذبح کر دیں۔ یہ ستر اونٹ تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نسخ کی امید میں نہ احرام کھولے نہ قصر و حلق راس کروایا۔ آخر سب سے پہلے آپ علیہ السلام نے حلق راس کروایا اور احرام سے آزاد ہو گئے۔ تب اکثر صحابہؓ نے احرام کھولا بعض نے حلق کروایا اور بعض نے بال کترا لیے اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا اللہ حلق کروانے والوں پر رحم کرے۔ اس پر لوگوں کے کہنے پر تیسری دفعہ قصر والوں کے لیے بھی دعا کی۔ اس ھدی میں ایک اونٹ سات شخص حصہ دار تھے۔ سب لوگ ایک ہزار چار سو تھے جو حدیبیہ مقام پر اترے تھے۔ بعض نے کہا نہیں بلکہ وہ کنارہ حرم پر تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حصر وہی ہے جو دشمن کی مزاحمت سے رکا۔ لیکن جو بیمار ہو گیا، دکھ درد میں مبتلا ہو ایا راستہ بھولنے کی مصیبت میں پھنس گیا اس پر کوئی حصر نہ ہے کیونکہ اللہ کریم نے فرمایا: فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ کہ پھر جب تم امن میں آؤ، اس سے پتا چلا دشمن کا روکنا ہی حصر ہے۔

دوسرا قول سب میں عام ہے دشمن کے روکنے سے خاص نہ ہے۔ دشمن، مرض اور رستہ بھول جانا سب اس

میں داخل ہے۔ حجاج انصاری نے مرفوعاً کہا ہے کہ جو کوئی لنگڑا ہو گیا یا اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ گئی یا کسی اور مرض میں مبتلا ہو گیا تو وہ احرام سے نکل گیا۔ وہ آئندہ سال حج کرے۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابو ہریرۃؓ نے اس حدیث کی تصدیق فرمائی ہے۔ [بروایت احمد ،بروایت ابن ماجه و ابو داؤد] صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے کہ دشمن و مرض اور کسر (ہڈی وغیرہ ٹوٹنے سے) سب سے حصر ہوتا ہے۔ ثوری نے کہا کہ ہر موذی چیز سے حصر ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ محصر وہ شخص ہے جو احرام باندھنے کے بعد کسی مرض یا دشمن کی وجہ سے مکہ نہ جا سکے۔ جبکہ شافعی اور اہل مدینہ کہتے ہیں کہ حصر صرف دشمن سے ہوتا ہے۔ اس مقام پر حنفیہ کا مذہب صریح حدیث کے موافق ہے۔ صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ضباعہ بنت زبیر کے پاس آئے، انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! صلی اللہ علیہ وسلم میں حج کرنا چاہتی ہوں مگر بیمار ہوں۔ فرمایا تو اس شرط پر حج کر لے کہ میرے حلال ہونے کی جگہ وہی ہے جہاں اللہ مجھے روک دے۔ اس کو مسلم نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ بعض اہل علم نے کہا یہ شرط صحیح ہے اسی حدیث کی بنیاد پر امام شافعی نے فرمایا کہ اگر یہ حدیث صحیح ہو تو میں بھی اس کا قائل ہوں۔ بیہقی وغیرہ حفاظ نے کہا کہ یہ حدیث ثابت ہو گئی۔ وَلِلّٰہِ الْحَمد جمہور علماء نے کہا کہ جب کوئی محصر ہو جائے تو جس جگہ محصر ہوا وہیں احرام کھول دے۔ اگر قربانی ساتھ لایا ہو تو ذبح کر دے اور سر کے بال اتروا دے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ کے مقام پر کیا تھا۔

فائدہ: علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہدی سے یہاں بکری مراد ہے۔ جبکہ حضرت ابن عباس نے فرمایا اونٹ، گائے، بکری سب ہدی ہیں۔ تابعین کی ایک جماعت اور ائمہ اربعہ کا یہی مذہب ہے۔ کہ بکری کو ہدی کہا مگر حضرت عائشہؓ اور ابن عمرؓ صرف گائے اور بکری کو ہدی کہتے ہیں۔ کچھ تابعیؒ بھی انہی کے ہم موقف ہیں۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کے موقف کی سند وہی حدیبیہ والا قصہ ہے کہ جب وہ احرام سے نکلے تو وہاں صرف گائے اور اونٹ تھے۔ بکریاں نہ تھیں۔ صحیحین میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا کہ ایک اونٹ گائے میں سات سات شخص شریک ہو جائیں۔ میسر ہونے کا مطلب حضرت ابن عباسؓ نے یہ بیان کیا ہے کہ اپنی طاقت کے مطابق قربانی کرے اگر اونٹ میسر ہو تو وہ کرے اگر نہ ہو تو گائے ورنہ بکری وغیرہ۔ عروہ نے کہا یہ بات ارزانی و گرانی، تنگی و خوشحالی پر موقوف ہے۔ اس طرح جمہور کا قول صحیح ہے کہ اللہ کریم نے فرمایا کہ جو قربانی میسر ہو وہ کرو۔ اس لیے محصر کو بکری کا ذبح کرنا کافی ہو سکتا ہے۔ اور ہدی، اونٹ، گائے، بکری کو کہتے ہیں۔

ترجمان القرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ سے آیا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بکری بطور ہدی بھیجی۔ حسن نے کہا کہ افضل ہدی اونٹ ہے اوسط گائے اور ادنی بکری ہے۔

فائدہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے سال ذبح ہدی اور حلق راس حرم سے باہر ہی کیا تھا۔ یعنی کفار قریش کی وجہ سے جب محصر ہوئے تو حرم سے باہر ہی ارکان پورے کر کے حلال ہو گئے۔ رہا امن کا حال کہ بحالت امن حرم تک پہنچ جائے۔ سو جب تک قربانی اپنے ٹھکانے نہ لگے اور حاجی اور عمرہ کرنے والا تمام افعالِ حج و عمرہ سے فارغ نہ ہو جائے خواہ وہ حج قران ہو یا تمتع ہو یا افراد ہو تب تک سر نہ منڈائے جس طرح صحیحین میں حضرت حفصہ سے آیا ہے کہ لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ سب تو حلال ہو گئے ہیں اور آپ علیہ السلام ابھی تک محرم ہیں۔ فرمایا میں نے اپنے سر کو تلبید کیا ہے (گوند نما چیز سے بال چپکا لیتے تھے تاکہ گرد نہ پڑے) اور قربانی کو قلاوہ ڈالا ہے۔ سو جب تک قربانی کو حلال نہ کر لوں میں احرام نہ کھولوں گا۔ غرضیکہ وَلَا تَحْلِقُوْا کا عطف اَتِمُّوْا پر ہے فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ پر نہ ہے۔ جس طرح کہ ابن جریر کا خیال ہے۔ فتح البیان کا بیان ہے کہ یہ خطاب محصر و غیر محصر سب کو ہے۔ اہل علم کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے اگر ایک گروہ نے کہا کہ محصرین کو خطاب ہے کہ جب تک ان کی قربانی ٹھکانے نہ لگے تب تک حلال نہ ہوں۔ پھر ٹھکانے میں اختلاف ہے کہ امام مالک و شافعی نے کہا کہ مقام محصر ہی اس کی قربان گاہ ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر کیا تھا۔ امام ابو حنیفہ نے کہا کہ حرم ہے اس فرمان کی دلیل سے ﴿ثُمَّ مَحِلُّهَا اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ﴾ "پھر اس کو پرانے گھر تک پہنچانا ہے۔" مگر اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت امن والے کے حق میں ہے۔ جو بیت اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ حنفیہ نے حدیبیہ والے عمل کا جواب یہ دیا ہے کہ حدیبیہ کی پچھلی جانب حرم میں داخل ہے۔ مگر یہ جواب مردود ہے۔ اس لیے کہ وہاں جس جگہ نحر کیا وہ حرم میں شامل نہ تھی۔

فائدہ: کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے اور جوئیں میرے سر سے چہرے پر گرتی تھیں۔ فرمایا میں خیال نہ کرتا تھا کہ تجھے اس قدر تکلیف پہنچی ہے۔ کیا تجھے کوئی بکری میسر نہ ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا تین روزے رکھو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو، ہر مسکین کو نصف صاع دو اور سر منڈا دے۔ اس لیے یہ آیت اگرچہ خاص میرے لیے نازل ہوئی مگر تم سب کو شامل ہے۔ [بروایت بخاری] یہ حدیث کئی طریق سے امام احمد کے نزدیک مروی ہے۔ سب قریب قریب ایک ہی معنی میں ہیں۔ حضرت مجاہد، عکرمہ

،عطاء،طاؤس، حسن،ابراہیم نخعی،ضحاک اور ائمہ اربعہ اور عام علماء کا مذہب یہی ہے کہ ایسے شخص کو اختیار ہے کہ چاہے روزہ رکھے چاہے صدقہ دے اور صدقہ کی مقدار نصف صاع ہے یعنی دو مد تیں صاع کا ایک فرق ہوتا ہے۔یا بکری ذبح کر کے فقراء میں تقسیم کر دے۔غرضیکہ ان تینوں کاموں میں سے جو بھی کرے گا وہ کافی ہوگا۔اس جگہ جب ذکر کیا تو سب سے آسان لفظ پہلے بولا پھر اسی ترتیب سے افضل بھی اس سے افضل پس فرمایا:((من صیام او صدقةٍ او نسُكٍ))اور حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کو جو سب سے پہلے بکری ذبح کرنے کا حکم دیا وہ افضل سے افضل تھا۔پھر اسی طرح صدقہ کا پھر روزے کا حکم ارشاد فرمایا۔سو پتا چلا کہ بجائے خود ہر کام بہت عمدہ ہے۔وَلِلّٰهِ الْحَمْد والمنة.

حکایت: ابراہیم نے حضرت سعید بن جبیر سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو انہوں نے فرمایا، کھانا دے یا بکری خرید کر ذبح کر لے اگر یہ نہ ہو سکے تو بکری کی قیمت کے برابر اتنا کھانا صدقہ کر لے ورنہ روزہ رکھے اور ہر دن نصف صاع صدقہ دے۔ابراہیمؒ نے کہا میں نے بھی علقمہ سے اسی طرح سنا ہے۔جب ابراہیمؒ یہ کہہ کر چل دیئے تو سعید بن جبیرؒ نے کہا یہ شخص کون ہے، بڑا خوش طبع ہے۔میں نے کہا یہ ابراہیم ہیں کہا بڑے ظریف آدمی ہیں۔ہمارے پاس بیٹھا کرتے تھے جب میں نے ابراہیم سے اس بات کا ذکر کیا تو اس لفظ پر کہ ہمارے پاس بیٹھا کرتے تھے،ذرا کم ہو گئے۔حضرت حسن نے کہا جب کہ محرم کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ سر منڈالے اور تینوں میں سے ایک کام کر لے۔دس روزے رکھے یا دس مساکین کو کھانا کھلائے ہر مسکین کو دو مکوک دے ایک مکول کھجوروں کا اور دوسرا مکول گیہوں کا۔یا بکری ذبح کرے، مگر یہ اقوال غریب ہیں۔درست بات وہی جو حضرت کعب بن عجرہ کی حدیث میں گذری ہے۔کہ یا تین روزے رکھے یا چھ مساکین کو کھانا کھلائے یا ایک بکری کا فدیہ دے اور یہ فدیہ بھی اختیار پر ہے۔کلام پاک کا سیاق اسی پر دلالت کرتا ہے(جو ترتیب حضرت کعب کو بتائی وہ) قتل صید میں معروف ہے۔قرآن نے اس پر نص کی ہے۔فقہاء اس پر متفق ہیں لیکن اس میں وہ ترتیب نہ ہے۔فتح البیان میں لکھا ہے کہ اس جگہ مرض سے وہ چیز مراد ہے جس پر بیماری کا نام بولا جا سکتا ہے۔اذیٰ سے مراد یہ کہ سر درد ہو یا جوئیں ہوں یا کوئی زخم وغیرہ ہو اس صورت میں سر منڈا کر حضرت کعب بن حجرہ کی حدیث میں مذکور فدیہ ادا کر دے۔ابن عبدالبر نے فرمایا کہ علماء میں اس بات پر اختلاف نہ ہے کہ اس جگہ نسک سے بکری مراد ہے۔جمہور کا مذہب یہی ہے کہ یا تین روزے رکھے یا چھ مساکین کو کھانا کھلائے۔مالکیہ، حنفیہ اور شافعیہ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے مد سے دو مد کھانا دے۔ثوری نے کہا گندم دے تو آدھا صاع دے اگر اور کچھ دے تو ایک

صاع دے۔ابو حنیفہ بھی اسی کے موافق مذہب رکھتے ہیں۔ مگر ابن منذر نے کہا یہ غلط ہے اس لیے کہ بعض احادیث کعبؓ میں مرفوعاً آیا ہے کہ تین صاع کھجور چھ مساکین کو دے۔احمد کے دو قول ہیں ایک مالک و شافعی کے موافق اور دوسرا قول یہ ہے کہ گندم ہو تو ایک مدہر مسکین کو دے اگر کھجور ہو تو نصف صاع دے۔

فائدہ: یہ فدیہ دینا کہاں چاہئے ؟ حضرت عطاء نے کہا جب قربانی دے تو مکہ میں ہی دے۔ لیکن کھانا اور روزے جہاں مرضی رکھے۔اصحاب الرائے کا بھی یہی قول ہے۔طاؤس، مجاہد، حسن اور شافعی کہتے ہیں کہ قربانی اور کھانا مکہ میں ہی دے جبکہ روزے کا اختیار ہے۔امام مالک نے فرمایا تینوں کا اختیار ہے جہاں چاہے ادا کردے۔فتح البیان میں کہا ہے کہ حق یہی ہے اس لیے کہ کسی خاص جگہ کی تعیین پر کوئی دلیل نہ ہے۔یہ (قربانی) فدیہ خون تخییر ہے جس طرح کہ قربانی کا خون خونِ ترتیب تھا۔ابو اسماء نے کہا کہ علی و حسین رضی اللہ عنہ حضرت عثمان کیساتھ حج کو تشریف لے گئے حضرت حسینؓ کے سر کو تکلیف تھی۔حضرت علیؓ نے ان کے بال اتروادیئے اور ایک اونٹ ذبح کیا۔ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اگر یہ قربانی حلق راس کے عوض تھا تو مکہ سے باہر ذبح ہوا لیکن اگر یہ حلال ہونے کے لیے ذبح کیا تھا تو واضح بات ہے

فائدہ: اس کے بعد اللہ کریم نے فرمایا کہ جب تم بیماری یا دشمن سے امن میں آؤ اور حج کے مناسک ادا کر سکو۔پھر جس نے عمرے کو حج سے ملایا ہو یعنی عمرے کا احرام باندھ کر مکہ آیا اور عمرے کے بعد احرام کھول دیا اور مکہ میں مقیم رہا۔ حتیٰ کہ پھر حج کا احرام باندھا۔اب اس کے لیے ہر وہ چیز درست ہو گئی جو محرم کے لیے مباح نہ تھی۔ تمتع کے یہی معنی ہیں۔اس کے جائز ہونے میں علماء کا کچھ اختلاف نہ ہے بلکہ محققین کے نزدیک تمتع حج کی اقسام میں سے افضل ہے۔ابن کثیر فرماتے ہیں کہ لفظ تمتع اس شخص کو بھی شامل ہے جس نے دونوں کا احرام باندھا یا صرف عمرے کا احرام باندھا۔پھر اس سے فارغ ہونے کے بعد حج کا احرام باندھا یہ تمتع خاص ہے۔کلام فقہاء میں یہی تمتع معروف ہے اس کی دوسری قسم تمتع عام ہے۔وہ دونوں قسموں کو شامل ہے۔احادیث صحاح اس پر دلیل ہیں کیونکہ بعض راوی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حج تمتع کیا۔ بعض نے کہا آپ علیہ السلام نے حج قران کیا۔اس میں خلاف نہ ہے کہ آپ نے ہدی روانہ کی تھی۔ بہر حال اللہ کریم نے فرمایا کہ جس نے تمتع کیا اسے جو قربانی میسر ہو وہ ذبح کرے یا کم سے کم قربانی ایک بکری ہے۔اگر گائے ذبح کرے تو بھی درست ہے۔اس لیے کہ آپ علیہ السلام نے اپنی ازواج کی طرف سے گائے ہی ذبح کی تھی ۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی ازواج کی طرف سے ایک گائے ذبح کی اور وہ سب متمتعات تھیں۔[بروایت ابن مردویہ] یہ مشروعیت تمتع پر دلیل ہے۔جس طرح کہ صحیحین میں حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے کہ حج تمتع کی آیت

کتاب اللہ میں نازل ہوئی اور آپ علیہ السلام کے ساتھ حج تمتع کیا۔ پھر ایسی کوئی آیت نازل نہ ہوئی جو اسے حرام کرتی یا اس سے منع کرتی۔ حتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ اب ایک آدمی نے محض اپنی رائے سے جو دل چاہا کہہ دیا۔ بخاری نے فرمایا کہ وہ شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ بخاری کا یہ قول وضاحت سے بھی مذکور ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو حج تمتع سے منع کر دیا تھا۔ وہ کہتے تھے اگر ہم کتاب اللہ کو پکڑیں تو اس میں اتمام کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: ﴿أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ﴾ کہ "اللہ کے لیے حج اور عمرہ مکمل کرو۔" ابن کثیر فرماتے ہیں در حقیت خلیفہ ثانی عمر رضی اللہ عنہ نے بطور تحریم منع نہ کیا تھا بلکہ اس سے وجہ سے منع کیا کہ لوگ علیحدہ حج و عمرے کے لیے زیادہ بیت اللہ کی طرف جائیں اور انہوں نے خود ہی اس بات کی وضاحت بھی فرمادی تھی۔ ہدی تمتع وہ بکری ہے جسے متمتع یوم النحر کو ذبح کرتا ہے اگر بحالتِ احرام یوم النحر سے پہلے بھی ذبح کر دی تو شافعی کے نزدیک وہ بھی کافی ہے گویا کہ ابو حنیفہؒ کے نزدیک کفایت نہیں کرتی ہے۔ کیونکہ اس قربانی میں ترتیب ملحوظ ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں فدیے کی تین اقسام مذکور ہیں جن میں قربانی واجب ہے۔ فدیہ کی چوتھی قسم سورۃ مائدہ میں آئے گی۔ جو فرمایا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ کہ بحالتِ احرام شکار نہ کرو اس فدیے میں تخیر ترتیب ہے۔ دو چیزوں میں یہ فدیہ واجب ہوتا ہے۔ درخت کاٹنے میں اور شکار کرنے میں۔ فقہاء نے بہت سے فدیے اور بدلے ذکر کیے ہیں جن کی کتاب و سنت میں کوئی اصل نہ ہے نہ اس پر کوئی صحیح دلیل ہے۔ اس لیے قربانیوں میں سے انہی قربانیوں پر اکتفا کرنا چاہئے جن کا کتاب و سنت سے جواز ہے۔ پھر جو شخص قربانی نہ کر سکے یا جانور نہ ملنے کی وجہ سے یا قیمت نہ ملنے کی وجہ سے اسے چاہئے کہ دوران حج تین روزے رکھے لے یعنی احرام کے شروع سے یوم النحر تک یہ قول حضرت ابن عباس کا ہے۔ علماء نے کہا عرفہ کے دن سے پہلے پہلے مکمل کر لے۔ حضرت عطاء کا بھی یہی قول ہے۔ کسی نے کہا اول شوال سے رکھنا بھی جائز ہے۔ حضرت مجاہد اور طاؤس وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ شعبی کے نزدیک یوم عرفہ کو اور اس سے دو دون پہلے بھی روزہ رکھنا جائز ہے۔ حضرت مجاہد، سعید بن جبیر، سدی ،عطاء، طاؤس، حاکم، حسن اور حماد کا بھی یہی قول ہے۔ ابن عباس نے فرمایا کہ عرفہ کے دن سے پہلے پہلے تینوں روزے مکمل کر لے۔ ہاں اگر تیسرا روزہ عرفہ کے دن آجائے تو بھی مکمل ہو جائے گا۔ وطن واپسی پر سات روزے اور رکھ لے۔ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ یوم الترویۃ سے ایک دن پہلے رکھ لے، پھر دوسرا روزہ یوم الترویہ کو اور تیسرا یوم عرفہ کو رکھے۔ پھر اگر کچھ روزے رہ گئے یا ابھی شروع ہی نہ کیے تو ایام تشریق میں تینوں روزے رکھ لے۔ اس لیے کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ ایام تشریق میں کسی کو روزے کی

رخصت نہ ہے سوائے اس شخص کے جس کے پاس قربانی نہ ہو۔ حضرت علی مرتضیٰؓ اور ایک جماعت تابعین کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ ایام تشریق میں روزہ رکھنا جائز نہ ہے۔ کیونکہ قتیبہ ہذلی کی مرفوع حدیث میں ہے کہ ایام تشریق کھانے پینے اور ذکر اللہ کے دن ہیں۔[بروایت مسلم] پھر جب حج کے بعد وطن واپس پہنچ جائے تو سات روزے رکھے۔ حضرت عطاء اور مجاہد فرماتے ہیں کہ وطن واپسی پر راستے میں روزے رکھنے کی بھی رخصت ہے۔ احمد و اسحٰق بھی اسی طرف گئے ہیں۔ یعنی وطن واپسی پر یہ روزے فرض ہیں۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ گھر پہنچ کر رکھے۔ ایک جماعت تابعین کا بھی یہی قول ہے۔ ابن جریر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ بخاری میں طویل حدیث کے تحت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج کے بعد آئے تو فرمایا جس نے قربانی نہ پائی ہو وہ تین دن کے روزے دوران حج رکھے اور سات روزے تب رکھے جبکہ گھر واپس آئے۔[الحدیث] یہی قول قوی ہے۔ مالک نے کہا کہ منیٰ سے واپسی پر روزے رکھے تو بھی کچھ حرج نہ ہے۔ ابن عباس نے فرمایا یعنی جب اعمال حج سے فارغ ہو کر جب گھر لوٹے تب رکھ لے۔ ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے۔ مگر پہلا قول راجح ہے۔ اور جو فرمایا کہ یہ دس پورے ہوئے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی سات اور تین میں اختیار نہ سمجھے ورنہ یہ بات تو واضح ہے کہ تین اور سات دس ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا بلکہ یہ تاکید ہے۔ ابن جریر نے کہا کامل کا مطلب یہ ہے کہ یہ قربانی کا عوض ہو گیا کسی نے کہا بلکہ یہ تاکید پر تاکید ہے کہ دس سے کم نہ کرے۔ کیونکہ یہ اجر و ثواب میں ہدی کے برابر ہے۔

فائدہ: اس میں اختلاف ہے کہ حاضرین مسجد الحرام سے کون لوگ مراد ہیں۔ اس لیے کہ مسجد الحرام کے رہنے والوں کے لیے حج تمتع نہ ہے۔ کسی نے کہا خالص اہل حرم مراد ہیں۔ حضرت ابن عباس اور طاؤس اسی طرف گئے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اے مکہ والو! تمہارے لیے حج تمتع کا جواز نہ ہے یہ تو اہل آفاق کے لیے حلال کیا گیا ہے۔ تم پر حرام ہے۔ تم تو ایک جنگل طے کر کے عمرے کا احرام باندھ لیا کرو۔ طاؤس نے کہا کہ حج تمتع میں لوگوں کے لیے ہے جن کے اہل والے حرم میں نہ رہتے ہوں اور نہ مکہ والوں کے لیے ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ لوگ مراد ہیں جو حرم و میقات کے درمیان رہتے ہیں وہ تمتع نہ کریں۔ حضرت عطاء کا بھی یہی قول ہے۔ یعنی عرفہ، مزدلفہ، عرفہ ورجیع کے رہنے والے ہیں۔ زہری نے کہا جس کے اہل والے اتنے فاصلے پر ہوں جو ایک دن میں طے ہو سکتا ہے تو وہ حج تمتع کر سکتا ہے۔ دوسرے قول میں دو دون کی مسافت کا ذکر ہے۔ ابن جریر نے اس جگہ شافعی مسلک اختیار کیا ہے کہ اہل حرم مراد ہیں اور وہ لوگ جو اس قدر فاصلے پر ہوں جہاں نماز قصر نہیں ہو سکتی

کیونکہ اتنی مسافت پر رہنے والا حاضر سمجھا جاتا ہے مسافر نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ذَالِكَ کا اشارہ یا تو تمتع کی طرف ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہے کہ حاضرین حرم پر تمتع نہ ہے۔ جس طرح کہ ابو حنیفہ و حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر تمتع کرلے گا تو اس پر قربانی لازم ہوگی۔ یہ قربانی غلطی کی وجہ سے ہے اور اس لیے خود اس میں سے نہ کھائے یا یہ ارشاد تمتع پر ہدی صیام کے وجوب کے حکم کی طرف ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ حاضر مسجد الحرام پر تمتع واجب نہ ہے۔ جس طرح امام شافعی و شافعیہ نے کہا۔ حاضر سے مراد یہ ہے کہ مکہ کا رہنے والا نہ ہو یا میقات و میقات کے اندر والا نہ ہو۔ مالک نے فرمایا اہل مکہ مراد ہیں۔ ابو حنیفہ نے کہا میقات پر رہنے والے مراد ہیں۔ میقات سے ذوالحلیفہ، جحفہ، قرن منازل، یلملم اور ذات عرق مراد ہیں۔ یہ مکہ کی پانچ اطراف سے پانچ میقات ہوئے۔ کسی نے کہا مراد وہ ہیں جن پر نماز جمعہ لازم ہے۔ سیوطی نے کہا کہ اہل سے خود محرم مراد ہے یعنی یہ محرم مسجد الحرام میں حاضر نہ ہو۔ مگر یہ قول نامناسب ہے۔ طبری نے کہا کہ اہل سے بیوی بچے مراد ہیں باپ بھائی مراد نہ ہیں۔ خیر جو بھی ہو اللہ کریم نے اس کے بعد فرمایا کہ تم اللہ سے ڈرو یعنی اس کے امر و نہی بجالاؤ۔ ورنہ وہ اپنے حکم کی مخالفت کرنے والے کو سخت سزا دے گا وہ کوئی ہو اور کہیں بھی ہو۔ یا اس سے عام تقویٰ کا حکم ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

حج کے مہینے (معین ہیں جو) معلوم ہیں، تو جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کرلے تو حج (کے دنوں) میں نہ عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی برا کام کرے اور نہ کسی سے جھگڑے اور جو نیک کام تم کرو گے وہ اللہ کو معلوم ہو جائے گا اور زادراہ (یعنی رستے کا خرچ) ساتھ لے جاؤ کیونکہ بہتر (فائدہ) زادراہ (کا) پرہیزگاری ہے اور اے اہل عقل مجھ سے ڈرتے رہو۔

احرام حج کا وقت شوال کی ابتداء سے عید الاضحیٰ کی رات تک ہے۔ اس سے پہلے مناسب نہ ہے۔ احرام باندھ لینے سے حج یا عمرہ واجب ہو جاتا ہے۔ احرام یہ ہے کہ شروع کرنے کی نیت کرلے۔ زبان سے لبیک کہے۔ پھر جب احرام میں داخل ہو گیا تو مرد و عورت کی صحبت سے، ہر گناہ، آپس میں جھگڑوں سے، بدن کے بال اتارنے، ناخن تراشنے، خوشبو لگانے، شکار کرنے سے پرہیز کرے۔ بدن پر سلے کپڑے نہ پہنے، نہ سر ڈھانپے، ہاں عورت مکمل لباس میں سر ڈھانپے رہے لیکن منہ پر کپڑا نہ رکھے اور کفر کی ایک غلطی یہ تھی کہ بغیر خرچ کے حج کو نکل جاتے اور اس کو ثواب سمجھتے تھے اور اس کو توکل سمجھتے تھے، اور قدرت کے باوجود خرچ کے بغیر نکل جاتے تھے۔ اللہ کریم

نے فرمایا کہ اگر قدرت ہو تو خرچ لے کر چلے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بھیک نہ مانگو۔

اس آیت کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ حج انہی مہینوں میں درست ہوتا ہے ان مہینوں کے علاوہ دوسرے مہینوں میں احرام باندھنا مناسب نہ ہے۔ انہی مہینوں میں حج کا احرام باندھنا اکمل ہے۔ اگرچہ دوسرے مہینوں میں بھی احرام باندھنا جائز ہو۔ مالک، ابو حنیفہ، احمد، اسحٰق، نخعی، ثوری اور لیث کا موقف یہ ہے کہ سارے سال میں احرام حج باندھنا درست ہے۔ ان کی دلیل ہے: ﴿هِىَ مَوَٰقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ کہ "لوگوں کے لیے وقت کا پیمانہ ہے اور حج کے لیے بھی۔" اس سے معلوم ہوا کہ سارے چاند مواقیت حج ہیں، ان تینوں مہینوں کو کوئی خصوصیت نہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت عام ہے جبکہ آیت باب خاص ہے خاص کو عام پر ترجیح ہوتی ہے۔ ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حج دو نسک میں سے ایک نسک ہی ہے۔ اس لیے عمرے کی طرح اس کا احرام بھی سارے سال میں باندھا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ محض ایک قیاس ہے اور جو قیاس نص قرانی سے (ٹکرا جائے) مخالف ہو وہ قیاس باطل ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ حج کے مہینوں کے علاوہ احرام حج درست نہ ہے اگر باندھ بھی لیا تو بھی وہ درست نہ ہو گا۔ حضرت ابن عباس، جابر، عطاء، طاؤس اور مجاہد وغیرہ کا یہی موقف ہے۔ ان کی دلیل یہی آیت باب ہے: ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ﴾ عمرے کے متعلق دو اقوال ہیں اس آیت کی دوسری تقدیر یہ ہے ((ان وقت الحج اشهر معلومات)) نحوی حضرات بھی اسی طرف گئے ہیں۔ اس میں اشہر حج کو تمام مہینوں سے خاص کر لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان مہینوں سے پہلے احرام حج باندھنا درست نہ ہے۔ یہ مہینے حج کے متعلق ایسے ہی ہیں جیسا کہ نماز کا وقت مقرر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کسی کو لائق نہ ہے کہ ان مہینوں کے علاوہ احرام حج باندھے۔ اس لیے کہ اللہ کریم نے فرمایا کہ حج کے معلوم مہینے ہیں۔ ان کا دوسر الفظ یہ ہے کہ سنت ہے کہ آدمی اشہر حج سے پہلے محرم نہ ہو۔ [بروایت ابن خزیمه با سناد صحیح] اور اہل علم کے نزدیک صحابی کا لفظ مِنَ السنةِ کہنا مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔ خصوصاً ترجمان القرآن حضرت ابن عباس کا قول اس بات کا زیادہ حق دار ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں ایک مرفوع حدیث بھی آئی ہے کہ: ((لَا يَنْبَغِىْ لِاَحَدٍ ان يحرم بالحج الا فى الشهر الحج)) اس کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں۔ [بروایت ابن مردویه] ابن کثیر فرماتے ہیں ((واسناده لا باس به)) لیکن بیہقی و شافعی نے اس کو موقوف روایت کہا ہے۔ اس کا موقوف ہونا مرفوع کی نسبت زیادہ صحیح و ثابت ہے۔ اس صورت میں یہ صحابہ کا موقف ٹھہرے گا اور جب اس کے ساتھ حضرت ابن عباس کا قول: ((حسن النسة ان لا يحرم بالحج الا فى الشهر)) شامل کیا جائے گا تو صحابیؓ کا یہ

موقف مزید قوی ہو گا۔

بخاری نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ اشھر معلومات، شوال، ذیقعدہ اور عشر ذی الحجۃ ہیں۔ بخاری نے اس کو بصیغۂ جزم تعلیقاً بیان فرمایا ہے۔ ابن جریر نے کہا یہ اسناد درست ہے۔ حاکم نے کہا کہ یہ شیخین کی شرط پر ہے۔ صحابہ و تابعین کی ایک جماعت اور امام ابو حنیفہ، احمد، ابو یوسف، ابو ثور اور ابن جریر نے بھی اسی موقف کو اپنایا ہے۔ اور دو ماہ اور دس دن پر جمع کا اطلاق تغلیباً ہے۔ مالک کے نزدیک یہ تین ماہ ہیں۔ شوال، ذیقعدہ اور مکمل ذی الحجۃ۔ حضرت ابن عمر، طاؤس، مجاہد، عروہ، ربیع اور قتادہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ اس متعلق ایک حدیث مرفوع بھی مروی ہے جو بظاہر مرفوع ہے۔ مگر حقیقت میں موضوع ہے۔ اس موقف سے یہ فائدہ ہو گا کہ جب ذی الحجہ تمام اشھر حج میں داخل سمجھا جائے گا تو بقیہ ذی الحجۃ کے دنوں میں عمرہ مکروہ ہو گا یہ مطلب نہ ہو گا کہ لیلۃ النحر کے بعد بھی حج درست ہو گا۔ عبداللہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ ان مہینوں میں عمرہ نہ ہے۔ ابن سیرین نے کہا کہ اہل علم میں سے کسی کو اس موقف میں شک نہ ہو گا کہ حج کے مہینوں کے علاوہ عمرہ کرنا افضل ہے۔ قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ صحابہ کرام اشھر حج میں عمرہ کرنا تمام نہ سمجھتے تھے، حضرت عمرؓ، عثمانؓ غیر اشھر حج میں عمرہ کرنا پسند فرماتے تھے اور ان مہینوں میں عمرہ کرنے سے منع کرتے تھے۔

فائدہ: اور جو فرمایا کہ جس نے ان مہینوں میں حج کرنا فرض کیا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ احرام باندھنے کے بعد حج فرض ہو جاتا ہے۔ ابن جریر نے کہا کہ اس بات پر علماء کا اتفاق و اجماع ہے کہ فرض سے اس جگہ وجوب و لزوم مراد ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یعنی جو حج یا عمرہ فرض کرے۔ حضرت عطاء نے کہا کہ فرض سے احرام مراد ہے۔ ضحاک اور ابراہیم کا بھی یہی قول ہے۔ ابن عباسؓ کا ایک دوسرا لفظ یہ ہے کہ تلبیہ حج پکار کر پھر اس زمین پر نہ ٹھہرے۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ فرض کرنا یہ ہے کہ تلبیہ کہہ لے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ فرض کرنا یہی ہے کہ تلبیہ حج پکارے یا ہدی کو قلادہ ڈال لے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ احرام میں حج کی نیت ہی کافی ہے۔ رفث سے جماع مراد ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ﴾ کہ "تمہارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں سے جماع کرنا حلال کیا گیا ہے۔" حضرت ابن عباس، سدی، قتادہ عکرمہ، زہری، مجاہد اور مالک کا بھی یہی قول ہے۔ سو جس طرح رفث حرام ہے اسی طرح اس کے متعلقات بوسہ لینا وغیرہ۔ بلکہ عورت کے سامنے اس قسم کا ذکر ہی نہ کرنا چاہئے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا رفث یہ ہے کہ مرد عورت کے پاس جائے یا یہ کہ

مرد و عورت باہم اس طرح کا تذکرہ کریں۔ابن عباس رضی اللہ عنہ راستے میں ہدی کرتے شعر و غزل پڑھتے۔کسی نے کہا تم احرام میں رفث کرتے ہو۔کہا رفث وہ بات ہے جو عورتوں کے سامنے کہی جاتی ہے۔پھر کہا رفث عورتوں سے تنہائی میں جماع کا ذکر کرنا ہے۔عطاء نے کہا کہ رفث جماع ہے اور فحش بات کرنا۔صحابہ رضی اللہ عنہم بحالتِ احرام اشارۃ جماع کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔طاؤس نے کہا رفث عورت سے یوں کہنا ہے کہ جب تم حلال ہو گی تب تم سے ملوں گا۔ابو العالیہ کا بھی یہی قول ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی فرمایا رفث یہ ہے کہ عورت کا بوسہ لے اس سے ملے اور بے حیائی کی بات کرے اور چھیڑ چھاڑ کرے۔تابعین رحمہم اللہ کی کثیر جماعت اس طرف گئی ہے۔فسوق سے معاصی مراد ہیں۔حضرت ابن عباس اور ایک جماعت تابعین اس کے قائل ہیں۔ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فسوق گناہ ہیں۔وہ شکار ہو یا اور کچھ جو بھی نافرمانی ہو وہ فسوق ہے۔ابن زبیر، مجاہد، سدی، نخعی اور حسن نے کہا کہ گالی دینا فسوق ہے۔ان کی دلیل یہ حدیث صحیح ہے کہ:((سِبابُ المومن فسوق و قتادلہ کفر)) [بروایت ابن ابی حاتم عن ابن مسعودؓ] ابن زید نے کہا یہاں فسوق سے مراد بتوں کے نام پر ذبح کرنا ہے۔جیسا کہ اللہ کریم نے فرمایا:﴿اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ کہ "یا گناہ کی چیز جس پر غیر اللہ کو پکارا جائے۔" ضحاک نے کہا اس جگہ فسوق سے مراد برے القاب سے پکارنا ہے۔ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ فسوق سے کوئی خاص معصیت مراد نہ ہے۔اگر کسی جگہ کسی خاص معصیت پر لفظ فسق بولا گیا تو اس سے یہ چیز لازم نہیں آجاتی کہ یہ اسی معنی کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا اس کے متعلق سب سے عمدہ قول اس شخص کا ہے جس نے لفظ فسوق کو تمام معاصی میں عام رکھا۔اللہ کریم نے اشہر حرم میں ظلم سے منع فرمایا ہے جبکہ سارے سال میں بھی ظلم غیر جائز ہے لیکن ان مہینوں میں اس کی حرمت و نہی زیادہ تاکیدی ہو گئی۔اس لیے یہ فرمایا:﴿مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ﴾ "ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں یہ دین درست ہے پھر ان میں اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو۔" حرم کے متعلق فرمایا:﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ "اور جو اس میں ظلم سے ٹیڑی راہ اختیار کرنا چاہے تو ہم اسے عذاب الیم کا مزہ چکھائیں گے۔" ابن جریر نے اس جگہ یہ اختیار کیا ہے کہ احرام کی حالت میں ممنوعات احرام و حرم کا ارتکاب کرنا فسوق ہے۔جیسے شکار کرنا، سر کے بال اتروانا، ناخن تراشنا، اور جو اس کے ہم مثل ہو لیکن پہلی بات اولیٰ ہے کہ اس کو عام رکھنا زیادہ مناسب ہے۔حضرت ابی ہریرہؓ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ جس نے اس گھر کا حج کیا اور نہ رفث کیا نہ فسوق کیا وہ اپنے گناہوں سے اس طرح صاف ہو گیا جیسے اس کی ماں نے اس کو آج جنم دیا ہو۔

[بروایت الشیخان] جدال کے متعلق دو اقوال ہیں۔ایک یہ کہ حج کے وقت مناسک حج میں کوئی جھگڑا نہ کرے۔اس کو اللہ کریم نے خوب کھول کر بیان فرمایا ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ اللہ نے حج کے مہینے مقرر فرمادیئے ہیں اس میں کوئی جھگڑا نہ کرنا چاہئے۔سدی نے کہا حج کا وقت مقرر ہے۔اب کس بات کا جھگڑا ہے۔یعنی مشرک لوگ تو نسیٔ کرتے تھے اور مہینوں کو بدل دیتے تھے لیکن اب اللہ نے وقتِ حج مقرر ردیا ہے اب کوئی الجھاؤ باقی نہ رہا جس پر جھگڑے کی نوبت آئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جدال سے دوران حج لڑائی کرنا مراد ہے۔مالک نے فرمایا حج میں جدال یہ ہے۔واللہ اعلم کہ قریش مزدلفہ میں مشعر حرام کے پاس ٹھہرتے جبکہ باقی عرب عرفات میں وقوف کرتے تھے اور سب باہم اس بات پر بحث و تکرار کرتے کہ حق پر کون گروہ ہے اور ہر ایک خود کو سیدھے رستے پر خیال کرتا تھا۔ابن زید نے کہا بلکہ وہ مختلف مقامات پر ٹھہرتے اور ہر ایک یہ بات کہتا کہ ابراہیم علیہ السلام کا موقف یہی ہے جہاں ہم کھڑے ہیں۔اللہ کریم نے مناسک بیان کر کے یہ جھگڑا ختم کر دیا۔ محمد بن کعب کہتے ہیں کہ قریش جب منیٰ میں جمع ہوتے تو کہتے کہ ہمارا حج تم سے اکمل ہے دوسرے کہتے نہیں بلکہ ہمارا حج زیادہ تمام تر ہے۔ قاسم بن محمد نے کہا جدال یہ ہے کہ کوئی کہے حج آج ہے اور کوئی کہے حج کل ہے۔ابن جریر نے اسی بات کو اختیار کیا ہے کہ مراد مناسک حج کے تنازع کو ختم کرنا ہے۔واللہ اعلم. دوسرا قول یہ ہے کہ اس جگہ جدال سے خصومت مراد ہے۔ابن مسعود نے فرمایا جدال یہ ہے کہ تو اپنے ساتھی سے لڑائی کرے اور اسے غصہ دلائے۔ حضرت ابن عباسؓ،ابو العالیہ،عطاء،مجاہد،سعید بن جبیر،عکرمہ،جابر،مکحول،سدی،مقاتل ،عمرو بن دینار،ضحاک،ربیع،نخعی،حسن اور قتادہ سب اسی طرف گئے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ تو اپنے ساتھی سے لڑائی جھگڑا نہ کرے،اس سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ نخعی نے فرمایا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جدال کو ناپسند کرتے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا جدال سے (سباب) گالی گلوچ کرنا اور لڑنا مراد ہے۔انکا دوسرا لفظ یہ ہے کہ جھگڑا مراد ہے۔عکرمہ نے کہا جدال سے غصہ مراد ہے کہ تو کسی کو غصہ دلائے۔ہاں اگر کسی غلطی کی بناء پر غلام سے ناراض ہو یا اسے غصے میں لائے تو بشرطیکہ اسے مارنے سے باز رہے تو ایسا کرنا جائز ہے۔ابن کثیر نے فرمایا بلکہ اگر اس کو مار پیٹ بھی دے تو بھی حرج نہ ہے۔اس لیے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر کی حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے غلام نے ان کا بار برداری والا اونٹ گم کر دیا جس پر ان کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سامنا تھا۔اس پر حضرت ابو بکرؓ نے اس کو مارنے لگے اور یہ ماجرہ سفر حج میں مقام عرج پر پیش آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر صرف اتنا فرمایا کہ اس محرم کو دیکھو یہ کیا کام کرتا ہے۔[بروایت احمد ،ابو داؤد ،ابن

ماجہ] بعض سلف نے کہا کہ اونٹ چلانے والے کو اگر مارے تو بھی حج مکمل ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے انکار سے ایک لطیف نکتہ سمجھ آیا ہے اس لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ اسے نہ مارے۔ اس لیے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ جس نے اپنا نسک (حج) مکمل کر لیا اور اس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سالم رہے تو اس کو اس کے پہلے گناہ معاف کیے گئے۔ [بروایت عبد بن حمید]

فائدہ: جب ہر بری بات اور برے کام سے منع فرمایا تو اچھے کام کی ترغیب دی۔ فرمایا رفث کے عوض اچھی بات کہو فسق کے عوض بر و تقویٰ اختیار کرو۔ اور جدال کے عوض اتفاق و اخلاق سے پیش آؤ۔ اس لیے کہ جو بھی تم کرتے ہو وہ سب اللہ کو معلوم ہے۔ وہ تمہیں تمہارے اعمال کے موافق جزاء دے گا۔ اچھے کے بدلے اچھی جزاء اور برے کاموں کے بدلے بری جزاء ملے گی۔ پھر اس کے بعد تقویٰ کو بہتر زاد راہ قرار دیا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ حج کو نکلنے پر بغیر خرچ کے نکل جاتے اور کہتے کہ ہم اللہ کے گھر کی حج کو جاتے ہیں تو کیا وہ ہمیں رزق بھی نہ دے گا۔ اللہ کریم نے فرمایا اپنا رستے کا خرچ لے کر چلو۔ اور اپنی عزت کی حفاظت کرو (مانگ کر اپنی عزت برباد نہ کرو۔) ان کا دوسر الفظ یہ ہے کہ اہل یمن حج کو نکلتے اور بغیر خرچ کے نکلتے اور خود کو متوکل کہتے تھے۔ اللہ کریم نے حکم فرمایا کہ زاد راہ لے کر چلا کرو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا لفظ ہے کہ کچھ لوگ ایسے تھے جو احرام باندھتے۔ اس وقت جو زاد راہ پاس ہوتا وہ پھینک دیتے اور نیا زادِ راہ لے لیتے۔ اللہ کریم نے فرمایا ایسا نہ کرو بلکہ آٹا ستو اور خشک روٹی اپنے پاس رکھو۔ صحابہؓ اور تابعین کا یہی قول ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ آدمی کی شرافت اس میں ہے کہ اس کا رزق حلال ہو۔ ان کے ساتھ کوئی ہوتا تو اس سے یہ شرط رکھ لیتے کہ اگر پاک مال حج کے لیے لائے ہو تو میرے ساتھ چلو۔ پھر جس طرح اللہ کریم نے انہیں دنیا میں زاد راہ کا حکم دیا اسی طرح یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آخرت کا زادِ راہ تقویٰ ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾ "اور (وہ لباس) زینت بھی ہے اور تقوے کا لباس یہی بہتر۔" یعنی لباس حسی کے بعد لباس معنوی کی طرف رہنمائی فرمائی کہ وہ عاجزی و تقویٰ ہے۔ پھر آخرت کے زاد راہ کو بہتر کہا۔

عطاء خراسانی کہتے ہیں کہ خیر الزاد سے زاد آخرت مراد ہے۔ حضرت عبداللہ سے مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص دنیا میں زاد راہ لیتا ہے وہ اسے آخرت میں فائدہ دیتا ہے۔ [بروایت الطبرانی] مقاتل بن حبان کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایک فقرائے مسلمین میں سے ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا اے اللہ کے رسول! ہمیں زاد راہ میسر نہ ہے۔ کہا: زاد راہ لے لو اور لوگوں سے اپنی عزت بچاؤ۔ اور بہتر زاد راہ تقویٰ ہے۔ [بروایت ابن ابی حاتم]

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اے عقل مندو! میرے عتاب و عذاب سے ڈرو۔ جو میرے حکم کی مخالفت کرتا ہے اسے سزا ملے گی۔ معلوم ہوا کہ جو جاننے والے ہیں انہیں اللہ کا خوف نصیب ہوتا ہے۔ جاہل اللہ کے عذاب سے نڈر ہوتا ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ﴿۱۹۸﴾

اس کا تمہیں کچھ گناہ نہیں کہ (حج کے دنوں میں بذریعہ تجارت) اپنے پروردگار سے روزی طلب کرو اور جب عرفات سے واپس ہونے لگو تو مشعر حرام (یعنی مزدلفے) میں اللہ کا ذکر کرو اور اس طرح ذکر کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا اور اس سے پیشتر تم لوگ (ان طریقوں سے محض) ناواقف تھے۔

فائدہ: یعنی حج میں مال تجارت بھی سات لے جاؤ۔ روزی کمانے میں کچھ حرج نہ ہے۔ لوگوں نے اس میں شبہ کیا تھا کہ شاید حج قبول نہ ہو اس لیے یہ ارشاد فرمایا۔ بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عکاظ، مجنہ، ذوالمجاز جاہلیت کے بازار تھے لوگوں نے موسم حج میں دن میں تجارت کو گناہ سمجھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض نے کہا جب اسلام آیا تو لوگوں نے تجارت کو گناہ سمجھا اور آنحضرت ﷺ سے پوچھا اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرت ابن عباسؓ کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ لوگ موسم حج میں لین دین اور خرید و فروخت سے بچتے تھے۔ اللہ کریم نے فرمایا اس میں کچھ گناہ نہ ہے بلکہ تم خوشی سے رزق کی تلاش کرو۔ یعنی جیسے احرام سے پہلے خرید و فروخت جائز تھی ویسے احرام کے بعد بھی جائز ہے۔ صحابہؓ و تابعین کی ایک جماعت نے یہی کہا کہ موسم سے موسمِ حج مراد ہے۔ ابو امامہ تیمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ ہم سواری کرایہ پر دیتے ہیں تو کیا ہمارا حج ہو جاتا ہے۔ فرمایا کیا تم طواف نہیں کرتے۔ عرفہ نہیں جاتے رمی جمار نہیں کرتے، سر نہیں منڈاتے کہا کیوں نہیں، یہ سب کچھ تو کرتے ہیں۔ فرمایا یہی بات ایک شخص نے رسول اللہ علیہ السلام سے پوچھی تھی اور آپؐ نے کچھ جواب نہ دیا تو جبریل علیہ السلام آپ پر آیت لے کر اترے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو بلا کر کہا: ((انتم حجاج)) کہ اے کرایہ کرنے والو! تم حاجی ہو۔ [بروایت احمد] یہ حدیث کئی طریق سے مروی ہے۔ ابو صالح مولی عمر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا تم حج میں تجارت کرتے تھے؟ کہا ان کی معاش تو اسی حج میں تھی۔ غرضیکہ اس آیت شریف میں حاجی کو تجارت کی رخصت ہے اسی طرح اور اعمال کا بھی حکم ہے جن میں رزق ملتا ہے۔ لفظ فضل سے اس جگہ رزق ہی کرایہ ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي

الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ ”کہ پھر جب نماز مکمل ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔“ فتح البیان میں فرمایا کہ درست بات یہ ہے کہ یہ اجازت بطور رخصت ہے لیکن اس کو ترک کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اللہ نے فرمایا: ﴿وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ ”اور انہیں نہیں حکم دیا گیا مگر یہ کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔“ اخلاص یہی ہے کہ اس کام پر اس کو عبادت کرنے کے سوا کوئی امر ابھارنے والا نہ ہو۔

فائدہ: عرفہ اس مقام کا نام ہے جہاں حج میں کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ وقوف حج کا بڑا عمدہ کام ہے۔ حدیث عبدالرحمٰن الدیلی میں مرفوعاً آیا ہے کہ حج عرفات ہے جس نے فجر سے پہلے عرفات پالیا اس نے حج پالیا۔ ایامِ منیٰ تین دن ہیں جس نے دو دن میں جلدی کی اس پر کوئی گناہ نہ ہے اور جس نے دیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہ ہے۔ [بروایت احمد] وقوف کا وقت یوم عرفہ کے زوال سے یوم النحر کے طلوع فجر تک ہے۔ اس لیے کہ آنحضرت ﷺ حجۃ الوداع میں نماز ظہر کے بعد غروب آفتاب تک کھڑے رہے اور فرمایا: ﴿خزوا عنی مناسلکم﴾ یعنی تم اپنے حج کے طریقے مجھ سے سیکھ لو۔ اور جو قول ہے کہ جس نے فجر سے پہلے عرفہ کو پالیا گویا حج پالیا۔ یہ ائمہ ثلاثہ کا مذہب ہے۔ امام احمد کا مذہب یہ ہے کہ وقوف کا وقت یوم عرفہ کے شروع سے ہوتا ہے۔ ان کی دلیل حدیث عروہ ہے۔ کہ انہوں نے مزدلفہ میں آنحضرت ﷺ کو نماز کے لیے نکلتے دیکھا اور کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میں دو پہاڑوں سے اپنی سواری کو تھکا کر اور اپنی جان کو تکلیف میں ڈال کر آیا ہوں۔ واللہ! میں کسی پہاڑ پر نہیں رکا۔ کیا میرا حج ہوا ہے؟ فرمایا جو شخص ہماری اس نماز میں حاضر ہوا اور ہمارے ساتھ وقوف کیا حتیٰ کہ ہم چلیں اور اس سے پہلے عرفہ میں ایک دن یا رات کھڑا رہ چکا ہے اس کا حج مکمل ہوا اور اس کا میل کچیل دور ہوا۔ [بروایت احمد ،اهل السنن و صححه الترمذی]

عرفات کو اس لیے عرفات کہتے ہیں کہ جب جبریل علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کے طریقے بتائے تو عرفہ میں پہنچ کر کہا: عرفت کہ آپؑ نے حج کے طریقے پہچان لیے۔ یہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ حضرت عطاء کا لفظ یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام جو مسک حج ادا کرتے تو کہتے: عرفت ،عرفت کسی نے کہا کہ یہاں حضرت آدم و حوا کا باہم تعارف ہوا تھا۔ کسی نے کہا یہاں باہم لوگوں کا تعارف ہوتا ہے اس لیے اسے عرفات کہتے ہیں۔ کسی نے کہا بلکہ یہ اصلی نام ہے۔ عرفات کا نام مشعر الحرام مشعر اقصیٰ الال (بروزن ہلال) بھی ہے۔ اس وادی میں جو پہاڑ ہے اس کو جبل رحمت کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جاہلیت والے عرفہ میں کھڑے رہتے حتیٰ کہ جب سورج پہاڑوں پر چمکنے لگتا گویا ان کے سروں پر عمامہ ہے۔ تب وہاں سے چلتے۔ رسول اللہ ﷺ

نے دیر کی اور جب سورج ڈوب گیا تب چلے۔[بروایت ابن ابی حاتم] ابن مردویہ نے اتنا زیادہ کہا ہے کہ پھر مزدلفہ آکر ٹھہرے صبح کی نماز پڑھی جب ہر چیز سفید ہو گئی اور وقت زیادہ ہو گیا تب وہاں سے روانہ ہوئے۔اس اسناد کو ابن کثیر نے حسن کہا۔مِسوَر بن مخرمہ کہتے ہیں کہ عرفات میں رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا۔اللہ کی حمد و ثناء کرتے پھر امابعد کہتے۔اس خطبے میں یہ ارشاد فرمایا کہ آج بڑے حج کا دن ہے۔سنو کہ بت پرست مشرکین اس دن یہاں سورج ڈوبنے سے پہلے چلتے تھے جبکہ سورج پہاڑوں پر اس طرح ہو تا گویا مردوں کے سروں پر عمامہ ہیں اور ہم غروب آفتاب کے بعد چلیں گے اور وہ مشعر الحرام سے سورج نکلنے کے بعد چلتے تھے،جب کہ سورج پہاڑوں پر اس طرح چمکتا تھا گویا کہ مردوں کے سر پر عمامے ہیں اور ہم سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے نکلیں گے۔ہمارا طریقہ اہل شرک کے طریقے کے خلاف ہے۔[بروایت ابن مردویہ] حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح ہے اور شرط شیخین پر ہے۔حضرت مِسوَر کا سماع نبی علیہ السلام سے ثابت ہے یہ نہیں کہ فقط رؤیت ہو سماع نہ ہو۔جیسا کہ بعض احباب کو وہم ہوا ہے۔معلوم ہوا کہ سنتِ صحیحہ یہ ہے کہ عرفہ سے غروب آفتاب کے بعد اور مزدلفہ سے طلوع آفتاب سے قبل چلنا سنت ہے۔لیکن ایک مدت سے یہ سنت ترک ہو گئی ہے۔اکثر لوگ جاہلیت کے طریقے کے مطابق عرفہ سے غروب آفتاب سے قبل اور مزدلفہ سے طلوع آفتاب کے بعد چلتے ہیں۔پھر مشعر حرام پر ٹھہر کر دعا بھی نہیں کرتے۔حالانکہ اس جگہ ٹھہر کر اللہ کا ذکر کرنا قرآن کی نص سے ثابت ہے۔((انا للّٰہِ وانّا الیہ راجعون))حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عرفہ میں وقوف فرمایا حتیٰ کہ سورج ڈوبنے لگا اور غروب آفتاب کی وجہ سے زردی چھا گئی پھر آپ نے اپنے پیچھے اسامہؓ بن زیدؓ کو سوار کیا اور آپؐ قصواء اونٹنی پر تھے اس کی باگ آپؐ نے اس قدر کھینچی کہ وہ پالان سے جا لگی اور آپ دائیں ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے اے لوگو! آہستہ آہستہ چلو۔جس پہاڑ پر آتے تو اونٹنی کی باگ ڈھیلی کر دیتے تاکہ وہ پہاڑی عبور کرلے۔حتی کہ مزدلفہ پہنچ کر مغرب و عشاء کی نماز ایک اذان اور دو اقامت سے پڑھی۔اور درمیان میں کوئی سنت نہ پڑھی پھر لیٹ گئے۔جب فجر ہو گئی تو صبح کی نماز ادا کی اور اذان واقامت بھی کہی۔پھر قصواء پر سوار ہو کر مشعر الحرام میں آئے اور وہ ذکر تسبیح، تہلیل، تکبیر و توحید کرتے رہے اور خوب روشنی تک کھڑے رہے لیکن سورج طلوع ہونے سے قبل آگے چلے۔[بروایت مسلم] صحیحین میں حضرت اسامہؓ بن زیدؓ سے مروی ہے کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ علیہ السلام کس رفتار سے چلتے تھے۔فرمایا عام درمیانہ رفتار سے چلتے لیکن جب کوئی گھاٹی آتی تو ذرا تیز چلتے۔سفیان بن عینیہ نے کہا کہ مشعر حرام کے پاس ذکر کرنے سے یہی دو نمازیں ادا کرنا مراد ہے۔ابن عمرو فرماتے ہیں کہ مشعر حرام یہی سارا مزدلفہ ہے۔ابن عمر نے کہا کہ مشعر یہی پہاڑ ہے اور جو بھی اس کے ارد گرد ہے جب لوگوں کو دیکھا

کہ قزح پر بھیڑ کرتے ہیں تو کہا یہ سارا مزدلفہ مشعر ہی ہے۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت نے کہا کہ دونوں پہاڑوں کے درمیان مشعر ہے۔

فائدہ: ظاہری اور واضح علامات کو مشاعر کہتے ہیں۔ مزدلفۃ کا نام مشعر الحرام اس لیے ہے کہ وہ داخل حرم ہے۔ ایک گروہ سلف اور بعض اصحاب شافعی مثلاً قفال، ابن خزیمہ، کا مذہب یہ ہے کہ وقوف مزدلفہ حج کا رکن ہے۔ اس کے بغیر حج مکمل نہیں ہوتا۔ اور ان کی دلیل وہی حدیث عروہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ رکن نہ ہے بلکہ واجب ہے اس کو چھوڑنے پر قربانی لازم آئے گی۔ امام شافعی کا ایک قول یہی ہے اور تیسرا یہ قول ہے کہ یہ نہ رکن ہے نہ واجب بلکہ مستحب ہے جس کے چھوڑنے سے قربانی لازم نہیں آتی ہے۔ یہ اہل علم کے کل تین اقوال ہوئے۔ حضرت زید بن اسلم نے مرفوعاً کہا کہ سارا عرفہ موقف ہے جو بطن عرفہ سے بلند ہوا اور سارا مزدلفہ بھی ٹھہرنے کی جگہ ہے مگر وادی مُحسر یہ حدیث مرسل ہے۔ اور اس بات پر اہل علم کا اجماع ہے کہ دونوں افعال سنت ہیں۔ یعنی مزدلفہ میں مغرب و عشاء کی نماز پڑھے اور مشعر حرام میں ذکر و دعا تہلیل و تکبیر میں مشغول ہونا اور جو فرمایا کہ جس طرح اللہ نے تمہیں سکھایا ہے اس کو اس طرح یاد کرو اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہ اللہ کا تم پر انعام و احسان ہے کہ اس نے تمہیں وہی مناسک حج سکھائے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سکھائے تھے۔ ورنہ تم اس بتانے سے پہلے یا رسول و قرآن سے پہلے راہ گم شدہ پر تھے۔ یہ سب معانی قریب قریب اور باہم متلازم ہیں۔ اور درست ہیں۔

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٩٩﴾ پھر جہاں سے اور لوگ واپس ہوں وہیں سے تم بھی واپس ہو اور اللہ سے بخشش مانگو، بے شک اللہ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔

فائدہ: دور جاہلت کی غلطیوں سے ایک یہ بھی تھی کہ اہل مکہ عرفات تک نہ جاتے تھے بلکہ مزدلفہ میں ہی رہتے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود کو پاک سمجھتے تھے اور حرم کی حد پر ٹھہرتے حرم سے باہر نہ جاتے کیونکہ عرفہ حرم سے باہر ہے۔ سو فرمایا کہ جہاں سے سب لوگ چلیں تو تم بھی چلو اور اپنی گذشتہ غلطی پر نادم ہو۔

فائدہ: ابن کثیر فرماتے ہیں کہ گویا اللہ کریم نے اس آیت میں یہ حکم دیا کہ جو کوئی عرفہ میں ٹھہرے وہ مزدلفہ بھی جائے۔ اور مشعر الحرام کے پاس اللہ کا ذکر کرے اور عرفات میں اسی جگہ جہاں سب لوگ کھڑے ہوں وہاں نہیں جہاں قریش کھڑے ہوتے تھے۔ قریش حل کی زمین کے پاس کنارۂ حرم پر کھڑے ہوتے تھے

اور کہتے کہ ہم اللہ کے شہر والے اور اسی کے گھر میں رہنے والے ہیں۔ بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ قریش اور ان کے ہم مذہب لوگ مزدلفہ میں ٹھہرتے ان کو حمس کہا جاتا تھا۔ باقی سارے عرب عرفہ میں ٹھہرتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اللہ کریم نے پیغمبر علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ عرفات میں وقوف کریں۔ پھر قاعدے کے مطابق وہاں سے واپس لوٹو۔

حضرت ابن عباس، مجاہد، عطاء، قتادہ، سدی اور ابن جریر وغیرہ کا یہی مذہب ہے اور اسی پر اجماع منقول ہے۔ جبیر بن مطعم فرماتے ہیں کہ میرا اونٹ کھو گیا میں اس کی تلاش میں عرفہ گیا تو وہاں آنحضرت ﷺ کو کھڑے دیکھا تو اپنے دل میں سوچا کہ یہ تو حمس ہیں یہ یہاں کیسے کھڑے ہیں۔ [بروایت احمد و شیخان] جو بخاری کی ابن عباس سے روایت ہے اس کے مقتضی یہ ہے کہ چلنے سے یہ مراد ہے کہ مزدلفہ سے چل کر منیٰ میں کنکر مارنے کے لیے آؤ۔ ضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ ابن جریر نے فرمایا کہ اس جگہ ناس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں۔ کسی نے کہا امام مراد ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ اگر اجماع حجت اس کے خلاف نہ ہوتا تو یہ قول سب سے زیادہ راجح ہوتا۔ اللہ کریم نے اکثر عبادت کے مکمل ہونے پر ذکر کا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہوتے تو تین دفعہ استغفار کرتے۔ صحیحین میں ہے کہ تینتیس دفعہ نماز کے بعد تکبیر و تسبیح و تحمید کی ترغیب فرمائی ہے۔ ابن جریر نے کہا کہ مرداس اسلمی کی حدیث میں آیا ہے کہ تیسرے پہر آپ ؐ نے مقام عرفہ میں امت کے لیے دعا کی۔ بخاری میں شداد بن اوس سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا سید الاستغفار یہ ہے۔ پھر دعا پڑھی کہ جس نے اس کو رات میں پڑھا تو جنت میں گیا اور جس نے اس کو دن میں کہا پھر مر گیا تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسی دعا سکھا دیجئے جس کو میں نماز میں پڑھا کروں۔ فرمایا کہ تو کہہ: ((اللهم انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً و لا یغفر الذنوب الا انت فاغفرلی مغفرة من عندك وارحمنی انك انت الغفور الرحیم)) ابن کثیر فرماتے ہیں کہ استغفار کے متعلق بہت سی احادیث اور ہیں۔ یہ حدیثیں رسالہ محمد "محوال الحوبة با ستکثار الاستغفار و التوبه" میں مذکور ہیں۔ اسی طرح اہل عرفہ پر رحمت و مقبولیت دعا کے متعلق بہت سی احادیث ہیں اس جگہ توبہ کا حکم اس لیے دیا کہ وہ نزول رحمت و قربت اور مقبولیت دعا کا وقت ہے۔ اور فرض عبادت کا مقام ہے یہاں سارے گناہوں سے سچی توبہ کرنا چاہیئے۔

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾

پھر جب حج کے تمام ارکان پورے کر چکو تو (منیٰ میں) اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور بعض لوگ ایسے ہیں جو (اللہ سے) التجا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو (جو دنیا ہے) دنیا ہی میں عنایت کر ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ اور بعضے ایسے ہیں کہ دعا کرتے ہیں کہ پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت بخشیو اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھیو۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے کاموں کا حصہ (یعنی اجر نیک تیار) ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا اور جلد اجر دینے والا ہے۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ کریم نے حکم فرمایا کہ حج کے مناسک وافعال سے فارغ ہو کر اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ حضرت عطاء فرماتے ہیں مراد یہ ہے کہ جس طرح بچہ بار بار ماں باپ کو پکارتا ہے۔ اس طرح کثرت سے اللہ کو یاد کرنے میں مصروف رہے۔ ایک جماعتِ صحابہؓ و تابعینؒ کا یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگ زمانۂ جاہلیت میں موسم حج میں اپنے باپ دادوں کے قصے سناتے۔ کوئی کہتا کہ میرا باپ غریبوں کو بہت کھانا کھلاتا ہے کوئی کہتا میرا باپ کمزوروں کے بوجھ اٹھاتا ہے۔ دیت دیتا ہے۔ انہیں بس اس قسم کے اذکار کے سوا کوئی شغل نہ تھا۔ اس پر اللہ کریم نے یہ آیت نازل فرمائی۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت اسی موقف پر ہے۔ ابن جریر نے ایک جماعت سے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ ابن کثیر نے ان کے نام بھی ذکر کیے ہیں۔ اس سے مقصود لوگوں کو ذکر اللہ پر آمادہ کرنا ہے۔ أَوْ اس جگہ تحقیق کے لیے ہے شک کے لیے نہ ہے۔ پھر کثرت ذکر کے بعد ارشاد فرمایا کہ دعا کرو کیونکہ یہ غالباً اجابت کی گھڑی ہوتی ہے۔ اس جگہ ان لوگوں کی مذمت آئی ہے صرف دنیا کا سوال کرتے ہیں اور آخرت سے کچھ غرض نہیں رکھتے۔ اس مذمت کرنے میں ان لوگوں کے مشابہ بننے سے نفرت دلائی ہے جو اپنے آباء کا ذکر اور صرف دنیا کی طلب کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا اعراب کی ایک قوم موقف میں آکر یوں کہتی تھی کہ اے اللہ! اس سال کو پانی کا سال بنا۔ اچھی کھیتی اور سرسبزی کا سال بنا، اچھی پیداوار اور اچھی ولادت کا سال بنا اور آخرت کا کچھ ذکر نہ کرتے۔ اس پر اللہ کریم نے یہ آیت نازل کی ان لوگوں کی تعریف کی جو دنیا و آخرت مانگتے ہیں۔ یہ دعا ہر خیر کو جامع اور ہر شر کو دافع ہے۔ اور ہر مطلب دنیوی کو شامل ہے

جیسے تندرستی، کشادہ گھر، نیک بیوی، وسیع رزق، علم نافع، عمل صالح، اچھی سواری اور اچھی سیرت و ثنائے جمیل وغیرہ جیسا کہ مفسرین کی عبارات دلالت کرتی ہیں، اور ان عبادات میں باہم کچھ منافات نہ ہے۔ اس لیے کہ یہ سب حسنہ دنیا میں داخل ہیں۔ رہا حسنہ آخرت تو ان میں سب سے اعلیٰ دخول جنت اور خزع اکبر سے امن میں رہنا۔ حساب کتاب میں آسانی وغیرہ داخل ہیں۔ رہی دوزخ سے نجات تو اس کے لیے ان امور کا آسان ہونا مراد ہے جن پر عمل کے ذریعے اس سے دور ہوا جا سکتا ہے۔ جیسے محارم و شبہات و شہوات سے بچنا اور گناہوں کو ترک کرنا وغیرہ۔ قاسم نے کہا جس کا شکر گذار دل، ذکر گذار زبان اور صابر جسم ملا گویا اسے دنیا و آخرت کی خیرات مل گئیں اور وہ آگ کے عذاب سے بچالیا گیا۔ قرطبی نے کہا کہ اکثر اہل علم اس بات پر ہیں کہ اس آیت میں خوبئ دار پن سے دنیا و آخرت کی نعمتیں مراد ہیں پھر کہا کہ یہی قول صحیح ہے اس لیے سیاق نکرہ میں حسنہ نکرہ ہے اور سب کو شامل ہے۔ اسی لیے حدیث میں اس دعا کے پڑھنے کی ترغیب آئی ہے۔ بخاری نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اس دعا کو پڑھا کرتے تھے۔ ((اللهم ربنا اتنا فی الدنيا حسنة و فی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار)) امام احمد فرماتے ہیں کہ کہ قتادہ نے حضرت انس سے پوچھا کہ آنحضرت ﷺ کونسی دعا زیادہ پڑھتے تھے۔ کہا یہی دعا آپؐ کثرت سے پڑھتے تھے۔ حضرت انس کی عادت یہ تھی کہ جب بھی کوئی دعا مانگا کرتے اس کو بھی ساتھ ملالیا کرتے تھے۔ مسلم میں آیا ہے کہ ابو طالوت انس کے پاس تھے ثابت نے کہا تمہارے بھائی چاہتے ہیں کہ تم ان کے لیے دعا کرو کہا: ((اللهم اتنا فی الدنيا حسنة و فی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار)) پھر ذرا باتیں کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ثابت نے کہا تمہارے بھائی جاتے ہیں اب ان کے لیے کچھ دعا کرو۔ کہا کیا تم چاہتے ہو کہ میں ان پر مشکل ڈالوں۔ جب تم میں سے کسی کو دنیا و آخرت کی خیر مل گئی اور وہ آگ کے عذاب سے بچ گیا۔ تو اس کو ساری خیر مل گئی۔ یعنی اب اور کیا چاہتے ہو؟ حضرت انس فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ایک مسلمان کی عیادت کو گئے جو دُبلا ہو گیا تھا۔ فرمایا کیا تو نے کوئی دعا کی تھی یا کرتا ہے؟ کہا: ہاں میں کہتا ہوں: ((اللهم ما كنت معاقبی به فی الاخرة نعجلة فی الدنيا)) کہ اے اللہ! جو تو عذاب مجھے آخرت میں دینا چاہتا ہے اس کو دنیا میں دے دے اور آخرت میں نہ پکڑنا۔ فرمایا سبحان اللہ! تجھے اس کے عتاب و عذاب کی طاقت کہاں ہے تو نے یہ کیوں نہ کہا: ((اللهم اتنا فی الدنيا حسنة و فی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار)) حضرت انس فرماتے ہیں کہ اس نے پھر یہی دعا کی تو اللہ نے اس کو شفا دی۔ یہ حدیث افراد مسلم سے ہے۔ شافعی نے ابن ابی السائب سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ رکن یمانی اور رکن اسود کے درمیان یہی دعا کیا کرتے

تھے۔ اس کو ابن ماجہ نے بھی حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا مگر اس کی سند ضعیف ہے۔ ابن مردویہ کا ابن عباس سے مرفوعاً لفظ یہ ہے کہ میں کسی رکن پر نہیں گذرا مگر وہاں ایک فرشتہ دیکھا جو آمین کہہ رہا ہے۔ سو جب تم وہاں سے گذرو تو یہی دعا کیا کرو۔ ایک شخص نے ابن عباس سے کہا میں نے ایک قوم سے اجارہ کیا کہ مجھے سوار کر کے لے چلیں میں ان کے ساتھ حج کروں گا اور اجرت میں سے اتنا کم کر دوں گا کیا یہ بات کافی ہے یا نہیں۔ کہا تو ان لوگوں میں سے ہے جن کے متعلق اللہ کریم نے فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾ "یہی لوگ ہیں جن کے لیے اس میں سے حصہ ہے جو انہوں نے کمایا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔" حاکم نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے اور شیخین کی شرط پر ہے۔ اس آیت پر سیقول کا نصف پارہ تمام ہوا۔ واللہ اعلم.

وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقَى وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ﴿۲۰۳﴾	اور (قیام منیٰ کے) دنوں میں (جو) گنتی کے (دن ہیں) اللہ کو یاد کرو، اگر کوئی جلدی کرے (اور) دو ہی دن میں (چل دے) تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو بعد تک ٹھہرا رہے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جو بعد تک ٹھہرا رہے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں یہ باتیں اس شخص کے لیے ہیں جو (اللہ سے) ڈرے اور تم لوگ اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ تم سب اس کے پاس جمع کیے جاؤ گے۔

فائدہ: ان آیات میں فرمایا کہ کفر کے وقت دستور تھا کہ حج سے فارغ ہو کر تین روز تک ٹھہرتے بازار لگاتے اور باپ دادوں کی بڑائی بیان کرتے تھے۔ اب اس کے عوض اللہ نے تین دن مقرر کر دیئے کہ ان دنوں میں اللہ کریم کا ذکر کریں، دوپہر کو کنکر پھینکتے ہیں ہر نماز کے بعد تکبیر پڑھتے اور عمومی اوقات میں بھی تکبیر و ذکر کرتے۔ پھر جو چاہے دو دن رہ کر رخصت ہو اور جو تین دن رہے وہ بہتر ہے۔ اور فرمایا کہ جن کو صرف دنیا کی رغبت ہے وہ آخرت سے محروم ہیں۔ اب حج کا ذکر ہو چکا۔

فائدہ: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایام معدودات سے ایام تشریق مراد ہیں۔ اور ایام معلومات سے دس دن مراد ہیں۔ تکبیر کہو ایام تشریق میں یعنی ہر فرض نماز کے بعد اللہ اکبر اللہ اکبر کہو۔

حضرت عقبہ بن عامر نے مرفوعاً فرمایا کہ یوم عرفہ، یوم النحر، ایام تشریق ہم مسلمانوں کی عید ہیں اور یہ کھانے پینے کے دن ہیں۔ [بروایت احمد] نبیشہ ہذلی کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ ایام تشریق کھانے پینے اور اللہ کے ذکر کے

دن ہیں۔[بروایت ابن جریر] حضرت ابی ہریرہ کا لفظ یہ ہے کہ یہ کھانے پینے اور ذکر اللہ کے دن ہیں۔[بروایت احمد و مسلم] ان کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ سے کہا کہ تم منیٰ میں چکر لگاؤ اور لوگوں سے کہو کہ تم روزہ نہ رکھو یہ کھانے پینے اور اللہ کے ذکر کے دن ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم نے ایام تشریق میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اور کہا کہ یہ کھانے پینے اور ذکر اللہ کے دن ہیں۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رسول اللہ علیہ السلام کے خچر پر تھے۔ شعب انصار پر سے گذرے تو فرمایا: اے لوگو! یہ دن روزے کے نہیں ہیں۔ بلکہ کھانے پینے اور ذکر اللہ کے دن ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایام تشریق چار ہیں۔ ایک یوم النحر اور تین دن اس کے بعد۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ حضرت علیؓ مرتضیٰ نے فرمایا کہ وہ تین دن ہیں۔ ایک دن نحر کا اور دو دن اس کے بعد۔ ان میں سے جس دن چاہو ذبح کرو۔ افضل پہلا دن ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ پہلا قول مشہور ہے اور آیت کا ظاہر بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ فرمایا کہ جس نے دو دنوں میں جلدی کی اس پر بھی کچھ گناہ نہیں اور جس نے دیر کی اس پر بھی کچھ گناہ نہ ہوگا۔ اس میں نحر کے بعد تین دن (ایام تشریق) پر دلالت ہے۔ اضاحی پر ذکر اللہ کا تذکرہ بھی اسی سے متعلق ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا، امام شافعی کا مسلک سب سے راجح ہے کہ قربانی کا وقت یوم النحر سے آخر ایام تشریق تک ہوتا ہے۔ اور جو مخصوص ذکر نمازوں کے بعد ہوتا ہے وہ بھی اسی ذکر سے متعلق ہے۔ اور ذکر مطلق وہ ہے جو سب احوال میں کیا جاتا ہے۔ اس باب میں علماء کے کئی اقوال ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ عملی طور پر مشہور و معروف ہے وہ یہ ہے کہ یوم عرفہ کی نماز فجر سے لے کر ایام تشریق کی نماز عصر تک ذکر کرے۔ یہ پچھلے کوچ کا آخر ہے۔ اس متعلق دار قطنی کے نزدیک ایک حدیث بھی آئی ہے مگر اس کا مرفوع ہونا درست نہ ہے۔ ہاں حضرت عمرؓ بن خطاب سے ثابت ہوا ہے کہ وہ اپنے قبے میں تکبیر کہتے ان کی آواز سن کر بازار والے بھی تکبیر کہتے حتیٰ کہ سارا منیٰ تکبیروں کی آواز سے گونج اٹھتا۔ پھر ایام معدودات کے ذکر سے وہ ذکر بھی متعلق ہے جو ہر روز ایام تشریق میں کنکر مارتے وقت کیا جاتا ہے۔ حضرت ابو داؤد کے نزدیک حدیث میں آیا ہے کہ طواف، سعی، بین الصفاء والمروۃ اور رمی جمار اللہ کے ذکر ہی کے لیے مقدر کیے گئے ہیں۔ پھر جب اللہ کریم نے پہلے دوسرے نفر کا ذکر کر دیا یعنی لوگوں کے مواقف میں جمع ہونے کے بعد جدا ہو کر اطراف دنیا میں جانے کا ذکر کر دیا تو فرمایا کہ تم اللہ کا خوف دل میں رکھو کہ جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا ہے یاد رکھو اسی کی طرف تمہیں اکٹھے ہونا ہے۔

فائدہ: فتح البیان کالفظ یہ ہے کہ قرطبی نے کہا علماء کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہ ہے کہ ایام معدودات سے ایام منیٰ مراد ہیں۔یہ تین دن ہیں انہی دنوں میں کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ان میں پہلا دن گیارہ ذی الحجۃ ہے۔حضرت ابن عمرؓ،ابن عباسؓ،شافعی،مجاہد اور قتادہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ابراہیم نے کہا کہ ایام معدودات سے عشر اور ایام معلومات سے ایام نحر (تشریق) مراد ہیں۔قرطبی نے کہا یہ بات درست نہ ہے اس لیے کہ پہلی بات پر ابن عبدالبر نے اجماع نقل کیا ہے۔ابو یوسف و محمد نے ایام معلومات سے ایام النحر مراد لیے ہیں۔ایک قربانی کا دن اور دو دن اس کے ساتھ جو اس کے بعد ہیں۔گویا ان کے نزدیک معدودات و معلومات میں کچھ فرق نہ ہے۔کیونکہ قران پاک میں بلا خلاف معدودات سے ایام تشریق ہی مراد ہیں۔امام مالک نے فرمایا بلکہ یہ چاروں دنوں کو شامل ہے یوم النحر اور اس کے تین بعد والے دنوں کو۔کیونکہ یوم النحر معلوم ہے معدود نہ ہے۔اور جو دو دن اس کے بعد ہیں وہ معلوم و معدود ہیں اور ان کا چوتھا دن نہ معلوم ہے نہ معدود ہے۔پھر جس نے صبح عرفہ سے آخر ایام تشریق تک تکبیر کا وقت بتایا ہے اس کے حساب سے تیئس نمازیں ہوتی ہیں۔حضرت علی مرتضیٰ،مکحول،ابو یوسف اور محمد کا یہی قول ہے۔کسی نے کہا صبح عرفہ سے یوم النحر کے آخری دن عصر تک ہے۔ابو حنیفہ اور ابن مسعود اسی طرف گئے ہیں۔اس حساب سے آٹھ نمازیں ہوئیں۔کسی نے کہا یوم النحر کی نماز ظہر سے ایام تشریق کے آخر تک امام مالک و شافعی اسی کے قائل ہیں۔اس مطابقت سے پندرہ نمازیں ہوئیں۔حضرت ابن عباسؓ و ابن عمرؓ کا یہی قول ہے۔شافعی کے نزدیک تکبیر کا مطلب اللہ اکبر کہنا ہے۔اس کو برابر تین دفعہ کہے۔اہل عراق کہتے ہیں کہ دو دفعہ کہے۔آیت کریمہ سے ثابت ہوا کہ تاخیر کرنا اور جلدی کرنا دونوں جائز ہیں۔یہ تخییر اس شخص کے گناہوں کو ختم کرے گی جو متقی ہے کیونکہ متقی ہی ہر شک و شبہ والی چیز سے بچتا ہے۔اسی لیے اس حکم کی تخصیص متقی کے حق میں ہی ہو گی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُعۡجِبُكَ قَوۡلُهُ فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَيُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِي قَلۡبِهِ وَهُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ۝۲۰۴ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الۡاَرۡضِ لِيُفۡسِدَ فِيۡهَا وَيُهۡلِكَ الۡحَرۡثَ وَالنَّسۡلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الۡفَسَادَ ۝۲۰۵ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتۡهُ

اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو دنیا کی زندگی میں تم کو دلکش معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر پر اللہ کو گواہ بناتا ہے حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔اور جب پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے تو زمین میں دوڑتا پھرتا ہے تاکہ اس میں فتنہ انگیزی کرے اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں) کی نسل کو نابود کر دے اور اللہ فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا۔اور جب اس سے کہا

الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٢٠٦﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠٧﴾

جاتا ہے کہ اللہ سے خوف کر تو غرور اس کو گناہ میں پھنسا دیتا ہے سو ایسے کو جہنم سزاوار ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔اور کوئی شخص ایسا ہے کہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے۔

فائدہ: یہ منافق کا حال ہے کہ بظاہر خوشامد کرتا ہے اور اس بات پر اللہ کو گواہ بناتا ہے کہ میرے دل میں تمہاری محبت ہے اور جھگڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑے اور اگر ان پر قابو پالے تو فساد مچادے اور اگر منع کیا جائے تو ضد میں آکر مزید گناہ پر آمادہ ہو۔

اخنس بن شریق نامی ایک شخص تھا۔اس نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایسا ہی رویہ اپنایا۔پھر اس کے بعد اللہ کریم نے اہل ایمان کا ذکر کیا کہ وہ اللہ کی رضا پر اپنا نفس بھی قربان کیے دیتا ہے۔سدی نے کہا کہ یہ آیت اخنس بن شریق ثقفی کے متعلق نازل ہوئی۔اس نے نبی علیہ السلام کے پاس آکر اسلام ظاہر کیا لیکن باطن حقیقت میں ایسا نہ تھا ۔ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت منافقین کے چند نفر کے متعلق نازل ہوئی۔ جنہوں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے متعلق گفتگو کی تھی۔اس پر اللہ نے ان کی مذمت کی اور خبیب رضی اللہ عنہ اور ان کے احباب کی مدح فرمائی ۔کسی نے اس آیت کو تمام منافقین اور تمام مومنین کے حق میں عام رکھا۔حضرت مجاہد، قتادہ اور ربیع وغیر ھم کا یہی قول ہے۔ابن کثیر نے بھی اس کو عام رکھا کیونکہ لفظ کا عموم سبب کے خصوص سے زیادہ معتبر ہے۔ابن جریر نے نوف بکالی سے روایت کیا ہے کہ وہ کتاب خواں تھے،انہوں نے فرمایا کہ میں نے اللہ کی نازل کردہ کتاب میں کچھ لوگوں کا حال پاتا ہوں وہ حال یہ ہے کہ ایک ایسی قوم ہو گی جو دنیا پر دین کا حیلہ کرے گی ان کی زبان تو شہد سے بھی میٹھی ہو گی مگر دل ایلوے سے بھی کڑوے ہوں گے۔لوگوں کو دکھانے کے لیے بکریوں کا پوستین پہنیں گے۔اور ان کے دل بھیڑیوں کے سے ہوں گے۔اللہ فرمائے گا کیا یہ مجھ پر جرأت کرتے ہیں یا مجھ پر مغرور ہیں۔میں نے اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں ان پر ایسا فتنہ برپا کروں گا جس سے بڑا بردبار شخص بھی حیران ہو جائے گا۔قرطبی کہتے ہیں کہ میں نے قرآن پر غور کیا اس میں دیکھا کہ ایسے منافقین ہی وہ قوم ہیں۔وہ آیت جس میں ان کا حال پایا وہ یہی آیت باب ہے۔حضرت سعید نے کہا بعض کتب میں لکھا ہے کہ اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں جن کی زبانیں بہت میٹھی اور دل ایلوے کے سے کڑوے ہوتے ہیں۔قرطبی نے کہا یہ بات کتاب اللہ میں ہے۔سعید نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ کہا وہ یہ آیت ہے:﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ﴾ ”لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ دنیا میں

جن کی بات آپؐ کو بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے۔" حضرت سعید نے کہا میں جانتا ہوں کہ یہ آیت کس کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ قرطبی نے کہا ہاں کوئی آیت کسی شخص کے متعلق نازل ہوتی تھی مگر پھر وہ عام ہوتی ہے۔ وہی قاعدے کے موافق کہ لفظ کا عموم سبب کے خصوص سے زیادہ معتبر ہوتا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ قرطبی کا یہ کہنا حسن صحیح ہے۔ یَشْهَدُ اللّٰهَ کو دو طرح پڑھا ہے۔ ایک بفتح یاء تحیته و ضم نام مبارک اللہ۔ اس کے معنی یہ ہوں گے اگرچہ وہ شخص تمہارے سامنے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے لیکن اللہ کو معلوم ہے کہ اس کے دل میں برائی ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ۝ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكَاذِبُوْنَ ۝﴾ "اور جب آپؐ کے پاس منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تو جانتا ہی ہے کہ وہ اس کا رسول ہے اور اللہ گواہ ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں۔" اور دوسری قرأت بضم یائے تحیته و نصب اسم مبارك الله ہے۔ یہی جمہور کی قرأت ہے۔ اس کے معنی یہوں گے کہ وہ بظاہر لوگوں پر ایمان ظاہر کرتا ہے لیکن دل کے کفر و نفاق سے اللہ کا مقابلہ کرتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ﴾ "کہ وہ لوگوں سے تو چھپ سکتے ہیں لیکن اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔" ابن عباسؓ نے بھی یہی معنی بیان کیے ہیں۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ جب ایمان کو ظاہر کرتا ہے تو قسم کھا کر کہتا ہے کہ اللہ گواہ ہے اس بات پر کہ میرا دل میری زبان کے موافق ہے۔ یہ معنی بھی درست ہیں۔ ابن جریر، ابن زید اور مجاہد وغیرہ بھی اسی طرف گئے ہیں اور الَدّ کج طبیعت کو کہا جاتا ہے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا﴾ "ای عوجا اور آپؐ اس کے ذریعے ٹیڑھی قوم کو ڈرائیں۔" منافق کا بھی یہی حال ہے کہ لڑائی کے وقت وہ جھوٹ بولتا ہے۔ سیدھی راہ پر ٹھہرتا نہ ہے۔ کمزور موقف رکھتا ہے جس طرح کہ صحیحین میں مرفوعاً آیا ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب عہد کرے تو توڑ دے جب جھگڑا کرے تو گالی دے۔ بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً آیا ہے کہ اللہ کو وہ شخص بہت برا لگتا ہے جو کج طبیعت جھگڑالو ہے۔ اس کو عبدالرزاق نے بھی روایت کیا ہے۔ سعی سے اس جگہ قصد مراد ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى﴾ "پھر پیٹھ پھیر کر کوشش کرتا ہوا چلا گیا۔" اور جیسے فرمایا: ﴿فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ "کہ پھر اللہ کے ذکر کی طرف آؤ۔" کیونکہ سنت صحیحہ میں نماز کے لیے حسی طور پر بھاگنے سے منع فرمایا ہے۔ فرمایا کہ جب تم نماز کے لیے آؤ تو دوڑتے ہوئے نہ آؤ بلکہ وقار و سکینت سے چلو۔ منافق کا یہی ارادہ ہوتا ہے کہ زمین میں فساد کرے۔ کھیتی پھلوں اور نسل کو برباد دے۔ غرضیکہ قول یہ اور کام یہ ہے حضرت مجاہد نے فرمایا کہ زمین میں فساد کرنے سے اللہ پانی

نہیں برساتا۔اور اس صفت کے موصوف شخص کو اللہ پسند نہیں کرتا۔پھر جب فاجر شخص کو بتاؤ اور وعظ کرو اور اللہ سے خوف دلاؤ تو وہ اپنے عزت نفس سے اور ضد سے اور بھی زیادہ گناہ کرتا ہے۔یہ آیت اس آیت کی طرح ہے:﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيَاتِنَا قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمُ النَّارُ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾''اور جب ان پر ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو توانکے چہروں میں برائی دیکھتا ہے (اور) وہ قریب ہیں نہ ان لوگوں پر چڑھ دوڑیں جو ان پر ہماری آیات پڑھتے ہیں۔کہہ دیجئے!کیا میں تمہیں اس سے بھی بری چیز کی خبر دوں؟وہ آگ ہے جس کا اللہ نے ان کافروں سے وعدہ کرر کھا ہے۔اور بہت بری پھرنے کی جگہ ہے۔''

اسی لیے آیت باب میں فرمایا کہ اس کو جہنم کافی ہے۔اور وہ برا بچھونا ہے۔حضرت ابن عباس،انس،ابن میتب،ابو عثمان النھدی،عکرمہ اور اہل علم کی ایک جماعت نے کہا کہ آیت:﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ ....الخ﴾ حضرت صہیب بن سنان رومی کے حق میں نازل ہوئی۔یہ مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے چاہا کہ مدینہ ہجرت کر جائیں لیکن لوگوں نے کہ کہ تم اپنا مال لے کر نہیں جا سکتے ہو اگر مال چھوڑ کر جانا ہو تو چلے جاؤ۔انہوں نے منع کرنے والوں کو سارا مال دے دیا اور خود تن تنہا مدینہ ہجرت کر گئے۔اس پر اللہ کریم نے یہ آیت نازل فرمائی۔حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور صحابہؓ کی ایک جماعت نے سنگستانِ مدینہ میں ان کا استقبال کیا اور کہا کہ تمہاری تجارت میں نفع ہوا،کہا اللہ تمہاری تجارت میں بھی نقصان نہ دے کیا بات ہے انہوں نے کہا اللہ کریم نے تمہارے متعلق یہ آیت نازل فرمائی ہے۔ایک روایت میں اس طرح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ربح بیع صہیبؓ ابن مردویہ نے کہا کہ آنحضرت علیہ السلام نے یہ لفظ دو دفعہ فرمایا ربحُ صہیبؓ ربح صہیبؓ حافظ محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا:

حسن ز بصرہ بلالؓ از حبش صہیبؓ ز روم ز خاك مكه ابوجهل ایں چه بوا العجبسیت

اکثر اہل علم نے کہا کہ ہر مجاہد فی سبیل اللہ اس کا مصداق ہے۔جیسے فرمایا:﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰاةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝﴾''بلاشبہ اللہ کریم نے مومنین سے ان کے نفوس اور اموال کو خرید لیا ہے کہ ان کے لیے جنت ہے۔وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔اس پر

توراۃ انجیل اور قرآن میں بر حق وعدہ ہے اور جس نے اللہ کے اس وعدے کو پورا کیا تو اس بیع سے خوش ہو جاؤ جو تم نے اس سے بیع کی ہے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔" حضرت ہشام بن عامر نے کفار کی دو صفوں پر حملہ کر دیا بعض لوگوں نے اس پر کلام کیا اس پر حضرت ابو ہریرہؓ اور عمر بن الخطاب ؓ نے ان لوگوں کا رد کیا اور یہ آیت تلاوت کی: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ﴾ "اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کی رضاجوئی کے لیے اپنے نفس کو بیچ دیتا ہے۔"

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے مومنین کے ذکر کے بعد منافقین کا ذکر کیا ہے۔ جو کہ دل میں کفر و نفاق رکھے ہوئے ہے اور زبان سے خلاف عقیدہ بات کرتا ہے۔ وہ اس آیت میں داخل ہے۔ اَلَدُّ الْخِصَامِ "وہ شخص ہے جو باطل میں بڑی بحث کرنے والا ہو۔" باتیں جھوٹی کرتا ہو۔ اس کا دل سخت ہو۔ اگرچہ بات تو حکمت کی کرتا ہے مگر اس کا کام برا ہے۔ سعی سے یا تو یہ مراد ہے کہ وہ فساد کے لیے دوڑتا ہے۔ جیسے رہزنی وغیرہ مسلمانوں سے لڑنا اور قطع رحمی کرنا۔ یا اس سے یہ مراد ہے پاؤں سے تو نہیں چلتا مگر ایسی تدبیریں کرتا ہے جس سے مسلمانوں کو نقصان ہو۔ ہر وہ کام جس کو کوا نسان حواس خمسہ سے یا اعضاء سے کرتا ہے اس کو سعی کہا جاتا ہے۔ آیت سے بھی یہی معنی ظاہر ہوتے ہیں۔ اور فساد کا لفظ خونریزی، غارت گری وغیرہ سب کو شامل ہے۔ حرث سے کھیتی اور نسل سے اولاد مراد ہے۔ یا حرث سے عورتیں اور نسل سے مرد مراد ہیں۔ اور لا یحب الفساد سے معتزلہ نے اس بات پر دلیل لی ہے کہ محبت ارادے سے عبارت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ محبت اور چیز ہے اور ارادہ اور چیز ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کسی چیز کا ارادہ تو کرتا ہے لیکن اس سے محبت نہیں کرتا۔ جیسے کڑوی دوا ہو اس کو انسان پی تو لیتا ہے مگر اس کو پسند نہیں کرتا۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا اللہ کے نزدیک بڑا گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی مسلمان بھائی سے کہے کہ اللہ سے ڈرو اور وہ جواب دے کہ تم خود ڈرتے رہو مجھے کیا کہتے ہو۔ ایک شخص نے حضرت مالک بن مغول سے کہا کہ اللہ سے ڈرو انہوں نے براہ عاجزی و خاکساری اپنا رخسار زمین پر رکھ دیا۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿٢٠٨﴾ فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٠٩﴾

مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو، وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے۔ پھر اگر تم احکام روشن پہنچ جانے کے بعد لڑکھڑا جاؤ تو جان رکھو کہ اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔

فائدہ: اس آیت کریمہ میں اللہ کریم نے مومنین کو حکم دیا کہ تم اسلام کے دائرے میں مکمل طور پر داخل ہو جاؤ اور پوری شریعت پر عمل کرو۔ جہاں تک ممکن ہو سکے سارے اوامر بجالاؤ اور سارے نواہی سے بچو۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، طاؤس ضحاک، عکرمہ، قتادہ، سدی اور ابن زید نے کہا کہ اس جگہ سِلم سے اسلام مراد ہے۔ ابو العالیہ اور ربیع نے کہا طاعت مراد ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا بلکہ موادعت مراد ہے۔ حضرت عکرمہ کا خیال ہے کہ یہ آیت یہود کے چند افراد کے متعلق نازل ہوئی جو مسلمان ہو گئے تھے جیسے عبداللہ بن سلام، اسد بن عبید ثعلبہ ایک گروہ نے نبی علیہ السلام سے اجازت چاہی کہ وہ ہفتے کے دن کی تعظیم بجالائیں رات کو تورات کی تلاوت کیا کریں۔ اللہ نے فرمایا کہ اسلام کو ہی قبول کرو اور اسلام کے علاوہ کسی اور چیز میں مشغول نہ ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ مومنین سے اہل کتاب کے ایمان والے مراد ہیں جو ایمان تو لے آئے تھے مگر تورات کے بعض امور کو پکڑے ہوئے تھے۔ اللہ کریم نے فرمایا کہ اسلام کو مضبوطی سے پکڑو اسلام کی کوئی چیز ترک نہ کرو۔ تورات پر صرف تمہارا ایمان لانا ہی کافی ہے۔ شیطان کی پیروی نہ کرو وہ جب بھی تمہیں حکم دے گا بے حیائی اور برائی کا حکم دے گا۔ اس کے چیلے تمہیں اہل جہنم سے بنانا چاہتے ہیں۔ مطرف نے کہا کہ اللہ کی مخلوق میں سے اس کے بندوں کے لیے سب سے زیادہ دھوکہ باز شیطان ہے۔ اور آیت میں ان لوگوں کے لیے بڑی سخت وعید ہے جو ایمان میں مستقیم نہ ہیں دل میں شک و نفاق رکھتے ہیں۔

هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٢١٠﴾

کیا یہ لوگ اسی بات کے منتظر ہیں کہ ان پر اللہ (کا عذاب) بادل کے سائبانوں میں آنازل ہو اور فرشتے بھی (اتر آئیں اور کام تمام کر دیا جائے اور سب کاموں کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے۔

فائدہ: یہ لوگ قرآن اور پیغمبر علیہ السلام پر تو ایمان نہیں لائے اور اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ خود ان کے پاس آئے اور ہر ایک کو اس کے عمل کی جزاء دے۔ اس آیت میں اللہ کریم کی طرف سے منکرین رسالت کے لیے دھمکی ہے کہ کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ قیامت برپا ہو جائے اور اللہ کریم سب اگلے پچھلے لوگوں کا فیصلہ کر دے ہر نیک اور بد عمل کی جزاء دے دے۔ جس طرح دوسری آیت میں فرمایا: ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا اَنْ تَاتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاتِيَ بَعْضُ اٰيَاتِ رَبِّكَ﴾ کہ "وہ کیا اسی انتظار میں ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تیرا رب آئے یا تیرے رب کی بعض نشانیاں آجائیں۔" ابن جریر نے اس مقام پر حضرت ابوہریرہؓ سے وہ حدیث طویل ذکر کی ہے جس میں صور کا ذکر ہے یہ حدیث مرفوع مشہور ہے۔ بہت سے اصحاب مسانید وغیرھم

نے اس کو روایت کیا ہے۔اس کا مضمون یہ ہے کہ جب لوگ میدان حشر میں کھڑے کھڑے اکتا جائیں گے تو انبیاء کرام کو اللہ کے حضور سفارش کے لیے لانا چاہیں گے۔حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کئی پیغمبروں سے سفارش کی بات کریں گے ہر نبی یہ کہہ کر کہ وہ اس کا اہل نہ ہے دامن بچالیتا۔ حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ کی باری آئی۔ آپ علیہ السلام فرمائیں گے ہاں میں سفارش کروں گا پھر آپ علیہ السلام جاکر عرش مبارک کے نیچے سجدہ ریز ہوں گے اور اللہ سے عرض کریں گے کہ فیصلہ مخلوق کے لیے آنا چاہیے۔اللہ کریم اس سفارش کو قبول فرمائیں گے اور بادلوں کے سائبان میں نمودار ہوں گے۔اور اللہ کی تشریف آوری آسمان پھٹ جانے کے بعد ہو گی۔پھر پہلے ،پھر دوسرے تیسرے ساتوں آسمانوں کے فرشتے نازل ہوں گے۔عرش بھی اترے گا۔ فرشتے تسبیح کرتے ہوئے کہیں گے:((سبحان ذی الملك والمكوت سبحان ذی العزة والجبروت سبحان الحی الذی لایموت سبحان ذی السلطان والعظمة سبحانه سبحانه ابدًا ابدًا))ابن مردویہ نے اس جگہ کچھ روایات ایسی لکھی ہیں جو غریب ہیں انہی احادیث میں سے حضرت ابن مسعود کی مرفوع حدیث بھی ہے کہ اللہ پہلوں اور پچھلوں کو معلوم دن کے وعدے کے مقام پر جمع کرے گا۔وہ سب آنکھیں کھولے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوں گے اور فیصلے کے منتظر ہوں گے اتنے میں اللہ کریم عرش مبارک سے کرسی پر بادلوں کے سائے میں نزول فرمائیں گے۔حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا جب کہ اللہ کریم نزول فرمائے گا تو خالق و مخلوق کے درمیان ستر پردے ہوں گے۔بعض نور کے پردے ہوں گے اور بعض ظلمت کے بعض پانی کے پردے ہوں گے اس تاریکی میں پانی کی آواز سے دل دھل جائیں گے۔[بروایت ابن ابی حاتم]زبیر بن محمد کہتے ہیں کہ اس سایہ ابر میں یاقوت وجواہر اور زبرجد جڑے ہوں گے۔حضرت مجاہد نے فرمایا وہ دنیا کے سے بادل نہ ہوں گے اس طرح کا ابر دنیا میں صرف بنی اسرائیل پر ہوا جب وہ میدان تیہ میں سرگردان پھرتے تھے۔ابو العالیہ نے کہا کہ فرشتے بادلوں کے سائے میں آئیں گے اور اللہ کریم جس چیز میں چاہے گا آئے گا۔بعض قرات میں اس طرح ہے:﴿الّا ان یاتیہم الله والملائكة فی ظلل من الغمام﴾وہ آیت بھی اسی طرح ہے:﴿وَیَومَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلَا ئِكَةُ تَنزِیْلًا﴾"اور جس دن آسمان بادلوں سے پھٹ جائے گا اور فرشتے اتارے جائیں گے۔"

فائدہ: یہ آیت آیات صفات میں سے ہے۔اس باب میں علماء کے دو مذاہب ہیں۔ایک یہ ہے کہ ان کے ظاہر پر محض ایمان لانا اور اس کا عقیدہ رکھنا اور اللہ کریم کو تشبیہ و تمثیل و تحریف و تبدیل و تعطیل سے بالاتر

سمجھنا۔ سلف امت وائمہ ملت اسی طرف گئے ہیں ۔ کلبی نے کہا کہ اس کی تفسیر نہیں کی جاتی ہے۔ ابن عینیہ ،زہری،اوزاعی،مالک،ابن مبارک لیث،امام احمد اور ابن راہویہ کا یہ قول ہے کہ آیاتِ صفات جس طرح آئی ہیں انہیں بغیر تکییف و تشبیہ و تعطیل و تاویل کے پڑھنا اور جاری کرنا چاہیے۔ علماء سنت اسی عقیدہ کے حامل ہیں۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ ہر مقام کی مناسبت سے ایسی تاویل کرنا چاہیے جس سے تنزیہ باری تعالیٰ ثابت ہو۔ جمہور متکلمین واصحاب نظر کا یہی مسلک ہے۔ مثلاً آیت باب میں کہتے ہیں کہ اللہ کے آنے سے مراد اس کی آیات یا امر یا عذاب کا آنا مراد ہے۔ سو یہ مذہب ائمہ ملت کے مذہب کے خلاف ہے۔ اس کی توضیح رسالہ " انتقاد ربیع "اور رسالہ "فتح الباب" میں کی گئی ہے۔ جبکہ لَيْسَ كَمِثْلِهِ بنیادی عقیدہ ثابت ہوا تو اب ظاہر عبارت میں تشبیہ و تمثیل کا لازم آجانا کچھ نقصان دہ نہ ہوگا، یہ اجمالی کلمہ تشبیہ و تمثیل کے معالجہ کے لیے کافی ہے۔ نفی میں یہ کلمہ اور اثبات میں ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ "کہ رحمان عرش پر مستوی ہوا کافی ہے۔"

سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُمْ مِنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴿۲۱۲﴾

(اے محمدؐ) بنی اسرائیل سے پوچھو کہ ہم نے ان کو کتنی کھلی نشانیاں دیں اور جو شخص اللہ کی نعمت کو اپنے پاس آنے کے بعد بدل دے تو اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے۔ اور جو کافر ہیں ان کے لیے دنیا کی زندگی خوشنما کر دی گئی ہے اور وہ مومنوں سے تمسخر کرتے ہیں لیکن جو پرہیز گار ہیں وہ قیامت کے دن ان پر غالب ہوں گے اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔

فائدہ: اس آیت مبارکہ میں اللہ کریم نے بنی اسرائیل کے متعلق خبر دی کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بہت نشانیاں دیکھیں جو ان کی صداقت پر قطعی حجت تھیں، جیسے ید بیضاء، عصا، فلق بحر، ضرب حجر، سایہ ابر، نزول من وسلویٰ وغیرھا۔ ان کا آنکھوں سے دیکھ لینا یقیناً فاعل مختار پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن اس عینی مشاہدے کے بعد بھی ان کے اکثر لوگ ایمان سے پھر گئے اور ایمان کو کفر سے بدل دیا۔ اس بدترین تبدیلی کا بدلہ انہیں سخت عذاب کی صورت میں ملے گا۔ جس طرح اللہ کریم نے کفار قریش کے حال کی خبر دیتے ہوئے فرمایا: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝﴾ کہ "کیا آپ نے ان لوگوں کو نہ دیکھا کہ جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو

ہلاکت کے گھر میں جا اتارا، وہ واصل جہنم ہوں گے اور وہ بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے۔" اس جگہ نعمت سے ایمان مراد ہے۔ سچے ایمان سے بڑھ کر کوئی نعمت نہ ہے۔

((ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ))

پھر فرمایا کہ ہم نے دنیا کو کافروں کی نظروں میں بہار بنادیا ہے۔ وہ اسی زندگی کو سب کچھ سمجھ کر اس پر راضی ہو کر مال جمع کرتے ہیں اور اللہ کی رضا جوئی کے مقاصد میں جہاں اس کے خرچ کرنے کا حق ہے وہاں وہ خرچ نہیں کرتے بلکہ مفلس ایمانداروں کو مذاق کرتے ہیں۔ اور انہیں دل لگی کا سامان سمجھتے ہیں۔ اور یہ نہیں جانتے کہ اگرچہ اب دنیا میں بظاہر وہ لوگ تم سے کم لگتے ہیں لیکن در حقیقت آخرت میں کافر لوگ حقیر و ذلیل اور مومن بلند ترین مقامات پر فائز ہوں گے۔ اعلیٰ علیین میں جگہ پائیں گے۔ اور تم (اے کافرو!) اسفل سافلین ہو گے۔

اسی لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ جس کو بھی ہم چاہتے ہیں بغیر حساب کے رزق عطا کرتے ہیں یعنی کافروں کو دنیا میں بے حساب اور بعض مومنوں کو دنیا میں بھی بے حساب دیتے ہیں جبکہ آخرت میں یقیناً خالصتاً مومنین پر یہ عطا ہوگی۔ حدیث مبارکہ میں ہے کہ اے ابن آدم! خرچ کر تجھ پر خرچ کیا جائے گا۔ جتنا زیادہ تو اللہ کی رضا کے مقام پر خرچ کرے گا اللہ تمہیں اتنا ہی زیادہ دے گا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تو خرچ کر اور صاحب عرش سے کمی کا خوف نہ کر۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿وَمَا اَنفَقتُم مِن شَیءٍ فَھُوَ یُخلِفُہٗ﴾ کہ "تم جو چیز بھی خرچ کرتے ہو گے وہ تمہیں اس کا عوض دیتا ہے۔" حدیث پاک میں ہے کہ ہر روز دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں ایک کہتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدل دے، دوسرا کہتا ہے کہ روکنے والے کو ضائع کردے۔ صحیح میں ہے کہ ابن آدم کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال۔ تیرا مال اتنا ہی ہے جو تو نے کھا کر ختم کر دیا اور پہن کر پرانا کر دیا اور جو صدقہ دیا تو وہ جاری ہو گیا۔ اس کے علاوہ جو بھی ہے وہ جانے والا ہے اور اسے لوگوں کے لیے چھوڑنے والا ہے۔

اور مسند احمد میں مرفوعاً آیا ہے کہ دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہے۔ اور اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہ ہے۔

فائدہ: اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو سوال کا حکم دیا گیا ہے یا ہر سوال کرنے کو بطور توبیخ حکم کیا ہے اور جن سے سوال کیا گیا ہے وہ یہود مدینہ ہیں۔ اور آیت سے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات مراد ہیں۔ یا محمد ﷺ کی صداقت کے دلائل مراد ہیں۔ نعمت سے مراد یا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات مراد ہیں یا اسلام مراد ہے۔ ایمان ظاہر یہ ہے کہ لفظ نعمت ہر اس نعمت الٰہی کو شامل ہے جو اس نے اپنے بندوں پر کیا۔ وہ کوئی بھی نعمت ہو کہیں بھی ہو اور کسی پر بھی ہو جب بندوں نے اس کا شکر ادا نہ کیا اسے بدل دیا تو گویا کفر ہوا۔ کیونکہ لفظ

کا عموم سبب کے خصوص سے زیادہ معتبر ہوتا ہے۔دنیا کی زینت دینے والا یا تو شیطان ہے کہ دن رات وسوسے ڈال کر جھوٹی تمناؤں میں مبتلا رکھتا ہے۔یا مزین کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے جس نے سب عجائب بنائے ہیں۔ان پر قدرت عطا کی ہے۔کیونکہ ہر چیز کا خالق وہی ہے۔کفار سے رؤسائے قریش مراد ہیں۔یا ہر کافر مراد ہے۔اس زینت کی کفار کے ساتھ اس لیے تخصیص کی کہ اگرچہ دنیا کی زندگی کافر اور مسلمان کے لیے رونق دار ہے لیکن اس کے فتنے میں خصوصی طور پر کافر ہی گرفتار ہوتے ہیں۔انہیں آخرت سے کچھ غرض نہ ہے۔مسلمان آجا کر آخرت ہی پر توجہ رکھتا ہے۔اس فانی کھیل تماشے پر دل نہیں ہار بیٹھتا۔فوقیت سے مراد یہ ہے کہ مومنین کا درجہ جنت میں بلند ہوگا۔اور کفار آگ میں ہوں گے۔یا فوق سے مکان مراد ہے،کیونکہ جنت آسمان پر ہے اور دوزخ زمین کی تہہ میں ہے۔یا یہ کہ مومنین دنیا میں بھی غالب ہیں اسلام ظاہر ہوگیا۔کفر گر گیا کافر مارے گئے۔کچھ قید ہوئے اور کچھ جزیے پر مجبور ہوئے۔آیت اس بات پر دلیل ہے کہ انہیں یہ فوقیت تقوای کی وجہ سے حاصل ہوئی۔اس میں گویا اس بات کی ترغیب ہے کہ تم تقوای اختیار کرو۔

حضرت جابر بن وہب کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں جنت والوں کی خبر نہ دوں وہ جو کمزور لوگ ہیں انہیں کمزور سمجھا جاتا ہے اگر وہ اللہ پر قسم کھالیں تو اللہ انہیں سچا کردے۔کیا میں تمہیں دوزخ والوں کی خبر نہ دوں وہ ہر شریر،بدمزاج ظالم اور متکبر ہے۔[بروایت الشیخان] حضرت اسامہ بن زید کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ میں جنت کے دروازے پر کھڑا تھا کہ اس میں جانے والے اکثر یہی مساکین تھے۔اصحاب دولت وثروت روکے گئے۔اور جب جہنمیوں کو آگ کا حکم ہوا تو میں دوزخ کے دروازے پر کھڑا ہوا اس میں دیکھا کہ اکثر دوزخ والی یہی عورتیں تھیں۔[بتخریج بخاری ومسلم] معلوم ہوا کہ کثرتِ مال اور وسعتِ رزق اس بات کی علامت نہ ہے کہ صاحب مال پر اللہ راضی ہے۔اور محتاج سے ناراض ہے۔بلکہ یہ مال آزمائش کے لیے بھیجا ہے اور محتاجی رتبہ بلند کرنے کے لیے ہے۔

مرا مرمسند جم می نشانند الٰهی بر سر آن کو نشینم

اور بغیر حساب کے یہ مطلب ہے کہ اس کو وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔جیسے فرمایا:﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾"اور اس کو وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا۔" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ نہ کوئی اس پر نگہبان ہے اور نہ اس کا کوئی حساب لینے والا ہے۔حضرت سعید بن جبیر نے کہا اللہ کا حساب کون لے۔وہ یا تو دنیا میں دے کر آخرت میں اس کا حساب نہیں لیتا۔یا یہ کہ بغیر استحقاق دیتا

ہے۔اسے خزانے کے ختم ہو جانے کا کوئی خوف نہیں کہ حساب سمجھنے کی ضرورت ہو یا یہ کہ ضرورت مند کو کم اور غیر ضرورت مند کو زیادہ دے دیتا ہے۔واللہ اعلم.

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴿۲۱۳﴾

(پہلے تو سب)لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا(لیکن وہ آپس میں اختلاف کرنے لگے)تو اللہ نے (ان کی طرف)بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے پیغمبر بھیجے اور ان پر سچائی کے ساتھ کتابیں نازل کیں تاکہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے تھے ان کا ان میں فیصلہ کر دے اور اس میں اختلاف بھی انہیں لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی باوجود یہ کہ ان کے پاس کھلے ہوئے احکام آچکے تھے (اور یہ اختلاف انہوں نے صرف) آپس کی ضد سے (کیا) تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے اللہ نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھادی اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھادیتا ہے۔

فائدہ: یعنی اللہ نے کتابیں اور نبی تو بہت بھیجے ہیں لیکن ان کو راہیں کئی نہیں بتائیں بلکہ سب اللہ کی مخلوق ہیں اور اس کی طرف سے سب کو ایک ہی راستے پر چلنے کا حکم ہوا ہے۔جب وہ لوگ ایک راستے سے کسی اور طرف نکلے تو تب ہی اللہ نے ایک اور نبی بھیجا تاکہ انہیں سیدھی راہ پر لے آئے اور کتاب دی تاکہ وہ سیدھے رہیں لیکن جب وہ اس کتاب سے توجہ ہٹانے لگے تو اور کتاب بھیجی۔سب نبی اور سب کتابیں ایک ہی راستے کی راہنمائی کے لیے آئے ہیں۔اس کی مثال اس طرح ہے جیسے تندرستی ایک ہے اور بیماریاں کئی ہیں۔جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے مطابق دوا اور پرہیز بتایا جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو اس کے مطابق ایک اور دوا اور پرہیز بتایا اب آخری کتاب میں ایک ایسا نسخہ بتایا کہ جس میں ہر مرض کی شفا ہے اور وہ سب کے بدلے کافی ہے۔

فائدہ: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس صدیوں کا فاصلہ تھا۔سب لوگ شریعت حق پر تھے۔پھر ان میں اختلاف پڑا۔اللہ نے نبی بھیجے انہوں نے خوشخبری دی اور ڈرایا۔ حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت یہ ہے:﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا﴾ حاکم نے اس کو صحیح الاسناد کہا۔ حضرت ابی بن کعبؓ کی بھی یہی قرأت ہے۔حضرت قتادہ نے کہا کہ لوگ ہدایت پر تھے۔جب ان میں اختلاف ہوا

تو اللہ نے پیغمبر بھیجے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام آئے۔ حضرت مجاہد وابن عباس کا یہی قول ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ سب لوگ کافر تھے۔ پھر اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا لیکن سند ومعنی کے لحاظ سے پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ سب لوگ ملت آدمؑ پر تھے پھر ان میں بت پرستی رواج پانے لگی۔ تب اللہ کریم نے حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا یہ اہل زمین کی طرف پہلے پیغمبر تھے۔ اسی لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ ہم نے انبیاء کے ساتھ کتابیں بھی بھیجیں لیکن انہوں نے اس کتاب کو نہ مانا ایک دوسرے پر بغاوت کی۔ (فرمایا) نہیں مانتے ہو تو نہ مانو اللہ نے اہل ایمان کو تو نور ہدایت دے دیا ہے اور انہیں اس اختلاف سے بچالیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ ہم پچھلے ہیں، مگر قیامت کے دن ہم پہلے ہیں۔ ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ فرق یہ ہے کہ کتاب انہیں پہلے ملی اور ہمیں بعد میں اللہ نے ہمیں ہدایت دی اور وہ اختلاف میں پڑے رہے۔ اور آج (جمعہ) وہ دن ہے جس میں وہ اختلاف میں رہے اور اللہ نے ہمیں اس کی راہ دکھائی۔ لوگ ہمارے پیچھے ہیں یہود کل ہیں اور نصاریٰ پرسوں ہیں۔ [بروایت عبد الرزاق]

معلوم ہوا کہ قیامت کے دن کی ترتیب دنیا کے مخالف ہوگی۔ اس میں یہ فائدہ ہے تاکہ جنت والے جہنمیوں کے فیصلے تک کھڑے مشقت نہ اٹھاتے رہیں کیونکہ وہ دن پچاس ہزار سال کا ہوگا اگر دنیا والی ترتیب ہی رکھی جاتی تو اہل جنت کی باری بہت دیر بعد آتی اور وہ ناحق طویل مشقتیں اور حشر کی صعوبتیں برداشت کرتے۔ اس لیے ان کا فیصلہ پہلے ہوگا اگرچہ وہ آخر میں آئے ہیں۔ اور وہ اہل نار کی نسبت تھوڑے بھی ہوں گے اس لیے ان کا فیصلہ پہلے ہو جانا عین رحمت اور حکمت کے موافق ہے۔ **وللہ الحمد**. پھر ساری امتوں کے کافروں کا فیصلہ ہوگا ان کا حساب جتنی دیر سے ہوگا ان کے لیے اتنی غنیمت ہے۔ حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ انہوں نے جمعے کے دن میں اختلاف کیا یہود نے ہفتہ لے لیا اور نصاریٰ نے اتوار لیا اور اللہ نے امت محمدیہؐ کو جمعے کے دن کی راہ دکھائی جو ان پر مخفی رہا تھا۔ پھر انہوں نے قبلہ میں اختلاف کیا۔ عیسائیوں نے مشرق کا رخ کر لیا اور یہودیوں نے بیت المقدس کو قبلہ بنالیا۔ اس امت نے کعبہ کو پالیا۔ پھر نماز میں انہوں نے اختلاف کیا۔ کوئی رکوع کرتا سجدہ نہ کرتا اور کوئی سجدہ کرتا رکوع نہ کرتا، کوئی نماز میں باتیں کرتا اور کوئی نماز کے دوران چلتا پھرتا۔ اللہ کریم نے اس امت کو حق کی راہ دکھائی۔ پھر انہوں نے روزے میں بھی اختلاف کیا۔ کوئی کسی خاص دن کا روزہ رکھتا اور کوئی خاص کھانے سے روزہ دار ہوتا۔ اس امت کو اللہ کریم نے حق بات عطا کی۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے متعلق اختلاف کیا یہود نے کہا وہ یہودی تھے نصاریٰ نے کہا وہ عیسائی تھے۔ اللہ نے کہا وہ ایک

طرفہ مسلمان تھے۔اس کے متعلق بھی امت محمدیہ کو حق موقف عطا ہوا۔پھر حضرت عیسیٰ کی شخصیت کے متعلق اختلاف کیا، یہود نے انہیں جھٹلایا اوران کی والدہ مطہرہ صدیقہ کی عصمت کو مشکوک کہا اور نصاریٰ نے انہیں اللہ اور ابن اللہ کہا۔حالانکہ وہ اللہ کی روح و کلمہ تھے۔اس بارے میں بھی حق موقف امت محمدیہ کو ہاتھ لگا۔معلوم ہوا کہ دین میں اختلاف ہونا بہت بڑی بری چیز ہے۔پہلی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہوگئیں۔یہ مصیبت جس دین میں بھی آگھستی ہے اس کو برباد کر کے اٹھتی ہے۔اس امت میں پہلے ایسا اختلاف نہ تھا۔سب سلف کتاب وسنت کے تابع تھے۔جب سے دین میں تقلید کی نحوست داخل ہوئی بے شمار اختلاف پیدا ہوگئے۔رائے، قیاس اور اجتہاد نے اسلام کے اتفاق کی جڑ کاٹ دی۔اہل حدیث و قرآن البتہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔وہ کون سا شخص ہے جو اس تفرقہ بازی سے الگ ہے۔اور یہ حدیث اختلاف امتی رحمۃ حجت کے قابل نہ ہے۔کیونکہ یہ سخت ضعیف ہے۔ محققین نے اس کے ثبوت میں کلام کیا ہے۔حدیث میں تو یہ ہے کہ:((من یعش بعدی فسیری اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین تمسکو بهاوعضوا علیها بالنوا جذو ایاکم ومحدثات الامور فان کل بدعةضلالة)) دوسری صحیح حدیث میں یہ خبر دی گئی ہے کہ تم تھوڑی تھوڑی بات میں بھی اہل کتاب کی پیروی کرو گے۔سو جو اختلاف اہل کتاب میں تھا وہی اب اس امت میں آگھسا ہے۔((فانا لله وانا الیه راجعون)) پھر جو حال ان کا ہوا وہی حال ان کا ہوتا نظر آرہا ہے۔ہاں جو شخص کتاب وسنت سے چمٹ جائے بدعات وخرافات سے بچتا رہے اس کی نجات کچھ مشکل نہ ہے۔اس لیے کہ نجات پانے والے گروہ کی تعریف حدیث میں یہی ہے کہ:((ما انا علیه واصحابی)) المختصر یہ کہ حضرت ربیع بن انس آیت باب کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ کریم نے اختلاف کے وقت میں ایمان والوں کو راہ حق بتادی۔یعنی جس طرح وہ اختلاف کرنے والے لوگ اختلاف سے پہلے ایک راہ پر تھے، اخلاص پر جمے ہوئے تھے۔اختلاف سے دور تھے۔اسی طرح اب یہ امت ہے جس میں کوئی اختلاف نہ ہے۔اس امت کے لوگ قیامت والے دن سب لوگوں پر گواہ ہوں گے وہ قوم نوح، قوم ہود، قوم صالح، قوم شعیب اور آل فرعون پر گواہی دیں گے کہ ان کے پیغمبروں نے تو ان تک دین پہنچادیا تھا لیکن انہوں نے ان کی تکذیب کی اوران کی اطاعت نہ کی۔حضرت ابی بن کعب کی قرأت یوں ہے:﴿لِيَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ○﴾ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ جب رات کو نماز کے لیے اٹھتے تو فرماتے:((اللهم رب جبریل ومیکائیل واسرافیل فاطر السمٰوٰت والارض عالم الغیب

والشهادة انت تحكم بين عبادك فيما كانو فيه يختلفون اهدني لما اختلف فيه من الحق باذنك انك تهدي من تشاء الى صراط مستقيم)) ابن کثیر فرماتے ہیں کہ دعائے مسنون میں یہ بھی آیا کہ: ((اللهم ارنا حقاًوارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه ولا تجعله متلبسا علينا فنضل واجعلنا للمتقين اماما))

فتح البیان میں ہے کہ جو فرمایا کہ لوگ ایک ہی دین پر تھے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اسلام پر تھے پھر ان میں اختلاف نے راہ پائی۔ یعنی جبکہ اللہ نے آدم علیہ السلام کی اولاد کو ان کی پشت سے نکالا۔ حضرت ابی بن کعب نے فرمایا کہ جب اولاد آدم کو حضرت آدم پر پیش کیا گیا تو وہ سب (فطرت) دین اسلام پر تھے پھر حضرت آدم کے بعد منکر و مختلف ہو گئے جبکہ اس سے قبل اپنی عبودیت کا اقرار کر چکے تھے۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ ناس سے صرف حضرت آدمؑ مراد ہیں۔اور انہیں اناسؑ اس لیے کہا کہ وہ ہی سب لوگوں کی اصل تھے۔ بعض نے کہا کہ آدم و حواء مراد ہیں۔ کسی نے کہا کہ حضرت آدم اور نوح علیہ السلام کے درمیان جو دس صدیاں گذریں تھیں ان کے لوگ مراد ہیں کسی نے کہا کہ حضرت نوح اور ان کے ساتھ والے جو کشتی میں سوار تھے وہ مراد ہیں کسی نے کہا کہ عرب مراد ہیں وہ سب دین ابراہیمؑ پر تھے۔ پھر عمرو بن لحی نے اس کو بدل دیا۔ کسی نے کہا کہ وفات آدمؑ سے حضرت نوح علیہ السلام تک سب لوگ کفر پر تھے۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے ابوالمسعود نے کہا کہ کلام پاک کے نظم کے مطابق پہلا قول ہی درست ہے مگر کوئی صحیح دلیل اس بات پر نہ ہے کہ وہ کفر پر تھے یا ایمان پر تھے۔ یہ بات دلیل خارج پر موقوف ہے۔ قطعی دلیل کوئی نہ ہے۔ کسی نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ سب لوگ ایک جنس تھے شریعت سے خالی اور حقائق سے جاہل تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ رسولوں کو بھیج کر ان پر احسان نہ کرتا (تو یہ ایسے ہی رہتے۔) کہا جاتا ہے کہ سب انبیاء جن کو اللہ کریم نے بھیجا وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہوئے۔ قرآن کریم میں ان انبیاء میں سے اٹھارہ نبیوں کا تذکرہ ہے۔ کتاب سے یا تورات مراد ہے یا یہ کہ ہر ایک نبیؑ کو ایک کتاب دی تھی۔ کل آسمان سے جو کتب اتریں وہ ایک سو چار تھیں۔ بیّنات سے وہ واضح دلائل مراد ہیں جو نبوت خاتم المرسلین کی رسالت پر دلیل ہیں۔ یا وہ واضح حجج مراد ہیں جو توحید پر دلالت کرتے ہیں اللہ کریم نے قرآن مجید کو بھیج کر پہلے اختلاف کو واضح کر دیا۔ پھر امت کو یہ ہدایت کی کہ وہ ان سب کتابوں کی تصدیق کریں۔ جب کہ ان سے پہلے لوگوں نے بعض کی تصدیق کی اور بعض کو جھٹلا دیا۔ اور اذن سے امر و ارادہ مراد ہے علم مراد نہ ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿۲۱۴﴾

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ (یوں ہی) بہشت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تم کو پہلے لوگوں کی سی (مشکلیں) تو پیش آئی ہی نہیں ان کو (بڑی بڑی) سختیاں اور تکلیف پہنچیں اور وہ (صعوبتوں میں) ہلا دیئے گئے یہاں تک کہ پیغمبر اور مومن لوگ جو ان کے ساتھ تھے سب پکار اٹھے کہ کب اللہ کی مدد آئے گی، دیکھو اللہ کی مدد (عن) قریب (آیا چاہتی) ہے۔

فائدہ: یعنی ابتلاء امتحان سے پہلے جنت نہیں ملتی ہے۔ باساء وضراء سے امراض واسقام اور مصائب ونوائب مراد ہیں۔ حضرت ابن مسعود، ابن عباس، ابو العالیہ، مجاہد، سعید بن جبیر، مرہ ہمدانی، حسن وقتادہ، ضحاک، ربیع، سدی اور مقاتل بن حیان نے کہا کہ باساء فقر و محتاجی ہے اور ضراء امراض ودکھ ہے۔ پھر دشمنوں کے ہاتھوں بڑی آزمائش پڑی۔ صحیح حدیث میں حضرت خباب بن ارث سے آیا ہے کہ ہم نے کہا اے اللہ کے رسول آپ ہمارے لیے دعا نہیں کرتے ہمارے لیے مدد نہیں مانگتے۔ فرمایا جو تم سے پہلے لوگ تھے ان میں سے کسی کے سر پر آرا رکھ کر سر سے پاؤں تک دو ٹکڑے کر دیے جاتے۔ اور وہ اس پر بھی اپنے دین سے نہ پھرتا۔ اور کسی سے لوہے کی کنگھیوں سے گوشت اور ہڈیاں الگ الگ کر دی جاتیں۔ لیکن پھر بھی وہ اپنا دین نہ چھوڑتا۔ پھر فرمایا کہ واللہ! اللہ کریم اس دین کو ضرور مکمل کرے گا حتیٰ کہ یہ سوار صنعاء سے حضر موت تک پہنچ جائے گا۔ وہ کسی سے اللہ کے علاوہ نہ ڈرے گا مگر یا بکری پر بھیڑیے سے مگر تم جلدی میں پڑ گئے ہو۔ دوسرے مقام پر اللہ نے فرمایا: ﴿الٓمّٓ أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ﴾ کہ "کیا لوگوں نے گمان کر لیا ہے کہ صرف ایمان لانے پر انہیں چھوڑ دیا جائے گا اور وہ آزمائے نہ جائیں گے۔ اور تحقیق ہم نے ان سے پہلے لوگوں کو بھی آزمایا پھر اللہ ضرور ان لوگوں کو معلوم کر لے جنہوں نے سچ کہا اور ان لوگوں کو بھی جان لے جنہوں جھوٹ کہا۔" صحابہؓ پر اسی طرح کا سخت معاملہ احزاب کے دن آپڑا تھا۔ جیسے فرمایا: ﴿إِذْ جَآءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللّٰهِ الظُّنُونَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا﴾ الایات...... کہ "جب وہ تمہارے اوپر سے اور نیچے سے آگئے اور جو آنکھیں پتھرا گئیں اور دل حلقوں

کو آگئے اور تم اللہ سے گمان کرنے لگے گمان کرنا تب مومنوں کو آزمائش میں ڈالا گیا۔اور وہ بڑی شدت سے ہلا دیے گئے اور جبکہ منافق لوگ اور جن کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگے کہ نہیں وعدہ کیا ہم سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے مگر دھوکے کا۔" اسی طرح ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا کہ کیا کبھی تمہاری اور اس کی جنگ بھی ہوئی وہ بولے جی ہاں۔ کہا نتیجہ کیا رہا؟ کہا: کبھی وہ ہم پر غالب رہا اور کبھی ہم اس پر غالب رہے۔ کہا رسولوں کی اسی طرح آزمائش ہوا کرتی ہے۔ پھر آخری انجام کار انہی کا (بہتر) ہوتا ہے۔اللہ کریم نے اس آیت میں قرب مدد کا ذکر فرمایا جس طرح فرمایا: ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴾ کہ "پھر بلاشبہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے بلاشبہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔" جس طرح کی مشقت ہوتی ہے بدلے میں اسی طرح کی مدد اترتی ہے۔ابورزین کی حدیث میں آیا ہے کہ اللہ اپنے بندے کی ناامیدی پر تعجب کرتا ہے کہ پانی عنقریب برسنے والا ہے اور انہیں ناامید دیکھ کر ہنستا ہے۔وہ جانتا ہے کہ وسعت نزدیک ہی ہے۔[الحدیث] کسی چیز کو زور سے ہلانے کو زلزلہ کہا جاتا ہے۔یہ حرکت اشخاص میں بھی ہوتی ہے اور اقوال میں بھی۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: یہ آیت احزاب کے دن غزوہ خندق میں اتری تھی۔اس دن نبی علیہ السلام اور صحابہؓ کو سخت آزمائش و حصر نے گھیرا تھا۔ کسی نے کہا یہ غزوہ احد میں نازل ہوئی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔اللہ کریم نے یہ خبر دی ہے کہ دنیا مشقت کا گھر ہے۔اللہ ان کو دنیا میں آزماتا ہے۔اور یہ کوئی نیا معاملہ نہ ہے۔غور کرو کہ پہلے انبیاء اور اللہ کے برگزیدہ لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو چکا ہے۔پھر جس طرح وہ اپنے دین پر ثابت قدم رہے اسی طرح اے مسلمانو! تم بھی ثابت قدم رہو۔اللہ کی مدد کچھ دور نہ ہے وہ عنقریب جلد آنے والی ہے۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٢١٥﴾

(اے محمدؐ) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کس طرح کا مال خرچ کریں، کہہ دو کہ (جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا چاہو وہ (درجہ بدرجہ اہل استحقاق یعنی) ماں باپ کو اور قریب کے رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو (سب کو دو) اور جو بھلائی تم کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔

فائدہ: لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ مال میں سے کون سا مال خرچ کرنے پر زیادہ ثواب ہے فرمایا مال جو بھی ہو۔ جتنی ضرورت کی جگہ خرچ ہو گا اتنا ہی اجر زیادہ ہو گا۔مقاتل بن حیان نے کہا کہ یہ آیت نفلی صدقہ کے متعلق اتری ہے۔سدی نے کہا اس آیت کو زکوٰۃ نے منسوخ کر دیا ہے۔ مگر یہ محل نظر قول

ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس میں صدقہ کے مصرف کا ذکر کیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں پر خرچ کرو پھر اس پر جو جتنا قریب ہو۔ حضرت میمون بن مہران نے اس آیت کو پڑھ کر فرمایا کہ یہ صدقات کے خرچ کرنے کے مقامات ہیں۔ اس میں طبلہ، مزمار، تصاویر چوبی، لباس اور در و دیوار کا ذکر نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ جو مال بلاضرورت گھر کو بلند کرنے اور آرائش وزیبائش اور لہو و لعب کی چیزوں میں خرچ ہوتا ہے وہ نفقہ باطل ہے۔ اللہ کو ان تمام مقامات کا علم ہے جو نیکی کرے گا اللہ اسے پورا بدلہ دے گا۔ ذرہ برابر بھی ظلم نہ کرے گا۔ یہ نفقہ کا سوال اہل ایمان نے کیا تھا، خرچ کی جنس اور مقدار کے متعلق سوال کیا تھا۔ اس پر جواب ملا کہ جو مواضع تمہیں بتائے جاتے ہیں وہی اہل مصارف ہیں۔ حسن نے کہا کہ یہ آیت محکم ہے۔ ابن زید نے کہا کہ یہ نفلی صدقہ کا ذکر ہے۔ آیت کا ظاہر بھی اسی بات کا مقتضی ہے۔ جس کسی کو اللہ کا تقرب چاہیے وہ مذکورہ مقامات پر خرچ کرے۔ اور پھر ترتیب سے ان کی فضیلت کا خیال رکھے۔ اس میں سائلین ور قاب کا ذکر نہیں کیا۔ جیسا کہ دوسری آیت میں کہا ہے یا تو اسی پچھلی آیت پر اکتفا کیا یا عموم معانی پر کہ اس کا ظاہری لفظ ہر خیر کو شامل ہے۔ وہ کسی بھی مصرف میں کیوں نہ ہو۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾

(مسلمانو) تم پر (اللہ کے رستے میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے وہ تمہیں ناگوار تو ہو گا مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو، اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لیے مضر ہو اور (ان باتوں کو) اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ کریم نے مسلمانوں پر فرضیت جہاد کو واضح کیا فرمایا کہ دشمنوں کے شر سے اسلام کو بچاؤ۔ زہری نے کہا کہ جہاد ہر شخص پر واجب ہے خواہ لڑے یا بیٹھا رہے۔ جو گھر میں بیٹھا رہے۔ اس پر واجب ہے کہ جب مدد طلب کی جائے تو مدد دے۔ جب فریاد طلب کی جائے تو فریاد کو پہنچے جب اسے پکارا جائے تو نکلے جب ضرورت نہ ہو تو بیٹھا رہے۔ اسی لیے حدیث میں ہے کہ جو شخص اسی حالت میں مر گیا کہ نہ تو اس نے جہاد کیا نہ دل میں جہاد کی نیت کی تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ نہیں ہے ہجرت فتح کے بعد لیکن جہاد و نیت ہے۔ جب تمہیں بلایا جائے تو نکلو۔ اور لڑائی اس لیے ناپسند ہے کہ اس میں مرنا مارنا، مشقت اٹھانا، زخمی ہونا اور دشمن کے مقابلے میں بہادری دکھانا پڑتی ہے۔ لیکن لڑائی کے بعد دشمنوں پر غلبہ

،کامیابی اور ملک ومال پر استحکام ملنا نصیب ہوتا ہے۔ یہ انجام بہتر ہے۔ اور یہ بات کہ کچھ چیزیں محبوب تو ہوتی ہیں مگر ناپسند ہوتی ہیں۔ یہ ان سب امور کو شامل ہے۔ جنہیں انسان پسند تو کرتا ہے مگر ان میں کچھ خیر نہ ہوتی ہے۔ جیسے لڑائی کو چھوڑ دینا اگرچہ دل کو اچھا لگتا ہے مگر اس میں انجام ذلت وخواری اور دشمنوں کا غلبہ ہے۔ لڑنا اگرچہ دل کو برا لگتا ہے مگر اس میں ضبط واستحکام اور ملک ومال پر غلبہ ہے۔ اسلام میں جب تک جہاد جاری رہا مسلمان غالب رہے۔ اور جب سے جہاد موقوف ہوا مسلمانوں پر پریشانیوں اور آفات وذلت نے ڈیرے ڈال لیے ہر کام کی حکمت کو وہی خوب جانتا ہے۔ تمہیں اس متعلق کیا علم ہے۔

فائدہ: جہاد کی فرضیت بجائے خود ایک امتحان ہے۔ اور جہاد سے اس جگہ کفار سے لڑائی کرنا مراد ہے۔ اور یہ ناپسند اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مال بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور اہل وعیال سے بھی جدا ہونا پڑتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ تم پر ہر (قسم کے) امیر کے ساتھ مل کر جہاد کرنا فرض ہے۔ وہ امیر نیک ہو یا بد۔ بتخریج ابوداؤ۔ کسی نے کہا کہ جہاد نفل ہے۔ کہ آیت سے خصوصاً اصحاب رسول ﷺ مراد ہیں۔ ثوری اور اوزاعی اسی طرف گئے ہیں۔ مگر اول قول زیادہ مناسب ہے۔ جمہور کا قول ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے کہ جب لوگ جہاد پر نکلیں تو باقی رہنے والوں سے وہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ بعض نے کہا کہ عام طور پر جبکہ دشمن اپنے ملک میں ہو تو یہ فرض کفایہ ہے لیکن جب دشمن ملک میں آگھسیں تو فرض عین ہو جاتا ہے۔ یہ آیت محکم ہے اس نے مشرکین سے عفو والی آیت کو منسوخ کر دیا۔ کسی نے کہا کہ بلکہ یہ منسوخ ہے۔ کیونکہ اس میں سب پر جہاد فرض ہے۔ اس کی ناسخ یہ جو فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَافَّة﴾ کہ "مومنوں کے لیے یہ تو نہیں کہ وہ سب کے سب نکل پڑیں۔" بعض نے کہا کہ ایک لحاظ سے ناسخ ہے۔ اور ایک لحاظ سے منسوخ ہے۔ ناسخ اس لحاظ سے ہے کہ مشرکوں پر جہاد موقوف کرنے کے بعد واجب کر دیا گیا۔ اور منسوخ اس طرح ہے کہ جہاد سب پر واجب ہے۔ جہاد کی فضیلت میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ جو صحاح ستہ وغیرہ کتب سنت میں موجود ہیں۔ "کتاب العبرہ" اکثر احادیث واحکام کی جامع ہے۔

يَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ

(اے محمدؐ) لوگ تم سے عزت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دو کہ ان میں لڑنا بڑا (گناہ) ہے، اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ میں جانے) سے (بند کرنا) اور اہل مسجد کو اس

وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَةَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢١٨﴾

میں سے نکال دینا (جو یہ کفار کرتے ہیں) اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ (گناہ) ہے، اور فتنہ انگیزی خونریزی سے بھی بڑھ کر ہے اور یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر مقدور رکھیں تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں، اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر کر (کافر ہو) جائے گا اور کافر ہی مرے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دنوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں جس میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے لیے وطن چھوڑ گئے اور (کفار سے) جہاد کرتے رہے وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔

فائدہ: آنحضرت ﷺ نے جہاد کے لیے ایک جماعت بھیجی۔ انہوں نے کافروں کو مارا اور لوٹ لیا۔ مال اسباب چھین لیے اور مسلمانوں کو یہ خیال تھا کہ یہ جمادی الاخرہ کا آخری دن ہے۔ جبکہ وہ رجب کی پہلی تاریخ تھی۔ کافروں نے اس متعلق بڑا نشانہ بنایا اس پر مسلمانوں کو شبہ پڑا۔ اس پر یہ آیت اتری۔ یعنی ان مہینوں میں ناحق لڑنا اشد گناہ ہے۔ جن کافروں نے ان مہینوں میں مسلمانوں سے لڑائی کی ان سے لڑنا منع نہ ہے۔ حضرت جندب بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ایک جماعت کو جنگ پر بھیجنا چاہا ان پر ابو عبیدہ بن جراح کو امیر بنایا۔ جب یہ چلنے لگے تو آنحضرت کی جدائی کی وجہ سے روئے، آنحضرت علیہ السلام نے ان کو روک دیا۔ اور ان کی جگہ عبداللہ بن جحش کو بھیجا۔ اور انہیں ایک خط لکھ کر دیا۔ اور فرمایا کہ جب تک فلاں فلاں جگہ نہ پہنچو اس خط کو نہ پڑھنا۔ اور اس میں فرمایا کہ زبردستی کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جانا جب انہوں نے خط پڑھا انااللہ پڑھا۔ اور لوگوں کو خبر دی۔ اس پر دو شخص واپس آگئے۔ باقی ان کے ساتھ رہے۔ اور ابن الحضرمی سے لڑے اور اس کو قتل کر دیا۔ انہیں اس بات کا علم نہ ہوا کہ آج رجب کی اول تاریخ ہے۔ مشرکین نے مسلمانوں کو عار دلایا کہ تم نے حرمت والے مہینوں میں قتل کر دیا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بروایت ابن ابی حاتم۔ سدی نے ابن عباس اور ابن مسعود سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ اس لشکر میں سات شخص تھے۔ خط میں یہ لکھا تھا کہ تم بطن نخلہ میں اترو۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا جس کو مرنا ہو ہمارے ساتھ چلے۔ اور وصیت کر لے

میں بھی وصیت کرتا ہوں اور چلتا ہوں۔یہ بطن نخلہ کو گئے۔وہاں لڑائی ہوئی۔عمرو بن الحضرمی طائف سے آرہا تھا اس کو قتل کیا۔اور وہ رات جمادی الاخرہ کی آخری اور رجب کی پہلی رات تھی۔انہیں اس بات کا دھوکہ ہوا جب مشرکین نے اس قتل پر طعن کیا۔کہ تم نے حرمت والے مہینے میں ہمارے شخص کو قتل کیا ہے۔اس پر اللہ کریم نے فرمایا اے مشرکو!جو کام تم نے کیا ہے یعنی اللہ کے ساتھ کفر کیا اور لوگوں کو پیغمبر علیہ السلام سے روکا اور مسجد الحرام سے لوگوں کو نکال دیا یہ تو اس قتل سے بھی سخت ہے۔یہی واقع کئی طریق سے مختلف طرح مروی ہے۔ بیہقی نے کتاب " دلائل نبوت" میں اس کا مفصل حال لکھا ہے۔جب حضرت عبداللہ بن جحش کو اس لغزش کی طرف سے کسی قدر اطمینان ہوا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے کہا ہمیں تو یہ امید و طمع ہے کہ ہم کسی غزوہ میں مجاہدین کا اجر پائیں۔اللہ کریم نے یہ فرمایا کہ جن کو ایسی امید ہے تو اللہ ان کو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

فائدہ: شہر حرام سے جنس مراد ہے۔کفار ان مہینوں میں خونریزی نہ کرتے تھے۔اور دشمن پر حملہ بھی نہ کرتے تھے۔یہ چار مہینے ذوالقعدہ، ذی الحجہ، اور محرم تو لگاتار ہیں اور چوتھا مہینہ رجب کا ہے۔یہ آیت محکم ہے۔ ان مہینوں میں لڑنا جائز نہ ہے۔مگر دفاع کا جواز ہے۔بعض نے کہا کہ بلکہ یہ آیت منسوخ ہے۔اس قول سے کہ: ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ کہ "مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کردو۔"اور یہ قول :﴿قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ﴾ کہ "مشرکین سے ہر حال میں جنگ کرو۔"جمہور علماء اسی کے قائل ہیں۔اور اہل مسجد سے رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم مراد ہیں۔کافروں نے انہیں اس قدر تنگ کیا کہ انہیں مکہ چھوڑنا پڑا۔سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے۔حرمت والے مہینوں میں قتال میں کوئی حرج نہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آیت برأت اس کی ناسخ ہے۔

فائدہ: اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو ارتداد اعمال کو ضائع کردیتا ہے۔وہ یہ ہے کہ کفر کی حالت پر ہی مرجائے لیکن جس ارتداد کے بعد پھر مسلمان ہو گیا اس پر ارتداد کا حکم نہ لگے گا۔امام شافعی کا یہی قول ہے۔کہ جب تک کوئی مرتد اسی حالت کفر پر نہ مرے تب تک اس کے اعمال ضائع نہیں ہوتے۔جبکہ امام ابو حنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ ارتداد اعمال کو ضائع کردیتا ہے۔اور جن آیات میں صرف ارتداد کو اعمال ضائع ہونے کا سبب بتایا ہے۔وہ آیات اس مقید آیت پر ترجیح رکھتی ہیں۔علم اصول کا قاعدہ ہے کہ (جب مطلق و مقید کا معاملہ ہو تو) مطلق کو مقید پر ترجیح ہوا کرتی ہے۔ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جا بسنے کو ہجرت کہا جاتا ہے۔اس جگہ ہجرت سے یہ مراد ہے کہ دار الکفر سے نکل کر دار السلام میں جا بسے۔رحمت کی امید کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ کوئی

خواہ کتنی بھی اطاعت گذار کیوں نہ ہو اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ جنت میں جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا کہ ہر امید کے ساتھ خوف ہوتا ہے جیسے ہر خوف کے ساتھ امید ہوتی ہے۔ اور ایمان امید و خوف کے درمیان ہے۔ اسی لیے یہ آیا ہے کہ ناامیدی کفر ہے جیسے امن کفر ہے۔ (یعنی بالکل بے خوف ہونا۔) حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ کریم نے صحابہ ﷺ کی اچھی تعریف بیان کی کہ وہ خیر امت ہیں۔ ان کو اہل رجاء قرار دیا۔ امید کرنے والا متلاشی ہوتا ہے۔ جبکہ خوف رکھنے والا بھاگتا ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١٩﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٢٠﴾

اے پیغمبر لوگ تم سے شراب اور جوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ ان میں نقصان بڑے ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کے نقصان فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کونسا مال خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو، اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم سوچو۔ (یعنی) دنیا اور آخرت کی (باتوں) میں (غور کرو) اور تم سے یتیموں کے بارے میں بھی دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ ان کی (حالت کی) اصلاح بہت اچھا کام ہے اور اگر تم ان سے مل جل کر رہنا (یعنی خرچ اکٹھا رکھنا) چاہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں اللہ خوب جانتا ہے کہ خرابی کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو تکلیف میں ڈال دیتا بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

فائدہ: اس آیت میں تین سوالوں کا جواب ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ شراب اور جوے کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ملا کہ اس کا گناہ اس کے فوائد سے بڑھ کر ہے۔ اس باب میں کئی آیات اتری ہیں۔ ان سب میں شراب اور جوے کی برائی بیان کی ہے۔ سب سے آخر میں (حکم شراب میں) سورۃ مائدہ کی آیت نازل ہوئی۔ جس میں اس کو مکمل طور پر حرام کر دیا گیا۔ جو بھی چیز نشہ آور ہو حرام ہے۔ اور جو کسی مخصوص شرط پر مال لیا جائے وہ بھی حرام ہے۔ وہ کوئی سی بھی شراب ہو۔ کسی بھی چیز سے بنی ہو اور کوئی مال جس بھی شرط پر لیا جائے جس کا حکم شرع میں نہ ہے وہ سب حرام ہیں۔ امام احمد نے ابو میسرہ سے نقل کیا ہے کہ جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے اللہ ہمارے لیے شراب کے متعلق واضح حکم نازل فرما اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کو بلا کر یہ آیت سنائی تو حضرت عمرؓ نے پھر کہا: ((اللهم بين لنا في الخمر بيانا شافيا)) اس پر سورۃ نساء کی آیت نازل ہوئی: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی﴾ کہ "اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔" آنحضرت ﷺ کا منادی، نماز کی اقامت کے وقت پکار دیتا کہ کوئی نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ آئے۔ حضرت عمرؓ کو بلا کر یہ آیت پڑھی تو انہوں نے پھر پہلی بات دہرائی اس پر سورۃ مائدہ کی آیت کلی حرمت کے متعلق نازل ہوئی۔ جب آنحضرتؐ ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ تک پہنچے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: انتهينا انتهينا کہ ہم نے یہ حکم مان لیا اور ہم باز آ گئے۔ اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے کئی طریق سے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اس کی سند کو صحیح کہا۔ علی بن المدینی نے اس کی اسناد کو صحیح اور صالح بتایا۔ ابن ابی حاتم نے لفظ انتهينا کے بعد اتنا زیادہ کہا ہے کہ یہ مال و عقل کو کھو دیتی ہے۔ سچ ہے۔

زباده هیچت اگر نیست این نه بس که ترا دمی ز وسوسئه عقل بینجر دارد

آیت مائدہ سے یہ آیت مراد ہے: ﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ کہ "بلاشبہ شراب اور جوا اور بت اور تیروں سے قسمت آزمانا ناپاک ہیں (اور) شیطانی عمل سے ہیں ان سے بچو تاکہ تم کامیاب ہو سکو۔" معلوم ہوا کہ شراب پینے والے اور جوا کھیلنے والے ایک ہی حکم میں ہیں۔ حضرت عمرؓ بن خطاب فرماتے ہیں کہ جو چیز عقل میں فتور لائے وہی خمر ہے۔ اور مَیسر قمار بازی ہے، ان دونوں کا دین میں تو نقصان ہوتا ہے اور دنیا میں کسی حد تک فائدہ ہوتا ہے۔ یعنی بدن کو فائدہ دیتی ہے نظام ہضم صحیح کرتی ہے۔ فضلات خارج کرتی ہے۔ کئی لوگوں کو ذہنی سرعت نصیب ہوتی ہے دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔

سرور ہو کے ہم آئے خمار ہو کے چلے

بڑی قیمت پر فروخت ہوتی ہے۔ بظاہر منافع ہوتا ہے۔ جو لوگ جوا کھیلتے ہیں اس کی کمائی اہل و عیال اور اپنی جان پر خرچ کرتے ہیں۔ لیکن یہ چند فوائد ان نقصانات و تکالیف کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو اس کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق عقل و دین سے ہے۔ اس آیت میں حرمت کی تمہید ہے۔ صریح حرمت مذکور نہ ہے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ بار بار تسلی بخش حکم مانگتے رہے۔ پھر سورۃ مائدہ کی آیت میں حرمت واضح ہو گئی۔ فرمایا: ﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ

وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ ﴾ کہ ”بلاشبہ شیطان تو چاہتا ہے کہ شراب اور جوے سے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور یہ کہ تمہیں ذکر اللہ اور نماز سے روک دے۔ پھر اب تم باز آؤ گے۔“ اس کی وضاحت انشاءاللہ سورۃ مائدہ میں ہی آئے گی۔ حضرت ابن عمرؓ، شعبی، مجاہد، قتادہ، ربیع اور ابن زید نے کہا کہ شراب کے متعلق سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر اس کے بعد سورۃ نساء کی آیت پھر آخر میں سورۃ مائدہ کی آیت نازل ہوئی۔ جس سے شراب واضح طور پر حرام ہو گئی۔ انگور کے رس کو خمر کہتے ہیں۔ جبکہ وہ جوش مارے کیونکہ تب وہ نشہ پیدا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ جو چیز بھی عقل کو ڈھانپ لے وہ خمر کے حکم میں ہے۔ جمہور کا یہی مذہب ہے۔ ابو حنیفہؒ، ثوری، ابن ابی یعلی، ابن شبرمہ اور فقہائے کوفہ کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ انگور کی شراب کے علاوہ جو چیز زیادہ پینے سے نشہ دے وہ کم مقدار میں پینا حلال ہے۔ جب پکانے سے وہ دو تہائی کم ہو جائے تو وہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حلال ہے۔ اس مذہب پر بڑی گفتگو ہے۔ ”مسك الختام شرح بلوغ المرام“ میں وہ بحث مذکور ہے۔ امام شوکانی نے ”نیل الاوطار“ میں اس کا رد کیا ہے۔ حافظ ابن القیم نے ”حادی الارواح“ میں شراب کی بڑی مذمت کی ہے۔ محققین اطباء بھی اس کے نقصانات کے قائل ہیں۔ دوسرے مفاسد کو چھوڑ کر صرف یہی دیکھا جائے تو کیا یہ کم ہے کہ اس سے عقل خراب ہوتی ہے۔ عمر کم ہو جاتی ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ ہمیشہ شراب پینے والا جب اللہ سے ملے گا تو بت پرست کے حکم میں ہو گا۔ رسالہ ”بشارة الفساق“ میں شراب کی مذمت میں احادیث درج ہیں۔

الغرض کہ اللہ نے شراب کے متعلق چار آیات نازل فرمائی ہیں۔ ایک آیت مکہ میں نازل ہوئی۔ ﴿وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا ﴾ ”اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے تم (نشہ آور چیزیں) بناتے ہو۔“ اول اسلام میں مسلمانوں کو اجازت تھی اور وہ پیا کرتے تھے۔ پھر حضرت معاذ اور عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے سوال کے جواب میں آیت باب نازل ہوئی۔ کچھ لوگوں نے اس کو گناہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ بعض نے کہا کہ اس میں فائدہ ہے۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾ پھر اس صورت میں بعض لوگوں نے اس کو نماز کے وقت پینا چھوڑ دیا۔ لیکن عام اوقات میں پیا کرتے تھے۔ پھر غزوہ احزاب کے چند روز بعد سورۃ مائدہ کی آیت نازل ہوئی۔ اور خمر کا لفظ مذکر و مؤنث دونوں طرح آیا ہے۔ شاید اسی لیے فاسق لوگ مرد و عورتیں دونوں ہی اس کو پیتے ہیں۔ اللهم احفظنا۔ ایک جماعت سلف نے کہا کہ جس چیز میں بھی شرط لگائی جائے وہ نرد ہو شطرنج ہو یا کچھ اور ہو وہ جوا ہے۔ حتیٰ کہ بچوں کا نرد کعاب سے کھیلنا بھی ہاں گھوڑ دوڑ اور قرعہ

اندازی جائز ہے۔مالک نے کہاجوادو طرح کا ہے۔ایک کھیل کی صورت میں جیسے نرد، شطرنج اور باقی اس طرح کی چیزیں دوسرا اقمار بازی۔ جس پر لوگ شرطیں رکھیں۔ سو ہر وہ چیز جس میں کچھ شرط لگائی جائے وہ مَیسر ہے۔اس کی باقی تفصیل ان شاء اللہ سورۃ المائدہ میں آئے گی۔۔دئے میں گناہ یہ ہے کہ مال جاتا ہے محتاجی آتی ہے۔ آپس میں دشمنی آتی ہے۔سینے میں بغض وکینہ جگہ پکڑتا ہے۔ نفع یہ کہ مفت میں بغیر مشقت و محنت مال حاصل ہوتا ہے۔اور جیت جانے کی صورت میں دل میں عجیب سی خوشی ہوتی ہے۔قمار میں گیارہ پانسے (تیر) ہوتے ہیں۔ ہر ایک کانام الگ الگ ہوتا ہے۔

فائدہ: دوسرا سوال یہ تھا کہ کس مقدار میں مال خرچ کریں۔؟فرمایاکہ جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو وہ خرچ کرو۔ جیسے آخرت کا فکر ضروری ہے دنیا کی معاش کی تلاش بھی ضروری ہے۔ایسانہ ہو کہ سارامال راہ للہ میں دے دو اور خود مفلس ہو بیٹھو۔ابن ابی حاتم نے روایت کیا کہ معاذ بن جبل اور ثعلبہ علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ سے کہاکہ ہمارے پاس غلام لونڈی ہمارے مالوں سے ہیں۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ عفو وہ ہے جو اہل سے بچ رہے۔تابعین ؒ کی ایک جماعت کا بھی یہی قول ہے عفو بمعنی فضل ہے۔طاؤس نے کہاعفو تھوڑی چیز کو کہتے ہیں۔ ربیع نے کہاطیب وافضل مال عفو ہے۔سب کا مرجع یہی معنی ہے۔کہ ضرورت سے زائد مال خرچ کرو۔ حسن نے کہاعفو سے یہ مراد ہے کہ تھوڑامال خرچ کریں ایسانہ ہو کہ زیادہ خرچ کرکے خود مانگتے پھریں۔ حضرت ابوہریرہ ؓ کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے کہاکہ اے اللہ کے پیغمبر علیہ السلام میرے پاس ایک دینار ہے۔کہااپنی ذات پر خرچ کر۔ کہااور بھی ہے۔کہاگھر والوں پر صرف کر۔کہاایک اور بھی ہے۔کہااولاد پر خرچ کر۔کہاایک اور بھی ہے۔کہاتواس کو خوب جانتا ہے جہاں مناسب ہو اسے خرچ کرو۔ [بروایت ابن جریر ومسلم] مسلم کا جابر سے دوسرا لفظ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے ایک شخص سے کہاتو اپنے نفس سے شروع کر اسی پر خرچ کر اگر خود سے زائد ہو تو اہل پر خرچ کرو پھر جو اہل سے بچ جائے تو قرابت والوں پر صرف کرو۔ پھر جو زائد ہو تو ادھر ادھر خرچ کرو۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے دوسرا لفظ اس طرح ہے کہ بہتر صدقہ وہ ہے جو وسعت سے ہو۔اوپر والا ہاتھ نچلے سے بہتر ہے۔اور اپنے عیال سے شروع کر۔[بروایت مسلم] ان احادیث میں نفقات کی ترتیب بتائی ہے۔کہ جس کو اللہ کریم غنی بخشے اس کے پاس مال ہو تو اسے چاہئے کہ اسی ترتیب سے خرچ کرے۔اپنی عقل کے موافق اس کو خرچ نہ کرے۔ حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ اے ابن آدم!اگر تو زائد مال کو خرچ کرے گا تو وہ تیرے لیے بہتر ہوگا۔اور اگر روکے گا تو وہ تیرے لیے برا ہے۔ کفاف پر کچھ ملامت نہ ہے۔ پھر

کسی نے کہا آیت باب منسوخ ہے۔اس کی ناسخ آیت زکوٰۃ ہے۔حضرت ابن عباسؓ،عطاء خراسانی اور سدی کا بھی یہی موقف ہے۔کسی نے کہا کہ بلکہ آیت زکوٰۃ اس کی وضاحت کرتی ہے۔حضرت مجاہد وغیرہ کا یہی قول ہے۔ابن کثیر نے اسی کو زیادہ مناسب قرار دیا ہے۔فتح البیان کا لفظ یہ ہے کہ عفو سہل و مُیَسر کو کہا جاتا ہے۔جو نفس پر شاق نہ ہو۔یا وہ نفقہ جو عیال سے بچ گیا ہو۔جمہور نے کہا کہ یہ نفلی صدقات کا بیان ہے۔بعض نے کہا یہ آیت محکم ہے۔اس لیے کہ زکوٰۃ کے سوا مال میں اور بھی حق ہے۔اور جو فرمایا کہ شاید تم دنیا و آخرت میں کچھ سوچو۔حضرت ابن عباسؓ نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ دنیا کے زوال و فنا اور آخرت کی آمد و بقا میں فکر کرو۔حضرت حسن نے کہا یہ آیت اس کے لیے ہے جو غور و فکر کی طاقت رکھتا ہے۔اس کو یہ بات معلوم ہو سکتی ہے۔کہ دنیا آزمائش کا گھر ہے۔پھر فنا ہو جائے گا۔اور آخرت جزاء کا گھر ہے۔اور باقی رہے گا۔قتادہ اور ابن جریج نے بھی یہی کہا ہے۔معلوم ہوا کہ آخرت کو دنیا پر فضیلت ہے۔اس لیے دنیا پر اسی کو اختیار کرنا چاہئے۔

فائدہ: تیسرا سوال یہ تھا کہ یتیموں سے کیا برتاؤ کرنا چاہیے۔؟سو یتیموں کے متعلق پہلے حکم یہ ہوا کہ جو بھی ان کا مال کھائے گا گویا پیٹ میں آگ بھرتا ہے۔اس پر ان یتیموں کے سرپرستوں نے ان کا مال اور کھانا پینا الگ کر دیا۔کہ ایسا نہ ہو کہ ان کے مال میں سے کوئی چیز ان کے مال میں نہ آجائے۔پھر معاملہ بڑا سخت ہوا کہ یتیم کے لیے ایک چیز پکائی پھر اس کے کام نہ آئی تو ضائع ہو گئی۔تب یہ حکم نازل ہوا کہ ان کا خرچ اپنے خرچ سے ملالو تو کچھ حرج نہ ہے۔کہ ایک وقت ان کا کھانا خود کھالیا پھر دوسرے وقت اپنا اسے کھلادیا۔لیکن اس کی نیت اصلاح کی ہونی چاہیے۔اللہ نیت کو دیکھتا ہے۔حضرت ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ سے اس کا یہی شان نزول لکھا ہے۔صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت کا یہی موقف ہے۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں یتیم کا مال اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتی۔کہیں اس کا کھانا پینا میرے کھانے پینے سے مل نہ جائے۔یہی رخصت کے باوجود احتیاط بہتر ہے۔

((چرا کاری کند عاقل که باز آید پشیمانی))

اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ اولیاء کو یتیموں کے مال میں بیع و مضاربت کرنا جائز ہے۔اپنا کھانا انہیں چاہے کھلادے لیکن ان کا کھانا نہ کھائے۔نہ اصلاح مال پر کسی قسم کی اجرت و عوض کا دعوی کرے۔اور مخالطت سے یہ مراد ہے کہ پینے پہننے میں اس سے میل جول رکھے۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ ماقبل کے لفظ کا ناسخ ہے۔کسی نے کہا برتاؤ مراد ہے۔کسی نے کہا رشتہ داری مراد ہے۔جیسے سسرال بنادینا۔مناسب یہ ہے کہ مخالطت کو کسی خاص قسم سے متعین نہ کرے۔بلکہ آیت کو مخالطت کی ہر قسم کو شامل سمجھے۔مذکورہ جملہ شرطیہ سے یہی

بات سمجھی جاتی ہے کہ اگر اللہ چاہتا تم پر تنگی کرتا اور تمہیں حرج ومشقت میں ڈال دیتا۔ مگر تم پر تخفیف کی اور مخالطت کو جائز کر دیا۔اب تمہیں بھی چاہیے کہ اچھے طریقے سے پیش آئے۔اور ان کے حال ومال کی اصلاح کرے۔ جیسے فرمایا:﴿وَلَا تَقْرَبُوْامَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾"اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگراس نیت سے جو اچھی ہو۔" بلکہ ایسا ولی جو خود مفلس ہو اس کے لیے اس کا مال کھانا عرف کے موافق جائز کر دیا۔اور یہ شرط رکھی کہ جب اس کو مال میسر ہو تو اس کے بدل کی ضمانت دے۔اور اگر مفت میں کھایا تو اس کے احکام ان شاء اللہ سورۃ نساء میں آئیں گے۔

وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّى يُؤْمِنَّ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿۲۲۱﴾

اور (مومنو) مشرک عورتوں سے جب تک کہ ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرنا کیونکہ مشرک عورت خواہ تم کو کیسی ہی بھلی لگے اس سے مومن لونڈی بہتر ہے اور (اسی طرح) مشرک مرد جب تک ایمان نہ لائیں مومن عورتوں کو ان کی زوجیت میں نہ دینا، کیونکہ مشرک (مرد) سے خواہ وہ تم کو کیسا ہی بھلا لگے مومن غلام بہتر ہے یہ (مشرک لوگوں کو) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنی مہربانی سے بہشت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور اپنے حکم لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ نصیحت حاصل کریں۔

فائدہ: پہلے مسلمان اور کافر میں رشتہ ناتہ جاری تھا۔ لیکن اس آیت سے حرام ٹھہرا۔اگر مرد یا عورت نے شرک کیا تو ان کا نکاح ٹوٹ گیا۔شرک یہ ہے کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو اس طرح سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے۔یا وہ جو چاہے کرتا ہے۔یا ہمیں خوشی غمی دینا اس کے اختیار میں ہے۔یا اللہ کی تعظیم کسی اور کے سامنے بجا لانا۔ مثلاً کسی چیز کو سجدہ کرنا یا اس سے حاجت طلب کرنا۔یا اس کو بااختیار سمجھنا۔باقی یہود ونصاریٰ ومجوس کی عورتوں سے نکاح درست ہے۔گوان کو مشرک نہیں فرمایا۔

فائدہ: ابن کثیر نے فرمایا یہ مومنوں کے لیے حرمت پر دلالت کرتی ہے۔کہ مشرکین کی عورتوں سے نکاح نہ کریں۔پھر اگر اس آیت سے عموم مراد ہے۔جس میں وثنیہ وکتابیہ دونوں داخل ہوں تو اس سے اہل کتاب عورتیں مستثنیٰ ٹھہریں گی۔جیسے اللہ کریم نے فرمایا:﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوْا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اِذَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ ﴾"اور قید میں آنے والی ان میں سے جو کتاب دیے گئے ہیں۔ تم سے پہلے جبکہ تم ان کو ان کے حق مہر ادا کرو۔ قید میں لانے والے نہ مستی نکالنے والے۔" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اہل کتاب کی عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ حضرت مجاہد، عکرمہ، مکحول، حسن، ضحاک اور ربیع وغیرھم کا بھی یہی موقف ہے۔ مجوس بھی اہل کتاب کے حکم میں ہیں۔اس لیے ان کی عورتیں بھی اس استثناء میں داخل ہوں گی۔ کسی نے کہا فقط بت پرست مراد ہیں۔اہل کتاب کا اس مقام پر قصد نہیں کیا گیا ہے۔ یہ معنی اول معنی کے قریب قریب ہیں۔ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے مومنات مہاجرات کے علاوہ سب عورتوں سے منع فرمایا ہے۔اور اسلام کے علاوہ ہر دین والی کو حرام کیا ہے۔ جیسے فرمایا:﴿وَمَنْ یَّكْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ﴾ کہ "جس نے ایمان سے انکار کیا تو اس کے عمل ضائع ہوں گے۔" حضرت طلحہ بن عبید اللہ نے ایک یہودیہ سے اور حذیفہ بن الیمان نے ایک نصرانیہ سے نکاح کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے ان پر بڑے غصے کا اظہار کیا۔ حتیٰ کہ ان پر حملہ کرنا چاہا۔ان دونوں نے کہا کہ آپؓ غصہ نہ کریں ہم انہیں طلاق دیے دیتے ہیں کہا اگر ان کو طلاق دینا حلال ہے تو نکاح کرنا بھی حلال ہے بلکہ میں انہیں ذلیل کرنے کے لیے تم سے چھین لیتا ہوں۔ابن کثیر نے کہا یہ حدیث اور اثر دونوں غریب ہیں۔ پھر ابن جریر نے کتابیات سے نکاح کے جواز پر اجماع نقل کر کے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے ایسا اس لیے کیا کہ مسلمان مومنات میں بے رغبتی نہ کریں۔ یا اس عمل سے کچھ اور مصلحت مقصود ہو گی۔ شقیق کہتے ہیں کہ حذیفہؓ نے ایک یہودیہ سے نکاح کیا حضرت عمرؓ نے اس کو لکھا کہ تم اسے چھوڑ دو انہوں نے کہا کہ کیا آپؓ کا خیال ہے کہ وہ حرام ہے جو میں اسے نکال دوں۔ فرمایا میں اس کو حرام خیال نہیں کرتا لیکن میں اس سے ڈرتا ہوں کہ تم ان کے سبب سے مومنات سے بے رغبت نہ ہو جاؤ۔ اس کی سند صحیح ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مسلمان نصرانیہ سے نکاح کر سکتا ہے لیکن نصرانی مسلمہ سے نکاح نہیں کر سکتا۔اس کی سند پہلی سند سے بھی زیادہ درست ہے۔ حضرت جابرؓ بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کی عورتیں نکاح میں آسکتی ہیں لیکن اہل کتاب ہماری عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے۔ابن جریر نے کہا اگر چہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے مگر مفہوم کے اعتبار سے اسی قول پر اجماع ہے۔ حضرت ابن عمرؓ بھی اہل [illegible]ب سے نکاح کرنا ناپسند کرتے تھے۔اور وہ اس آیت کی تفسیر کرتے تھے۔ کہ مشرکات سے نکاح نہ کرو حتیٰ کہ د[illegible] ان لے آئیں۔امام بخاری نے فرمایا وہ کہتے تھے کہ اس سے بڑھ کر شرک کیا ہو گا کہ وہ کہیں کہ عیسیٰ میرے رب [illegible] ۔امام احمد فرماتے ہیں کہ اس جگہ مشرکات سے مشرکات عرب مراد ہیں

وہ بت پرست تھے۔ سدی نے کہا کہ حضرت عبد اللہ بن رواحہ کے پاس ایک کالی لونڈی تھی۔ انہوں نے ایک دفعہ غصے میں آکر اس کو طمانچہ مارا۔ پھر گھبرا کر آنحضرت ﷺ کے پاس آکر ذکر کیا فرمایا اس کا کیا حال ہے کہا وہ روزہ رکھتی ہے نماز پڑھتی ہے اچھی طرح وضو کرتی ہے۔ ((لا اله الا الله وانك رسول الله)) کی گواہی بھی دیتی ہے فرمایا وہ تو مؤمنہ ہے۔ کہا واللہ میں اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرلوں گا۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو لوگوں نے طعن کیا کہ لونڈی سے نکاح کرلیا ہے اور وہ لوگ صرف عمدہ حسب نسب کی وجہ سے مشرکات سے نکاح کر لیتے تھے۔ اس پر اللہ کریم نے فرمایا کہ مومنہ لونڈی مشرکہ سے بہتر ہے۔ گو کہ تمہیں مشرکات اچھی معلوم ہوں۔ حضرت ابن عمرؓ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ عورتوں سے ان کے حسن کے سبب نکاح نہ کرو۔ قریب ہے کہ ان کا حسن انہیں ہلاک کردے۔ اور عورتوں سے ان کی مالداری پر نکاح نہ کرو شاید ان کا مال انہیں فریب میں مبتلا کردے ان سے دینداری کی بنیاد پر نکاح کرے۔ کالی لونڈی دیندار ہو تو بہتر ہے۔ بروایت عبید بن حمید۔ اس کی سند میں افریقی ضعیف ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً آیا ہے کہ عورت سے چار اسباب کی بنیاد پر نکاح کیا جاتا ہے۔ مال کی وجہ سے جمال اور حسب ودین کی وجہ سے۔ پھر تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں تو دین والی کا انتخاب کر۔ مسلم نے جابرؓ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ پھر حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ دنیا ساری فائدہ ہے اس کا بہترین فائدہ نیک عورت ہے۔

فائدہ: پھر یہ فرمایا کہ مشرکین سے مومنات نکاح نہ کرو۔ جیسے فرمایا: ﴿لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ﴾ کہ ”نہ وہ عورتیں ان مردوں کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ مردان عورتوں کے لیے حلال ہیں۔“ مومن اگر حبشی غلام بھی ہو تو بھی رئیس مشرک سے بہتر ہے۔ کیونکہ ان کے باہمی تعلق اور میل جول سے دنیا کی محبت اس کے فتنے میں گھسنا اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینا ہوگا۔ جس کا انجام خیر نہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تو رحمت ومغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ اور امر ونواہی کی اتباع سے یہ مرتبہ ملتا ہے۔ مسئلہ یہ ٹھہرا کہ مسلمان کا مشرکہ سے نکاح کرنا اور مومنہ کا مشرک سے نکاح جائز نہ ہے۔ گو وہ مشرک ہو اور مشرک دنیا کا مال وعزت اور سرداری بھی کیوں نہ رکھتے ہوں۔ اور یہ مومن ومومنہ غریب ومفلس ہوں پھر مومنات میں سے دین دار تلاش کرو مال وجمال اور حسب پر اکتفانہ کر بیٹھے۔ رسالہ ”اصلاح ذات البین“ اس باب میں بہت عمدہ کتاب ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نسب کا کفو کچھ معتبر نہیں بلکہ اصل اعتبار کفو دین ہے۔ امام مالک بھی اسی طرف گئے ہیں۔ اور یہی قول راجح ہے۔ اصل شرافت دین کی ہے سب سے شریف وہ ہے جو دین پر زیادہ کاربند ہے۔ گو کہ

نسب میں کمتر ہی کیوں نہ ہو۔اور کم عزت وہ ہے جو بے دین ہو۔گو کسی عالم اور مجتہد کی اولاد کیوں نہ ہو۔نسب ذات کو کہتے ہیں اور حسب صفت کو کہتے ہیں۔مثلاً قریشی یا ہاشمی ہونا نسب ہے اور امیر و رئیس ہونا حسب ہے۔شرع میں مال و جمال و حسب کا کچھ اعتبار نہ ہے۔فقط دین کو معتبر رکھا۔پھر اگر دین کے ساتھ ساتھ شرافت علم و نسب بھی شامل ہو تو بڑی عمدہ بات ہے۔ورنہ دین سب پر مقدم ہے۔حدیث میں ہے کہ اگر تم دین کو مقدم رکھنا چھوڑ دو گے اور ذات پات کے سلسلوں میں کھو جاؤ گے تو زمین میں ایک بڑا فتنہ برپا ہو جائے گا۔[بروایت اهل السنن] یہ آنحضرت ﷺ کا معجزہ ہے کہ جس طرح فرمایا تھا اسی طرح ہوا۔جب اہل اسلام نے اسلام کی رعائیت چھوڑ کر باپ دادوں کے دین اور حسب و نسب پر اکتفا کر لیا تب سے شرفاء میں کمینوں والی خصلتیں گھس آئیں، علم و فضل جاتا رہا۔ذلت و خواری نے ہر طرف سے گھیر لیا۔جیسا کیا ویسا بدلہ پایا۔انا لله...... حسب و نسب سے بھی بڑا فتنہ مال و جمال کا ہے۔جمال ایک گھوڑے کا سبزہ اور مال ہاتھ کی میل ہوتی ہے۔ایک رات میں چور ڈاکو مال لوٹ لے جاتے ہیں اور ایک دن کی بیماری سے جمال خاک میں مل جاتا ہے۔اور دین ہی ایسی چیز ہے جس کو ہر حال میں شرکت رہتی ہے۔دنیا میں عزت اور آخرت میں مغفرت کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔اسلام اور دین کی بدولت کئی غلام اور نو مسلم امت کے امام بن گئے۔جنت کے وارث و بادشاہ بن گئے۔اور اس دین کو چھوڑنے کے سبب ہزاروں شریف ورؤسا ذلت میں جاگرے اور جہنم کے فقیر بن گئے۔نہ حسب کام آیا نہ نسب نے فائدہ دیا۔**اللهم احفظنا**.

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۲۳﴾

اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو وہ تو نجاست ہے سو ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو، اور جب تک پاک نہ ہو جائیں ان سے قرابت نہ کرو، ہاں جب پاک ہو جائیں تو جس طریق سے اللہ نے تمہیں ارشاد فرمایا ہے ان کے پاس جاؤ کچھ شک نہیں کہ اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ اور اپنے لیے (نیک عمل) آگے بھیجو، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ (ایک دن) تمہیں اس کے روبرو حاضر ہونا ہے اور (اے پیغمبر) ایمان والوں کو بشارت سنا دو۔

فائدہ: حیض اس بیماری کو کہتے ہیں جو اللہ نے عورتوں کی فطرت میں لکھ دی ہے۔اور جو خون خلاف عادت ہو وہ بیماری ہے حیض کے حکم میں نہ ہے۔ فرمایا بحالت حیض عورتوں کے قریب نہ جاؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ازار سے آگے نہ بڑھو۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جائے جیسے اللہ نے اس کو حکم دیا۔ ناپاکی کے مقام کا اللہ نے کسی صورت بھی حکم نہیں دیا۔ پھر فرمایا جس طرف سے بھی اس کے پاس آؤ مگر کھیتی میں آؤ۔اور اس میں اولاد کی نیت کرو تاکہ ثواب ملے۔

فائدہ: حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب یہود میں کسی عورت کو حیض آتا تو یہود نہ اس کے ساتھ کھاتے پیتے نہ اس کے ساتھ ایک گھر میں رہتے۔ صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ سے اسکے متعلق پوچھا تو اللہ کریم نے یہ آیت نازل فرمائی۔ فرمایا کہ اس کے ساتھ زندگی کا ہر معاملہ کرو لیکن جماع نہ کرو۔[الحدیث بروایت مسلم واحمد] معلوم ہوا کہ اس علیحدگی سے ترک صحبت مراد ہے۔اکثر علماء کا یہی مذہب ہے کہ شرمگاہ کے سوا عورت سے مباشرت جائز ہے۔ابوداؤد نے بعض ازواج النبیؐ سے روایت کیا ہے کہ جب آپؐ حائض سے کسی امر کا ارادہ کرتے تو اس کی شرمگاہ پر کپڑا ڈال دیتے۔ عمارہ کی پھوپھی نے حضرت عائشہؓ سے کہا ہم میں سے کوئی حائض ہوتی ہے اور میاں بیوی کا ایک ہی بچھونا ہوتا ہے تو ہم کیا کریں؟ کہا کہ آنحضرت ﷺ گھر کی مسجد میں آئے اور میں سو گئی تھی۔ آنحضرت ﷺ کو سردی لگی تو فرمایا میرے پاس آؤ۔ میں نے کہا: میں حائض ہوں۔ فرمایا: اپنی ران کھول دے میں نے کھولدی آنحضرت ﷺ نے اپنا رخسار اور سینہ میری ران پر رکھ دیا۔ میں ان پر جھک گئی حتیٰ کہ وہ گرم ہو کر سو گئے۔[بروایت ابوداؤد] مسروق نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ جب عورت حائض ہو تو اس سے کیا سلوک کرے؟ کہا سب کچھ کرے مگر شرمگاہ سے بچے۔ان کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ جماع نہ کرے۔[بروایت ابن جریر] تیسرا لفظ یہ ہے کہ ازار سے اوپر تک اختیار ہے۔

حضرت ابن عباسؓ و مجاہد و حسن اور عکرمہ کا بھی یہی قول ہے۔ابن کثیر نے فرمایا کہ اس کے ساتھ بستر میں لیٹنا اور اس کے ساتھ کھانا بلا اختلاف حلال ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں آنحضرت ﷺ کا سر دھوتی جبکہ حائض ہوتی اور آپؐ میری گود میں (تکیہ) ٹیک لگا کر قرآن پڑھتے جبکہ میں حائض ہوتی۔ بخاری میں یہ ہے کہ میں بحالت حیض ہڈی نوچتی اور پھر آنحضرت ﷺ کو دیتی تو وہ وہیں سے کھاتے جہاں میں نے اپنا دھن رکھا ہوتا اور میں پانی پی کر دیتی تو وہ اسی جگہ منہ رکھ کر پانی پیتے جہاں سے میں نے پیا تھا۔ابوداؤد نے کہا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں حالت حیض سے ہوتی اور میں اور نبی علیہ السلام ایک ہی کپڑے میں ہوتے اگر آنحضرت ﷺ کو کچھ لگ جاتا تو وہاں

سے دھوتے اور نماز پڑھتے۔ایک روایت میں حضرت عائشہؓ سے اس طرح بھی آیا ہے کہ جب میں حائض ہوتی تو چارپائی سے اتر کر چٹائی پر بیٹھتی اور جب تک پاک نہ ہو جاتی آنحضرتؐ کے پاس نہ جاتی۔[بروایت ابو داؤد] اور یہ حدیث احتیاط پر مبنی ہے۔ حضرت میمونہ علیہا السلام فرماتی ہیں کہ جب آپؐ اپنی کسی بیوی سے مباشرت کا ارادہ کرتے اور وہ حائض ہوتی تو فرماتے ازار پہن لے۔[بروایت بخاری] یعنی تحت ازار کے سوا مباشرت جائز ہے۔ حضرت عبد اللہؓ بن سعد انصاری نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ جب کسی شخص کی بیوی حائضہ ہو تو اس کو اس کے ساتھ کیا درست ہے؟ فرمایا: مافوق ازار۔[بروایت احمد، اهل السنن] حضرت معاذؓ بن جبل کے سوال کے جواب میں یہی مضمون مرفوعًا ارشاد فرمایا اس میں اتنا زیادہ کیا کہ اس سے بچنا افضل ہے۔[بروایت ابو داؤد] یہ احادیث اس شخص کے لیے حجت ہیں جس کا موقف یہ ہے کہ مافوق الازار حلال ہے۔ شافعی کا ایک قول بھی یہی ہے۔ جس کو اکثر اہل عراق نے ترجیح دی ہے۔ ان کا ماخذ یہ ہے کہ مافوق ازار حریم فرج ہے۔ اس کی مباشرت فرج حرام ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ صحبت کر بیٹھے۔ اللہ نے اس حال میں صحبت کو حرام کیا ہے۔ پھر اگر کوئی اس فعل میں واقع ہو جائے تو توبہ کرے اور کفارے کے متعلق دو اقوال ہیں۔ ایک یہ قول ہے کہ اہل السنن نے حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعًا روایت کیا ہے کہ جو شخص حائض سے جماع کرے وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ دے۔ ترمذی کا لفظ یہ ہے کہ اگر خون سرخ ہو تو ایک دینار دے اگر زرد ہو تو نصف دینار صدقہ دے۔ مسند امام احمد کا لفظ یہ ہے کہ نصاب حیض ایک دینار ہے، لیکن اگر خون کے ختم ہونے وقت بیوی کے پاس گیا ہے، اگر وہ ابھی تک نہائی نہ ہو تو نصف دینار ہے۔ اور شافعی کا دوسرا نیا قول یہ ہے کہ فقط استغفار کرے جمہور اسی طرف گئے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک اس حدیث کا مرفوع ہونا صحیح نہ ہے۔ بلکہ اکثر ائمہ کے نزدیک اس کا موقوف ہونا درست ہے۔ اور جو فرمایا کہ ان کے قریب نہ جاؤ حتیٰ کہ وہ پاک ہو جائیں یہ اللہ کے فرمان عورتوں سے حالت حیض میں علیحدہ رہو کی تفسیر ہے۔ نزدیک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جماع کی نیت سے اس کے قریب نہ جاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب وہ پاک ہو جائے تو جماع حلال ہے۔ طہر قرب کی دلیل ہے۔ حضرت میمونہؓ اور عائشہؓ نے جو فرمایا کہ جب ہم میں سے کوئی حائض ہوتی تو ازار پہن کر نبی علیہ السلام کے کپڑے میں داخل ہو جاتی اس سے معلوم ہوا کہ غسل سے پہلے جماع کا ارادہ فرماتے نہیں۔ پاکیزگی میں ارشاد یہ ہے کہ غسل کے بعد صحبت کرنا زیادہ مناسب ہے۔ ابن حزم نے کہا کہ ہر حیض کے بعد جماع واجب ہے اس آیت کی دلیل سے ﴿فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ﴾ مگر یہ اس مقصد پر دلیل نہ ہے بلکہ یہ تو ممانعت کے بعد بطور اجازت امر ہے۔ اس میں علماء اصول کا اختلاف ہے۔ کسی نے کہا یہ مطلق وجوب کے لیے ہے۔ یہ لوگ ابن حزم کے جواب کے محتاج ہیں۔ بعض نے کہا یہ اباحت کے لیے ہے نہی متقدم کو

قرینہ صارفہ کہتے ہیں۔ مگر اس میں نظر ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ جس بات پر دلیل ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حکم کو اسی حال پر رکھیں جو ممانعت سے پہلے تھا اگر واجب تھا تو واجب ہی ہے جیسے فرمایا: ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ﴾ کہ "جب حرمت والے مہینے گذر جائیں تو مشرکین سے لڑو۔" اور اگر مباح تھا تو مباح ہی رہے گا جیسے ﴿فَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا﴾ کہ "جب احرام کھول لو تو شکار کر سکتے ہو۔" اور یہ فرمایا: ﴿فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ کہ "جب نماز مکمل کر لی جائے تو زمین میں پھیل جاؤ۔" اسی قول پر ادلہ جمع ہو جاتی ہے۔ اس کو غزالی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ بعض ائمہ متاخرین کا مختار بھی یہی ہے۔ ابن کثیر نے بھی اسی کو صحیح کہا ہے۔ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ جب عورت کا حیض منقطع ہو جائے تو جب تک وہ نہا نہ لے یا اگر نہانا مشکل ہے تو تیمم نہ کر لے تب تک وہ حلال نہیں ہوتی۔ مگر ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب حیض کی اکثر مدت پوری ہو جائے یعنی دس دن مکمل ہو جائیں تو صرف انقطاع سے وہ حلال ہو جائے گی۔ اسے غسل کی ضرورت نہیں رہتی۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ طہر سے طہر خون اور تطہر سے غسل مراد ہے۔ حضرت مجاہد، عکرمہ، حسن، مقاتل بن حیان اور لیث بن سعد وغیرھم کا بھی یہی موقف ہے۔ ابن عباسؓ و مجاہد کے نزدیک حَیْثُ سے فرج مراد ہے۔ یعنی فرج سے تجاوز نہ کرے۔ جس نے اس سے تجاوز کیا اس نے زیادتی کی اس میں وطی فی الدبر کی حرمت پر دلیل ہے۔ عنقریب اس کا بیان آئے گا۔ ان شاء الله۔ ابورزین و عکرمہ اور ضحاک نے کہا مراد یہ ہے کہ جب حیض سے پاک ہو تو اس کے پاس جائے۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اگرچہ کئی دفعہ عشیان کیا ہو۔ اور پاکیزگی والوں کو پسند کرتا ہے۔ جو گندگی کے مقام سے بچتے ہیں یا بے محل جگہ نہیں جاتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حدث سے موضع ولد مراد ہے۔ جو فرمایا کہ جس طرح چاہو جاؤ اس کا مطلب یہ ہے کہ آگے یا پیچھے سے جاؤ مگر جانا ایک ہی مقام میں ہو جس طرح احادیث میں آیا ہے۔ بخاری میں جابرؓ سے مروی ہے کہ یہود کہتے تھے کہ جب عورت سے پچھلی جانب جماع کیا جاتا ہے تو بچہ احول پیدا ہوتا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کو مسلم اور ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے۔ ابن جریج کا لفظ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا سامنے سے اور پشت سے جبکہ فرج ہی میں ہو۔ معاویہ قشیری نے پوچھا ہم اپنی عورتوں سے کس چیز کو لیں اور کس کو ترک کریں۔ فرمایا وہ تیری کھیتی ہے جدھر سے تو چاہے۔ مگر اس کے منہ پر نہ مارو نہ اس کو برا کہو نہ اس کو جدا کر مگر گھر کی حد تک۔ [الحدیث براویت احمد] اہل السنن و ابن ابی حاتم نے کہا کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حمیر قبیلے کے چند لوگ آپ علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ ہم عورتوں کو چاہتے ہیں آپؐ اس متعلق کیا فرماتے

ہیں۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ان کا دوسرا لفظ امام احمد کے قریب یہ ہے کہ یہ آیت انصار کے متعلق نازل ہوئی۔انہوں نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا تھا۔ فرمایا ہر حال میں ان کے پاس آؤ۔ جبکہ مقصود فرج ہے۔

فائدہ: ابو جعفر طحاوی نے مشکل الآثار میں حضرت ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے دبر میں صحبت کی تو لوگوں نے اس پر انکار کیا تب یہ آیت نازل ہوئی۔اس کو ابن جریر اور ابو یعلی نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ جب مہاجرین مدینہ میں آئے اور انصار کی عورتوں سے نکاح کیا تو عورتوں کے پاس پشت سے آئے۔اس پر انصار کی عورتوں نے انکار کیا آنحضرت ﷺ سے سوال کیا گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی فرمایا:((انّی شئتم صما ما واحدًا.......... الحدیث بطوله)) [بروایت احمد] ترمذی نے اس کو حسن کہا۔ حفصہؓ فرماتی ہیں کہ ایک عورت آئی اس نے کہا کہ میرا شوہر میرے پاس پشت کی جانب سے آتا ہے اور میں اس بات کو ناپسند کرتی ہوں۔جب آنحضرت ﷺ کو بتایا گیا تو فرمایا:((لا باس اذا کان فی صمام واحدٍ)) کہ ”اگر ایک ہی مقام میں ہو تو کچھ حرج نہ ہے۔“ [بروایت ابن کثیر من طریق حماد بن ابی حنیفه] حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ بن خطاب نے آنحضرت ﷺ سے کہا اے اللہ کے رسولؐ! میں ہلاک ہوا فرمایا کیا ہوا کہا آج رات میں نے اپنی بیوی کو پھیر دیا۔یعنی پشت کی جانب سے صحبت کی اس پر آنحضرت ﷺ خاموش رہے۔اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ آگے سے آؤ یا پیچھے سے مگر دبر اور بحالت حیض سے بچو۔[بروایت احمد] اس کو ترمذی حسن غریب کہا۔ابو سعید کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے پشت کی جانب سے صحبت کی۔لوگوں نے کہا کہ دیکھو اس نے ایسا کام کیا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[بروایت ابو یعلی] حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اہل کتاب عورتوں کے پاس ایک ہی جانب سے آتے تھے اس میں عورتوں کا مناسب پردہ رہتا۔انہی سے انصار کے ایک قبیلے نے یہ عادت اخذ کی تھی۔ قریش عورتوں کو ہر جانب سے لطف اندوزی کا سامان بناتے تھے جب وہ مدینے آئے تو ایک انصاریہ سے نکاح کیا جب اس سے اسی طریق سے ملے تو اس نے انکار کیا اس نے کہا ہمارے پاس ایک جانب سے آؤ ورنہ الگ رہو۔یہ بات آنحضرت ﷺ کو پہنچی تو اللہ نے یہ آیت نازل کی کہ جس طرح جی چاہے آؤ مگر ایک ہی مقام میں آؤ۔ابو داؤد اس حدیث کے ساتھ منفرد ہیں۔اس سے پہلی احادیث اس کی صحت کی شاہد ہیں۔ خصوصاً ام سلمہؓ کی روایت اس سیاق سے مشابہ ہے۔اس حدیث کو طبرانی نے بھی حضرت ابن عباسؓ سے طویل روایت کی صورت میں روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ یہ آیت وطی فی الدبر کے متعلق آئی ہے۔یعنی دبر میں نہیں بلکہ دبر کی جانب سے قُبل میں آنے کے متعلق ہے۔اس حدیث کی

وضاحت خود حضرت ابن عمرؓ نے نسائی کے نزدیک نافع کی حدیث میں آئی ہے۔اس کی سند صحیح ہے۔ابن کثیر نے کہا کہ حضرت ابن عمرؓ سے یہ صحیح حدیث ہے کہ دبر میں جماع کرنا حلال نہ ہے۔اگر یہ قول فقہائے مدینہ کے ایک گروہ کی طرف منسوب ہے۔بعض نے کتاب ایسر میں اس کو امام مالک کی طرف منسوب کیا ہے۔اکثر لوگ اس کو امام مالک سے صحیح نہیں کہتے۔مختلف طرق سے کئی احادیث میں اس فعل پر ڈانٹ بتائی گئی ہے۔حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم شرم کرتے ہو جبکہ اللہ نہیں شرماتا یہ بات حلال نہ ہے۔کہ تم عورتوں کے پاس ان کے دبر میں آؤ۔[بروایت حسن بن عرفۃ] خذیمہ بن ثابت کی حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دبر میں آنے سے منع فرمایا ہے۔[بروایت احمد] اس کو نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔مگر ان کی اسناد میں بہت اختلاف ہے۔ابن عباسؓ کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ اللہ اس مرد کی طرف نظر نہیں کرتا جو عورت کے پاس اس کے دبر میں آتا ہے۔[بروایت نسائی] ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔اس کو ابن حبان اور ابن حزم نے بھی روایت کیا ہے۔لیکن نسائی میں یہ روایت موقوف مذکور ہے کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ عورت کے پاس دبر میں آنے کا کیا حکم ہے کہا تو مجھ سے کفر کے متعلق سوال کرتا ہے۔[بروایت عبد بن حمید] ابن کثیر نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے۔دوسرا لفظ یہ ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ میں اپنی بیوی کے پاس اس کے دبر میں آتا ہوں اس لیے کہ اللہ نے فرمایا انّٰی شئتم میں نے خیال کیا کہ ایسا کرنا حلال ہے۔کہا اے احمق! اس سے مراد یہ ہے کہ کھڑے بیٹھے آگے پیچھے سے جاؤ، قُبل سے کسی اور جانب تجاوز نہ کرو۔[بروایت عبد بن حمید] حدیثِ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ میں مرفوعًا آیا ہے کہ جو کوئی عورت سے دبر میں آتا ہے تو یہ لوطیتِ صغرٰی ہے۔[بروایت احمد] ابو الدرماء نے کہا ایسا کام صرف کافر ہی کرتا ہے۔حضرت علی بن طلق فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے دبر میں صحبت سے منع فرمایا ہے۔پھر فرمایا کہ اللہ حق بات سے نہیں شرماتا۔بروایت احمد۔ترمذی نے اس کو حسن کہا۔بعض نے اس کو مسند علی بن ابی طالب میں لکھ رہا ہے۔جیسا کہ سند احمد میں بھی ایسا ہوا لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ علی بن طلق ہے۔حضرت ابو ہریرہؓ کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ جو کوئی عورت کے پاس دبر میں آتا ہے اللہ تعالٰی ں کی طرف نہ دیکھے گا۔[بروایت احمد] دوسرا لفظ یہ ہے کہ اللہ اس مرد کی طرف نظر نہیں کرتا جو عورت سے دبر میں جماع کرتا ہے۔[بروایت احمد وابن ماجہ] تیسرا لفظ یہ ہے کہ وہ شخص ملعون ہے جو عورت سے دبر میں جماع کرتا ہے۔[بروایت احمد و ابوداؤد ونسائی] چوتھا لفظ یہ ہے کہ جو شخص حائض کے پاس آئے یا دبر میں آئے یا کاہن کے پاس جائے، اس نے اس چیز کا کفر کیا جو محمد ﷺ لے کر آئے

۔[بروایت احمد واهل السنن] ترمذی نے کہا کہ بخاری نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ لیکن بخاری نے حکیم ترمذی کے متعلق کہا حکیم اثرم کے متعلق نہیں۔ سو اس حدیث میں ابو تمیمہ سے روایت کرنے والے حکیم اثرم ہیں حکیم ترمذی نہ ہیں۔ پانچواں لفظ یہ ہے کہ اللہ سے مکمل طور پر حیا کرو عورتوں کی دبر میں نہ آؤ۔ اس طریق سے نسائی منفرد ہیں۔ حمزہ بن محمد کنانی کہتے ہیں کہ یہ حدیث زہری وابو سلمہ اور ابو سعید سے منکر و باطل ہے۔ جو کہ اس کی سند میں ہیں اگر عبد الملک نے سعید سے اس حدیث کو سنا ہے تو اختلاط کے بعد سنا ہوگا۔ ہاں ترمذی نے ابو سلمہ سے روایت کیا ہے کہ وہ اس فعل سے منع کرتے تھے۔ لیکن یہ حدیث ابو ہریرہؓ سے مرفوع مروی نہ ہے۔ ابن کثیر نے کہا یہ مناسب تنقید ہے لیکن عبد الملک کا مختلط ہونا حمزہ کے سوا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ وہ ثقہ ہے۔ رحیم وابو حاتم نے اس میں کلام کیا ہے۔ ابن حبان نے کہا کہ اس حدیث سے محبت پکڑنا درست نہ ہے کیونکہ یہ حدیث دو اور طریق سے ابو سلمہ سے مروی ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی درست نہ ہے۔ چھٹا لفظ موقوف یہ ہے کہ جو شخص مردوں کا عورتوں کے پاس دبر میں آنا کفر ہے۔ [بروایت نسائی] ساتواں موقوف لفظ یہ ہے کہ جو شخص مردوں اور عورتوں کے دبر میں آیا وہ کافر ہوا۔ [بروایت نسائی] حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ عورتوں کے پاس ان کے دبر میں نہ آؤ۔ [بروایت نسائی] یہ بھی موقوف ہے طلق بن یزید اور یزید بن طلق کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ اللہ حق سے نہیں شرماتا تم عورتوں کے دبر میں مت آؤ۔ [بروایت احمد] کسی حدیث میں حشوش کا لفظ ہے کسی میں محاش کسی میں اعجاز، کسی میں استاہ کا لفظ آیا ہے مگر اکثر میں ادبار کا لفظ ہے جبکہ یہ سارے الفاظ قریب المفہوم ہیں۔ اثرم کا لفظ حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعاً یہ ہے کہ عورتوں کی محاش حرام ہیں۔ مگر اس کا موقوف ہونا زیادہ درست ہے۔ دوسرا لفظ یہ ہے کہ عورتوں کے اعجاز میں نہ آؤ۔ اس کو ابن عدی نے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ مگر اس کی سند میں محمد جزری اور شیخ جزاری ضعیف ہیں۔ ایک شخص نے حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ سے یہی مسئلہ پوچھا تھا کہا تو نیچے گرا اللہ تمہیں نیچے گرائے۔ کہا تو نے اللہ کا یہ قول نہ سنا ہے: ﴿اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِيْنَ۝﴾ کہ "کیا تم بے حیائی کرتے ہو جیسا کام تم سے پہلے جہانوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔" بروایت ثوری وابن مسعود وابو الدرداء وابو ہریرہ وابن عباس اور ابن عمرو کا قول تحریم وطی فی الدبر کے متعلق پہلے گذر چکا ہے۔ بلا شبہ وہی قول حضرت ابن عمرؓ سے بھی ثابت ہے کہ وہ اس کام کو حرام سمجھتے تھے۔ دارمی نے سعید بن یسار سے روایت کیا کہ انہوں نے ابن عمرؓ سے یہ مسئلہ پوچھا انہوں نے بلفظ تحمیض ذکر کیا تھا۔ کہا کیا کوئی مسلمان اس طرح بھی کرتا ہے۔ ابن کثیر نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے۔ یہ تحریم پر صریح نص ہے۔ پھر جو بطور امتحان

حضرت ابن عمرؓ سے اس کے خلاف آیا ہے وہ اس محکم کی طرف مردود ہے۔ معمر بن عیسٰی نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ یہ کام حرام ہے۔ اسرائیل بن روح کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے پوچھا کہ تم اتیان فی الدبر کے متعلق کیا خیال رکھتے ہو؟ کہا تم گنوار لوگ ہو۔ بھلا کھیتی کھیت کے علاوہ بھی ہوتی ہے۔ فرج سے تجاوز نہ کرو۔ میں نے کہا کہ لوگ تو کہتے ہیں کہ تم اس کے قائل ہو۔ انہوں نے دو دفعہ جواب دیا کہ لوگ مجھ پر دروغ گوئی کرتے ہیں۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام مالک سے اسی طرح ثابت ہوا ہے۔ ابو حنیفہ، شافعی، احمد اور ان کے اصحاب کا بھی یہی مذہب ہے۔ سعید بن مسیب، ابو سلمہ عکرمہ، طاؤس، عطاء، سعید بن جبیر، عروۃ بن زبیر، مجاہد اور حسن وغیرھم سلف بھی اسی کے قائل ہیں۔ سب نے اس فعل پر سخت انکار کیا۔ کسی نے اس فعل کے فاعل پر کفر کا اطلاق کیا ہے۔ جمہور علماء کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور جو بیان اس میں مالک اور بعض فقہائے مدینہ سے منقول ہے اس میں نظر ہے۔ عبد الرحمٰن بن قاسم کہتے ہیں کہ میں نے کسی امام دین کو نہیں پایا کہ وہ اس کی حلت میں شک کرتے یعنی سب نے اس کو حرام کہا ہے۔ پھر آیت پڑھ کر کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا وضاحت ہو گی۔ [بروایت الطحاوی ، حاکم ، دار قطنی] خطیب بغدادی نے امام مالک سے کئی طریق سے ایسی روایات بیان کی ہیں جو جواز پر دلیل ہیں۔ لیکن ان کی اسانید سخت ضعیف دوامی قسم کی ہیں۔ ہمارے شیخ ذہبی نے اس باب میں ایک جزء جمع فرمایا ہے۔ پھر طحاوی نے ابن عبد الحکم سے روایت کیا کہ اس نے امام شافعی کو یہ کہتے سنا کہ اس کی تحریم و تحلیل میں کوئی بات درجہ صحت کو نہیں پہنچتی قیاس یہ ہے کہ حلال ہو۔ مگر ربیع نے قسم کھا کر کہا باللہ الذی لاالہ الاھو کہ ابن عبد الحکم نے امام شافعی پر جھوٹ باندھا ہے۔ انہوں نے تو چھ کتب میں اس کی تحریم پر نص کی ہے۔ و اللہ اعلم۔

فائدہ: فتح البیان کا بیان فاتح یہ ہے کہ لفظ حرث سے یہ فائدہ ہوا کہ صرف فرج میں اباحت واقع ہوئی۔ جو قبل سے خاص ہے۔ اس لیے کہ پیداوار کی جگہ یہی ہے۔ عورت کی شرمگاہ کو زمین سے، نطفے کو بیج سے اور بچے کو کھیتی سے تشبیہ دی ہے۔ انّی شئتم کا مطلب یہ ہے کہ جس طریقے سے چاہو آؤ مگر موضع حرث میں آؤ۔ سیبویہ نے کہا کہ اس جگہ انّی سے کیف مراد ہے۔ سارے صحابہؓ و تابعینؒ سلف و خلف ائمہ و مجتہدین اسی کے قائل ہیں کہ دبر میں آنا حرام ہے۔ سارے اصحاب و مشائخ مالکیہ اسی بات کے منکر ہیں کہ کتاب السر امام مالک کی ہے۔ امام صاحب کا رتبہ اس بات سے بلند ہے کہ وہ ایسی کتاب لکھیں۔ ابن شعبان نے کتاب "جماع النسوان" میں اس کو صحابہؓ و تابعینؒ کی کثیر جماعت کی طرف منسوب کیا ہے۔ ذکرہ ابن العربی۔ مگر وہ اقوال صحیح نہ ہیں۔ جو بات صحابہؓ و تابعینؒ سے مرفوعاً اور موقوفاً آئی ہے وہ یہی ہے وہ وطی فی الدبر حرام قطعی ہے۔ جو اس کے جواز کے قائل ہیں مگر ان کے پاس اس امر کی

کوئی دلیل نہ ہے۔ پھران کی بات قابل قبول کیسے ہو سکتی ہے۔اگر انہوں نے مذکورہ آیت سے اس کے جواز کی دلیل لی ہے تو ان سے خطا ہوئی۔ ہمارے لیے قرآن کی تفسیر آنحضرت ﷺ اور صحابہ ؓ سے منقول ہے۔وہ ہمیں کافی ہے ان سے بڑھ کر قرآن کو اور کون سمجھے گا؟ جس نے یہ خیال کیا کہ کسی شخص کا ایسا کرنا اس آیت کا سبب نزول ہے تو بھی اس میں اس فعل کی حلت پر کوئی دلیل نہ ہے۔ آیت سے جواز حلت لینے والے نے خطا کی آیت تو حرمت پر دلیل ہے۔ سبب نزول سے یہ بات لازم نہ ہوتی ہے کہ وہ آیت اس حرام کی تحلیل کے لیے اتری ہو۔ کیونکہ اسباب پر نزول آیات کبھی حلت کے لیے ہوتا ہے اور کبھی حرمت کے لیے اگر مان بھی لیا جائے کہ سبب نزول یہ ہو مگر لفظ حرث کہہ کر اس سے منع کر دیا۔ کہ اس طرح یہ فعل جائز ہے اس طرح نہیں جس طرح تم نے کیا۔

فائدہ: اور جو فرمایا کہ اپنے نفسوں کے لیے آگے بھیجو اس کا مطلب یہ ہے کہ طاعات بجا لاؤ اور منہیمات سے بچو، محارم کو چھوڑ دو۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ اللہ سے ڈرو تمہیں اس سے ملنا ہے۔ یعنی وہ تمہارے اعمال کا حساب لے گا۔ پھر کہا کہ مومنوں کو بشارت ہے۔ جو اس کے احکام بجالائے اور اس کے روکے ہوئے امور سے بچتے ہیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس تقدیم سے مراد یہ ہے کہ جماع سے پہلے بسم اللہ کہہ لیا کرو۔ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً آیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس جائے تو کہے:((اللهم جنبنا الشيطان وجنب الشيطان مارزقتنا)) اگر اس کے مقدر میں اولاد ہو گی تو شیطان اسے نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ کسی نے کہا تقدیم سے اولاد چاہنا مراد ہے۔ کسی نے کہا کہ نیک عورتوں سے نکاح کرنا مراد ہے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٤﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٢٥﴾	اور اللہ (کے نام) کو اس بات کا حیلہ نہ بنانا کہ (اس کی) قسمیں کھا کھا کر سلوک کرنے اور پرہیز گاری کرنے اور لوگوں میں صلح و سازگاری کرانے سے رک جاؤ اور اللہ سب کچھ سنتا (اور) جانتا ہے۔ اللہ تمہاری لغو قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا، لیکن جو قسمیں تم قصد دل سے کھاؤ گے ان پر مواخذہ کرے گا اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

فائدہ: یعنی اچھے کام پر اللہ کی قسم نہ کھائے کہ میں ماں باپ سے نہ بولوں گا یا محتاج پر خرچ نہ کروں گا وغیرہ لیکن اگر ایسی قسم کھا بیٹھے تو اس کو توڑ دے اور کفارہ ادا کرے۔ لغو قسم وہ ہے جو زبان سے نکلے مگر دل کو اس کی خبر نہ ہو۔

فائدہ: ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اللہ کریم نے فرمایا کہ اللہ کی قسموں کو نیکی صلہ رحمی سے رکاوٹ نہ بناؤ جیسے فرمایا: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَى وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ "اور تم میں سے صاحب فضل و وسعت قسم نہ کھائیں کہ وہ قریبیوں، مساکین اور مہاجرین فی سبیل اللہ کو نہ دیں گے۔ اور انہیں چاہئے کہ معاف کر دیں اور درگذر کریں۔ کیا تم نہ چاہتے ہو کہ اللہ تمہیں معاف کر دے۔" ایسی قسم پر اصرار کرنا گناہ ہے۔ کفارے کے ذریعے اس گناہ سے صاف ہوا جاسکتا ہے۔ احادیث صحیحین وغیرھما میں آیا ہے کہ جس نے قسم کھائی پھر دیکھا کہ قسم کے سوا اور معاملہ زیادہ بہتر ہے تو اس کو چاہئے کہ اس بہتر کام کو کرلے اور قسم کا کفارہ دے۔ دوسری روایات میں فرمایا کہ میں اسی طرح کرتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ کا لفظ یہ ہے کہ جس نے معصیت پر قسم اٹھائی یا قطع رحمی پر اس کا سچ کرنا یہ ہے کہ اس قسم کو توڑ دے اور اچھے کام کی طرف رجوع کرے۔ [بروایت ابن ماجہ] حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تم اللہ کی قسموں کو نشانہ نہ بناؤ کہ تم نیکی نہ کرو گے۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی کثیر جماعت کا یہی موقف ہے۔ ابن کثیر نے جن کے نام بھی ذکر کیے ہیں۔ ایسی قسم کو توڑنا اور اس کا کفارہ دینا بہت سی احادیث صحیحہ میں وارد ہوا ہے۔

فائدہ: لغو قسم وہ ہے کہ حالف نے اس کا دل سے ارادہ نہ کیا (بلا ارادہ) عادتاً زبان پر جاری ہو گئی۔ اس سے نہ کوئی قید مقصود ہے نہ تاکید۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے لات وعزیٰ کی قسم کھائی اسے چاہئے کہ وہ لا الہ الا اللہ کہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ ایک ایسی قوم کو ارشاد کیا تھا جو نئی نئی زمانہ جاہلیت سے نکلی تھی عادت کے طور پر ان کی زبان سے ایسی قسمیں جاری ہو جایا کرتی تھیں۔ اس لیے حکم دیا کہ کلمہ اخلاص کہو تا کہ اس کا بدل ہو۔ ھذہ بھذہ۔ اللہ کریم نے بھی یہی فرمایا کہ دل کی (کمائی) فعل پر گرفت ہو گی سبقت لسانی پر مواخذہ نہ ہو گا۔ جس طرح دوسری آیت میں فرمایا: ﴿بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ﴾ حضرت عائشہ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ یمین لغو یہ ہے کہ آدمی اپنی عام گفتگو میں ﴿واللہ وبلی واللہ﴾ کہتا ہے۔ [بروایت ابو داؤد] یہ حدیث کئی طریق سے آئی ہے مگر ہر طریق میں یہ موقوف ہے۔ پھر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: کہ یمین لغو ہنسی دل لگی میں ہوتی ہے۔ جیسے ((لا واللہ وبلیٰ واللہ)) اس پر کچھ کفارہ نہ ہے۔ کفارہ تو اس پر ہے جو دل کے ثبوت کا ساتھ ہو۔ کہ اس کام کو کریں گے مگر پھر نہ کیا۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ مروزی نے کہا کہ عام علماء اس پر متفق ہیں احادیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہیں۔ امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے۔ حضرت

عائشہ علیہا السلام کا دوسرا قول یہ ہے کہ لغو قسم سے یہ مراد ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کو سچ سمجھ کر قسم کھائے مگر وہ سچ نہ ہو۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ حنیفہ اور مالک کا بھی یہی قول ہے۔ حسن بن ابوالحسن نے کہا کہ آنحضرت ایک جماعت سے گذرے جو تیر چلا رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک شخص تھا ان میں سے ایک شخص نے کہا واللہ! تیر ٹھیک لگایا واللہ! اس نے خطا کی۔ اس شخص نے کہا اے اللہ کے پیغمبرؐ! یہ شخص حانث ہوا (یعنی اس نے قسم توڑی اور گناہ پایا) فرمایا نہیں تیر اندازوں کی قسم لغو ہوتی ہے نہ اس میں کفارہ نہ کچھ سزا۔[بروایت ابن جریر] ابن کثیر نے کہا یہ حدیث مرسل حسن ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابوالحسن سے حضرت عائشہ سے دونوں قول روایت کیے ہیں۔ ابراہیم نے کہا لغو یہ ہے کہ کسی چیز پر قسم کھا کر بھول جائے۔ زید بن اسلم نے کہا لغو قسم یہ ہے کہ کہے اللہ مجھے اندھا کرے اگر میں یہ کام نہ کروں یا مجھے مفلس کر دے اگر میں کل تیرے پاس نہ آؤں ابن عباسؓ نے فرمایا لغو یہ ہے کہ غصے میں قسم کھائے یا حلال کو حرام کرے ایسی قسم میں کفارہ نہ ہے۔ حضرت سعید بن جبیرؒ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ بعض نے کہا: لغو قسم یہ ہے کہ معصیت پر قسم کھالے کہ میں شراب پیوں گا یا قطع رحمی کروں گا۔ یا یہ کہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہودی ہو یا مشرک ہو۔ یا یہ کہ ایک کہے واللہ میں اتنی قیمت پر فروخت نہ کروں گا دوسرا کہے واللہ میں اتنی قیمت پر نہ خریدوں گا۔

فائدہ: اللہ دل کی بات پر گرفت کرتا ہے اس کا مطلب حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد وغیرھما نے یہ کہا ہے کہ کسی چیز پر دیدہ دانستہ قسم کھائی جبکہ وہ جھوٹ تھی۔ حضرت مجاہد نے کہا کہ یہ آیت اسی آیت کی طرح ہے جو فرمایا: ﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ﴾ ”اور لیکن وہ تمہیں اس پر پکڑے گا جو تمہارے قسم تم نے (مضبوط کی) گرہ باندھی۔“ یعنی جس چیز پر بالارادہ قسم کھائی جائے اس پر پکڑ ہوگی۔ یہ اللہ کا حلم ہے کہ اس نے یمین لغو پر نہ کفارہ رکھا نہ مواخذہ۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس جانے کی قسم کھالیں ان کو چار مہینے انتظار کرنا چاہئے اگر (اس عرصے میں قسم سے) رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر طلاق کا ارادہ کر لیں تو بھی اللہ سنتا (اور) جانتا ہے۔

فائدہ: جس شخص نے قسم کھائی کی اپنی بیوی کے پاس نہ جائے گا تو چار مہینوں کے اندر اندر اس کے پاس جائے اور قسم کا کفارہ دے ورنہ طلاق ٹھہرے گی۔ ایلاء قسم کھانے کو کہتے ہیں۔ کہ اگر چار ماہ سے کم مدت کی قسم

کھائی ہے تو مدت کے پورا ہونے کا انتظار کرے پھر تکمیل مدت پر اس کے پاس جائے۔اس مدت میں عورت پر صبر لازم ہے۔ عورت کو نہ چاہئے کہ اس مدت میں رجوع کی درخواست کرے۔ جس طرح کہ صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ اپنی بیویوں سے ایک ماہ کا ایلاء کیا پھر انتیسویں تاریخ کو واپس آگئے اور فرمایا کہ مہینہ کبھی انتیس دنوں کا بھی ہوتا ہے اس طرح کی روایت شیخین نے حضرت عمرؓ بن خطاب سے بھی روایت کیا ہے۔اگر چار ماہ سے زایدہ مدتِ ایلاء ہو تو چار ماہ گذرنے پر بیوی خاوند سے کہہ سکتی ہے کہ مل جاؤ۔ اس کو ترک کردو۔اور اس متعلق حاکم بھی اس شخص پر جبر کر سکتا ہے۔اس لیے کہ عورت کو ضرر نہ پہنچے اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایلاء بیویوں کے ساتھ خاص ہے لونڈیوں کے ساتھ نہ ہے۔ کیونکہ نساء کا لفظ بولا ہے۔ جمہور کا یہی مذہب ہے۔ چار ماہ کی فرصت حلف کے وقت سے شمار ہوتی ہے۔ پھر اس کے گذرنے پر واپسی یا طلاق کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ فیئ سے جماع مراد ہے۔ ابن عباسؓ، مسروق، شعبی اور سعید بن جبیر وغیرھم نے بھی ایسا ہی کہا۔ اللہ کریم ایسی غلطی کو جو اس قسم کی وجہ سے ازواج کے حق میں ہوئی معاف فرمادیتا ہے۔ شافعی نے فرمایا کہ معاف کرنے کے یہ معنی ہیں کہ جب ایلاء کرنے والا چار ماہ کے بعد رجوع کرے تو اس پر کچھ گناہ نہ ہے۔ حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث اسی پر دلالت کرتی ہے۔ اس حدیث کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ جس نے کسی کام پر قسم کھائی مگر اس نے اس کے غیر کو مناسب خیال کیا تو اس کا کفارہ یہی ہے کہ اس مقسوم علیہ کام کو چھوڑ دے۔ [بروایت احمد، ابو داؤد] ترمذی جمہود کا مذہب اور شافعی کا نیا قول یہ ہے کہ اس پر کفارہ لازم ہے۔ اس لیے کہ ہر حالف پر وجوب کفارہ عام ہے۔ جس طرح کہ اوپر احادیث صحاح میں مذکور ہو چکا ہے۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ فقط چار ماہ کی مدت گذرنے پر طلاق نہیں واقع ہوتی۔ جمہور متاخرین کا یہی قول ہے۔ دوسرے گروہ کا قول یہ ہے کہ ایک طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ یہ قول صحیح اسناد کے ساتھ خلفائے اربعہ اور صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ پھر ایک جماعت نے کہا کہ یہ طلاق رجعی ہے جبکہ دوسری جماعت نے کہا کہ بلکہ وہ بائن ہے۔ ایک جماعت سلف اور حنفیہ کہتے ہیں کہ جب ایک طلاق واقع ہوئی تو عدت بھی واجب ہوئی۔ مگر حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر اسے تین حیض آچکے ہیں تو اب عدت نہ رہی۔ شافعی کا بھی یہی قول ہے۔ جمہور متاخرین کہتے ہیں کہ اس کو روکا جائے کہ یا لوٹ آئے یا چھوڑ دے۔ فقط مدت پوری ہونے پر طلاق واقع نہ ہوگی۔ مالک نے ابن عمرؓ سے بھی ایسا ہی روایت کیا ہے۔ سلیمان بن یسار نے کہا کہ میں دس سے زائد صحابہ رضی اللہ عنہم کو پایا سب کا یہی قول تھا کہ ایلاء کرنے والے کو ٹھہرایا جائے گا۔ شافعی نے کہا کہ کم از کم تیرہ صحابیؓ ہوں گے۔ اور وہ خود (شافعی) بھی اس

کے قائل ہیں کہ اس کو روکا جائے گا۔انہوں نے کہا کہ ھکذا نقول۔یہی بات حضرت عمرو،ابن عمرؓ،عائشہؓ،عثمانؓ اور زید بن ثابت کے مذہب کے موافق ہے۔ابو صالح کہتے ہیں کہ میں نے بارہ ۱۲ اصحابؓ سے پوچھا سب نے یہی کہا کہ خاوند پر چار ماہ گذرنے تک کچھ نہیں پھر اس مدت کے گذرنے پر ان کو ٹھہرایا جائے گا۔کہ رجوع کرے یا طلاق دے۔ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر، عثمان، علی، ابو الدرداء عائشہ، ابن عمرو، ابن عباس ﷺ کا یہی مذہب ہے اور جماعت تابعینؒ مالک، شافعی، احمد اور ان کا اصحاب کا بھی یہی موقف ہے۔ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔لیث بن راہویہ، ابو عبید، ابو ثور اور ابو داؤد کا بھی یہی قول ہے۔سب نے کہا کہ اگر مرد رجوع نہ کرے تو اس صورت میں طلاق لازم آئے گی۔اگر مرد پھر بھی طلاق نہ دے تو حاکم طلاق دے دے۔اور یہ طلاق رجعی ہوگی۔اگر چاہے تو عدت میں رجوع کر سکتا ہے۔مگر مالک اس رجعت کو ناجائز سمجھتے ہیں حتیٰ کہ اس عدت کے اندر جماع کر لے۔ان کا یہ قول سخت ضعیف ہے۔فقہاء وغیر ھم نے اس کے متعلق امام مالک کا ایک اثر مؤطا میں عبد اللہ بن دینارؒ سے نقل کیا ہے۔کہ ایک رات حضرت عمرؓ بن خطاب باہر نکلے تو ایک عورت کو سنا وہ یہ شعر پڑھ رہی تھی۔

تطاول هذاالیل واسود جانبه وارقفی الاخلیل الاعبه

فو الله لو لا الله انی اراقبه لحرك من هذا السر یر جوانبه۔

حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ سے پوچھا کہ عورت کتنی مدت صبر کر سکتی ہے؟ کہا: چھ ماہ یا چار ماہ۔ فرمایا: میں اس سے زیادہ کسی لشکری کو باہر نہ روکوں گا۔یہ اثر کئی طریق سے مروی ہے اور مشہور ہے۔

فائدہ: فتح البیان میں لکھا ہے کہ لفظ نساء آزاد عورت اور لونڈی دونوں کو شامل ہے جیسے للذین یُؤْلُوْنَ میں غلام بھی داخل ہیں۔احمد و شافعی اور ابو ثور نے کہا ہے کہ غلام کا ایلاء آزاد مرد کے ایلاء کی طرح ہے۔مالک ،زہری، عطاء ابو حنیفہ اور اسحٰق کہتے ہیں کہ بلکہ اس کا ایلاء دو ماہ ہے۔شعبی نے کہا کہ لونڈی کا ایلاء آزاد عورت کا ایلاء سے آدھا ہے۔اللہ کریم نے عورتوں سے تکلیف کو ختم کرنے کے لیے یہ مدت مقرر فرما دی ہے ورنہ اہل جاہلیت ایک ایک دو دو سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت ایلاء کرتے تھے۔ان کا مقصد عورتوں کو تنگ کرنا ہی ہوتا تھا۔فئی لغت میں رجوع کو کہتے ہیں۔اس جگہ یہی معنی مراد ہیں۔ابن المنذر نے کہا کہ جن حضرات سے علم لیا گیا ہے ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ فئی سے جماع مراد ہے۔اگر شوہر مریض ہے یا قید میں ہے تو وہ زوال عذر تک اس کی بیوی ہے۔پھر اگر عذر ختم ہونے پر بھی مدت کے مکمل ہونے پر جماع نہ کیا تو تفریق کر دی جائے گی۔مالک کا بھی یہی قول ہے۔ایک جماعت نے یہ بھی کہا کہ بحالتِ عذر اگر دل میں رجوع کا ارادہ کر لیا تو بھی کافی ہے۔حسن

،عکرمہ، نخعی،اوزاعی اور احمد اسی کے قائل ہیں۔جمہور نے کہا اگر خاوند جماع کے ذریعے رجوع کرے تو اس پر کفارہ واجب ہے۔حسن اور نخعی نے کہا بلکہ اس پر کچھ کفارہ نہ ہے۔اس باب میں صحابہؓ و تابعینؒ کے بہت سے اقوال مروی ہیں۔جن میں سے بعض ایک دوسرے کے مخالف بھی ہیں۔اور مختلف بھی۔اور صحیح بات وہی ہے جو آیت میں مذکور ہے۔

فائدہ: ہر مذہب والے نے آیت باب کی تفسیر اپنے مذہب کے موافق کی ہے۔اور بغیر دلیل اس کا تکلف کیا ہے یا دوسری دلیل کے معنی مقرر کیے ہیں۔حالانکہ آیت کے معنی واضح ہیں۔یعنی اللہ نے ایلاء کرنے والے کے لیے چار ماہ کی مدت مقرر کر دی ہے۔پھر اس مدت کے بعد یہ حکم دیا کہ اگر بقاء زوجیت کی طرف رجوع کرے گا تو اللہ غفور رحیم ہے۔اور انہیں اس قسم پر کچھ مواخذہ نہ کرے گا۔اور اگر طلاق دینے کا ارادہ کر لیا تو اللہ سمیع علیم ہے اس آیت کے بغیر شبہ کے یہی معنی ہیں۔پھر جس نے غیر معین مدت کی قسم کھائی یا چار ماہ سے زیادہ مدت کی قسم کھائی تو اسے چار ماہ تک چھوڑا جائے گا چار ماہ گذرنے پر اس کو اختیار ہے کہ وہ رجوع کر لے کفارہ دے دے،اور وہ اسی طرح اس کی بیوی رہے گی جیسے اس مدت سے قبل تھی لیکن اگر طلاق کا ارادہ کر کے طلاق دے دے تو یہ طلاق رجعی ہوگی۔اور اگر چار ماہ سے کم مدت مقرر کی ہے اور قسم میں سچا ہونا چاہتا ہے تو پھر اس مدت میں عورت سے الگ رہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے کیا تھا اور اگر اس چار ماہ سے کم مقرر کی ہوئی۔مدت میں اس کے پاس آنا چاہے گا تو کفارہ دے گا۔کیونکہ حانث ہوگا۔تو وہ اس حدیث پر عمل کرے گا اور اسی مثال کے تحت آئے گا۔((من حلف علی یمین فرای غیرھا خیرًا منھا فلیات الذی ھو خیر ولیکفر عن یمینہ)) ترجمہ واضح ہے۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۲۸﴾

اور طلاق والی عورتیں تین حیض تک اپنے تئیں روکے رہیں اور اگر وہ اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کو جائز نہیں کہ اللہ نے جو کچھ ان کے شکم میں پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں اور ان کے خاوند اگر پھر موافقت چاہیں تو اس (مدت) میں وہ ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں اور عورتوں کا حق (مردوں پر) ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے،البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اور اللہ غالب اور صاحب حکمت ہے۔

جب مرد عورت کو طلاق دے تو عورت کو چاہئے کہ جب تک تین حیض نہ آجائیں اور نکاح نہ کرے۔اگر حاملہ ہے تو اس کو بتادینا چاہئے تاکہ ایسانہ ہو کہ کسی کی اولاد کسی اور کی طرف منسوب ہو۔اس لیے عورت اگر حامل ہو تو اسے یہ بات واضح کرنا فرض ہے۔اس مدت کا نام عدت ہے اس دوران اگر مرد چاہے تو عورت کو دوبارہ گھر میں لا سکتا ہے اگر چہ عورت خوش نہ بھی ہو۔اس لیے فرمایا کہ اگر چہ عورتوں کے مردوں پر بھی بہت سے حقوق ہیں مگر اس جگہ مرد ہی کو زیادہ درجہ ہے۔

فائدہ: ائمہ اربعہ نے لونڈی کو اس عموم سے الگ رکھا ہے کہ طلاق کے بعد اس کی عدت دو حیض ہے۔ یعنی آزاد سے آدھی عدت ہے۔اس لے کہ دوسرے یا تیسرے حیض کی مدت کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا اس لیے دوماہ ہی عدت مقرر ہوئی۔حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ لونڈی کی دو طلاق اور دوماہ عدت ہے۔[بروایت ابن جریر، ابو داؤد، ابن ماجه] لیکن ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کا مظاہر راوی بالکل ضعیف ہے۔حافظ دار قطنی نے کہا درست وہ ہے جو سالم اور نافع نے ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے نہ یہ کہ جس کے راوی عطیہ عوفی ہیں۔یہ روایت حضرت عمرؓ بن خطاب سے بھی مروی ہے۔صحابہ رضی اللہ عنہم میں اس باب میں کوئی اختلاف نہ ہے۔ بعض سلف نے کہا کہ لونڈی کی عدت آزاد عورت کی طرح ہے۔اس لیے کہ یہ آیت عام ہے۔اس میں آزاد عورت اور لونڈی برابر ہیں۔ابن عبد البر نے اس کو محمد بن سیرین اور بعض اہل ظاہر سے روایت کیا پھر ضعیف کہا۔ابن ابی حاتم نے کا کہ حضرت اسماءؓ بن یذید بن السکن انصاریہ فرماتی ہیں کہ مجھے عہد رسالت میں طلاق ہوئی جبکہ اس وقت مطلقہ کی کوئی عدت مقرر نہ تھی۔تب یہ آیت نازل ہوئی۔سب سے پہلے آیت عدت طلاق انہی کے حق میں نازل ہوئی۔ابن کثیر فرماتے ہیں مگر اس طریق سے یہ حدیث غریب ہے۔

فائدہ: لفظ قروء میں سلف و خلف ائمہ کا اختلاف ہے کہ کیا اس سے حیض مراد ہے یا طہر مراد ہے۔مالک نے مؤطا میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے کہ اس سے طہر مراد ہے۔پھر ابو بکر بن عبد الرحمٰن سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا میں نے اپنے فقہاء میں سے کسی کو نہیں پایا مگر وہ کہتا تھا کہ قروہ بمعنی اطہار ہے۔حضرت ابن عمرؓ کا بھی یہی قول ہے۔امام مالک بھی اسی کے قائل ہیں۔صحابہؓ اور تابعینؒ کی کثیر جماعت بھی اسی طرف گئی ہے۔فقہائے سبعہ شافعی اور داؤد کا بھی یہی مذہب ہے۔اور امام احمد کا ایک قول بھی یہی ہے۔ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ کریم نے فرمایا:﴿ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ﴾ اس جگہ عدت سے طہر مراد ہے۔اور وہ طہر جس میں طلاق ہوئی، جب وہ بھی شمار ہو گا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ان تین قروء میں سے ایک قرء ہے جن کے متعلق حکم ہے۔اسی لیے ان لوگوں

نے کہا کہ جب تیسرا حیض شروع ہوا تو عدت تمام ہو گئی۔ بیوی شوہر سے الگ ہو گئی۔ کم از کم وہ مدت جس پر تمامِ عدت کا لفظ صادق آئے وہ بتیس ۳۲ دن اور دو لحظے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قروء سے حیض مراد ہے۔ اس صورت میں جب تک تین حیض سے فارغ نہ ہو تب تک عدت مکمل نہ ہو گی۔ کسی نے یہ بھی زیادہ کہا ہے کہ حتیٰ کہ وہ نہا بھی لے۔ اس عدت کی کم تر مدت تینتیس ۳۳ دن ایک لحظہ ہوتی ہے۔ علقمہ نے کہا کہ ہم حضرت عمرؓ بن خطاب کے پاس تھے کہ ایک عورت نے آکر کہا کہ میرے شوہر نے مجھے ایک یا دو طلاق دے کر جدا کر دیا تھا۔ پھر میرے پاس آیا اور میں نے دروازہ بند کیا اور نہانے کے لیے کپڑے اتارے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ نے حضرت ابن مسعودؓ سے کہا میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کی بیوی ہے جب تک کہ اس کے لیے نماز پڑھنا درست نہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ میں بھی اسی کا قائل ہوں۔ خلفائے اربعہ اور صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت سے بھی یہی مروی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا بھی یہی مذہب ہے اور امام احمد سے صحیح روایت ہے امام احمد نے کہا کہ اکابر صحابہؓ یہی کہتے تھے کہ قرو حیض ہے۔ حضرت فاطمہؓ بنت جیش کی حدیث بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے کہا تھا کہ: ((دعي الصلوة ایام اقراء ك)) یعنی زمانہ حیض میں تو نماز نہ پڑھ۔ [بروایت ابو داؤد ونسائی] پس اگر درجہ صحت کو پہنچ جائے تو اس بات پر واضح دلیل ہے۔ کہ اقراء سے حیض مراد ہے۔ لیکن اس کی سند میں منذر کو ابو حاتم نے مجہول غیر مشہور کہا ہے۔ مگر ابن حبان نے ثقات میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ابن جریر نے کہا کہ کلام عرب میں قرء کا اصل معنی کسی مروجہ چیز کا معین وقت میں آمد و رفت کرنا ہے۔ یہ عبارت اس امر کی مقتضی ہے کہ یہ لفظ ان دونوں معنوں کے درمیان ہے۔ اس لیے بعض اہل اصول اسی طرف گئے ہیں۔ اصمعی کا قول بھی یہی ہے۔ کہ قرء بمعنی وقت ہے۔ ابو عمرو بن العلاء نے کہا کہ عرب حیض کو بھی قروء کہتے ہیں اور طہر کو بھی قرء کہتے ہیں۔ اور بیک وقت دونوں کو قروء کہتے ہیں۔ ابن عبد البر نے کہا کہ عربی لغت اور فقہاء کو اس میں کوئی اختلاف نہ ہے کہ قروء سے حیض وطہر مراد ہوتے ہیں۔ اختلاف اس بات میں ہے کہ اس آیت میں قروء سے کیا مراد ہے۔ سو اس میں دو قول ہیں۔ فتح البیان میں دونوں اقوال کو نقل کرنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ اہل کوفہ قروء کو حیض کہتے ہیں۔ اہل مجاز طہر بتاتے ہیں۔ اس میں شک نہ ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے۔ پھر فریقین کی دلیلوں میں تنقید کر کے یہ کہا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ انقضائے عدت تین حیض یا تین طہر سے ہوتا ہے۔ کیونکہ اہل علم کی ایک جماعت نے اس لفظ کو دونوں معانی میں مشترک رکھا ہے۔ اس صورت میں جمع بین الادلہ ہو جائے گا۔ اور اختلاف ختم ہو جائے گا۔

فائدہ: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جو بطن میں ہو وہ نہ چھپائے یعنی حیض یا حمل کے ایک جماعت

تابعینؒ کا بھی یہی قول ہے۔ کسی نے کہا حمل و حیض دونوں مراد ہیں۔ چھپانے سے اس لیے منع کیا ہے کہ بعض احوال میں نقصان زوج اور اس کی حق تلفی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر عورت نے کہا میں حیض سے ہوں جبکہ وہ حائض نہ تھی تو شوہر کا بابت رجوع حق ضائع ہوا۔ یا یہ کہ وہ حائض تھی مگر کہہ دیا کہ میں غیر حائض ہوں اور اس کے ذمے غیر لازم حقِ نفقہ لگا دیا۔ اس طرح حمل کو مخفی رکھنے میں زوج کے رجوع کے متعلق حق کو قطع کرنا ہے۔ یا دعویٰ حمل میں نفقہ واجب کرنا ہے۔ غرضیکہ ایسے مقاصد کے لیے جس میں خاوند کو نقصان ہو اس سے منع فرمایا ہے۔ پھر اس مخفی پر بطور وعید عدم ایمان کو سختی کے انداز میں زیادہ کیا۔ اور یہ شرط بطور قید نہ ہے کیونکہ اگر مومنات نہ بھی ہوں گی تو عورت تب بھی لازم ہو گی۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ عورتوں کو خلاف حق بات پر وعید ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس بات کا مرجع انہی کی طرف ہے کیونکہ ان کے بتائے بغیر یہ بات معلوم نہ ہو سکتی ہے۔ اور غالبًا کوئی دلیل قائم نہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس امر کو انہی پر موقوف رکھا۔ اور اس کو چھپانے پر وعید سنائی تاکہ وہ حق بات کہیں۔ اور خلاف حق کے ظہور سے گریز کریں۔ پھر فرمایا کہ خاوند ان کے پھر لینے کا مستحق ہے۔ یعنی اس عورت سے رجوع کا خاوند کو زیادہ حق ہے جس کے ساتھ رجوع کرنا جائز ہے۔ گویا یہ اس عموم کی تخصیص کرتی ہے جو فرمایا: ﴿ وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ﴾ کہ "مطلقہ عورتیں اپنے نفسوں کے ساتھ انتظار کریں۔" اس لیے کہ یہ قول مثلثات کو بھی شامل ہے اور دوسریوں کو بھی اور افعل التفضیل کے صیغے سے یہ فائدہ ہوا کہ اگر مرد رجوع کرنا چاہے مگر عورت نہ مانے تو اس صورت میں مرد کی بات کو زیادہ درجہ ہو گا اسی کی بات اختیار کی جائے گی۔ یہ مطلب نہ ہے کہ عورت کا بھی رجعت میں حق ہے۔ اور خاوند کا یہ استحقاق مدتِ عدت کے اندر ہے۔ عدت گذرنے پر عورت اپنے نفس پر بااختیار ہے۔ اور نئے نکاح اور نئے مہر والی اور گواہوں کے بغیر وہ اس کے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔ اس میں کسی کا اختلاف نہ ہے۔ رجعت کبھی قول سے ہوتی ہے کبھی فعل (جماع) سے اور اس میں بھی اختلاف نہ کہ رجوع کرنے والے پر احکام نکاہ میں سے کچھ لازم نہ آتا ہے۔ اور یہ رجعت اس وقت درست ہو گی جبکہ اصلاح حال چاہتا ہو لیکن اگر اس کو تنگ کرنے کے لیے رجوع کرنا چاہے تو ایسا کرنا حرام ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا﴾ کہ "انہیں تکلیف دینے کے لیے نہ روکو کہ تم زیادتی کرو۔" بعض نے کہا کہ رجعت تو ہو جائے گی مگر ایسا رجوع کرنے والا حرام کا مرتکب اور ظالم نفس ٹھہرے گا۔ اس صورت میں آیت ازواج کی اصلاح کی طرف ترغیب دینے کے لیے ہو گی صحت رجعت کی شرط کے طور پر نہ ہو گی۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ آیت مطلقات رجیعات کے متعلق ہے۔ بوائن کے متعلق نہ ہے۔ کیونکہ اس آیت کے نزول کے وقت کوئی

مطلقہ باینہ نہ تھی۔جب یہ آیت اتری تب تک مرد رجعت کا حق رکھتا تھا گو کہ سو دفعہ طلاق دی ہو پھر جبکہ اس کے بعد تین طلاق مقرر ہوئیں پھر تین طلاق رجعی و بائن سب ہونے لگی۔اس سے معلوم ہوا کہ جو بعض اہل اصول نے ضمیر کے عمود کے مسئلہ سے یہ دلیل لی ہے کہ آیا یہ ضمیر مذکور متقدم عموم کی مخصص ہے یا نہیں۔یہ مسلک ضعیف ہے۔اس لیے کہ یہ علی الاطلاق ان پر مثال نہ ہے۔پھر فرمایا کہ عورت کا مرد پر ایسا ہی حق ہے جیسے مرد کا عورت پر حق ہے۔پھر ہر ایک کو چاہئے کہ عرف کے موافق ایک دوسرے کا حق ادا کریں۔جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے مرفوعا مروی ہے کہ حضرتؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا کہ عورتوں کے حق مین اللہ سے ڈرو۔تم نے ان کو اللہ کی امانت سے لیا ہے۔اور اللہ کے کلمے سے ان کو ستر کو حلال کیا ہے۔ان پر تمہارا حق یہ ہے کہ جس کو تم ناخوش جانتے ہو وہ انہیں تمہارے بستر پر نہ آنے دیں۔اگر وہ ایسا کرین تو بطور تنبیہ تم ان کو اس حد تک مارو کہ ہڈی نہ ٹوٹنے پائے۔اور تم پر ان کا حق یہ ہے کہ تم ان کو دستور کے مطابق کھانا اور لباس مہیا کرو۔معاویہ قشیری نے کہا اے اللہ کے رسولؐ ہم پر اپنی بیوی کا کیا حق ہے فرمایا جب تو کھائے تو اسے بھی کھلا اور جب تو پہنے تو اسے بھی پہنا۔اس کے منہ پر نہ مارو۔اس کو برا نہ کہو۔اور اس کو صرف شب خوابی میں جدا کرو۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں اپنی عورت کے لیے زینت کو پسند کرتا ہو جس طرح کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے لیے زینت کرے کیونکہ اللہ کریم نے فرمایا:﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ کہ ”ان کے لیے اتنا ہے جتنا ان کے ذمے ہے دستور کے ساتھ۔“ [بروایت ابن جریر وابن ابی حاتم] یہ استدلال بڑا عمدہ ہے۔کرخی نے کہا کہ یہ برابری وجوب میں ہے جنس میں نہ ہے۔عورت اگر مرد کے کپڑے دھودے یا کھانا تیار کرے تو مرد کے لیے لازم نہ ہے کہ وہ بھی اس کے لیے ایسا ہی کرے۔کسی نے کہا یہ مساوات صرف وجوب میں ہے عدد و افراد و صفت وجوب میں نہ ہے۔

فائدہ: مردوں کو عورتوں پر خَلق و خُلق ہر لحاظ سے درجہ ہے۔منزلت و اطاعت امر انفاق و قیام مصالح میں عمدہ ہیں اہل جہاد اور قوت و عقل والے ہیں۔میراث میں بھی ان کا حصہ دوگنا ہے۔عورت پر ان کی اطاعت واجب ہے ان کی مرضی سے زندگی گذارے۔گواہی، دیت، صلاحیت، امامت و قضا پر معاملے میں مقدم ہیں۔وہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری، تیسری اور چوتھی بیوی اور جتنی دل چاہے لونڈیاں رکھ سکتا ہے۔لیکن عورت ایک خاوند کی موجودگی میں دوسرے سے نکاح نہیں کر سکتی ہے۔طلاق و رجعت کا اختیار بھی مرد کے پاس ہے۔اگر اور کچھ بھی فضیلت مرد کو عورت پر نہ بھی ہوتی تو کیا یہ فضیلت کم تھی کہ عورت مرد سے پیدا ہوئی ہے۔ کہ حوا کا آدم کی بائیں پسلی سے پیدا ہونا ثابت ہو چکا ہے۔فرمایا کہ اگر میں کسی کو سجدے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم

دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ بغوی نے اسے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔ یہ بات حضرت معاذ بن جبل کی حدیث میں آئی ہے۔ اور مردوں کی عورتوں پر یہ فضیلت دنیا و آخرت میں ثابت ہے۔ فرمایا: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ کہ "مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس لیے کہ اللہ نے ان کے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس لیے بھی کہ انہوں نے اپنے مالوں سے خرچ کیا۔" فضیلت کا اطلاق عموم کا فائدہ دیتا ہے جو دنیا و آخرت دونوں کو شامل ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيحٌ بِاِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا اِلَّا اَنْ يَخَافَا اَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَاُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَتَرَاجَعَا اِنْ ظَنَّا اَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۲۳۰﴾

طلاق (صرف) دو بار ہے (یعنی جب دو دفعہ طلاق دے دی جائے تو) پھر (عورتوں کو) یا تو بطریق شائستہ (نکاح میں) رہنے دینا ہے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا، اور یہ جائز نہیں کہ جو مہر تم ان کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لے لو، ہاں اگر زن و شوہر کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو اگر عورت (خاوند کے ہاتھ سے) رہائی پانے کے بدلے میں کچھ دے ڈالے تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدیں ہیں ان سے باہر نہ نکلنا اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے باہر نکل جائیں گے وہ گنہگار ہوں گے۔ پھر اگر شوہر (دو طلاقوں کے بعد تیسری) طلاق عورت کو دیدے تو اس کے بعد جب تک عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کر لے اس (پہلے شوہر) پر حلال نہ ہو گی، ہاں اگر دوسرا خاوند بھی طلاق دے دے اور عورت اور پہلا خاوند پھر ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں بشرطیکہ دونوں یقین کریں کہ اللہ کی حدوں کو قائم کر سکیں گے، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کو وہ ان لوگوں کے لیے بیان فرماتا ہے جو دانش رکھتے ہیں۔

فائدہ: اس آیت میں تین مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ایک طلاق پر دوسرا خلع پر اور تیسرا حلالہ پر۔ موضح قرآن میں لکھا ہے کہ عدت کے اندر مرد اگر عورت سے رجوع کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اور پہلی اور دوسری طلاق میں ایسا ہو سکتا ہے تیسری میں رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ اگر شرع کے موافق اس کے حقوق ادا

کر سکے تو درست ہے ورنہ اسے رخصت کر دے۔ تاکہ پھر لڑائی کی نوبت نہ آئے اس ارادے سے اس کو نہ لٹکائے کہ وہ مجبور ہو کر اس کا دیا ہوا مال واپس کر دے۔ اور یہ واپسی کی صورت تب درست ہے جبکہ مرد کی طرف سے حقوق میں تو کوئی کوتاہی نہ ہو مگر فطرتاً حالات موافق نہ ہو سکیں اس وقت سب لوگ مل کر عورت کی طرف سے مرد کو کچھ دے دلا کر راضی کر لیں اور اس سے طلاق دلوادیں اس کو خلع کہتے ہیں۔ تیسری طلاق کے بعد رجوع نہ ہے بلکہ اگر دونوں راضی بھی ہوں تو بھی نئے نکاح سے بھی مسئلہ حل نہ ہوگا۔ جب تک کسی اور خاوند سے نکاح نہ کرے اور اس سے خلوت صحیحہ ہو چکی ہو۔ اس کو حلالہ کہتے ہیں۔

فائدہ: ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت نے دستور جاہلیت کو ختم کر دیا۔ وہ دستور یہ تھا کہ مرد اگر سو دفعہ بھی طلاق دے دیتا مگر عدت میں رجوع کا حق رکھتا تھا۔ اس میں عورتوں پر بڑی پریشانی ہوتی۔ اسلام نے طلاق کی گنتی تین تک مقرر کر دی ہے۔ ایک یا دوسری طلاق میں رجوع ہو سکتا ہے جبکہ تیسری طلاق کے بعد بالکل جدا کر دیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ آیت پہلی آیت کی ناسخ ہے۔ [بروایت ابو داؤد ونسائی] عروہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نہ تجھے طلاق دوں گا نہ تیرے پاس رہوں گا۔ اس عورت نے کہا وہ کیسے ہو گا؟ کہا: تجھے طلاق دوں گا جب مدت مکمل ہونے کے قریب ہوگی تو تجھ سے رجوع کر لوں گا۔ اس نے آنحضرت ﷺ کو اس بات کی اطلاع دی، تب یہ آیت نازل ہوئی کہ طلاق (رجعی) دو دفعہ ہے۔ [بروایت ابن ابی حاتم] اس کو ابن جریر اور عبد بن حمید نے بھی روایت کیا ہے۔ اس آیت کے اترنے پر لوگوں نے طلاق دی تھی یا نہ دی تھی اس متعلق معاملہ درست کر لیا۔ یہ حدیث کئی طریق سے ابن مردویہ، ترمذی اور حاتم میں آئی ہے حاکم نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ پہلے طلاق کا وقت مقرر نہ تھا لیکن اب یہ مقرر ہوا کہ تیسری طلاق کے بعد حق رجوع ختم ہے۔ جب تک کہ اور نکاح نہ کرے۔ قتادہ، سدی اور ابن زید کا یہی قول ہے۔ ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ طلاق رجعی کی تعداد دو ہے۔ مَرَّتَانِ سے یہ معلوم ہوا کہ طلاق مرۃ بعد مرۃ ہونی چاہئے۔ ایک ہی دفعہ دو طلاقیں معتبر نہ ہیں۔ ایک جماعتِ مفسرین اسی طرف گئی ہے۔ پھر جب ایک طلاق دی یا دو دفعہ میں دو طلاق دیں تو عدت کے مکمل ہونے تک اختیار ہے چاہے نیت احسان رجوع کر لے یا چھوڑ دے۔ عدت مکمل ہونے پر وہ جدا ہو جائے گی۔ یہ جدائی بھی احسان کے ساتھ ہونی چاہئے۔ نہ اس کا کوئی حق ضائع کرے نہ اسے نقصان پہنچائے۔ حضرت ابن باسؓ نے فرمایا جب مرد نے عورت کو دو دفعہ طلاق دے دی تو اب تیسری طلاق کے متعلق اللہ سے ڈرو۔ یا دستور کے موافق روکے یا احسان کے ساتھ بغیر ظلم کے رخصت

کردے۔ یعنی اس کو پریشان نہ کرے۔ ابورزین کی مرفوع حدیث میں ہے کہ رخصت کرنا تیسری طلاق دینا ہے۔ [بروایت ابن ابی حاتم، عبد بن حمید، احمد وغیرهم] کسی نے کہا کہ امساک سے مراد دوسری طلاق کے بعد رجوع کرنا ہے۔ اور تسریح سے مراد تیسری طلاق کے بعد ترک رجوع ہے۔ حتیٰ کہ عدت گذر جائے۔ لیکن اظہر یہ ہے کہ بغیر تکلیف کے تیسری طلاق دینا مراد ہے۔ ابو عمرو نے کہا کہ اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ تسریح سے تیسری طلاق مراد ہے۔ اس ارشاد کا یہی مطلب ہے کہ ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ﴾ پھر اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو اس کے لیے حلال نہ ہے...... اس میں اختلاف ہے کہ ایک ہی دفعہ میں دی گی تین طلاقیں تین ہوں گی یا ایک جمہور کے مذہب کے مطابق وہ تین ہوں گی، جبکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد حافظ ابن القیم اور قاضی محمد بن علی الشوکانیؒ اور محققین کی ایک جماعت کا بھی یہی مذہب ہے کہ وہ ایک طلاق ہو گی۔ حضرت عمرؓ بن خطاب نے کسی مصلحت کے تحت اس کو تین طلاق ٹھہرا دیا تھا ورنہ حضرت ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں ایسی طلاق ایک ہی شمار ہوتی تھی۔ یہ بڑا وسیع اختلافی مسئلہ ہے اس باب میں بہت سی کتب اور رسالے لکھے گئے ہیں۔ بڑی لمبی بحث ہے۔ ائمہ اربعہ کا مذہب جمہور کے موافق ہے مگر بعض محققین اس طرف گئے ہیں جس موقف پر شیخ الاسلام ہیں۔ حتیٰ کہ بعض حنفیہ بھی اسی طرف گئے ہیں جیسے "اعلام الموقعین" میں بیان کیا ہے۔ سو جب اللہ کی لہر آئی تو عقول کی لہر کی کیا ضرورت رہی۔ یہ آیت اس بات پر بھی دلیل ہے کہ طلاق دینے پر عورت کو تنگ کر کے اس سے کچھ واپس نہ لے وہ زیادہ ہو یا کم ہو بس جو دیا سو دے دیا۔ لفظ کی تنکیر یہی فائدہ دیتی ہے کہ کچھ بھی نہ لے جب تھوڑا لینا جائز نہیں تو زیادہ لینا یا بالاولیٰ جائز نہ ہو گا۔ پھر جبکہ مہر کی واپسی جائز نہ ہے تو جو مال عورت کی ملکیت ہے وہ لینا کیسے جائز ہو گا۔ یہ خطاب ازواج کو ہے جبکہ بعض نے کہا کہ یہ حکام کو خطاب ہے۔ پہلا قول زیادہ درست ہے۔ یہ آیت اس آیت کی طرح جو فرمایا ﴿وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ "اور نہ روکو ان کو تا کہ تم کچھ لے لو جو تم نے ان کو دیا ہے مگر یہ کہ وہ ظاہری بے حیائی کریں۔" ہاں اگر عورت خوش دلی سے کچھ دے دے تو لینا جائز ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓئًا مَّرِيْٓئًا﴾ کہ "پھر اگر وہ اس میں سے تمہیں دلی خوشی سے کچھ دیں تو اس کو رچتا پچتا کھاؤ۔" یہاں تک مسئلہ طلاق تھا۔

فائدہ: دوسرا مسئلہ یہاں خلع کا بیان ہوا کہ اگر خاوند بیوی میں باہم مخالفت پیدا ہو جائے، عورت خاوند کے حقوق ادا نہ کر سکے بلکہ اسے ناپسند کرے، اس کے ساتھ مناسب برتاؤ نہ کر سکے تو جو مال شوہر نے اس کو دیا تھا

وہ بطور فدیہ نفس دے کر الگ ہو جائے۔ اس مال کو خرچ کرنے میں نہ عورت کو حرج ہے اور نہ خاوند کو وصول کرنے میں کوئی عیب ہے۔ جمہور کا مذہب یہی ہے کہ اگر دونوں خوف کریں کہ اللہ کے قاعدوں کا پاس نہ رکھ سکیں گے تو کچھ لے دے کر باہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں شرع کی روشنی میں یہ جائز ہے۔ کلام پاک نے اسی امر کی وضاحت فرمائی ہے۔ اور جو بعض اہل علم نے کہا کہ شوہر کو وہ مال لینا جائز نہ ہے۔ اور جو لے لیا تو اس پر اسے مجبور نہ کیا جائے یہ قول بہت ساقط الاعتبار ہے۔ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جمیلہ زوجہ ثابت بن قیس آئی اور کہا کہ میں ثابت سے اس کے خلق و دین کی وجہ سے ناراض نہیں ہوں لیکن بغض کی وجہ سے میں اسے دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتی۔ میں اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں۔ فرمایا تو اس کو اس کا باغ واپس کرتی ہے کہا ہاں۔ ثابت سے فرمایا کہ اپنا باغ لے لے اور اس کو ایک طلاق دے دے۔ ابن ماجہ کا لفظ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ باغ لے لے مگر اس سے زیادہ کچھ نہ لے۔ اس باب میں اور بھی بہت سی احادیث مروی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ حکم ایجابی تھا ارشادی نہ تھا۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ جتنا دیا ہے اس سے زیادہ کا مطالبہ نہ کرے کیونکہ اس میں بھی عورت کو نقصان ہے۔ بعض نے کہا کہ قرآن کا ظاہر زائد لینے پر جواز دیتا ہے اس لیے کہ کسی معین مقدار کی قید نہ لگائی ہے۔ مالک و شافعی اور ابو ثور اسی طرف گئے ہیں۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت بھی اسی طرف گئی ہے۔ طاؤس، عطاء، اوزاعی، احمد اور اسحٰق کہتے ہیں زیادہ لینا جائز نہ ہے۔ اس لیے کہ حدیث ابن عباسؓ میں مرفوعاً آیا ہے: ((امرہ ان یا خذ ما ساق ولا یزداد)) [بروایت ابن بطہ وابن مردویہ وابن ماجہ] ابن کثیر نے فرمایا کہ ابن ماجہ کی اسناد جید ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خلع اسی صورت میں جائز ہے جب موافقت کی کوئی صورت نہ ہو سکے۔ ایک کو دوسرے کی صورت اچھی نہ لگے۔ کفر کا خوف ہو۔ اور جو اس لیے خلع طلب کرے کہ آشناؤں کے ساتھ مل کر عیش کریں۔ اور مرد کی طرف سے کوئی قصور نہ ہو تو ایسا خلع طلب کرنا نفاق ہے۔ بلکہ موجب لعنت ہے۔ اور مختلعات کی مذمت میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ ثوبان نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو عورت بغیر کسی تکلیف کے طلاق مانگے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ خلع کرنے والی منافقات ہیں۔ [بروایت ابن جریر] ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن ہے۔ حاکم نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ بروایت ابو داؤد احمد، ابن ماجہ، بیہقی ایضاً عقبہ بن عامر کا لفظ یہ ہے کہ خلع کرنے والیاں الگ تھلگ رہنے والیاں منافقات ہیں۔ [بروایت ابن جریر] اس کی سند ضعیف ہے۔ اس کو امام احمد نے بھی ابی ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ کے نزدیک ابن عباسؓ کا مرفوعاً لفظ یوں ہے کہ نہیں طلاق مانگتی کوئی عورت اپنے خاوند سے بغیر کسی گناہ کے پھر جنت کی ہوا بھی

پائے۔خالانکہ جنت کی ہوا چالیس سال کی مسافت سے پائی جاتی ہے۔سلف کی ایک جماعت اور ائمہ خلف نے کہا کہ جب تک مخالفت عورت کی طرف سے نہ ہو تب تک خلع جائز نہ ہے۔جبکہ ایسا ہو تو مرد کو چاہئے کہ کچھ فدیہ لے کر اس کو خود سے علیحدہ کردے۔اس قول کی دلیل پر ﴿ اِلَّا اَنْ یَخَافَا اَنْ لَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ﴾ مگر "یہ کہ وہ دونوں اللہ کی حدود قائم نہ رکھ سکیں گے۔"معلوم ہوا کہ اس کے علاوہ کسی اور حالت میں خلع کرنا درست نہ ہے۔حضرت ابن عباسؓ، طاؤس، ابراہیم، عطاء حسن اور جمہور کا یہی قول ہے۔مالک اور اوزاعی نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر شوہر نے اس سے کچھ لے لیا ہے اور اس میں عورت کو نقصان ہے تو شوہر پر وہ واپس کرنا واجب ہے۔اور یہ طلاق رجعی ہو گی۔مالک کہتے ہیں کہ ہم نے لوگوں کو اسی بات پر پایا ہے۔شافعی کہتے ہیں کہ خلع جب حالت شقاق میں جائز ہوا تو بحالت اتفاق بالاولیٰ جائز ہو گا۔سارے اصحاب شافعی کا بھی یہی قول ہے۔مگر اوپر والا موقف زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔مزنی کہتے ہیں کہ خلع اس قول سے منسوخ ہے۔﴿وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْہُ شَیْئًا﴾ "اور تم ان کو ایک خزانے کا ڈھیر دے چکے ہو پھر اس میں سے کچھ نہ لو۔"ابن کثیر نے فرمایا یہ قول ضعیف ہے اور یہ ماخذ قائل پر مردود ہے۔شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا یہ قول اجماع سے خارج ہے دونوں آیات میں کوئی باہم منافات نہ ہے۔ابن جریر نے کہا کہ یہ آیت ثابتؓ بن قیس کے متعلق نازل ہوئی ہے۔یہ حدیث کئی طریق سے مروی ہے ان کی بیوی کا نام جبیبہ بن عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔بخاری میں اس کا نام جمیلہ مذکور ہے جبکہ مؤطا میں حبیبہ بنت سہیل انصاری کہا ہے۔حضرت عائشہ کا لفظ یہ ہے کہ ثابت نے اس کو مارا تھا اس کی وجہ سے اس کے بعض جسم کو نقصان ہوا اس نے آنحضرت ﷺ سے ذکر کیا تو آپ علیہ السلام نے ثابت کو بلا کر کہا کہ اس سے کچھ مال لے کر اس کو طلاق دے دو۔کہا: کیا یہ ہو سکتا ہے؟ فرمایا: ہاں ہو سکتا ہے۔کہا: میں نے اس کو دو باغ دیئے ہیں جو اس کی ملکیت میں ہیں۔فرمایا: ان دونوں کو لے لو اور اس کو چھوڑ دو اس نے ایسا ہی کیا۔ [بروایت ابن جریر وھذا لفظہ و ابوداؤد] ابن جریر کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جمیلہ سے پوچھا کہ تو اس کی کسی بات پر نہ خوش ہے۔کہا نہ اس کے دین پر نہ خلق پر بلکہ مجھے اس کی بدصورتی بری لگتی ہے۔کہا کیا تو اس کا باغ واپس دے دے گی اس نے کہا جی ہاں۔اس نے وہ باغ لوٹا دیا اور آپؐ نے دونوں میں تفریق کر دی۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ سب سے پہلے اسلام میں یہی خلع ہوا تھا۔وہ آپؐ کے پاس آئی اور کہا اے اللہ کے رسولؐ کوئی چیز میرے اور اس کے سر کو یکجا نہ کرے گی میں نے خیمہ کی ایک جانب سے دیکھا وہ کچھ لوگوں کے ساتھ آرہا تھا۔سب سے پست قد سب سے سیاہ رنگ اور سب سے بدصورت ہے۔شوہر نے کہا کہ میں نے اس کو اپنا افضل

مال جو میرا باغ تھا وہ دیا ہے۔ یہ اس کو لوٹا دے فرمایا تو کیا کہتی ہے کہا ہاں اگر اور بھی کچھ چاہے تو بھی میں دوں گی۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے ان کے درمیان تفریق کرادی۔ بروایت ابن جریر۔ معلوم ہوا کہ یہ امر ارشادی نہیں بلکہ ایجابی تھا۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ زیادہ دینے کا وعدہ خود عورت نے اپنی طرف سے کیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے نہ فرمایا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے تو صرف باغ واپس دلوایا تھا۔ پھر یہ بھی ثابت نہ ہوا کہ اس نے کچھ زیادہ ادا کیا ہو اور آپؐ نے اس کو مقرر رکھا ہو۔ بلکہ پہلی حدیث میں صاف طور پر منع فرمادیا ہے۔ اور آیت کا اطلاق حدیث مذکور سے مقید ہے۔ مگر جمہور کہتے ہیں کہ آیت: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ﴾ کہ ”ان دونوں پر کچھ حرج نہ ہے کہ اس چیز میں جو عورت اپنے بدلے میں دے عام ہے۔“ لیکن یہ آیتِ باب کے کچھ منافی نہ ہے۔ کہ اس سے حجت لی جائے۔ بلکہ ربیع بن انس کی قراءت یوں ہے: ﴿فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ مِنْهُ﴾ اسی لیے اس کے بعد فرمایا کہ تم اللہ کے مقرر کردہ قاعدے سے آگے مت بڑھو اگر ایسا کرو گے تو ظالم ٹھہرو گے۔ ابن ماجہ کے نزدیک عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے یوں آیا ہے کہ ثابت ایک بدشکل آدمی تھے اس کی بیوی حبیبہ نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! واللہ اگر اللہ کا خوف نہ ہوتا تو جب وہ میرے پاس آیا تھا تو میں اس کے منہ پر تھوک دیتی۔ [الحدیث] اس حدیث میں بھی یہ لفظ مذکور ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ تفریق آنحضرتؐ کے حکم سے ہوئی۔

فائدہ: ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ائمہ میں اس بات پر اختلاف ہے کہ کیا خاوند کو دی ہوئی مقدار سے زیادہ لینا جائز ہے یا نہیں۔ جمہور کہتے ہیں کہ جائز ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن عمرؓ، مجاہد، عکرمہ، ابراہیم نخعی، قبیصہ، حسن بن صالح، عثمان بتی کا بھی یہی قول ہے۔ مالک، لیث، شافعی اور ابو ثور کا بھی یہی مسلک ہے۔ ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اصحاب ابو حنیفہ نے کہا اگر اصرار عورت کی طرف سے ہے کہ تو جتنا دیا ہے اتنا ہی لے زیادہ لینا درست نہ ہے اگر زیادہ لیا ہے تو قضا میں جائز ہے۔ اور اگر زوج کی طرف اصرار ہے تو کچھ بھی نہ لے اگر لے لیا ہے تو قضا میں جائز ہے۔ امام احمد، ابو عبید اور ابن راہویہ کا قول یہ ہے کہ زیادہ لینا درست نہ ہے تابعینؒ کی ایک جماعت بھی اسی طرف گئی ہے۔ ابن کثیر بھی اسی کے قائل ہیں۔ عطاء کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے جتنی رقم دی ہے اتنی سے زیادہ لینا مکروہ سمجھا ہے۔

فائدہ: ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر کسی شخص نے عورت کو دو طلاقیں دیں پھر اس عورت نے مرد سے خلع کر لیا تو اگر وہ مرد چاہے تو پھر اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کریم نے فرمایا کہ طلاق دو دفعہ ہے۔ عکرمہ نے کہا کہ ہر وہ چیز جسے مال نے جائز رکھا وہ طلاق نہ ہے۔ ابراہیم بن سعد بن ابی وقاص نے حضرت ابن

عباس سے یہی مسئلہ پوچھا تھا انہوں نے کہا کہ خلع طلاق نہ ہے۔ اللہ نے آیت کے اول میں بھی طلاق کا ذکر کیا اور آخر میں بھی اور خلع کا ذکر درمیان میں ہے خلع کچھ نہ ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ کہ "طلاق دو دفعہ ہے پھر معروف طریقے سے روکنا ہے اور احسان سے رخصت کرنا ہے۔" پھر یہ پڑھا: ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾ کہ "پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو اس کے بعد اس کے لیے حلال نہ ہے حتی کہ وہ اس کے علاوہ کسی مرد سے نکاح کر لے۔" جو حضرت ابن عباسؓ کا مذہب ہے کہ خلع طلاق نہ ہے۔ بلکہ فسخ ہے۔ حضرت عثمانؓ، ابن عمرؓ، طاؤس، عکرمہ، احمد، ابن راہویہ، ابو ثور، داؤد ظاہری اور شافعی بھی اسی طرف مائل ہیں۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ آیت کا ظاہر بھی یہی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ خلع طلاق بائن ہے مگر یہ کہ زیادہ دینے کی نیت کرے۔ ایک جماعت صحابہؓ و تابعینؒ مالک، ابو حنیفہ اور شافعی کا نیا قول بھی یہی ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک یا دو طلاق کی نیت کی ہے یا چھوڑ دیا ہے تو یہ ایک ہی طلاق بائنہ ہوئی اور اگر تین طلاقوں کی نیت کی ہے تو تین طلاقیں ہوئیں۔ شافعی کا تیسرا قول یہ ہے کہ جب خلع طلاق کے لفظ میں نہ ہوگا اور نیت سے نہ ہوگا تو وہ بالکل کچھ چیز نہ ہے۔ شوکانیؒ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ خلع طلاق ہے مگر پھر اس کو فسخ نکاح ٹھہرا دیا۔

فائدہ: ائمہ اربعہ اور ابن راہویہ نے کہا کہ حائضہ مختلعہ کی عدت مطلقہ کی طرح تین حیض ہے۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی کثیر جماعت اسی طرف گئی ہے۔ ترمذی نے کہا کہ اکثر اہل علم صحابہؓ وغیر ہم کا یہی قول ہے کہ ان کا ماخذ یہ ہے کہ جب خلع طلاق ہے تو اس کی عدت بھی مطلقہ کی سی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مختلعہ کی عدت ایک حیض ہے۔ اس میں استبراء رحم ہو جاتا ہے۔ عثمان، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، عکرمہ اور خلع کو فسخ کہنے والے حضرات اسی طرف گئے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ثابت بن قیس کی بیوی کو ایک ماہ عدت کا حکم دیا تھا اس کو ابو داؤد نے روایت کیا۔ ترمذی نے کہا یہ حسن غریب ہے۔ ترمذی کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ ربیع بنت معوذ نے عہد نبوتؐ میں خلع کیا، آنحضرت ﷺ نے اس کو ایک حیض کی عدت کا حکم دیا یا وہ حکم دی گئی۔ ترمذی نے کہا صحیح یہ ہے کہ وہ حکم کی گئی۔ ابن ماجہ کا لفظ یہ ہے کہ عثمانؓ نے ربیع (مذکورہ) سے کہا تجھ پر کچھ عدت نہ ہے۔ مگر یہ کہ تو حال میں خاوند کے پاس گئی ہو تو ایک حیض تک اس کے پاس رہ۔ عثمانؓ نے یہ حکم رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کے موافق دیا تھا یعنی آنحضرت ﷺ نے مریم مغالیہ زوجہ ثابت بن قیس کو یوں ہی حکم دیا تھا جبکہ اس نے اپنے خاوند سے خلع کیا تھا۔ ربیع کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ میں نے سنا کہ آنحضرت ﷺ نے ثابت بن قیس کی بیوی کو

ایک حیض عدت کا حکم دیا۔ فتح البیان میں بھی اسی کو ترجیح دی گئی ہے۔ کہا کہ حق یہی ہے کہ سنتِ صحیحہ عموم قرآن کی مخصص ہے۔

فائدہ: اور عورت سے خلع کرنے والے مرد کو دوران عدت مختلعہ سے بغیر اس کی رضا کے رجوع کرنا جائز نہ ہے۔ ائمہ اربعہ اور جمہور علماء اسی طرف گئے ہیں۔ اس لیے کہ وہ مال خرچ کر کے اپنے نفس کی مالک بن چکی ہے۔ ابن ابی اوفی اور ماہان حنفی نے کہا اگر وہ مال دوبارہ اس کو لوٹا دے تو دوران عدت بغیر رضا کے بھی رجعت درست ہو گی۔ ابو ثور نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ثوری نے کہا کہ اگر خلع لفظ طلاق کے بغیر ہوا ہے تو اب فراق ہوا، اب خاوند کو بیوی کی طرف کوئی رستہ نہ ہے۔ اور اگر بنام نہاد طلاق ہے تو وہ عدت تک رجعت کا مالک ہے۔ داؤد ظاہری بھی اسی طرف گئے ہیں۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ مختلع کو مختلعہ سے عدت میں نکاح کرنا جائز ہے۔ جبکہ ایک گروہ نے کہا کہ جائز نہ ہے۔ ابن کثیر نے کہا کہ یہ قول شاذ و مردود ہے۔ رہی یہ بات کہ آیا مختلع اس کو دوران عدت دوسری طلاق بھی دے سکتا ہے یا نہیں اس متعلق علماء کے تین اقوال ہیں۔ ایک یہ قول ہے کہ وہ اب اسے طلاق نہیں دے سکتا کیونکہ اب وہ اس سے جدا ہو گئی ہے اور اپنے نفس کی مالک ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، ابن زبیر، جابر بن یزید، حسن بصری، شافعی، احمد، ابن راہویہ اور ابو ثور اسی کے قائل ہیں۔ مالک کا دوسرا قول یہ ہے کہ اگر خلع کے ساتھ ہی طلاق بھی کہہ دی اور دونوں کے درمیان سکوت نہ کیا تو طلاق ہو جائے گی۔ اور اگر درمیان میں سکوت کیا تو طلاق نہ ہو گی۔ ابن عبد البر نے کہا حضرت عثمان سے اسی طرح مروی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ طلاق ہر حال میں ہو گی جب تک کہ عدت میں رہے۔ ابو حنیفہ، حنفیہ، ثوری، اوزاعی، ابن مسعود اور ابو الدرداء وغیرھم اسی کے قائل ہیں مگر ابن عبد البر کہتے ہیں کہ ان دو صحابہؓ سے یہ بات ثابت نہ ہے۔ پھر اللہ کریم نے اس کے بعد فرمایا کہ مذکورہ شرائع اللہ کے قواعد ہیں ان سے تجاوز نہ کرنا چاہیے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے حدیں مقرر کی ہیں ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور اللہ نے فرائض مقرر کیے ہیں ان کو ضائع نہ کرو۔ اللہ نے محارم مقرر کیے ہیں تم ان کی بے حرمتی نہ کرو۔ اور بغیر نسیان کے کچھ چیزوں سے سکوت کیا ہے تم ان کے متعلق سوال نہ کرو۔ بعض نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ تین طلاق کو ایک جملے میں جمع کرنا حرام ہے۔ مالکیہ اور ان کے ہم مسلک لوگ اسی طرف مائل ہیں۔ ان کے نزدیک سنت یہ ہے کہ ایک طلاق دے اللہ کریم کے فرمان کی وجہ سے کہ ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ﴾ کہ "طلاق دو دفعہ ہے۔" پھر فرمایا کہ ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ کہ "یہ اللہ کی حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔" پھر اس

قول کی محمود بن لبید کی حدیث سے تائید کی ہے۔ جو نسائی میں اس لفظ سے مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں اکٹھی دیں ہیں تو آپ علیہ السلام غصے میں آکر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیلا جارہا ہے اور میں تمہارے درمیان ہوں حتی کہ ایک آدمی نے کہا اگر حکم ہو تو میں اس شخص کو قتل کر دوں مگر اس کی سند میں انقطاع ہے۔

فائدہ: تیسرا مسئلہ حلالہ کا ہے۔ جب کوئی شخص دو طلاق دینے کے بعد تیسری طلاق دے دے تو وہ اس پر حرام ہو جاتی ہے۔ جب تک وہ دوسرے شخص سے شادی نہ کرے اور وہ اس سے صحبت نہ کرے۔ لیکن اگر اس نے اس سے نکاح نہ کیا اور بصورت لونڈی اس سے جماع کیا ہے تو بھی پہلے مرد کے لیے حلال نہ ہوگی۔ کیونکہ اس صورت میں یہ اس کا شوہر نہ ہوا۔ اسی طرح اگر نکاح تو کر لیا مگر جماع نہ کیا تو بھی پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔ بہت سے فقہاء میں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت سعید بن میتب کا یہ قول ہے کہ وہ صرف نکاح ثانی سے زوج اول کے لیے حلال ہو جائے گی۔ بلکہ اس قول کی صحت میں نظر ہے۔ اگرچہ ابن عبد البر نے "استذکار" میں اس کا ذکر کیا ہے کیونکہ امام احمد کے بطریق سعید بن میتب حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ دوسرے کا شہد نہ چکھ لے۔ ابن میتب سے ابن جریر کا اس حدیث میں مرفوعاً لفظ یہ ہے کہ لَا حتی تذوق عسیلۃ ویذوق عسیلتھا۔ اسکو ابن ماجہ اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے، سو یہ حکایت مذکور کے خلاف ہے اور یہ بات بعید ہے کہ راوی بغیر کسی مستند کے مخالفت روایت کرے۔ امام احمد و نسائی کا ابن عمرؓ سے دوسرا لفظ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے عورت کو تین طلاقیں دے دیں، پھر اس عورت نے دوسرے مرد سے نکاح کیا، دروازہ بند کر کے پردہ گرایا لیکن دخول نہ کیا، پھر طلاق دے دی، تو کیا وہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو گئی؟ فرمایا: وہ اول پر حلال نہ ہو گی حتی کہ دوسرے کا شہد چکھ نہ لے۔ یہ لفظ احمد کا ہے، ان کی تیسری روایت میں حضرت انس بن مالک سے یوں آیا ہے کہ قال لا حتی یکون الاخر قد ذاق من عسیلتھا وذاقت من عسیلتہ۔ ابن جریر کے ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً لفظ یوں ہے کہ: حتی یذوق الاخر من عسیلتھا، ابن جریر کا حضرت عائشہ سے دوسرا لفظ ہے کہ: لا حتی یذوق من عسیلتھا کما ذاق الاول، اس کو شیخین اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ ان کا تیسرا لفظ حضرت عائشہ سے اس طرح ہے: قال لا تحل زوجھا الاول حتی یذوق الاخر عسیلتھا وتذوق عسیلتہ۔ اس کو ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے۔ صحیحین

میں یہ حدیث کئی طریق سے مروی ہے۔عائشہؓ نے کہا کہ رفاعہ قرظی نے ایک عورت سے نکاح کیا، پھر اسے طلاق دے دی،اس نے دوسرا نکاح کیا، پھر آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ وہ میرے پاس نہیں آتا اور اس کے پاس نہیں ہے مگر کپڑے کے لتے کی طرح۔ فرمایا: لا حتی تذو فی عسیلته و یذوق عسیلتك ۔امام احمد کی روایت میں آیا ہے کہ یہ شکایت عبدالرحمٰن بن زبیر کی نسبت تھی۔یعنی وہ جماع پر قادر نہ ہے۔ فرمایا: تو چاہتی ہے کہ رفاعہ کے پاس پھر جائے یہ نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ وہ تیرا شہد اور تو اس کا شہد چکھ لے۔اس کو شیخین اور نسائی نے بھی روایت کیا۔ یہ قصہ بھی کئی طریق سے امام مالک وغیرہ کے نزدیک آیا ہے۔ غرضیکہ بات یہ ثابت ہوئی کہ فقط خلوت کافی نہ ہوگی بلکہ صحبت لازمی ہے۔زوج ثانی سے یہ مقصود ہے کہ وہ عورت میں راغب ہو۔ اور ہمیشہ ساتھ رہنے کی نیت سے نکاح کرے۔کیونکہ تزویج میں یہی چیز مشروع ہے۔امام مالک نے یہ بھی شرط رکھی ہے کہ جماع مباح ہو محرم نہ ہو یا وہ صائمہ یا معتکفہ یا حائض یا نفاس میں نہ ہو یا زوج ثانی صائمہ ،معتکفہ، یا محرم نہ ہو۔ان صورتوں کی موجودگی میں وہ پہلے خاوند کے لیے حلال نہ ہوگی۔اسی طرح اگر اس کا دوسرا خاوند ذمی ہے تو اس کے نکاح کرنے سے وہ زوج اول مسلم کے لیے حلال نہ ہوگی۔کیونکہ مالک کے نزدیک کفار کے نکاح باطل ہیں۔ حضرت حسن بصری نے یہ شرط بھی زیادہ کی ہے کہ زوج ثانی کو انزال بھی ہو جائے۔شاید یہ بات لفظ عسیلہ سے سمجھی ہے مگر اس صورت میں یہ بھی لازم آئے گا کہ عورت بھی مُنزل ہو مگر عسیلہ سے منی مراد ہے۔اس لیے کہ احمد اور نسائی نے حضرت عائشہ علیہا السلام سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ ((اَلا ان العسیلة الجماع)) کہ شہد سے صحبت مراد ہے انزال مراد نہ ہے۔پھر اگر دوسرے خاوند نے اس نیت سے نکاح کیا کہ پہلے خاوند کے لیے حلال ہو جائے تو محلل ٹھہرا۔ احادیث میں محلل کی بہت مذمت آئی ہے۔اس پر لعنت کی گئی ہے۔اور اگر بوقت نکاح وہ اس امر کی وضاحت کرے گا تو جمہور ائمہ کے نزدیک اس کا نکاح ہی نہ ہوگا۔باطل ہوگا۔ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے محلِل اور محلَل لہ پر لعنت فرمائی ہے۔ [بروایت احمد ونسائی] ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔صحابہؓ اہل علم کا اسی پر عمل ہے ان میں سے حضرت عمرؓ، عثمانؓ، ابن عمرؓ ہیں اور فقہاء تابعینؒ سے یہی مروی ہے حضرت علی، ابن مسعود اور ابن عباس سے بھی یوں ہی وارد ہے۔ حضرت ابن مسعود کا لفظ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: لعن اللہ المحلِل والمحلل له ۔[بروایت احمد] یعنی اللہ محلِل زوج ثانی اور محلل لہ زوج اول پر لعنت کرے۔ان کا تیسرا لفظ مرفوعاً یہ ہے کہ محلل اور محلل لہ بزبان محمد ﷺ قیامت تک ملعون ہیں۔ [بروایت احمد، نسائی] عقبہ بن عامر

نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں کرائے کے سانڈ کے متعلق خبر نہ دوں؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: وہ محلل ہے اللہ محلل اور محلل لہ پر لعنت کرے۔ [بروایت ابن ماجہ] ابن ماجہ کا دوسرا لفظ حضرت ابن عباسؓ سے پورا مرفوعاً یوں ہے کہ: ((لعن رسول اللہ ﷺ المحلل والمحلل لہ)) اس حدیث کو امام احمد نے حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم عہد رسالت میں اس کو زنا تصور کرتے تھے۔ حاکم نے کہا یہ اسناد صحیح ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ محلل اور محلل لہ میرے پاس آئیں گے تو میں اس کو رجم کروں گا۔ [رواہ الاثرم وابن ابی شیبہ] ایک آدمی نے حلالہ کیا یعنی زوج اول پر حلال کرنے کے لیے اس پر حضرت عثمانؓ نے ان کے درمیان تفریق کرادی۔ حضرت علیؓ اور ابن عباس وغیرھما سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔ اس باب میں بہت سی احادیث مروی ہیں جن میں سے سات ابن کثیر نے ذکر کی ہیں۔ ابن القیم نے "اعلام الموقعین" اور "اغاثۃ اللھفان" میں اس بحث پر بڑا زور دیا ہے اور ان کو بڑا علامتی طور پر ملعون ثابت کیا ہے۔ پھر اللہ کریم نے فرمایا کہ پھر اگر دوسرے خاوند نے بعد دخول طلاق دے دی ہے اور پہلا خاوند اور یہ عورت خیال کریں کہ باہم حدود کو قائم رکھ سکیں گے تو ان پر دوبارہ نکاح کرنے میں کچھ حرج نہ ہے۔ پھر اگر انہیں یقینِ اصلاح نہ ہے یا دونوں میں سے ایک یا دونوں تردد میں ہیں تو اس صورت میں نکاح کرنا معصیت وحرام میں پھنسنے کے مترادف ہوگا۔ یہ شرائع اللہ کے احکام ہیں جو اس نے جاننے والوں کے لیے بتائے ہیں۔ رہا یہ مسئلہ کہ اگر ایک شخص نے عورت کو دو یا ایک طلاق دے دی۔ پھر عدت پوری ہونے پر اس نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا۔ پھر دخول کے بعد دوسرے خاوند نے اس کو طلاق دے دی عدت پوری ہونے پر پہلے خاوند نے اس سے نکاح کر لیا تو کیا وہ اس کو ایک طلاق کے اختیار سمیت مل سکتی ہے یا نہیں۔؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ مالک، شافعی اور احمد اور ایک گروہ صحابہؓ نے کہا کہ ہاں وہ اسکو ایک طلاق کے اختیار سمیت مل سکتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دوسرے خاوند نے پہلی طلاقوں کو ساقط کر دیا اب وہ تینوں طلاقوں کے اختیار سے ملے گی۔ ابو حنیفہ کا مذہب یہی ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جب دوسرا شوہر تینوں طلاقوں کو ساقط کر سکتا ہے تو اس سے کم کو بالاولیٰ ساقط کر سکتا ہے۔ واللہ اعلم. ابن المنذر نے کہا علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب کسی شخص نے بیوی کو تین طلاقیں دیں اس نے عدت گذرنے پر نکاح کر لیا، پھر دوسرے خاوند نے دخول کے بعد اس کو طلاق دے دی پھر پہلے خاوند نے اس سے نکاح کر لیا تو وہ عورت پہلے خاوند کے پاس تین طلاق کے اختیار سمیت آئے گی۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۳۱﴾

اور جب تم عورتوں کو (دود فعہ) طلاق دے چکو اور انکی عدت پوری ہو جائے تو انہیں یا تو حسن سلوک سے نکاح میں رہنے دو یا بطریق شائستہ رخصت کر دو، اور اس نیت سے ان کو نکاح میں نہ رہنے دینا چاہئے کہ انہیں تکلیف دو اور ان پر زیادتی کرو، اور جو ایسا کریگا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا اور اللہ کے احکام کو ہنسی (اور کھیل) نہ بناؤ اور اللہ نے تم کو جو نعمتیں بخشی ہیں اور تم پر جو کتاب اور دانائی کی باتیں نازل کی ہیں جن سے وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے ان کو یاد کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس آیت میں یہ حکم دیا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق رجعی دے تو اسے چاہئے کہ امکان کی حد تک عدت میں اسے اپنے پاس لے آئے یعنی رجوع کرے۔ دستور سے یہ مراد ہے کہ بوقت رجوع گواہ بنالے۔ اور اچھے سلوک کی نیت سے رجوع کرے۔ اگر ایسا نہیں تو اسے چھوڑ دے حتی کہ عدت مکمل ہو جائے۔ پھر اس کو عدت سے رخصت کردے مخالفت ودشمنی اور لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آنے دے۔ حضرت ابن عباسؓ، مجاہد، مسروق، حسن، قتادہ، ضحاک اور ربیع وغیرھم نے کہا کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا پھر جب اس کی عدت مکمل ہونے کے قریب ہوتی تو تکلیف دینے کے لیے اس سے رجوع کر لیتا تا کہ یہ کہیں اور نکاح نہ کر سکے۔ پھر طلاق دیتا جب پھر عدت تکمیل کو پہنچنے لگتی تو پھر طلاق دے دیتا تا کہ عدت کی مدت لمبی ہو جائے۔ اللہ کریم نے اس چیز سے منع فرمایا اور یہ وعید سنائی کہ ایسا شخص ظالم نفس ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف عمل کرنے والا ہے۔ ابن جریر نے ابو موسیٰ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اشعریین پر ناراض ہوئے میں نے وجہ پوچھی تو فرمایا تم میں لوگ ادھر طلاق دیتے ہیں ادھر رجوع کر لیتے ہیں۔ یہ کوئی مسلمانوں کی طلاق نہ ہے۔ عورت کو عدت سے قبل طلاق دو اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ۔ مسروق نے کہا یہ وہ شخص ہے جو بغیر گناہ عورت کو طلاق دیتا ہے۔ اس کو پریشان کرتا ہے اور اس کی عدت کو طویل کرنا چاہتا ہے۔ حضرت حسن، قتادہ، ربیع مقاتل اور عطاء خراسانی کا قول ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو طلاق دے کر کہتا ہے کہ میں نے تو مذاق کیا تھا یا غلام آزاد کر کے یا نکاح کر کے اس کو کھیل مذاق میں اڑا دیتا ہے۔ اللہ نے طلاق کو اس پر لازم کر دیا ہے۔ فرمایا اللہ کی آیات کو

مذاق نہ بناؤ۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس کے حق میں ہے جو طلاق کے ارادہ کے بغیر کسی ہنسی مذاق میں طلاق دے دیتا ہے اللہ کریم نے اس پر وہ طلاق شمار کی ہے کہ اب مذاق کرتے رہو۔ حضرت عبادہ بن صامت فرما تے ہیں کہ کوئی شخص کسی کو کہتا ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کا نکاح تجھ سے کیا پھر اس کو مذاق کہتا ہے یا کسی کو کہتا ہے کہ میں نے تمہیں آزاد کردیا بھی ہنسی پر ٹالتا ہے اس پر اللہ کریم نے یہ آیت نازل کی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع حدیث یہ ہے کہ تین چیزیں ہیں جو کہ ہنسی اور سنجیدگی ہر حال میں ہو جاتی ہیں۔ نکاح، طلاق اور رجعت۔[بروایت ابو داؤد،ابن ماجہ] ترمذی نے اس کو حسن غریب کہا ہے۔ پھر اللہ کریم نے یہ احسان ذکر فرمایا کہ ہم نے تم پر کتاب وسنت اتاری ہیں تم اس نعمت کو مت بھولو۔ اس جگہ کتاب سے قرآن پاک اور حکمت سے سنت مراد ہے۔ ابن کثیر نے ہر جگہ لفظ حکمت کو سنت سے تعبیر کیا ہے۔ فتح البیان کا بیان ہے کہ مفسرین کے نزدیک حکمت سے مراد ہر وہ سنت ہے جو نبی علیہ السلام نے جاری کیا ہے۔ امام شافعی بھی اسی کے قائل ہیں۔ معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن اللہ کا نازل کردہ ہے اسی طرح حدیث بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ قرآن کی باقاعدہ تلاوت کی جاتی ہے جبکہ حدیث کی اس طرح تلاوت نہیں کی جاتی ہے۔ اور وحی اور حجت ہونے میں دونوں برابر ہیں۔ جیسے فرمایا :﴿وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ۝ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى﴾ کہ "وہ خواہش نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ وحی ہے جو ان کی طرف وحی کی جاتی ہے۔" حدیث میں ہے کہ ((اوتیت القرآن و مثلہ معہ)) کہ "مجھے قرآن بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ایک اور مثل بھی۔" اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ منکر الحدیث کا حکم منکر القرآن کا سا ہے۔ جن کو قرآن وحدیث مل گیا اور وہ مذاہب واقوال رجال کے مقابلے میں اسے تسلیم نہیں کرتے ان پر کفر کا خدشہ ہے جبکہ وہ اس کی مخالفت وجھگڑا کرنے والے ہیں صرف تاویل کرنے والے نہیں۔ واللہ اعلم. اس آیت پر دوسرے پارے کا ربع ثالث تمام ہوا۔ وللہ الحمد.

وَإِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعۡضُلُوهُنَّ أَنۡ يَنكِحۡنَ أَزۡوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُم بِالۡمَعۡرُوفِ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللَّهِ وَالۡيَوۡمِ الۡآخِرِ ذَٰلِكُمۡ أَزۡكَىٰ لَكُمۡ وَأَطۡهَرُ وَاللَّهُ يَعۡلَمُ وَأَنتُمۡ لَا تَعۡلَمُونَ ﴿۲۳۲﴾

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو ان کو دوسرے شوہروں کے ساتھ جب وہ آپس میں جائز طور پر راضی ہو جائیں نکاح کرنے سے مت روکو، اس (حکم) سے اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں اللہ اور روز آخرت پر یقین رکھتا ہے، یہ تمہارے لئے نہایت خوب اور بہت پاکیزگی کی بات ہے، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

فائدہ: یہ حکم عورت کے ورثاء کو ہے کہ ایسی صورت مین اس کی خوشی کو نکاح میں ملحوظ رکھیں اگر چہ تمہاری نظر میں کوئی اور مقام مناسب ہو۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس شخص کے حق میں اتری ہے جس نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاق دیں۔ پھر عدت گذرنے پر چاہا کہ دوبارہ اسی سے نکاح کرے اور وہ عورت بھی اسی بات کو پسند کرتی ہے تو عورت کے ولیوں کو یہ نا چاہئے کہ عورت کو اس سے منع کریں۔ مسروق، نخفی، زہری اور ضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آیت کا ظاہر یہی ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ عورت خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی ولی کا ہونا لازم ہے۔ ترمذی اور ابن جریر نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ کوئی عورت کسی عورت سے نکاح نہ کرے اور کوئی عورت خود اپنا نکاح نہ کرے۔ جو عورت اپنا نکاح خود کرے وہ زانیہ ہے۔ دوسرے اثر میں اس طرح ہے کہ نہیں ہوتا نکاح مگر ولی مرشد اور دو شواہدوں کے ساتھ۔ اس مسئلے میں علماء کا بہت اختلاف ہے۔ اس کا اصل مقام کتب فروع ہیں۔ ابن کثیر نے اس مسئلے کی سیر حاصل بحث "کتاب الاحکام" میں کی ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ یہ آیت حضرت معقل بن یسار اور ان کی بہن کے حق میں نازل ہوئی، حضرت حسن نے کہا کہ اخت معقل بن یسار کو اس کے شوہر نے طلاق دی پھر عدت گذرنے پر اسی سے نکاح کرنا چاہا۔ معقل نے انکار کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کو ابو داؤد، ابن ماجہ، ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن مردویہ نے بھی کئی طریق سے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اس کو صحیح کہا ابن جریج نے کہا یہ عورت جمیل بن یسار تھی۔ اور ابو البداح کے نکاح میں تھیں۔ ابو اسحٰق سبعی نے کہا وہ فاطمہ بنت یسار تھی۔ اکثر سلف نے کہا کہ یہ آیت معقل بن یسار کے حق میں نازل ہوئی۔ سدی نے کہا بلکہ یہ آیت جابر بن عبد اللہ اور ان کی بنت عم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ابن کثیر نے کہا بلکہ پہلا قول صحیح ہے۔ فتح البیان میں کہا کہ اس آیت میں عورت کے اولیاء کو خطاب ہے۔ طلاق کی نسبت ان کی طرف اس لیے کی ہے کہ مطلقات کے نکاح کے وہی سبب ہیں۔ یا یہ ازواج کو خطاب ہے۔ یعنی جب تم طلاق دے چکے اور وہ عدت مکمل کر چکیں تو اب وہ جس سے چاہیں نکاہ کریں۔ تم انہیں منع نہ کرو۔ اور یہ ممانعت جاہلیت کی حمیت سے ہے۔ جس طرح اکثر رئیس امیر لوگ کرتے تھے کہ جو عورتیں ان کے نکاح میں تھیں وہ کسی اور کے نکاح میں ہوں۔ کیونکہ وہ اپنے جاہ جلال اور ریاست کی وجہ سے یہ خیال کر بیٹھتے ہیں کہ وہ بنی آدم کی جنس سے ہی نہیں ہیں مگر وہ جیسے اللہ نے تقوی و تواضع سے بچالیا۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٣﴾

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں یہ (حکم) اس شخص کے لئے ہے جو پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق باپ کے ذمے ہو گا، کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی (تو یاد رکھو کہ) نہ تو ماں کو اس کے بچے کے سبب نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے ،اسی طرح (نان نفقہ) بچے کے وارث کے ذمے ہے اور اگر دونوں (یعنی ماں باپ) آپس کی رضامندی اور صلاح سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں، بشرطیکہ تم دودھ پلانے والیوں کو دستور کے مطابق ان کا حق جو تم نے دینا کیا تھا دے دو، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسکو دیکھ رہا ہے۔

فائدہ: یعنی اگر بیوی اور خاوند کے درمیان طلاق واقع ہوئی اور بچہ دودھ پیتا ہے تو وہ عورت دو سال کی مدت اس بچے کو دودھ پلائے گی تو اس کا خرچ باپ برداشت کرے گا۔اور اگر باپ فوت ہو گیا تو بچے کے وارث پر وہ خرچ لازم ہو گا۔اور اگر باہمی خوشی سے دو برس سے کم مدت تک دودھ پلانا چاہیں تو بھی گنجائش ہے۔اور اگر باپ کسی اور عورت سے دودھ پلوالے اور ماں کو اس کا مکلف نہ کرے تو بھی جائز ہے۔لیکن اس کے بدلے ماں کا کچھ حق نہ رکھے۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ کریم نے والدات کو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو دو برس مکمل دودھ پلائیں۔اس کے بعد رضاعت کچھ معتبر نہ ہو گی۔اسی لیے فرمایا کہ جو عدت رضاعت مکمل کرنا چاہے وہ اس طرح کرے۔اکثر ائمہ اس طرف گئے ہیں کہ رضاعت محرمہ وہ ہے جو دو سال کے اندر ہو۔اگر دو برس سے بڑے بچے نے دودھ پیا تو وہ حرام نہ ہو گا۔ترمذی نے اس متعلق ایک الگ باب قائم کیا ہے۔اس میں حضرت ام سلمہ علیہا السلام سے مروی ہے کہ رضاع سے حرام نہیں ہوتا مگر وہ جو چھاتی سے نکل کر آنتوں کو پھاڑ دے اور دودھ چھڑانے سے پہلے ہو۔یہ حدیث حسن صحیح ہے۔اور اکثر اہل علم اور صحابہؓ وغیر ھم کا اسی پر عمل ہے کہ حرام کرنے والی رضاعت وہی ہے جو دو برس کے اندر ہو۔اور جو دو برس کے بعد ہے وہ کسی چیز کو حرام نہیں کرتی۔۔ابن کثیر نے فرمایا کہ ترمذی

اس حدیث کے ساتھ متفرد ہیں اور یہ حدیث صحیحین کی شرط پر ہے۔اور چھاتی سے محل رضاعت مراد ہے۔جس طرح کہ حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کا بیٹا ابراہیم فوت ہوا تو آپؐ نے فرمایا میرا بیٹا چھاتی کے اندر فوت ہوا یعنی مدت رضاعت میں فوت ہوا اس کے لیے جنت میں ایک دایہ ہے اس کو احمد و بخاری نے روایت کیا ہے۔یہ اس لیے فرمایا کہ وہ ایک سال دس ماہ کی عمر میں فوت ہوئے جو دو ماہ ان کی رضاعت باقی تھی وہ مرضعہ جنت پوری کرے گی۔ حضرت جابرؓ نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ نہیں رضاعت دودھ سے جدا کرنے کے بعد اور نہیں ہے یتیمی بعد احتلام کے۔[بروایت ابو داؤد الطیاسی] اس حدیث کی مکمل دلالت اس آیت میں ہے:﴿وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ﴾ کہ "اس کا دودھ چھڑانا دو سالوں میں ہے۔"﴿وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ کہ "اس کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس مہینوں میں ہے۔"اور یہ قول کہ دو سال کے بعد رضاعت کچھ حرام نہیں کرتی۔ حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، جابرؓ، ابی ہریرہؓ، ابن عمرؓ، ام سلمہؓ، ابن المسیب، عطاء اور جمہور کا مذہب ہے۔شافعی، احمد، اسحٰق، ثوری، مالک، ابو یوسف اور محمد بھی اسی طرف مائل ہیں۔مالک سے ایک روایت یوں ہے کہ مدت رضاعت دو برس دو ماہ ہے یا تین ماہ ہے۔ابو حنیفہ کہتے ہیں کہ اڑھائی برس مدت رضاعت ہے۔ زفر نے کہا جب تک بچہ دودھ پیتا رہے۔ تین برس تک اوزاعی سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔مالک اور اوزاعی یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ماں نے دو برس سے کم میں دودھ چھڑا دیا پھر کسی عورت نے فصال کے بعد دودھ پلا دیا تو وہ اس سے حرام نہ ہوگا۔اس لیے کہ وہ دودھ کھانے کی جگہ ہوگا۔ حضرت عمرؓ اور علیؓ نے کہا کہ نہیں ہے رضاعت فصال کے بعد شاید دو سال مراد ہیں۔ جس طرح جمہور نے کہا خواہ دودھ چھوڑ دے یا نہ چھوڑے۔یا فعل مراد ہے جیسا کہ مالک نے کہا ہے۔واللہ اعلم. صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے آیا ہے کہ وہ رضاع کبیر کو بھی تحریم معتبر سمجھتی تھیں۔ حضرت عطاء اور لیث کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عائشہؓ جن مردوں کے سامنے آنا مناسب سمجھتی تھیں تو بعض عورتوں سے کہہ دیتیں کہ ان کو دودھ پلا دو۔ان کی دلیل سالم مولیٰ ابی حذیفہ کی حدیث تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی عورت سے کہا کہ اس کو دودھ پلا دو۔اور وہ بڑی عمر کا تھا۔وہ ان کی رضاعت کی وجہ سے ان کے گھر میں آتا جاتا تھا۔ مگر دوسری عورتوں نے یہ سمجھا کہ یہ انہی کے ساتھ خاص ہے۔جمہور کا قول بھی یہی ہے ان کی حجت حدیث عائشہؓ ہے صحیحین میں ہے کہ اے عورتو! دیکھو کہ تمہارے بھائی کون ہیں رضاعت تو بھوک سے ہوتی ہے۔اور جمہور سے مراد ساری ازواج مطہرات اکابر صحابہؓ فقہائے سبعہ ائمہ اربعہ ہیں۔ابن کثیر نے فرمایا کہ اس مسئلے کی بحث ان شاء اللہ آیت رضاعت کے پیچھے آئے گی۔یعنی اس قول کے تحت﴿وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ

اَرْضَعْنَكُمْ ﴾ کہ "تمہاری مائیں وہ ہیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے۔" امام شوکانی اس باب میں حضرت عائشہؓ کے ہم مذہب ہیں کہتے ہیں کہ تجویز نظر کے لیے رضاع کبیز جائز ہے، گو داڑھی والا ہی کیوں نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

فتح البیان میں فرمایا کہ اللہ نے نکاح و طلاق کے ذکر کے بعد رضاع کا ذکر کیا کہ کبھی طلاق میں ایسا معاملہ بھی در پیش ہو سکتا ہے کہ خاوند بیوی کے درمیان فرقت ہو جائے اور ان کے درمیان کو بچہ ہو جو دودھ پیتا ہو۔ بعض نے کہا کہ یہ آیت مطلقات کے ساتھ خاص ہے جبکہ بعض نے عام قرار دیا۔ اور لفظ حولین کاملین میں ابو حنیفہ اور زمر کے موقف کا رد ہے۔ جو فرمایا کہ اگر تمام رضاعت کا ارادہ کرے اس سے معلوم ہوا کہ دو برس کی مدت کو پورا کرنا کچھ واجب نہ ہے۔ بلکہ یہ تمام رضاعت کی حد بتلائی ہے۔ اگر اس سے کم بھی پلاتیں تو بھی جائز ہے لیکن کم کی کوئی مدت قائم نہ ہے۔ جس مقدار میں بچے کی زندگی کی اصلاح ہو اس قدر کافی ہے۔

فائدہ: بچے کے والد پر واجب ہے کہ مدت رضاعت میں شہر کے دستور کے موافق ماں اور بچے کا خرچ ادا کرے نہ اسراف کرے نہ بخیلی کرے بلکہ اپنی طاقت کے موافق مناسب خرچ دے۔ جیسے اللہ کریم نے فرمایا ﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتَاهُ اللّٰهُ ط لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتَاهَا سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا﴾ "پھر کشائش والا اپنی کشائش کے موافق خرچ کرے اور جس پر اس کا رزق کم کیا جائے تو چاہیے کہ اس میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اس کو دیا ہے۔ اللہ کسی نفس کو مکلف نہیں کرتا مگر اتنا جتنی اسے روزی دی ہے عنقریب اللہ تنگی کے بعد آسانی کر دے گا۔" امام ضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ اور لفظ مولود لہ میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اولاد باپ کی ہوتی ہے۔ ماں کی نہیں اسی لیے باپ کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔ گویا ماؤں نے باپوں کے لیے وہ اولاد جنم دی ہے۔ فتح البیان میں ہے کہ رزق و لباس کا یہ وجوب ان عورتوں کے لیے ہے جو مطلقات بوائن ہیں۔ جو غیر مطلقات ہیں ان کا نفقہ خاوندوں پر بغیر ارضاع کے بھی واجب ہے۔ قرطبی نے کہا ظاہر تر یہ ہے کہ یہ آیت ان عورتوں کے حق میں ہے جو نکاح میں ہیں۔ کیونکہ وہ نان و نفقہ کی مستحق ہیں خواہ دودھ پلائیں یا نہ پلائیں۔ یہ روٹی کپڑا صحبت کے عوض ہے سو جب وہ دودھ پلانے میں مشغول ہو گئی تو اس سے کامل فائدہ نہ اٹھا سکا اس لیے شاید بعض کو یہ وہم ہو تا کہ بحالت رضاع وہ نفقہ جاتا رہا اس لیے اللہ کریم نے اس شبہ وہم کو دور کر دیا ہے۔ فرمایا ایسا نہیں ہو گا بلکہ اب بھی طعام و لباس اسی طرح واجب ہے جیسا کہ قبل رضاع واجب تھا۔ اس میں اس بات پر بھی دلیل ملتی ہے کہ اولاد کا خرچ والد پر ہے کیونکہ اولاد کمزور ہوتی ہے۔ اور جو اس کی ماں کی طرف نسبت کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حالت رضاع میں ماں کے واسطے سے ہی بچے کو

غذا ملتی ہے۔اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ایسی اولاد جن کے پاس مال نہ ہو ان کا خرچ باپ پر واجب ہے۔

فائدہ: بحالت رضاعت ماں کو نہ چاہئے کہ بچے کو خود سے جدا کرے کہ باپ کو اس کی کفالت مشکل ہو۔ ہاں دودھ کی مدت مکمل ہونے پر وہ چاہے تو پاس رکھے اور چاہے تو جدا کر دے۔ لیکن اگر اس وقت بچے کو جدا کرنے سے باپ کو نقصان ہو گا تب بھی علیحدہ کرنا درست نہ ہو گا۔ جیسا کہ ماں کو تنگ کرنے کے لیے باپ کو بچہ چھیننا مناسب و جائز نہ ہے۔اسی لیے یہ فرمایا:﴿وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ﴾"اور نہ لڑکے والا اپنے بچے کے ساتھ یعنی ماں کو تنگ کرنے کے لیے باپ بھی بچے کو لینے کا مجاز نہ ہے۔ حضرت مجاہد، ضحاک، قتادہ، زہری، سدی وثوری اور ابن زید وغیر ھم کا بھی یہی مذہب ہے۔وارث پر یہ واجب ہے کہ اپنے قریب کو ضرر نہ دے۔ مجاہد، شعبی اور ضحاک یہی قول ہے۔ بعض نے مراد یہ لیا ہے کہ جس کا باپ نہ ہو تو وارث پر اس کا خرچ واجب ہے۔ کہ بچے کی والدہ کو طعام ولباس مہیا کرے اور اسے ایذا نہ دے۔ جمہور نے اسی طرح کہا ہے۔ابن جریر نے اس کو مفصل بیان کیا ہے۔ حنفیہ اور حنبلیہ نے اس آیت سے یہ دلیل لی ہے کہ بعض اقارب کا خرچ بعض پر واجب ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ، ابو حنیفہ، احمد اور جمہور سے اسی طرح مروی ہے۔ بروایت حسن سمرہ سے مرفوع حدیث آئی ہے وہ بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ کہ جو کسی ذی رحم محرم کا مالک ہوتا ہے تو وہ اس پر آزاد ہو جاتا ہے۔اور دو سال سے زائد رضاعت بچے کو کبھی جسمانی نقصان دیتی ہے اور کبھی عقلی۔ حضرت علقمہ نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ اپنے بچے کو دو سال سے زائد دودھ پلاتی ہے تو آپ نے اس کو منع کیا کہ اس کو مت دودھ پلا۔ کسی نے کہا کہ وارث سے خود وہ بچہ مراد ہے یعنی جب وہ بچہ باپ کا وارث ہوا اور اس کو مال ملا تو اپنے مال سے اس کو اپنا ارضاع واجب ہے۔ بعض نے اس سے والدین مراد ہیں کہ ایک کے وفات پانے کے بعد دوسرا جو باقی ہے۔اگر بچہ مالدار نہ ہے تو باپ کی وفات کے بعد ماں بچے کی کفیل ہو گی۔ ثوری اسی کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا کہ وارث سے مرضعہ کے وارث مراد ہے۔ قرطبی نے کہا کہ اس جگہ جو مثل ذالك فرمایا اس میں مثلیت سے عدم اضرار مراد ہے۔ رضاع وانفاق مراد نہ ہے ورنہ مثل ذالك کی بجائے مثل ھولاء ہوتا۔ کئی مفسرین اسی طرف گئے ہیں مگر یہ قول انتہائی نامناسب ہے۔ کیونکہ اسم اشارہ جس طرح واحد کو فائدہ دیتا ہے اسی طرح جمع کو بھی مفید ہے۔اور پہلا قول ہی زیادہ مناسب ہے۔ پھر اگر ماں باپ اس میں مصلحت دیکھیں کہ بچے کا دودھ دو سال سے قبل چھڑا دیں تو ان پر کچھ گناہ نہ ہے۔ معلوم ہوا کہ والدین میں سے ایک کی رائے کافی نہ ہے۔نہ ان میں سے ایک کو دوسرے کے مشورے کے بغیر اپنی رائے پر اکتفا کرنے چاہئے۔جب تک کہ دوسرے کا مشورہ نہ ہو۔ ثوری کا بھی یہی قول ہے۔

اس میں بچے کے لیے احتیاط کا پہلو ہے۔ تاکہ اس کے متعلق خوب غور کر لیا جائے۔ یہ بندوں پر اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے بچے کی تربیت کا ذمہ دار والدین کو ٹھہرایا ہے۔اور یہ فرمایا کہ جس معاملے میں مصلحت ہو وہ اختیار کرو۔ جیسے سورۃ الطلاق میں فرمایا:﴿ فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ وَإِن تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ ﴾"پھر اگر وہ تمہاری خاطر دودھ پلائیں تو ان کو ان کی مزدوری دو اور آپس میں معروف طریقے سے مشورہ کر لو۔"اور اگر تم تنگی محسوس کرو تو اس کے لیے دوسری دودھ پلادے۔یا مشورے سے اہل علم مراد ہیں۔ کہ جب وہ یہ مشورہ دیں کہ حولین سے قبل فطام میں بچے کو کچھ ضرر نہ ہو گا تو دودھ چھڑا دینا چاہئے۔ورنہ نہ چھڑانا چاہئے۔اگر باپ یہ چاہے کہ دایہ سے دودھ پلوائے تو جتنی مدت ماں نے دودھ پلایا ہے اس کو اس کی اجرت دے دے۔ مجاہد و ثوری کا بھی یہی قول ہے۔اللہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے کہ کیا تم نے والدہ و مرضعہ اور اولاد کے حقوق ادا کیے ہیں یا نہیں۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۳۴﴾

اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں تو عورتیں چار مہینے اور دس دن اپنے آپ کو روکے رہیں اور جب (یہ)عدت پوری کر چکیں اور اپنے حق میں پسندیدہ کام (یعنی نکاح)کر لیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں، اور اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔

فائدہ: مطلقہ کی عدت تین حیض ہے۔اور متوفی عنہا زوجہا کی عدت چار ماہ دس دن بتائی گئی ہے۔اور یہ اس صورت میں جبکہ حمل نہ ہو لیکن اگر حمل ہو تو وضع حمل عدت ہو گی۔

فائدہ: نکاح و طلاق اور رضاع کے ذکر کے بعد فرمایا کہ جس کا خاوند فوت ہو گیا ہو اس کی عدت چار مہینے اور دس راتیں ہیں۔اور اس بات پر اجماع ہے۔ کہ اس مدخولہ و غیر مدخولہ زوجات مراد ہیں۔اور اس اجماع کی سند کہ غیر مدخولہ بھی اس میں شامل ہے عموم آیت ہے۔اور جو حضرت ابن مسعود کی حدیث ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ ایک آدمی نے شادی کی نہ اس سے مہر مقرر کیا نہ جماع کیا اس کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے فرمایا اس باب میں میں اپنی رائے دیتا ہوں کہ اگر میرا کہنا درست ہوا تو وہ اللہ کی طرف سے ہے۔اور اگر خطا ہوئی تو وہ میری اور شیطان کی طرف سے ہو گی۔اللہ اور اس کا رسولؐ اس سے بری ہیں۔اس عورت کو پورا مہر ملنا چاہئے۔دوسرا لفظ یوں ہے کہ اس کو مہر مثل ملنا چاہئے نہ کم نہ زیادہ۔اس پر عدت بھی اور وہ وراثت کی مقدار بھی ہو گی۔اس پر معقل بن یسار اشجعی کھڑے

ہوئے اور کہا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو سنا کہ انہوں نے بروع بنت واشق کے متعلق ایسا ہی حکم دیا تھا۔ابن مسعود رضی اللہ عنہما اس سے نہایت درجہ خوش ہوئے۔ایک روایت میں یہ لفظ ہے کہ قبیلہ اشجع کے کچھ لوگ کھڑے ہوئے انہوں کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے بروع بنت واشق کے حق میں یہی حکم دیا تھا۔[بروایت احمد واھل السنن] ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔اور حضرت ابن مسعودؓ اس بات پر اس لیے بہت خوش ہوئے کہ ان کا فتوی رسول اللہ ﷺ کے فتوے کے موافق رہا۔اس حکم سے وہ عورت خارج ہے جو خاوند کی وفات پر حامل ہو۔کیونکہ اس کی عدت وضع حمل ہے۔اگرچہ اس کی وفات کے ایک لمحہ بعد ہی وضع ہو کیونکہ فرمان الٰہی ہے:﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ کہ "حاملات کی عدت وضع حمل ہے۔"حضرت ابن عباسؓ بعد الاجلین کے قائل ہیں خواہ وہ وضع حمل ہو یا چار ماہ دس دن۔ تاکہ دونوں آیات میں تطبیق کی صورت ہو۔ابن کثیر نے فرمایا کہ اگر سبیعہ اسلمیہ کی حدیث نہ ہوتی۔تو یہ ماخذ جید اور یہ مسلک قوی ہے۔ صحیحین میں ہے کہ اس کا خاوند سعد بن خولہ فوت ہوا جبکہ وہ حامل تھی۔اس کے وفات بعد جلد ہی وضع حمل ہو گیا۔بعض روایات میں یوں ہے کہ چند روز بعد اس نے بچہ جنم دیا۔جب وہ نفاس پاک ہوئی تو پیغام دینے والوں کے لیے آراستہ ہوئی۔ابو السنابل بن بعکک اس کے پاس آیا اور کہا میں تجھے آراستہ دیکھتا ہوں شاید تیرا ارادہ نکاح کرنے کا ہے۔واللہ جب تک چار مہینے اور دس دن نہ گذر جائیں تب تک تو نکاح نہیں کر سکتی۔سبیعہ کہتی ہیں جب میں نے یہ بات سنی تو شام کو کپڑے پہنے اور آپؐ کے پاس گئی اور یہ مسئلہ دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا تو عدت سے پاک ہے۔ جبکہ وضع حمل ہو چکا ہے۔اور کہا کہ اگر میں مناسب سمجھوں تو نکاح کر لوں۔ابن عبد البر کہتے ہیں جب حضرت ابن عباسؓ سے یہ حجت بیان کی گئی تو انہوں اپنے پہلے موقف سے رجوع کر لیا اور اس کی دلیل یہ تھی کہ حضرت ابن عباسؓ کے اصحاب اسی حدیث کے موافق فتوی دیتے تھے۔سارے اہل علم کا یہی قول ہے۔اسی طرح اس حکم سے وہ لونڈی بھی مستثنیٰ ہے کہ اس کی عدت دو ماہ اور پانچ رات ہے۔جمہور کا یہی قول ہے۔کیونکہ جب لونڈی کی حد آزاد عورت سے آدھی ہوئی تو اس کی عدت بھی نصف ہونی چاہئے۔ہاں ابن سیرین اور بعض ظاہر یہ اس میں آزاد عورت اور لونڈی کو برابر رکھا ہے۔ان کی دلیل عموم آیت ہے۔اور اس سے بھی دلیل لی کہ عدت ایک فطری عمل ہے اس میں خلقت برابر ہے۔سعید بن المسیب اور ابو العالیہ نے کہا یہ چار ماہ دس دن کی مدت اس لیے مقرر کی کہ اگر حمل غیر مبین ہو تو اتنی مدت میں ظاہر ہو جائے۔جیسا کہ ابن مسعود کی حدیث میں ہے کہ تمہاری تخلیق ماں کے پیٹ میں چالیس دن نطفہ رہتی ہے پھر چالیس دن لوتھڑا بنی رہتی ہے پھر چالیس دن گوشت کا ٹکڑا پھر فرشتہ آکر روح پھونک جاتا ہے۔ان تین حالتوں میں چار ماہ مکمل ہوں گے دس دن مزید

احتیاط کے لیے ہیں کیونکہ بعض مہینے کم دن کے بھی ہوتے ہیں جب روح پھونکی جائے گی تو بچے کی حرکت ظاہر ہو گی۔و الله اعلم. ابن المسیب اور ابو العالیہ نے بھی یہی حکمت بیان کی ہے۔اسی لیے امام احمد نے ام ولد کی عدت کے متعلق کہا کہ اس میں وہ بھی حرہ کے برابر ہے۔کیونکہ وہ بھی حرہ کی طرح فراش ہو گئی ہے۔حضرت عمرو بن العاص کی حدیث میں اس پر دلیل ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم پر ہمارے نبیؐ کی سنت مشتبہ نہ کرو۔ام ولد جبکہ اس کا سید فوت ہو جائے تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔[بروایت احمد،ابو داؤد،ابن ماجہ] امام احمد سے اس حدیث کا انکار بھی مروی ہے۔کسی نے کہا کہ قبیصہ کو عمرو سے سماع نہ ہے مگر ایک گروہ سلف اسی حدیث کی طرف گیا ہے۔طاؤس اور قتادہ نے کہا کہ ام ولد کی عدت حرہ سے نصف ہے یعنی دو ماہ پانچ رات۔ابو حنیفہ نے کہا تین حیض عدت گذارے۔بعض صحابہؓ و تابعینؒ کا بھی یہی موقف ہے۔امام مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک ایک حیض کافی ہے۔ایک جماعت تابعینؒ بھی اسی کی ہم مسلک ہے۔حضرت ابن عمرؓ بھی اسی کے قائل ہیں۔لیث نے کہا کہ اگر بوقت وفات سید وہ حائض تھی تو وہی کافی ہے۔مالک نے کہا اگر حیض نہیں آتا تو تین مہینے عدت گذارے۔شافعی اور جمہور نے کہا ایک ماہ تین دن کافی ہیں۔فتح البیان میں ہے کہ یہ آیت اس مابعد آیت کی ناسخ ہے۔جس میں ایک سال عدت کا ذکر ہے۔اگرچہ تلاوت میں یہ متقدم ہے جمہور کا اسی پر اجماع ہے۔

فائدہ: اور لفظ ﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾ سے یہ سمجھا گیا ہے کہ مدت عدت میں متوفی شوہر پر سوگ واجب ہے۔ام حبیبہ و زینب بن جحش نے کہا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کسی عورت کو حلال نہ ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو کہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے مگر خاوند پر کہ اس پر چار مہینے دس دن۔[رواہ الشیخان] ام سلمہؓ سے صحیحین میں آیا ہے کہ میری بیٹی کا شوہر فوت ہو گیا ہے، اس کی آنکھ میں تکلیف تھی میں نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ کیا میں اس کو دو تین دفعہ سرمہ لگاؤں فرمایا نہیں عدت چار ماہ دس دن ہے جاہلیت میں تو ایک سال ہوتی تھی۔زینبؓ بنت ام سلمہ نے کہا کہ عورت کا شوہر جب مر جاتا تو وہ ایک گندی جگہ بیٹھتی تھی۔برے سے برا لباس پہنتی تھی۔خوشبو نہ لگاتی تھی۔جب تک کہ ایک برس نہ گذر جاتا پھر سال گذرنے پر باہر نکلتی اور ایک مینگنی پھینکتی۔پھر کوئی جانور گدھا، بکری یا چڑیا لائی جاتی وہ اس سے اپنے بدن کو رگڑتی تھی اس سے وہ جانور مر جاتا تھا۔اسی لیے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ آیت مابعد آیت کی ناسخ ہے۔مطلب یہ ہوا کہ سوگ ترک زینت کو کہتے ہیں۔یعنی خوشبو نہ لگانے زیور نہ پہننے اور اچھے کپڑے نہ پہننے یہ بات عدت وفات میں واجب ہے۔جمہور کا اس پر اتفاق ہے۔عدت رجعی میں واجب نہ ہے۔اس کے متعلق ایک ہی قول ہے۔عدت بائن میں دو

اقوال ہیں۔وجوب سوگ میں چھوٹی، بڑی، آزاد، لونڈی، مسلمان اور کافرہ سب برابر ہیں۔اس لیے کہ آیت کریمہ عام ہے۔ثوری اور ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ کافرہ پر سوگ نہ ہے۔اشہب اور ابن نافع اور مالکی بھی اسی طرف گئے ہیں۔ان کی دلیل اس حدیث کے الفاظ ہیں کہ کسی مومنہ کو سوائے خاوند کے کسی پر تین دن سے زیادہ سوگ کرنا حلال نہ ہے۔ام حبیبہ کی یہ حدیث اوپر مذکور ہو چکی ہے۔اس میں ایمان کی قید ہے۔یہ حکم کافرہ کے ساتھ تعبدی ہے۔امام ابو حنیفہ اور ثوری نے صغیرہ کو عدم تکلیف کی وجہ سے اور لونڈی کو نقصان مقام کی وجہ سے ملا دیا ہے۔

فائدہ: اس جگہ بلوغ اجل سے تکمیل عدت مراد ہے۔ضحاک اور ربیع کا بھی یہی قول ہے۔علیکم سے اولیاء عورت مراد ہیں۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب عورت کو طلاق دے دی گئی یا اس کا خاوند فوت ہو گیا اور عدت گذر چکی پھر عورت پر زینت کرنے میں اور پیغام نکاح وصول کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہوتا۔مقاتل بن حیان کا بھی یہی لفظ ہے۔حضرت مجاہد نے کہا کہ معروف سے مراد حلال طیب نکاح ہے۔حسن بصری، زہری اور سدی بھی اسی کے قائل ہیں۔۔ابو حنیفہ کہتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوا کہ بغیر ولی کے نکاح جائز ہے۔کیونکہ فعل کی فاعل کی طرف نسبت کرنا مباشرت پر محمول ہوتا ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اولیا کو خطاب ہے اگر بغیر ولی کے نکاح ہو سکتا تو اولیاء کو خطاب نہ ہوتا۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴿۲۳۵﴾

اگر تم کنائے کی باتوں میں عورتوں کو نکاح کا پیغام بھیجو یا (نکاح کی خواہش کو) اپنے دلوں میں مخفی رکھو تو تم پر کچھ گناہ نہیں، اللہ کو معلوم ہے کہ تم ان سے (نکاح کا) ذکر کرو گے، مگر (ایام عدت میں) اسکے سوا کہ دستور کے مطابق کوئی بات کہہ دو پوشیدہ طور پر ان سے قول و قرار نہ کرنا اور جب تک عدت پوری نہ ہو لے نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرنا اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ کو سب معلوم ہے تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا (اور) علم والا ہے۔

فائدہ: یعنی جب عورت عدت کے اندر ہے تو کسی کو یہ جائز نہ ہے کہ اس سے نکاح کرے یا صاف وعدہ کرے لیکن اگر دل میں نیت کرے یا در پردہ بات کرے مثلاً اس طرح اسے اشارہ کر دے کہ تجھے ہر کوئی عزیز کرے گا یا میں نکاح کرنا چاہتا ہوں تا کہ اس سے پہلے کوئی اور نہ پیغام نکاح دے دے تو اتنا کہنے میں یا نیت میں جواز

ہے۔ لیکن بالکل واضح الفاظ میں نہ کہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تعریض یہ ہے کہ یوں کہے کہ میرا نکاح کرنے کا ارادہ ہے یا یہ کہے کہ میں عورت سے محبت رکھتا ہوں۔ یا یہ کہے کہ میں اللہ سے چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی عورت مل جائے لیکن منگنی کرنے پر تیار نہ ہو۔ دوسرا لفظ یوں ہے کہ میں تمہارے سوا کسی سے نکاح نہ کروں گا یا یوں کہے کہ میں چاہتا ہوں کوئی نیک عورت مل جائے۔ بخاری نے اس کو تعلیقاً روایت کیا ہے۔ ایک جماعت سلف وائمہ کا یہی قول ہے کہ اشارہ جائز ہے وضاحت جائز نہ ہے۔ اور طلاق بائن والی کا بھی یہی حکم ہے۔ کہ اسے تعریض جائز ہے تصریح نہیں۔ فاطمہ بنت قیس کو اس کے شوہر ابو عمرو بن حفص نے تین طلاقیں دے دیں آنحضرت ﷺ نے اسے ابن ام مکتوم کے گھر عدت گذارنے کا حکم دیا۔ پھر فرمایا کہ جب تیری عدت مکمل ہو چکے تو مجھے خبر دینا جب عدت ہو چکی تو اسامہ بن زید کا پیغام بھیج کر ان سے نکاح کر دیا۔ رہی مطلقہ رجعیہ تو اس کو خاوند کے سوا نہ کسی کو دوران عدت تعریض جائز ہے نہ تصریح۔ اس میں کسی کا اختلاف نہ ہے۔ واللہ اعلم.

فائدہ: پھر فرمایا کہ اگر تم نے اس بات کو اپنے نفس میں چھپایا ہے اور کسی پر ظاہر نہ کیا تو تم پر کچھ گناہ نہ ہو گا۔ لفظ اَوْ اباحت یا تخییر یا تفصیل یا ابہام کے مخاطب پر ہے۔ اکنان اخفاء کو کہتے ہیں۔ اور اکننتم کے معنی اضمر تم ہیں۔ جیسے یہ آیت:﴿وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَاتُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾ کہ "اور بلاشبہ تیرا رب البتہ جانتا ہے جو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔" اور جیسے فرمایا:﴿وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَا اَخْفَيْتُمْ وَمَا اَعْلَنْتُمْ﴾ کہ "میں جانتا ہوں کہ جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔" اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم عنقریب ان کا اپنے دل میں تذکرہ کرو گے۔ کشاف میں کہا ہے کہ اس میں ایک طرح کی ڈانٹ ہے۔ جیسے فرمایا تھا:﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ کہ "اللہ نے جانا کہ تم اپنے نفسوں کی خیانت کر رہے تھے۔" ایک جماعت سلف نے کہا کہ اس جگہ چھپے وعدے سے مراد زنا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔ اور ابن جریر نے بھی اسی کو مناسب سمجھا ہے۔ یعنی یوں نہ کہے کہ میں تجھے چاہتا ہوں تو وعدہ دے کہ میرے سوا کسی اور سے نکاح نہ کرے گی، ایک جماعت سلف کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ یوں نہ کہے کہ تو مجھے نہ چھوڑنا میں تجھ سے نکاح کروں گا۔ قتادہ نے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اس سے اس بات کا عہد نہ لے کہ وہ اس کے سوا کسی سے نکاح نہ کرے گی۔ ابن زید نے کہا ایسا نہ کرے کہ دوران عدت ہی اس سے نکاح کرے پھر عدت مکمل ہونے پر ظاہر کرے۔ ابن کثیر نے فرمایا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آیت ان تمام معانی میں عام ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر کچھ کہو تو معروف بات کہو۔ جیسے یہ کہے کہ مجھے تجھ میں رغبت ہے۔ عبیدہ نے کہا کہ

معروف بات یہ ہے کہ اس کے ولی سے کہہ دے کہ تم جلدی نہ کرنا یعنی اس کا نکاح نہ کرنا جب تک کہ مجھ سے نہ کہہ دو۔ جمہور نے کہا کہ عدت والی سے یہ نہ کہے کہ تو مجھ سے نکاح کر بلکہ صرف اشارے سے بات کرے۔ کسی نے کہا اشارے سے مراد جماع ہے کہ اس سے یہ نہ کہے کہ میں کثیر الجماع ہوں کہ اس کو نکاح میں رغبت ہو۔ شافعی اسی طرف گئے ہیں۔ ابن عطیہ نے کہا اس پر اجماع امت ہے کہ اس سے بے حیائی والی بات جیسے ذکرِ جماع وغیرہ نہ کرے بلکہ اسے حرص نہ دلائے۔ کیونکہ ایسی گفتگو جائز نہ ہے۔ بلکہ اس پر بھی اجماع ہے۔ کہ عدت کے اندر عورت کو وعدہ دینا یا باپ سے کنواری لڑکی کے لیے یا سید سے لونڈی کی بابت وعدہ کرنا بھی مکروہ ہے۔ کتاب سے اس جگہ حد و مقدار مراد ہے یعنی عدت معین مراد ہو گی جیسے فرمایا:﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ کہ "یہ نماز مسلمانوں پر مقرر وقت کے لیے لکھ دی گئی ہے۔" اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ عدت کے اندر نکاح کرنا حرام ہے۔ اجل سے مدت عدت کا اخیر مراد ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور جماعت تابعینؒ نے کہا کہ جب تک عدت مکمل نہ ہو چکے نکاح نہ کرو۔ ابن کثیر نے اس بات پر اجماع علما نقل کیا ہے کہ اگر کسی نے دوران عدت نکاح کر لیا پھر اس کے پاس بغرض جماع گیا تو ان دونوں کو جدا کر دیا جائے گا۔ پھر اس بات میں دو قول ہیں کہ پھر آیا وہ اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہے یا نہیں۔ جمہور نے کہا بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے حرام نہ ہو گی عدت مکمل ہونے پر اگر چاہے تو پیغام نکاح بھیجے۔ مالک نے کہا کہ وہ اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو گی ان کی دلیل وہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس عورت نے عدت کے اندر اپنا نکاح کیا پھر اگر اس کے شوہر نے اس سے دخول نہ کیا تو تفریق کر دی جائے گی اور باقی عدت گذرنے پر وہ بھی پیغام نکاح دینے والوں میں شامل ہو سکتا ہے لیکن اگر اس نے دخول بھی کیا تو اس کو تفریق کے بعد پہلے اگلی عدت مکمل کرنا ہو گی پھر دوسری عدت مکمل کرے گی اور وہ عورت پھر کبھی اس کی بیوی نہ بن سکے گی۔ اہل علم نے کہا کہ اس حکم کا ماخذ یہ ہے کہ جب اس دوسرے شوہر نے جلدی کی اور اللہ کی مدت معین پر قائم نہ رہا تو اب اس کے مقصد کے خلاف یہ سزا ملی ہے۔ کہ وہ اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو گئی۔ جیسا کہ قاتل میراث سے محروم ہو جاتا ہے۔ شافی نے اس اثر کو مالک سے روایت کیا ہے۔ بیہقی نے کہا کہ ان کا اپنا قدیم قول بھی یہی تھا۔ مگر پھر اس سے رجوع کر لیا۔ بقول مرتضی کہ وہ اس کے لیے حلال ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ مذکور اثر منقطع بھی ہے۔ بلکہ مسروق نے کہا کہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے رجوع فرمایا اور دونوں کا جمع ہونا اور مہر کا مقرر کرنا جائز کہا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَیۡكُمۡ إِنۡ طَلَّقۡتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوهُنَّ أَوۡ تَفۡرِضُوا لَهُنَّ فَرِیضَةً وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الۡمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الۡمُقۡتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالۡمَعۡرُوفِ حَقًّا عَلَى الۡمُحۡسِنِینَ ﴿۲۳۶﴾

اور اگر تم عورتوں کو ان کے پاس جانے یا ان کا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دو تو تم پر کچھ گناہ نہیں، ہاں ان کو دستور کے مطابق کچھ خرچ ضرور دو (یعنی) مقدور والا اپنے مقدور کے مطابق دے اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق، نیک لوگوں پر یہ ایک طرح کا حق ہے۔

فائدہ: یعنی اگر بوقت نکاح مہر مقرر نہ کیا تو بھی نکاح درست ہے۔ مہر بعد میں بھی مقرر ہو سکتا ہے۔ پھر اس کے قریب نہ گیا اور طلاق دے دی تو کچھ مہر لازم نہ ہے۔ لیکن کچھ دے کر رخصت کرنا ضروری ہے۔ اپنے حالات کے موافق کوئی لباس دے دے۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ کریم نے نکاح کرنے کے بعد دخول سے پہلے طلاق دینا جائز کہا ہے۔ ابن عباسؓ، طاؤس، ابراہیم اور حسن بصری نے کہا کہ مس یعنی ہاتھ لگانا سے جماع مراد ہے۔ بلکہ اگر وہ مفوضہ ہے تو بھی نکاح کے بعد بغیر حق مہر مقرر کیے اور بغیر دخول کے طلاق دینا جائز ہے گو کہ اس میں دل شکنی ہے اسی لیے فرمایا کہ اس کو خالی ہاتھ رخصت نہ کرو کچھ دے کر بھیجو۔ ابن عباسؓ نے فرمایا اس صورت میں دینے کی چیز سب سے مناسب غلام یا لونڈی ہے یا پھر چاندی یا پیسہ دے یا کوئی لباس وغیرہ جیسی حیثیت ہو ویسا برتاؤ کرے۔ شعبی نے کہا کہ افضل یہ ہے کہ ایک قمیض ایک دوپٹہ اور چادر اور ایک اس سے بڑی چادر دے دے۔ شریح ایسے مواقع پر پانچ سو درہم دلواتے تھے۔ ابن سیرین خادم یا نفقہ یا لباس دیتے تھے۔ امام حسنؓ نے بیس ہزار درہم دیئے تھے۔ ایک عورت نے کہا ہے «متاع قلیل من حبیب مفارق» ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب طلاق کے بعد اس متاع میں جھگڑا ہوا تو نصف مہر مثل دیا جائے۔ شافعی نے قول جدید میں فرمایا کہ ہمیں اس فائدہ دینے کے متعلق کوئی خاص مقدار معلوم نہ ہے مناسب یہ ہے کہ تیس (۳۰) درہم دے دے۔ حضرت ابن عمرؓ کا بھی یہی قول ہے۔ بعض اہل علم نے کہا کہ ہر مطلقہ کو اس قسم کا فائدہ دینا واجب ہے۔ اس لیے کہ ﴿وَلِلۡمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالۡمَعۡرُوفِ حَقًّا عَلَى الۡمُتَّقِینَ﴾ ہے کہ طلاق والی عورتوں کو معروف طریقے سے فائدہ دینا متقین پر واجب ہے۔ اور آیت ﴿یَاأَیُّهَا النَّبِیُّ قُلۡ لِأَزۡوَاجِكَ إِنۡ كُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ الۡحَیَوٰةَ الدُّنۡیَا وَزِینَتَهَا فَتَعَالَیۡنَ أُمَتِّعۡكُنَّ وَأُسَرِّحۡكُنَّ سَرَاحًا جَمِیلًا﴾ "اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے کہیے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ فائدہ دوں اور تمہیں مناسب طریقے سے رخصت کر دوں۔" یہ عام ہے۔ سب ازواج مطہرات مدخولہ تھیں

ان کے مہر مقرر تھے۔ سعید بن جبیر ابو العالیہ حسن بصری اور شافعی کا قدیم قول اور بعض کے نزدیک جدید قول بھی یہی ہے۔ کہ یہ متاع اسی کے لیے واجب ہے جس کو قبل مسیس طلاق دی ہو۔ گو کہ حق مہر مقرر ہو چکا ہو۔ اللہ کے اس فرمان کی دلیل سے ﴿يَاأَيُّهَاالَّذِينَ اٰمَنُوْا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ کہ ”اے ایمان والو! جب تم مومنات سے نکاح کرو پھر انہیں اس سے پہلے طلاق دو کہ تم نے انہیں چھوا ہو تو تمہارے لیے ان پر کوئی عدت نہ ہے کہ جسے تم ان پر شمار کرو پھر انہیں فائدہ دو اور عمدہ طریقے سے رخصت کر دو۔“ ابن المسیب نے کہا کہ اس آیتِ احزاب کو اس آیت نے منسوخ کر دیا جو سورۃ بقرہ میں ہے۔ سہیل بن سعد کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے امیمہ بنت شرحبیل سے نکاح کیا جب اس کے قریب ہونے لگے تو اس نے ناپسند کیا آپؐ نے ابو اسید سے کہا کہ اس کو کچھ فائدہ دو اور نگین کپڑے دے کر رخصت کر دو۔ [بروایت الشیخان] بعض نے کہا کہ یہ متاع اس مطلقہ کے لیے ہے کہ جو غیر مدخولہ و غیر مفروضہ ہے۔ اگر مدخولہ ہے تو مہر مثل واجب ہوگا۔ اگر مفوضہ ہے اور اگر قبل دخول اور بعد فرض حق مہر کے طلاق دی تو نصف مہر مثل ہوگا۔ پھر اگر دخول کیا تو سارا مہر واجب ہوا۔ یہ اسی فائدے کے عوض ہوگا۔ اور مصیبت تو اس بے چاری کے لیے ہوئی جو غیر مدخولہ ہے نہ اس کا مہر مقرر ہوا ہے یہ آیت اسی کو متاع دینے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ ابن عمرؓ اور مجاہد کا یہی قول ہے۔ بعض علماء ہر مطلقہ کے لیے یہ متاع مستحب سمجھتے ہیں۔ مفروضہ کے سوا کہ جس کو دخول سے قبل طلاق ہوئی کہ اس کے لیے واجب ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ بات کچھ منکر نہ ہے۔ اسی پر سورۃ احزاب کی آیت تخییر دلالت کرتی ہے۔ اسی لیے اللہ نے غنی و مفلس پر اس کی قدرت کے موافق یہ متاع دنیا فرض کیا ہے۔ فرمایا ﴿وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقٌّ عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾ علماء نے کہا کہ یہ متاع دنیا مطلقا (سب مطلقات کے لیے) مستحب ہے۔ شعبی نے کہا کہ اگر یہ متاع دینا واجب ہوتا تو قاضی لوگوں کو قید کرتے۔

فائدہ: فتح البیان میں کہا ہے کہ مطلقات کی چار اقسام ہیں۔ ایک وہ جو مدخولہ بھی ہے اور حق مہر بھی مقرر ہے۔ اس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ کہ شوہر کو اپنا دیا ہوا مال اس سے واپس نہ لینا چاہئے۔ وہ تین حیض تک عدت کر لے۔ دوسری وہ جس کا نہ مہر مقرر ہو انہ مدخولہ ہوئی اس کا حکم اس آیت میں مذکور ہے۔ سورۃ احزاب میں یوں فرمایا ہے کہ غیر مدخولہ پر طلاق کے بعد عدت نہ ہے۔ اس کو مہر نہ ملے گا صرف مذکورہ فائدہ دیا جائے گا۔ تیسری وہ جس کا مہر تو مقرر ہے البتہ غیر مدخولہ ہے اس کا ذکر اس آیت میں ہے ﴿وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ

وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً﴾چوتھی وہ ہے جس کا مہر مقرر نہ ہے البتہ مدخولہ ہے۔اس کے متعلق فرمایا: ﴿فَمَااسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً﴾ سے اس جگہ مہر معین کا مقرر کرنا مراد ہے۔ مفروضہ وہ ہے جس کا مہر مقرر ہوا ہے اور مفوضہ وہ ہے جس کو حق مہر مل گیا ہے۔اوزاعی وثوری نے کہا کہ لونڈی کے لیے وہ متاع واجب نہ ہے اس لیے کہ وہ متاع اس کے مالک کا ہوگا۔وہ لونڈی ہونے کی ایذاء کے مقابلے میں سید کے کسی مال کی مستحق نہ ہے۔ متاع تو اس مطلقہ کے لیے مشروع ہے جس کو قبل فرض مہر اور دخول طلاق دینے سے ایذادی گئی ہے۔ مگر جمہور نے کہا یہ متاع لونڈی اور آزاد عورت میں برابر ہے اس لونڈی کو بھی ملے گا۔

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَلَا تَنسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۷﴾

اور اگر تم عورتوں کو ان کے پاس جانے سے پہلے طلاق دے دو لیکن مہر مقرر کر چکے ہو تو آدھا مہر دینا ہوگا، ہاں اگر عورتیں مہر بخش دیں یا مرد جن کے ہاتھ میں عقد نکاح ہے (اپنا حق) چھوڑ دیں (اور پورا مہر دے دیں تو ان کو اختیار ہے) اور اگر تم مرد لوگ ہی اپنا حق چھوڑ دو تو یہ پرہیز گاری کی بات ہے اور آپس میں بھلائی کرنے کو فراموش نہ کرنا کچھ شک نہیں کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

فائدہ: یعنی اگر مہر مقرر ہو چکا ہے پھر بغیر ہاتھ لگائے اس کو طلاق دے دی تو آدھا مہر لازم ہوگا۔ مگر ہاں اگر عورتیں چھوڑ دیں یا وہ مرد چھوڑ دیں جو نکاح کرنے اور نہ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ یعنی وہ پورا مہر ادا کر دیں۔ پھر فرمایا کہ اگر مرد پورا مہر ادا کر دیں تو یہ بہتر ہے۔ کیونکہ اللہ نے ان کو فوقیت دی ہے انہیں نکاح کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا ہے تو انہیں چاہئے کہ اپنی فوقیت وعظمت کو مد نظر رکھتے ہوئے درگذر کریں اور انہیں پورا مہر دے دیں۔

فائدہ: کل چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یہاں دو کے متعلق حکم ہوا ہے۔ایک یہ کہ مہر مقرر نہ ہوا تھا اور قبل مسیس طلاق دے دی۔ دوسرا یہ کہ مہر تو مقرر تھا لیکن قبل مسیس طلاق دی۔ باقی دو صورتیں یہ ہوئیں کہ مہر بھی مقرر اور مدخولہ بھی ہے۔ اس میں پورا مہر لازم ہوگا۔ یہ سورۃ النساء میں مذکور ہے۔ دوسرا یہ کہ مدخولہ غیر مفروضہ ہے۔ اس میں مہر مثل مکمل ہوگا۔ یعنی اتنا جتنا اس عورت کی قوم میں عام رواج ہے۔ موضح قرآن میں اس کے بعد یوں کہا کہ جب خلوت ہو چکی تو گویا مس کے حکم میں ہوا۔ یہ حنفیہ کا مسلک

ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مس کا اعتبار ہو گا۔ صرف خلوت کو مس میں شمار نہ کریں گے گو کہ ہزار پردوں میں ہو۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ کچھ متاع دینا انہی مطلقات کے ساتھ خاص ہے۔ جن کا ذکر پہلی آیت میں ہوا ہے۔ کیونکہ اس آیت میں مفروض مہر کا نصف واجب کیا ہے۔ جبکہ خاوند نے دخول سے پہلے طلاق دی ہو۔ اگر وہاں کوئی اور متاع دینا واجب ہوتا تو اس کا ذکر ہوتا۔ خصوصاً جبکہ اس آیت کو اس کے ساتھ ملا دیا گیا جس میں اس مذکورہ عورت کے ساتھ فائدے کو خاص کیا گیا تھا۔ واللہ اعلم. ایسی حالت میں نصف مہر ادا کرنے پر علماء کا اجماع ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہ ہے۔ جب مہر مقرر ہو چکا تو قبل دخول سے جدا کی گئی تو اب مفروض سے نصف دینا واجب ہو گا۔ ہاں اگر ہر تیسری طلاق کے قریب اس سے خلوت کی لیکن دخول نہ کیا تو سارا مہر لازم ہو گا۔ امام شافعی کا قدیم مذہب بھی یہ ہے۔ خلفائے راشدین نے بھی یہی حکم دیا ہے۔ مگر حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اگر ایک شخص نے نکاح کیا اور خلوت کی مگر مس نہیں کیا پھر طلاق دے دی تو اس کو نصف مہر ملے گا۔ اور دلیل آیت باب ہے۔ شافعی نے کہا ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں ظاہر کتاب بھی یہی مذہب ہے۔ فتح البیان کا لفظ یہ ہے کہ اس ایت میں اس بات کی دلیل ہے کہ اس مطلقہ کے لیے متاع واجب نہ ہو گا کیونکہ یہ مطلقہ قبل البناء والفرض کے مقابلے میں واقع ہوئی ہے جس کے لیے استحقاق متاع ہے۔ اس بات پر اتفاق ہے کہ جس عورت سے دخول نہ کیا گیا لیکن مہر مقرر ہے اور اس کا خاوند مر گیا تو وہ اس کی موت کے سبب پورے مہر کی حقدار ہو گی اس کو میراث ملے گی اور وہ عدت بھی گذارے گی۔ خلوت کے متعلق اختلاف ہے کہ کیا وہ دخول کے قائم مقام ہو گا یا نہیں اور اس کو مہر پورا ملے گا یا نہیں۔ اول مذہب جس پر جمہور علماء خلفائے اربعہ کوفیین اور امام مالک ہیں وہ یہ کہ اس کو کامل مہر ملے گا اور اس پر عدت واجب ہو گی۔ اور دوسرا موقف یہ ہے کہ نصف مہر ملے گا۔ آیت کا ظاہر بھی یہی ہے۔ کیونکہ مَسّ سے جماع مراد ہوتا ہے اس صورت میں عدت واجب نہ ہو گی۔ ایک جماعت سلف کا یہ موقف ہے۔ البتہ یہ الگ بات ہے کہ عورت اپنا سب حق معاف کر دے اس صورت میں مرد پر اس کے حق میں سے کچھ واجب نہ ہو گا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا یعنی ثیب (شادی شدہ) اپنا حق ترک کر دے۔ ایک جماعت تابعینؒ کا یہی قول ہے۔

فائدہ: اس بات میں اختلاف ہے کہ ﴿الَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَةُ النِّکَاحِ﴾ سے کون مراد ہے۔ حضرت ابیہ عمرو عن ابیہ عن جدہ کی حدیث میں ہے کہ عقدۃ النکاح کا ولی خاوند ہے۔ [بروایت ابن ابی حاتم، ابن مردویہ

،ابن جریر] صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک بڑی جماعت کا یہی مذہب ہے۔امام ابو حنیفہ، ثوری، اوزاعی اور محمد بن قرظی بھی اسی طرف گئے ہیں۔ابن جریر نے بھی یہی مذہب اپنایا ہے۔یعنی جس طرح ولی کو مؤلیہ کے دوسرے بال کا کسی کو دینا جائز نہ ہے اسی طرح اس کو حق مہر کا بھی حق اختیار نہ ہے۔ابن عباسؓ کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے عورت کا باپ، بھائی مراد ہے یا وہ مراد ہے کہ جس کے اذن کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا یعنی ولی۔تابعینؒ کا ایک گروہ اسی طرف گیا ہے۔امام مالک کا بھی یہی مذہب ہے۔اس کا ماخذ یہ ہے کہ یہ مہر اس عورت کو ولی کے ذریعے ملا ہے۔تو اب اس کو اس میں حق تصرف بھی ہے۔باقی مال میں تصرف جائز نہ ہے۔حضرت عکرمہ نے کہا اللہ نے معاف کرنے کی اجازت دی ہے جس عورت نے معاف کیا وہ ہو گیا لیکن اگر عورت نے بخل کیا اور ولی نے معاف کر دیا تو بھی جائز ہو گا۔اس سے معلوم ہوا کہ ولی کا در گذر کرنا درست ہے۔گو کہ عورت سمجھدار ہو۔شریح کا یہی قول ہے مگر جب شعبی نے ان پر انکار کیا تو انہوں نے اس سے رجوع کر لیا۔اور کہا کہ مراد خاوند ہے ولی مراد نہ ہے۔بلکہ وہ اس موقف پر مباہلہ کے لیے بھی تیار ہوتے تھے۔ابن جریر نے کہا ان تَعْفُوا کا خطاب مرد و عورت سب کو ہے۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اَقْرَبُ اِلَى التَّقْوٰی یہ ہے کہ معاف کر دے۔شعبی سے بھی یہی قول مروی ہے۔مجاہد، نخعی، ضحاک، قتادہ، مقاتل بن حیان، ربیع اور ثوری نے کہا کہ افضل یہ ہے کہ یا عورت آدھا چھوڑ دے یا مرد مکمل ادا کر دے۔اسی لیے فرمایا کہ تم باہمی فضل مت بھولو بلکہ اس کو آپس میں استعمال کرو۔حضرت علی مرتضیٰؓ کی حدیث میں مرفوعًا آیا ہے کہ ایک ایسا سخت وقت آئے گا کہ مومن اپنے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹے گا۔اور آپس کے فضل کو بھول جائے گا۔حالانکہ اللہ کریم نے فرمایا کہ آپس کے فضل کو نہ بھولو۔[الحدیث، بروایت ابن مردویہ] عون بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں امیروں میں اٹھتا بیٹھتا تھا تو سخت غمگین رہتا ان کو اچھے لباس و عمدہ سواریوں پر دیکھتا وہ عمدہ خوشبو لگاتے تھے۔لیکن جب فقیروں کے پاس بیٹھا تو بہت سکون ملا۔تم آپس میں فضل کو فراموش نہ کرو۔اور جب کوئی سائل تمہارے پاس آئے اور تمہارے پاس اور کچھ نہ ہو تو اس کو دعا ہی دے دو۔[بروایت ابن ابی حاتم] فتح البیان میں اسی کو راجح کہا ہے۔کہ ﴿الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّکَاحِ﴾ سے زوج مراد ہے ولی نہیں۔

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَى وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴿۲۳۸﴾ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۲۳۹﴾

(مسلمانو) سب نمازیں خصوصاً بیچ کی نماز (یعنی نماز عصر) پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو اور اللہ کے آگے ادب سے کھڑے رہا کرو۔ اگر تم خوف کی حالت میں ہو تو پیادے یا سوار (جس حال میں ہو نماز پڑھ لو) پھر جب امن (و اطمینان) ہو جائے تو جس طریق سے اللہ نے تم کو سکھایا ہے جو تم پہلے نہیں جانتے تھے اللہ کو یاد کرو۔

فائدہ: درمیانی نماز سے نماز عصر مراد ہے۔ کیونکہ یہ دن اور رات کے درمیان میں ہوتی ہے وسطیٰ کی قید میں متعلق زیادہ یہی ہے کہ وہ نماز عصر مراد ہے۔ طلاق وغیرہ کے معاملات کے درمیان نماز کا ذکر کیا ہے تاکہ لوگ متنبہ ہوں کہ ایسا نہ ہو کہ ان معاملات میں پڑ کر بندگی بھول جائیں۔ اسی لیے نماز عصر کی قید لگائی ہے کہ اس وقت امور دنیا میں زیادہ مشغولیت ہوتی ہے۔ اور جو فرمایا کہ عاجزی سے کھڑے رہو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس حرکت سے یہ محسوس ہو کہ آدمی غیز نماز میں ہے اس حرکت کے ارتکاب سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ جیسے کھانا پینا باتیں کرنا وغیرہ۔ پھر فرمایا کہ اگر کوئی چارہ نہ ہو بحالت جنگ جس طرح ممکن ہو نماز پڑھ لو خواہ سوار ہو یا پیدل یا خواہ غیر قبلہ کی طرف کیوں نہ ہو۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ کریم نے محافظت صلوٰات کا حکم دیا کہ ان کو وقت پر بجالاؤ۔ اس کی حفاظت کرو۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ سے آیا ہے کہ میں آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کون سے عمل سب سے افضل ہے فرمایا بروقت نماز پڑھنا۔ میں نے کہا پھر کونسا عمل؟ فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ کرنا۔ میں نے کہا پھر کون سے کام افضل ہے؟ فرمایا: ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔ اگر میں کچھ اور پوچھتا تو وہ اور زیادہ بتادیتے۔ ام فروہ کہتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اعمال کا ذکر کیا پھر فرمایا کہ اللہ کو اعمال میں سے زیادہ محبوب وقت پر نماز پڑھنا ہے۔ [بروایت احمد] اس کو ابو داؤد اور ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ ترمذی نے کہا کہ ہم اس کو عمری کے طریق سے پہچانتے ہیں اور وہ قوی نہ ہے۔ پھر سب نمازوں سے زیادہ نمازِ وسطیٰ کی تاکید فرمائی۔ اس میں سلف و خلف کا اختلاف رہا کہ وہ کون سی نماز ہے۔ حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ صبح کی نماز ہے۔ صحابہؓ و تابعینؒ کا یہی قول ہے۔ امام شافعی بھی اسی طرف گئے ہیں۔ اس لیے کہ قنوت اسی نماز میں ہوتی ہے۔ وسطیٰ اس لیے کہ یہ دو رباعی نمازوں کے درمیان ہے اس میں قصر نہ ہوتا ہے یعنی ظہر اور عشاء کے درمیان ہے یا اس طرح کہ یہ دو جہری اور دو سری نمازوں میں درمیانی ہے۔ بعض نے کہا کہ اس سے نماز ظہر مراد ہے۔ زید ابن ثابت کا یہی قول ہے آنحضرت ﷺ اس کو

دوپہر کو پڑھتے تھے۔ یعنی یہ دن کا درمیان والا حصہ ہے۔ صحابہؓ پر یہ نماز سخت گرمی کی وجہ سے سخت ہوتی تھی ۔اسامہ بن زید کہتے ہیں کہ یہ نمازِ ظہر ہے آنحضرتؐ اس کو دوپہر کو پڑھتے تھے اور اس وقت آپؐ کے پیچھے ایک یا دو صفیں لوگ ہوتے۔لوگ قیلولہ و تجارت میں مصروف ہوتے تھے۔ بعض صحابہؓ و تابعینؒ اور امام ابو حنیفہؒ کا یہی موقف ہے۔ بعض نے کہا وہ نماز عصر ہے۔ترمذی اور بغوی نے کہا اکثر علمائے صحابہؓ وغیرھم کا یہی قول ہے۔ماوردی نے کہا کہ جمہور تابعینؒ کا یہی قول ہے۔ابن عبد البر نے کہا کہ اکثر اہل اثر کا یہی قول ہے۔ابن عطیہ نے کہا جمہور لوگوں کا یہی قول ہے دمیاطی نے کتاب " کشف الغطاء" میں اسی پر نص کی ہے۔ایک گروہ غیر صحابہؓ و تابعینؒ سے یہی منقول ہے جن کے نام ابن کثیر نے ذکر کیے ہیں۔امام احمد بھی اسی طرف گئے ہیں۔ماوردی نے کہا شافعی کا مسلک بھی یہی ہے۔ابن منذر نے کہا: امام ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد سے بھی اسی طرح صحیح ثابت ہے۔ابن حبیب مالکی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔اور اس پر دلیل ذکر کی ہے۔ علی مرتضٰی نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے احزاب کے دن فرمایا کہ انہوں نے ہمیں صلوۃ وسطٰی نماز عصر سے باز رکھا۔اللہ ان کے دلوں کو اور گھروں کو آگ سے بھر دے پھر اس کو مغرب اور عشاء کے درمیان پڑھا۔ [بروایت احمد وبتخریج الشیخان.ابو داؤد،ترمذی،نسالی وغیر واحد من اصحاب المسانید والسنن والصالح من طرق یطول ذکرها] ابن کثیر نے اس باب میں احادیث صحیحہ وحسنہ کی مناسب مقدار ذکر کر کے کہا کہ یہ احادیث اس پر بطریق نص ہیں۔اس میں کسی اور چیز کا احتمال نہ ہے۔اس نماز پر محافظت کا حکم اس کی تاکید ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے حدیث صحیح میں مرفوعاً آیا ہے کہ جس کی نماز عصر ضائع ہوگئی گویا اس کے اہل ومال لٹ گئے۔دوسری صحیح حدیث میں بریدہ سے یوں آیا ہے کہ بادل کے دن نماز کو جلد پڑھو۔جس نے نماز عصر کو ترک کردیا اس کے عمل ضائع ہوگئے۔ابو نضرہ غفاری نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے وادی حمیص میں ہمیں نماز عصر پڑھائی۔پھر فرمایا کہ یہ نماز تم سے پہلوں پر پیش کی گئی تھی۔انہوں نے اس کو ضائع کیا۔سنو! جو اس نماز کو پڑھے گا دوہرا اجر پائے گا۔اس کے بعد اور کوئی نماز نہ ہے جب تک کہ تم شاید (ستارہ) کو دیکھو۔ [بروایت احمد ومسلم] حضرت عائشہؓ کے غلام ابو یونس نے کہا کہ مجھے حضرت عائشہؓ نے حکم دیا کہ میں ایک مصحف لکھوں اور فرمایا کہ جب تو آیت:﴿حافظوا علی الصلوٰت والصلوۃ الوسطیٰ ﴾ پر آؤ تو مجھے خبر دینا ۔جب میں اس مقام پر پہنچا تو میں نے ان کو خبر دی تو انہوں نے لفظ وسطٰی پر فرمایا لکھو وَصلوۃ العصر پھر کہا کہ میں نے یہ آنحضرت ﷺ سے سنا ہے۔[بروایت مسلم واحمد] حضرت عروہ نے فرمایا کہ مصحف عائشہ میں اسی طرح تھا، حسن بصری نے کہا: آنحضرتؐ اسی طرح پڑھتے تھے۔اسی طرح کا کتابت مصحف کی بابت ایک قصہ امام مالک

نے حضرت حفصہ زوج النبیؐ سے بھی روایت کیا ہے۔نافع نے کہا کہ میں نے اس مصحف کو پڑھا ہے اس میں واؤ درج ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز عصر نماز وسطیٰ کے سوا ہو۔ کیونکہ واؤ مغایرت کے لیے ہوتی ہے۔ مگر اس کے بہت سے جواب دیئے گئے ہیں۔ایک یہ ہے کہ یہ واؤ زائد ہے جیسے ان فرامین میں ﴿وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ "اور اسی لیے ہم آیات کو مفصل بیان کرتے ہیں اور تاکہ مجرموں کی راہ واضح ہو سکے۔" اور اس فرمان میں ﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴾ "اور اسی طرح ہم نے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھائی اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔" یا یہ عطف صفات کے لیے نہیں ہے جیسے فرمایا ﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ٥ وَسَبِّحِ اسْمِ رَبِّكَ الْاَعْلَى ٥ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ٥ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ٥ وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ٥﴾ اسی طرح کا واؤ اشعار عرب میں بھی مستعمل ہے۔پھر اس لفظ کی تلاوت منسوخ ہو گئی۔ جیسا کہ مسلم میں براء بن عاذب سے روایت کیا ہے۔امام شوکانی بھی اسی طرف گئے ہیں کہ نماز وسطیٰ سے نماز عصر مراد ہے۔اور اپنے بیان میں اسی موقف کی پرزور تائید کی ہے۔ قبیصہ بن ذویب نے کہا کہ اس سے نماز مغرب مراد ہے۔ کیونکہ یہ ثنائی و رباعی کے درمیان میں ہے۔وتر مفروضات سے ہے اس کی فضیلت مذکور ہے۔ بعض نے کہا نماز عشاء مراد ہے۔واحدی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ بعض نے کہا وہ کوئی سی نماز ہے اس کی تعیین نہ ہے۔ جیسا کہ شب قدر مبہم ہوتی ہے کہ کس سال کس مہینے اور کس عشرے میں ہوتی ہے۔اسی طرح یہ نماز بھی مبہم ہے۔ ابن المسیب قاضی شریح نافع مولیٰ ابن عمرؓ وغیرہ اسی طرف گئے ہیں۔ جوینی نے کتاب نہایہ میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ یہی قول امام ماوراء النحر ابن عبد البر کا مختار ہے۔ مگر ایسا اختیار کرنا نامناسب ہے کیونکہ اطلاع و حفظ کے بعد ایسی بات کو اختیار کرنا جس پر کوئی سنت و اثر دلیل نہ ہو انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے۔ کسی نے کہا کہ نماز فجر اور نماز عشاء مراد ہے۔ کسی نے کہا کہ جماعت کی نماز مراد ہے۔ کسی نے کہا نماز جمعہ اور کسی نے کہ نماز خوف مراد ہے۔ کسی نے نماز عیدین مراد ہیں۔ کسی نے کہا نماز وتر کسی نے کہا نماز چاشت مراد ہے۔ بعض نے وجہ ترجیح ظاہر نہ ہونے اور ادلہ کے ٹکراؤ کی وجہ سے توقف اختیار کیا ہے۔ کیونکہ کسی ایک قول پر اجماع نہ ہوا اور صحابہؓ کے دور سے اب تک یہ اختلاف برقرار ہے۔ابن جریر نے کہا کہ صحابہؓ کی آراء بھی اس نماز کے متعلق مختلف تھیں۔اور پہلے قول کی نسبت باقی سب اقوال ضعیف ہیں۔اور معرکہ نزاع کا نماز عصر و فجر ہیں۔ سنت سے ثابت ہوا کہ وہ نماز یہی نماز عصر ہے۔اس لیے اسی کو ترجیح دینا چاہئے۔ابن ابی حاتم نے کتاب فضائل شافعی میں امام صاحب سے نقل کیا ہے کہ

:((کل ماقلت فکان عن النبی صلی الله علیه وسلم بخلاف قولی ممایصح فحدیث النبی صلی الله علیه وسلمٖ اولیٰ ولا تقلد وانی))ربیع، زعفرانی اور امام احمد بھی شافعی سے اسی طرح روایت کرتے ہیں۔ شافعی سے ابن ابی الجارود کا لفظ یہ ہے کہ:((اذصح الحدیث وقلت قولا فانا راجح عن قولی وقائل بذالك))ابن کثیر نے فرمایا :((فهذا من سیادته وامانته وَهذا انفس اخوانه من الائمة رحمهم الله تعالی))اسی مقام سے ماوردی نے قطعی طور پر یہ بات کہی ہے کہ شافعی کا مذہب یہ ہے کہ نماز وسطیٰ نماز عصر ہے۔اگرچہ قول جدید وغیرہ میں انہوں صلوۃ فجر کی دلیل پر نص کی ہے کیونکہ احادیث میں اس کا نماز عصر ہونا ثابت ہے محدثین کی ایک جماعت ان کے مذہب کے موافق ہے۔والحمد لله المنة. بعض فقہاء نے امام شافعی کی بابت یہ انکار کیا کہ ان کا موقف نماز عصر کی جانب ہو بلکہ انہوں نے نماز صبح پر بات ثابت کی ہے۔ کہ ان کا قول صرف یہی ہے۔ماوردی نے کہا بعض نے اس مسئلے میں دو اقوال بیان کیے ہیں۔باہم مخالف اقوال کے ذکر اور ان کے جواب کا اور مقام ہے یہاں ان کو لکھنا مناسب نہ ہے۔ہم نے اس کو علیحدہ ذکر کر دیا ہے۔میں کہتا ہوں کہ جس طرح امام شافعی سے مروی ہے کہ حدیث کے خلاف میری بات کو تسلیم نہ کرو اسی طرح ائمہ ثلاثہ سے بھی مروی ہے۔ائمہ مجتہدین کے خصوصی رسالہ" جلب المنفعه " میں لکھے گئے ہیں۔اسی بنیاد پر کتاب وسنت کے موافق موقف کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ ائمہ اربعہ کا یہی موقف ہے۔اگرچہ اہل الرائے اور مقلدین اس کو پسند نہ کریں۔

فائدہ: فتح البیان میں یہ ہے کہ صلوات سے پانچوں نمازیں مراد ہیں۔اور محافظت سے مراد یہ ہے کہ ان کو تمام ارکان وحدود کے ساتھ بجالایا جائے۔اور وسطیٰ اوسط کی تانیث ہے۔اوسط اور وسط عمدہ چیز کو کہتے ہیں۔ جیسے فرمایا﴿وَ كَذَالِكَ جَعَلْنَا كُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ کہ "اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسَط بنادیا۔" یہ اس وسط سے مشتق نہ ہے جس کے معنی ہیں متوسط ہونا دو چیزوں کے درمیان۔بلکہ وسط بمعنی عدل وخیار ہے۔اگرچہ نماز پنجگانہ میں یہ بھی داخل ہے مگر اس کی اہمیت وشرافت کے سبب اس کا الگ ذکر کیا ہے۔اس نماز کی تعیین میں اٹھارہ اقوال ہیں، جن کو علامہ شوکانی نے شرح منتقیٰ میں تحریر کیا ہے۔ہر قول کا متمسک بیان کر کے یہ کہا کہ راجح قول وہ ہے جس طرف جمہور گئے ہیں کہ وہ نماز عصر ہے۔پھر تفسیر فتح القدیر میں بعض احادیث صحیحہ ذکر کر کے یہ لکھا ہے کہ ان احادیث میں اس موقف کی تائید وتصریح ہے کہ اس سے مراد نماز عصر ہے۔اس باب میں صحابہؓ سے بھی بہت سے آثار مروی ہیں۔ مگر جب آنحضرت ﷺ سے ثابت ہو گیا تو اب کسی اور تائید کی حاجت نہ رہی جو آثارِ صحابہؓ حدیث مرفوع کے خلاف ہوں وہ حجت نہ ہوں گے۔اور جو قرائت وَصلوۃ العصر جس کا مقتضیٰ مغایرت ہے، اس

کی معارض روایت عروہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ مصحف عائشہؓ میں اس طرح تھا وَھِیَ صلوٰۃ العصر اس کو ابن جریر نے روایت کیا۔ حالانکہ اگلی قرأت کا نسخ بھی ثابت ہو چکا ہے۔ جس کو عائشہؓ، حفصہؓ اور ام سلمہؓ نے نقل کیا ہے۔ غرضیکہ جو بات آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے وہ کدورت معارضہ سے پاک ہے۔ اسی کو مضبوطی سے پکڑنا چاہئے۔ باقی اقوال محض رائے ہیں کسی طرح یہ حجت کا لائق نہ ہیں۔ یہ عدم حجیت بھی اس صورت میں ہے کہ اس کا کوئی معارض موجود نہ ہوتا۔ پھر جبکہ معارض موجود ہے اور ہے بھی اعلیٰ درجے کا صحیح و ثابت پھر کس طرح یہ اقوال کہ فلاں فلاں نماز فرض یا نفل مراد ہیں۔ لائق اعتماد و التفات ہو سکتی ہیں۔ خازن نے کہا کہ سب اقوال میں سے یہ قول صحیح ہے کہ صلوۃ وسطیٰ سے نماز عصر مراد ہے۔ کیونکہ اس باب میں احادیث صحیحہ وارد ہیں۔

فائدہ: قنوت کے معنی خشوع و ذلت ہیں۔ یہ امر اس بات کو لازم ہے کہ نماز میں بات نہ کرنا چاہئے۔ اسی لیے جبکہ آنحضرت انے ابن مسعود کے سلام کا جواب بحالت نماز نہ دیا تو عذر بیان فرمایا کہ :((انّ فی الصلوۃ لشغلًا)) صحیح مسلم میں ہے کہ معاویہ بن حکم سلمی سے فرمایا کہ یہ نماز ہے اس میں لوگوں کی باتوں سے کچھ نہ ہونا چاہئے۔ یہ تو تسبیح و تکبیر ذکر اللہ ہے۔ زید بن ارقم نے کہا کہ لوگ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں اپنے ساتھی سے بات چیت کرتے تھے کام کاج کرتے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر ہمیں حکم ہوا کہ خاموشی سے نماز میں کھڑے ہوں۔ [بروایت احمد والجماعۃ سوی ابن ماجہ] ایک جماعت علماء پر یہ حدیث مشکل ہوئی ہے۔ کیونکہ نماز میں تحریم کلام مکہ میں ہوئی جبکہ ابھی مدینہ کی طرف ہجرت نہ کی تھی۔ اور یہ حکم ہجرت حبشہ کے بعد نازل ہوا۔ جیسا کہ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں ہے کہ ہجرت حبشہ سے قبل جب ہم رسول ﷺ کو وہ بحالت نماز ہوتے سلام کہتے تو وہ جواب دیتے تھے۔ پھر جب ہم وہاں سے واپس آئے تو سلام کیا انہوں نے جواب نہ دیا ہمارا خیال ادھر ادھر گیا جب سلام پھیرا تو فرمایا میں نماز میں تھا اللہ جو نیا حکم چاہتا ہے کرتا ہے۔ انہی احکام میں سے یہ بھی ہے کہ نماز میں بات نہ کرو۔ ابن مسعود پرانے مسلمانوں میں سے محاجر حبشہ تھے۔ پھر وہاں سے مکہ آئے پھر مکہ سے مدینہ ہجرت کی۔ اور یہ آیت کہ ﴿وَقُوْمُوْ لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ ﴾ بلا خلاف مدنی ہے۔ اس لیے یہ کہا ہے کہ زید بن ارقم نے اس کلام کی خبر دے کر اپنی سمجھ کے مطابق تحریم کلام پر استدلال کیا ہے۔ (وقت مقصود نہ ہے) واللہ اعلم. بعض نے کہا زید کا مطلب یہ ہے کہ یہ حرمت ہجرت کے بعد ہوئی۔ گویا دو دفعہ کلام مباح ہوا اور دو دفعہ حرام ہوا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ہمارے اصحاب میں سے ایک جماعت نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ مگر پہلی بات ظاہر تر ہے۔ اور حضرت ابن مسعود کی حدیث جس میں سلام کا جواب نہ دینے کا ذکر ہے اس کو ابو یعلی نے بھی روایت کیا ہے۔ اہل علم نے کہا کہ

قنوت کے تیرہ معانی ہیں۔ان معانی کو شوکانی نے نیل الاوطار میں ذکر کیا ہے۔اور وہ بلوغ المرام کی شرح مسك الختام میں بھی مذکور ہیں یہاں یہ بات متعین ہے کہ یہ سکوت کے معنی میں ہے۔اس کی دلیل حدیث مذکورہ ہے۔وہ قنوت اور ہے جو نماز صبح یاوتر میں کہا جاتا ہے۔اس میں مختلف احادیث وارد ہیں۔کسی میں ہے کہ رکوع کے بعد قنوت ہے کسی میں رکوع کے بعد قنوت کا ذکر ہے کسی میں سب نمازوں میں اور کسی حدیث میں بعض نمازوں میں قنوت کا ذکر ہے۔کسی میں بلا اختصاص ہے اور کسی میں مختص بنوازل مذکور ہے۔راجح یہ بات ہے کہ یہ قنوت نازلہ کے ساتھ خاص ہے۔"شرح منتقیٰ" میں اس کی مفصل بحث ذکر کی گئی ہے۔

فائدہ: نماز فرض کی ادائیگی کے بعد حالت شغل کا حکم ذکر فرمایا کہ فرض نماز اگر بحالت جنگ مشغولیت کی وجہ سے مکمل ادا نہ ہو سکے تو جس طرح بھی ممکن ہو پڑھ لے۔سوار ہو پیدل ہو قبلہ رخ ہو یا غیر قبلہ رخ۔حضرت ابن عمرؓ نے اسی طرح فرمایا ہے۔نافع کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ ابن عمرؓ نے یہ بات آنحضرت ﷺ سے روایت کی ہے۔[بروایت الشیخان] مسلم کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ اگر خوف زیادہ ہو تو سوار ہو یا پیدل ہو اشارے سے پڑھ لے۔عبد اللہ بن انیس جھنی کو آنحضرت ﷺ نے خالد بن سفیان کے قتل کے لیے بھیجا اور وہ عرفہ یا عرفات کی طرف تھا۔نماز عصر کا وقت ہو چکا تھا میں نماز کے فوت ہو جانے کے خوف سے اشارے سے پڑھتا جاتا تھا۔[بروایت احمد وابو داؤد باسنادٍ جید] ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے بندوں کے لیے رخصت ہے کہ اس نے ان سے بوجھ اٹھا دیئے۔حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ سوار سواری پر اور پیدل چلنے والا ویسی حالت میں نماز ادا کرے۔حسن، مجاہد، مکحول، سدی، حکم، مالک، اوزاعی اور ثوری کا بھی یہی قول ہے۔اور اتنا زیادہ کیا کہ جس طرف منہ کرے ادھر سے سر سے اشارہ کرتا جائے۔امام احمد نے فرمایا کہ بعض حالات میں نماز خوف ایک رکعت ہوتی ہے۔جبکہ دونوں لشکروں کی مڈ بھیڑ ہو۔حضرت ابن عباسؓ کی اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے جس کو مسلم اہل سنن اور ابن جریر نے روایت کیا ہے۔کہ اللہ نے نماز کو تمہارے نبیؐ کی زبان پر حضر میں چار، سفر میں دو اور خوف کی حالت میں ایک رکعت فرض کی ہے۔حضرت حسن، بصری، قتادہ، ضحاک وغیر ھم کا یہی قول ہے۔حضرت جابرؓ بن عبد اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں اور ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔اس نماز کو نمازِ مسائفہ کہتے ہیں کہ وہ نماز جو سیف چلنے کی حالت میں پڑھی جائے۔امام بخاری کا لفظ یہ ہے کہ ((باب الصلوۃ عنہ مناھضۃ الحصون ولقاء العدو)) یعنی وہ نماز کو قلعہ گیری اور دشمن کی ملاقات کے وقت پڑھی جاتی

ہے۔اوزاعی نے کہاکہ اگر فتح ہونے کو ہے مگر نماز نہیں پڑھ سکتے تو ہر آدمی بذات خود الگ الگ اشارے سے پڑھ لے۔اگر یہ بھی ممکن نہ ہو سکے تو لڑائی ٹلنے تک تاخیر کرے۔پھر امن کی حالت میں دو رکعت پڑھ لے۔ورنہ اگر ایک رکعت اور دو سجدے بھی نہ ہو سکیں تو پھر بحالت امن تک موخر کر دے۔صرف تکبیر کہہ لینا کافی نہ ہوگا۔ امن کی حالت میں ادا کرے۔مکحول کا بھی یہی قول ہے۔حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ ہم نے فجر کے وقت ایک قلعے پر چڑھائی کی۔اور لڑائی زور پر تھی ہم دن چڑھنے سے پہلے نماز نہ ادا کر سکے۔ہم ابو موسیٰ کے ساتھ تھے۔مجھے اس نماز کے بدلے دنیاومافیہا کی کوئی خوشی نہ تھی۔یہ بخاری کا لفظ ہے پھر اس پر اس حدیث کو شاہد ٹھہرایا جبکہ غزوہ خندق کے دن لڑائی کی وجہ سے نماز کو غروب آفتاب تک تاخیر کیا۔اسی طرح وہ حدیث جس میں ہے کہ دو شخصوں کو بنی قریظہ کی طرف بھیجا تھا۔راستے میں نماز عصر کا وقت ہو گیا ایک نے راستے میں پڑھ لی دوسرے نے غروب تک تاخیر کی۔آنحضرت ﷺ نے دونوں میں سے کسی کو ملامت نہ کی۔اس سے معلوم ہوا کہ بخاری کا مختار یہی ہے۔جبکہ جمہور اس کے خلاف ہیں۔وہ یوں کہتے ہیں کہ جس طرح نماز خوف مشروع ہوئی وہ طریقہ غزوہ خندق کے بعد ہوا ہے۔جیسا کہ وہ طریقہ سورہ نساء میں مذکور ہے۔جیسا کہ حدیث ابو سعید وغیرہ میں وضاحت سے مذکور ہو ہے۔بخاری،اوزاعی اور مکحول کا جواب یہ ہے کہ اس نماز کا غزوہ خندق کے بعد مشروع ہوا اس بات کے جواز کو منافی نہ ہے جب ایسا نہیں تو گویا جائز ٹھہرا۔صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تستر شہر کی فتح کے وقت ایسا ہی کیا تھا۔یہ بات مشہور ہے کسی نے اس کا انکار نہ کیا ہے۔فتح البیان میں لکھا ہے کہ اس آیت سے معلوم یہ ہوا کہ یہ عبادت حسبِ حال ہر حالت میں لازم ہے۔یہ نماز دو طرح ہے۔اس آیت میں اس نماز کا ذکر ہے جو بحالت لڑائی پڑھی جائے۔دوسری نماز غیر قتال میں ہے اس کا ذکر سورۃ نساء میں آئے گا۔پھر فرمایا کہ جب تم جمع ہو تو اسی طرح پڑھو جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے۔یعنی قیام ورکوع، قعود وسجدہ وتشہد ودرود وغیرہ پورا ادا کرو۔کوئی کمی نہ کرو اس کا شکر بجا لاؤ۔اس کا بکثرت ذکر کرو۔جیسا کہ نماز خوف کے ذکر کے بعد فرمایا ﴿فَاِذَا اطْمَنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا﴾ کہ "پھر جب تم اطمینان میں آجاؤ تو نماز کو قائم کرو۔بلاشبہ نماز مومنوں پر وقت پر لکھی گئی ہے۔" اور جو حدیثیں نماز خوف کے متعلق مذکور ہیں وہ سورۃ نساء کی آیت:﴿وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ﴾ کہ "جب آپؐ ان میں ہوں پھر آپؐ انہیں نماز کے لیے کھڑا کریں۔" کے تحت ذکر کی جائیں گی۔ان شاء اللہ۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَ لِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۲۴۱﴾ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۲۴۲﴾

اور جو لوگ تم میں سے مر جائیں اور عورتیں چھوڑ جائیں وہ اپنی عورتوں کے حق میں وصیت کر جائیں کہ ان کو ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں، ہاں اگر وہ خود گھر سے نکل جائیں اور اپنے حق میں پسندیدہ کام (یعنی نکاح) کر لیں تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔ اور مطلقہ عورتوں کو بھی دستور کے مطابق نان و نفقہ دینا چاہیئے پرہیز گاروں پر (یہ بھی) حق ہے۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام تمہارے لیے بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

فائدہ: یہ حکم تب کا ہے جب کہ مردے کی وصیت پر وراثت موقوف تھی اب جبکہ وارثوں کے حصے مقرر ہیں تو عورت کا حصہ بھی مقرر ہے۔ اب مردے کو ذوی الفروض کے لیے وصیت کرنا موقوف ہوا۔ پہلے اس عورت کو لباس دینے کا ذکر تھا جس کا نہ مہر مقرر ہوا نہ مدخولہ ہوئی۔ یہاں سب کے متعلق فرمایا کہ انہیں لباس دینا بہتر ہے۔ اور اس پہلی کو لازم طور پر دینا ہوا۔ یہاں تک کہ نکاح و طلاق کے احکام ختم ہوئے۔

فائدہ: اکثر علماء نے کہا کہ یہ آیت اگلی آیت سے منسوخ ہے۔ ﴿يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا﴾ ابن زبیر نے حضرت عثمان سے کہا کہ جب یہ آیت منسوخ ٹھہری ہے تو اس کا لکھنا مصحف میں کیا ضروری ہے اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ کہا اے بھتیجے! میں کسی چیز کو جہاں مصحف میں پایا وہاں سے نہ بدلوں گا۔ اور وہیں رہنے دوں گا۔ [بروایت بخاری] حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جاتا اس کو ایک سال کا نفقہ و سکنیٰ دیا جاتا آیت مواریث نے اس کو منسوخ کر کے ترکہ خاوند سے ربع یا ثمن رکھا۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ یعنی اگر اس کی اولاد ہے تو ثمن ملے گا اور اگر نہیں ہے تو ربع ہوگا۔ وصیت کا حکم چار ماہ دس دن والی آیت سے منسوخ ہو گیا۔ ابن المسیب نے کہا ناسخ وہ آیت ہے جو فرمایا ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ﴾ "کہ اے ایمان والو! جب تم ایمان والیوں سے نکاح کرو۔" مقاتل و قتادہ نے کہا بلکہ اس کی ناسخ آیت میراث ہے۔ بخاری نے حضرت مجاہد سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے سات ماہ بیس راتوں کو وصیت ٹھہرایا چاہے رہے چاہے نہ رہے چلی جائے، یہی مطلب ہے لفظ غَيْرَ إِخْرَاجٍ کا کہ اگر وہ خود چلی گئی تو کچھ گناہ نہ ہوگا۔ غرضیکہ عدت بدستور واجب رہی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس آیت نے عدت اہل

والوں کے پاس گذارنے کا حکم منسوخ کر دیا۔ چاہے اس کے گھر میں رہے یا کہیں اور چلی جائے۔ میراث نے آکر سکنیٰ کو منسوخ کر دیا۔ اب جہاں دل چاہے رہے سکنیٰ نہ ہے۔ یعنی اس آیت میں ایک سال کی عدت نہ ہے۔ جیسے جمہور نے خیال کیا ہے کہ چار ماہ دس رات کی عدت نے اس کو منسوخ کر دیا ہے۔ بلکہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر وہ چاہے تو بیوی کو اپنی وفات کے بعد ایک سال تک وہیں رہنے کی وصیت کر جائے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ﴾ یعنی ”اللہ تمہیں اس بات کی وصیت کرتا ہے۔“ جیسے فرمایا: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ﴾ اور یہ فرمان ﴿وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ﴾ یا یہ مطلب ہے کہ تم انہیں وصیت کر جاؤ۔ ابن جریر نے کہا کہ لفظ وصیۃ مرفوع ہے۔ یعنی تم پر یہ وصیت فرض ہے۔ انہیں اس امر سے روکا نہ جائے۔ اس دلیل سے ﴿غَيْرَ إِخْرَاجٍ﴾ پھر جب عدت ہو چکے اور وہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکو اس قول سے کہ ﴿فَإِنْ خَرَجْنَ﴾ کہ ”اگر وہ خود نکل جائیں۔“ تو تم پر کچھ گناہ نہ ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا اس قول میں ایک التجاہے اور اس لفظ میں ایک مساعدت ہے۔ اسی لیے ایک جماعت نے اس کو اختیار کیا ہے۔ انہی میں سے امام ابو العباس بن تیمیہؒ ہیں۔ اور دوسری جماعت نے اس کا رد کیا ان میں سے ابن عبد البر بھی ہیں۔ اور عطاء کا یہ قول کہ یہ آیت آیت میراث سے منسوخ ہے اگر اس لحاظ سے ہے کہ چار ماہ دس دن سے زیادہ مدت منسوخ ہے تو درست ہے ورنہ اگر اس لحاظ سے منسوخ کہا ہے کہ اتنی مدت کا سکنیٰ بھی ترکہ میت سے واجب نہ ہے اس موقف میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعی نے دونوں باتیں ذکر کی ہیں۔ اور یہ بات کہ تا عدت شوہر کے گھر میں رہنا واجب ہے۔ اس کی دلیل فریعہ بنت مالک کی حدیث ہے۔ کہ ان کا شوہر فوت ہو گیا وہ انہی کے نفقہ پر انہی کے گھر رہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس گھر میں تو نے اس کی خبر وفات سنی ہے اسی میں رہو حتیٰ کہ عدت پوری ہو۔ حضرت عثمان بن عفان نے سن کر اسی پر عمل کیا۔ بروایت مالک و اہل سنن۔ ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

فائدہ: ابن زید نے کہا کہ جب پہلی آیت اتری جس میں حقا علی المحسنین ہے تو ایک آدمی نے کہا چاہوں تو احسان کروں چاہوں تو نہ کروں۔ اس پر اللہ کریم نے فرمایا: ﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ﴾ بعض علماء نے اس آیت کو دلیل بنا کر یہ موقف اختیار کیا کہ ہر مطلقہ کو متاع دیا جائے گا خواہ مفروضہ ہو یا مفروض لہا یا مطلقہ قبل المسیس یا مدخول بہا ہو۔ شافعی وغیرہ سلف کا یہی قول ہے ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اور جو حضرات اہل علم متاع کے مطلقاً قائل نہیں وہ کہتے ہیں کہ صرف اس مطلقہ کے لیے متاع ہے جس کا ذکر حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ والی آیت میں ہے۔ اس سے قبل موقف والوں نے کہا کہ وہ آیت جس میں مطلقاً مطلقات کے لیے متاع کا ذکر ہے

وہ اس طرح ہے جو عموم افراد پر مشتمل ہو اس میں کچھ تخصیص نہ ہو۔ مشہور مذہب یہی ہے۔ کسی نے کہا اس آیت میں متاع واجب وغیر واجب ایک ساتھ مذکور ہیں۔ کہ ایسی مطلقہ جو غیر مفروضہ وغیر مدخولہ ہو اس کے لیے متاع واجب ہے جبکہ باقی مطلقات کے لیے مستحب ہے۔ کسی نے کہا اس جگہ متاع سے نفقہ مراد ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٢٤٣﴾ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٤﴾ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٤٥﴾

بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو (شمار میں) ہزاروں ہی تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے تو اللہ نے ان کو حکم دیا کہ مر جاؤ پھر ان کو زندہ بھی کر دیا کچھ شک نہیں کہ اللہ لوگوں پر مہربانی رکھتا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اور (مسلمانو) اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور جان رکھو کہ اللہ (سب کچھ) سنتا اور (سب کچھ) جانتا ہے۔ کوئی ہے کہ اللہ کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا اور اللہ ہی روزی کو تنگ کرتا اور (وہی اسے) کشادہ کرتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

فائدہ: پہلی امتوں میں یہ واقعہ پیش آیا کہ کئی ہزار لوگ اپنے ساز و سامان اٹھا کر وطن چھوڑ کر گھروں سے نکل پڑے انہیں خوف ہوا کہ ان کا اسباب لوٹ لیا جائے گا۔ انہوں نے لڑنے سے جی چرایا۔ یا انہیں وبا کا خوف ہوا اور تقدیر پر یقین نہ ہوا۔ پھر ایک جگہ پہنچ کر سب مر گئے۔ پھر سات دن کے بعد پیغمبرؑ کی دعا سے زندہ ہوئے۔ تاکہ آئندہ توبہ کر لیں۔ اور یہ اس لیے فرمایا کہ جہاد سے جی چرانا فضول ہے موت کسی کو چھوڑتی نہ ہے۔ اللہ کو قرض دینا یہ ہے کہ جہاد میں مال خرچ کرے۔ تنگی کا اندیشہ نہ کرے۔ اللہ کے ہاتھ میں کشائش ہے۔

فائدہ: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ چار ہزار آٹھ یا چالیس ہزار آدمی تھے۔ ابو صالح نے کہا کہ وہ نو ہزار شخص تھے۔ وہب بن منبہ اور ابو مالک نے کہا کہ وہ تیس ہزار سے کچھ زائد آدمی تھے۔ ان کے گاؤں کا نام "زاوردان" تھا۔ یہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے۔ ابو صالح نے کہا وہ واسط کی جانب رہتے تھے۔ سعید بن عبدالعزیز نے کہا کہ وہ اذرعات کے تھے۔ حضرت عطاء نے کہا کہ یہ ایک کہاوت ہے۔ علی بن عاصم نے کہا کہ وہ واسط سے ایک فرسخ کے فاصلے پر رہتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ لوگ طاعون سے بھاگے تھے۔ کہ

کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں موت نہ ہو۔ جب ایک مقام پر پہنچے تو سب وہیں مر گئے۔ وہاں سے ایک نبی کا گذر ہوا ان کی دعا سے انہیں دوبارہ زندہ کر دیا گیا۔ بہت سے سلف نے کہا کہ وہ بنی اسرائیل کی ایک قوم تھی۔ اور شہر میں رہتے تھے وہاں ان پر وبا چھوٹ پڑی انہوں نے اس آب وہوا کو ناپسند کرتے ہوئے وہاں سے کوچ کیا۔ شہر سے نکل کر جنگل کو بھاگے وہاں وادی افیح میں اترے اور اس وادی کے دونوں کنارے ان سے بھر گئے۔ اللہ نے دو فرشتے بھیجے ایک نے وادی کی اوپر والی جانب سے اور دوسرے نے نچلی جانب سے چیخ ماری جس سے وہ سب لوگ مر گئے۔ جیسے کوئی ایک شخص مرتا ہے۔ ان کو خطیروں میں جمع کر کے ان کی دیواریں بنائیں۔ وہ گل سڑ کر ختم ہو گئے۔ ایک مدت بعد انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبی حضرت حزقیل علیہ السلام کا وہاں سے گذر ہوا تو انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ انہیں میرے ہاتھ پر زندہ کر دے۔ اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ اللہ نے فرمایا۔ حزقیل! یوں کہو کہ اے بوسیدہ ہڈیو! اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم سب مل جاؤ سب ہڈیاں ایک ایک جسم کی صورت میں مل گئیں۔ پھر کہا اے ہڈیو! تمہیں اللہ حکم دیتا ہے کہ گوشت، پٹھے، رگیں پہن لو۔ سب نے ایسا ہی کیا۔ پھر فرمایا اب کہو اے روحو! اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم سے اپنے اپنے بدنوں میں آ جاؤ جن میں تمہیں پہلے بسایا تھا۔ سب کے سب زندہ ہو کر دیکھنے لگے اتنی مدت خواب کی حالت میں رہنے کے بعد جب اللہ نے ان کو زندہ کیا تو وہ بول اٹھے: ((سبحانك لا اله الا انت)) اور یہ ان کی اس زندگی میں بعثت بعد الموت پر بڑی عبرت و قطعی دلیل ہے کہ وہ قیامت کے دن بھی اسی طرح اٹھائے جائیں گے۔ اسی لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ یہ لوگوں پر اللہ کا فضل ہے کہ وہ انہیں قطعی دلائل وواضح حجتیں دکھاتا ہے مگر اکثر لوگ ناشکرے ہیں۔ جو نعمت اللہ نے ان کو دین و دنیا میں دی ہے اس کا شکر نہیں کرتے ہیں۔ وہ لوگ موت سے بچنے اور طویل زندگی کے لالچ میں آ کر وہاں سے بھاگے لیکن اس کا انجام ان کے ارادے کے خلاف ہوا اور ایک لمحے میں موت نے ان سب کو آ لیا اور بے بس ہو کر چل پڑے۔ اسی قبیل سے یہ حدیث صحیح بھی ہے کہ آنحضرت ؐ نے فرمایا کہ جب کسی زمین میں وبا پھوٹ پڑے اور تم وہاں ہو تو وہاں سے نہ نکلو اور اگر کسی جگہ تمہیں اس کی اطلاع ملے تو وہاں نہ جاؤ۔

[بروایت احمد وبتخریج صحیحین بطریق اخری]

فائدہ: فتح البیان میں کہا کہ یہ لوگ آٹھ دن یا اس سے کچھ زیادہ دنوں میں دوبارہ زندہ ہو گئے۔ اور یہ امر کون و قدر میں لکھا تھا۔ اس کے بعد یہ لوگ مدت تک زندہ رہے۔ ان پر موت کا اثر دیکھا جاتا تھا۔ وہ جو کپڑا پہنتے کفن کی طرح ہو جاتا۔ اور مدتوں یہ علامت ان کی اولادوں میں رہی۔ کسی نے کہا یہ پیغمبر حزقیلؑ تھے جن کو ابن

العجوز اور ذوالکفل بھی کہا جاتا ہے۔یہ بنی اسرائیل میں تیسرے خلیفہ تھے پہلے حضرت یوشع پھر کالب پھر حزقیل علیہ السلام۔محدثین ومفسرین نے اس قصے کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔جن کے ذکر میں کوئی خاص فائدہ نہ ہے ان کا حاصل یہی تھا جو مذکور ہو چکا ہے۔یہ ہر قصہ دو گروہ کے لیے نشان عبرت ہے۔وہ جن کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا اور جنہوں نے اس کو سنا۔حضرت عیسیٰ ﷺ کے ہاتھ پر بھی بعض مردے زندہ ہو گئے تھے۔اس پر نصاریٰ نے ان کو اللہ یا ابن اللہ مان لیا۔انہوں نے اتنا خیال نہ کیا کہ حضرت عیسیٰ ﷺ نے تو تین چار مردے زندہ کیے اور یہاں حزقیل ﷺ کے ہاتھ پر ہزاروں مردے زندہ ہو گئے۔وہ معجزہ بڑا ہو یا یہ بڑا ہے۔انہیں کسی نے اللہ یا ابن اللہ نہ کہا۔بہر حال اس جگہ اللہ نے وہ واقعہ بیان کر کے یہ سمجھایا ہے کہ جس طرح تقدیر سے تدبیر نہیں بچا سکتی اسی طرح جہاد سے انسان کے مرنے جینے کا تعلق نہیں نہ اس سے موت جلدی آتی ہے نہ دیر سے بلکہ اس کا تو وقت متعین ہے اور اسے آنا ہے۔خواہ حالت کوئی بھی ہو یا وقت کوئی بھی ہو۔جیسے اللہ کریم نے فرمایا:﴿اَلَّذِیْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْاَطَاعُوْنَامَاقُتِلُوْا قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ کہ ”جنہوں نے اپنے بھائیوں سے کہا اور خود بھی بیٹھ رہے کہ اگر وہ ہماری مانتے تو قتل نہ کیے جاتے۔فرمائیے کہ اپنے نفس سے موت کو ہٹالو اگر تم سچے ہو۔“اور فرمایا:﴿وَقَالُوْارَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ لَوْ لَا اَخَّرْتَنَا اِلٰى اَجَلٍ قَرِیْبٍ الٰی قوله۔فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ﴾ کہ ”انہوں نے کہا اے ہمارے رب! تو نے ہم پر قتال کیوں فرض کر دیا اور ہمیں قریب مدت تک ڈھیل کیوں نہ دی......“ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امیر الجیوش،مقدم عساکر،حامیء اسلام اور ایک سونتی ہوئی تلوار ابو سلیمان حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے مرض الموت میں موت سے قبل فرمایا میں فلاں فلاں موقف میں حاضر ہوا۔میرا جسم کا کوئی حصہ نہ ہے۔کہ جس میں کوئی تیر تلوار کا زخم نہ ہو لیکن اب میں بستر پر اس طرح مر رہا ہوں جیسے گدھا مرتا ہے۔اللہ کے نامردوں کی آنکھوں کو نیند نہ آئے۔یعنی انہوں نے اس بات پر افسوس کیا کہ میں کسی لڑائی میں کیوں نہ مارا گیا اور فراش پر موت آنے پر ماتم کیا۔

چوں خوردنی ست کاشه زهری که قسمت ست

باجبئه کشاده غیر وچراکسے

فائدہ: پھر اس کے بعد اللہ کریم نے مخلوق کو قرض حسنہ دینے کا حکم دیا۔اور ترغیب دلائی کہ اس کے بدلے کئی گنا زیادہ ملے گا۔یہ آیت کلام پاک میں کئی مقامات پر آئی ہے۔حدیث نزول میں مذکور ہے کہ اللہ

کریم فرماتا ہے کہ اسے کون قرض دیتا ہے جو نہ مظلوم ہے نہ محتاج۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایک نصاری ابو الدحداح نے کہا اے اللہ کے رسولؐ! اللہ ہم سے قرض لینا چاہتا ہے ؟ فرمایا :ہاں کہا ذرا ہاتھ بڑھایئے۔ آنحضرتؐ نے ہاتھ بڑھایا۔ کہا میں نے اپنا باغ چار دیواری اپنے رب کو قرض میں دیا۔ اس باغ میں کھجور کے چھ سو درخت تھے۔ ان کی بیوی اور بچے اسی باغ میں رہتے تھے۔ انہوں نے آکر پکارا اے ام الدحداح وہ بولیں لبیک۔ کہا: نکلو، میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض میں دیا ہے۔ [بروایت ابن مردویہ] ابن ابی حاتم عن عمرؓ مرفوعاً۔ حضرت عمرؓ وغیرہ سلف نے فرمایا کہ اس جگہ قرض حسنہ سے انفاق فی سبیل اللہ مراد ہے۔

بعض نے کہا عیال پر خرچ کرنا مراد ہے۔ کسی نے کہا کہ تسبیح تقدیس مراد ہے۔ اور جو فرمایا کہ اس قرض کا اجر کئی گنا زیادہ ہوگا۔ یہ اس فرمان الٰہی کی طرح ہے۔ جو فرمایا ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَہُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَۃٍ مِّاْئَۃُ حَبَّۃٍ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ کہ ”ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کے راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایک دانے کی سی ہے جس نے سات بالیاں اگائیں ہر بالی میں سو دانہ ہے۔ اور اللہ کریم جس کے لیے چاہتا ہے اس سے بھی زیادہ بڑھاتا ہے۔“ حضرت ابوہریرہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکی کو دو لاکھ گنا بڑھاتا ہے۔ [بروایت ابن ابی حاتم] ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً آیا ہے کہ جو شخص کسی بازار میں گیا پھر اس نے یہ کہا: ((لا الٰه الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير)) اللہ اس کے لیے ایک لاکھ نیکی لکھ دیتا ہے۔ اور ایک لاکھ گناہ مٹا دیتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَہُمْ﴾ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے اللہ! میری امت کو اور زیادہ عطا کر۔ تب یہ آیت اتری ﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَہُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ کہ ”بلاشبہ صابر لوگ اپنے اجر بغیر حساب کے دیئے جائیں گے۔“ [بروایت ابن ابی حاتم] کعب احبار نے کہا کہ جب اللہ کی طرف سے کثیر ہوا تو وہ بے شمار ہوگا۔ پھر فرمایا کہ تم خرچ کرو اور پرواہ نہ کرو۔ اللہ رازق ہے۔ جسے چاہے کم دے اور جسے چاہے زیادہ دے۔ اور اس کی حکمت سے وہی واقف ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بنی آدم کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں میں ایک دل کی طرح ہیں۔ اس کو جس طرف چاہے پھیر دے۔ پھر فرمایا اے دلوں کو پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر ثابت رکھ۔ [بروایت مسلم]

أَلَمْ تَرَ إِلَى الْمَلَإِ مِنْ بَنِي إِسْرَاءِيلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۲۴۶﴾

بھلا تم نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا جس نے موسیٰ کے بعد اپنے پیغمبر سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں پیغمبر نے کہا کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو عجب نہیں کہ لڑنے سے پہلو تہی کرو، وہ کہنے لگے کہ ہم راہ اللہ میں کیوں نہ لڑیں گے جب کہ ہم وطن سے (خارج) اور بال بچوں سے جدا کر دیئے گئے لیکن جب ان کو جہاد کا حکم دیا گیا تو چند اشخاص کے سوا سب پھر گئے اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔

فائدہ: حضرت موسیٰ ﷺ کے بعد ایک مدت تک بنی اسرائیل کا کام موقوف رہا۔ جب ان کی نیت خراب ہو گئی۔ ان پر غنیم مسلط ہو گیا۔ اور کافر بادشاہ جالوت نے ان کے اطراف شہر چھین لیے انہیں گرفتار کر لیا۔ وہاں سے بھاگنے والے لوگ بیت المقدس پہنچے اور حضرت شمویل پیغمبر سے چاہا کہ ہم پر کوئی لیڈر مقرر کر دیں کہ ہم کسی سالار کے بغیر نہیں لڑ سکتے۔

فائدہ: حضرت قتادہ نے کہا کہ یہ نبی یوشع بن نون تھے۔ ابن جریر نے کہا بلکہ وہ ابن افراہیم بن یوسفؑ بن یعقوبؑ تھے۔ مگر یہ قول بعید ہے کیونکہ وہ حضرت موسیٰ کے بعد طویل عرصے کے بعد نبی ہوئے تھے۔ یہ سارا ماجرہ حضرت داؤد ﷺ کے زمانے میں ہوا۔ جیسا کہ قصے میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ اور حضرت موسیٰ اور داؤد علیہما السلام کے درمیان ہزار برس کا فاصلہ ہے۔ کسی نے کہا بلکہ وہ نبی شمعون تھے۔ مجاہد نے کہا وہ شمویل تھے۔ وہب بن منبہ نے کہا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کے بعد ایک مدت تک درست رستے پر رہے۔ پھر انہوں نے بدعات نکال لیں۔ بعض نے بتوں کی پوجا کی۔ اور انبیاء ان میں ہمیشہ تورات کے منہج پر انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے۔ ان کو قائم رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ جو کچھ کیا سو کیا۔ اللہ نے ان پر دشمنوں کو غالب کر دیا۔ دشمنوں نے بڑا فساد مچایا۔ اور کچھ مخلوق کو قید کر لیا۔ بہت سے شہر چھین لیے ورنہ اس سے پہلے وہ جس سے لڑتے تھے اس پر غالب آتے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس تورات و تابوت تھا۔ زمانہ قدیم سے ان کی وراثت میں چلا آتا تھا۔ تو کسی ملک نے کسی لڑائی میں ان سے وہ چھین لیے۔ اور تورات الگ لے لی۔ اور کوئی حافظ تورات نہ رہا۔ مگر بہت کم لوگ حافظ تھے۔ ان کی اسباط سے نبوت بھی جاتی رہی۔ اور سبط لاوی جن میں انبیاء

ہوتے تھے۔ان میں ایک حاملہ عورت کے سوا باقی نہ رہا۔انہوں نے اس عورت کو حفاظت سے ایک گھر میں ٹھہرایا۔ کہ شاید اللہ اس کو بیٹا دے اور وہ نبی ہو۔۔اور وہ عورت بھی ہمیشہ دعا کرتی رہی کہ اللہ اسے بیٹا عطا کرے۔ اللہ نے اس کی دعا سن لی اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا اس کا نام شمویل رکھا۔یعنی اللہ نے میری دعا سن لی۔ بعض نے کہا اس کا نام شمعون رکھا تھا۔دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ پھر اس لڑکے نے انہی میں پرورش پائی۔اللہ نے اس کی اچھی تربیت کی جب نبوت کی عمر کو پہنچے تو اللہ نے وحی سے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو اللہ کی توحید کی طرف بلاؤ۔ جب انہوں نے ان کو توحید کی دعوت دی تو انہوں نے بادشاہ کا مطالبہ کیا۔تاکہ ہم اس کے ساتھ مل کر لڑیں۔ان میں کوئی بادشاہ نہ تھا۔ نبیؑ نے کہا اگر اللہ کریم نے بادشاہ مقرر کر دیا اور پھر تم نہ لڑے تو کیا ہوگا۔انہوں نے کہا بھلا ہم کیوں نہ لڑیں گے جبکہ ہمارے شہر لوٹ لیے گئے ہماری اولاد قتل کی گئی۔اللہ کریم نے فرمایا کہ جب ہم نے ان پر جہاد فرض کر دیا تو سب پھر گئے ستر ہزار پھر گئے۔باقی تھوڑے سے بچے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾	اور پیغمبر نے ان سے (یہ بھی) کہا کہ اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے وہ بولے کہ اسے ہم پر بادشاہی کا حق کیونکر ہو سکتا ہے بادشاہی کے مستحق تو ہم ہیں اور اس کے پاس تو بہت سی دولت بھی نہیں، پیغمبر نے کہا کہ اللہ نے اس کو تم پر (فضیلت دی ہے اور بادشاہی کے لیے) منتخب فرمایا ہے اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن و توش بھی (بڑا عطا کیا ہے) اور (اللہ کو اختیار ہے) جسے چاہے بادشاہی بخشے، وہ بڑا کشائش والا (اور) دانا ہے۔

فائدہ: حضرت طالوت کی قوم میں ان سے پہلے سلطنت نہ تھی۔وہ کام کاج کرتے تھے اور ان کی نظر میں اس قابل نہ تھے۔پیغمبرؑ نے کہا کہ سلطنت کسی کا حق نہ ہے عقل و فہم اور وسیع الجسم کو ملنی چاہیے۔اللہ نے پیغمبر کو ایک عصاء کی نشاندہی کی کہ جس کا قد اس کے برابر ہو اس کو بادشاہت دی جائے۔ حضرت طالوت کا قد اس عصاء کے برابر تھا۔

فائدہ: ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جب عوام نے نبیؑ سے بادشاہ کا مطالبہ کیا تو انہوں نے اس منصب کے لیے طالوت کو چنا، وہ خاندانِ شاہی سے نہ تھے بلکہ عام لشکری تھے۔کیونکہ بادشاہی سبطِ یہود میں چلی آتی تھی یہ اس نسل سے نہ تھے۔اس پر انہوں نے انکار کیا کہ ایک تو یہ نسل شاہی سے نہیں پھر یہ محتاج و فقیر بھی ہے۔یہ کس

طرح بادشاہ بن سکتا ہے۔ کسی نے کہا طالوت سقا تھا کسی نے کچھ اور کہا حالانکہ انہیں پیغمبرؑ کی اطاعت کرنا چاہیے تھی سرکشی سے بچنا چاہیے تھا۔ پیغمبر ﷺ نے کہا کہ اس کو میں نے اپنی طرف سے منتخب نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اس کا حقدار کہا ہے پھر وہ عقل ودانش اور علم و شکل و قوت میں بھی تم سے زیادہ ہے۔ جنگی خوبیوں سے واقف ہے۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ کو عالم، حسین، قوی وزبردست وباہمت ہونا چاہیے۔ پھر فرمایا کہ اللہ حاکم ہے وہ جو چاہے سو کرے۔ اس سے تو کوئی پوچھ نہیں سکتا اور وہ جس سے چاہے پوچھے وہ علیم و حکیم اور مخلوق پر مشفق ورحیم ہے۔ فتح البیان میں کہا کہ طالوت عجمی نام ہے کسی نے کہا وہ چرواہا تھا۔ کسی نے کہا وہ مزدور تھا۔ عبرانی زبان میں اس کا نام شاول بن قیس تھا۔ وہ بنیامین بن یعقوبؑ کی نسل سے تھا۔ اس آیت میں شیعہ کے قول کا ابطال ہے۔ جو منصب امامت کو موروث سمجھتے ہیں۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَى وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴿٢٤٨﴾	اور پیغمبر نے ان سے کہا کہ ان کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا جس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تسلی (بخشنے والی چیز) ہو گی اور کچھ اور چیزیں بھی ہوں گی جو موسیٰ اور ہارون چھوڑ گئے تھے، اگر تم ایمان رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے ایک بڑی نشانی ہے۔

فائدہ: بنی اسرائیل میں ایک تابوت چلا آتا تھا۔ اس میں حضرت موسیٰ وہارون کے تبرکات تھے۔ لڑائی میں اس کو ساتھ رکھتے سپہ سالار کے آگے رکھتے تھے۔ جب حملہ کرتے تو اللہ کریم انہیں فتح دے دیتا۔ جب وہ بدنیت ہوگئے تو وہ صندوق ان سے چھین لیا گیا۔ اور غنیم کے ہاتھ لگ گیا۔ اب جبکہ حضرت طالوتؑ بادشاہ بنے تو رات کے وقت وہ صندوق ان کے گھر کے سامنے آگیا۔ سبب یہ بنا کہ غنیم کے شہر میں جس جگہ وہ رکھا تھا وہاں مصیبت پڑی پانچ شہر ویران ہوگئے۔ تب انہوں نے چاروناچار اس کو دو بیلوں پر رکھ کر ہانک دیا۔ پھر فرشتے ان بیلوں کو ہانک کر یہاں لے آئے۔

فائدہ: ابن کثیر فرماتے ہیں کہ پیغمبرؑ نے ان کو کہا تھا کہ طالوت کی برکت وسلطنت کی علامت یہ ہو گی کہ جو تابوت سکینہ تم سے چھن گیا وہ تمہیں واپس مل جائے گا۔ سکینہ کے معنی وقار وجلالت کے ہیں۔ حضرت قتادہ کا یہی قول ہے۔ ربیع نے کہا رحمت مراد ہے۔ حضرت ابن عباس وحسن کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت عطاء نے کہا مراد اللہ کی وہ آیات ہیں جن کے ذریعے دل کو سکون حاصل ہو۔ کسی نے کہا کہ سکینہ ایک تھال تھا جس میں

پیغمبروں کے دل دھوئے جاتے تھے۔اللہ نے وہ تھال حضرت موسیٰؑ کو دیا انہوں نے تورات کی تختیاں اس میں رکھی تھیں۔ حضرت ابن عباس کا ایک یہ قول بھی ہے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا وہ ایک روح ہفافہ ہے اس کا منہ انسان کی طرح ہوتا ہے۔دوسرا لفظ یہ ہے وہ ایک متحرک ہوا تھی جس کے دو سر تھے۔ حضرت مجاہد نے کہا اس کے دو بازو اور ایک دم ہے۔وہب بن منبہ نے کہا کہ وہ ایک بلی کے سر کی طرح تھا جب وہ اندر سے بلی کی سی آواز نکالتا تو فتح ہو جاتی۔دوسرا لفظ یہ ہے کہ وہ اللہ کی روح تھی جب ان میں کسی بات کا اختلاف ہوتا تو وہ حق فیصلہ بتاتی تھی۔ابن عطیہ نے کہا صحیح یہ ہے کہ اس تابوت میں آثار انبیاء کی کچھ چیزیں تھیں۔جن کو دیکھ کر دل مطمئن ہوتے تھے اور نفس قوی و ثابت ہوتے تھے امام شوکانی نے فتح القدیر میں مذکورہ اقوال کے ذکر کے بعد سکینہ کی وضاحت میں یہ فرمایا کہ شاید یہ تفاسیر متناقضہ ان کو یہود کے طریق سے پہنچی ہیں۔اللہ ان کو غارت کرے۔ کہ انہوں نے یہ باتیں دین کو کھیل بنانے کے لیے ذکر کی ہیں۔ذرا دیکھو کہ سکینہ کو کبھی حیوان کہا کبھی جمادات بھر کبھی ایک لایعقل چیز کہا۔اور سب منقولات بنی اسرائیل کا یہی حال ہے۔کہ وہ باہم مخالف ہیں۔اور ایسے امور پر مشتمل ہیں جو عقل سے باہر ہیں۔یہ بات کسی طرح درست نہیں ہو سکتی کہ یہ تفاسیر متناقضہ آنحضرت ﷺ سے مروی ہوں اور نہ یہ کسی قائل کی رائے معلوم ہوتی ہیں۔ان لوگوں کا مرتبہ اس سے کہیں بلند تھا کہ وہ اس قسم کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے۔اور ایسی بات کرتے جس میں اجتہاد کو بھی دخل نہ ہے۔جب یہ بات ثابت ہو چکی تو اب یہ لازم ہوا کہ لغت کی طرف رجوع کیا جائے۔لغت میں جو سکینہ کے معنی ہیں وہ معروف ہیں۔ان امورِ متناقضہ کو اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے اللہ کریم نے اس میں نہ کشائش رکھی ہے نہ تنگی۔اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لفظ سکینہ کی کوئی تفسیر منقول ہوتی تو لازمی طور پر ہمیں اسی پر توقف واجب ہوتا۔لیکن کسی طریق سے اس کی کوئی صحیح تفسیر منقول نہ ہے۔اور بعض صحابہؓ پر سکینہ بوقت تلاوت نازل ہوا تھا۔جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت براء سے آیا ہے کہ ایک شخص سورۃ کہف پڑھ رہا تھا۔اس کے پاس اس کا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ایک بادل نے اس کو آکر ڈھانپ لیا۔وہ گھوڑا اچھلنے لگا۔سکینہ اس شخص سے قریب ہونے لگا۔جب صبح ہوئی تو انہوں نے اس کا ذکر نبی ﷺ سے کیا فرمایا وہ سکینہ تھا جو قرآن پڑھنے کے سبب نازل ہوا تھا۔اس حدیث میں اسی قدر ہے کہ جس چیز کو آپؐ نے سکینہ کہا وہ ایک بادل تھا جو اس قاری کے گرد منڈلایا تھا۔

فائدہ: حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس جگہ بقیہ سے حضرت موسیٰ کا عصا اور تورات کی تختیاں مراد ہیں۔ قتادہ، ربیع، عکرمہ اور سدی کا بھی یہی قول ہے۔ابو صالح نے کہا اس سے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام

کے عصاء اور تورات کی دو تختیاں اور کچھ من مراد ہیں عطیہ نے زیادہ کہا کہ حضرت موسیٰ وہارون کے کپڑے بھی تھے ثوری نے کہا دو جوتے بھی تھے۔ کسی نے کہا کہ اس میں صرف تورات اور علم ہی تھا۔ کسی نے کہا عمامہ بھی تھا۔ کسی نے کہا عمامہ بھی اور اور یہ تبرکات بنی اسرائیل کے پاس نسلاً بعد نسل تھے اور انہیں میراث میں ملتے آئے تھے۔ جب انہوں نے گناہ وفساد شروع کر دیا تو اللہ نے ان پر عمالقہ کو مسلط کر دیا۔ انہوں نے وہ تابوت بنی اسرائیل سے چھین لیا۔ اور آل موسیٰ وآل ہارون سے خود موسیٰ وہارون یا انبیاء بنی یعقوب مراد ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ فرشتوں نے وہ تابوت زمین و آسمان کے درمیان ہوا میں لا کر طالوت کے سامنے رکھ دیا اور وہ سب دیکھتے رہے۔ سدی نے کہا صبح کو وہ طالوت کے گھر میں رکھا ہوا پایا گیا تو سب نے شمعون کی نبوت کو تسلیم کر لیا۔ اور طالوت کی اطاعت کر لی۔ ثوری نے بعض شیوخ سے نقل کیا ہے کہ فرشتے اس کو ایک بیل یا دو گاؤ پر لاد کر لائے تھے۔ کسی نے کہا وہ تابوت اریحا میں تھا۔ مشرکوں نے اس کو لے کر معبد میں ایک بڑے بت کے نیچے رکھا تھا۔ صبح کو وہ بت کے سر پر آ گیا۔ انہوں نے اس کو اتار کر بت کے نیچے رکھا اگلی صبح کو وہ اس بت کے اوپر تھا۔ انہوں پھر اس کو بت کے نیچے گاڑ دیا پھر اگلی صبح بت اوندھے منہ گرا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے تھے۔ تب انہوں نے خیال کیا کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے۔ اور وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔ چار و ناچار اس کو جنگل کی طرف نکال دیا۔ اس گاؤں والوں کی گردنوں میں بیماری لگ گئی ایک لڑکی کے مشورے پر اس کو دو بیلوں پر لاد کر ہانک دیا گیا جو بھی اس کے پاس جاتا تھا مر جاتا تھا۔ حتی کہ وہ دونوں بیل بنی اسرائیل کے شہر کے قریب گئے۔ بنی اسرائیل نے آکر اس کو لے لیا۔ کسی نے کہا کہ داؤد علیہ السلام نے لیا تھا۔ کسی نے کہا دو نوجوانوں نے اس کو پکڑا تھا۔ واللہ اعلم۔ بعض کہتے ہیں کہ تابوت ایک گاؤں میں تھا۔ جو فلسطین کے گاؤں میں سے تھا اس کو ازدہ کہتے ہیں۔ ابو صالح نے کہا کہ تابوت میں کلمۂ کشائش تھا: ﴿لا الٰہ الا اللہ الحلیم الکریم سبحان اللہ رب السمٰوٰت السبع ورب العرش العظیم والحمد للہ رب العالمین﴾ قتادہ وکلبی کا قول یہ ہے کہ سکینہ طمانیت کو کہتے ہیں۔ جس جگہ وہ تابوت پڑا ہوتا اس جگہ کے رہنے والوں پر تسکین نازل ہوتی تھی۔ یہ قول صحت کے زیادہ قریب ہے۔ اس بنیاد پر کہ جس چیز سے دلجمعی ملے وہی سکینہ ہو سکتی ہے۔ لیکن جب اس باب میں کوئی نص صریح موجود نہ ہے تو ایک قول کو صحیح اور دوسرے کو ضعیف کہنے کا جواز کیسا۔ پھر اس صورت میں لغت کی طرف مرجع ہو گا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس تابوت کی واپسی اسی نبی کی نبوت پر مہر صدق تھی۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم ایمان دار ہو تو طالوتؑ کی اطاعت قبول کر لو۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٢٤٩﴾

غرض جب طالوت فوجیں لے کر روانہ ہوا تو اس نے (ان سے) کہا کہ اللہ ایک نہر سے تمہاری آزمائش کرنے والا ہے جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا (اس کی نسبت تصور کیا جائے گا کہ) وہ میرا نہیں اور جو نہ پئے گا وہ (سمجھا جائے گا کہ) میرا ہے، ہاں اگر کوئی ہاتھ سے چلو بھر پانی لے لے (تو خیر جب وہ لوگ نہر پر پہنچے) تو چند شخصوں کے سوا سب نے پانی پی لیا، پھر جب طالوت اور مومن لوگ جو اس کے ساتھ تھے نہر کے پار ہو گئے تو کہنے لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں جو لوگ یقین رکھتے تھے کہ ان کو اللہ کے روبرو حاضر ہونا ہے وہ کہنے لگے کہ بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی ہے اور اللہ استقلال رکھنے والوں کے ساتھ ہے۔

فائدہ: طالوت ﷺ کے ساتھ سب شوق سے نکلے انہوں نے اس بات کی قید لگائی کہ جو جوان اور بے فکر ہو وہ ہمارے ساتھ چلے۔ اسی ۸۰ ہزار لوگ ساتھ تھے اس نے چاہا کہ ان کو آزمائے۔ ایک منزل پانی نہ ملا دوسرے مقام پر نہر آتی تھی اس نے کہا کہ جو اس نہر سے ایک چلو سے زیادہ پانی پیئے گا وہ میرے ساتھ نہ جائے۔ تین سو تیرہ آدمی رہ گئے باقی سب رک گئے۔

لطیفہ: ایک بزرگ صوفی کو ایک امیر کبیر آدمی نے پیغام بھیجا کہ جو عہدہ مانگو وہ ملے گا۔ انہوں نے جواباً رقعہ لکھا:

دنیا بنهر طالوت می ماند غرفه ازاں حلال ست باقی حرام

دراں دیار که شاهی بهر گدابخشند غنیمت ست که مارا همیں بما بخشند

فائدہ: سدی کہتے ہیں جس دن طالوت علیہ السلام لشکر لے کر روانہ ہوئے تو اسی (۸۰) ہزار لوگ تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ نہر اردن و فلسطین کے درمیان تھی۔ اس کو نہر شریعت کہتے ہیں۔ جس نے چلو پیا وہ سیراب ہوا اور جس نے اور طرح پیا وہ پیاسا رہا۔ قتادہ و ابن شوذب کا یہی قول ہے۔ سدی نے کہا صرف چار ہزار رہ گئے باقی چوہتر ہزار نے پانی زیادہ پی لیا۔ حضرت براء بن عاذب کہتے ہیں ہم کہتے تھے کہ بدر کے دن صحابہ بھی تین سو اور دس سے کچھ زیادہ تھے اور ہم حضرت طالوت کے لشکر جتنے تھے۔ جنہوں نے ان کے ساتھ مل کر

نہر پار کی اور سوا مومنین کے کسی نے نہر پار نہ کی۔[بروایت ابن جریر] اسی کے قریب قریب، بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تعداد دیکھ کر کہا کہ ہم تھوڑے ہیں مقابل زیادہ ہیں۔ اس پر علماء نے ان کی ہمت بندھائی تسلی دی کہ اللہ کا وعدہ سچ ہے۔ تم مت خوف کرو۔ فتح اللہ کی جانب سے آتی ہے زیادہ تعداد اور تیاری اس کی بنیاد نہیں ہوتے۔ فتح البیان میں کہا ہے کہ طالوت جب بیت المقدس سے بغرض جہاد نکلے تو ان کے ساتھ ستر (۷۰) یا اسی (۸۰) فردیا ایک لاکھ بیس ہزار فوج تھی۔ اور بوڑھے بیمار اور معذور کے سوا سب نکل پڑے۔ اور وہ سخت گرمی میں نکلے تھے۔ پانی کی شکایت ہوئی کہ ہمارا پانی کا زاد کافی نہ ہوگا۔ اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لیے نہر جاری کردے۔ اردن، بیت المقدس کے پاس ریتلی جگہ ہے۔ وہ نہر وہاں موجود تھی۔ اس آیت سے یہ بھی پتا چلا کہ پانی بھی طعام ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ان کی کل تعداد تین لاکھ تین ہزار تین سو تیرہ تھی۔ سب نے پانی پی لیا صرف تین سو تیرہ باقی رہے۔ اور اصحاب بدر کی تعداد بھی تین سو تیرہ تھی۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بدر کے دن اپنے اصحابؓ سے فرمایا کہ تم اصحاب طالوتؑ جتنے ہو جبکہ ان کا جالوت سے مقابلہ ہوا تھا۔ قرطبی نے کہا کہ جالوت کے ساتھ والے ایک لاکھ اور ہتھیار بند تھے۔ یہ بات مومنین نے نہر پار کرنے کے بعد کہی جبکہ ان کی کثرت دیکھی جو پھر گئے تھے اور سرے سے نہر کے پار ہی نہ ہوئے تھے۔ اور مقابل کی کثرت کو بہانہ بنایا۔ اور اس قول کے قائل کی تعیین میں یہ دوسرا قول ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۲۵۲﴾

اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابل میں آئے تو (اللہ سے) دعا کی کہ اے پروردگار ہم پر صبر کے دہانے کھول دے اور ہمیں (لڑائی میں) ثابت قدم رکھ اور (لشکر) کفار پر فتح یاب کر۔ تو طالوت کی فوج نے اللہ کے حکم سے ان کو ہزیمت دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر ڈالا اور اللہ نے ان کو بادشاہی اور دانائی بخشی اور جو کچھ چاہا سکھایا اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے (پر چڑھائی اور حملہ کرنے) سے ہٹاتا نہ رہتا تو ملک تباہ ہو جاتا لیکن اللہ اہل عالم پر بڑا مہربان ہے۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تم کو سچائی کے ساتھ پڑھ کر سناتے ہیں اور (اے محمدؐ) تم بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہو۔

فائدہ: ان تین سو تیرہ آدمیوں میں سے حضرت داؤد ان کے باپ اور چھ بھائی بھی تھے۔ راستے میں تین پتھر ملے وہ بولے ہمیں اٹھالو ہم جالوت کو مارڈالیں گے جب مقابلہ ہوا اور خود جالوت باہر نکلا اور کہا میں تم سب کو کافی ہوں میرے سامنے آتے جاؤ۔ پیغمبر علیہ السلام حضرت داؤد کے والد کو بلایا۔ اور کہا کہ مجھے اپنے بیٹوں کی خبر دو ان کے سب بیٹے قد آور تھے جبکہ حضرت داؤد ایسے نہ تھے اور بکریاں چراتے تھے۔ انہوں نے حضرت داؤد کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم جالوت کو قتل کرو گے انہوں نے کہا ہاں کرونگا۔ پھر وہ تین پتھر اس کو تاک کر مارے اور وہ ذرہ بکتر تھا، صرف اس کا ماتھا کھلا تھا وہ سیدھا نشانے پر لگے اور ماتھے سے لگ کر گدی سے نکل گئے۔ اس کے بعد طالوت علیہ السلام نے اپنی بیٹی کا نکاح حضرت داؤد سے کر دیا۔ اور وہ طالوت ؒ کے بعد بادشاہ بنے۔ نادان لوگ کہتے ہیں کہ لڑائی کرنا نبیوں کا کام نہیں ہے۔ جبکہ اس قصے سے معلوم ہوا کہ جہاد ہر دور میں جاری رہا ہے۔ اگر جہاد نہ ہوتا تو ملک میں فساد ہوتا اور ملک ویران ہو جاتے۔

فائدہ: اس آیت مین فرمایا ہے کہ جب گروہ ایمان کا مقابلہ جو کہ اصحاب طالوت ؒ تھے۔ اہل کفر یعنی اصحاب جالوت سے ہوا تو مومنین نے دعا کی۔ اللہ نے ان کی التجا قبول کی اور قلیل کو کثیر پر غالب کر دیا۔

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ملے اے غیرؔ

مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

طالوت ؒ نے داؤد سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم جالوت کو قتل کرو گے تو میں اپنی بیٹی کا نکاح تم سے کروں گا۔ انہوں نے پھر اس وعدے کو پورا کیا۔ پھر انجام میں سارا ملک انہی کے ہاتھ میں آگیا۔ اس پر یہ عزت ملی کہ نبوت بھی عطا ہوئی۔ حکمت سے وہی نبوت عظیمہ مراد ہے۔ یہ نبوت ان کو شمویل ؒ کے بعد ملی۔ اس پر ایک اور انعام ہوا کہ بعض علوم خاصہ بھی عطا ہوئے۔ ((جسے پیا چاهیں وهی سهاگن)) اللہ کریم نے طالوت علیہ السلام کے مقابلے میں جالوت کو داؤد کے ذریعے شکست دی۔ اگر ایسا نہ ہو تو زمین میں فساد پیدا ہو جاتا جیسے فرمایا: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا﴾ "اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض کے ساتھ نہ ہٹاتا تو تکیے، مدرسے، عبادت گاہیں اور مساجد گرادی جاتیں۔ جن میں اللہ کا بکثرت ذکر ہوتا تھا۔" حضرت ابن جریر نے حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ

اللہ ایک مسلمان گھر کی وجہ سے سو گھروں سے مصیبت کو ٹالتا ہے۔ جو اس کے آس پاس بستے ہیں۔ پھر اس آیت کو پڑھا مگر اس کی سند ضعیف ہے۔ جابرؓ کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ اللہ ایک صالح مسلمان کی وجہ سے اس کی اولاد اور اس کی اولاد کی اولاد اور اس کے گھر والوں کو سنوار دیتا ہے۔ اور اس کے پڑوس والے ہمیشہ اللہ کے حفظ میں رہتے ہیں۔ جب تک وہ شخص ان کے درمیان ہو۔ یہ حدیث بھی غریب ضعیف ہے۔ بروایت ابن جریر۔ ثوبان نے مرفوعاً کہا ہے کہ تم میں ہمیشہ سات شخص ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب سے تمہیں مدد، پانی اور رزق ملتا ہے۔ حتی کہ اللہ کا حکم آئے۔ یعنی قیامت قائم ہو۔ [بروایت ابن مردویہ] ان کی دوسری مرفوع روایت حضرت عبادہ بن صامت سے یوں ہے کہ میری امت میں سے تیں شخص ابدال ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے رزق، بارش اور نصرت ملتی ہے۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ میں امید کرتا ہوں کہ حسن انہی ابدال میں سے ہے مگر یہ احادیث محتاج صحت ولائق غور ہیں۔ واللہ اعلم.

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ حضرت داؤد کے والد کا نام ایشایاز کریا ابن بشوی تھا۔ اور یہ یہوذ بن یعقوب کی نسل سے تھے۔ اللہ نے ان کو بادشاہت و نبوت دی۔ جبکہ وہ چرواہے تھے اور سب بھائیوں سے چھوٹے بھی، بالغ بھی نہ ہوئے تھے۔ رنگ زرد تھا۔ بکریاں چراتے تھے۔ اور یہ ماجرا نبوت سے پہلے کا ہے۔ جب حضرت طالوتؒ چالیس سال زندہ رہ کر فوت ہوئے تو حضرت داؤد ﷺ نے سات سال بادشاہت کرنے کے بعد وفات پائی۔ اور بڑائی اللہ کے لیے ہے جس کی ذات عظیم کو زوال نہ ہے۔

مراو ارسد کبریا وُ ضی

کہ ملکش قدیمت وذاتش غنی

مفسرین نے اس قسم کے بہت سے قصے ذکر کیے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ حکمت سے نبوت مراد ہے یا لوہے سے زرہ بنانا یا چڑیوں کی بولی سمجھنا یا بہائم کی آواز پہچاننا یا وہ زنجیر مراد ہے کہ جس کے پاس وہ نیاؤ چاہتے تھے۔ مراد ہے۔ حضرت داؤد کے علاوہ کوئی ایسا بادشاہ نہ ہوا کہ جس پر بنی اسرائیل نے اتفاق کیا ہو ورنہ نبوت ایک نسل میں اور سلطنت ایک نسل میں ہوا کرتی تھی۔ اللہ نے ان کو نبوت و بادشاہت دونوں چیزیں عطا کر دیں۔ پھر ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کو انہی دو عظیم نعمتوں سے نوازا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ نمازی، حاجی

اور زکوۃ دینے والے کے سبب سے بے نمازوں اور غیر حاجیوں اوز کوۃ نہ دینے والوں سے بلاٹالتا ہے۔ آیت کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کے آپؐ جو غیب کی خبریں اور عجیب قصے بیان کرتے ہیں اس کی وجہ نبوت ہے۔ یہ بذریعہ وحی آپؐ کو بتائی جاتی ہیں نہ آپؐ نے کسی کتاب سے پڑھا ہے اور کسی عام ذریعے سے سنا سیکھا ہے۔ آپؐ کی رسالت پر یہی دلیل ہے۔

((اس آیت پر سیقول پارہ تمام ہوا۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالمنة.))

اَلحَمدُ لِلّٰہِ
پارہ سَیَقُولُ مکمل ہوا

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ۝
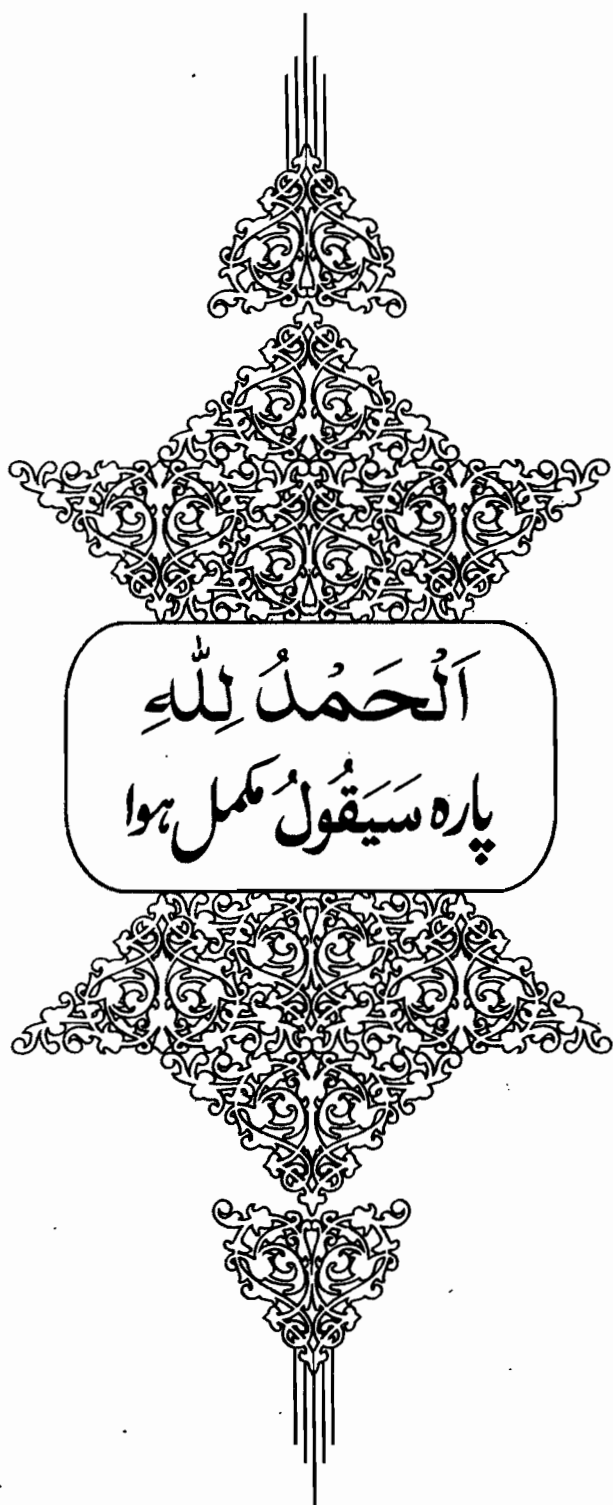
یہ پیغمبر (جو ہم وقتاً فوقتاً بھیجتے رہے ہیں) ان میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے بعض ایسے ہیں جن سے اللہ نے گفتگو کی اور بعض کے (دوسرے امور میں) مرتبے بلند کئے اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے کھلی ہوئی نشانیاں عطا کیں اور روح القدس سے ان کو مدد دی اور اگر اللہ چاہتا تو ان سے پچھلے لوگ اپنے پاس کھلی نشانیاں آنے کے بعد آپس میں نہ لڑتے لیکن انہوں نے اختلاف کیا تو ان میں سے بعض تو ایمان لے آئے اور بعض کافر ہی رہے اور اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ باہم جنگ و قتال نہ کرتے لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

فائدہ: اس آیت میں خبر دی ہے کہ اللہ نے بعض رسل کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا۝﴾ "اور ہم نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی اور جن کو شرف تکلم سے نوازا وہ حضرات: آدم، موسیٰ اور محمد ﷺ ہیں۔ یہ مضمون ابن حبان میں ابو ذر کی حدیث میں مذکور ہے جن کے درجے بڑھائے، ان کے درجات کے موافق۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو شب معراج میں آسمانوں پر دیکھا۔ رہی حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ ایک مسلمان اور یہودی کے درمیان حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمدؐ کی فضیلت میں سخت کلامی ہوئی۔ آنحضرت علیہ السلام نے سن کر فرمایا کہ تم مجھے انبیاء پر فضیلت نہ دو۔ لوگ قیامت کے دن بے ہوش ہوں گے میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا اور دیکھوں گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں میں نہیں جانتا کہ وہ مجھ سے قبل ہوش میں آئے ہیں یا طور والی بے ہوشی کفایت کرے گی۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ تم پیغمبروں کے درمیان تفاضل نہ کرو۔ [بروایت الشیخان] سو اس حدیث کے کئی ایک جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ارشاد علم تفضیل سے پہلے کا ہے مگر یہ محل نظر آتا ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ فرمان بطور کسر نفس و تواضع فرمایا۔ تیسرا یہ کہ ایسے عمل تحاکم میں تفضیل سے منع کیا (مطلقاً نہیں۔) چوتھا یہ کہ تفضیل کی بنیاد صرف رائے اور عصبیت نہ ہونی چاہئے۔ پانچواں یہ کہ تفضیل کا اختیار اللہ کو ہے تمہیں نہیں، تمہارا کام صرف انقیاد و تسلیم ہے۔ بس وہ بجالاؤ۔ شوکانی نے ان سب کو ضعیف قرار دیا اور فرمایا درست بات بس اس قدر ہے کہ قران کریم نے کہا بعض انبیاء کو

بعض پر فضیلت ہے۔اور سنت سے معلوم ہوا کہ انبیاء کے درمیان باہم تفضیل نہ کرنا چاہیئے۔ آیت و حدیث میں کوئی تعارض نہ ہے کہ ضرورتِ تطبیق ہو۔ واللہ اعلم.

فائدہ: فتح البیان کا بیان ہے کہ اس آیت میں رسل سے یا تو سب رسل مراد ہیں یا وہ رسل جن کا ذکر سورت میں آیا ہے یا وہ رسل مراد ہیں جن کا تذکرہ نبی علیہ السلام کو پہنچا ہے۔ تفضیل سے یہ مراد ہے کہ جو صفات و کمال ایک کو دیئے وہ دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ سو جس میں وہ کمالات زیادہ ہیں وہ فاضل ہے دوسرے مفضول ہیں۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو خلیل قرار دیا، موسیٰ کو کلیم بنا دیا، عیسیٰ کو آدم کی طرح مٹی سے بنا کر اپنا کلمہ اور اپنی روح ٹھہرایا، داؤد علیہ السلام کو زبور دی، سلیمان علیہ السلام کو ایسی عظیم سلطنت عطا کی جو ان کے بعد کسی اور کو نہ دی اور محمد ﷺ کے سارے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے۔ خازن نے کہا کہ اس بات پر اجماع امت ہے کہ ہمارے پیغمبر علیہ السلام افضل الانبیاء ہیں کیونکہ آپ علیہ السلام کی نبوت عام ہے۔ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۝﴾ ''اور نہیں ہم نے بھیجا آپؐ کو مگر سب لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا۔'' اللہ کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر بلا واسطہ کلام کیا اور آنحضرت ﷺ سے شب معراج میں گفتگو فرمائی۔ حدیث میں ہے کہ آدم نبی مکلم تھے، درجات سے عظمت و منزلت مراد ہے۔ جو کسی کو اللہ کے ہاں حاصل ہوتا ہے، یا صاحب درجات سے ہمارے نبی علیہ السلام یا حضرت ادریس علیہ السلام مراد ہیں۔ کیونکہ اللہ کریم نے فرمایا: وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا۝ کہ ہم نے اس کو (ادریسؑ کو) بلند مقام پر اٹھا لیا یا اس سے اولوا العزم مراد ہیں۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں لیکن بات یہ ہے کہ اللہ کریم نے ان بعض کو مبہم رکھا جن کے درجات بلند کیے ہیں۔ ہمیں کتاب و سنت کی دلیل کے بغیر اس کے مخالف موقف اختیار نہ کرنا چاہیئے۔ ان دونوں میں بعض مرفوع ذات کی تعیین پر کوئی دلیل بھی موجود نہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہونے کے باوجود ہم نے کوئی دوسرا موقف اختیار کیا تو گویا یہ تفسیر بالرائے ٹھہری۔ اور اس پر بڑی سخت وعید آئی ہے اور یہ تفسیر تفضیل کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہے اور آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ فتح القدیر میں کہا ہے کہ بہت سے آئمہ تفسیر نے اس موقف پر جزم کیا کہ اس بعض مرفوع سے آنحضرت ﷺ مراد ہیں۔ اس لیے کہ اللہ نے ان کو معجزات و فضائل و خصالِ کمال بخشے ہیں۔ مگر یہ دلیل مطلوب پر دلالت نہیں کرتی ہے مگر اس تفسیر میں دو خدشے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ تفسیر بالرائے ہو گی دوسری یہ ذرائع تفضیل میں داخل ہوتا ہے۔ گو کہ یہ تفضیل صریح نہ ہے مگر بلا شبہ اس میں تفضیل کی طرف احتمال تو ہے کیونکہ جس کو یہ یقین ہو گا کہ مرفوع درجات محمد ﷺ ہیں تو یقیناً وہ تفضیل انبیاء کی

طرف ضرور مائل ہو گا۔حالانکہ تفاضل منع ہے اور ہمارے پیغمبر علیہ السلام کو اللہ کریم نے اس سے بے نیاز رکھا ہے کیونکہ ان کے اور فضائل کیا کم ہیں جو انہیں اس کی حاجت ہو۔پھر جس بات سے اللہ کریم نے ہمیں منع کیا ہے اس میں گھسنا کیا ضروری ہے کہ ہم خود کو ان کے مطیع سمجھتے ہوں اور حقیقت میں عاصی و گناہ گار ہوں اس کا کیا فائدہ ہو گا۔

فائدہ: بینات سے اس جگہ دلالات واضحات و حجج قاطعات مراد ہیں جو کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام پر نازل کیے گئے۔ جیسے مردوں کو زندہ کرنا، بیماروں کو تندرست کرنا، روح القدس یعنی جبریل مراد ہیں۔ وہ ہر جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اللہ نے ان کو ساتویں آسمان پر اٹھالیا۔اور اقتتال سے اس جگہ اختلاف مراد ہے۔یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب متفق رہتے اور اختلاف نہ ہوتا۔لیکن اللہ کی مشیت اسی طرح تھی وہ وقوع پذیر ہو کر رہی وہ مختلف ہو گئے کوئی مسلمان ہوا کوئی جان بوجھ کر کافر رہا۔ جیسا کہ حضرت مسیحؑ کے بعد نصاریٰ میں اختلاف پیدا ہو گیا وہ کافر ہو گئے۔لیکن اصل کار فرما اللہ کا ارادہ ہوتا ہے جس کو چاہے خیر کی توفیق دے اور جسے چاہے ذلیل و رسوا کر دے۔ایک شخص نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے قضاء قدر کا مسئلہ پوچھا۔انہوں نے فرمایا یہ ایک اندھیر رستہ ہے اس پر نہ چلو اور یہ ایک گہرا دریا ہے اس میں داخل نہ ہو، پھر پوچھنے پر فرمایا کہ یہ اللہ کا راز ہے تو اس کی کرید نہ کر۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۵۴﴾

اے ایمان والو! جو (مال) ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس دن کے آنے سے پہلے پہلے خرچ کر لو جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہو اور نہ دوستی اور سفارش ہو سکے اور کفر کرنے والے لوگ ظالم ہیں۔

فائدہ: یعنی عمل کا وقت ابھی ہے آخرت میں اعمال نہ فروخت ہوں گے نہ کوئی تعلق کا پاس رکھتے ہوئے دے گا۔نہ کوئی کسی کو سفارش سے چھڑا سکتا ہے جب تک خود پکڑنے والا نہ چھوڑے۔اس آیت میں اللہ کریم اپنے بندوں کو حکم دیتا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں عمدہ کاموں میں اور ثواب کے راستوں میں اپنا مال خرچ کرو۔ دنیا کی زندگی میں خرچ کر لو ورنہ قیامت والے دن نہ کوئی مال کام آئے گا نہ کوئی دوستی اور نسب کام آئے گا۔ جیسے فرمایا:﴿فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ﴾ کہ "پھر جب صور میں پھونک دیا جائے گا تو ان کے درمیان اس دن نہ کوئی نسبؔ ہو گا نہ وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے اور نہ کسی کی سفارش کام دے گی۔" فرمایا:﴿وَلَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ﴾ کہ "ان کو سفارش کرنے والے کی سفارش

کچھ فائدہ نہ دے گی۔" اور جو فرمایا کہ کافر ہی ظالم ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دن سب سے بڑھ کر وہی شخص ظالم ہوگا جو اللہ سے بحالت کفر ملے گا۔ حضرت عطاء بن دینار فرماتے ہیں الحمد للہ کہ اللہ نے اس طرح فرمایا کہ کافر ظالم ہیں یہ نہ کہا کہ ظالم کافر ہیں۔ فتح البیان میں فرمایا ہے کہ صرف کرنے سے اس جگہ بعض کے نزدیک صدقہ فطر ہے۔ بعض نے کہا آیت عام ہے فرض و نفل صدقہ کو شامل ہے۔ ابن عطیہ نے کہا کہ یہ صحیح ہے لیکن اوپر جو قتال کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ قرطبی نے کہا کہ اس تاویل پر کبھی انفاق واجب ٹھہرے گا اور کبھی مستحب۔ یعنی تعیین جنگ کے وقت وہ واجب ہوگا عام مستحب ہوگا۔ مگر آیت کا ظاہر وجوب پر ہے۔ اس آیت میں عام شفاعت کی نفی فرمائی ہے۔ مگر جس کے لیے اللہ اجازت دے گا اس کی سفارش ہوگی کیونکہ مومنین کے باہم اللہ کے حکم سے سفارش کے جواز پر کتاب و سنت کے نصوص دلالت کرتے ہیں۔ پس یہ عام آیت پھر تخصیص میں بدل جائے گی یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر کافر ظالم نفس ہے اس میں وہ مانع زکوٰۃ بھی شامل ہیں جو اس حد تک زکوٰۃ نہ دے کہ اس پر کفر لازم آئے۔ اسی لیے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے جہاد کیا تھا۔ اور امر انفاق کے سیاق میں بلاشبہ زکوٰۃ بھی داخل ہے۔

اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۲۵۵﴾

اللہ (وہ معبود برحق ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ، زندہ، ہمیشہ رہنے والا اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے، کون ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس سے (کسی کی) سفارش کر سکے جو کچھ لوگوں کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے ہاں جس قدر وہ چاہتا ہے اسی قدر معلوم کرا دیتا ہے۔ اس کی بادشاہی (اور علم) آسمان اور زمین سب پر حاوی ہے اور اسے ان کی حفاظت کچھ بھی دشوار نہیں وہ بڑا عالی رتبہ (اور) جلیل القدر ہے۔

فائدہ: اس آیت الکرسی کی بہت عظمت ہے۔ مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ یہ کتاب اللہ میں افضل آیت ہے۔ ابی بن کعب سے آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ کتاب اللہ میں کون سی آیت سب سے بڑی ہے۔ کہا: اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں۔ جب بار بار پوچھا تو انہوں نے کہا آیۃ الکرسی۔ فرمایا اے ابا منذر! تمہیں یہ علم

مبارک ہو۔اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس آیت کی ایک زبان ہے اور دو ہونٹ ہیں یہ عرش کے پائے کے ساتھ اللہ کی تقدیس بیان کرتی ہے۔[بروایت احمد]اور اس کو مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔ عبداللہ بن ابی بن کعب نے کہا کہ ان کے باپ نے ذکر کیا کہ ان کا ایک مکان تھا وہ اس میں کھجوریں رکھتے تھے۔ جب دیکھا تو وہ کم ہوتا جاتا تھا۔ایک رات جبکہ اس پر پہرہ دیا تو دیکھا کہ ایک جاندار ہے بالغ لڑکے جتنا قد ہے۔اس کو سلام کیا اس نے جواب دیا تو پوچھا تو انسان ہے یا جن کہا جن ہوں۔انہوں نے کہا ذرا اپنا ہاتھ دکھاؤ اس نے ہاتھ دکھایا وہ ہاتھ کتے کا سا تھا اور اس پر بال تھے۔پوچھا کیا جن اسی خلقت کے ہوتے ہیں۔ کہا سارے جن جانتے ہیں کہ ان میں مجھ سے سخت کوئی نہ ہے۔ کہا تم نے یہ کام کیوں کیا؟اس نے کہا: میں نے سنا ہے کہ تم صدقہ کرنا پسند کرتے ہو۔ہم نے چاہا کہ ہم بھی تمہارے کھانے سے کچھ لے لیں۔ابی نے فرمایا ہمیں کون سی چیز تم سے پناہ میں رکھ سکتی ہے؟ کہا: آیت الکرسی۔ حضرت ابی نے صبح جا کر آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ علیہ السلام نے کہا: اس خبیث نے سچ کہا۔[بروایت ابو یعلیٰ]حاکم نے مستدرک میں کہا کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اس کو شیخین نے روایت نہیں کیا۔حدیث انس بن مالک میں آیۃ الکرسی کو ربع قرآن کہا ہے۔[بروایت احمد بطولہ]اس آیت شریفہ کا اسم اعظم ہونا متعدد طرق سے کئی احادیث میں مروی ہے۔ابن کثیر نے ان کو ذکر کیا ہے۔ابو ایوب کے مکان سے ہر روز ایک غول غلہ نکال کر لے جاتا۔انہوں نے اس کو دو دفعہ پکڑا بھی پھر چھوڑ دیا۔ تیسری دفعہ اس نے کہا تم مجھے چھوڑ دو میں تمہیں ایسی چیز بتاتا ہوں کہ کوئی چیز تمہارے پاس نہ آئے گی۔وہ چیز آیت الکرسی ہے۔جب انہوں نے اس کا ذکر آنحضرت ﷺ سے کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ وہ ہے تو جھوٹا مگر اس نے سچ کیا ہے۔[بروایت احمد] ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔ابن کثیر نے فرمایا کہ غول لغت عرب میں اس جن کو کہتے ہیں جو رات کو ظاہر ہوتا ہے۔اس کو بخاری نے بھی حضرت ابو ہریرہؓ سے ”کتاب فضائل القرآن “اور ”کتاب الوکالۃ“ میں ابلیس کی صفت کے تحت طویل روایت ذکر کی ہے۔ایک شیطان ان کا کھانا لے جاتا تھا۔ تیسری دفعہ اس نے کہا کہ جب تم سونے کے لیے بستر پر جاؤ تو آیت الکرسی پڑھا کرو۔اللہ کی طرف سے تم پر ایک محافظ مقرر رہے گا۔ اور شیطان تمہارے پاس نہ پھٹکے گا۔جب انہوں نے آنحضرت علیہ السلام سے اس بات کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا:((اما انہ صدق و ھو کذوب))کہ ”ویسے ہے تو وہ جھوٹا لیکن سچ بول گیا۔“اس کو بخاری نے تعلیقاً بصیغہ جزم ذکر فرمایا ہے۔ اس کو ابن مردویہ نے بھی روایت کیا ہے۔ مگر اس کے علاوہ سیاق سے بیان کیا۔اس میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے سن کر فرمایا:((اما علمت ان ذالك كذالك))کہ ”کیا تم نہیں جانتے کہ یہ آیت ویسی ہی

ہے جیسے اس شیطان نے تمہیں کہا ہے۔“ اس کو نسائی نے بھی بطولہ روایت کیا ہے۔ غرضیکہ یہ تین واقعے ایک طرح کے ہوئے۔ ابوعبید نے ”کتاب الغریب“ میں اپنی سند سے ایک چوتھا قصہ ذکر کیا ہے کہ ابن مسعود نے کہا ہے کہ ایک شخص نکلا اس کی ملاقات ایک جن سے ہوئی جن نے کہا تم مجھ سے کشتی کرو اگر تو نے مجھے پچھاڑ دیا تو میں تمہیں ایسی آیت سکھادوں گا کہ جب تو اس کو پڑھ کر گھر جائے گا تو پھر کوئی شیطان اس گھر میں نہ جاسکے گا۔ کشتی ہوئی، جن ہار گیا۔ کہا تو تو کمزور سا ہے، تیرے بازو کتے کے سے ہیں کیا سب جن اسی طرح ہوتے ہیں یا خاص تم ہی ایسے ہو۔ کہا میں ان سب میں قوی ہوں، پھر لڑو...... دوبارہ کشتی میں بھی جن ہار گیا۔ اس نے کہا: تم آیۃ الکرسی پڑھا کرو۔ تمہارے قریب کوئی نہ آئے گا۔ جب گھر جاؤ گے تو شیطان گدھے کی طرح بھاگے گا۔ حضرت ابن مسعودؓ سے پوچھا گیا کہ وہ آدمی حضرت عمرؓ ہوں گے فرمایا وہ نہیں تو اور کون ہوگا؟ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ سورۃ بقرہ میں ایک ایسی آیت ہے جو سب آیات کی سردار ہے۔ وہ کسی گھر میں نہیں پڑھی جاتی مگر وہاں سے شیطان نکل جاتا ہے۔ وہ آیت آیۃ الکرسی ہے۔ [بروایت حاکم] اس کو حاکم نے دو طریق سے روایت کیا ہے اور صحیح الاسناد بتایا ہے۔ ترمذی کا لفظ زائدہ کی حدیث سے یوں ہے کہ ہر چیز کی کوہان ہوتی ہے اور قرآن کی کوہان سورۃ بقرہ ہے۔ اس میں ایک آیت ہے جو سب آیات کی سردار ہے۔ وہ آیت آیت الکرسی ہے۔ پھر اس کو غریب کہا اس کی سند میں حکیم بن جبیر ضعیف راوی ہیں۔ اسماء بنت یزید نے سنا کہ آنحضرت ﷺ فرماتے تھے کہ ان دو آیات میں: ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ اور ﴿الٓمٓ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ اسم اعظم ہے۔ [بروایت احمد و اهل السنن] ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ ابن مردویہ نے ابوامامہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اللہ کا اسم اعظم کہ جب اس کا نام لے کر دعا کی جائے تو قبول ہو، سورتوں میں سے سورۃ بقرہ، آل عمران اور سوۃ طٰہٰ میں ہے۔ ابن عمار خطیب دمشق نے کہا کہ سورۃ بقرہ و آل عمران میں تو وہی اسم اعظم ہیں جو اوپر ذکر ہوئے۔ اور سوۃ طٰہٰ میں یہ ہے: ﴿وَعَنَتِ الْوُجُوهُ لِلْحی القیوم﴾ ابوامامہ کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی اسے جنت میں صرف موت رکاوٹ ہے۔ [بروایت ابن مردویہ ،والنسائی فی الیوم واللیلۃ و ابن حبان فی صحیحہ] ابن کثیر نے فرمایا یہ اسناد شرط بخاری میں ہے۔ ابن الجوزی نے اس کو موضوع سمجھا ہے۔ واللہ اعلم۔ اس کو اسی کے قریب قریب ابن مردویہ نے علیؓ، مغیرہؓ اور جابرؓ سے رویت کیا مگر ہر سند ضعیف ہے۔ غرضیکہ آیۃ الکرسی کی فضیلت میں بہت سی احادیث آئی ہیں ان سب کو عدم صحت وضعف اسناد کی وجہ سے یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔ اس آیت میں دس مستقل جملے ہیں: ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا

هُوَ﴾اس بات کی خبر ہے کہ تمام مخلوقات کی الوہیت میں وہی متفرد ہے۔وہی معبود مطلق اور برحق رب ہے۔پس حیّ وہ ہے جو کبھی موت سے ہمکنار نہ ہو اور قیوم وہ ہے جو غیر کو تھامے۔حضرت عمرؓ قیوم کی جگہ قیام پڑھتے تھے۔ ساری مخلوقات اس کی محتاج ہیں وہ سب سے غنی ہے۔اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کا قیام نہیں ہو سکتا ۔جیسے فرمایا: ﴿وَمِنۡ آيَاتِهِ اَنۡ تَقُوۡمُ السَّمَآءُ وَلَاَرۡضَ بِاَمۡرِهِ﴾ "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ آسمان وزمین اس کی نشانیوں میں سے ہے۔" اور پوری قیومیت یہ ہے کہ نیند تو کجا اونگھ بھی نہیں آتی۔یعنی وہاں غفلت ونقص کا تصور بھی نہ ہے بلکہ وہ ہر نفس پر قائم ہے اور اس کے اعمال کا گواہ ہے۔کیا مجال کہ کوئی چیز اس سے مخفی رہ سکے یا کوئی پوشیدہ بات اس پر مخفی رہ سکے اونگھ کے بعد نیند کا ذکر اس لیے کیا کہ نیند زیادہ قوی ہے۔ مطلب یہ کہ نہ تھوڑی غلفت ہو نہ زیادہ۔ صحیح میں حضرت ابو موسیٰ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہمارے درمیان چار باتیں کہیں۔ فرمایا اللہ سوتا نہیں ہے اور اس کو سونا زیبا بھی نہ ہے،وہ ترازو کو اونچا نیچا کرتا ہے دن کا عمل رات سے پہلے اور رات کا عمل دن سے پہلے اس کے پاس جاتا ہے۔اس کا پردہ نور یا نار ہے اگر وہ اس پردے کو کھول دے تو اس کے چہرے کے انوار تاحد نگاہ مخلوق کو جلادیں۔

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ میں اس بات کی خبر ہے کہ سب اس کے بندے ہیں۔اسی کی ملکیت ہیں اور اس کی جباری کے تحت ہیں۔جیسے فرمایا: ﴿اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًاoلَقَدۡ اَحۡصَاهُمۡ وَعَدَّهُم عَدًّاoوَ كُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيَامَةِ فَرۡدًا﴾ کہ "جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ رحمٰن کے پاس بندگی کی حالت میں آئے گا۔ تحقیق اس نے ان سب کو گن لیا ہے اور شمار کرلیا ہے، شمار کرنا اور وہ سب قیامت والے دن اس کے پاس تنہا آنے والے ہیں۔" اس میں بعض کواکب پرست مشرکین پر اور بت پرست مشرکین پر رد ہے کہ جب یہ سب کچھ مخلوق ہیں تو معبود ہونے کا لائق کہاں ہیں؟

تا چند گه از جوب گه از سنگ تراش بگذار خدائے که بصد رنگ تراشی

اور جو فرمایا کہ اس کے پاس کون سفارش کرسکتا ہے مگر وہی جس کو وہ اجازت دے یہ اس آیت کی طرح ہے جو فرمایا: ﴿وَ كَمۡ مِنۡ مَلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِيۡ شَفَاعَتُهُمۡ اِلَّا مِنۡ بَعۡدِ اَنۡ يَاۡذَنَ اللّٰهُ لِمَنۡ يَشَآءُ وَ يَرۡضٰى﴾ "اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں ان کی سفارش کفایت نہ کرے گی۔ مگر اس کے بعد کہ اللہ جس کو چاہے اور پسند کرے۔" اور جیسے فرمایا: ﴿وَلَا يَشۡفَعُوۡنَ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰى﴾ "اور وہ نہ سفارش کریں گے مگر جس

کے لیے وہ اللہ پسند کرے گا۔" یہ اللہ رب العزت کا جلال ہے کہ اس کے سامنے کوئی کسی کی سفارش کی تاب و طاقت نہ رکھے گا مگر اس کے اذن واجازت سے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ میں عرش کے نیچے سجدے میں گر جاؤں گا۔ جب تک اللہ چاہے گا مجھے پڑا رہنے دے گا پھر کہا جائے گا: کہ سر اٹھائیے آپ کی بات سنی جائے گی۔ اور سفارش کریں آپ کی سفارش قابل قبول ہو گی۔ فرمایا: ((فیحدلی حداً)) یعنی میرے لیے ایک حد مقرر کی جائے گی میں انہیں نکال کر جنت میں لے جاؤں گا، شفاعت کا یہ بیان ابن کثیر نے ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ بغیر اجازت کے شفاعت نہ ہو گی۔ یہ کس کو معلوم ہے کہ شفاعت کا اذن کس کے لیے ہو گا اور کس کے لیے نہ ہو گا۔ مجملاً اتنا معلوم ہے کہ اہل کبائر کے لیے شفاعت ہو گی۔ یہ کہیں نہ ہے کہ اہل شرک و کفر کے لیے شفاعت ہو گی بلکہ ان کے لیے تو عدم شفاعت مذکور ہے جو نام نہاد مسلمان در حقیقت قبر پرست، پیر پرست، مجتہد پرست، قیاس پرست اور رائے فاسد میں گرفتار ہیں، اولیاء اللہ کو زندگی میں اور موت کے بعد متصرف سمجھتے ہیں وہ مشرک ہیں، انہیں گھمنڈ یہ ہے کہ ہمیں ہمارے پیر و مرشد سفارش کر کے بخشوالیں گے۔ یہ محض ان کی جہالت ہے۔ پیر تو خود محتاج خیر ہوں گے شفاعت تو کجا رہی۔ اور شفاعت اہل معصیت کے لیے ہو گی وہ بھی محدود اور نا معلوم الاسم بد عقیدہ لوگوں کے لیے جو غیر اللہ کو مانتے ہیں سفارش نہ ہو گی۔ کسی کے نام کا جانور ذبح کرتے ہیں، کسی کی نذر و نیاز مانتے ہیں، کسی کو شفا بخش جانتے ہیں، کسی کو اولاد دینے والا اور حاجت روا سمجھتے ہی۔ اللہ کریم نے پہلے سے یہ خبر دے دی ہے کہ کسی کی کیا طاقت ہے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف سفارش کرے۔ پھر اذن اسکے لیے ہو گا جس کی سفارش منظور ہو گی۔ اذن میں اختیار اللہ کا ہے۔ شفیع محض حکم کا پابند ہو گا۔ پھر اذن کی بھی ایک حد مقرر ہو گی اس سے زیادہ کون کر سکے گا۔ فتح البیان نے کہا اللہ نے جو یہ فرمایا کہ اللہ کے سامنے کون سفارش کرے گا مگر جس کو وہ اجازت دے اس میں اس شخص کا انکار ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ کوئی شخص بذات خود کسی کی سفارش کی قدرت رکھتا ہے۔ اس استفہام میں ایسی ڈانٹ ہے کہ جس سے بڑھ کر تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ عُبّادِ قبور کے سینوں میں ایک دھکا اور ان کے منہ پر طمانچہ ہے اور ان کے بازوؤں پر ایک ایسا گھونسا ہے جس کی انتہا نہیں۔ ان کا منہ توڑ جواب ہے اور جو بات اس آیت سے سمجھی گئی ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ جو مفہوم آیت: ﴿وَلَا يَشْفَعُونَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى﴾ سے یا آیت: ﴿لَا يَتَكَلَّمُونَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ﴾ سے سمجھی گئی ہے۔ پہلا استفادہ بدرجات کثیر فائق ہے۔ احادیث صحیحہ میں ثابت ہے کہ شفاعت کیا ہے اور اس کا حق دار کون ہے اور کس کے حق میں وہ قابل قبول ہو گی۔

فائدہ: اور جو فرمایا کہ اللہ کو سب پہلے اور پچھلے حالات معلوم ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا علم تمام کائنات کو گھیرے ہوئے ہے۔ماضی ہو حال یا مستقبل ہو۔جیسے فرمایا:﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ کہ "ہم نہیں اترتے مگر تیرے رب کے حکم سے اسی کا ہے جو ہمارے آگے پیچھے اور جو اس کے درمیان ہے تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے۔" حضرت مجاہد نے فرمایا کہ آگے اور پیچھے سے دنیا و آخرت مراد ہے۔یعنی وہ عمل جو آگے بھیجے اور وہ جو برباد کیے۔اس میں فلاسفہ کا رد ہے جو اللہ کریم سے علم جزءیات کی نفی کرتے ہیں حالانکہ صفت علم صفات کی امام ہے۔اگر زمین کی تہہ میں ٹھوس چٹان پر ایک سیاہ چیونٹی چلتی ہے یا کوئی ذرہ زمین و آسمان کے درمیان متحرک ہوتا ہے یا کوئی پرندہ ہوا میں اڑتا ہے۔وہ سب اس عالم الغیب والشہادہ کو معلوم ہے کسی میں یہ طاقت کہاں کہ اس کے علم کا احاطہ کر سکے۔ مگر جتنا خود دے دیا، سو دے دیا، یا جو انبیاء و رسل کے ذریعے انہیں بتا دیا وہ بھی ان کی نبوت کی دلیل کے طور پر دیا یہ مقصد نہ ہے کہ وہ خود اس علم پر مختار ہیں۔اللہ کریم کی صفات واجبی میں کسی کو شریک کرنا کفر ہے۔شرک کی اقسام "تقویۃ الایمان" اور کتاب دین خالص میں یکجا لکھی گئی ہیں۔جس طرح شرک عبادت میں ہوتا ہے اسی طرح عادت میں بھی ہوتا ہے۔شرک چھوٹا ہو یا بڑا ہو واضح ہو یا مخفی ہو۔بخشا نہ جائے گا۔(الا یہ کہ توبہ کی جائے) وہ خواہ علم میں ہو یا تصرف میں یا کسی بھی اور صفت میں ہو ہے تو بہر حال شرک ہی پایا۔یا یہ مراد ہے کہ علم ذات و صفات الٰہی میں سے کسی پر وہ مطلع نہ ہیں مگر جس قدر اللہ نے خود اطلاع دے دی ہے۔جیسے فرمایا:﴿وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴾ کہ "وہ اس کو جان کر اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہاں کرسی سے علم مراد ہے کہ اس کا علم زمین و آسمان و شامل ہے۔حضرت سعید بن جبیر کا بھی یہی قول ہے۔بعض نے کہا کہ دونوں قدم کی جگہ کرسی ہے۔ابو موسیٰ، سدی، ضحاک و مسلم بطین اسی کے ہم موقف ہیں۔آنحضرت ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کرسی کیا ہے؟ فرمایا دونوں قدموں کی جگہ کرسی ہے اور عرش مبارک کی مقدار اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔اس کو حاکم نے حضرت ابن عباسؓ سے موقوفاً روایت کیا ہے۔ابو مالک نے کہا کہ کرسی عرش کے نیچے ہے۔سدی نے کہا کہ آسمان و زمین کرسی کے اندر ہیں۔اور کرسی عرش کے سامنے ہے۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر ساتوں آسمان اور زمین کو ایک دوسرے کے ساتھ پھیلا کر رکھا جائے تو بھی کرسی کی وسعت کو نہ پہنچیں گے۔مگر اس طرح ہوں گے جیسے جنگل میں ایک حلقہ ہو۔ابن زید نے کہا میرے والد کہتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ساتوں آسمان کرسی کے نیچے ایسے ہیں جیسے کوئی ڈھال میں چند درہم ڈال دے۔

[بروایت ابن جریر] ابوذر کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ کرسی عرش میں اس طرح ہے جیسے ایک دشت کے سامنے لوہے کا چھلا پڑا ہو۔ عرش کی بڑائی کرسی کے مقابلے میں اتنی ہے جتنی دشت کے حلقے کے مقابلے میں بڑائی ہے۔[بروایت ابن مردویہ] حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے نبی علیہ السلام سے آکر کہا کہ دعا کیجئے اللہ کریم مجھے جنت میں لے جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کریم کی عظمت بیان کر کے فرمایا اس کی کرسی آسمان وزمین کو سمائے ہوئے ہے وہ کرسی ایسے چرچراتی ہے جیسے نئی پالان بوجھ سے چرچراتی ہے۔[بروایت ابو یعلی، بزار، عبد بن حمید، ابن جریر، طبرانی، ابن ابی عاصم والضیاء فی المختارہ] پھر اس کو کسی نے موقوفاً کسی نے مرسلاً اور کسی نے کم وبیش بیان کیا ہے۔ اس سے زیادہ غریب وہ حدیث ہے جس کو ابوداؤد نے جبیر بن مطعم سے روایت کیا جو صفت عرش کے متعلق ہے۔ ابن مردویہ کے پاس بریدہ وجابر وغیرہ سے احادیث مروی ہیں جو اس کرسی کے رکھنے کے متعلق ہیں جسے قیامت کے دن مخلوق میں فیصلے کے لیے لایا جائے گا مگر ظاہر یہ ہے کہ اس آیت سے وہ کرسی مراد نہ ہے وہ اور کوئی کرسی ہو گی۔ فتح البیان میں کہا ظاہر یہ ہے کہ کرسی وہ جسم مراد ہے جس کا تذکرہ احادیث میں ہے۔ ایک مقام پر معتزلہ نے اس کا انکار کیا ہے یہ انکی بہت بڑی غلطی ہے۔ ابن جریر نے کہا کہ راجح یہ ہے کہ کرسی سے علم مراد ہے۔ اسی لیے علماء کو کراسی کہا جاتا ہے۔ اور کتاب کے اجزاء جن میں علم ہوتا ہے انہیں کراویس جمع کراسہ کہتے ہیں۔ قاموس میں یوں ہے کہ کرسی بضم وکسر کاف بمعنی سریر وعلم ہے۔ کسی نے کہا کرسی اللہ کی قدرت ہے جس کے ذریعے وہ آسمان وزمین کو تھامے ہوئے ہے۔ بعض نے کہا کہ کرسی سے عرش مراد ہے۔ بعض نے کہا یہ درحقیقت کچھ وجود نہ ہے یہ ذکر عظمت کے لیے محض ایک تصویر ہے۔ تفتازانی کا بھی یہی قول ہے۔ بیضاوی نے کہا کہ یہ فقط ایک مثال ہے کسی نے کہا وہ ملک وسلطان سے عبارت ہے مگر سب سے مناسب اور عمدہ قول پہلا ہی ہے کہ کرسی وہ جسم ہے جس کی صفات احادیث میں مذکور ہیں۔ حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجاز کی طرف جانا محض جہالت ہے۔ اس کا سبب فلاسفہ کی جہالت و بے جا بحث ہے۔ اللہ ان کو غارت کرے۔ ابن کثیر نے فرمایا بعض متکلمین جو ہیئت دان ہیں کا گمان یہ ہے کہ کرسی آٹھواں آسمان ہے جس کو فلک ثوابت کہتے ہیں۔ اس کے اوپر نواں آسمان ہے۔ جس کو فلک اثیر و فلک اطلس کہتے ہیں۔ جبکہ دوسروں نے ان پر رد کیا ہے۔ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ کرسی عرش ہے مگر درست بات یہ ہے کہ کرسی اور عرش الگ الگ چیزیں ہیں۔ عرش زیادہ جسیم ہے جیسا کہ احادیث و آثار میں ہے۔ ابن جریر نے اس باب میں حضرت عمرؓ کی حدیث پر اعتماد کیا ہے۔ مگر ابن کثیر نے فرمایا کہ میرے نزدیک اس کی صحت میں نظر ہے۔ وَاللّٰہ اَعلم .

پھر فرمایا کہ اللہ کو ان دونوں کی حفاظت تھکاتی نہ ہے بلکہ اس کا آسانوں اور زمین کی نگرانی کرنا آسان ہے۔ صرف انہی پر نہیں بلکہ وہ ہر نفس پر قائم ہے اس کے اعمال پر نظر رکھے ہوئے ہے اس پر کچھ مخفی نہ ہے بلکہ سب کچھ اس کے سامنے حقیر و عاجز ہے۔ سب اسی کے محتاج و فقیر ہیں وہ غنی و حمید ہے۔ جو چاہے کرے اس سے کوئی سوال کرنے والا نہ ہے۔ وہ ہر چیز پر غالب اور ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ بر تر ہے اور بڑا ہے نہ اس کے سوا کوئی معبود ہے نہ مسجود۔ جیسے فرمایا: ﴿هُوَ الْكَبِيرُ الْمُتَعَال﴾ علو سے قدر و منزلت مراد ہے یعنی وہ ساری مخلوق سے اوپر ہے۔ اس سے اوپر کچھ نہ ہے کسی نے کہا وہ بطریق غلبہ و سلطنت سب سے اعلیٰ ہے اس سے اعلیٰ تر کوئی نہ ہے۔ بعض نے کہا وہ اس بات سے بھی اعلیٰ ہے کہ بیان کرنے والے کما حقہ اس کی ذات و صفات بیان کر سکیں۔ وہ صاحب عظمت و جلال ہے اور اپنی عظمت و جلال میں کامل الذات ہے۔ طبری نے نقل کیا ہے کہ اس کی جگہ مخلوق کے مراتب سے بلند ہے۔ ابن عطیہ نے کہا کہ یہ جھلاؤ محسمین کا قول ہے جو اس لائق نہ تھا کہ اس کو نقل کیا جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ مسئلہ اثبات جھت میں علماء کا اختلاف مشہور و معروف ہے۔ اس میں طویل بحث چلی آرہی ہے اور کتاب و سنت اثبات علو و فوق پر زور دے رہے ہیں لیکن جو شخص کسی مذہب میں نشو نما پاتا ہے وہ غیر کی بات کو خارج از شرع سمجھتا ہے۔ نہ دلیلوں کو دیکھتا ہے نہ متوجہ ہوتا ہے۔ کتاب و سنت ایسی کسوٹی ہیں جس سے حق و باطل الگ الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ صحیح غلط سے واضح ظاہر ہو جاتا ہے: ﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ الْأَرْضُ﴾ "اور اگر حق ان کی خواہشات کے پیچھے لگے تو آسمان و زمین بگڑ جائیں۔" اس میں شک نہ ہے کہ لفظ عَلِیّ کا اطلاق غالب و قاہر پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے: ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ﴾ اور علو و فوق مکان پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور اللہ کریم کے لیے ہر قسم کا علو و فوقیت ثابت ہے۔ جو شخص جہت علو کا انکار کرتا ہے وہ بلا وجہ بحث کرتا ہے۔ اور فضول گوئی کرتا ہے۔ صفات میں سلف کا مذہب اجراء صفات علی الظاہر ہے۔ تاویل کی ضرورت سے بے نیاز ہے۔ ظاہر نصوص پر ایمان لا کر خاموش ہو رہنے میں سلامتی ہے۔ تاویل کی دلدل میں پھنسنا ہلاک ہونا ہے۔

خوش نہ آئی یہ تیری چال ہمیں یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں۔

ابن کثیر نے فرمایا: ((هذا الاحاديث و ما فى معنا ها من الاحاديث الصحاح الاجود فيها طريقة السلف الصالح امر وها كما جائت من غير تكصيف ولا تشبيه)) سارے ائمہ و مجتہدین و محدثین کا یہی قول ہے۔ اس باب میں رسالہ "احتواء على مسئلة الاستواء" مختصر ہونے کے باوجود بہت عمدہ ہے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥٦﴾

دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے، ہدایت (صاف طور پر ظاہر) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے، تو جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے ایسی مضبوط رسی ہاتھ میں پکڑ لی یہ جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ (سب کچھ) سنتا اور (اور سب کچھ) جانتا ہے۔

فائدہ: یعنی کوشش کرتے ہیں ایسا نہیں کرتے کہ زبردستی اپنا دعویٰ منواتے ہیں بلکہ جس کام کو سب اچھا سمجھتے ہیں لیکن کرتے نہیں ہیں وہ کام ان سے کرواتے ہیں۔

فائدہ: ابن کثیر نے فرمایا اس آیت میں اللہ کریم نے یہی فرمایا کہ تم کسی پر دین کے قبول کرنے کی بات زبردستی نہ کرو کیونکہ اسلام ایک بالکل واضح چیز ہے۔ اس کی دلیلیں بڑی واضح ہیں وہ اس بات کا ضرورت مند نہیں کہ اس کے معاملے میں کسی پر زبردستی کی جائے۔ بلکہ جس کو اللہ ہدایت دیتا ہے تو اس کا سینہ کھول دیتا ہے۔ اس کی عقل روشن کر دیتا ہے وہ اسی سمجھ کے ساتھ اسلام قبول کر لیتا ہے جس کے دل کو اللہ نے اندھا کر دیا اس کے کانوں پر مہر لگا دی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا وہ اگر بوقت مجبوری اسلام میں داخل ہو بھی جائے تو اس کو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ یوں ذکر کیا ہے کہ یہ آیت انصار کی ایک قوم کے حق میں نازل ہوئی۔ گو کہ اس کا حکم عام ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جس عورت کا بچہ موت کے منہ میں جا رہا ہوتا ہے وہ اپنے نفس پر یہ بات نذر مانتی کہ اگر یہ زندہ رہے گا تو میں اس کو یہودی بناؤں گی، جب بنو نضیر جلاوطن کیے گئے تو ان میں انصار کے اس طرح کے بہت سے بچے تھے۔ انصار نے کہا کہ ہم اپنے بچوں کو نہ چھوڑیں گے۔ تب اللہ کریم نے یہ آیت نازل فرمائی۔ [بروایت ابن جریر، ابو داؤد، نسائی، ابن ابی حاتم و ابن حبان فی صحیحہ] حضرت مجاہد، سعید بن جبیر، شعبی، حسن بصری وغیرہ کا بھی یہی قول ہے کہ یہ آیت باب اسکے متعلق اتری ہے۔ حضرت ابن عباس کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ بنی سالم قبیلے میں ایک حصین نامی انصاری تھے اس کے دونوں بیٹے عیسائی تھے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے کہا میں ان پر زبردستی کر دیکھوں وہ تو نصرانیت کے سوا کسی اور دین کو نہیں مانتے اس پر یہ آیت باب نازل ہوئی۔ [بروایت ابن جریر] سدی نے کہا کہ وہ دونوں ان سوداگروں کے ہاتھ پر عیسائی ہوئے تھے جو شام سے زبیب لاتے تھے۔ ان کے والد نے ان پر زبردستی کرنا چاہی۔ آنحضرت ﷺ سے کہا کہ میں ان کو بلا نہ بھیجوں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت عمرؓ کا ایک غلام اسبق نامی عیسائی تھا، حضرت عمرؓ اس کو جب مسلمان ہونے کا کہتے تو وہ نہ مانتا اس پر حضرت عمر فرماتے: ﴿لَا اِكْرَاهَ

فِی الدِّیۡنِ ﴾اور فرماتے اے اسبق! اگر تو مسلمان ہو جائے تو میں مسلمانوں کو بعض امور پر تجھ سے مدد لوں۔ علماء کے گروہ کثیر نے کہا ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں اور اس شخص کی بابت ہے جو نسخ و تبدیل سے پہلے ان کے دین میں داخل ہو چکا ہے۔ جبکہ وہ جزیہ ادا کریں کہ پھر ان پر زبردستی نہ کرو۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ بلکہ یہ آیت منسوخ ہے۔ اس کی ناسخ آیت قتال ہے۔ سب امتوں کو دخول دین حنیف کی طرف لانا واجب ہے۔ جو اس دین میں داخل نہ ہو، نہ مطیع ہو، نہ جزیہ دے اس سے یہاں تک لڑا جائے کہ وہ مارا جائے۔ اکراہ کے یہ معنی ہیں۔ اللہ کریم نے فرمایا: ﴿سَتُدۡعَوۡنَ اِلٰی قَوۡمٍ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ تُقَاتِلُوۡنَهُمۡ اَوۡ یُسۡلِمُوۡنَ﴾ کہ "عنقریب تم ایک بہت جنگجو قوم کی طرف بلائے جاؤ گے۔ "تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں۔ اور فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الۡكُفَّارَ وَالۡمُنٰفِقِیۡنَ وَاغۡلُظۡ عَلَیۡهِمۡ﴾ کہ "اے پیغمبر! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔" اور فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ یَلُوۡنَكُمۡ مِّنَ الۡكُفَّارِ وَلۡیَجِدُوۡا فِیۡكُمۡ غِلۡظَةً وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ ۝﴾ "اے ایمان والو! تم ان کافروں سے لڑو جو تم سے ملحق ہیں اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں اور خوب جان لو کہ اللہ متقین کے ساتھ ہے۔" صحیح میں آیا ہے کہ اللہ ایسی قوم سے تعجب کرتا ہے جن کو بیڑیوں میں جنت کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ مراد وہ لوگ ہیں جن کو قید کر کے لایا جاتا ہے ان کی گردنوں میں طوق غلامی ہوتے ہیں اور مشکیں باندھے ان کو بلادِ اسلام میں لایا جاتا ہے۔ پھر وہ مسلمان ہو کر عمل صالح کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کا ظاہر باطن سنور جاتا ہے اور اہل جنت سے ہو جاتے ہیں۔ اور جو حدیث انسؓ میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو کہا کہ تو مسلمان ہو جا۔ اس نے کہا میں آپؐ کو کارہ پاتا ہوں یعنی میرا دل نہیں چاہتا۔ فرمایا: اگرچہ تو ناپسند بھی کرے۔ [بروایت احمد] یہ حدیث ثلاثی صحیح ہے۔ لیکن یہ اس قبیل سے نہ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اس پر کوئی زبردستی نہ کی تھی بلکہ اس کو صرف اسلام کی دعوت دی تھی اس نے کہا میرا دل نہیں چاہتا۔ اس پر فرمایا: اگرچہ تیرا دل نہ بھی چاہے تو مسلمان ہو جا اللہ تجھے اخلاص و حسن نیت عطا کر دے گا۔

فائدہ: فتح البیان میں یوں کہا کہ اس آیت میں کئی اقوال ہیں ایک یہ کہ منسوخ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے عرب کو دین اسلام پر مجبور کیا۔ ان سے قتال کیا اور اسلام کے سوا ان سے کسی بات پر راضی نہ ہوئے۔ اکثر مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں خاص ہے کہ جب وہ جزیہ دیں تو پھر انہیں اکراہ کی زد میں نہ لایا جائے۔ اکراہ تو بت پرستوں پر ہے کہ ان سے اسلام یا قتال کے علاوہ کچھ مقبول نہ ہے۔ شعبی، حسن، قتادہ اور ضحاک کا یہی قول ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ انصار کے حق میں خاص ہے

۔چوتھا قول یہ ہے کہ جو تلوار کے نیچے ایمان لے آئے اسے یہ نہ کہو کہ یہ زبردستی ایمان لایا ہے۔پانچواں قول یہ ہے کہ یہ اہل کتاب کے قیدیوں کے متعلق ہے۔کہ ان پر اسلام کی بابت جبر نہ کرنا چاہئے۔چھٹا قول ابن کثیر کا ہے جو اوپر گذر چکا ہے۔ساتواں قول وہ ہے جو تفسیر کشاف میں مذکور ہے۔کہ اللہ نے یہ حکم نہ دیا ہے کہ تم لوگوں کو مار مار کر اسلام میں داخل کرو۔ہاں جو اپنی مرضی سے مسلمانوں میں داخل ہو سو ہو جائے۔جسے فرمایا: ﴿وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِي الۡاَرۡضِ كُلُّهُمۡ جَمِيۡعًا ؕ اَفَاَنۡتَ تُكۡرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ﴾ کہ ”اگر تیرا رب چاہے تو اہل زمین سب کے سب مسلمان ہو جائیں۔کیا پھر آپ لوگوں کو مجبور کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ مومن بن جائیں۔“یعنی اگر اللہ چاہتا تو ان کو ایمان پر مجبور کرتا لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔بلکہ لوگوں کے اختیار پر چھوڑا ہے۔سب سے زیادہ لائق تو یہ بات ہے کہ یہ آیت اپنے سبب نزول میں محکم ہے۔منسوخ نہ ہے۔سبب نزول وہی عورت کا قصہ ہے۔جو مذکور ہو چکا ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ اہل کتاب پر اکراہ نہ ہے جبکہ وہ جزیہ ادا کر کے اپنے دین پر رہنا چاہیں۔رہے اہل حرب تو اگرچہ یہ آیت ان کو بھی شامل ہے کیونکہ نکرہ سیاق نفی میں آیا ہے اور دین معرفہ ہے۔اور لفظ کا عموم معتبر ہے۔سبب کا خصوص نہیں مگر یہ عموم ان آیات سے مخصوص ہے جو اہل حرب کے حق میں اکراہ کی بابت آئی ہیں۔

فائدہ: طاغوت طغیان سے مشتق ہے۔جوہری نے کہا کہ کاھن، ساحر، شیطان اور ہر سردار گمراہی اور ہر معبود غیر اللہ کو طاغوت کہتے ہیں۔مفرد و جمع دونوں طرح آیا ہے۔مطلب یہ ہوا کہ جس نے شیطان، اصنام یا کُھّان یا روؤس ضلالت میں سے کسی کا یا سب کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا تو گویا اس نے ایک مضبوط رسی کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹتی نہیں ہے۔ابن کثیر کا لفظ یہ ہے کہ جس نے انداد و اوثان و عبادت غیر اللہ کو چھوڑا لا الہ الا اللہ کی گواہی دی اللہ کو ایک سمجھ کر اس کی عبادت بجالایا۔اس کا کام مضبوط و ثابت ہوا۔وہ عمدہ طریقہ و رستے پر سیدھا ہوا۔حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جبت جادو ہے اور طاغوت شیطان ہے۔بہادری اور بزدلی فطرت ہے جو مردوں میں ہوتی ہے۔بہادر اس سے بھی لڑتا ہے جس کو پہچانتا بھی نہیں اور بزدل ماں سے بھی بھاگ جاتا ہے۔اور مرد کی عزت و تکریم اس کے دین کی بنا پر ہے اور مرد کا حسب اس کا اخلاق ہے اگرچہ فارسی یا نبطی ہو۔شرافت دین کی وجہ سے ہے نسب کی وجہ سے نہیں۔جس کا خلق اچھا ہے وہ شریف ہے گو وہ نسب میں کم ہو۔حضرت مجاہد نے فرمایا کہ مضبوط رسی سے ایمان مراد ہے۔سدی نے کہا اسلام مقصود ہے۔سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا کہ لا الہ الا اللہ مراد ہے۔انس بن مالک نے کہا کہ قرآن ہے۔سالم بن ابی الجعد نے کہا کہ ((الحب فی اللہ والبغض فی اللہ))

مقصود ہے۔ابن کثیر نے فرمایا یہ سب اقوال درست ہیں۔باہم کچھ منافات نہ ہے۔حضرت معاذ بن جبل فرماتے ہیں کہ اس رسی کو (دخول جنت تک) شکست نہ ہے۔حضرت مجاہد نے یہ آیت پڑھنے کے بعد فرمایا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُوْا مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ "اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا حتیٰ کہ وہ اپنے آپ کو خود نہ بدلیں۔" احمد نے حضرت عبداللہ بن سلام کا طویل خواب ذکر کیا ہے۔اس میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک مضبوط رسی کو پکڑا۔اس کی تعبیر آنحضرت ﷺ نے یہ کی کہ یہ رسی اسلام ہے تو اس کو مرتے دم تک تھامے رہو۔یہ طویل حدیث مسلم ونسائی میں بھی مذکور ہے۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥٧﴾

جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کا دوست اللہ ہے کہ اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے دوست شیطان ہیں کہ ان کو روشنی سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں یہی لوگ اہلِ دوزخ ہیں کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یعنی کافروں کی مخالفت وضد خاک میں ملانے کے لیے ایک اقدام و کوشش ہے۔اللہ جس کی قسمت میں کرتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے۔جب شبہ محسوس ہوا تو فوراً خبردار کیا۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس آیت میں خبر دی ہے کہ جو شخص اللہ کی رضا پر چلتا ہے اللہ کریم اس کو سلامتی والا رستہ بتادیتا ہے۔اسے کفروشرک کے ظلمت سے نکال کر نورِ حق جو واضح صاف اور آسان رستہ ہے اس کی طرف لے آتا ہے۔کافروں کا شیطان دوست ہے۔وہ انہیں جہالت وضلالت مزین کر کے دکھاتا ہے۔انہیں سیدھے راستے سے بھٹکا کر شک وبہتان کی راہ پر ڈال دیتا ہے • حق ایک ہی ہے اسلیے نور کا لفظ مفرد آیا ہے جبکہ کفر کی بہت سی اقسام ہیں اس لیے لفظ ظلمات کو جمع کے صیغے سے تعبیر کیا ہے۔جیسے فرمایا: ﴿إِنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْماً فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ کہ "بلاشبہ یہ میرا سیدھا رستہ ہے اس کی پیروی کرو اور کئی رستوں پر نہ چلو وہ تمہیں اس کے راستے سے متفرق کردیں گے۔ تمہیں اس بات کی وصیت کی جاتی ہے کہ تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔" اور فرمایا: ﴿وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرِ﴾ "اور اس نے اندھیرے اور نور پیدا کیے۔" اور فرمایا: ﴿وَعَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشَّمَائِلِ﴾ اس کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں جن میں حق کی وحدانیت و باطل کی کثرت کا ذکر کیا ہے۔ابوایوب بن خالد نے کہا کہ اہل

اھوَا اوراہل فتن سر اٹھاتے ہیں پھر ایمان کا فتنہ روشن ہوتا ہے اور اہل کفر کا فتنہ اندھیرا اور سیاہ ہوتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾

بھلا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو اس (غرور کے) سبب سے کہ اللہ نے اس کو سلطنت بخشی تھی ابراہیم سے پروردگار کے بارے میں جھگڑنے لگا، جب ابراہیم نے کہا میرا پروردگار تو وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، وہ بولا کہ جلا اور مار تو میں بھی سکتا ہوں، ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے آپ اسے مغرب سے نکال دیجئے (یہ سن کر) کافر حیران رہ گیا اور اللہ بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

فائدہ: ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا وہ سلطنت کے غرور میں لوگوں سے خود کو سجدہ کراتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سجدہ نہ کیا۔ اس نے سبب پوچھا، تو انہوں نے فرمایا کہ میں صرف اللہ کو سجدہ کرتا ہوں اس نے کہا رب تو میں ہوں۔ انہوں نے فرمایا میں حاکم کو رب نہیں کہتا۔ رب تو وہ ہے جس نے زندہ کیا اور وہی مارتا ہے۔ اس نے دو قیدی منگوائے اور جس کو سزائے موت ہونا تھی اس کو چھوڑ دیا اور جسے رہائی ملنا تھی اس کو مار دیا۔ تب انہوں نے سورج کی دلیل طلب کر کے اسے لاجواب کر دیا۔

فائدہ: ابن کثیر نے فرمایا کہ وہ بادشاہ جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا وہ بابل کا بادشاہ نمرود بن کنعان بن کوس بن سام بن نوح تھا۔ اس کو نمرود بن فالخ بن عائذ بن شالخ بن سام بن نوح بھی کہتے ہیں۔ حضرت مجاہد وغیرہ کا موقف پہلے قول پر ہے۔ حضرت مجاہد نے کہا کہ مشارق و مغارب ارض کے بادشاہ چار گذرے ہیں جن میں سے دو مومن اور دو کافر تھے۔ دو مومن بادشاہ حضرت سلیمان بن داؤد اور ذوالقرنین تھے اور کافر بادشاہ نمرود اور بخت نصر تھے۔ سب سے پہلے جس نے اپنی سلطنت میں تجبر کیا وہ یہی نمرود مردود تھا۔ اور وہ ولد الزنا تھا۔ اس آیت میں پہلی بات کی شہادت ہے کہ کافروں کا دوست مددگار طاغوت ہوتا ہے اور اس کا غرور سلطنت کی وجہ سے تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ اس نے یہ جھگڑا کب کیا۔ کسی نے کہا تب ایسا واقعہ پیش آیا جب حضرت ابراہیمؑ نے بت توڑے۔ کسی نے کہا کہ آگ میں ڈالنے کے بعد ایسا کیا۔ اس نے چار سو برس حکومت کی۔ اس کا یہ دعویٰ ایسے ہی ہے جیسے فرعون نے کہا تھا: ﴿مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي﴾ کہ "میرے خیال میں میرے سوا تمہارا کوئی معبود نہ ہے۔" اس نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ تمہارے پاس وجود رب کی کیا دلیل ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس

کی ذات کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہا اس نے عدم کے بعد ہر چیز کو وجود بخشا۔ پھر وجود کے بعد انہیں عدم میں منتقل کرے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً کوئی ذات مختار ہے جو ان میں یہ عمل کر رہی ہے ورنہ یہ نظام بغیر کسی چلانے والے کے چل نہیں سکتا۔ وہی ان کا موجد ہی رب ہے۔ جس کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں اور وہ ہے بھی اکیلا اس کا کوئی شریک نہ ہے۔ اس پر بولا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں پھر دو قیدی منگوا کر ایک کو چھوڑ دیا اور دوسرے کو قتل کروا دیا۔ حضرت قتادہ، سدی اور ابن اسحاق کا یہی قول ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں ظاہر یہ ہے کہ اس کی مراد یہ نہ تھی کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کا جواب نہ تھا کیونکہ اس میں وجود صانع سے منع مذکور ہے بلکہ اس کی مراد یہ تھی کہ میں بھی ایسا ہی دعویٰ کرتا ہوں اور اس کا یہ دعویٰ بطریق تکبر تھا کہ اس نے خود کو فاعل مختار سمجھا کہ میں زندگی اور موت کا اختیار رکھتا ہوں۔ فرعون نے بھی گویا اسی کی پیروی میں دعویٰ ربوبیت کر دیا۔

میرا ہی مقلد عمل تھا مجنوں کے دماغ میں خلل تھا

حضرت ابراہیم نے اس کے اس سوال مکابرے کا اس عمدہ طرح جواب دیا۔ فرمایا کہ اگر تو رب ہے تو سورج کو مغرب سے نکال دے جیسا کہ اللہ اس کو مشرق سے نکال دیتا ہے کیونکہ جو زندگی موت کا اختیار رکھے گا تو یقناً اس کا اثر وجود خلق و ذات خلق اور نجوم وغیرہ پر بھی ہوگا۔ سورج ہر روز مشرق سے نکلتا ہے لیکن تم اس کو مغرب سے نکال دو۔ وہ مردود یہ سن کر حیران ہو گیا اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور اس کے خلاف حجت تمام ہوئی۔ اللہ ظالموں کو دلیل الہام نہیں کرتا بلکہ اللہ کے سامنے ان کی دلیل ہو بھی تو کمزور ہی ہوتی ہے۔ ان پر اللہ کا غضب اور عذاب الیم کی بشارت ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آیت کو اس معنی پر محمول کرنا عمدہ ہے۔ یعنی اس بیان سے زیادہ مناسب ہے جو منطقیوں نے کہا ہے کہ ابراہیم کا ایک مقام سے چل کر دوسرے مقام تک آنا گویا ایک دلیل سے اس دوسری دلیل کی طرف منتقل ہونا ہے جو پہلی سے زیادہ واضح تر ہے۔ اور بعض نے ایسی عبارت کہی جو خود ان کی بات کا رد کرتی ہے۔ سو قول مذکور کوئی چیز نہ ہے بلکہ مقام اول مقدمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے نمرود کے دونوں اقوال کا باطل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ **والحمد لِلّٰہِ والمنۃ**۔

فتح البیان میں کہا ہے کہ حضرت ابراہیم کی مراد یہ تھی کہ اللہ وہ ہے جو اجسام میں موت و زندگی پیدا کرتا ہے اور کافر کی مراد یہ تھی کہ وہ قاتل کو زندہ رکھ سکتا ہے اور غیر قاتل کو مار سکتا ہے۔ گویا یہی زندگی و موت ہے۔ احمق کا یہ جواب اس لائق نہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کی دلیل کے مقابلے میں کہا جاتا کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کی مراد کچھ اور تھی اور نمرود کی مراد کچھ اور تھی۔

سوال از آسمان جواب از سیماں

سدی نے کہا کہ ان کے درمیان یہ مناظرہ تب ہوا جبکہ حضرت ابراہیمؑ آگ سے باہر نکلے اس وقت ان کی ملاقات بادشاہ سے ہوئی۔اس سے پہلے وہ بادشاہ سے کبھی نہ ملے تھے۔ملاقات میں یہ مناظرہ پیش آیا۔زید بن اسلم نے کہا کہ نمرود کے پاس غلہ تھا لوگ اس کے پاس آکر غلہ لے جاتے تھے۔حضرت ابراہیمؑ کو غلہ نہ دیا اور وہ خالی چلے آئے جب گھر کے قریب آئے تو وہاں ٹیلے پر ریت تھی وہاں سے ایک بوری ریت کی بھر لی۔کہا گھر والوں کو کوئی نفع ہو جائے گا اور گھر آکر وہ کندھے سے اتاری، تھکے ہوئے تھے آتے ہی سو گئے۔سارہؑ نے اٹھ کر بوری کھولی اس میں بہت عمدہ غلہ پایا انہوں نے پیسا پیس کر کھانا تیار کر دیا۔حضرت ابراہیمؑ جب جاگے تو کھانا دیکھ کر پوچھا یہ کہاں سے آیا ہے؟ کہا یہ وہی جو آپؑ لائے ہیں انہوں نے جان لیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو اس کی طرف مبعوث کیا کہ اسے ایمان کی طرف بلائیں انہوں نے اسے دعوت دین دی لیکن وہ نہ مانا دو تین، چار دفعہ سمجھایا لیکن اس نے قبول نہ کیا۔کہا تم اپنے ساتھی جمع کرو میں اپنے ساتھی جمع کرتا ہوں۔سورج نکلنے پر نمرود کا لشکر جمع ہو گیا۔اللہ نے ان پر مچھروں کا لشکر بھیج دیا۔ابھی انہوں نے سورج کو دیکھا بھی نہ تھا کہ مچھروں نے ان کے گوشت پوست کھا لیے۔ہڈیاں رہ گئیں ایک مچھر نمرود کے دماغ میں ناک کے ذریعے گھس گیا۔چار سو برس اس کے دماغ میں رہا۔اللہ نے اس کو عذاب میں گرفتار کر دیا۔سر پر جوتے پڑتے تھے۔اسی ذلت میں مر گیا۔اللہ کا یہ قول صادق آیا کہ ظالموں کو ہدایت نہیں ملا کرتی۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى يُحْيِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانظُرْ إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ

یا اسی طرح اسی شخص کو (نہیں دیکھا) جسے ایک گاؤں میں جو اپنی چھتوں پر گرا پڑا تھا اتفاق سے گذر ہوا تو اس نے کہا کہ اللہ اس (کے باشندوں) کو مرنے کے بعد کیونکر زندہ کرے گا، تو اللہ نے اس کی روح قبض کر لی (اور) سو برس تک (اس کو مردہ رکھا) پھر اس کو جلا اٹھایا اور پوچھا تم کتنا عرصہ (مرے) رہے ہو اس نے جوب دیا کہ ایک دن یا اس سے بھی کم، اللہ نے فرمایا (نہیں) بلکہ سو برس (مرے) رہے ہو اور اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ (اتنی مدت میں مطلق سڑی) بسی نہیں اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو کہ ہم ان کو کیونکر جوڑے دیتے اور ان پر (کس طرح) گوشت پوست

لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾ چڑھائے دیتے ہیں، جب یہ واقعات سے مشاہدے میں آئے تو بول اٹھا کہ میں یقین کرتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

فائدہ: موضح قرآن نے کہا کہ یہ شخص حضرت عزیرؑ پیغمبر تھے ان کے زمانہ میں ایک کافر بادشاہ بخت نصر تھا۔ بنی اسرائیل پر غالب تر تھا اس نے بیت المقدس کو ویران کر دیا اور لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ حضرت عزیر علیہ السلام اس شہر پر سے گذرے اور تعجب کیا کہ یہ شہر پھر کیسے آباد ہو گا اسی مقام پر ان کی روح قبض کر لی گئی۔ سو برس کے بعد جو زندہ ہوئے تو ان کا کھانا پینا ان کے پاس رکھا تھا اور گدھا بھی مر چکا تھا اور وہ ہڈیاں اسی طرح پڑی تھیں۔ وہ گدھا پھر ان کے سامنے زندہ ہوا۔ ان کی اسی سو سال کی مدت میں وہ قیدی رہا ہوئے۔ اور شہر آباد ہو چکا تھا جب یہ زندہ ہوئے تو شہر آباد تھا۔

فائدہ: پہلے اللہ کریم نے آنحضرت ﷺ سے کہا تھا کہ کیا آپؐ نے اس شخص جیسا کوئی جھگڑالو بھی دیکھا ہے جس نے حضرت ابراہیمؑ سے اس کے رب کے متعلق جھگڑا کیا، اب فرمایا کہ کیا آپؐ نے اس بستی پر گذرنے والے کو بھی دیکھا جس کو اللہ نے اشتباہ کے اندھیرے سے نکال کر نور شہادت میں داخل کر دیا۔ معقول کو محسوس کر دکھایا، باطن کو ظاہر کر دیا اس میں اختلاف ہے کہ وہ کون شخص تھا جس کا گذر اس بستی پر سے ہوا۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا کہ وہ عزیر بن شرخیا تھے۔ حضرت ابن عباسؓ، حسن، قتادہ، سدی، سلمان بن بریدہ اور ناجیہ بن کعب کا قول بھی یہی ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہی بات مشہور ہے۔ وہب بن منبہ اور ابن عبید نے کہا وہ ارمیا بن شلقیا تھے۔ وہ حضرت ہارون کی اولاد سے تھے۔ وہب کا ایک قول یہ ہے کہ وہ خضر علیہ السلام تھے انہی کا نام ارمیا تھا۔ کسی شامی کا ایک یہ بھی قول ہے کہ وہ حزقیل بن بوار تھے۔ حضرت مجاہد نے کہا وہ اسرائیلی شخص تھے۔ مجاہد کا ایک یہ قول ہے کہ وہ کوئی کافر تھا اس نے بعث بعد الموت میں شک کیا تھا۔ مگر یہ قول واہی ہے۔ اس لیے کہ لفظ كَمْ لَبِثْتَ میں اس شخص کو خطاب ہے اور اللہ کسی کافر کو مخاطب نہیں کرتا ہے۔ ﴿لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ﴾ کا استعمال بھی کسی کافر کے حق میں نہیں ہوتا۔ غرضیکہ اس جگہ صرف بعث بعد الموت پر ثبوت مقصود ہے۔ اس شخص کی پہچان و تعارف مقصود نہ ہے۔ مشہور یہ بات ہے کہ اس جگہ گاؤں سے بیت المقدس مراد ہے۔ بخت نصر کے فساد کے بعد ان کا گذر ہوا۔ جبکہ وہاں کے لوگ قتل و غارت میں مر گئے تھے۔ کسی نے کہا قریہ سے اہل قریہ مراد ہیں۔ کسی نے کہا وہ قریہ مراد ہے جس کے رہنے والے وبا کے خوف سے نکل گئے تھے۔ جن کا قصہ گذر چکا ہے۔ کلبی نے کہا دیر سابر آباد مراد ہے۔ یہ جگہ فارس میں تھی سدی نے

کہا کہ وہ قریہ سلما آباد تھی جو جرجان یا ہمدان کے نواحی میں تھی۔ بعض نے کہا وہ دِیَر ہر قل مراد ہے۔ وہ بصرہ و عسکر مکرم کے درمیان دریائے دجلہ کے کنارے ہے۔ فتح البیان میں بھی پہلے قول کو ظاہر تر اور مشہور کہا ہے۔ بہر حال اللہ کریم نے نہ اس شخص کا نام بتایا ہے نہ اس بستی کا اصل اس کی وہی جانتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب ان کا گذر اس بستی سے ہوا تو اس ویرانی کو دیکھ کر سوچا کہ جب عظیم تعمیر کے بعد اس کی یہ حالت ہو گئی ہے تو پھر اللہ کیسے اس کو زندہ کرے گا، اللہ انہیں سو برس تک مار دیا پھر زندہ کیا۔ کہتے ہیں کہ ان کی وفات کے ستر سال بعد وہ لوگ آباد ہوئے تیس برس میں خوب آبادکاری ہو گئی۔ بنی اسرائیل بھی وہاں آگئے تھے جب کہ اللہ نے ان کو زندہ کرنا چاہا تو ان کی آنکھوں کو کھولا تا کہ وہ اللہ کی کاری گری دیکھیں کہ وہ کیسے ان کے بدن کو زندہ کرتا ہے۔ جب وہ زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ نے ایک فرشتے کے ذریعے ان سے کہا کہ تو کتنی دیر رہا۔ کہا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، اور یہ اس لیے کیا کہ وہ دن کے شروع میں فوت ہوئے اور آخر میں زندہ ہوئے تھے۔ دیکھا کہ سورج ابھی باقی ہے خیال کیا کہ یہ اسی دن کا سورج ہے۔ اس بنیاد پر کہا کہ یا ایک دن سے بھی کم عرصہ میں مرا رہا۔ ان کے ساتھ انگور انجیر اور عصیر تھا دیکھا کہ کچھ گلا سڑا نہیں نہ انجیر کھٹا ہوا نہ عصیر کا ذائقہ تبدیل ہوا نہ انگور خراب ہوا۔ پھر ان کے سامنے گدھے کو زندہ کیا کہا کہ تم اجر معاد پر اور بعثِ خلق پر دلیل ہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب وہ شہر میں آئے تو ایک ہمسایہ کفشگ کو جوان چھوڑا تھا اس کو شیخ فانی پایا۔ کہتے ہیں کہ جس فرشتے نے ان سے سوال کیا وہ جبریلؑ تھے یا کوئی اور فرشتے تھے یا خود اللہ نے پوچھا تھا۔ یہی بات زیادہ مناسب ہے جو جواب انہون نے دیا تھا وہی جواب اصحاب کہف نے دیا تھا کہ: ﴿قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ ''انہوں نے کہا کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ مرے رہے۔'' اسی طرح وہ واقعہ بھی ہے جیسے قصہ ذوالیدین میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((لم تقصر و لم انس)) کہ ''نہ نماز کم ہوئی ہے نہ میں بھولا ہوں۔'' معلوم ہوا کہ صدق وہ ہے جو اعتقاد کے موافق ہے، اور کذب وہ ہے جو اعتقاد کے خلاف ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ گدھا گل سڑ کے ختم ہو گیا تھا جسے ان کے سامنے زندہ کیا اور اسے گوشت پہنایا۔ سدی کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا بلکہ وہ مرا نہ تھا اسی جگہ کھڑا تھا جہاں اسے ٹھہرایا تھا۔ وہ سو برس اسی طرح کھڑا رہا۔ پہلے قول کی دلیل اس لفظ میں ہے: ﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ دوسرے قول کی تائید یہ ہے کہ ﴿وَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ نفخ روح کا اشارہ اس لیے نہ کیا کہ وہ حکمت و ضاحت کا تقاضا نہ کرتی تھی۔ واللہ اعلم۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَى قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَى وَلَكِن لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۶۰﴾

اور جب ابراہیم نے (اللہ سے) کہا کہ اے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا، اللہ نے فرمایا کیا تم نے (اس بات کو) باور نہیں کیا انہوں نے کہا کیوں نہیں لیکن (میں دیکھنا) اسلیئے (چاہتا ہوں) کہ میرا دل اطمینان کامل حاصل کر لے، اللہ نے فرمایا کہ چار جانور پکڑ کر اپنے پاس منالو (اور ٹکڑے ٹکڑے کر دو) پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر رکھ دو پھر ان کو بلاؤ تو وہ تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے اور جان رکھو کہ اللہ غالب (اور) صاحب حکمت ہے۔

فائدہ: موضح قرآن میں فرمایا کہ چار جانور لائے گئے تھے، ایک مور، کبوتر، کوا اور مرغ، ان کو اپنے ساتھ دکھاتا کہ پہچان ہو جائے۔ پھر ان کو ذبح کیا اور ایک پہاڑ پر سب کے سر رکھے ایک کے اوپر پر رکھ دیئے، ایک پر دھڑ، اور ایک پر پاؤں رکھے، اور ان کے درمیان کھڑے ہو کر پکارا ایک پہاڑ سے سر اٹھا اور ہوا میں معلق ہو گیا ایک سے دھڑ آیا، پھر پر لگے، پھر پاؤں لگے تو وہ دوڑتا ہوا ان کے پاس چلا آیا۔ اسی طرح چاروں پرندے آگئے۔ یہاں تک تین قصے بعث بعد الموت کے ذکر ہوئے۔ جس کو اس میں شک ہو فوراً اس کا جواب ارشاد کر دیا۔ اس کے بعد پھر جہاد و انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔

فائدہ: ابراہیمؑ نے جو اللہ سے سوال کیا اس کا سبب ذکر کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب نمرود سے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ پھر ان کا دل چاہا کہ علم الیقین سے عین الیقین کی طرف ترقی کریں۔ آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں۔ ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ ہم ابراہیمؑ سے زیادہ شک کے مستحق ہیں۔ [بروایت الشیخان] ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس جگہ شک سے وہ شک مراد نہ ہے جو بے علم سمجھے ہیں اس حدیث کے کئی جوابات نقل کیے گئے ہیں۔ مگر تفسیر مذکور میں اس جگہ بیاض ہے۔ فتح البیان میں کہا کہ حضرت ابراہیمؑ کو احیاء موتیٰ میں کسی قسم کا کوئی شک نہ تھا۔ بلکہ انسان کی فطرت ہے کہ جس چیز کی خبر سنتا ہے اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ: ((ليس الخبر كالمعاينة))

یار کیا ذات ہے تیری کہ ندیدہ ہو کر مجھے دیدہ نظر آتا ہے شنیدہ ہو کر

اہل علم کے ایک گروہ نے کہا کہ یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ قدرت میں شک ہوا تھا جیسا کہ حدیث ابی ہریرہ میں گذرا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک اس سے زیادہ امیدوار کرنے والی کوئی آیت قرآن

میں نہ ہے۔ ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا میرے نزدیک یہ ترجیح مردود ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر ابراہیمؑ شک کرتے تو ہم زیادہ شک کے مستحق ٹھہرتے مگر جبکہ ہم نے شک نہیں کیا تو ابراہیمؑ عدم شک کے لائق تر ہیں۔ حدیث کی بنیاد عدم شک پر ہے۔ رہا حضرت ابن عباسؓ کا قول تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ پر ناز کر کے کہا کہ دنیا میں زندہ کر کے دکھادے کیونکہ وہاں کی زندگی تو معلوم ہے۔ یہاں زندہ ہونے کی عادت نہ ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ایمان کافی ہے اس کے ہوتے ہوئے اتنی بحث کرید کی ضرورت نہیں ہے۔ تو یہ آیت سب سے زیادہ امید دلانے والی ہوئی کیونکہ عام ایمان والے ہر شک کا طاری ہونا بعید ہے تو وہ نبی و خلیل بالا ولیٰ اسے بلند درجے والے ہیں۔ وہاں شک کا کیسے تصور ہو سکتا ہے۔ سب انبیاء صغائر و کبائر سے معصوم ہوتے ہیں۔ آیت کریمہ کے الفاظ میں غور کرنے سے بھی کوئی شک ظاہر نہیں ہوتا۔ اس جگہ فتح البیان کا مکمل بیان ذکر ہے۔ قرطبی نے کہا کہ ابن عطیہ نے بہت عمدہ بات کہی ہے۔ انبیاء پر ایسا شک تصور میں بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس طرح کا شک کفر ہے۔ سب انبیاء عقیدہ بحث پر متفق ہیں۔ اللہ نے خبر دی کہ شیطان کا زور انبیاء و اولیاء پر نہیں چلتا ہے۔ فرمایا: ﴿إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ﴾ کہ "بلا شبہ میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ نہ ہوگا۔" خود اس لعین سے یہ نقل کیا کہ ﴿إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ کہ پھر جب اس لعین کا کچھ غلبہ اللہ والوں پر نہیں تو پھر شک کیسا۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے عین الیقین کے لیے ان کے اجزاء کا ملنا اور گوشت وغیرہ چڑھنا اور پھر زندہ ہونا دیکھنا چاہتے تھے۔ واللہ اعلم۔

کسی نے کہا کہ پرندے کو اس لیے ذکر کیا کہ وہ انسان کے زیادہ قریب النوع ہوتا ہے۔ اس کا سر بھی انسان کی طرح گول ہوتا ہے دو پاؤں پر چلتا ہے یا اس لیے کہ پرندے کی ہمت یہ ہے آسمان پر اڑے اور ہمت خلیل یہ تھی کہ عَلُوْ میں جائیں۔ اس کے علاوہ اور بھی تخصیص تعداد کے کئی نکتے بیان کیے گئے ہیں جو ان دونوں کے قریب تر ہیں۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ان پرندوں کی تعیین میں مفسرین کا اختلاف رہا ہے کہ وہ پرندے کون سے تھے۔ اس تعیین میں کچھ فائدہ بھی نہیں ہے کیونکہ اگر یہ کوئی اہم مسئلہ ہوتا تو خود اللہ کریم اس کو بطور نص ذکر کر دیتا۔ حضرت مجاہد و عکرمہ کا وہی قول ہے جو موضح قرآن سے نقل ہو چکا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایک غرنوق، ایک مور، ایک مرغ اور ایک کبوتر تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ ایک مور ایک کبوتر کا بچہ، ایک مرغ اور ایک وز تھا۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ وہ اجزاء اور پہاڑ کتنے تھے مگر اس بحث میں کچھ فائدہ نہ ہے۔ ایک گروہ سلف نے کہا کہ لفظ فَصُرْهُنَّ سے ان کا ٹکڑے کرنا مراد ہے یا باندھنا یا جمع کرنا یا بلانا یا چیر پھاڑ کرنا مراد ہے۔ غرضیکہ کچھ بھی ہو چار پرندے لیے ا

وران کو ذبح کر کے ان کے پر علیحدہ علیحدہ کر کے انہیں خلط ملط کر دیا اور ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیئے۔ وہ چار یا سات پہاڑ تھے پھر انکے سر اپنے ہاتھ میں لے کر پکارا، پھر دیکھا کہ پر پر سے مل گئے خون خون سے غرضیکہ ہر جزء دوسرے جزء سے مل گیا اور الگ طور پر ہر پرندہ بن گیا۔ اور دوڑتا ہوا ان کے پاس چلا آیا۔ اگر اڑتا آتا تو کوئی متوھم یہ وہم کر سکتا تھا کہ وہ کوئی اور پرندہ ہے اس کے پاؤں سلامت نہ ہیں اس شبہ کو ختم کرنے کے لیے وہ پاؤں پر چل کر آئے ۔اس قصے میں حضرت خلیلؑ کے فضل وادب پر دلیل ہے کہ جو سوال کیا وہ فوراً پورا ہوا۔ حضرت عزیرؑ کو سو سال بعد ان کے سوال کا جواب ملا۔ ابن المسیب نے کہا کہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن عمروؓ جمع ہوئے تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ بتاؤ بندوں کے لیے قرآن میں کونسی آیت زیادہ امید دلانے والی ہے۔ ابن عمروؓ نے کہا اللہ کا یہ فرمان: ﴿قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ اَسْرَفُوا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۝اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ کہ "فرمادیجے! اے میرے بندو! جو اپنے نفسوں پر زیادتی کر چکے ہو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ بلاشبہ اللہ سب گناہوں کو معاف کرتا ہے بلاشبہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تم اس طرح کہتے ہو جبکہ میں یہ کہتا ہوں کہ اس امت کے لیے حضرت ابراہیمؑ کا قول زیادہ امید دلانے والا ہے۔ جو انہوں نے فرمایا: ﴿رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ﴾ [بروایت ابن جریر] اس کو ابن ابی حاتم نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس کے بعد اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ: ((فرضی من ابراهيم قوله بلى)) حاکم نے اس کو صحیح الاسناد کہا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب دل و زبان سے ایمان کا اقرار ہو گیا تو اب کوئی وسوسہ نفس مضر نہ ہو گا۔ اس سے بڑھ کر جناب باری سے اور کیا امید ہو سکتی ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦١﴾	جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان (کے مال) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں اور اللہ جس (کے مال) کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے وہ بڑی کشائش والا (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔

فائدہ: یہ ایک مثال ہے جو اللہ کریم نے ثواب کے دوچند ہونے کے متعلق بیان کی ہے۔ یعنی جو شخص اپنا مال اللہ کے راستے میں اور اس کی رضا کے لیے خرچ کرتا ہے تو اس کی نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھ جاتی ہے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا کہ اس جگہ راہ خدا سے طاعت مراد ہے۔ حضرت مکحول نے کہا خرچ کرنے

سے یہ مراد ہے کہ جہاد میں اور گھوڑے اور ہتھیار خریدنے میں مال صرف کیا جائے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جہاد و حج مراد ہے۔ کہ ان میں خرچ کیا ہوا ایک درہم سات سو گنا تک پہنچ جاتا ہے۔ اور زبان سے سات سو گنا کہہ دینے سے اس کا اثر نفوس میں کہیں زیادہ ہے کیونکہ اس میں اشارہ ہے اللہ اپنے بندوں کے اعمال صالحہ کو اس طرح بڑھاتا ہے کہ جیسے پاکیزہ زمین بیج ڈالنے سے کھیتی اگاتی ہے۔ حدیث میں ایک نیکی کا سات سو نیکی تک بڑھنا آیا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے جہاد میں بہتر نفقہ خرچ کیا وہ سات سو گنا ہے۔ جس نے اپنے نفس پر اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کیا اور کسی مریض کی عیادت کی تو ایک نیکی دس گنا ہوتی ہے اور روزہ ڈھال ہے جب تک کہ اس کو نہ پھاڑے۔ جس کو اللہ نے اس کے بدن کی کسی تکلیف میں مبتلا کیا تو وہ اس کے لیے حطہ ہے یعنی گناہوں کا جھڑنا ہے۔ [بروایت احمد، و نسائی موقوفا] ابن مسعود نے کہا کہ ایک آدمی نے ایک مخطومہ اونٹنی اللہ کی راہ میں دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا قیامت والے دن یہ سات سو ناقہ مخطومہ آئیں گی۔ [بروایت احمد، مسلم، نسائی] مسلم کا لفظ یوں ہے کہ ایک آدمی مخطومہ اونٹنی لایا اور کہا یہ اللہ کی راہ میں ہے اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ قیامت والے دن تجھے اس کے بدلے سات سو اونٹنیاں ملیں گی۔ ابن مسعود کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ اللہ نے بنی آدم کے حسنہ کو دس گنا سے سات سو گنا تک مقرر کیا ہے مگر روزہ کہ وہ میرے لیے ہے اور میں اس کا اجر خود دوں گا۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی بوقت افطار اور ایک خوشی جبکہ وہ اللہ سے ملاقات کرے گا اور روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی عمدہ ہے۔ [بروایت احمد] حضرت ابو ہریرہؓ کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ ابن آدم کا ہر عمل دو گنا ہوتا ہے نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک ہوتی ہے اور اس سے بھی زیادہ جتنی اللہ چاہے مگر روزہ کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزاء دوں گا وہ میرے لیے اپنا کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔ [الحدیث، بروایت احمد و مسلم]

مریم بن وائل نے مرفوعاً کہا کہ جس نے اللہ کی راہ میں کچھ بھی خرچ کیا تو اس کا اجر سات سو گنا تک بڑھتا ہے۔ [بروایت احمد] حضرت معاذ نے کہا کہ نماز روزہ ذکر نفقہ فی سبیل اللہ پر سات سو گنا بڑھتا ہے۔ [بروایت ابو داؤد] عمران بن حصین سے مرفوعاً مروی ہے۔ عمران بن حصین سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے راہ لِلّٰہ میں نفقہ بھیجا اور خود گھر میں رہا اس کو ہر درہم کے بدلے سات سو درہم ملیں گے اور جس نے اپنا مال اور نفس اللہ کی راہ میں خرچ کیا تو اس کو ہر درہم کے بدلے سات سو درہم ملیں گے۔ پھر یہ آیت تلاوت کی کہ: ﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ [بروایت ابن ابی حاتم] یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ نیکی دو لاکھ تک پہنچتی

ہے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اللہ کے پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا:((رَبِّ زِدْ اُمَّتِیْ)) پھر اللہ نے یہ آیت نازل کی: ﴿مَنْ ذَالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ کہ "کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے۔" فرمایا:((رَبِّ زِدْ اُمَّتِیْ)) پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ کہ "صابر اپنے اجر بغیر حساب دیئے جائیں گے۔" [بروایت ابن مردویہ ،ابو حاتم ،ابن حبان] معلوم ہوا کہ بڑھائی کے مراتب ہیں سب سے کم مرتبہ یہ ہے کہ ایک نیکی کا اجر دس گنا ہوگا۔ دوسرا مرتبہ سات سو گنا تک ہے، تیسرا مرتبہ دو لاکھ گنا ہوتا ہے اور چوتھا رتبہ بغیر حساب ہے۔ یہ مراتب بقدر اخلاص عمل اور حلت مال کے مختلف ہوتے ہیں۔ اللہ کا فضل بہت واسع ہے وہ جانتا ہے کہ کون کس مرتبے کا مستحق ہے کس کا ایک درہم دوسرے کے ہزار درہم سے بڑھ جاتا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ اگر تم احد پہاڑ کے برابر بھی نفقہ خرچ کرو تو اس نصف مد سے مقابلہ نہ کر سکو گے جو صحابہؓ نے خرچ کیا اس کا سبب صرف اخلاص نیت و عمل اور مال حلال اور بوقت ضرورت خرچ کرنا تھا۔

الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٦٢﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ﴿٢٦٣﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٢٦٤﴾ ......

جو لوگ اپنا مال اللہ کے رستے میں صرف کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ اس خرچ کا (کسی پر) احسان رکھتے ہیں اور نہ (کسی کو) تکلیف دیتے ہیں، ان کا صلہ ان کے پروردگار کے پاس (تیار) ہے اور (قیامت کے روز) نہ ان کا کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جس نے خیرات دینے کے بعد (لینے والے کو) ایذا دی جائے اس سے تو نرم بات کہہ دینی اور (اس کی بے ادبی سے) درگذر کرنا بہتر ہے اور اللہ بے پروا (اور) بردبار ہے۔ مومنو! اپنے صدقات (وخیرات) احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو اس (کے مال) کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سے مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے (اسی طرح) یہ (ریاکار) لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے اور اللہ ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

....

فائدہ: یعنی مانگنے والے کو نرمی سے جواب دینا اور اس کی بداخلاقی سے درگزر کرنا اس سے بہتر ہے کہ کسی کو دے اور بار بار اس کو جتلائے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ میں نے تو اللہ کو دیا ہے اس کو کیا پرواہ ہے اپنے نفس کی بھلائی کی ہے۔ اوپر خیرات کی مثال بیان کی تھی کہ جس نے اخلاص نیت سے خرچ کیا اس کے نفقہ کی مثال دانے کی سی ہے کہ جس نے سات بالیاں اگائیں پھر ہر بالی میں سو دانہ ہوا تو وہ ایک سے سات سو گنا تک بڑھ گیا۔ لیکن اگر دکھلاوے کی غرض سے خرچ کیا ہے تو وہ ایسے ہو گا جیسے ایک صاف چٹان ہو اس پر تھوڑی سے مٹی ہو اس پر بیج ڈال دیا جائے پھر بارش ہوئی تو اس کو بہا لے گئی اس پر کچھ نہ رہے گا پھر اس میں کیا اُگے گا۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس میں ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو اپنا مال اللہ کے راستے میں خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتلاتے اور نہ قول سے ایذا دیتے ہیں نہ فعل سے۔ پھر ان سے جزائے جمیل اور حزن و غم کی نفی کا وعدہ کیا۔ قول معروف سے عمدہ بات مراد ہے مثلاً سائل کو اچھے طریقے سے جواب دے یا دعا دے۔ مغفرت سے یہ مراد ہے کہ جس نے قول و فعل میں اس پر ظلم کیا اسے معاف کر دے۔ حضرت عمرو بن دینار نے کہا کہ اللہ کو قول معروف سے بڑھ کر کوئی صدقہ محبوب نہ ہے۔ پھر یہ آیت تلاوت کی۔ احادیث میں صدقہ کر کے جتلانے سے ممانعت آئی ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ تین شخص ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت والے دن بات بھی نہ کرے گا نہ ان کی طرف نظر کرے گا، نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔ ایک دے کر احسان جتانے والا، دوسرا اپنا ازار لٹکانے والا، تیسرا وہ شخص جو جھوٹی قسم کھا کر سودا بیچتا ہے۔[بروایت مسلم] ابو الدرداء کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ ماں باپ کا نافرمان دے کر احسان جتلانے والا، ہمیشہ شراب پینے والا، اور تقدیر کو جھٹلانے والا، جنت میں نہ جائے گا۔[بروایت ابن مردویہ ،احمد ،ابن ماجہ] حضرت ابن عمرؓ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ تین اشخاص کی طرف اللہ قیامت کے دن نظر نہ کرے گا ایک والدین کا نافرمان، دوسرا ہمیشہ کا شراب پینے والا، تیسرا دے کر احسان جتانے والا۔[بروایت ابن مردویہ ،حاکم ،ابن حبان] حضرت ابن عباسؓ کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ جنت میں والدین کا نافرمان، ہمیشہ شراب پینے والا اور دے کر احسان جتانے والا داخل نہ ہو گا۔[بروایت نسائی و ابن ابی حاتم] اسی لیے اللہ کریم نے خبر دے دی ہے کہ جس صدقہ کے بعد احسان اور تکلیف دینا ہو اس کا ثواب اس گناہ کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ریاکار کا خرچ کیا ہوا ضائع ہو جاتا ہے وہ بظاہر تو ایسا محسوس کراتا ہے کہ میں نے اللہ کے لیے خرچ کیا ہے لیکن مقصد اس کا یہ ہو کہ لوگ میری مدح کریں۔ مخلوق میں شہرت ہو کہ فلاں شخص بڑے اخلاق و صفات جمیلہ کا مالک ہے یا یہ کہ لوگ کہیں فلاں بڑا سخی ہے دوسرا اس معاملے میں اسے ثواب و رضائے رحمٰن سے

کوئی سروکار نہ ہے۔ فقط دنیا کی نیک نامی مطلوب ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ پھر اللہ نے ریاکار صدقہ کرنے والے کی مثال بیان فرمائی کہ جس طرح ایک سخت چٹان پر مٹی ہو اور بارش ہونے سے وہ بہہ جاتی ہے اور چٹیل پہاڑ رہ جاتا ہے اسی طرح اس ریاکار کا حال ہے کہ ثواب برباد ہو گیا وبال رہ گیا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

فائدہ: فتح البیان میں کہا کہ آیت: ﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ حضرت عثمان بن عفان، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کے حق میں اتری ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک میں ایک ہزار اونٹ مسلمانوں کو مع ساز و سامان دیئے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے چار ہزار درہم بطور صدقہ آنحضرت ﷺ کے سامنے لا رکھے۔ مَنّ یہ ہے کہ احسان گن گن کر بتائے کہ میں نے تیرے ساتھ فلاں وقت ایسا کیا اور ایسا کیا۔ لوگوں سے کہتا پھرے کہ میں نے فلاں شخص سے ایسا ایسا احسان کیا ہے اور ایسا عمل کبائر میں سے ہے۔ اذیٰ یہ ہے کہ زبان درازی کرے، گالی دے، شکوہ شکایت کرے۔ عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں کہ میرے والد کہتے تھے جب تو کسی شخص کو کچھ دے دے پھر تو دیکھے کہ تیرا اس کو سلام کرنا اس پر گراں ہے تو اس پر سلام نہ کر۔ عرب اس شخص کی مدح کرتے تھے جو نعمت و احسان کو جتاتا تھا اور وہ اظہار نعمت کو پسند نہ کرتے تھے۔ قول معروف یہ ہے کہ اس سے اچھی بات کرے، نرمی سے کرے۔ یا وعدہ دے دے یا پس پشت اچھی دعا دے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ کلمہ طیبہ صدقہ ہے۔ اور معروف میں اسے یہ بات بھی ہے کہ تو اپنے بھائی سے کشادہ پیشانی ملے۔ مغفرت سے یہ مراد ہے کہ محتاج کی حالت بد اور خصلت بد کو مخفی رکھے۔ سائل اگر بہت اصرار کرے تو تنگ نہ ہو بلکہ معاف کر دے۔ ضحاک نے کہا قولِ معروف یہ ہے کہ سائل کو جھڑک نہ دے بلکہ یرحمك الله اور یرزقك الله کہے۔ سخت جواب نہ دے اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ مَنٌّ وَ اَذًى اور ریاکاری کافروں کی خصلتوں سے ہیں۔ محمود بن لبید نے کہا کہ آنحضرت نے فرمایا مجھے تم پر شرک اصغر کا ڈر ہے فرمایا وہ کیا ہے؟ کہا: ریا ہے۔ جس دن مخلوق کو ان کے اعمال کی جزاء دی جائے گی تو ریاکاروں سے کہا جائے گا کہ تم اب انہی کے پاس جاؤ جنہیں دکھانا تمہارا مقصد تھا، دیکھو ان کے پاس کچھ خیر ہے۔ [بروایت بغوی]

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ میں شریکوں کے شرک سے بڑا بے نیاز ہوں جس نے کوئی کام کیا اور اس میں شرک کیا تو میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاةِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦٥﴾

اور جو لوگ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اور خلوص نیت سے اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک باغ کی سی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو (جب) اس پر مینہ پڑے تو دگنا پھل لائے اور اگر مینہ نہ بھی پڑے تو خیر پھوار ہی سہی اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

فائدہ: بارش سے مراد مال کثیر خرچ کرنا ہے۔ اگر نیت درست ہے تو جتنا زیادہ مال ہوگا اتنا ثواب زیادہ ہے کہ لیکن تھوڑا بھی کام آئے گا جیسے اچھی زمین پر باغ ہو۔ اس پر جتنا مینہ برسے زیادہ مناسب ہے۔ بلکہ اوس بھی کافی ہے۔ اگر نیت درست نہ ہو تو جتنا زیادہ خرچ کرے وہ ضائع ہے۔ کیونکہ مال جتنا زیادہ ہوگا اس میں ریا بھی اتنی زیادہ ہوگی۔ جیسے پتھر پر دانہ ہو کہ جتنا زیادہ مینہ ہو اتنا نقصان کا خدشہ ہو کہ مٹی بہہ جائے گی۔

فائدہ: یہ آیت ان مومنین کی مثال ہے جو اپنا مال اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ ان کے دلوں کو یقین ہے کہ اللہ انہیں ان کے خرچ کرنے کا ثواب دے گا۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ: ((مَنْ صام رمضان ایماناً و احتساباً)) یعنی یہ جانتا ہے کہ اللہ نے روزے کو مشروع کیا ہے اور اللہ کے نزدیک اس کے ثواب کا یقین رکھتا ہے۔ شعبی نے کہا تثبیت کے معنی تصدیق و یقین کے ہیں۔ قتادہ اور ابو صالح بن زید کا بھی یہی قول ہے اور ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ حضرت مجاہد و حسن نے کہا تثبیت یہ ہے کہ سچے دل سے صدقات و خیرات کرتے ہیں۔ بعض نے کہا معنی یہ ہیں کہ ان کو بصیرت ہے وہ ان کو بذریعہ انفاق اطاعتِ الٰہی پر ثابت قدم رکھتی ہے۔ فتح البیان میں اسی قول کو راجح کہا ہے۔ ربوہ بستان کو کہتے ہیں۔ جمہور نے کہا کہ ٹیلے کو ربوہ کہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اس زمین کو ربوہ کہتے ہیں جو سطح زمین سے بلند ہو اور اس میں نہریں جاری ہوں۔ ابن جریر نے کہا ربوہ ضمہ، فتحہ اور کسرہ تینوں طرح پڑھا گیا ہے۔ ضمہ کی قرأت عامہ اہل مدینہ، حجاز و عراق کی قرأت ہے اور فتحہ سے بعض اہل شام، کوفہ اور قبیلہ بنی تمیم کی قرأت ہے۔ اور کسرہ سے حضرت ابن عباسؓ کی قرأت ہے۔ وابلٌ موسلا دھار بارش کو کہتے ہیں۔ اُکُلٌ میوہ کو کہتے ہیں یعنی اس بارش کی وجہ سے باغات میں دوگنا تین اور چار گنا پھل آتا ہے اور طل سے نرم پانی کو کہتے ہیں۔ جیسے عرف میں اوس کہتے ہیں۔ رذاذ بھی کہتے ہیں طش و ندیٰ بھی کہتے ہیں۔ یعنی ایسی جگہ ہونے والا باغ کبھی خشک نہیں رہتا بارش ہوئی تو ہوئی ورنہ شبنم پڑتی رہی۔ بہر کیف وہ باغ کو کافی ہوتا ہے اسی طرح مومن کے عمل کا حال ہے کہ وہ کسی صورت برباد نہیں ہوتا بلکہ اللہ اس کو بڑھاتا اور پالتا

رہتا ہے۔اور اس کی افزائش عامل و عمل کے موافق ہوتی ہے۔اسی لیے فرمایا کہ اللہ پر تمہارا کوئی کام مخفی نہ ہے اس آیت میں اخلاص کی ترغیب اور ریا سے ترہیب ہے۔اس میں وعدہ وعید دونوں شامل ہیں۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۶۶﴾

بھلا تم میں کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو جس میں نہریں بہہ رہی ہوں اور اس میں اس کے لیے ہر قسم کے میوے موجود ہوں اور اسے بڑھاپا آپکڑے اور اس کے ننھے ننھے بچے بھی ہوں تو (ناگہاں) اس باغ پر آگ کا بھرا ہوا بگولا چلے اور وہ جل (کر راکھ کا ڈھیر ہو) جائے اس طرح اللہ تم سے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم سوچو (اور سمجھو)۔

فائدہ: یہ ان متقین کی مثال ہے جو احسان جتاتے ہیں کہ جو اپنی اچھی خیرات کو ضائع کر دیتے ہیں جیسے جوانی کے وقت اس امید پر حاصل کیا کہ بڑھاپے میں کام آئے گا لیکن عین ضرورت کے وقت وہ جل کر ضائع ہو گیا۔

بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اصحابؓ سے کہا کہ بتاؤ یہ آیت کس کے حق میں نازل ہوئی؟ انہوں نے کہا: واللہ اعلم۔ حضرت عمرؓ کو غصہ آگیا فرمایا ایک بات کہو کہ جانتے ہو یا نہیں جانتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اے امیر المومنین! میرے نفس میں اس کے متعلق ایک بات ہے۔ فرمایا: اے بھتیجے! کہو اور خود کو چھوٹا نہ سمجھو۔انہوں نے کہا کہ یہ عمل کی مثال ہے۔پوچھا کون سا عمل؟ کہا ایک مالدار شخص نے اللہ کی اطاعت کی پھر اللہ نے اس کے لیے ایک شیطان بھیجا (وہ اس پر سوار ہوا) اور وہ گناہ کرنے لگ گیا اور اس کے سارے عمل غارت ہو گئے۔یہ روایت افراد بخاری سے ہے۔ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت باب کی تفسیر میں یہ حدیث کافی ہے اس میں یہ ہے کہ ایک شخص نے پہلے تو نیک عمل کیے۔پھر اس کی عادت بدل گئی اس کی اچھائیاں برائیوں میں بدل گئیں۔اس نے اپنے گذشتہ نیک اعمال کو آئندہ بد اعمال سے خراب کر دیا۔اب اسے اپنے پہلے اعمال صالحہ کی ضرورت ہوئی لیکن اب کیا ملے گا وہ تو ہاتھ سے نکل چکا ہے۔اسی لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ بڑھاپے میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے، اچانک ایک آگ کا بگولہ آیا اور پھلوں سمیت درختوں کو ضائع کر گیا۔بتاؤ اس پر اس کا کیا حال ہو گا؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے یہ بہت عمدہ مثال بیان فرمائی ہے۔اور اس

کی ساری مثالیں اچھی ہوتی ہیں۔ جبکہ بڑھاپے میں اس کے بچے کمزور تھے۔ جب اللہ نے اس باغ کو ضائع کر دیا اب نہ خود میں اتنی قوت رہی کہ دوبارہ بیج بوئے اور نہ بچے اس قابل ہیں کہ کچھ سنوار سکیں۔ وہ باغ آخر عمر میں جل گیا کچھ باقی نہ رہا۔ یہی حال روز قیامت کافر کا ہوگا کہ جب اللہ کے ہاں پہنچے گا تو محض گناہ ہوں گے کچھ خیر نہ ہو گی۔ اگر کوئی خیر کی بھی تھی تو وہ بھی باقی نہ رہیں۔ جیسے اس بزرگ شخص کو اپنی اولاد کچھ کفایت نہیں کر سکتی اور اس حال میں وہ باغ سے محروم ہو گیا۔ اسی طرح اب کافر بھی عمل صالح سے خالی رہ گیا۔ حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: ((اللھم اجعل اوسع رزقك علی عند کبر معی و انقضاء عمری)) [بروایت حاکم] اسی لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ یہ مثال تمہارے لیے بیان کی گئی ہے کہ شاید تم سوچو سمجھو۔ جیسے فرمایا: ﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ﴾ کہ "یہ امثال ہیں جنہیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انہیں جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔" فتح البیان میں کہا ہے کہ یہ مثال ایسے شخص کی ہے جو نیک عمل کرتا ہے پھر اس کے ساتھ ایسی چیز کو ملا دیتا ہے جو اسے ضائع کر دیتی ہے۔ اور قیامت والے دن جبکہ اسے سخت ضرورت ہو گی تو ان کو بے فائدہ پائے گا۔ جس طرح باغ والے نے آخر عمر میں (بوقت ضرورت) اس کو ویران پایا۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾ الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦٨﴾ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾

مومنو! جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کماتے ہو اور جو چیزیں ہم تمہارے لیے زمین سے نکالتے ہیں ان میں سے (راہ اللہ میں) خرچ کرو، اور بری اور ناپاک چیزیں دینے کا قصد نہ کرنا کہ (اگر وہ چیزیں) تمہیں دی جائیں تو) بجز اس کے کہ (لیتے وقت) آنکھیں بند کر لو ان کو کبھی نہ لو اور جان رکھو کہ اللہ بے پروا (اور) قابل ستائش ہے۔ (اور دیکھنا) شیطان (کا کہنا نہ ماننا وہ) تمہیں تنگ دستی کا خوف دلاتا اور بے حیائی کا کام کرنے کو کہتا ہے اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور رحمت کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی کشائش والا (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے دانائی بخشتا ہے اور جس کو دانائی ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی، اور نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل مند ہیں۔

فائدہ: موضح قرآن میں فرمایا ہے کہ صدقہ کی قبولیت کی ایک یہ بھی شرط ہے کہ وہ مال حلال ہو، حرام نہ ہو اور اللہ کی راہ میں بہتر چیز خرچ کرے، ایسا نہ ہو کہ ردی چیز صدقہ دے دے کہ اگر ویسی چیز خود لینی پڑے تو نہ لے مگر ناچارگی کی صورت میں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بے نیاز ہے۔ بڑی خوبیوں والا ہے اس لیے عمدہ چیز پسند کرتا ہے۔ جب دل میں خیال آئے کہ میں مال خرچ کروں گا تو مفلس ہو جاؤں گا اور ہمت نہ پڑے اور تاکید کے باوجود خرچ نہ کرے تو سمجھے کہ یہ خیال شیطان کی طرف سے ہے اور اگر یہ خیال کرے کہ صدقہ سے گناہ معاف ہوں گے اگر اللہ چاہے گا تو اور بھی دے گا اس کے ہاں کوئی کمی نہ ہے۔ تو جان لے کہ یہ خیال اللہ کی طرف سے ہے۔

فائدہ: حضرت ابن کثیر نے فرمایا کہ اللہ نے مومنین کو خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور اس خرچ سے صدقہ مراد ہے۔ حضرت ابن عباس کا بھی یہی قول ہے، طیبات سے تجارت مراد ہے جس کو اللہ نے ان پر آسان کر دیا۔ حضرت علیؓ و سدی نے کہا کہ سونا چاندی، پھل اور کھیتی مراد ہیں۔ جسے اللہ نے ان کے لیے زمین سے نکالا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس نے ان کو عمدہ مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے اور برا اور ردی مال خرچ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اللہ خود بھی پاک ہے اور پاک مال ہی کو قبول کرتا ہے۔ یہ اس لیے فرمایا کہ ایسی نکمی چیز کو خرچ کرنے کی نیت نہ کرو کہ اگر وہ تمہیں لینی پڑے تو کبھی نہ لو کیونکہ جو چیز تم لینا پسند نہیں کرتے ہو وہ کیسے قبول کر لے گا۔ نعوذ باللہ وہ کوئی محتاج تو نہیں ہے کہ ہر اچھی بری چیز لے لے۔ حضرت ابن مسعود کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت نے فرمایا اللہ نے جس طرح تمہارے رزق تم میں تقسیم کیے ہیں اسی طرح تمہارے اخلاق بھی تقسیم کیے۔ اللہ دنیا اس کو دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور جسے نہیں چاہتا لیکن دین صرف اسے دیتا ہے جسے چاہتا ہے اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے بندہ مسلمان نہیں ہوتا حتیٰ کہ اس کا دل و زبان سالم نہ ہوں اور بندہ تب تک مومن نہیں ہوتا جب تک اس کا ہمسایہ اس کی مصیبتوں اور ظلموں سے سالم نہ ہو۔ اور نہیں وہ بندہ حرام مال کماتا پھر اسکو خرچ کر لے کہ اس میں برکت ہو اور (ایسا بھی) نہیں ہے کہ اس مال سے دیا ہوا صدقہ قبول ہو۔ اور نہیں چھوڑتا وہ اس کو اپنے پیچھے مگر وہ اس کے لیے جہنم کا زادِ راہ ہوگا۔ وہ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا مگر برائی کو نیکی سے ختم کرتا ہے۔ گندگی کو گندگی دور نہیں کرتی۔ [بروایت احمد] براء بن عاذب نے کہا کہ یہ آیت انصار کے حق میں نازل ہوئی ہے جب کھجوروں کا پھل اترتا تو وہ اس میں سے ایک خوشہ مسجد نبوی کے ستون کے ساتھ لٹکا جاتے تاکہ فقیر کھالیں کچھ لوگ کمتر کھجوریں بھی وہاں رکھ جاتے اور اس کو جائز خیال کرتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [بروایت ابن جریر ،ابن ماجه ،ابن مردویه] حاکم اور کہا کہ یہ بخاری و مسلم کی شرط پر ہے لیکن انہوں نے اس کو

تخریج نہیں کیا ہے۔اس کے سبب نزول کو ترمذی، نسائی اور ابن ابی حاتم نے بھی نقل کیا ہے۔اور حسن غریب کہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مغفل کہتے ہیں کہ مسلمان کی کمائی گندی نہیں ہوتی مگر نکمی چیز اور کھوٹا پیسہ برا مال صدقہ میں نہ دے۔ کسی نے کہا طیبات سے حلال مراد ہے یعنی مال اچھا بھی ہو اور حرام بھی نہ ہو۔ کسی نے کہا اس آیت میں ہاتھ کی کمائی کے جواز کی دلیل ہے۔ حضرت مقدام کی حدیث میں ہے کہ آدمی اس کمائی سے بہتر کوئی کمائی نہیں کھاتا جو اس نے ہاتھ سے کمائی ہو۔ [بروایت بخاری] اس جگہ انفاق سے زکوٰۃ فرضی اور صدقہ نفلی دونوں مراد ہیں۔اور آیت میں زکوٰۃ کے وجوب پر دلالت ہے کہ زمین کی ہر پیداوار سے زکوٰۃ دی جائے لیکن جمہور اس عام کو خاص کہتے ہیں۔ شافعی نے فرمایا کہ زکوٰۃ اس مال کے ساتھ خاص ہے۔ جسے آدمی بوتے ہیں اور اس سے کھاتے ہیں جب کہ وہ حد نصاب کو پہنچ جاتے۔ کھجور اور انگور اسی میں داخل ہیں۔ابو حنیفہ نے فرمایا آیت عام ہے ہر پیداوار زمین پر زکوٰۃ واجب ہے۔ میوہ جات، سبزیاں، ککڑی، خربوزہ وغیرہ سب پر زکوٰۃ ہے اور ان میں قلیل مقدار ہو یا کثیر ہو دسواں حصہ زکوٰۃ ہو گی۔ مگر پہلا قول صحیح ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بعض لوگ سستی قیمت پر غلہ خرید کر صدقہ کرتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

فائدہ: حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے فرشتے کو بھی ابن آدم کی طرف بھیجا اور شیطان کو بھی مائل کیا۔ شیطان کا مائل ہونا یہ ہے کہ وہ ابن آدم کو برائی اور حق بات کو جھٹلانے کا وعدہ دیتا ہے۔اور فرشتے کا مائل ہونا یہ ہے کہ وہ اسے خیر اور حق کی تصدیق کا وعدہ دیتا ہے۔ پھر جو کوئی ایسا جذبہ پائے تو اللہ کا شکر ادا کرے اور جو شیطانی خیال پائے تو شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے۔ پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ﴾ [بروایت ابن ابی حاتم ،ترمذی ،نسائی ،ابن حبان،ابو یعلیٰ] ترمذی نے کہا یہ حدث حسن غریب ہے۔ شیطان کے وعدہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہیں محتاجی سے ڈراتا ہے کہتا ہے کہ اگر تم اللہ کے رستے میں خرچ کرو گے تو خود مفلس ہو جاؤ گے اس کو اپنی ضرورت کے لیے روکے رکھو۔اس کے علاوہ وہ یہ حکم بھی دیتا ہے کہ خوب عیش کرو۔ گناہ و غلطیاں تمہیں کچھ نقصان نہ دیں گے۔اس کے مقابلے میں اللہ کریم نے یہ فرمایا کہ ہم تم سے مغفرت کا وعدہ کرتے ہیں جو کچھ تم میری اطاعت و رضا کے لیے خرچ کرو گے اس کے عوض تمہیں جنت ملے گی۔ ذرا غور کرو کہ دونوں کے درمیان کس قدر عظیم فرق ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس جگہ حکمت سے مراد قرآن کے ناسخ و منسوخ، محکم متشابہ، حلال و حرام پہچاننا ہے۔ دوسرا لفظ مرفوعاً اس طرح ہے کہ حکمت بھی قرآن ہے یعنی قرآن کی تفسیر مراد ہے۔ کیونکہ پڑھتا تو ہر کوئی ہے۔ حضرت مجاہد نے

کہا ٹھیک بات کہنا حکمت ہے اگرچہ وہ نبوت تو نہیں ہے مگر علم وفقہ ہے۔ابو العالیہ نے کہا اس سے اللہ کا خوف مراد ہے کیونکہ اللہ کا خوف حکمت کی چوٹی ہے۔حضرت ابن مسعو کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ حکمت کی چوٹی اللہ کا خوف ہے۔ابو العالیہ نے کہا کتاب وفہم حکمت ہے۔نخعی نے کہا فہم حکمت ہے۔ابو مالک نے کہا حکمت سنت ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کی حدیث حکمت ہے۔زید بن اسلم نے کہا حکمت عقل ہے۔مالک نے کہا میرا خیال ہے کہ حکمت فہم دین ہے۔جو اللہ کے فضل وکرم سے دلوں میں اتارا جاتا ہے۔اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص دنیا کے معاملات میں بڑا ہوشیار ہے لیکن دوسرا دنیا کے معاملے میں ہوشیار نہ ہے۔لیکن دین میں اللہ نے اس کو سمجھ دی ہے۔اللہ نے اس کو دین کی چستی دی دنیا سے محروم رکھا۔پس حکمت سے فقہ فی الدین مراد ہے۔اور فقہ سے دوسری عام اصطلاحی فقہ مراد نہ ہے بلکہ فہم مراد ہے۔سدی نے کہا حکمت نبوت ہے۔ابن کثیر نے فرمایا درست بات یہ ہے کہ حکمت نبوت کے ساتھ خاص نہ ہے بلکہ عام ہے۔اعلیٰ حکمت نبوت ہے لیکن رسالت زیادہ خاص ہے لیکن انبیاء کے پیروکاروں کو بطریق اتباع خیر سے حصہ حکمت عطا ہوتا ہے۔جس طرح کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ جس نے قرآن کریم حفظ کر لیا اس کے دونوں کندھوں کے درمیان نبوت رکھ دی گئی۔مگر اتنی بات کہ اس کو وحی نہ آتی ہے۔[بروایت وکیع] حضرت ابن مسعود مرفوعاً فرماتے ہیں کہ صرف دو آدمیوں پر حسد جائز ہے۔ایک وہ شخص جس کو اللہ نے مال دیا اور وہ اس کو اللہ کے رستے میں حق پر خرچ کرتا ہے۔دوسرا وہ شخص جس کو اللہ نے حکمت دی ہے وہ اس کے موافق فیصلے کرتا ہے اور اس کو آگے بھی سکھاتا ہے۔[بروایت احمدو الشیخان ،نسائی ،ابن ماجہ من طرق متعددہ]

فتح البیان میں ان اقوال مذکورہ کے بعد کہا ہے کہ یہ سب اقوال ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں اگر لفظ حکمت کو ان تمام معانی پر بطریق شمول اور بطریق بدل محمول کیا جائے تو بھی کچھ رکاوٹ نہ ہے۔میں کہتا ہوں کہ ہر عالم نے ایک خصلت حسنہ یا خلق حسن یا عمل صالح یا علم نافع کو اپنی سمجھ کے موافق تفسیر حکمت میں ذکر کیا ہے۔سب سے بہتر حکمت کی وہ تفسیر ہے جس کی طرف اکثر ائمہ گئے ہیں۔کہ حکمت سے رسول اللہ علیہ السلام کی سنت مراد ہے۔خصوصاً اس جگہ جہاں اس کا ذکر کتاب کے ساتھ آیا ہے اور جس جگہ صرف لفظ حکمت آیا ہے وہاں بھی اس کو انہی معانی پر محمول کرنا کچھ مانع نہیں یا اس سے قرآن مراد ہے کیونکہ قرآن کا ایک نام ذکر حکیم بھی ہے پھر جب کہ حکمت سے قرآن و حدیث مراد ہوا تو سب اقوال اس کے اندر آ جائیں گے۔قرآن و سنت دونوں کا حکمت ہونا کتاب و سنت کے کمال اتحاد کی دلیل ہے۔کہ اس لفظ سے جو بھی مراد لیا

جائے دوسری اس میں خود ہی آجائے۔ قرآن اتباع سنت کا حکم دیتا ہے اور حدیث تمسک بالقرآن کا حکم دیتی ہے۔ولِلّٰہِ الحَمدُ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خواہ اس سے قرآن مراد ہو یا سنت بہر حال اس کو خیر کثیر کہا۔اور خیر کثیر سے وہ علم نافع مراد ہے جو عمل صالح کی رہنمائی کرے۔ جس کا انجام ابدی نجات کی صورت میں ہوتا ہے۔ اللھم ارزقنا.

وَمَا أَنفَقْتُم مِّن نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُم مِّن نَّذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ ۗ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّئَاتِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٧١﴾

اور تم (اللہ کی راہ میں) جس طرح کا خرچ کرو یا کوئی نذر مانو، اللہ اس کو جانتا ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے اور (اس طرح کا دینا) تمہارے گناہوں کو بھی دور کر دے گا اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے۔

فائدہ: یعنی جب منت مانی تو اب اس کا ادا کرنا واجب ہو گیا ادا نہ کرنے کی صورت میں گناہگار ہوگا اور نذر اللہ کے سوا کسی کی نہ مانے مگر ہاں یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اللہ کے لیے فلاں شخص کو دوں گا۔اگر نیت دکھاوے کی نہ ہو تو بظاہر خرچ کرنا بھی بہتر ہے تاکہ دوسروں کو بھی شوق پیدا ہو اور چھپا کر دینا بھی بہتر ہے تاکہ لینے والا شرم محسوس نہ کرے۔

فائدہ: اس آیت میں معلوم ہوا کہ صدقہ بظاہر دینے سے چھپا کر دینا بہتر ہے کیونکہ یہ ریا سے دور تر ہے۔ہاں ظاہر دینے میں کوئی مصلحت ہو، پھر اس مصلحت کی وجہ سے اظہار افضل ہو گا مگر اس آیت کا تقاضا یہی ہے کہ مخفی صدقہ دینا زیادہ افضل ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ قیامت والے دن اللہ سات شخصوں کو عرش کا سایہ دے گا۔ان میں ایک وہ شخص بھی ہے جس نے اس طرح چھپا کر صدقہ دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتا نہ چلا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔ حضرت انس بن مالک مرفوعاً کہتے ہیں کہ جب اللہ نے زمین کو پیدا کیا تو وہ ہلنے لگی اللہ نے اس پر پہاڑ رکھ دیئے تو وہ تھم گئی۔ملائکہ نے پہاڑوں کی تخلیق سے تعجب کیا کہا: اے رب! کہ کیا تیری مخلوق میں پہاڑوں سے سخت تر کوئی اور بھی مخلوق ہے۔ فرمایا: ہاں لوہا ہے۔ انہوں نے کہا کیا تیری مخلوق میں لوہے سے سخت بھی کوئی چیز ہے؟ کہا ہاں آگ ہے۔ کہا کیا کوئی چیز تیری مخلوق میں آگ سے بھی سخت ہے؟ کہا ہاں پانی ہے۔انہوں نے کہا کیا تیری

مخلوق میں سے پانی سے سخت بھی کوئی مخلوق ہے ؟ کہا ہاں ہوا ہے۔ کہا کیا اس سے بھی سخت تیری کوئی مخلوق ہے ؟ کہا بنی آدم سید ہے اپنے ہاتھ سے صدقہ کرتا ہے تو اس کو بائیں ہاتھ سے چھپاتا ہے۔[بروایت احمد] ایک حدیث میں ہے کہ پوشیدہ صدقہ اللہ کے غضب کو بجھا دیتا ہے۔ عامر شعبی نے کہا کہ یہ آیت حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے حق میں نازل ہوئی کہ حضرت عمرؓ گھر کا آدھا سامان آپؐ کی خدمت اقدس میں لے آئے۔ فرمایا گھر کیا چھوڑ آئے ہو فرمایا: آدھا مال۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ گھر کا سارا سامان لے آئے اپنا صدقہ اپنے نفس سے بھی چھپاتے تھے۔ پوچھا ابو بکرؓ گھر کیا چھوڑ آئے ہو۔ فرمایا اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔ حضرت عمرؓ رو دیئے اور فرمایا ابو بکر رضی اللہ عنہ میرے ماں باپ آپؓ پر قربان ہوں ہم نے کسی خیر میں سبقت نہ کی مگر آپؓ اس میں سابق نکلے۔[بروایت ابن ابی حاتم] یہ حدیث اور طرق سے بھی مروی ہے مگر ہم نے اس جگہ اس کو عامر شعبی کے طرق سے اس لیے نقل کیا کہ انہوں نے اس آیت کا سبب نزول حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے حق میں بتایا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے کہ صدقہ فرض ہو یا نفل اس کو چھپا کر دینا افضل و بہتر ہے۔ لیکن ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ اللہ نے نفلی صدقہ میں پوشیدہ دینے کو ستر درجے علانیہ صدقہ سے افضل کہا اور صدقہ فرض کو نفل پر پچیس درجے فضیلت ہے۔ سب اشیاء میں فرض و نفل کا یہی تناسب ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ کا ایک یہ قول بھی ہے کہ سورۃ براءۃ نازل ہونے سے قبل اس پر عمل ہوتا تھا۔ جب سورۃ براءۃ نازل ہو گئی تو اس میں صدقات فرائض کی تفصیل نازل ہوئی تو سب صدقات اس تک ختم ہو گئے۔ ان کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ آیت باب منسوخ ہے۔ اسی طرح آیت: ﴿فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ پھر کہا کہ ہر صدقہ جو قرآن میں آیا ہے اس کو سورۃ توبہ کی آیت: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ﴾ نے منسوخ کر دیا۔ فتح البیان میں ہے کہ آیت باب حکم کلی ہے ہر مقبول و غیر مقبول اور صدقہ اور ہر مقبول و غیر مقبول نذر کو شامل ہے اس میں اس شخص کے لیے وعدہ ثواب ہے جس نے انفاق یا نذر مقبولیت کی نیت سے خرچ کیا۔ اور جس نے صدقہ و نذر غیر مقبول نیت سے خرچ کیا اس کے لیے وعید ہے۔ حدیث میں ہے کہ معصیت میں نذر نہ ہے۔ دوسری روایت یوں ہے کہ جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر مانی تو چاہیئے کہ وہ اس کی اطاعت کرے اور جس نے اللہ کی معصیت کی نذر مانی اسے چاہیئے کہ وہ معصیت نہ کرے۔ تیسری حدیث یہ ہے کہ (معتبر) نذر وہ ہے جس سے اللہ کی ذات مقصود ہو اور نذر کا کفارہ مشہور ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٢﴾ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٢٧٣﴾ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٤﴾

(اے محمدؐ) تم ان لوگوں کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہو بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے اور (مومنو!) تم جو مال خرچ کرو گے تو اس کا فائدہ تمہی کو ہے اور تم تو جو خرچ کرو گے اللہ کی خوشنودی کے لیے کرو گے ،اور جو مال تم خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہیں کیا جائے گا۔(اور ہاں تم جو خرچ کرو گے تو) ان حاجت مندوں کے لیے جو اللہ کی راہ میں رکے بیٹھے ہیں اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے (اور مانگنے سے عار رکھتے ہیں) یہاں تک کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے اور تم قیافے سے ان کو صاف پہچان لو (کہ حاجت مند ہیں اور شرم کے سبب لوگوں سے منہ پھاڑ کر اور) لپٹ کر نہیں مانگ سکتے اور تم جو مال خرچ کرو گے کچھ شک نہیں کہ اللہ اس کو جانتا ہے۔جو لوگ اپنا مال رات اور دن اور پوشیدہ اور ظاہر (راہ اللہ میں) خرچ کرتے رہتے ہیں ان کا صلہ پروردگار کے پاس ہے اور ان کو (قیامت کے دن) نہ کسی طرح کا خوف ہو گا اور نہ غم۔

فائدہ: یعنی ان کو صدقہ دینا بہت ثواب ہے۔جو اللہ کے رستے میں مصروف عمل ہیں۔نہ کما سکتے ہیں نہ اپنی حاجت ظاہر کرتے ہیں۔جیسے آپ علیہ السلام کے اصحابؓ تھے۔جو صفہ والے تھے گھر بار چھوڑ کر آنحضرت ﷺ کی صحبت اختیار کی تھی تاکہ علم سیکھیں اور جہاد میں حصہ لیں۔اسی طرح اب بھی جو طلب حفظ قرآن یا علم دین میں مشغول ہوں تو لوگوں کے لیے لازم ہے کہ ان کی مدد کریں۔یہاں تک صدقات کا بیان تھا اس کے بعد سود حرام کیا۔جب خیرات کی قید لگائی گئی تو قرض دینا اولیٰ ہے۔پھر قرض پر سود کاہے کو لیا جائے۔

فائدہ: نسائی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ ہم اپنے نسب والوں کو خیرات دینا ناپسند کرتے تھے۔اللہ نے رخصت دے دی۔اور یہ آیت نازل ہوئی اور مسلم و کافر دونوں کو صدقہ دینا جائز ہے۔ان کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے حکم دیا تھا کہ صرف اہل اسلام کو صدقہ دو۔جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے کہا کسی بھی دین والا ہو جب سوال کرے تو اس کو دو۔[بروایت ابن ابی حاتم] اور جو فرمایا کہ تم جو بھی خرچ کرو

گے اپنے نفسوں کے لیے کرو گے۔اس ارشاد کی طرح ہے:﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِه﴾ کہ "جس نے نیک عمل کیا تو وہ اس کے نفس کے لیے ہو گا۔" اس کی مثالیں قرآن کریم میں بہت ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا کہ اس سے مراد مومنین کا اپنے نفس کے لیے خرچ کرنا مراد ہے۔ مومن جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے اللہ کی رضا چاہتا ہے۔ حضرت عطاء خراسانی نے کہا جب تو نے کسی کو اللہ کی راہ میں دے دیا تو اب تجھ پر کچھ حرج نہیں کہ وہ اس کو لے کر کیا کرے گا۔ ابن کثیر نے فرمایا یہ معنی بڑے عمدہ ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ جب تو نے کسی کو اللہ کے لیے دے دیا تو تیرا اجر اللہ پر ثابت ہو گیا نفس الامر میں تجھ پر کچھ مواخذہ نہ ہو گا کہ وہ صدقہ نیک کو پہنچایا بد کو۔ مستحق کو ملے یا غیر مستحق کو، اس کو اس کی نیت کا اجر ملے گا۔ اس کی دلیل آیت کا آخر ہے:﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾ کہ "جو بھی تم خیرات کرو گے اسکا اجر تمہیں پورا ملے گا اور تم ظلم نہ کیے جاؤ گے۔" اور حدیث ابو ہریرہ بھی اس کی دلیل ہے۔ جو صحیحین میں ہے کہ حدیث کا لفظ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ایک آدمی نے کہا کہ آج رات میں صدقہ دوں گا پھر صدقہ لے کر نکلا اور وہ ایک زانیہ کو دے دیا۔ صبح لوگ چرچا کرنے لگے کہ اس نے زانیہ کو صدقہ دیا۔ اس نے کہا: اے اللہ تجھے زانیہ پر حمد ہے میں آج رات پھر صدقہ کروں گا، وہ صدقہ ایک غنی کو دے دیا۔ صبح لوگ چرچا کرنے لگے کہ اس نے غنی کو صدقہ دیا۔ اس نے کہا: اے اللہ تیری حمد ہے غنی پر آج رات میں میں پھر صدقہ کروں گا، پھر اس رات صدقہ لے کر نکلا تو وہ ایک چور کو دے دیا ۔ صبح لوگوں نے کہا کہ دیکھو اس نے چور کو صدقہ دیا ہے۔ کہا:((اللهم لك الحمد على زانيه و على غنى و على سارق))اس کے پاس ایک آنے والا آیا اس نے کہا تیرا صدقہ مقبول ہوا۔ شاید زانیہ زنا سے بچے، شاید غنی عبرت پکڑے کہ وہ اپنے مال سے اللہ کے راستے میں دے اور شاید کہ چور چوری سے بچے۔ معلوم ہوا کہ جب نیت درست ہوتی ہے اور کام خالص اللہ کے لیے کیا جاتا ہے تو اس کام کی بھول چوک معاف ہے۔ اور اس کا اجر ضائع نہیں ہوتا۔ ہاں دیدہ دانستہ ایسے شخص کو صدقہ نہ دے جو اس کو فسق و فجور میں صرف کرے کیونکہ یہ ظلم پر مدد کرنا ہے۔

فائدہ: فقراء سے اس جگہ مہاجرین مراد ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی خاطر دوسرے لوگوں سے کٹ کر اس طرف آگئے اور نہ رزق کا کوئی وسیلہ ہے نہ طلب معاش میں سفر کی طاقت رکھتے ہیں۔ سبیل اللہ سے اس جگہ جہاد مراد ہے اور اس آیت میں صدقات کے مصارف کا بیان ہے۔ ابن الانباری نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا یہ تقریباً چار سو اشخاص تھے ان کے نہ مدینہ میں گھر تھے نہ گھر والے تھے، یہ رات مسجد کے صفہ میں بسر کر لیتے راتوں کو قرآن سیکھتے تھے اور خود کو جہاد کے لیے وقف کیے ہوئے تھے۔ حضرت مجاہد نے

فرمایا وہ مہاجرین قریش تھے اور مدینے میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہتے تھے۔ نبی علیہ السلام نے ان کے متعلق انصار کو حکم دیا کہ انہیں صدقہ دیا جائے۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا یہ ایک قوم تھی جو اللہ کی راہ میں زخمی ہو کر معذور ہو گئے تھے ان کے لیے مسلمانوں کے صدقات سے حصہ مقرر کیا گیا۔ بعض نے کہا ہر وہ شخص مراد ہے جو فقر سے موصوف ہے۔ اللہ نے ان فقراء کا وصف بیان کیا جو ان پر رحمت و شفقت کا باعث ہے۔ یعنی وہ لوگ سوال کرنے سے بچتے ہیں اور کسی پر اپنی مسکینی ظاہر نہیں کرتے اور جاہل لوگ ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے انہیں غنی سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے اقوال وافعال میں بڑے متقی ہیں۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً آیا ہے کہ مسکین وہ نہیں ہے جو (گلیوں) میں پھرتا ہے ایک یا دو کھجوریں یا ایک یا دو لقمے اسے پھیر دیتے ہیں۔ مسکین وہ ہے جو اس قدر نہیں پاتا جو اسے کفایت کرے۔ نہ انہیں کوئی پہچانتا ہے کہ صدقہ کرے، اور نہ کسی سے کچھ سوال کرتا ہے۔ اس کو احمد نے بھی ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ اللہ کریم نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ تم ان (کے فقر) کو ان کی صورت سے پہچانتے ہو، محتاجی سے ان کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں، بھوک سے رنگ زرد ہو رہا ہے اور جسم ناتواں ہو گئے ہیں۔ یا ان پر تواضع و خضوع ظاہر ہے لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ یا یہ خطاب ہر اس شخص کو ہے جو اس کے لیے موزوں ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا ان لوگوں کے حالات و صفات اولی الالباب پر ظاہر ہیں۔ جیسے فرمایا: ﴿سِيمَاهُمْ فِيْ وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُوْدِ﴾ کہ "ان کو علامت ان کے چہروں میں و سجدوں کے نشانوں سے ہے۔" اہل سنن کے نزدیک حدیث میں آیا ہے کہ تم مومن کی فراست سے بچو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿إِنَّ فِيْ ذَالِكَ لَآيَاتٍ لِلْمُتَوَسِّمِيْنَ﴾ کہ "بیشک اس میں دھیان کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔" معلوم ہوا کہ سمجھ دار لوگ آدمی کو اس کے لباس، وضع قطع اور بظاہر علامات سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ خالص مومن ہے یا منافق۔ ان فقراء کا ایک وصف یہ بیان کیا ہے کہ وہ سوال کرنے میں مبالغہ نہیں کرتے اور کسی کو اپنے سوال سے تکلیف بھی نہیں دیتے۔ جو شخص کفایت کے باجود سوال کرے وہ ملحف فی المسئلہ ہے۔ فتح البیان میں لکھا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ نہ پیچھے پڑ کر سوال کرتے ہیں نہ بغیر مبالغے کے۔ طبری، زجاج اور جمہور مفسرین کا یہی قول ہے۔ یعنی تعفف ان کی ایک ایسی صفت ہے جو کسی بھی حال میں ان سے جدا نہیں ہوتی کیونکہ محض سوال کرنا بھی تعفف کے منافی ہے۔ بعض نے معنی یہ کیے کہ وہ تکلف کی بجائے نرمی سے سوال کرتے ہیں لیکن یہ بھی صفت تعفف کے مخالف ہے اس کے علاوہ یہ دلیل بھی ہے کہ جب وہ سوال نہ کریں گے تب ہی جاہل انہیں غنی خیال کریں گے۔ اور سوال کی حرمت میں بہت سے دلائل ہیں۔ جب کسی

طرح چارہ نہ ہو تب سوال کرے۔ ابو ہریرہؓ سے بخاری کا لفظ مرفوعاً اس طرح ہے کہ مسکین وہ نہیں جس کو ایک کھجور یا دو کھجوریں یا ایک لقمہ اور دو لقمے پھیر دیں۔ مسکین وہ ہے جو تعفف سے کام لیتا ہے۔ جس کا دل چاہے یہ آیت پڑھ لے۔ ﴿وَلَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًاo﴾ اس کو مسلم و نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم کا لفظ یہ ہے کہ مسکین وہ نہیں جو تمہارے گرد پھرتا ہے اور تم اسے ایک ایک لقمہ دیتے ہو مسکین وہ ہے جو سوال سے بچتا ہے اور بڑے مبالغے سے نہیں مانگتا۔ اس کو ابن جریر نے بھی اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ تک مرفوعاً ذکر کیا ہے کہ ایک مزنی شخص نے کہا کہ میری ماں نے مجھ سے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے جا کر کیوں نہیں مانگتے جیسے دوسرے لوگ مانگتے ہیں۔ میں گیا تو آپ ؐ کھڑے خطبہ پڑھ رہے تھے: ((مَنِ اسْتعف اعفه لله و من استغنى اغناه الله و من سال الناس وله عدل خمس اواق فقد سئل الناس الحافا)) میں نے اپنے نفس میں کہا کہ ایک اونٹنی میرے پاس ہے اور ایک میرے غلام کے پاس وہ پانچ اوقیہ سے بہتر ہے۔ پھر میں واپس آگیا اور سوال نہ کیا۔ [بروایت احمد] دوسرا لفظ یوں آیا ہے کہ: ((من سئال وله اوقية فقد الحف)) [بروایت نسائی ایضاً] ابن ابی حاتم نے ابو سعید سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس نے سوال کیا اور اس کے پاس ایک اوقیہ ہے تو وہ اصرار سے سوال کرنے والا ہے۔ ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ دوسرا لفظ یہ ہے کہ ایک اوقیہ ہے یا اوقیہ کے برابر قیمت ہے۔ [بروایت احمد] ابن مسعود مرفوعاً کہتے ہیں کہ جس نے سوال کیا اور اس کے پاس اتنا ہے جو اس کو بے نیاز کرتا ہے تو قیامت والے دن اس کے چہرے میں خدوش یا کدوش ہوگا۔ کہا اے اللہ کے پیغمبرؐ! بے نیازی کیا ہے؟ فرمایا پچاس درہم یا اتنا سونا۔ [بروایت احمد و اهل السنن] بعض احادیث میں چالیس درہم بھی مذکور ہیں۔

فائدہ: پھر اللہ کریم نے ان لوگوں کی مدح کی ہے کہ جو سب اوقات میں دن رات مخفی اور ظاہر ہو کر اپنا مال اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ اس میں وہ خرچ بھی ہے جو آدمی اپنے اہل پر خرچ کرتا ہے۔ جیسا کہ صحیحین میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے سال یا حجۃ الوداع کے سال ان کی عیادت کے وقت فرمایا کہ تو اللہ کے لیے کوئی خرچ نہ کرے گا مگر تیرا درجہ بڑھے گا۔ حتیٰ کہ وہ لقمہ جو تو اپنی بیوی کے منہ میں رکھے گا۔ حضرت ابن مسعود کا لفظ یہ ہے کہ جب اجر کی امید سے کچھ خرچ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہوتا ہے۔ [بتخریج احمد] غریب ملیکی نے کہا کہ یہ آیت گھوڑوں والوں کے حق میں اتری ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں گھوڑوں کو دانہ، چارہ کھلاتے ہیں۔ حضرت مجاہد نے کہا حضرت علیؓ کے پاس چار درہم تھے ایک رات کو ایک دن کو ایک چھپ کر اور ایک اعلانیہ خرچ کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مگر اس

کی سند ضعیف ہے۔فتح البیان میں لکھا ہے کہ اس آیت میں انفاق پر بہت ترغیب دی ہے کہ کسی وقت بھی انفاق کو ترک نہ کرے۔ رات ہو یا دن، چھپے ہو یا علانیہ ہر حال میں صدقہ دیتا رہے۔اس میں یہ بھی اشارہ ہے ک مخفی صدقہ کرنا علانیہ صدقہ سے افضل ہے۔ کیونکہ اللہ نے نفقہ رات کو دن پر اور سر کو علانیہ پر مقدم کیا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا کہ مراد وہ لوگ ہیں جو بغیر اسراف و تبذیر واملاق کے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ابن المسیب نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور عثمان رضی اللہ عنہما کے حق میں نازل ہوئی جبکہ انہوں نے جیش عسرت (غزوۂ تبوک) میں مدد کی لیکن لفظ کے عموم کا اعتبار سبب کے خصوص سے زیادہ ہے۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۲۷۵﴾

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قبروں سے) اس طرح (حواس باختہ) اٹھیں گے جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو، یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ سود بیچنا بھی تو (نفع کے لحاظ سے) ویسا ہی ہے جیسے سودا (لینا) حالانکہ سودے کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام، تو جس شخص کے پاس اللہ کی نصیحت پہنچی اور وہ (سود لینے سے) باز آگیا تو جو پہلے ہو چکا وہ اس کا اور (قیامت میں) اس کا معاملہ اللہ کے سپرد اور جو پھر لینے لگا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں کہ ہمیشہ دوزخ میں (جلتے) رہیں گے۔

یعنی ممانعت سے پہلے جو لے لیا دنیا میں اس کی واپسی نہیں ہے اور آخرت میں اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے چاہے تو اس کو معاف کر دے۔ اور جو ممانعت کے بعد لے وہ جہنمی ہے۔ اللہ کے حکم کے سامنے عقل کو کوئی دخل نہیں جو ایسا کرے اس کی یہی سزا ہے جو ذکر کی گئی ہے۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ کریم نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو سود کھاتے ہیں اور مال باطل اور مشکوک روزی کھاتے ہیں۔ ان کا حال خروج قبر سے لے کر بعث و نشور تک ان کا حال یہ ہے کہ وہ بعث کے وقت قبر سے اس طرح اٹھیں گے جیسے کوئی خبطی دیوانہ ہو۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ سود خور د قیامت والے دن مجنون اٹھے گا۔ عوف بن مالک، سعید بن جبیر، سدی، ربیع بن انس، قتادہ اور مقاتل بن حبان کا یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قیامت والے دن سود خور کو کہا جائے گا کہ ہتھیار لگا کر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ پھر یہ آیت پڑھی کہا کہ یہ قبور سے اٹھنے کے وقت ہو گا۔ حضرت ابو سعید کی حدیث میں ہے کہ معراج کی رات

آنحضرت ﷺ ایک قوم پر سے گذرے ان کے پیٹ کمروں کی طرح تھے، ان کا حال پوچھا تو کہا کہ یہ سود خور ہیں۔[بروایت بیھقی] ابن ابی حاتم کا لفظ یہ ہے کہ ان کے پیٹ میں سانپ بھرے تھے۔ سمرہ بن جندب کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ ایک سرخ نہر پر آئے جیسے خون ہو، اس میں ایک آدمی تیر تا تھا، نہر کے کنارے پر ایک اور شخص تھا جس کے پاس پتھر جمع تھے، جب وہ تیر کر اس کے پاس آتا تو منہ کھول دیتا وہ کنارے والا ایک پتھر کا لقمہ اس کے منہ میں ڈال دیتا۔ بخاری نے کہا کہ وہ شخص سود خور تھا۔ فتح البیان میں کہا ہے کہ اس وعید سے صرف سود کھانے والا مراد نہ ہے بلکہ ہر شخص مراد ہے جو سود کا لین دین کرتا ہے۔ حضرت جابرؓ مرفوعاً فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے سود کھانے، کھلانے والے پر اور کاتب و گواہوں پر لعنت کی ہے۔ [بروایت مسلم] حضرت ابن مسعود کا مرفوع لفظ یہ ہے کہ سود کے تہتر دروازے ہیں۔ سب سے کم یہ ہے کہ کوئی اپنی ماں سے حرام کاری کرے۔ سب سے زیادہ مسلمان مرد کی آبرو ہے۔ [بروایت بیھقی، حاکم و صححه] ایک جماعت صحابہؓ سے بھی یہی مضمون مروی ہے۔ صرف ربا کے عددِ ابواب میں اختلاف ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت نے کہا کہ سب سے بعد نازل ہونے والی آیت یہی آیت ربا ہے۔

فائدہ: آخر میں اللہ کریم نے فرمایا کہ جس کو یہ بات پہنچ گئی کہ اللہ نے سود کو حرام کر دیا ہے اور وہ سنتے ہی اس سے باز رہا تو اس کو پہلا معاملہ معاف ہے۔ رسول اللہ علیہ السلام نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ جاہلیت کا سود میرے قدموں تلے ہے سب سے پہلے میں اپنے چچا عباسؓ کا سود معاف کرتا ہوں پھر یہ حکم نہ دیا کہ جو سود جاہلیت میں لے چکے ہو وہ واپس کریں۔ سدی نے کہا ان کی مراد یہ تھی کہ جو سود جاہلیت میں کھا چکے ہیں وہ معاف ہے۔ پھر فرمایا کہ جس نے ممانعت کے بعد سود کھایا وہ دوزخی ہے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس آیت کے نزول کے بعد فرمایا کہ جس نے مخابرہ نہ چھوڑا وہ اللہ اور اکے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ [بروایت ابو داؤد] ابن کثیر نے فرمایا کہ کھیتی کو بعض پیداوار کے عوض بیچنا مخابرہ کہلاتا ہے۔ اور تر میوے لے کر خشک میوے کے بدلے خریدنا مزابنہ ہے اور خشک غلے کے بدلے تازہ غلہ درختوں پر خریدنا محاقلہ ہے۔ یہ سب اقسام و اشیاء اور جو اس کے مثل ہوں مادۂ ربا کو ختم کرنے کے لیے حرام کیے گئے ہیں۔ کیونکہ خشک ہونے سے قبل تر اور خشک کا مساوی ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ اسی لیے فقہاء نے کہا کہ مماثلت کے ساتھ جہل حقیقت معاضلہ کی طرح ہے۔ اسی لیے بہت سی ایسی اشیاء کو حرام سمجھا جو ربا کا وسیلہ ہیں۔ اور اس میں فرق ہر شخص کے علم کے موافق ہے کہ جس کو اللہ نے جتنا علم دیا اس نے ویسا سمجھا۔ اور فرمایا: ((وقد قال تعالیٰ: و فوق کل ذی علمٍ علیم)) اہل علم پر

باب ربا سب ابواب سے مشکل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں چاہتا تھا کہ آنحضرت ہم سے جد اور کلالہ اور ابواب ربا کے متعلق کچھ قول و قرار کر جاتے۔ مراد بعض وہ مسائل ہیں جن میں ربا کی آمیزش ہے۔ شریعت اس بات پر شاہد ہے کہ جو چیز حرام کی طرف وسیلہ ہو وہ بھی حرام ہے۔ جیسا کہ اشراط واجب بھی واجب ہیں یعنی جس چیز کے بغیر کوئی واجب کل نہیں ہوتا وہ بھی لازم واجب ہے۔ صحیحین میں حضرت نعمان بن بشیر سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حرام بھی واضح ہے اور حلال بھی ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ امور ہیں جو ان سے بچا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچالیا اور جو ان میں واقع ہوا گویا حرام میں گرا۔ جیسے وہ چرواہا ہو جو چراگاہ کے ارد گرد چراتا ہے قریب ہے کہ (اس کے جانور) اس میں چریں۔ سنن میں حضرت حسنؓ بن علیؓ سے آیا ہے کہ جو چیز تجھے شک میں ڈالے وہ چھوڑ دے اور جو شک میں نہ ڈالے اس کو اختیار کر لے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکا پیدا کرے اور لوگوں کا اس پر مطلع ہونا تجھے ناپسند ہو۔ تیسری روایت میں ہے کہ تو اپنے نفس سے فتویٰ لے، گو کہ لوگ تجھے فتویٰ دیں۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ سب سے آخر میں یہی آیت ربا اتری ہے، پھر آپؐ اس کی تفسیر نہ کر سکے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔ سو تم ربا بھی کو چھوڑ دو اور جو چیز شک میں ڈالے اس کو بھی ترک کر دو۔ ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً کہتے ہیں کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اس میں سود کھائیں گے پوچھا گیا کیا سب لوگ فرمایا جو کوئی نہ کھائے گا تو اس کو اس کا غبار لگ جائے گا۔ [بروایت احمد و اهل السنن]

ابن کثیر نے فرمایا اسی سے ان وسائل کی بھی تحریم ہے۔ جو محرمات تک پہنچا دیتے ہیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جب سورۃ بقرہ کی آخری آیات، آیات ربا نازل ہوئیں تو آنحضرت ﷺ نے مسجد میں جا کر ان کو پڑھا اور شراب کی تجارت کو حرام کر دیا۔ [بتخریج الجماعة سوی الترمذی] بعض اہل علم نے کہا کہ جب ربا اور اس کے وسائل کو حرام کر دیا تب شراب اور اس کی تجارت کو بھی حرام کر دیا۔ جیسا کہ متفق علیہ حدیث میں ہے کہ اللہ یہود پر لعنت کرے۔ ان پر چربی حرام ہوئی لیکن انہوں نے اس کو پگھلایا اور بیچ کر اس کی قیمت کھا گئے۔ علماء نے کہا کہ سود کے کاتب و شاہد پر اس صورت میں لعنت ہے جبکہ اسے اس کے متعلق امر واضح ہو۔ اگر بظاہر عقد شرعی کی صورت میں اور باطن میں فاسد ہو اس صورت میں تو معنی کا اعتبار ہو گا۔ نہ صورت کا کیونکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ صحیح میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور اموال کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے اعمال اور قلوب کو دیکھتا ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام علامہ ابو العباس، ابن تیمیہ نے ابطال تحلیل میں ایک کتاب لکھی ہے اس میں ان وسائل میں داخل ہونا منع کیا ہے جو باطل کی طرف لے جاتے ہیں۔ پھر کہا کہ: ((وقد کفی فی ذالك و شفاء رحمه الله

و رضی عنہ))

يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٧٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٧﴾

اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور ان کو ان کے کاموں کا صلہ اللہ کے ہاں ملے گا اور (قیامت کے دن) ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

فائدہ: یعنی مالدار ہو کر غریب کو قرض بھی مفت نہ دے جب تک کہ سود مقرر نہ کرلے یہ بھی نعمت کی ناشکری ہے۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس آیت میں فرمایا کہ سود کی کمائی یا تو بالکل ختم ہو جاتی ہے یا اس کی برکت مٹ جاتی ہے۔ دنیا میں ہی ختم ہو جاتی ہے کچھ نفع حاصل نہیں ہوتا اور آخرت میں اس پر عذاب ہوگا۔ جیسے فرمایا: ﴿قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ﴾ کہ ”فرما دیجئے! ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے گو کہ آپ ؐ کو ناپاک کی کثرت اچھی لگے۔“ اور فرمایا: ﴿وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعاً فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ﴾ ”اور وہ ناپاک کو ایک دوسرے کے اوپر کرے پھر اس کو سارا ڈھیر کرے پھر اس کو جہنم میں ڈال دے۔“ اور فرمایا: ﴿وَمَا اٰتَيْتُمْ مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ کہ ”اور جو تم سود دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں بڑھتا رہے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔“ ابن جریر نے کہا کہ یہ آیت حضرت ابن مسعود کی حدیث کی مثال ہے کہ سود چاہے جتنا بھی بڑھ جائے اس کا انجام کمی ہی ہوتا ہے۔ [بروایت احمد و ابن ماجہ] گویا یہ مقصود کو ختم کرنے والا معاملہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: کہ اللہ سود خور کا نہ صدقہ قبول کرتا ہے نہ حج نہ جہاد نہ صلہ رحمی، صدقات کے بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ مال بڑھتا ہے جس میں سے صدقہ دیا ہے یا اس کا اجر دگنا ہوتا رہتا ہے۔ یا دونوں فوائد ہوتے ہیں۔ صحیحین وغیرھما میں مرفوعاً آیا ہے کہ جس نے طیب کمائی سے ایک کھجور صدقہ کی اور اللہ صرف پاک مال قبول کرتا ہے تو اللہ اس کو دائیں ہاتھ سے وصول کر کے اس کو متصدق کے لیے اس طرح پالتا ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنے بچھڑے کو پالتا ہے حتیٰ کہ وہ صدقہ پہاڑ کی طرح ہو جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ اور ابن عمرؓ کی حدیث میں اتنا زیادہ ہے کہ پھر آنحضرت

ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ طبرانی نے ابو برزہؓ اسلمی سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ بندہ روٹی کا ایک ٹکڑا صدقہ دیتا ہے اور اللہ کے پاس بڑھ کر احد پہاڑ کی طرح ہو جاتا ہے اس باب میں اور بہت سی احادیث ہیں۔ان احادیث سے اس آیت کے معانی واضح ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ اللہ ناشکرے دل کو اور گناہگار افعال والے کو پسند نہیں کرتا۔ یہ ارشاد اس لیے ہوا کہ جو حلال رزق اللہ نے اس سود خور کی قسمت میں رکھا تھا اور جو جائز کمائی اس نے اس کے لیے مشروع کی تھی اس نے اس پر اکتفانہ کیا اور لوگوں کا مال باطل طریق سے اور ناپاک کمائی سے کھانا شروع کیا تو نعمت کی ناشکری کیوجہ سے ظلوم اور باطل طریقے سے کھانے کی وجہ سے گناہگار ہوا۔اس کے بعد اللہ نے مومنین کی تعریف کی۔اس جگہ مومنین سے وہ لوگ مراد ہیں کہ تحریم ربا پر ایمان لائے مگر عموم زیادہ مناسب ہے۔ایمان یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تصدیق کرے اور اعمال صالحہ جس کا اس کو حکم ہوا ہے وہ بجالائے۔انہی میں سے ایک ترکِ رباہے۔ نماز اور زکوٰۃ خود دو فریضے ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾

مومنو! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور رسول سے جنگ کرنے کے لیے (تیار ہوتے ہو) اور اگر توبہ کرلو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ تمہارا نقصان۔

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾

اور اگر قرض لینے والا تنگ دست ہو تو (اسے) کشائش (کے حاصل ہونے) تک مہلت (دو) اور اگر (زر قرض) بخش دو تو وہ تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے بشرطیکہ سمجھو۔اور اس دن سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور میں لوٹ کر جاؤ گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی کو کچھ نقصان نہ ہوگا۔

فائدہ: چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جو سود تم نے ممانعت سے پہلے لیا ہے، سو لے لیا،اب آئندہ سود مقرر کیا ہوا نہ طلب کرو۔ پھر اگر پہلے سود لیا ہوا تمہارے اصل مال میں کمی کرے تو تم پر ظلم ہے۔اگر ممانعت کے بعد تم سود طلب کرو گے تو یہ تمہارا ظلم ہے۔پھر یہ نہ کرنا چاہیے کہ جب سود موقوف ہوا تو اب مفلسی سے قرض کا تقاضا کرنے لگو، بلکہ اس کو فرصت دو اور اگر توفیق ہو تو معاف کردو۔

فائدہ: زید بن اسلم ابن جریج، مقاتل بن حبان اور سدی نے کہا کہ یہ آیات بنی مغیرہ و بنی عمر کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ پہلی قوم ثقیف میں سے تھی دوسری بنی مخزوم سے۔ان کا آپس میں دور جاہلیت میں سود کا لین دین تھا۔جب یہ لوگ اسلام میں آگئے تو ثقیف نے چاہاکہ اپنے پہلے سود کا مطالبہ کریں۔باہم مشورہ کیا، بنو مغیرہ نے کہاکہ ہم اسلام میں سود نہ دیں گے۔نائبِ مکہ عتاب بن اسید نے رسول اللہ ﷺ کی طرف لکھا۔تب یہ آیت نازل ہوئی۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت عتاب کو یہ آیت لکھ بھیجی۔اس میں بہت بڑی وعید ہے اور اس شخص پر بڑی تشدید ہے جو انذار کے بعد بھی سودی لین دین کو قائم رکھے۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایاکہ اس جگہ ایذان بمعنی استیقان ہے۔قیامت میں سود خور سے کہیں گے کہ اپنے ہتھیار اٹھا اور جنگ کے لیے تیار ہو جا۔امام پر حق ہے کہ جو شخص سود پر قائم رہے اور باز نہ رہے تو اس سے توبہ طلب کرے اگر باز آئے تو بہتر ورنہ اس کو قتل کردے۔حضرت حسنؒ و ابن سیرین نے فرمایا: وَاللّٰهُ یہ صراف سود خور ہیں، اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کو تیار ہیں، آج اگر کوئی لوگوں پر امام ہوتا تو ان سے توبہ کراتا اگر یہ کرلیتے تو بہتر ورنہ ان پر ہتھیار استعمال کرتا۔

حضرت قتادہ نے فرمایاکہ اللہ نے ان سے قتل کا وعدہ کیا ہے جیساکہ وہ سنتے ہیں۔سو تم سودی لین دین سے بچتے رہو۔ اللہ نے حلال کو تم پر وسعت دی ہے اور حلال کو پاک کہا ہے۔پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ فاقہ تمہیں معصیت کی طرف لے چلے۔ حضرت ربیع بن انس نے کہاکہ اللہ نے سود خور کو قتل کی وعید سنائی ہے۔سُہیلی نے کہا اسی لیے حضرت عائشہؓ نے زید بن ارقم کی لونڈی سے مسئلہ عینہ میں یہ کہاکہ تو زید سے کہناکہ اس کا نبی علیہ السلام کے ساتھ کیا ہوا جہاد برباد ہوا مگر یہ کہ توبہ کرلے۔کیونکہ وہ اللہ کے قول کی مخالفت ہے۔﴿فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ اس بات کو بہت سے اہل علم نے ذکر کیا مگر حضرت عائشہؓ تک اس کی سند ضعیف ہے۔پھر اللہ کریم نے فرمایاکہ اصل مال لے لو کم زیادہ نہ لو۔احوص نے کہاکہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ علیہ السلام نے فرمایاکہ سودِ جاہلیت موقوف ہے۔ تمہیں اصل مال لے لینا چاہیے نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم ہونا چاہیے اور سب سے پہلے جو سود موقوف ہوا وہ حضرت عباسؓ کا سود ہے۔[بروایت ابن ابی حاتم و ابن مردویہ] پھر اللہ کریم نے حکم دیاکہ مفلس قرضدار کو مہلت دو ایسا نہ کرو جیسے جاہلیت میں ہوتا تھاکہ جب قرضدار کی مدت مکمل ہوتی تو اسے کہتے کہ یا قرض واپس کر دیا اس پر سود لگاؤ۔پھر فرمایاکہ اگر تم اصل مال بھی چھوڑ دو تو یہ اور بھی بہتر ہے۔اس باب میں کئی طرق سے کئی احادیث مروی ہیں۔حضرت سعد بن زرارہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جسے یہ بات پسند ہے کہ اللہ اس کو اس دن سایہ دے جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا تو اسے چاہیے کہ وہ ضرورت مند پر آسانی

کرے یا چھوڑ دے۔[بروایت الطبرانی] بریدہ کا لفظ یہ ہے کہ جس نے مفلس کو مہلت دی اس کے لیے ہر دن کے بدلے اتنا صدقہ یا اس سے دو گنا صدقہ کا اجر ہے۔[بروایت احمد] ابو قتادہ کہتے ہیں کہ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ جس نے قرضدار کو مہلت دی یا اس کو معاف کر دیا وہ قیامت والے دن عرش کے سائے میں ہو گا۔[بروایت احمد ،مسلم]

حضرت حذیفہؓ نے مرفوعاً فرمایا ہے کہ قیامت والے دن ایک بندے کو اللہ کے سامنے لایا جائے گا۔ اللہ فرمائے گا تو نے دنیا میں کیا کام کیا وہ کہے گا اے رب! میں نے تو دنیا میں کچھ بھی ایسا کام نہ کیا جس پر امید رکھوں۔ اللہ کریم تین دفعہ اس سے پوچھے گا اور وہ وہی جواب دے گا، پھر آخر یہ کہے گا اے اللہ! تو نے مجھے زیادہ مال دیا تھا میں لوگوں سے لین دین کرتا تھا، اور میری عادت درگذر کرنے کی تھی میں غنی پر آسانی کرتا، مفلس کو مہلت دیتا تھا، اللہ فرمائے گا میں آسانی کا زیادہ حق دار ہوں۔ جنت میں داخل ہو جا۔[بروایت ابو یعلیٰ] اسی کے لگ بھگ شیخین اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔ سُہل بن حنیف کہتے ہیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس نے مجاہد فی سبیل اللہ کی مدد کی یا غازی کی مدد کی یا قرضدار کو اس کی تنگی میں مدد دی یا مکاتب کو اس کی گردن آزاد کرانے میں مدد دی تو اللہ اس کو اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہو گا۔ حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح الاسناد ہے مگر شیخین نے اس کو روایت نہیں کیا۔ حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً مروی ہے جو کوئی چاہتا ہے کہ اس کی دعا قبول ہو اور اس کی تکلیف دور ہو تو اسے چاہئے کہ تنگدست سے درگذر کرے۔[بروایت احمد] حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ مسجد کی طرف نکلے، ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے فرمایا: جس نے مفلس کو مہلت دی یا معاف کر دیا اللہ اس کو جہنم کی بھاپ سے نجات دے گا۔[الحدیث بروایت احمد] ان کا دوسرا لفظ مرفوعاً یوں ہے کہ جس نے قرضدار کو آسودگی تک مہلت دی اللہ اس کے گناہ کو توبہ تک مہلت دے گا۔[بروایت الطبرانی] پھر اللہ کریم نے اپنے بندوں کو نصیحت کی کہ دنیا کو ختم ہو جانا ہے دنیا کے سب مال فنا ہو جائیں گے۔ آخرت بس آنے والی ہے اللہ سے ضرورت پڑے گی مخلوق کے اعمال کا حساب کتاب لیا جائے گا۔ ہر نیک و غیر نیک عمل کی جزاء و سزا ملے گی۔

ابن کثیر نے فرمایا کہتے ہیں کہ یہ آیت سب کے بعد نازل ہوئی۔ حضرت سعید بن جبیر کا بھی یہی قول ہے کہ: ((آخر ما نزل القرآن کله : وَاتَّقُوا يَوۡمًا)) اس آیت کے نازل ہونے کے نو دن بعد آنحضرت ﷺ نے ۱۲ ربیع الاول پیر کے دن انتقال فرمایا: ((انا لله و انا الیه راجعون))[بروایت ابن ابی حاتم ۔ و ابن مردویه عن ابن عباس والنسائی ایضا عنه]

حضرت ابن عباسؓ سے ثوری کا لفظ یہ ہے کہ اس آیت کے نزول اور نبی علیہ السلام کی وفات کے درمیان اکتیس دن کا وقفہ تھا۔ دوسرا لفظ یہ ہے کہ نو راتیں درمیان میں گذریں۔ ہفتے کو بیمار ہوئے، پیر کو وفات پائی، ابو سعید کہتے ہیں

کہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت یہی ہے۔

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ آیت باب میں دلیل ہے کہ سود کا لین دین اور سود کھانا کبائر میں سے ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہ ہے یوم رجوع الی اللہ سے موت کا دن مراد ہے۔ایک جماعت کا یہی موقف ہے، جمہور کے نزدیک قیامت کا دن مراد ہے۔اس آیت میں لوگوں کے لیے ایک وعید بھی ہے اور ساتھ ساتھ عمدہ وعظ بھی۔خفاجی نے کہا کہ اس آیت کا بطور نزول آخری ہونا کتب احادیث میں مذکور ہے اور صحیح ہے۔کسی نے کہا اس کے اکیاسی دن بعد انتقال ہوا کسی نے سات دن کا فاصلہ بتایا کسی نے تین ساعت کہا۔بہر کیف کچھ بھی ہو اس کے بعد قرآن آسمان سے نہیں اترا۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَى أَجَلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ

مومنو!جب تم آپس میں کسی میعاد معین کے لیے قرض کا معاملہ کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو اور لکھنے والا تم میں کسی کا نقصان نہ کرے بلکہ انصاف سے لکھے نیز لکھنے والا جیسے اللہ نے اسے سکھایا ہے لکھنے سے انکار بھی نہ کرے اور دستاویز لکھ دے،اور جو شخص قرض لے وہی(دستاویز کا) مضمون بول کر لکھوائے اور اللہ سے کہ اس کا مالک ہے خوف کرے اور زر قرض میں سے کچھ کم نہ لکھوائے اور اگر قرض لینے والا بے عقل یا ضعیف ہو یا مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے اور اپنے میں سے دو مردوں کو(ایسے معاملے کے)گواہ کر لیا کرو،اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ پسند کرو(کافی ہیں) کہ اگر ان میں سے ایک بھول جائے گی تو دوسری اسے یاد دلادے گی اور جب گواہ (گواہی کے لیے)طلب کئے جائیں تو انکار نہ کریں اور قرض تھوڑا ہو یا بہت اس (کی دستاویز) کے لکھنے لکھانے میں کاہلی نہ کرنا ،یہ بات اللہ کے نزدیک نہایت قرین انصاف ہے اور شہادت کے لیے بھی یہ بہت درست طریقہ ہے اس سے تم کو کسی طرح کا شک

وَاَدْنٰی اَلَّا تَرْتَابُوا اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیْرُوْنَهَا بَیْنَکُمْ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَکْتُبُوْهَا وَاَشْهِدُوْا اِذَا تَبَایَعْتُمْ وَلَا یُضَارَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۸۲﴾

و شبہ بھی نہیں پڑے گا، ہاں اگر سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو اگر (اسے معاملے کی) دستاویز نہ لکھو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور جب خرید و فروخت کیا کرو تو بھی گواہ کر لیا کرو، اور کاتب دستاویز اور گواہ (معاملہ کرنے والوں کا) کسی طرح کا نقصان نہ کریں، اگر تم (لوگ) ایسا کرو تو یہ تمہارے لیے گناہ کی بات ہے اور اللہ سے ڈرو اور دیکھو کہ وہ تم کو (کیسی مفید باتیں سکھاتا) ہے اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

فائدہ: موضح قرآن میں فرمایا اس آیت میں اللہ کریم نے دو باتوں کو مشروط کیا۔ ایک تو یہ کہ وعدے کے وقت معاملے کو لکھ لینا چاہئے تاکہ پھر لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آئے اور خود کو شبہ نہ پڑے گواہ کو دیکھ کر یاد آئے، دوسری یہ کہ ہر معاملے میں گواہ قائم کر لینے چاہئیں۔ وہ دو مرد ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں اور یہ گواہ ان لوگوں میں سے ہوں جن کی گواہی لوگ پسند کریں۔ پھر اس بات کی قید بھی رکھی کہ کاتب و شاہد کسی کا نقصان نہ کریں جو واجب حق ان پر ہے وہ ادا کریں۔ اور جو دینے والا کہے وہی لکھیں یا اگر کہنے والا عقل مند نہ ہو تو اس کا ولی بزرگ جو کہے وہ لکھیں۔

فائدہ: ابن کثیر نے فرمایا کہ قرآن میں یہ آیت سب سے لمبی ہے۔ ابن المسیب کہتے ہیں کہ ہمیں خبر ملی ہے کہ عرش کے ساتھ احدث قرآن آیت دین ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی تو آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو اپنی بات سے پھرا وہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ پھر فرمایا کہ آدمؑ نے اپنی عمر میں سے چالیس برس داؤد علیہ السلام کو دیئے۔ جب ملک الموت آئے تو آدمؑ بولے ابھی تو چالیس برس باقی ہیں ان کی عمر ہزار برس مقرر ہوئی تھی۔ فرشتوں نے کہا تم نے چالیس برس داؤد کو دیئے ہیں۔ کہا میں نے تو نہیں دیئے۔ اللہ نے کتاب ظاہر کی جس پر فرشتوں کو گواہ کیا۔ [الحدیث بطوله بروایت احمد] حماد بن سلمہ نے کہا اللہ نے داؤد کو سو برس اور آدمؑ کو ہزار برس مکمل کر دیئے۔ [بروایت ابن ابی حاتم] اس آیت میں اللہ کریم نے اہل ایمان کو یہ ارشاد کیا ہے کہ جب تم کوئی معاملہ مؤخر کرو تو لکھ لیا کرو۔ اس میں یہ بات ہوگی کہ معاملہ کی مقدار و وقت اس کا اچھی طرح محفوظ ہو جائے گا اور گواہ بھی بھول چوک کا شکار نہ ہوں گے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا ہے کہ: ﴿ذٰلِکُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰی اَلَّا تَرْتَابُوْا﴾ ابن عباسؓ نے فرمایا یہ آیت بیع سلم کے مدت

معلوم تک کے متعلق اتری ہے۔دوسرا لفظ یہ ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ نے سلف کی مدت مقرر کی ہے اور اس کا اذن دیا ہے پھر یہ آیت تلاوت کی۔[بروایت بخاری] سلف سے سلم مراد ہے۔جس کو ہندی زبان میں "بندھور" کہتے ہیں۔ صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ سے آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ جب مدینے میں تشریف لائے۔وہاں کے لوگ ایک سال دو سال اور تین سال تک سلف کرتے۔فرمایا جو سلف کرے وہ کیل معلوم وزن معلوم اور اجل معلوم تک کرے اور کتابت کا حکم اس لیے دیا کہ اس میں وثوق وحفظ ہوتا ہے۔یہ بات اس حدیث کے خلاف نہ ہے جو فرمایا:((انا امة امية لا نكتب ولا نحسب))اس لیے کہ قرآن حفظ ہوتا ہے سنن بھی محفوظ ہیں ان کو لکھنے کی ضرورت نہ ہے۔جن چیزوں کا لکھنے کا حکم دیا ہے وہ جزئی چیزیں ہیں۔جن میں لوگ واقع ہوتے ہیں۔یہ امر کتابت کا ارشادی ہے ایجابی نہ ہے۔جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے ابن جریج نے کہا جو کسی کو قرض دے وہ لکھ لے اور جو خریدے اس پر گواہ کرلے۔قتادہ نے کہا ابو سلیمان مرعشی نے ہم سے ذکر کیا کہ کیا تم جانتے ہو وہ کون سا مظلوم ہے جس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے۔لوگوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔فرمایا ایک آدمی نے خاص مدت تک سودا کیا نہ اس کو لکھا نہ اس کی گواہی طلب کی جب مدت گذر گئی تو مال والے نے انکار کر دیا اس نے اللہ سے دعا کی مگر وہ قبول نہ ہوئی کیونکہ اس نے اللہ کی نافرمانی کی ہے۔ابو سعید، شعبی، ربیع بن انس، حسن، ابن جریج اور ابن زید وغیرھم نے کہا پہلے یہ بات واجب تھی پھر منسوخ ہو گئی۔اس کی ناسخ یہ آیت ہے:﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَه﴾"پھر اگر تمہارا بعض بعض کو امین بنائے پھر چاہیئے کہ وہ شخص ادا کرے دے جو اپنی امانت کا امین بنایا گیا۔"حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے دوسرے اسرائیلی سے کہا کہ مجھے ایک ہزار دینار ادھار دے دو اس نے کہا تم کوئی گواہ لاؤ جسے میں گواہ کروں۔کہا:((كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا))کہا: کفیل لاؤ۔کہا:((كفى بالله وكيلاً))اس نے کہا تو نے سچ کہا اور ایک مدت مقررہ تک ہزار دینار اسے دیئے۔[الحدیث بروایت احمد]اس حدیث کی سند درست ہے۔بخاری نے اپنی صحیح میں اسی کو سات مقامات پر بصیغہ جزم تعلیقاً روایت کیا ہے۔سو یہ حدیث بھی نسخ پر دلیل ہے کیونکہ جب ایسی کوئی بات جو پہلی شریعت سے ہماری شریعت میں آئی ہو اور اس پر انکار نہ کیا گیا ہو وہ حجت ہے۔سو اس حدیث میں عدم کتابت واشہاد پر انکار نہیں کیا گیا۔پھر جب لکھنے کی ضرورت ہو تو دستاویز لکھنے والے کو چاہے کہ انصاف سے وہی بات لکھے جس پر فریقین اتفاق کریں نہ کم کرے نہ زیادہ اور جب کوئی کسی ایسے شخص سے لکھوانا چاہے جسے لکھنا آتا ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ لکھ دے اور انکار نہ کرے۔کیونکہ جب اللہ نے اس کو وہ بات سکھائی جو وہ نہ جانتا تھا تو اب اس کو بھی یہی

مناسب ہے کہ جب اس سے کوئی ایسا شخص لکھوانا چاہے جو خود لکھنا نہیں جانتا تو اسے لکھ دے اس پر نرمی کرے ۔حدیث میں ہے کہ یہ بھی صدقہ ہے کہ تو کسی کام کرنے والے کی مدد کرے یا کسی نہ جاننے والے کا کام کر دے ۔دوسری حدیث میں ہے کہ جس نے وہ علم چھپایا جو جانتا ہے تو اس کو قیامت کے دن آگ کی لگام پہنائی جائے گی ۔حضرت مجاہد و عطاء نے کہا کہ کاتب کو لکھ دینا واجب ہے۔ قرض دار کے ذمے جو قرض ہے اسے کاتب سے لکھوا دے۔اللہ سے ڈرے اور کمی نہ کرے۔ کسی چیز کو نہ چھپائے، پھر اگر مستحق شخص تبذیر کی وجہ سے مجور علیہ ہے یا چھوٹا ہے یا مجنون ہے یا ویسے لکھنا نہیں جانتا یا ٹھیک بات کو نہیں پہچانتا اور صحیح و غلط میں فیصلہ نہیں کر سکتا تو اس کا کوئی ولی لکھوا دے اور وثیقہ کے لیے دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اس پر گواہ کرے۔یہ کارروائی مال کے متعلق ہوتی ہے اور ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو اس لیے گواہ کرنے کا حکم اس لیے دیا کہ عورت ناقص العقل ہوتی ہے ۔جیسا کہ حضرت ابی ہریرہؓ کی طویل حدیث میں ہے:((اما نقصان عقلها فشهادة امرأتين تعدل شهادةرجل فهذا نقصان العقل و تمكث الليالي لا تصلي و لا تفطر في رمضان فهذا نقصان الدين)) [بروایت مسلم] اور شہود میں رضا کی قید لگانے سے معلوم ہوا کہ ان میں عدالت کا ہونا شرط ہے۔امام شافعی نے قرآن میں ہر مطلق کو اس سے مقید کیا ہے۔ یعنی جہاں بھی اشہاد بدون شرط مذکور ہے۔ مراد یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق گواہ کیوں نہ ہوں ان کا عادل ہونا ضروری ہے۔ فقط اس مال کے متعلق یہ شرط کچھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ کسی بھی معاملے کے گواہوں کا عادل ہونا لازم ہے۔ جس نے مستور الحال کی گواہی مردود قرار دی ہے اس کی دلیل یہی آیت ہے۔ کہ اس میں آیا ہے کہ گواہ عادل بھی ہو اور اسے اس متعلق مناسب سمجھا گیا ہو۔اور مستور الحال عدل مرضی نہیں ہوتا۔ یعنی جس کے حالات انسان پر واضح نہیں اس کے عدل کے متعلق علم نہیں اسے کیونکہ پسند کیا جائے گا۔ پھر فرمایا کہ جب ایک عورت بھول جائے تو دوسری کے یاد دلانے سے اس کو وہ گواہی یاد آ سکتی ہے۔ جس نے یہ کہا کہ دونوں عورتوں کی گواہی ملکر ایک مرد کی گواہی جتنی ہوگی اس نے ایک موٹی سی بات کہی۔ صحیح بات وہی پہلی بات ہے ۔پھر فرمایا کہ جب گواہوں کو بلایا جائے تو انہیں آنا چاہئے اور شہادت کو قبول کرنا واجب ہے۔ ربیع و قتادہ کا یہی قول ہے۔ جیسے فرمایا کہ کاتب لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ لکھ دے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گواہی قبول کرنا فرض کفایہ ہے۔ جمہور کا یہ مذہب ہے۔ یعنی اس صورت میں یہ فرض کفایہ ہوگا جبکہ شہادت متعین نہ ہو ورنہ تعین کی صورت میں اسی حاملِ شہادت شخص پر واجب ہوگی۔ و اللّٰہُ اعلم .

مجاہد و ابو مجلز اور بہت سے لوگوں نے کہا جب تجھ کو گواہی کے لیے بلایا جائے تو تجھے اختیار ہے اور جب تجھے

گواہ بنالیا گیا تو اب تجھے گواہی دینی چاہئے۔ زید بن خالد نے کہا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں نہ بتاؤں کہ بہتر گواہ کون ہیں۔ وہ جو سوال سے پہلے گواہی دیتا ہے۔ [بتخریج مسلم و اهل السنن] اور یہی بات جو شیخین میں مذکور ہے کہ بدترین گواہ وہ ہیں جو طلب سے پہلے گواہی دیتے ہیں اور فرمایا پھر ایسی قوم آئے گی جن کی گواہی قسم سے پہلے ہو گی اور قسم گواہی سے آگے ہو گی۔ یا ایسی قوم آئے گی جو بن مانگے گواہی دے گی۔ سوان سے جھوٹے گواہ مراد ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ و حسن بصری نے کہا یہ آیت تحمل و ادا دونوں صفات کو شامل ہے۔ ارشاد فرمایا کہ تم تحریر حق سے خواہ چھوٹی ہو یا بڑی ہو کوتاہی نہیں کرنی چاہئے۔ مؤخر معاملے کو تحریر کرنا اللہ کے ہاں زیادہ عدل والا ہے۔ جب قلم سے لکھ دیا تو گواہی مضبوط ہو گئی۔ گواہ جب اس کو دیکھے گا تو اپنی شہادت کو یاد کرے گا کیونکہ نہ لکھنے میں یہ احتمال تھا کہ شاید بھول جائے۔ چنانچہ تحریر کے بعد عموماً دھوکہ باقی نہیں رہتا اور بوقت بحث وہ کام آتا ہے۔ اس کے مطابق بغیر دھوکے معاملے کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر لین دین ہاتھوں ہاتھ ہو تو نہ لکھنے میں کچھ حرج نہیں رہا بیع پر گواہ کرنا سو اللہ نے فرمادیا کہ جب تم لین دین کرو تو گواہ کر لو۔ یعنی جس پر تمہارا حق ہو، خواہ اس معاملے میں مدت ہو یا نہ ہو ہر حال میں تم اس پر گواہ بنالیا کرو۔ حضرت سعید بن جبیر کا بھی یہی قول ہے۔ جابر بن زید، مجاہد، عطاء و ضحاک سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ شعبی و حسن کے نزدیک یہ امر منسوخ ہے لیکن جمہور کے نزدیک یہ امر ارشاد ترغیب پر محمول ہے وجوب پر نہیں۔ اس پر حضرت خذیمہ بن ثابت انصاری کی حدیث دلیل ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کے لیے ایک اسپ کی خرید پر گواہی دی تھی۔ آپ علیہ السلام نے ان کی گواہی دو گواہوں کے برابر قرار دی۔ [بروایت احمد بطوله و ابو داؤد] ابن کثیر فرماتے ہیں لیکن احتیاط اس میں ہے کہ گواہ بنالے۔ اس لیے کہ دو امام حافظ ابن مردویہ و حاکم نے ابو موسیٰ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ تین آدمی ایسے ہیں جن کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے ایک وہ مرد جس کی عورت بد خلق ہے وہ اسے طلاق نہیں دیتا، دوسرا وہ شخص جس نے بلوغت سے پہلے کسی یتیم کا مال پھیر دیا، تیسرا وہ شخص جس نے کسی کو کچھ مال قرض دیا مگر گواہ نہ کیا۔ حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور شیخین کی شرط پر ہے۔ کاتب و شاہد کے نقصان نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو لکھوایا ہے کاتب اس کے خلاف لکھ دے اور گواہی دینے والا اس کے خلاف گواہی دے۔ جو اس نے سنا ہے یا اس کو بالکل چھپا جائے۔ حسن و قتادہ کا یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا عدم اضرار کے یہ معنی ہیں کہ آدمی کاتب اور شاہد کو لکھنے کے لیے اور گواہی دینے کے لیے بلائے اور وہ کہیں ہمیں کام ہے لیکن یہ انہیں مجبور کرے کا کہ ضرور آؤ۔ اس طرح انہیں تنگ کرے۔ حضرت عکرمہ، سدی، طاؤس، مجاہد، ضحاک، ابن جبیر، عطیہ، مقاتل بن حیان اور ربعی

بن انس سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ پھر فرمایا: اے لوگو! اگر تم اس کے خلاف کرو گے تو فسق تمہارے گلے بندھ جائے گا، پھر تم اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اللہ سے ڈرو اس کے حکم کو بجالاؤ۔ اس کے زواجر کو ترک کردو۔ اللہ تمہیں سکھاتا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّكُمۡ فُرۡقَانًا﴾ "اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہارا فیصلہ کر دے گا۔" اور جیسے فرمایا: ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوۡا بِرَسُوۡلِهٖ يُؤۡتِكُمۡ كِفۡلَيۡنِ مِنۡ رَّحۡمَتِهٖ وَيَجۡعَلۡ لَّكُمۡ نُوۡرًا تَمۡشُوۡنَ بِهٖ﴾ کہ "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ وہ تمہیں اپنی رحمت سے دو حصے دے گا۔ اور تمہارے لیے نور کر دے گا جس کے ساتھ تم چلو گے۔"

فائدہ: فتح البیان میں آیت باب کی تفسیر میں یوں لکھا ہے کہ اللہ کریم نے اس آیت میں سود کے بعد قرض کا ذکر کیا ہے کہ خواہ قرض دے یا کسی سے لے، قرض میں مدت معلوم کر لے۔ یعنی ایک سال یا ایک ماہ اور یہ قیمت کی مدت بیع و سلم دونوں میں لازم ہے۔ تاکہ مدت تمام ہونے سے پہلے صاحب حق مطالبہ نہ کرے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مدت مجہول جائز نہ ہے۔ جمہور نے کہا کہ دنوں، مہینوں یا سالوں کی مدت مقرر کرے۔ کھیتی کاٹنے یا قافلہ کے واپس آنے کی شرط درست نہ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب اللہ نے سود کو حرام کیا تو سلم کو جائز کر دیا اور قرض کو مدت مقررہ کی تقید سے لکھنا چاہئے۔ خواہ بیع ہو، سلم ہو یا قرض ہو۔ کیونکہ اس میں مخالفت و لڑائی جھگڑے کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور بظاہر لکھنے کا حکم وجوب کے لیے ہے۔ عطاء، شعبی، نخعی وغیرھم اسی طرف گئے ہیں۔ ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے کہ اگر کاتب نہ ملے اور کسی شخص کو لکھنا آتا ہے تو درخواست کے وقت اسے دستاویز لکھ دینا چاہئے۔ انکار نہ کرنا چاہئے۔ جمہور کہتے ہیں کہ یہ امر استحباب کے لیے ہے۔ لفظ رجالکم سے معلوم ہوا کہ دونوں گواہ مسلمان ہوں کافر نہ ہوں۔ لفظ رجال میں غلام بھی داخل ہیں۔ شریح، عثمان بتی، احمد، اسحٰق، ابوثور کا بھی یہی قول ہے۔ ائمہ ثلاثہ اور جمہور کے علماء غلام کی گواہی کو ناجائز کہتے ہیں لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ عورتوں کو مردوں کے ساتھ گواہی درست ہے اکیلے نہیں۔ ہاں اس معاملے میں تنہا عورت کی گواہی معتبر ہے جو اس کے علاوہ کسی کو معلوم نہ ہو۔ رہا یہ مسئلہ کہ دو عورتوں کی گواہی اور مدعی کی قسم پر حکم دینا جائز ہے یا نہیں۔ جیسے ایک مرد کی گواہی اور مدعی کی قسم پر فیصلہ جائز ہے۔ اس مسئلے میں اختلاف ہے۔ امام مالک و شافعی جائز سمجھتے ہیں اس لیے کہ اللہ نے اس آیت میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر کی ہے۔ جبکہ امام ابو حنیفہ اس کو غیر جائز کہتے ہیں۔ اختلاف کا مرجع یہ ٹھہرتا ہے کہ مدعی کی قسم کے ساتھ ایک گواہ کافی ہے یا

نہیں۔ حق بات یہی ہے کہ کافی ہے کیونکہ اس امر پر دلیل آچکی ہے۔ یہ زیادت قرآن کے خلاف نہ ہے۔ اس میں شاہد و یمین کی بابت رسول اللہ ﷺ کے کسی فیصلے کا رد نہ ہے۔ ہر صاحب فہم اس کو جانتا ہے۔ بہر کیف اس میں اللہ کریم نے اموال کے معاملے میں احتیاط کی ترغیب دی یہ کیونکہ معاش و معاد کے مصالح انہی اموال سے منسلک ہیں۔

وَإِنْ كُنتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَّقْبُوضَةٌ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٨٣﴾

اور اگر تم سفر پر ہو اور (دستاویز) لکھنے والا نہ مل سکے تو (کوئی چیز) رہن یا قبضہ رکھ کر (قرض لے لو) اور اگر کوئی کسی کو امین سمجھے (یعنی رہن کے بغیر قرض دے دے) تو امانت دار کو چاہئے کہ صاحب امانت کی امانت ادا کر دے اور اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے، اور (دیکھنا) شہادت کو مت چھپانا جو اس کو چھپائے گا وہ دل کا گنہگار ہو گا اور اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔

فائدہ: اللہ کریم نے اس آیت میں یہ فرمایا کہ اگر تم بحالت سفر قرض ادھار کا معاملہ کرو اور کاتب یا سامان کتابت نہ پاؤ تو کتابت کے عوض صاحب کے ہاتھ میں رہن رکھ دے۔ لفظ مقبوضہ سے یہ معلوم ہوا کہ قبضہ کے بغیر رہن لازم نہیں آتا ہے۔ امام شافعی و جمہور کا یہی مذہب ہے۔ دوسری جماعت نے کہا کہ رہن کے لیے لازم ہے کہ وہ مرتھن کے پاس اس کے قبضے میں ہو۔ امام احمد اور ایک گروہ اہل علم اسی طرف گیا ہے۔ ایک جماعت سلف نے کہا اس آیت سے یہ بھی پتا چلا کہ رہن صرف سفر میں جائز ہے۔ حضرت مجاہد وغیرہ کا یہی مسلک ہے۔ صحیحین میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انتقال کیا جبکہ آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تین وسق جو کے بدلے گروی رکھی تھی۔ جو آپؐ نے اپنے اہل کی ضرورت طعام کے لیے اس سے لیے تھے اور زرہ بطور گروی دی۔ امام شافعی کی روایت میں اس یہودی کا نام ابوالشحم ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ وہ یہود مدینہ کے پاس رہن رکھی تھی۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان مسائل کی وضاحت "کتاب واحکام کبیر" میں کی ہے۔ ابو سعیدؓ خدری نے فرمایا یہ آیت منسوخ ہے۔ شعبی نے کہا معنی یہ ہیں کہ اگر تمہارے بعض کو بعض پر اعتماد ہے تو عدم کتابت و عدم الشہاد میں کچھ خوف نہیں۔ مومن کو چاہیئے کہ اللہ سے ڈرے۔ حسن نے سمرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے ہاتھ پر ہے جو اس نے لیا حتی کہ وہ ادا کر دے۔ [بروایت احمد و اهل السنن] پھر گواہی چھپانے سے منع فرمایا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جھوٹی گواہی اکبر کبائر ہے اسی طرح اس کا چھپانا بھی۔ سدی نے کہا اس جگہ اثم بمعنی فاجر ہے۔ یعنی اس کا دل فاجر ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ﴾" اور

ہم اللہ کی گواہی چھپاتے نہیں ہیں۔ہم تب البتہ گناہگاروں سے ہوں گے۔"اور فرمایا:﴿يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۞ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۞﴾"اے ایمان والو!انصاف کے ساتھ اللہ کے لیے گواہی کے لیے سیدھے ہو جاؤ۔اگر چہ وہ تمہارے خلاف ہو یا تمہارے والدین کے خلاف یا قرابت داروں کے خلاف ہو۔اگر وہ غنی ہے یا فقیر ہے تو اللہ ان کا ان سے زیادہ خیر خواہ ہے۔پھر خواہشات کی پیروی نہ کرو کہ برابر سمجھو اور اگر تم زبان کو پیچ دو یا اعراض کرو تو اللہ تمہارے اعمال سے خبردار ہے۔"اسی طرح اس جگہ فرمایا:﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾"اور نہ گواہی کو چھپاؤ اور جس نے اس کو چھپایا تو اس کا دل گناہگار ہے۔"

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ جب اللہ نے اموال کی حفاظت اور شبہے کو ختم کرنے کے لیے کُتّابُ وَ شُہّاد کو مشروع کیا اس کے بعد بحالت سفر کاتب نہ ملنے کا عذر ذکر کیا اور حالت سفر پر تخصیص کی ہے کیونکہ وہ احوال عذر میں سے ہے اور جو عذر بھی سفر کے قائم مقام ہو اس کا یہی حکم ہے۔رہان مقبوضہ کو کتابت کی جگہ رکھا۔اہل علم نے کہا کہ سفر میں رہن رکھنا کتاب سے ثابت ہے اور حضر کا رہن سنت نبوی سے ثابت ہے۔ مرتہن وہ ہے جو رہن لیتا ہے اور وہ چیز رہین و مرہون کہلاتی ہے راہن وہ ہے جو رہن رکھتا ہے۔جمہور کہتے ہیں کہ ایجاب و قبول سے ارتہان ثابت و صحیح ہو جاتا ہے۔گو کہ قبض نہ بھی ہو اس میں بھی تقویٰ مد نظر رہنا چاہئے کہ جب مدت رہن پوری ہو جائے تو بلا تاخیر و انکار حق ادا کر دے اور معاملہ اچھا کرو جیسے راہن نے حسن ظن کیا تھا ویسا ہی برتاؤ کیا جائے۔آیت کے آخر میں کتمان شہادۃ سے وعید و تحذیر ہے۔اس آیت کو آیت دین کہتے ہیں اور جو ابو سعید نے کہا کہ اس آیت کا ماقبل منسوخ ہے یہ بات درست نہ ہے۔(اللہ ان سے راضی ہو اور ان پر رحم کرے۔)یہ آیت جنس نسخ سے نہ ہے بلکہ امانت سے مقید ہے۔اس کا ماقبل محکم و ثابت ہے وہ منسوخ نہ ہے۔عدم امانت سے ہے۔بعض علماء نے کہا کہ از طرح عہد آیت ربا و آیت دَین آخری ہے۔واللّٰہُ اعلم.

لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٨٤﴾

جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے تم اپنے دلوں کی بات کو ظاہر کرو گے تو اور چھپاؤ گے تو اللہ تم سے اس کا حساب لے گا،پھر وہ جسے چاہے مغفرت کرے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

فائدہ: موضح قرآن میں فرمایا اس آیت سے معلوم ہوا کہ دل کے خیالات کا بھی حساب ہو گا۔ یہ سن کر اصحابؓ نے عرض کیا کہ یہ حکم بہت مشکل ہے۔ آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا بنی اسرائیل کی طرح انکار نہ کرو بلکہ قبول کرو۔ اور اللہ سے مدد چاہو۔ پھر لوگوں نے کہا ہم ایمان لائے اور قبول کیا۔ اللہ کریم کے ہاں یہ بات بہت پسند کی گئی تب اگلی دو آیات نازل ہوئیں۔ ان میں حکم ہوا کہ جو چیز طاقت سے باہر ہے اس کی تکلیف نہیں ہے۔ اب جو دل میں کسی برائی کا خیال کرے لیکن عمل نہ کرے تو اس کو شمار نہیں کیا جاتا۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ کریم نے یہ خبر دی ہے کہ جو کچھ آسمان و زمین کے درمیان ہے سب کچھ اسی کا ہے اسے ہر چیز کی خبر ہے۔ اس پر کچھ کھلا یا چھپا پوشیدہ نہیں۔ وہ ہر دل کا حال اور ہر نفس کا خیال جانتا ہے ۔اگرچہ کتنا ہی مخفی کیوں نہ ہو۔ پھر فرمایا کہ بندے جو کام کرتے ہیں اور جو دل میں خیال گذرتے ہیں ان سب سے اللہ وقف ہے اور وہ ان سب کا حساب لے گا۔ فرمایا:﴿اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْتُبْدُوْہُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝﴾ ”اگر تم چھپاؤ جو تمہارے نفسوں میں ہے یا ظاہر کرو اس کو اللہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اسے بھی جانتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ اور فرمایا:﴿یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی﴾ ”کہ وہ پوشیدہ اور اس سے بھی مخفی بات کو جانتا ہے۔“ اس باب میں اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ پھر اس آیت میں علم سے زیادہ یہ خبر دی ہے کہ حساب بھی ہو گا۔ اسی لیے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ ہر چھوٹی یا بڑی بات پر محاسبہ ہونے سے ڈر گئے اور یہ ڈر ،شدت ایمان و کمال ایقان کے طریق سے تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اصحاب رسولؐ پر سخت گذری وہ آکر دو زانو بیٹھ گئے اور عرض کیا: اے اللہ کے پیغمبر! علیہ السلام جن کاموں کا ہمیں مکلف کیا گیا ہے جیسے نماز، روزہ، جہاد، صدقہ وغیرہ اس کی ہمیں طاقت ہے لیکن اب جو حکم آپؐ پر نازل ہوا اس کی ہمیں طاقت نہ ہے۔ فرمایا کیا تم چاہے ہو کہ وہ بات کہو جو تم سے پہلے اہل کتابین نے کہی تھی۔((سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا)) ”کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔“ بلکہ تم کہو:((سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ)) کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی ہم تجھ سے بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب! اور آپ کی طرف لوٹنا ہے۔ جب قوم نے اس بات کا اقرار کیا تو زبان سے اعتراف کیا۔ اس پر اللہ نے بعد والی آیت میں اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ [بروایت احمد]

مسلم کا لفظ یہ ہے کہ جب انہوں نے اس بات کا اقرار کر لیا تو اللہ نے فرمایا:﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا

وُسْعَهَا﴾ کہ "اللہ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے موافق۔" ہر جملہ پر نعم فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی تو ان کے دلوں پر ایسا خوف پیدا ہوا جو کسی اور حکم سے پیدا نہ ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم کہو: ((سَمِعْنَا وَاطعنا واسلمنا)) اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان کو جگہ دی۔ اس پر آیت: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ .... نازل ہوئی۔ [بروایت احمد و مسلم] اور ہر دعائیہ جملے کے بعد قَدْ فَعَلْتُ کہا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس وسوسۂ نفس کی طاقت مسلمانوں کو نہ تھی اللہ نے قول و فعل پر دار و مدار رکھا۔

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ اس آیت کی پچھلی آیت نے منسوخ کر دیا۔ حضرت علیؓ، ابن مسعود، کعب احبار، شعبی، نخعی، قرظی، عکرمہ اور حضرت سعید بن جبیر کا ایک جماعت سے کتب ستہ میں یہی قول مروی ہے۔ بطریق قتادہ زرارہ بن ابی اوفی حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً آیا ہے کہ اللہ نے میری امت سے دل کی باتوں سے در گذر کیا جب تک کہ زبان پر نہ لائے یا عمل نہ کرے۔ ابوہریرہؓ کا صحیحین میں مرفوع لفظ اس طرح ہے کہ اللہ کریم نے فرمایا کہ جب میرا بندہ کسی برائی کا ارادہ کرلے تو تم اس کو نہ لکھو پھر اگر وہ اس گناہ کو کر بیٹھے تو اس پر ایک گناہ ہی لکھو۔ اور جب خیر کا ارادہ کرلے تو ایک نیکی لکھ لو۔ پھر جب وہ اس نیکی کو کرلے تو اس کی دس حسنات لکھ دو۔ مسلم کا لفظ یہ ہے کہ اللہ کریم نے فرمایا جب میرے بندے نے ایک نیکی کا ارادہ کیا پھر وہ نیکی نہ کرسکا تو میں اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھ لیتا ہوں۔ پھر جب وہ نیکی کرلیتا ہے تو دس گنا سے سات سو گنا تک لکھتا ہوں۔ پھر اگر کسی برائی کا ارادہ کیا پھر اس کو نہ کیا تو میں اس کو نہیں لکھتا پھر اگر وہ اس گناہ کو کرلے تو اس کے کھاتے میں ایک ہی گناہ لکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ بھی اس بابت میں بہت سی احادیث مروی ہیں جو مختلف طرق سے مروی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کچھ صحابیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا ہم اپنے نفس میں ایسی بات پاتے ہیں جس کا زبان پر لانا ہمارے لیے نہایت مشکل ہے۔ فرمایا: کیا تم نے ایسی بات پائی ہے؟ کہا: ہاں۔ کہا: یہی تو واضح ایمان ہے۔ [بروایت مسلم] مسلم کا دوسرا لفظ اس طرح ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وسوسے کا حال پوچھا تو فرمایا: تلک صریح الایمان۔ [بروایت مسلم عن ابی ہریرہ] حضرت ابن عباسؓ کا ایک یہ قول ہے کہ یہ آیت منسوخ نہ ہے بلکہ جب اللہ کریم قیامت والے دن سب کو جمع کرے گا تو فرمائے گا کہ میں تمہارے ان خیالات نفس کے متعلق تمہیں بتاتا ہوں جن پر میرے فرشتے بھی مطلع نہ تھے۔ پھر ان کو ان خیالات کی خبر دے کر معاف فرمادے گا۔ ﴿یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ سے یہی اخبار مراد ہیں اور اہل شک و ریب کو ان کے شک مخفی کی خبر دے کر ان سے

مواخذہ کرے گا۔ حضرت مجاہد و ضحاک سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ حضرت حسن بصری و ابن جریر نے کہا یہ منسوخ نہ ہے بلکہ محکم ہے۔ کہا کہ محاسبہ سے عتاب لازم نہیں آتا۔ اللہ کبھی حساب تو لیتا ہے مگر عذاب نہیں دیتا۔ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ مومن اللہ سے نزدیک ہو گا پھر حتی کہ اللہ کریم اپنا ہاتھ اس پر رکھ دے گا پھر اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا کہے گا تو فلاں گناہ کو پہچانتا ہے وہ کہے گا جی ہاں۔ حتی کہ وہاں تک پہنچ جائے گا جہاں تک اللہ چاہے گا۔ پھر فرمائے گا کہ میں نے دنیا میں تجھ پر اس گناہ کی بابت پردہ ڈالا تو آج میں تجھے معاف کرتا ہوں۔ ((اللھم انی اسئلك برحمتك التی وسعت کل شیء ان تغفرلی)) پھر اس کا صحیفۂ حسنات یا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا کفار و منافقین کے لیے سب کے سامنے یہ پکارا جائے گا: ((ھولاء الذین کذبوا علی ربھم الا لعنة الله علی الظالمین)) [بروایت ابن جریر] یہ حدیث صحیحین وغیرھما میں بھی متعدد طرق سے آئی ہے۔ ابن جریر کے موقف کی دلیل یہی ہے۔

فائدہ: فتح البیان کا لفظ یہ ہے کہ اہل علم سے اس کے متعلق کئی اقوال ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اگرچہ یہ آیت عام ہے مگر کاتم شہادت کے لیے خاص ہے کہ اس سے گواہی چھپانے کا حساب لیا جائے گا۔ خواہ اس نے لوگوں پر اس مخفی امر کو ظاہر کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ حضرت ابن عباسؓ، عکرمہ، شعبی اور مجاہد کا یہی قول ہے مگر اس کا عموم زیادہ تر مناسب ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے وہ امور مراد ہیں جو دل میں خیال گزرتے ہیں اور شک و یقین کے درمیان ہوتے ہیں۔ یہ حضرت مجاہد کا قول ہے اس میں تخصیص بلا مخصص ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت محکم و عام ہے۔ لیکن دل کے خیالات پر کفار و منافقین کو عذاب ہو گا۔ طبری نے اس قول کو ایک جماعت سے نقل کیا ہے مگر یہ بھی تخصیص مخصص کے باب سے ہے۔ کیونکہ: ﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَآءُ﴾ کہ "جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔" بعض معین کے ساتھ بغیر دلیل کے مختص نہیں ہو سکتا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک عظیم جماعت اس موقف کی ہم نوا ہے۔ یہی قول درست ہے۔ احادیث صحیحہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ ناسخ و منسوخ تفسیر والی احادیث کے بعد مخالفت کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جو بندہ کسی برائی یا معصیت کا ارادہ کرتا ہے، اپنے نفس میں اس کا خیال لاتا ہے تو اللہ اس کا دنیا میں محاسبہ کر لیتا ہے اس کو غم و حزن میں مبتلا کر دیتا ہے۔ آخرت میں اس کا کچھ مواخذہ نہ ہو گا۔ جیسے بدی کا ارادہ کیا مگر بدی نہ کی۔ کسی نے کہا اگر ان احادیث نفس کو عزم پر محمول کریں تو چونکہ اس پر مواخذہ نہ ہے اس صورت میں یہ آیت محکم ہو گی۔

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴿۲۸۵﴾لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴿۲۸۶﴾

رسول اس کتاب پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں اور مومن بھی، سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم اس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور وہ (اللہ سے) عرض کرتے ہیں کہ ہم نے (تیرا حکم) سنا اور قبول کیا۔ اے پروردگار ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، اچھے کام کرے گا تو اس کو ان کا فائدہ ملے گا، برے کام کرے گا تو اسے ان کا نقصان پہنچے گا، اے پروردگار! اگر ہم سے بھول یا چوک ہو گئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کیجیو، اے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا، اے پروردگار جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا ہمارے سر پر نہ رکھیو، اور (اے پروردگار) ہمارے گناہوں سے درگزر کر، اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا مالک ہے اور ہم کو کافروں پر غالب کر۔

فائدہ: موضح القرآن میں کہا کہ اللہ نے یہ دعا ہم پر پسند کی ہے اور احکام قبول بھی کوئی مشکل نہیں رکھے۔ دل کا خیال بھی معاف کیا اور بھول چوک سے بھی درگذر کیا۔

فائدہ: اس سورت میں اللہ کریم نے نماز، روزہ، زکوۃ، حج، جہاد، حکم حیض و طلاق و ایلاء کا ذکر کیا پھر انبیاء کے قصے بھی ذکر کیے۔ سود کا معاملہ لین دین مذکور کیا۔ پھر ان امور کے متعلق آنحضرت اور مومنین کی تصدیق ذکر فرمائی۔ حضرت ابن عباسؓ و اکثر مفسرین نے کہا اس آیت میں اللہ کریم نے نفس کے خیالات کو منسوخ کر دیا اور یہ اللہ کی طرف سے بندوں کو طریقہ دعا کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ اللہ کا انتہائی کرم ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو مانگنے کا طریقہ بتلا دیا تاکہ انہیں ان کا مطلوب عطا کر دے اور اِصْرًا سے اس جگہ مشقت و مشکلات مراد ہیں یا شدت عمل مراد ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل میں احکام تھے کہ قصاص لازم تھا۔ پھر نجاست کے مقام کو جسم سے الگ کرنا یا جیسے وہ مسخ ہو گئے تھے۔ بندر اور سور بن کر کائنات سے ختم ہو گئے اور مِنْ قَبْلِنَا سے یہود مراد ہیں ان پر پچاس

نمازیں فرض تھیں اور چوتھائی مال زکوٰۃ کے طور پر فرض تھا۔اور کافروں سے عام کافر مراد ہیں اس میں گویا بطریق جہاد اعلاء کلمۃ اللہ کا اشارہ ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ان دعوات میں سے ہر دعا کے بعد اللہ کریم نے فرمایا: قَدْ فَعَلْتُ یعنی جیسے اس نے کہا میں نے ایسا ہی کیا۔یہ اس پر بھی دلیل ہے کہ خطاو نسیان پر مواخذہ نہ ہے۔نہ پہلے لوگوں جیسا بوجھ ان پر لادا گیانہ ان کو تکلیف مالا یطیق یُطَاقَ کا متحمل کیا گیا۔بلکہ ان کے ساتھ بخشش ورحمت کا کافروں کے مقابلے میں مدد کا معاملہ کیا گیا۔

((والحمد لِلّٰہِ حمدًا موافیا لنعمه مکافیا لمذید))"اے اللہ یہ تیرا عاصی بندہ ترجمان القرآن اس مقام پر نہایت عاجزی وانکساری و ندامت سے ان تمام مقبول دعوات کا بصدق دل سے سوال کرتا ہے تو اس کی فریادرسی کر اس کو جملہ آفات و مصائب سے دنیاو آخرت میں بچا۔اس کو قبول کرنا تیرے سامنے کچھ بڑی بات نہ ہے۔((رب اغفرلی ولوالدی ولسیاتی وجمع المسلیمن والمسلمات)) ((آمین))

خاتمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ جس نے کسی رات سورۃ بقرہ کی ان دو آیات کو پڑھا تو وہ اسے کفایت کریں گی۔[بروایت بخاری و احمد۔]ابو ذر رضی اللہ عنہ کا مرفوع لفظ اسطرح ہے کہ میں خواتیم سورۃ بقرہ اس خزانے سے دیا گیا ہوں جو عرش کے نیچے ہے۔یہ مجھ سے قبل کسی نبی کو عطا نہیں کی گئیں۔[بروایت احمد]

بہت سی احادیث میں یہی مضمون مذکور ہے جنہیں ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ شداد بن اوس نے مرفوعاً کہا کہ اللہ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب لکھی۔اس میں سے یہ دو آیات نازل کیں جن پر سوۃ بقرہ کا خاتمہ ہے۔یہ کسی گھر میں تین رات نہیں پڑھیں جائیں کہ پھر شیطان اس گھر کے قریب جائے۔[بروایت طبرانی بسند جید] حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت جبریلؑ آپ علیہ السلام کے پاس بیٹھے تھے کہ آسمان سے ایک آواز سنی گئی۔جبریل علیہ السلام نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا: یہ آسمان سے ایک دروازہ کھلا ہے جو (اس سے قبل) کبھی نہیں کھولا گیا تھا۔ایک فرشتہ نازل ہوا اس نے آنخضرت سے آکر فرمایا: آپ علیہ السلام کو دو نوروں کی بشارت ہو جو آپ علیہ السلام سے پہلے کسی نبی علیہ السلام کو نہیں دیئے گئے۔ایک" فاتحة الکتاب" دوسرے "خواتیم سورۃ بقرہ" کوئی ان کا حرف نہ پڑھے گا مگر وہ اس نور کو عطا کیا جائے گا۔[بتخریج مسلم و نسائی واللفظ] حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جب اس سورت کو پڑھ کر فارغ ہوتے تو آمین فرماتے۔[بروایت مسلم] حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب یہ آیات اتریں تو نبی علیہ السلام نے فرمایا:((حق له ان یومن))حاکم نے اس حدیث کو صحیح

الاسناد کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہے کہ اللہ نے میری امت سے خطاء نسیان اور جس چیز پر انہیں زبردستی عمل کرایا گیا وہ معاف کیا ہے۔ [بروایت ابن ماجه، ابن حبان فی صحیحه] یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے جو بعض بعض کو قوی کرتے ہیں۔ والحمد للہ.

اے اللہ اس تفسیر کی تحریر میں جو خطاء نسان یا اکراہ مجھ سے واقع ہوا یا کسی اور قول و فعل میں وہ مجھے اپنے فضل عمیم ورحمت وسیع سے معاف کر دے۔ اس مقام پر میں اپنے تمام سابقہ و حالیہ گناہوں سے صدق دل سے توبہ کرتا ہوں تو میری توبہ کو قبول فرما۔ (آمین)

آج بستم شوال ۱۳۰۲ھ بروز دوشنبہ کو یہ سورۃ مبارکہ بمع تفسیر مکمل ہوئی۔

((والحمد للّٰه الذی بنعمة تتم الصالحات))

یہ سورۃ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی قرطبینے کہا ہے یعنی بالا جماع اس میں دو سو آیات ہیں اس کے مدنی ہونے کی یہ دلیل ہے کہ یہ سورۃ نجران کے وفد کے بارے میں نازل ہوئی اور یہ لوگ نو(۹)ہجری میں آئے تھے۔مدینہ منورہ میں ان کے آنے کا بیان ان شاء اللہ آیت مباہلہ کی تفسیر کے ذیل میں آئے گا۔سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران کی فضیلت کے بارے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران سیکھو قیامت کے دن ان دونوں میں چمک ہوگی اور اپنے پڑھنے والوں پر سایہ کریں گیں گویا کہ یہ دونوں چھتریاں ہیں یا صف باندھے ہوئے پرندوں کے جھنڈ ہیں[الحدیث رواہ احمد]

ابوامامہ کے الفاظ ہیں کہ قرآن کو پڑھو قیامت کے دن یہ آپ لوگوں کی سفارش کرے گا،زہراوین یعنی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھو یہ قیامت کے دن دو بادلوں یا دو چھتریوں یا پر باندھے ہوئے پرندوں کے جھنڈ کی طرح ہیں جو اپنے قاریوں کے لیے (سفارش کی خاطر) جھگڑا کریں گی۔[رواہ احمد]

نواس بن سمعان کے الفاظ یہ ہیں:

"قیامت کے دن قرآن اور قرآن والوں کو جو اس پر عمل کرتے ہیں کو (اس حال میں لائیں گے) کہ سورۃ بقرہ اور سورہ آل عمران ان کے آگے ہونگی۔"[رواہ احمد ومسلم] (ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔)

ابو عبیدہ کی روایت میں ہے کہ ایک شخص نے سورۃ بقرہ و آل عمران پڑھی جب وہ شخص فارغ ہو چکا تو کعبؓ نے کہا: کیا تو نے سورۃ بقرہ اور آل عمران پڑھی ہے؟اس شخص نے کہا:ہاں کعبؓ نے کہا:اللہ کی قسم!ان دونوں میں وہ نام ہے اللہ کا کہ جب اس نام کے ساتھ دعا کریں تو دعا قبول ہوتی ہے۔اس شخص نے کہا:وہ نام مجھے بتا دیں تو انہوں نے کہا کہ ہرگز نہ بتاؤنگا(کیونکہ)اگر میں نے تمہیں بتا دیا اور تو نے کوئی ایسی دعا کی جس سے میں اور تو دونوں ہلاک ہوگئے تو پھر کیا ہوگا۔

یزید جرشی نے کہا:

"جو کوئی ان دونوں سورتوں کو دن یا رات میں پڑھے گا وہ نفاق سے پاک رہے گا۔"

صحیحین میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں سورتوں کو ایک رکعت میں پڑھا ہے ابن کثیر نے سورۃ بقرہ کی ابتدا میں یہی حدیث لکھی ہے۔ جن میں سورۃ بقرہ اور آل عمران کی انفرادی واجتماعی فضیلت بیان کی گئی ہے اور سبع طوال کی فضیلت بھی ذکر کی گئی ہے۔ وللہ الحمد.

الٓمٓ ۞ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۞ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ۞ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِلنَّاسِ وَأَنْزَلَ الْفُرْقَانَ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۞

الٓمٓ۔ اللہ جو معبودِ برحق ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں زندہ ہمیشہ رہنے والا۔ اس نے (اے محمدؐ) تم پر سچی کتاب نازل کی جو پہلی (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اسی نے تورات اور انجیل نازل کی۔ (یعنی) لوگوں کی ہدایت کے لیے پہلے (تورات اور انجیل اتاری) اور (پھر قرآن جو حق اور باطل کو) الگ الگ کر دینے والا ہے نازل کیا۔ جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ان کو سخت عذاب ہوگا، اور اللہ زبردست (اور) بدلہ لینے والا ہے۔

فائدہ: یہ حدیث گزر چکی ہے کہ اللہ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے۔ کتاب سے مراد اس جگہ قرآن ہے یعنی اے محمد ﷺ ہم نے تم پر سچا ٹھیک قرآن اتارا ہے جس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے آیا ہے، فرشتے اس کی گواہی دیتے ہیں اللہ کی گواہی کافی ہے۔ یہ کتاب تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے آسمان سے اللہ کے بندوں اور پیغمبروں پر اتری ہیں یعنی زمانۂ قدیم میں ان کتابوں نے جس بات کی خبر دی اور بشارت دی یہ کتاب بھی وہی خبر اور بشارت دیتی ہے وہ خبر یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ حضرت (محمد ﷺ) کو رسول بنا کر بھیجے گا وہ بشارت یہی تھی کہ ان پر قرآن اتارے گیا۔ تورات موسیٰ علیہ السلام بن عمران پر اتری، انجیل عیسیٰ علیہ السلام بن مریم علیہا السلام پر نازل ہوئی تھی۔ ان دونوں کتابوں میں اس زمانے کے لوگوں کے لیے ہدایت تھی۔ اب فرقان آیا جو ہدایت اور گمراہی حق اور باطل، سیدھے اور ٹیڑھے پن کے درمیان فرق کرتا ہے اس میں ہمارے لیے کھلی براہین، واضح دلائل اور قطعی سندیں موجود ہیں جن سے خیر وشر، نیک وبد خوب اور ناخوب میں تمیز حاصل ہوتی ہے۔ فرقان کے یہی معنی ہیں، قتادہ اور ربیع نے کہا کہ اس جگہ فرقان سے مراد قرآن ہے ابن جریر نے کہا فرقان اس جگہ مصدر ہے، اس لیے کہ قرآن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ لفظ کتاب سے مراد قرآن ہی تھا، ابو صالحہ کا قول ہے کہ فرقان سے مراد تورات ہے یہ قول ضعیف ہے۔ کیونکہ

تورات کا ذکر بھی پہلے ہو چکا ہے۔

پھر فرمایا جن لوگوں نے اس فرقان یا قرآن کا انکار کیا قیامت کے دن انہیں بڑی مار پڑے گی۔ سو مسلمانوں کے سوا تمام امتیں منکر ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اس انکار کا خاطر خواہ بدلہ لے گا۔

فائدہ: فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ لفظ الٓمّٓ سے کیا مراد ہے حَیٌّ کا معنی ہے ہمیشہ قائم رہنے والا جو کبھی نہ مرے قیوم وہ ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو اپنی مخلوق کا انتظام کرے، معیشت و معاش، دنیا و آخرت کے معاملہ میں مخلوق کی محتاجی میں ان کی مصلحت اور مفاد کا انتظام کرے لفظ نزّل سے معلوم ہوا اس آیت کے نازل ہوتے وقت قرآن پاک پورا نہ اترا تھا کیونکہ صیغہ تفصیل اس بات کی دلیل ہے کہ قران پارہ پارہ کی شکل میں بہت وقت میں نازل ہوا ہے بخلاف تورات اور انجیل کے کہ یہ کتابیں ایک ہی دفعہ میں اتری ہیں۔ اس لیے لفظ أنزلَ فرمایا ہے۔ ان دونوں کتابوں کے یہ نام عبرانی یا سریانی ہیں جیسے زبور۔ بعض علماء نے کہا کہ یہ مشتق ہیں لیکن پہلا قول افضل ہے۔ لفظ نَاسٌ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں یا اس سے مراد عالم لوگ ہیں اس لیے یہ امت بھی غیر منسوخ شدہ شریعتوں کی اتباع کے پابند ہیں اس لیے ابن فورک نے کہا کہ ناس سے مراد متقین ہیں۔ قرآن کو فرقان اس لیے کہا کہ اس میں حق و باطل میں فرق کرنے کی صفت موجود ہے۔ قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قرآن میں حلال و حرام، حدود و فرائض اور امر و نواہی کا بیان ہے ۔یہ قرآن پاک اس اختلاف کا بھی فیصلہ کرتا ہے جو عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ کسی نے کہا فرقان سے مراد زبور ہے، اس لیے کہ یہ مواعظ حسنہ پر مشتمل ہے یا ان ساری اگلی کتابوں پر جو رسولوں پر نازل ہوئیں لیکن پہلا قول ہی اولیٰ ہے۔ کافروں سے مراد نصاریٰ ہیں جو نجران سے بطور ایلچی آئے تھے انہوں نے قرآن اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا لیکن خصوص کا ذکر عام لفظ کے لیے مانع ہونے کا سبب نہیں ہے۔ جب مانع نہیں ہے تو آیت ہر شخص پر شامل ہو گی جو اللہ کی آیات کا منکر ہے انہیں اس کفر کے سبب شدید عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دنیا میں (جہادی) تلوار کا اور آخرت میں نار کا، محمد بن جعفر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر اس کافر سے انتقام لے گا جس نے جان بوجھ کر اللہ کی آیات کا انکار کیا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ۝ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

اللہ (ایسا خبیر و بصیر ہے کہ) کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ وہی تو ہے جو (ماں کے) پیٹ میں جیسی چاہتا ہے تمہاری صورتیں بناتا ہے، اس غالب حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

فائدہ: اس آیت شریف میں اس بات کی خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر غیب کی بات جانتا ہے کوئی چیز اس پر مخفی نہیں ہے۔ تمام جزئیات کا اسے علم ہے، ماں کے پیٹ میں نر مادہ، خوب و بد صورت، بد بخت و نیک، بخت وہی پیدا کرتا ہے لہذا بندگی کی مستحق بھی اسی کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ عزت و حکمت کا وہی مالک ہے اس آیت میں اشارہ بلکہ صراحت ہے کہ اس بات کی کہ عیسیٰ بن مریمؑ اللہ کا بندہ اور مخلوق ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام انسان ماں کے پیٹ میں بنائے ہیں اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ماں کے پیٹ میں بنایا پھر وہ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے جیسا کہ نصاریٰ نے جھوٹا خیال کیا ہے۔ وہ تو انتڑیوں میں پھرنے والا ہے جو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہو گیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں ایک پیدائش کے بعد دوسری پیدا کرتا ہے تین اندھیروں میں) صاحب فتح البیان کا کہنا ہے اس آیت میں علم الٰہی کی وسعت کا بیان ہے جو کہ ہر قسم کی معلومات کو محیط ہے۔ ہر جزی اور کلی کا اسے علم ہے، حکماء کا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ کلیات کو تو جانتا ہے مگر جزئیات کو نہیں جانتا، یہ قول باطل اور غلط ہے اور اسی آیت میں ان کا رد موجود ہے: جو کچھ زمین میں ہے اور آسمان میں ہے اسے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ بندوں کا علم ماسوائے عالم کے قاصر ہے ورنہ اللہ کے علم کی کوئی انتہا نہیں ہے منجملہ اس کی معلومات کے ایک یہ ہے کہ اسے معلوم ہے کہ کون مومن ہے کون کافر ہے، اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے اور جب پیدا ہوئے تو مخلوق ٹھہرے نہ کہ معبود۔

رحم کے اندھیروں میں مختلف صورتیں کیا کیا رنگ اور طبیعتیں بدلتی ہیں۔ اچھی، بری، کالی، گوری، بڑی، چھوٹی، کامل، ناقص بنائی ہیں۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور صحابہ کی ایک جماعت نے کہا ہے نطفہ جب رحم میں پڑتا ہے تو سارے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ پھر چالیس دن کے بعد ایک علقہ ہو جاتا ہے پھر چالیس دن کے بعد مضغہ بنتا ہے پھر چالیس دن کے بعد ایک فرشتہ آکر اس کی صورت بناتا ہے دو انگلیوں سے مٹی لا کر اس مضغہ میں ملا دیتا ہے پھر اسے گوندھ کر جیسے حکم ہوتا ہے نر یا مادہ خوش بخت یا بد بخت ویسی ہی شکل بنا دیتا ہے۔ رزق، عمر، خوشحالی یا مصائب اللہ کے حکم کے مطابق لکھتا ہے۔ جب وہ بدن مرتا ہے تو اسی جگہ دفن ہوتا ہے جہاں کی وہ مٹی تھی۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ﴿٧﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ﴿٨﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ﴿٩﴾

وہی تو ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیتیں محکم ہیں (اور) وہی اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ ہیں، تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہت کا اتباع کرتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور مراد اصلی کا پتہ لگائیں حالانکہ مراد اصلی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں، اور نصیحت تو عقلمند ہی قبول کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کردیجیو اور ہمیں اپنے ہاں سے نعمت عطا فرما توں تو بڑا عطا فرمانے والا ہے۔ اے پروردگار تو اس روز جس (کے آنے) میں کچھ بھی شک نہیں سب لوگوں کو (اپنے حضور میں) جمع کرے گا بے شک اللہ خلاف وعدہ نہیں کرتا۔

فائدہ: موضح القرآن میں لکھا ہے کہ اس سورت میں نصاریٰ کو سمجھانا مقصود ہے۔ وہ حضرت مریم علیہا السلام کو خدا کی عورت اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے وہ اس بات پر بھٹک گئے تھے کہ اللہ کی مہربانی کے الفاظ ان کے حق میں سنتے تھے اس طرح کہ ان کو بندگی سے زیادہ عزت و مرتبہ کی تلاش تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر کلام میں اللہ تعالیٰ نے بعض باتیں ایسی رکھیں ہیں جن کے معنی واضح نہیں، تو گمراہ قسم کے لوگ ان کے معانی کا کھوج اپنی عقل سے لگانے لگے اور جو مضبوط علم والے ہیں وہ ان کے معانی دیگر آیات سے ملا کر سمجھتے ہیں جو کتاب کا اصل مدعی ہیں۔ اس کے مطابق سمجھ گئے تو ٹھیک ورنہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہی اصل حقیقت جانتا ہے ہمارا کام تو ایمان لانا ہے۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے آیت مقدس میں خبر دی ہے کہ قرآن میں محکم آیات ہیں جو کہ ام الکتاب ہیں یعنی کھلے دلائل اور روشن حجتیں ہیں جن میں کسی طرح کا ابہام یا اشتباہ نہیں ہے ہر شخص ان کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ بعض آیات ایسی ہیں جن کی دلالت سے ان کے مدلول پر بہت لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے پس جس شخص نے متشابہ کو محکم کے ساتھ ملایا اور متشابہ پر محکم کا حکم لگایا اس نے ہدایت پائی اور جس نے متشابہ پر حکم لگایا وہ گمراہ ہوا اسی لیے

پہلی قسم کو "ام الکتاب" کہا یعنی وہ اصل ہیں کہ متشابہ کی صورت میں محکم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ دوسری آیات متشابہات ہیں ان کی دلالت کبھی تو محکم کے مطابق ہوتی ہے اور کبھی لفظ اور ترکیب کے لحاظ سے دوسرا احتمال رکھتی ہے مراد کے لحاظ سے نہیں اہل علم کا محکم و متشابہ میں اختلاف ہے سلف سے بہت زیادہ روایات وارد ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ: محکمات ناسخ و منسوخ حرام و حلال، حدود و احکام اور امر و نواہی ہیں دوسری رائے یہ ہے کہ محکمات سے مراد اللہ کا فرمان: "کہو! آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو اللہ نے تم پر حرام کیا یہ تمہارے رب نے یہ کہا ہے کہ تم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو............... آخری آیات تک"

فائدہ: اور اللہ کا ارشاد: "اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔" سعید بن جبیر کا یہی قول ہے۔ ابو فاختہ نے کہا متشابہات سورتوں کی ابتدائی آیات ہیں۔ یحییٰ بن یعمر کہتے ہیں کہ محکم سے فرائض وامر و نواہی، حلال اور حرام، سعید بن جبیر نے ان کو ام الکتاب اسی لیے فرمایا کہ یہ ساری تمام کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ مقاتل بن حیان نے کہا ہے کہ کوئی دین والا ایسا نہیں مگر انکو پسند کرتا ہے۔ متشابہات سے آیات منسوخہ، مقدم مؤخر کی مثالوں کے اقسام ہیں جن پر ایمان لاتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے۔ ابن عباس رضی اللہ نعہ کا بھی یہی قول ہے۔ دوسرا قول مقاتل بن حبان کا ہے کہ "متشابہات سے حروف مقطعات ہیں جو سورتوں کی ابتدا میں آئے ہیں۔ مجاہد کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے کہا متشابہ وہ کلام ہے جو ایک سیاق پر مبنی ہو، مثانی وہ ہے جو رائے پر صادق آئے جیسے آگ اور جنت کی صفات، یا نیک اور بد کا حال، اسی طرح دوسری چیزیں مگر یہاں متشابہ سے مراد وہ امور ہیں جو محکم کے مقابلہ میں ہوں۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ بہتر وہی قول ہے جو اوپر گزر چکا ہے اسی قول کی محمد بن اسحٰق بن یسار نے تائید کی ہے چنانچہ کہا ہے کہ محکمات اللہ کی محبت اور انسانوں کی عصمت اور جھگڑا کرنے والا و باطل کا دفاع ہے، ان میں تحریف و تبدیلی ان کی وضع سے نہیں ہوتی متشابہات فی الصدق ہی سے تحریف و تبدیلی نہیں مل سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ان میں اس طرح مبتلا کیا ہے جس طرح حلال و حرام میں حق کی تلاش میں باطل کی طرف مائل نہیں ہوتے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن کے دل یعنی گمراہی، حق سے کنارا کشی کر کے باطل کی تلاش کرتے ہیں۔ ان متشابہات کے ذریعہ تحریف کرتے ہیں اور ایسی متشابہات کو اپنے فاسد مقاصد کے لیے ان کا اطلاق کرتے ہیں جس طرح چاہیں ان کو پھیر دیں، محکم میں ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا اس لیے کہ محکمات تو انکے ناجائز مقاصد کا توڑ اور ان پر حجت ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ فتنہ بپا کرنے کے لیے ان کی جستجو کرتے ہیں تا کہ اپنے پیرو کاروں کو گمراہ کر دیں اور اپنے گمراہ کن

نظریات کو ثابت کرنے کے لیے قرآن سے دلائل لائیں۔ حالانکہ قرآن خود ان پر حجت ہے نہ کہ ان کے لیے جس طرح نصاریٰ نے کہا کہ قران پاک میں آیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی روح اور کلمہ ہیں جسے مریم کی طرف ڈالا اور اس آیت کو چھوڑ دیا جو ان کے خلاف حجت بنتی ہے۔ "وہ تو صرف بندہ ہے جس پر ہم نے انعام کیا۔" اور وہ آیت: "عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال اللہ کے ہاں مثل آدمؑ کے ہے جسے اس نے مٹی سے پیدا کیا پھر اسے کہا: ہو جا سو وہ وجود میں آگیا۔" اس کے علاوہ اور بہت سی محکم آیات ہیں جو اس بات پر دلیل ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی مخلوق تھے جیسے کہ اللہ کی دیگر مخلوق ہے اور اس کے بندے اور رسول تھے۔ منجملہ دیگر رسولوں کی تاویل تلاش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اپنے مقصد کے مطابق تحریف و تبدیلی پیدا کر لی جائے مقاتل بن حیان اسدی کہتے ہیں کہ ان کا ارادہ ہے کہ جو بات ہونے والی ہے اور جو کسی چیز کا انجام ہے اسے قرآن سے معلوم کریں۔ حضرت عائشہؓ نے یہ آیت هُوَ الَّذِیْ سے لے کر اُولُوا الْاَلْبَاب تک پڑھا اور فرمایا: "جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو اس میں مجادلہ کرتے ہیں تو جان لو کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ان سے بچو۔" احمد اور ابن ماجہ نے اسے روایت کیا ہے ابو بکر المنذر نے اپنی تفسیر میں اس کا ذکر کیا، ترمذی اور ابن جریر نے اسے نقل کیا۔ امام بخاری نے اسی آیت کی تفسیر میں اس کا ذکر کیا، مسلم نے "کتاب القدر" میں روایت کیا اور ابو داؤد نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آپؐ نے یہ آیت پڑھ کر فرمایا: "جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو قرآنی متشابہات کی پیروی کرتے ہیں تو جان لو کہ یہی لوگ ہیں جن کا اللہ نے نام لیا ہے تم ان سے بچتے رہو۔" یہ لفظ بخاری کا ہے ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔ ابن ابو حاتم ابن جریر نے اسے روایت کیا ابن مردویہ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے بارے میں یوں فرمایا: "اللہ نے تم کو ڈرایا ہے سو تم جب ان کو دیکھو تو ان سے بچو۔" ابو امامہ نے بیان کیا ہے کہ یہ لوگ خوارج ہیں۔ [رواہ احمد] اسی طرح آیت: "جس دن کئی چہرے روشن ہوں گے اور کئی چہرے سیاہ ہوں گے۔" کے بارے میں کہا ہے کہ وہ خارجی لوگ ہیں۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس حدیث کی کم سے کم حیثیت موقوف کی ہے یعنی یہ قول صحابی ہو مگر اس کے معنی صحیح ہیں کیونکہ اسلام میں سب سے پہلے بدعت واقع ہوئی وہ بھی خوارج کا فتنہ تھا اور ان کی ابتداء دنیا طلبی پر ہوئی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حنین سے آنے والے مال غنیمت کو تقسیم کیا تو ان کی فساد انگیز عقلوں میں یہ بات سمائی کہ آپؐ نے عدل سے کام نہیں لیا۔ یہ بات یکایک منہ سے نکال دی ذو الخویصرہ نے کہا کہ آپؐ عدل کریں۔ آپؐ نے عدل نہیں کیا، آپؐ نے فرمایا: اگر میں نے انصاف نہیں کیا تو میں برباد ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے تو مجھے اہل زمین پر امین

سمجھا ہے اور تم مجھے امین نہیں جانتے، جب وہ شخص واپس مڑا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ یا خالد بن ولید نے کہا ہم اسے قتل نہ کر دیں تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھوڑو، اس کی نسل سے ایک گروہ ایسا نکلے گا جن کی نمازوں اور قرأت کے مقابلہ میں سے کوئی آدمی اپنی نماز اور قرأت کو بہت حقیر سمجھے گا یہ گروہ دین سے ایسے نکلے گا جیسے ترکش سے تیر نکل جاتا ہے۔

"تمہیں جہاں کہاں یہ گروہ ملے اسے قتل کر دو۔ اور ان کے قتل کرنے میں قاتل کو اجر ملے گا۔" پھر خوارج کا ظہور علی بن ابو طالب کے زمانہ میں ہوا یہ لوگ نہروان میں مارے گئے۔ پھر ان کے قبائل اور اولادیں اور ان کے افکار و خیالات پھیل گئے۔ پھر قدریہ نمودار ہوئے پھر معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ ظاہر ہوئے ان اہل بدعت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث سے خبر دی ہے: (عنقریب میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی یہ سب کے سب جہنم میں جائیں گے مگر ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: وہ کون ہیں؟ فرمایا: "وہ! وہ ہیں جو اس پر ہوں گے جس پر میں ہوں اور میرے صحابہؓ ہیں۔" [رواه الحاكم في مستدركه لهذا الذيادة] حذیفہ رضی اللہ عنہ نے مرفوع بیان کیا ہے کہ "میری امت میں ایک قوم ہو گی جو قرآن پڑھے گی اور قرآن اور معنی کو اس طرح بٹھائے گی جیسے کھجور کی گٹھلی پھلاتے ہیں۔" [رواہ ابو یعلیٰ]

فتح البیان کے الفاظ ہیں: محکمات سے مراد بینات مفصلات ہیں یعنی ان کی عبارت تاویل اور اشتباہ کے احتمال سے محکم ہے گویا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس میں تصرف کرنے سے روک دیا ہے اس لیے کہ اس کے الفاظ ظاہر اور معانی واضح ہیں متشابہات کی تفسیر میں کئی قول ہیں کسی نے کہا محکم وہ ہے جس کی تاویل معروف اور معنی معلوم ہے۔ متشابہ وہ ہیں جس کے معلوم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ جابر بن عبد اللہ، شعبی سفیان ثوری اسی کے قائل ہیں جیسے حروف مقطعات سورتوں کی ابتداء میں ہیں۔ بعض نے کہا کہ محکم وہ ہے جو ایک ہی وجہ کا متحمل ہے اور متشابہ وہ ہے جو کئی وجوہات کی متحمل ہے جب اسے ایک معنی سے منسلک کریں گے تو دیگر وجوہ باطل ہو جائیں گے تو متشابہ محکم ہو جائے گی۔ بعض نے کہا کہ محکم وہ ہے جو بنفسہ قائم ہے کسی غیر کی طرف رجوع کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ متشابہ وہ ہے جسے غیر کی طرف رجوع کی ضرورت ہو۔ نحاس نے کہا کہ یہ عمدہ قول ہے قرطبی نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے ابن عطیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ شوکانی کہتے ہیں کہ بہتر یہ کہنا ہو گا محکم وہ ہے جس کا معنی واضح دلالت ظاہر خواہ باعتبار اپنے نفس کو ہو یا باعتبار غیر کے۔ متشابہ وہ ہے جس کے معنی غیر واضح جس کی دلالت غیر ظاہر ہو دونوں اعتبار سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف مذکورہ صحیح نہیں ہے ہر قول کے قائل نے بعض

صفات کے ذریعہ محکم کی تعریف کی پھر متشابہ کو اس کے مقابل کھڑا کیا پھر سات اقوال نقل کر کے ان کی کمزوریوں کا ذکر کیا پھر ابن عباسؓ کا قول نقل کیا کہ سورہ انعام کی آخری تین آیات: قُلْ تَعَالَوْا ....الخ اللہ سبحانہ کا قول "وَقَضٰى رَبُّكَ ...... تک۔ تین آیات کو محکمات بتایا، اللہ ان پر رحم کرے، وجہ یہ ہے کہ اس قول میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تین یا دس یا سو آیات کو سارے قرآن میں محکم قرار دینے میں کیا حاصل، تمام اقوال کے مطابق اکثر قرآن محکمات پر مشتمل ہے بلکہ خود ان کے دوسرے اقوال میں بھی یہ کہا گیا ہے۔ محکمات سے مراد ناسخ، حلال و حرام، حدود و فرائض ہیں، زیغ کا معنی ہے حق سے روگرانی کرنا جس طرح وفد نجران روگردانی کر گیا تھا۔ اتباع متشابہ کا لفظ عام ہے ہر وہ گروہ جو حق سے روگردانی کر کے اس سے خارج ہو جاتا ہے اس گروہ میں شامل ہے جو زیغ کا اتباع کرتے ہیں۔ ان آیات کے نزول کا سبب نجران کے نصاریٰ تھے وہ قرآن کی متشابہ کو لے کر اہل ایمان کے دلوں میں شکوک پیدا کرتے تھے اور اسے اپنی بدعت پر دلیل ٹھہراتے تھے جس طرح دیگر تمام اہل بدعت کتاب اللہ سے کھیلتے ہیں اور اپنی جہالت کو رائج کرنے کے لیے قرآن سے دلیلیں نکالتے ہیں حالانکہ کوئی دلیل ان کے مدعیٰ کی تائید نہیں کرتی اور یہ کام وہ اس لیے کرتے ہیں کہ دین میں فتنہ برپاء کرتے ہیں۔

فائدہ: حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں لکھتے ہیں کہ جب کسی شخص سے کسی آیت یا حدیث کی تفسیر پوچھی جائے تو اس شخص کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ اس آیت یا حدیث کی اس کے ظاہر معنوی سے ہٹا کر اس کی غلط تاویلیں کرے اپنے یا اپنی خواہش کے مطابق اس کی تاویل کرے اگر کوئی شخص ایسا کام کرے تو اسے فتویٰ بازی سے روک دینا چاہیے۔

نئے اور قدیم ائمہ کرام نے اسی بات کی تصریح کی ہے جوینی نے رسالہ نظامیہ لکھا ہے کہ ائمہ سلف کا یہ مذہب ہے کہ تاویل سے باز رہنا چاہیے ظاہر کو ان کے اپنے مصادر پر جاری کرنا چاہیے۔ اور ان کے معانی سپرد خدا ہیں جو ہماری پسندیدہ رائے اور ہمارا مذہب ہے وہ اتباع سلف امت کی، آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ کا یہی مسلک تھا کہ معانی سے تعرض نہ کیا جائے۔ صحابہؓ وہ لوگ تھے جنہوں نے شریعت کا بوجھ اٹھایا ملت اسلامیہ کے چنے ہوئے لوگ تھے۔ ضبط و قواعد ملت میں کدو کاوش کرتے تھے ملت کی حفاظت کی ایک دوسرے کو وصیت کرتے تھے۔ لوگوں کو جس کا چیز علم کا نہ تھا وہ انہیں سکھاتے تھے اگر ظاہر الفاظ کی تاویل جائز یا پسندیدہ ہوتی تو وہ فروع شریعت سے زیادہ اس کا اہتمام کرتے، لیکن ان کا اور تابعین کا زمانہ بغیر تاویل کے گزر گیا تو یہ اس پر قطعی دلیل ہے کہ یہی طریقہ ہر اعتبار سے لائق اتباع ہے۔ ہر دین دار شخص پر فرض ہے کہ وہ اللہ پاک کا مخلوق کی صفات سے منزہ ہونے

کا اعتقاد کرے، متشابہات کی تاویل اور مشکلات میں نہ پڑے۔ ان کے معنی اللہ کے سپرد کرے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جو علم کلام سے حاصل ہوتا ہے وہ ضعیف ہے۔ راسخ ایمان وہی ہے جو عوام کا ایمان ہے جو بچپن سے سن سن کر ان کے دلوں میں پختہ ہو گیا ہے۔ آئمہ اربعہ کلامی ایمان کی مذمت پر متفق ہیں۔ علامہ ابن قیم کی یہ تقریر فتح البیان میں بہت مفصل ہے، کلام اور تاویل کی مذمت میں رسالہ "قصد السبیل" مختصر لکھا گیا مگر بہت عمدہ ہے۔

فائدہ: وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ اِلَّا اللّٰهُ کے وقت پر قاریوں کا اختلاف ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہاں وقف کرنا چاہیے۔ عائشہؓ کا بھی یہی قول ہے، عروہ ابو شعشاء، ابو نہیک وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ حافظ ابو القاسم معجم کبیر میں ابو مالک اشعری سے مرفوع روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ مجھے اپنی امت کے متعلق تین چیزوں کا خوف آتا ہے ایک یہ کہ ان کے پاس مال زیادہ ہو اور یہ حسد کرنے لگیں اور ایک دوسرے کو قتل کریں۔ دوسرا یہ کہ ان کے لیے اللہ کی کتاب کھولی جائے اور مومن اس میں تاویل تلاش کریں حالانکہ اللہ کے سوا کوئی اس کی تاویل نہیں جانتا۔ پختہ ایمان والے کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے تیسرا یہ کہ عالم کو ضائع کریں اور اس کی پرواہ نہ کریں۔ (یہ حدیث سخت غریب ہے)

ابن مردویہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے الفاظ جو کہ مرفوع ہیں اس طرح نقل کیے ہیں "قرآن اس لیے نہیں نازل ہوا کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تکذیب کرے، بلکہ جو تمہیں معلوم ہو اس پر عمل کرو اور جو متشابہ ہو اس پر ایمان لے آؤ۔" ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کو اس طرح پڑھتے تھے: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ اِلَّا اللّٰهُ وَيَقُوْلُ الرّٰسِخُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ﴾ یعنی اس کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور راسخون پختہ علم والے کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے۔ اسے عبد الرزاق اور ابن جریر نے روایت کیا۔ مالک بن انسؒ کہتے ہیں کہ صحابہ اس پر ایمان لائے اور اس کی تاویل نہیں جانتے تھے۔ ابن جریر نے کہا: ابن مسعودؓ اس کی یوں قرأت کرتے تھے: ((ان تاویله الا عند الله والرسخون فی العلم یقولون امنا به)) ابی بن کعب سے بھی یہی مروی ہے۔ ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ یہی قول حق اور درست ہے دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ پر وقف ہے۔ بہت سے مفسرین اور اہل اصول نے اسی کو اختیار کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ایسا خطاب جو سمجھ سے بالاتر ہو بعید از قیاس ہے ابن عباسؓ کا بھی قول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ان راسخون میں سے ہوں جو تاویل جانتے ہیں۔ ربیع بن انس نے بھی یہی بات کہی ہے لیکن انہوں نے متشابہات کی تاویل کو محکمات پر منطبق کیا ہے اس سے ان کا عذر ظاہر ہو گیا، باطل دفعہ ہوا اور کفر باطل ہو گیا۔ حدیث میں ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباسؓ کے لیے دعا کی تھی

کہ اے اللہ!اسے دین کی سمجھ اور تاویل سکھادے۔" بعض علماء نے اس مقام پر کچھ تفصیل بیان کی ہے وہ کہتے ہیں کہ تاویل کے دو معنی ہیں:ایک کسی شے کی حقیقت اور اس کا انجام جس طرح اس آیت میں ہے۔﴿یَا اَبَتِ ھٰذَا تَاْوِیْلُ رُؤْیَایَ مِنْ قَبْلُ﴾"اے باپ یہ بیان ہے میرے پہلے خواب کا۔"اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ھَلْ یَنْظُرُوْنَ﴾"وہ نہیں انتظار کرتے مگر تاویل کا جس دن اس کی تاویل آئے گی۔"سو تاویل سے اس جگہ اگر یہ معنی مراد ہیں تو اللہ کے مبارک نام پر وقف کرنا صحیح ہے۔کیونکہ اشیاء کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔اور اگر دوسرے معنی مراد ہیں یعنی تفسیر و تعبیر جیسے وہ ہمیں اس کی تفصیل بتائیں۔تو وقف﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ﴾پر ہوگا اس کے لیے اس اعتبار سے وہ خطاب کو سمجھتے ہیں۔اگرچہ وہ اشیاء کے حقائق کے علم کا احاطہ نہ کر سکیں۔فتح البیان کا یہ بیان فاتح ہے کہ والراسخون فی العلم اگلی بات سے ایک جداگانہ کلام ہے۔اکثر اہل علم کی بھی یہی رائے ہے واؤ جمع کے لیے ہے اگلا کلام لفظ "اللہ" پر ختم ہوتا ہے۔صحابہ و تابعین کی اکثریت کی بھی یہی رائے ہے۔

کسائی،اخفش اور ابو عبیدہ وغیرہ کی بھی یہی رائے ہے۔فقط ایک مجاہد نے اس واؤ کو عطف قرار دیا ہے،سو عام اہل علم و مذہب اور نحویوں کے مقابلہ میں مجاہد کی رائے وزنی نہیں ہے اگر واؤ عطف کے لیے ہو تو کُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔

خطابی کہتے ہیں کہ مجاہد کے سوا یہ بات کسی نے نہیں کی۔بغوی کہتے ہیں کہ راسخون الگ تھلگ جملہ ہے اپنے ماقبل پر معطوف نہیں ہے۔مگر ابن فورک،احمد بن عمر الشیخ قرطبی وغیرہ محققین اہل تفسیر عطف کے قائل ہیں۔شوکانی فتح القدیر میں کہتے ہیں کہ سارا اضطراب جو اہل علم میں نظر آتا ہے اس کا سبب محکم و متشابہ کے معنی کی تحقیق ہے اور جو صحیح بات ہے وہ ہم نے پہلے لکھ دی ہے،متشابہ کے تحت آنے والی چیزوں سورتوں کے فواتح یعنی ابتدائیات میں جن کو کوئی لغت شناس عرب نہیں جانتا پھر وہ چیزیں جن کا علم صرف اللہ کو معلوم ہے اور کوئی نہیں جانتا مثلاً روح،علم قیامت،نزول باران یا جو کچھ عورت کے رحم میں ہے۔اسی طرح وہ الفاظ جن کی دلالت باعتبار خود یا غیر کے اعتبار سے ظاہر اور واضح نہیں ہے وہ بھی متشابہ ہے مثلاً ایک شی میں دو احتمام ہوں مگر کوئی احتمال راجح نہ ہو اس کی مثال دو مشترک الفاظ ہیں جن کے معنی کو کسی وجہ سے متعین نہیں کیا یا دو دلیلیں متعارض آئی ہیں جن میں ایک دوسری پر ترجیح بنفسہ یا کبھی خارجی وجہ نہیں ہو سکتی۔اور جس کے معنی باعتبار خود واضح ہیں مثلاً عربی زبان یا شرعی عرف میں مشہور ہیں یا غیر کے اعتبار سے معلوم ہیں جیسے وہ مجمل امور جن کا بیان کسی دوسری آیت یا حدیث میں آگیا ہے۔یا وہ امور جن کی دلالت باہم مخالف ہے مگر قرآن و حدیث نے کسی ایک

دلالت کو ترجیح دی ہے یاوہ ترجیہات جو اہل اصول، اہل انصاف کے نزدیک مقبول ہیں کہ اس قسم کے محکم ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ جس شخص نے ان کو متشابہ سمجھا اس پر حق مشتبہ ہو گیا پھر قرآن میں ایسی آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا قرآن محکم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کتاب کہ جس کی تمام آیات پختہ ہیں اور ارشاد یہ آیات ہیں حکمت والی (پکی کتاب کی) محکم سے مراد یہاں یہ ہے کہ اس کے الفاظ صحیح، معنی درست فصاحت و بلاغت میں سب کلاموں سے افضل و بہتر، کسی مقام سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ سارا قرآن متشابہ ہے۔ جیسے اللہ کا ارشاد ہے کتاب (جس کی آیات) ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں۔ یہاں متشابہ کا مطلب یہ ہے کہ صحت و فصاحت، حسن و بلاغت، اور حق و صداقت میں اس کا ہر حصہ اور آیت ایک دوسری کے برابر اور مشابہ ہے۔

فائدہ: اس آیت میں راسخین ایسے لوگوں کو کہا گیا ہے جن کا یہ عقیدہ ہے کہ تمام محکم و متشابہ حق اور سچے ہیں اور یہ ایک دوسرے کی تائید و تصدیق کرتی ہیں۔ کیونکہ سب اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے نہیں ہیں۔ ارشاد: "کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس بات کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جن کی عقل سلیم اور فہم درست ہے۔ عبید اللہ بن یزید نے بہت سے صحاب کو پایا جیسے ابو امامہ انس، ابو دردا، وہ مرفوعا کہتے ہیں کہ رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ وہ لوگ ہیں جو قسم کے پکے، زبان کے سچے، دل کے غنی، شکم اور شرمگاہ کے پارسا ہیں [رواہ ابن ابو حاتم]

ابن مسعودؓ مرفوعاً کہتے ہیں کہ پہلی کتابیں ایک طرح ایک لہجہ اور ایک حرف پر نازل ہوئیں لیکن قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا۔ سو اس کے حلال کو حلال جانو اور حرام کو حرام سمجھو، امر پر چلو اور نہی سے بچو، مثالوں سے عبرت حاصل کرو، محکم پر عمل کرو، متشابہ پر ایمان لاؤ اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس پر جو ہمارے رب کی طرف سے آیا ہے۔ [رواہ ابن جریر والحاکم صححہ] ابو ہریرہؓ مرفوع کہتے ہیں قرآن سات حروف پر اترا ہے قرآن میں جھگڑنا کفر ہے جو تمہیں معلوم ہو اس پر عمل کرو جو نہ سمجھ سکو اس کے جاننے والے کے سپرد کر دو۔ [رواہ ابن جریر ابن المنذر] اس کی اسناد صحیح، ضبیع ایک شخص تھا وہ مدینہ میں آیا لوگوں سے متشابہ قرآن کے بارے میں سوال کرتا تھا۔ حضرت عمر نے کھجور کی چھڑی سے اس قدر پیٹا کہ اس کا سر لہولہان ہو گیا، آخر وہ چلا اٹھا کہ اب بس کریں جو بات میرے دماغ میں تھی وہ نکل گئی، یہ قصہ دارمی، نصر مقدسی، وابن عساکر وغیرہ نے طریقوں سے روایت کیا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا کہ جو لوگ علم میں راسخ ہیں ان کی دعا یہ ہے کہ وہ اللہ سے ہدایت پر ثابت قدمی مانگتے ہیں

،رحمت کے طلب گار ہیں ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: "اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔" پھر یہ آیت پڑھتے: ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا﴾ [رواہ ابن ابی حاتم] اسماء بنت ابی یزید کہتی ہیں کہ نبی ﷺ "اللھم" کے لفظ کے ساتھ کثرت سے دعا کرتے تھے میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا دل پلٹ جاتا ہے؟ فرمایا: ہاں، ہر انسان کا دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے چاہے اسے سیدھا رکھے چاہے پلٹ دے ہم اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ ہمارے دلوں کو ہدایت دینے کے بعد نہ پلٹے، ہمیں اپنی رحمت سے نوازے کیونکہ وہی دینے والا ہے۔ [رواہ ابن مردویہ] ابن جریر نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ میں نے عرض کیا کہ کیا آپ مجھے کوئی ایسی دعا نہیں سکھا دیتے جو میں اپنے لیے کیا کروں؟ آپ نے فرمایا یوں کہو! "اے اللہ! رب محمد جو نبی ہیں ،میرے گناہ بخش دے، میرے دل کی سختی دور کر دے اور گمراہ کرنے والے فتنوں سے مجھے پناہ دے۔" اس کے بعد جو دعا آئی ہے اس میں اقرار ہے دوبارہ جی اٹھنے کا۔ "حزب الاعظم اور نزل الابرار" میں قران کی تمام دعائیں قرآنی ترتیب کے مطابق لکھ دی ہیں، سب سے بہتر وہ دعا ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں انبیاء و صالح لوگوں کی زبانی سے نقل کیا ہے پھر وہ دعاء جو نبی ﷺ سے منقول ہے۔ دین و دنیا کی وہ کونسی حاجت ہے یا مشکل ہے جو ان دعاؤں میں ذکر نہیں ہوئی کہ ہم لوگ ان مقدس دعاؤں کو چھوڑ کر علماء و مشائخ کی دعاؤں کو وظیفہ بنائے ہوئے ہیں۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص "ربنا لا تزغ قلوبنا" الایہ، گم شدہ چیز کے لیے پڑھے گا۔ اللہ اس چیز کو لوٹا دے گا جب یہ دعا پڑھ چکے تو کہے: ((یا جامع الناس لیوم لا ریب فیه احمع بینی و بین مالی انك علیٰ کل شیء قدیر)) [بخاری نے اپنی تاریخ میں روایت کیا جعفر بن محمد الخلدی سے]

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ﴿١٠﴾ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١١﴾

جو لوگ کافر ہوئے (اس دن) نہ تو ان کا مال ہی اللہ (کے عذاب) سے ان کو بچا سکے گا اور نہ ان کی اولاد ہی (کچھ کام آئے گی) اور یہ لوگ آتش (جہنم) کا ایندھن ہوں گے۔ ان کا حال بھی فرعونیوں اور ان سے پہلے لوگوں کا سا ہو گا جنہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تھی تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب (عذاب میں) پکڑ لیا تھا اور اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خبر دی ہے کہ کافر لوگ جہنم کا ایندھن ہون گے اس روز کسی ظالم کو اس کا کوئی عذر نفع نہ دے گا بلکہ ان کے لیے بدترین ٹھکانہ ہے اور دنیا جو مال، اللہ کے سامنے کچھ کام نہ آئے گا نہ مال

خرچ سے عذاب ٹلے گا اور نہ اولاد کی مدد سے کچھ فائدہ ہوگا جیسے کہ اللہ کا ارشاد ہے: "ان کا مال اور ان کی اولاد آپ کو تعجب میں نہ ڈالیں، اللہ چاہتا ہے ان کے ذریعہ ان کو دنیاوی زندگی ہی میں عذاب دے اور حالت کفر ہی میں ان کو موت آئے۔" اللہ تعالیٰ کا مزید ارشاد ہے: "تمہیں ان لوگوں کا شہروں میں گھومنا پھرنا کسی دھوکے میں نہ ڈالے یہ تھوڑا سا فائدہ ہے پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔" یہاں فرمایا کہ جو لوگ خدا کی آیات اس کے رسولوں اور خدا کی کتاب کے مخالف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ ارشاد فرمایا: "تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی پوجا کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہوں گے اور تم اس میں وارد ہونے والے ہو۔" ام الفضل ابن عباسؓ کی والدہ کہتی ہے کہ ہم مکہ میں تھے کہ ایک رات نبیؐ نے کھڑے ہو کر تین بار بلند آواز میں کہا: اے اللہ! کیا میں نے پہنچا دیا؟ عمر بن خطابؓ نے عرض کیا: ہاں، پھر صبح کو آپؐ نے ارشاد فرمایا: عنقریب اسلام غالب ہو گا کفر اپنے ٹھکانے لگے گا، کچھ لوگ اسلام لے کر دریاؤں میں کود پڑیں گے، لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ قرآن سیکھ کر اس کی قرات کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نے قرآن پڑھا، علم سیکھ لیا ہے؟ ہم سے بہتر کون ہے؟ فرمایا: بھلا ان میں کچھ بھی خیر ہے؟ پوچھا گیا: اے رسول اللہ وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: وہ تمہیں میں سے ہوں گے وہ آگ کا ایندھن ہیں اسے ابن ابو حاتم اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ عمل کے بغیر صرف علم جہنم کی آگ سے نہیں بچا سکتا۔ اے اللہ ہمیں محفوظ فرما۔

فائدہ: دأب کے معنی ہیں صنیع، ابن عباس، عکرمہ، مجاہد، ابو مالک اور ضحاک وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے ضبع کہتے ہیں کام کو بعض نے کہا دأب سے مراد سنت ہے۔ کسی نے کہا مراد شبہ ہے ابن کثیر دأب الف کے سکون اور حرکت کے ساتھ بمعنی صنیع حال، شان، امر و عادات ہے، مطلب یہ ہوا کہ جس طرح کا عذاب آل فرعون اور سابقہ امتوں کو رسولوں کے جھٹلانے کی وجہ سے ہو گا اسی طرح کا عذاب ان مالدار اور اولاد رکھنے والوں کو ہو گا۔ کفار کا لفظ کافروں کی قسموں کو شامل ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس جگہ نجرانی وفد یا بنی قریظہ یا بنو نضیر یا مشرکین عرب مراد لیا ہے لیکن یہاں عام کافر مراد لینا ہی بہتر ہے۔

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَى جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٢﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ

(اے پیغمبرؐ) کافروں سے کہہ دو کہ تم (دنیا میں بھی) عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے اور (آخرت میں) جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ بری جگہ ہے۔ تمہارے لیے دو گروہوں میں جو (جنگ بدر کے دن) آپس میں بھڑ گئے (قدرتِ اللہ کے عظیم الشان) نشانی تھی ایک گروہ

اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاءُ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿١٣﴾

(مسلمانوں کا تھا وہ) اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، اور دوسرا گروہ (کافروں کا تھا وہ) ان کو اپنی آنکھوں سے اپنے سے دوگنا مشاہدہ کر رہا تھا اور اللہ اپنی نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے جو اہلِ بصارت ہیں ان کے لیے اس (واقعے) میں بڑی عبرت ہے۔

فائدہ: جنگ بدر جس کا قصہ سورۃ الانفال میں مفصل ہے میں کافر مسلمانوں کے مقابلہ میں تین گنا تھے۔ "اللہ تعالیٰ کافروں کی نگاہ میں مسلمانوں کو دوچند دکھاتا تھا۔" تاکہ اور مسلمانوں کی نگاہ کافروں کو برابر کی تعداد میں دکھاتا تھا تاکہ مسلمان خوفزدہ نہ ہوں پھر اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی اس واقعہ سے کافروں کو عبرت پکڑنی چاہیئے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ تم کافروں کو کہہ دو کہ تم دنیا میں مغلوب ہو گے اور آخرت میں تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے۔

عاصم بن عمرو کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب بدر سے واپس لوٹے تو آپ نے بنی قینقاع کے بازار میں یہود کو جمع کر کے فرمایا: اے گروہ یہود! تم مسلمان ہو جاؤ اس سے پہلے کہ تمہاری بھی اسی طرح درگت بنے جس طرح کفارہ مکہ کی بن چکی ہے۔ یہود نے کہا: اے محمدؐ! تم اس گھمنڈ میں نہ رہنا کہ تم نے مٹھی بھر قریش مار ڈالے ہیں وہ تو گنوار کی لٹھ تھے جو وہ لڑنا کیا جانیں اگر تمہیں ہم سے پالا پڑا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم آدمی ہیں ہمارے جیسا کوئی لڑنے والا نہیں ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ بدر کے دن مشرک لوگ مسلمانوں کو اپنے سے دوچند دیکھتے تھے۔ اللہ نے اسلام کی مدد کے لیے اہل اسلام کو ان کی نگاہ میں دوچند کر کے دکھایا، اس میں یہ اشکال ہے کہ مشرکوں نے لڑائی سے پہلے عمیر بن سعد کو بطور جاسوس بھیجا کہ وہ دیکھیں کہ مسلمانوں کی تعداد کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ تین سو تین ہیں یا کچھ کم یا کچھ زیادہ اور بات تھی بھی اسی طرح کہ مسلمانوں کی تعداد کچھ اوپر تین سو آدمی تھے۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو اللہ نے خاص اور سر کردہ ایک ہزار فرشتے بھیج دیئے۔ تاکہ مسلمانوں کی مدد کریں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مسلمانوں نے کافروں کو اپنے سے دوچند دیکھا اس کے باوجود اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی اس میں اشکال نہیں ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی مشرک چھ سو چھبیس تھے گویا (یہ تعداد) ظاہر روایت سے معلوم ہوتا ہے لیکن مشہور بات اس کے خلاف ہے کیونکہ تاریخ وسیر اور جمہور کے نزدیک اس روز مشرکوں کی تعداد نو سو سے لے کر ایک ہزار تک تھی، جس طرح عروۃ بن زبیر سے مرفوع روایت ہے، علی و ابن مسعود نے کہا کہ

ایک ہزار تعداد تھی۔ بہر حال مسلمانوں سے تین چند تھی۔ابن جریر نے اشکال کے باوجود اسی قول کو ترجیح دی ہے رہی وہ آیت جو بدر کے قصہ میں مذکور ہے "اور جب تمہاری مڈھ بھیڑ ہوئی تو ان کو تمہاری نگاہ تھوڑی تعداد میں دکھاتا تھا اور تمہیں ان کی نگاہ میں کم کر کے دکھاتا تھا............الایہ "اس آیت میں کسی دوسری حالت کا ذکر ہے جس میں ہر فریق نے دوسرے فریق کو اپنے سے دوچند دیکھا،اس طرح کا دیکھنا، مسلمانوں کی فتح کا سبب بنا اور کافروں کی شکست کا موجب بنا،وہاں اللہ نے فرمایا: "اللہ نے بدر میں تمہاری مدد کی اور تم بیچارگی کی حالت میں تھے۔" اور یہاں فرمایا: "اللہ جسے چاہتا ہے انہیں مدد سے قوت پہنچاتا ہے۔"

فائدہ: فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ اس جگہ کفار سے مراد یہود ہیں یا مشرکین مکہ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان کو مغلوب ہونے کا جو وعدہ کیا تھا وہ اس طرح بنو قریظہ قتل ہوئے بنو نضیر خیبر کی طرف نکالے گئے جو بعد میں فتح ہوا دیگر بقیہ یہود پر جزیہ لاگو کیا گیا۔اس لڑائی میں ستر مہاجر اور دو سو چھتیس انصار تھے یہ سب تین سو تیرہ ہوئے مہاجرین کا نشان علیؓ کے ہاتھ میں تھا۔انصار کا نشان سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھامے ہوئے تھے۔لشکر اسلام میں ستر اونٹ دو گھوڑے چھ زرہ اور آٹھ تلواریں تھیں۔اکثر لشکری پیادہ تھے۔مشرکین نو سے پچاس افراد تھے سب لڑنے والے ان کا سردار عتبہ بن ربیعہ تھا۔لشکر میں سو گھوڑے تھے۔،ہجرت کے بعد نبی ﷺ سب سے پہلے اس جنگ میں شریک ہوئے۔ صحیح بات یہی ہے کہ مشرکوں نے مسلمانون کو اپنے سے دوچند نہیں دیکھا اور نہ ہی مسلمانوں نے کافروں کو اگرچہ بعض اہل علم تکلف کر کے اس طرف گئے ہیں۔تین سو تیرہ افراد کا نو سو پچاس افراد پر فتح پانا بڑا سبق آموز ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ﴿١٤﴾ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُم بِخَيْرٍ مِّن ذَٰلِكُمْ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا............

لوگوں کو ان کے خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں (مگر) یہ سب دنیا ہی کی زندگی کے سامان ہیں، اور اللہ کے پاس بہت اچھا ٹھکانا ہے۔(اے پیغمبر ان سے کہو کہ بھلا میں تم کو ایسی چیز بتاؤں جو ان چیزوں سے کہیں اچھی ہو (سنو) جو لوگ پرہیز گار ہیں ان کے لیے اللہ کے ہاں باغات (بہشت) ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور پاکیزہ عورتیں ہیں اور

وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ (سب سے بڑھ کر) اللہ کی خوشنودی، اور اللہ (اپنے نیک) بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دنیا کے تمام مردوں کا ذکر فرمایا ہے اور بات عورتوں سے شروع کی اس لیے ان کا فتنہ سب سے بڑا ہے۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ نہیں چھوڑا میں نے اپنے پیچھے کوئی فتنہ مردوں کے لیے جو عورتوں سے زیادہ نقصان دہ ہوگا۔ اگر عورتوں سے مراد پارسائی اور کثرت اولاد ہے تو یہ مطلوب و مستحسن ہے جس طرح حدیثوں میں نکاح کے لیے ترغیب واقع ہوئی ہے۔ فرمایا کہ بہترین امت وہ ہے جس میں عورتوں کی بہتات ہو۔ ساری دنیا قابل استفادہ ہے اور اس کی بہترین متاع نیک بخت عورت ہے۔ جب اسے دیکھے تو وہ اسے خوش کر دے، جب اسے کوئی حکم دے تو وہ بجالائے اور جب وہ گھر سے باہر ہو تو اس کے مال کی حفاظت کرے اور اپنی آبرو کی بھی دوسری حدیث میں آیا ہے کہ مجھے عورتیں پسند ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ کو عورتوں سے زیادہ کوئی چیز پسند نہ تھی مگر گھوڑے، رہی بیٹوں کی محبت تو اگر یہ فخر و غرور کے لیے اس آیت کی وعید میں داخل ہے۔ اور اگر یہ کثرت نسل اور آپ کی امت میں اضافہ کے لیے اللہ کی عبادت کرنے والو اور شرک سے بے زار ہونے والوں کی تعداد بڑھے یہ قابل تعریف اور مستحسن ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ تم زیادہ جننے والیوں اور محبت کرنے والیوں سے نکاح کرو۔ میں قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت پر فخر کر سکوں۔" یہی حال مال کی محبت کا ہے اگر تو یہ فخر و غور اور محتاجوں کو حقیر جاننے کے لیے تو یہ قابل مذمت ہے اور اگر اقارب پر خرچ کرنے اور اطاعت کے لیے ہے تو یہ شرعاً قابل تحسین ہے مفسرین کا قنطار کے بارے میں اختلاف ہے صحیح بات وہی ہے کہ قنطار سے مراد ڈھیر سارا مال ہے۔ کسی نے کہا: ہزار دینار کسی نے کہا بارہ سو دینار، کسی نے بارہ ہزار، کسی نے چالیس ہزار، کسی نے ساٹھ ہزار، کسی نے ستر ہزار، کسی نے اسی ہزار۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ نے فرمایا قنطار بارہ ہزار اوقیہ ہے ہر اوقیہ اس سے بہتر ہے جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ [رواہ احمد، ابن ماجہ] اس حدیث کو موقوفاً روایت کیا ہے۔ یہی صحیح ہے، معاذ بن جبل اور ابن عمر، ابو درداء نے کہا: قنطار بارہ سو اوقیہ ہے۔ حاکم نے کہا: یہ حدیث شرط شیخین صحیح ہے۔ دوسری روایت انس سے مرفوعاً ہے کہ قنطار ہزار دینار ہے۔ [ابن ابی حاتم]

ابو سعید خدری نے کہا قنطار بیل کی کھال بھر سونے کو کہتے ہیں۔ رہا گھوڑے تو اس کی محبت تین طرح پر ہوتی ہے ایک اس لیے پالنا کہ جب جہاد کا موقع آئے تو اس پر سوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کیا جائے ایسے شخص کو ثواب

ملتا ہے دوسرے فخر و غرور کے لیے پالنا، یہ اس کے لیے وبال ہوگا، تیسرے اس لیے پالنا کہ محتاج نہ رہے یا نسل کی بڑھوتری کے لیے پالنا، اللہ کا حق بھی نہ بھلائے یہ اپنے مالک کے لیے پردہ ہے، مُسَوَّمَة سے مراد پلے ہوئے گھوڑے مراد ہیں۔ ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، سدی اور ربیع وغیرہ کا یہی قول ہے۔ مکھول نے کہا: یہ پنج کلاں گھوڑے ہیں۔ ابوذرؓ کی مرفوعاً حدیث میں آیا ہے کہ ہر عربی گھوڑے کو ہر صبح دعا کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اے اللہ تو نے مجھے بنی آدم کے حوالے کیا ہے جسے چاہا مجھے اسکو دیا اب تو مجھے اس کے اہل و مال کا پسندیدہ ترین بنادے۔" [رواہ احمد] مویشی سے مراد اونٹ بیل بکری وغیرہ ہیں۔ حرث سے مراد وہ زمین ہے جس میں کوئی درخت لگائیں یا کھیتی باڑی کریں۔ سوید بن ہبیدہ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ "اچھا مال آدمی کا کثیر النسل گھوڑا ہے یا کھجور کے گھنے درخت پھل لانے والے۔" [رواہ احمد]

فائدہ: فتح البیان میں ہے اس روایت میں اللہ تعالیٰ نے دنیا کے مزوں کی حقارت بیان کی ہے اور بے رغبتی دلائی ہے مزین سے مراد اللہ تعالیٰ ہے، اسی کو بخاری نے عمران سے نقل کیا ہے آیت کریمہ ہے: "ہم نے بنایا ہے جو حقیر زمین پر اس کے لیے زینت تاکہ ہم ان کی آزمائش کریں۔" اسی کو مؤید ہے اسی لیے مجاہد نے زَيَّنَ کو بصیغہ معروف پڑھا ہے حسن نے کہا مراد شیطان ہے جس طرح صراحت کے ساتھ آیا۔ "اور شیطان نے ان کے لیے دنیا کے اعمال خوبصورت بنادیئے۔" یہ آیت مذمت میں آئی ہے۔ معتزلہ کے ایک گروہ کا یہی قول ہے لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

لفظ ناس سے مراد تمام لوگ ہیں یعنی جس بنی آدم مشتہیات کو شہوات سے تعبیر کیا ہے تاکہ ان کا مرغوب ہونا معلوم ہو یا بطور حقارت بیان کیا کیونکہ اہل عقل کے نزدیک تمام مشتبہات حیوانی طبائع کی صفات سے ہیں پھر شہوت کبھی جھوٹی ہوتی ہے جیسے: "انہوں نے نماز کو ضائع کیا اور شہوت کے پیچھے پڑ گئے۔ یا جیسے اس میں جو نفس چاہیں گے اور آنکھوں کی لذت ہوگی۔" سدی نے کہا: مقنطرہ سے مضروبہ یعنی سکہ دار چیز ہے ابن جریر نے کہا: مراد یعنی ڈھیر پر ڈھیر، مسومہ وہ گھوڑے ہیں جو سبزہ زار میں چرتے ہیں یا جن کو علامت کے طور پر داغ دیا گیا۔

فائدہ: پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ تمام ٹھاٹھ باٹھ اور چمک دمک اس دار فانی کی رونق ہے۔ اچھا ثواب اللہ کے پاس ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا اے ہمارے رب ہم کیا کریں۔ تب فرمایا: میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتاتا ہوں وہ جنت ہے جس کے نیچے طرح طرح کی نہریں بہتی ہیں۔ کوئی شہد کی کوئی دودھ کی کوئی شراب کی بلکہ اس میں وہ چیز جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی دل پر اس

کا گمان گیا۔ خلود سے مراد ہیشگی ہے وہ اس میں رہیں گے اور اس میں سے کبھی نکلنا پسند نہیں کریں گے۔ بی بیوں کی طہارت سے مراد یہ ہے کہ کسی طرح کی کچیل، بدبو، حیض نفاس نہ ہو گا جس طرح دنیا کی عورتوں میں ہوتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ اللہ ہمیشہ راضی رہے۔ یہ نعمت سب سے بڑی ہو گی سورۃ برأت میں ارشاد ہے: ''یعنی اللہ کا راضی ہونا تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔'' ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور اللہ جنتیوں سے فرمائے گا: اے جنت والو! وہ کہیں گے اے ہمارے رب! ہم حاضر ہیں اور تمام بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے اللہ فرمائیں گے تم راضی ہو؟ وہ عرض کریں گے، ہم کیوں نہ راضی ہوں آپ نے سب کچھ ہمیں عطا کیا ہے۔ اللہ فرمائیں گے: کیا اس سے بھی بہتر چیز میں تم کو نہ دوں؟ وہ عرض کریں گے اس سے بہتر کیا چیز ہوتی ہے۔ فرمائے گا میں تم پر اپنی رضامندی نازل کرتا ہوں میں اب کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔'' [رواہ شیخان بخاری و مسلم]

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٦﴾ الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ ﴿١٧﴾

جو اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم ایمان لے آئے سو ہم کو ہمارے گناہ معاف فرما اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ وہ لوگ ہیں جو (مشکلات میں) صبر کرتے اور سچ بولتے اور عبادت میں لگے رہتے اور (راہِ اللہ میں) خرچ کرتے اور اوقاتِ سحر میں گناہوں کی معافی مانگا کرتے ہیں۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان متقیوں کا ذکر فرمایا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے بڑے ثواب اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ ان کی پہلی صفت صبر ہے، یعنی اللہ کی اطاعت کی پابندی کرتے ہوئے محرمات سے بچتے ہیں۔ دوسری صفت صدق ہے۔ یعنی یہ سچے پکے مومن ہوں۔ اگر یہ سچے نہ ہوتے مشقت والے اعمال نہ کرتے، تیسری صفت قنوت ہے جس کا معنی اطاعت اور عاجزی ہے، چوتھی صفت اہل قرابت اور صلہ رحمی میں اور غریبوں پر اللہ کی رضا کی خاطر مال خرچ کرنا یہ پانچواں وصف اسحار کے وقت استغفار کرنا ہے۔ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا: ''میں تمہارے لیے جلد استغفار کروں گا، پھر سحر ہونے تک تاخیر کی۔'' صحابہؓ کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ نبیؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ جب پچھلی رات کی ایک تہائی باقی رہ جاتی ہے اور اعلان فرماتا ہے کوئی ہے مانگنے والا جس کو میں دوں؟ کوئی ہے دعا کرنے والا جس کی دعا میں قبول کروں؟ کوئی استغفار کرنے والا جسے میں بخشوں؟

یہ بات تہجد پڑھنے والوں کے لیے نہایت آسان ہے یہ لوگ دعا سحر کے اثر سے خوب استفادہ کر سکتے ہیں۔

صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبیؐ نے تمام رات میں وتر پڑھا، رات کے اگلے حصہ میں، درمیانی حصہ اور آخری حصہ میں، پھر سحری کے وقت وتر پڑھنے لگے۔ ابن عمرؓ رات کو نماز پڑھتے اور فرماتے: اے نافع! سحر ہوئی یا نہیں؟ جب وہ کہتا کہ ہو گئی ہے تو صبح تک دعا و استغفار میں معروف رہتے۔[رواہ ابن ابی حاتم] حاطب نے کہا: کہ میں نے ایک شخص کو مسجد کے کونے میں سحر کے وقت یہ دعا کرتے سنا۔ ''اے میرے رب! تو نے حکم کیا میں نے اطاعت کی تیری! یہ وقت سحر ہے مجھے بخش دے دیکھا تو یہ شخص ابن مسعودؓ تھے۔[رواہ ابن مردویہ] انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہمیں حکم تھا کہ جب ہم رات میں نماز پڑھیں تو سحر کے آخری وقت میں ستر بار استغفار کریں۔ [رواہ ابن مردویہ]

فائدہ: اس روایت میں سوال کو مجرد ایمان پر مرتب کیا گیا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مغفرت کے لیے صرف ایمان کافی ہے۔ معتزلہ کا یہ کہنا ہے کہ محض ایمان سے مغفرت کا استحقاق نہیں ہوتا یہ قول مردود ہے کرخی کا بھی یہی قول ہے مستغفرین سے مراد سائلین ہیں یا نمازی جو صبح کی نماز میں حاضر ہوتے ہیں، سعید جریری کہتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا رات کا کونسا وقت افضل ہے؟ انہوں نے کہا: مجھے معلوم نہیں اتنی بات ضرور ہے کہ سحر کے وقت عرشِ الٰہی جنبش کرتا ہے۔ جب رات پلٹا کھاتی ہے اس وقت سے لے کر طلوع فجر تک سحر کا وقت ہوتا ہے۔ راغب نے کہا کہ رات کی سیاہی جب دن کے اجالے سے ملتی ہے تو یہ اجابت کا وقت ہے۔ اکثر لوگ اسی وقت خواب غفلت میں مست پڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے سحر کا ذکر بطور خاص ذکر فرمایا:

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۸﴾ إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ

اللہ تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ جو انصاف پر قائم ہیں وہ بھی (گواہی دیتے ہیں کہ) اس غالب حکمت والے کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہے، اور اہل کتاب نے جو (اس دین سے) اختلاف کیا تو علم حاصل ہونے کے بعد آپس کی ضد سے کیا، اور جو شخص اللہ کی آیتوں کو نہ مانے تو اللہ جلد حساب لینے والا (اور سزا دینے والا) ہے۔ (اے پیغمبر) اگر یہ لوگ تم سے جھگڑنے لگیں تو کہنا کہ میں اور میرے پیرو تو اللہ کے فرمانبردار ہو چکے ہیں، اور

وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾

اہل کتاب اور ان پڑھ لوگوں سے کہو کہ کیا تم بھی (اللہ کے فرمانبردار بنتے اور) اسلام لاتے ہو؟ اگر یہ لوگ اسلام لے آئیں تو بے شک ہدایت پالیں اور اگر (تمہارا کہا) نہ مانیں تو تمہارا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچادینا ہے اور اللہ (اپنے) بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

فائدہ: اللہ پاک نے اس آیت شریف میں گواہی دی سو اس کی گواہی کافی وافی ہے وہ سب گواہوں میں سب سے سچا اور زیادہ انصاف کرنے والا ہے۔ گواہی اس بات کی دی کہ الوہیت کا وہی یکتا سزاوار ہے تمام مخلوق اس کے بندے ہیں۔ اسی کے محتاج ہیں وہ غنی ہے وہ سب سے بے نیاز ہے جیسے ارشاد فرمایا: "لیکن اللہ نے گواہی اس کی دی جو اس نے تجھ پر نازل کیا۔" پھر اپنی گواہی کے ساتھ فرشتوں اور اپنی گواہی کو ملایا۔ اس مقام پر اہل علم کے لیے بڑی خصوصیت ہے ۔ زبیر بن العوام کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو سنا کہ وہ عرفہ میں تھے آپؐ نے مذکورہ بالا تلاوت کی اور کہا: اور میں اس پر اے رب! گواہوں میں سے ہوں [رواہ احمد] ابن ابو حاتم کے الفاظ ہیں "اے میرے رب میں گواہی دیتا ہوں ۔" اعمش نے ایک رات تہجد میں یہ آیت "اللہ کے نزدیک دین اسلام ہے۔" تک پڑھی تو کہا: میں گواہی دیتا ہوں جس بات کی اللہ نے گواہی دی میں یہ گواہی اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ یہ گواہی میری امانت ہے اللہ کے پاس، تین مرتبہ یونہی کہا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز گواہی والے کو لائیں گے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے بندے نے مجھ سے عہد کیا تھا کہ میں سب سے زیادہ الوہیت کا حق دار ہوں اور اس نے یہ عہد نبھایا لہٰذا اسے جنت میں لے جاؤ، مختصراً میں بھی اس جگہ پر گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے دین یہی اسلام ہے۔ اے اللہ! میں نے اس گواہی کو تیرے پاس امانت رکھا تھا تو مجھے بھی بخش دے۔ اللھم آمین.

فائدہ: اس آیت سے یہ نتیجہ نکلا کہ اللہ کے نزدیک اسلام کے سوا کوئی دین قبول نہیں ہے۔ ابن کثیر نے کہا: اسلام کا معنی رسولوں کی اتباع کرنا ہے جس رسول کو اللہ تعالیٰ نے جس وقت بھیجا (اس کی اتباع اسلام تھا)

پھر ان کے بعد محمد ﷺ کو بھیج کر نبوت کا دروازہ بند کر دیا اور تمام راستے بند کر دیئے۔ نبیؐ کا بتایا ہوا راستہ مقرر کیا جو کوئی آپ کی بعثت کے بعد شریعت اسلام کے بعد کسی اور دین پر چلے گا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا جیسے کہ ارشاد ہے: "اور جو کوئی اسلام کے سوا دوسرا دین چاہے پس وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔" اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسلام میں مقبول دین کو منحصر کیا ہے کہ جنہیں پہلے کتاب مل چکی ہے ان کا اختلاف حجت قائم ہونے کے بعد ہوا۔ باہم حسد و بغض کی بناء پر انہوں نے بغاوت کی اور سچے اقوال و افعال کی مخالفت کی پھر فرمایا کہ اللہ

مخالفین سے جلد حساب لے گا اور انہیں اس کی تکذیب کی بنا پر سزا دے گا۔ پھر فرمایا: جو شخص توحید کے بارے میں تجھ سے حجت بازی کرے تو کہہ دیں کہ میں تو موحد ہوں اور جو میری پیروی کرے وہ بھی موحد ہے جیسے کہ اللہ کا ارشاد ہے: "کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے میں علیٰ وجہ البصیرت اللہ کی طرف بلاتا ہوں میں اور جس نے میری اتباع کی۔" پھر آپ کو حکم دیا کہ تم سب لوگوں کو اپنے دین و طریقہ کی طرف بلاؤ اگر وہ آجائیں تو بہتر ورنہ جو کام تمہارا قائم کر چکے کسی کو ہدایت دینا یا گمراہ کرنا اللہ کی مشیت اور حکمت بالغہ پر منحصر ہے۔ ابن کثیر نے کہا کہ اس قسم کی آیات میں نبیؐ کی عمومی بعثت پر صراحتہ دلالت کرتی ہیں یہ عموم کتاب و سنت سے صراحتًا بخوبی ثابت ہے ارشاد ہے: "اے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول ہوں۔" اور ارشاد فرمایا: "بابرکت ہے وہ ذات نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ جہانوں کے لیے ڈرانے والا ہو جائے۔" صحیحین وغیرہ میں متعدد واقعات تواتر سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے اس وقت کی دنیا کے تمام ملوک و امراء عربی اور عجمی امّی اور خطابی کو خطوط لکھے اور ان کو اسلام کی دعوت دی۔

ابو ہریرہؓ سے مرفوعا مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مجھے نہ سنے گا میری امت سے کوئی یہودی نہ نصرانی پھر وہ مر گیا اور مجھ پر ایمان نہ لایا تو وہ دوزخیوں میں ہوگا) [رواہ مسلم و عبد الرزاق] دوسری حدیث میں وارد ہے: (میں مبعوث ہوا ہوں (تمام) گورے اور کالوں کی طرف مجھ سے پہلے نبی اپنی خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا، میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ انسؓ کہتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا نبی ﷺ کے وضو کا پانی رکھتا تھا وہ بیمار ہوا تو آپؐ نے اس کی عیادت کی اس کے سرہانے بیٹھ کر فرمایا: اے فلاں! تو لا اله الا الله کہہ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا باپ خاموش رہا، آپ نے پھر یہی ارشاد فرمایا: اس نے پھر باپ کی طرف دیکھا باپ نے کہا: جو ابو القاسم کہتے ہیں اسے مان لے اس نے کہا: ((لا اله الا الله و انك رسول الله)) آپؐ نے وہاں سے اٹھ کر فرمایا: "سب تعریف اس ذات کے لیے ہے جس نے اسے آگ سے بچالیا۔" [رواہ احمد و بخاری] اس کے علاوہ بہت سی آیات اور احادیث ہیں۔

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ شَهِدَ اللّٰهُ سے مراد یہ ہے کہ اپنی توحید کو بیان کیا۔ بتایا گیا کہ کسی اعرابی سے پوچھا تھا کہ مانع کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ اس نے کہا: مینگنی دلیل ہے اونٹ پر، آثار ہیں چلنے پر دلیل ہے۔ تخت، یہ آسمانوں سے چھوٹا اور ہیکل اس نزاکت اور لطافت سے بنایا ہوا یہ اونچا مرکز کیا چیزیں وجود صانع پر دلیل نہیں ہیں۔ قرآن پاک میں توحید کے بے شمار دلائل ہیں۔ یہ دلیل اس بات پر کہ اصولی دین کے علم والوں کو فضیلت حاصل ہے۔ (دیگر علم والوں پر) اہل علم کا اسی بارے میں اختلاف ہے کہ یہاں اولی العلم سے کون لوگ مراد

ہیں ؟ کسی نے کہا: انبیاء علیہم السلام مراد ہیں، کسی نے کہا: مہاجرین و انصار مراد ہیں، کسی نے کہا: اہل کتاب کے مومنین مراد ہیں۔ مقاتل سے بھی یہی بات کہی ہے، کسی نے کہا سارے اہل ایمان ہیں، یہ قول کلبی کا ہے اور یہی حق ہے اس لیے کہ کسی خاص کو مراد لینے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس آیت میں علماء کی بڑی فضیلت اور اہمیت بیان کی گئی ہے کہ اللہ نے اپنے اور ملائکہ کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے یہاں علماء سے کتاب و سنت والے علماء ہیں کیونکہ توحید کی حقیقت اللہ ہی کے پاس ہے، اس علم کا کیا اعتبار جس میں قرآن و حدیث کا دخل نہ ہو، لا الہ الا اللہ کا تکرار تاکید کے لیے ہے۔ اور اس تکرار کا فائدہ یہ ہے کہ تمام لوگ معلوم کرلیں کہ یہ کلمہ اشرف و اعلیٰ ہے ۔ گویا بندوں کو اشارہ دیا کہ تم اس کلمہ کو بار بار کہا کرو اور جو کوئی اس کے ذکر میں مشغول رہتا ہے گویا وہ افضل عبادت میں مشغول ہے۔ پھر اسلام کو اپنا پسندیدہ دین ٹھہرایا اس لیے کہ اس کی بنیاد توحید پر رکھی گئی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے اسلام کو تمہارے لیے بطور دین پسند فرمایا ہے۔ دین نام ہے جس میں اللہ نے اپنی مخلوق سے اپنی بندگی کا تقاضہ کیا ہے۔ اور اس پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے۔ لفظ اسلام کے معنی سلم میں داخل ہونا ہے اور سلم کہتے ہیں طاعت میں اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ اسلام سے مراد یہاں ایمان ہے۔ اگرچہ اصل میں دونوں متغائیر ہیں جس طرح حدیث جبرئیل میں دونوں کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ یہ حدیث صحیحین میں ہے مگر کبھی ایمان کو اسلام اور اسلام کو ایمان کہلا لیتے ہیں، قران و حدیث دونوں میں محاورہ موجود ہے۔ قتادہ نے کہا: اسلام گواہی دینا ہے لا الہ الا اللہ کی اور اقرار کرنا جسے آنحضرت ﷺ ایمان لائے یہ وہی دین ہے جسے اللہ نے اپنے لیے پسند کیا اور رسولوں کو دے کر بھیجا اور اپنے دوستوں کو بتایا۔ ضحاک کہتے ہی کہ اللہ نے نہیں بھیجا مگر کوئی رسول مگر یہی اسلام دیکر پھر اس آیت میں خبر دی کہ یہود و نصاریٰ کا اختلاف صرف بغاوت کی وجہ سے تھا۔ انہیں علم تھا کہ دین اسلام میں داخل ہونا لازم ہے اس لیے یہ بات ان کی کتابوں میں موجود تھی اس لیے بنی اسرائیل کی زیادہ مذمت کی کیونکہ کتاب آجانے کے بعد اختلاف کرنا بدتر ہوتا ہے۔ اختلاف یہ تھا کہ کسی نے کہا محمد ؐ نبی نہیں ہیں، کسی نے کہا دین اسلام حق نہیں ہے، کسی نے کہا آپ ؐ کی نبوت عرب کے ساتھ مخصوص تھی۔ کسی نے توحید کے بجائے تثلیث کو حق جانا جیسے کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے، کسی نے کہا: عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہود نے کہا: نصاریٰ کچھ نہیں ہیں نصاریٰ نے کہا یہود کچھ نہیں ہیں۔ ابو العالیہ نے کہا: یہ تمام کام انہوں نے طلب دنیا کے لیے کیا تھا تاکہ ملک و سلطنت قائم رہے، پھر انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا، حالانکہ اس سے پہلے وہ علماء تھے پھر اللہ نے ان پر جابر ظالم قسم کے لوگ مسلط کر دیئے۔ اب یہی حال اس امت کا ہے کہ قرآن اور

سنت رسولؐ آجانے کے بعد بہتر فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ گمراہ لوگوں کو جانے دیں خود فرقہ ناجیہ نے چار مذہب بنالیے ہیں۔ ہر مذہب کا پیروکار دوسرے مذہب والے کو بے حقیقت سمجھتا ہے، اپنے مذہب کو حق اور دوسرے کو ناحق جانتا ہے پھر اس مذہبی تعصب کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دوسرے کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ اہل مذاہب کی سب سے زیادہ دشمنی اہل سنت سے ہے اس اختلاف اور بغاوت کا انجام یہ ہوا کہ اہل کفر وفجور اہل اسلام پر غالب آگئے اور اسلام غریب ہو گیا اور دین پر قائم رہنا اس طرح ہو گیا جیسے ہتھیلی پر چنگاری رکھنا۔ حدیث میں وارد ہے کہ جب تم اختلاف کثیر دیکھو تو میری سنت پر چلو اور محدثات اور بدعات سے بچو، جسے اپنا دین وایمان عزیز ہو اس پر لازم ہے کہ قیامت کے قریب تر اس زمانہ میں تمام اختلافات سے بچ کر قرآن وحدیث کو اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑے اور دیگر لوگوں سے کوئی غرض نہ رکھے۔

دل آرا ئے کہ داری دل درو بند   دگر چشم از همه عالم فرو بند

شراب ومحبت کو اپنے دل میں جذب کرلے اور باقی تمام لوگوں سے آنکھیں بند کرلے پھر فرمایا کہ یہود ونصاریٰ باطل شبہات اور غلط تاویلوں سے آپؐ سے محبت کرنا چاہیں تو ان کو صاف بتادیں کہ میں نے تو اپنے دل وزبان اور بدن کو تمام توانائی کے ساتھ اللہ کی ذات کے لیے فرمانبردار ہوں اور اس کا عبادت گذار ہوں اسی طرح میرے ماننے والے بھی خالص موحد فرمانبردار ہیں۔ پھر فرمایا کہ اہل کتاب اور مشرکین اور جوان پڑھ ہیں ان سے کہہ دو کہ تم سب مسلمان ہو جاؤ۔ ابن جریر کا یہی قول ہے۔ زجاج کا کہنا ہے کہ صیغۂ امر ہے جس کا یہاں مطلب تہدید وتنبیہ ہے کہ جب تمہارے پاس اسلام کے واجب ہونے کے دلائل آچکے ہیں تو تم نے ان براہین پر عمل کیا یا نہیں؟ اس لیے کہ ایک منصف شخص پر جب دلیل واضح ہو جاتی تو پھر اسے حق قبول کرنے میں حیل وحجت نہیں ہوتی۔ آگے فرمایا اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو سمجھو کہ انہوں نے دنیا وآخرت کی فلاح پالی ورنہ تمہارا کوئی نقصان نہیں، تمہارا کام پہنچانا تھا سو وہ تم نے کر دیا۔ چاہیں مانیں یا نہ مانیں۔ "آپؐ ان پر داروغہ نہیں۔ ان پر پچھتاوے کے سبب تیری جان نہ چلی جائے۔"

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝٢١ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ۝٢٢

جو لوگ اللہ کی آیتوں کو نہیں مانتے اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں اور جو انصاف کا حکم دیتے ہیں انہیں بھی مار ڈالتے ہیں ان کو دکھ دینے والے عذاب کی خوشخبری سنادو۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہیں اور ان کا کوئی مددگار نہیں (ہوگا)۔

فائدہ: یہ آیت مذمت کرتی ہے اللہ کی طرف سے اہل کتاب کی ان کے گناہوں اور حرام چیزوں کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے انہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا غرور اور عناد کی وجہ سے حق ماننے سے انکار کیا۔ جب انبیاء نے ان کو حق کی تبلیغ کی تو انہوں نے بغیر کسی قصور کے قتل کیا، اسی طرح جو لوگ حق و انصاف کا پرچار کرتے تھے ان کو بھی قتل کیا، نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''کبر یہ ہے کہ حق کا انکار کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔'' ابو عبیدہ ابن الجراحؓ کہتے ہیں کہ: ''میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب کس کو ہوگا؟ آپ نے فرمایا: ''اس شخص کو جس نے کسی نبی کو قتل کیا، یا ایسے شخص کو قتل کیا جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتا تھا۔ پھر مذکورہ بالا آیت پڑھی۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا: بنی اسرائیل نے پہلے پہر ایک دن میں تینتالیس نبی قتل کیے۔ اس پر ایک سو ستر آدمیوں نے ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا، آخری پہر ان کو قتل کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کا ذکر کیا ہے۔ [رواہ ابن ابو حاتم و ابن جریر] ابن مسعودؓ نے کہا: بنی اسرائیل نے دن کے پہلے حصے میں تین سو پیغمبروں کو قتل کیا اور دن کے دوسرے حصہ میں بازار فروشی کا گرم کیا۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ جب انہوں نے حق کے مقابلہ میں تکبر و غرور کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں بدلے دنیا میں ان پر ذلت و رسوائی مسلط کر دی اور آخر میں رسوا کرنے والا عذاب مقرر کیا۔ ان کے اعمال ضبط کیے اور ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ ابن عباسؓ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے یحییٰ علیہ السلام کو حواریوں میں سے بارہ آدمی دے کر بھیجا کہ تم ان کو تعلیم دو، وہ ان کو بھائی کی بیٹی سے نکاح کرنے سے روکتے ایک بادشاہ اپنی بھتیجی کو چاہتا تھا ہر دن اسے ملنے کے بہانے اس کا کوئی نہ کوئی کام کرتا، اس عورت کی ماں نے کہا کہ اب اگر وہ تجھ سے کسی کام کرنے کا پوچھے تو اسے کہنا کہ میرا کام یہ ہے کہ تم یحییٰ بن ذکریاؑ کو قتل کر دو، بادشاہ نے کہا: اس کے علاوہ کوئی کام ہو تو بتاؤ؟ اس نے کہا: بس میرا تو یہی کام ہے بادشاہ نے یحییٰ کو ایک بڑے طشت میں ذبح کیا ایک قطرہ خون کا ان کا زمین پر گرا وہ ہمیشہ جوش مارتا رہتا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو بھیجا ایک بڑھیا نے وہ جگہ ان کو بتائی اس نے اپنے دل میں کہا کہ جب تک وہ خون ٹھہر نہ جائے تب تک میں قتل کرتا رہوں گا۔ پھر ایک دن ایک ہلہ سے ستر ہزار آدمی قتل کر ڈالے تب وہ خون بھی ٹھہر گیا۔

فائدہ: اللہ پاک نے اس آیت میں انبیاء کو قتل کرنے والوں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والوں کے قاتلوں کی ایک ہی سزا تجویز کی جس طرح یحییٰ علیہ السلام کے خون کا بدلہ ستر ہزار افراد مار کر لیا اسی طرح امام حسین رضی اللہ عنہ کا بدلہ لیا، یہی حکم ان لوگوں کا ہے جو اہل حدیث اور قران کے دشمن ہیں، جو کوئی انہیں ذلیل و خوار

کرتا ہے، قتل کرتا ہے اگر دنیا میں وہ بچ بھی گیا تو اس آیت کے مطابق آخرت میں اس کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔ کیونکہ عموم لفظ کا اعتبار ہوتا ہے۔ نہ کہ خاص سبب کا آئمہ سلف کو کیا کیا تکالیف نہیں ہوئیں۔ مگر انہوں نے صبر کیا ان کا انجام اچھا ہوا۔ اور انہیں تکلیف دینے والے برباد ہو گئے۔ (یہ قصہ امام الشیخ الاسلام ابن تیمیہ و حافظ ابن القیم و شوکانی وغیرہ کی کتابوں میں درج ہے)

أَلَمْ تَرَى إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿۲۳﴾ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۲۴﴾ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۵﴾

بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب اللہ (یعنی تورات) سے بہرہ دیا گیا اور وہ (اس) کتاب اللہ کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ (ان کے تنازعات کا) ان میں فیصلہ کردے تو ایک فریق ان میں سے کج ادائی کے ساتھ منہ پھیر لیتا ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ اس بات کے قائل ہیں کہ (دوزخ) کی آگ ہمیں چند روز کے سوا چھو ہی نہیں سکے گی، اور جو کچھ یہ دین کے بارے میں بہتان باندھتے رہے ہیں اس نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ تو اس وقت کیا حال ہو گا جب ہم ان کو جمع کریں گے (یعنی) اس روز جس (آنے کے) میں کچھ بھی شک نہیں اور ہر نفس اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

فائدہ: یہ یہود کا ذکر ہے جو اپنی کتاب پر عمل نہیں کرتے، گناہ پر بڑے دلیر ہیں اور غرور کے ساتھ انکے پہلے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ ہم میں سے کسی گنہگار کو سزا ملی بھی تو وہ گنتی کے سات دن سے زیادہ عذاب نہ بھگتے گا۔ سو اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کو رد کیا، یہ لوگ تورات اور انجیل کے مطابق بھی فیصلے نہیں کرتے، نبی محمد ﷺ کے حکم بھی نہیں مانتے دم دبا کر نکل بھاگتے ہیں، اس میں ان کی مذمت فرمائی، مخالفت اور عناد کا ذکر کیا وہ اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ دنیا کی زندگی سات ہزار سال ہے ہم ہر ہزار کے عوض ایک دن آگ میں رہیں گے، سو یہ بات ان کی اپنی ایجاد کردہ ہے اللہ نے اس کے لیے کوئی دلیل نہیں اتاری اس کے بعد فرمایا کہ اس دن ان کا کیا حال ہو گا یہ بڑے کذاب ہیں انہوں نے انبیاء کو قتل کیا، اللہ پر بہتان تراشی کی، اللہ ان پر یہ تمام معاملہ پوچھے گا اور ان کے قول و فعل کی سزا دے گا اس وقت ان کا سچ و جھوٹ کھل جائے گا۔ فتح البیان میں ان کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ ہمارے باپ دادا بڑے پیغمبر تھے وہ ہمیں بخشوالیں گے۔ سفارشیں کر کے مواخذہ سے

بچالیں گے جس طرح آج کل کے اس امت کے جہلا مرید بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہمارے پیر و مرشد ہمارے لیے کافی ہو جائیں گے ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ میں تیری اولاد کو عذاب نہ دوں گا مگر صرف قسم پوری کرنے کو (ایک آدھ کو ڈالوں گا) قتادہ نے کہا: وہ کہتے تھے کہ: "ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے دوست ہیں۔" ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہم حق پر ہیں تم باطل پر ہو، جس طرح آج کل کے مقلدین کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب حق ہے تمہارا مذہب باطل ہے۔ اللہ کے نبی کا ارشاد سچ ہوا آپؐ نے فرمایا جو کام اہل کتاب نے کیا وہی کام اس امت کے لوگ کریں گے بالکل ذرا ذرا برابر کریں گے۔ (اے اللہ! ہمیں محفوظ فرما)

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۶﴾ تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

کہو کہ اے اللہ (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے، ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے اور بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بے جان پیدا کرتا ہے، اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق بخشتا ہے۔

فائدہ: اس آیت میں تنبیہ کے ساتھ ساتھ اس بات کا ذکر بھی کہ اللہ عزوجل نے جو نبی ﷺ اور اس امت پر جو احسانات کیے ہیں ان کا شکر ادا کریں کہ اس نے بنی اسرائیل سے نکال کر محمد عربی ہاشمی مکی کو خاتم الانبیاء مقرر کیا۔ اور بقدر محاسن جملہ انبیاء میں تھے وہ سب سے نبی آخر الزمان کو عطا کیے اس کے علاوہ ان کو بعض ایسے خصائص عنایت کیے جو پہلے انبیاء کو نہیں دیئے گئے۔ مثلاً ماضی اور مستقبل سے تعلق رکھنے والی غیب کی خبریں آخرت کے حقائق کا انکشاف، مشرق و مغرب میں اسلام کا غلبہ وغیرہ اس سلسلے میں علامہ سیوطی نے دو اہم کتابیں تالیف کی ہیں۔ اول خصائص کبریٰ اور دوسری کتاب انموزج اللبیب، آیت میں بتایا گیا ہے کہ عطاء کرنے والا، روکنے والا، عزت و ذلت دینے والا، مخلوق میں تصرف وغیرہ کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے وہ جو چاہتا ہے کر گذرتا ہے۔ قریش کا رد اس طرح فرمایا: "انہوں نے کہا کہ ان دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل ہوا؟" دوسری جگہ فرمایا: "کیا وہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرنا چاہتے ہیں؟" ان کے بے ہودہ مطالبات اور

خیالات کا یوں رد فرمایا: "اللہ خوب جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنا پیغام بھیجے اور فرمایا: دیکھ ہم نے بعض کو بعض پر کیسے فضیلت عطا کی۔" "رات کو دن میں اور دن کو رات میں لانے کا مطلب یہ ہے کہ ایک کا طول دوسرے کے قصر میں بڑھادیا دونوں کو برابر کر دیا اسی طرح ایک کا قصر دوسرے کے طول میں داخل کر دیا اسی طرح دونوں معتدل ہو گئے یہی حال ہر سال کے موسموں کا ہے۔ ربیع موسم گرما، خریف اور موسم جاڑا، کھیتی کو دانے سے نکالتا اور دانے کو کھیتی سے، گٹھلی سے درخت اور درخت سے گٹھلی یہ سب اللہ تعالیٰ کی کارا گری ہے، مومن کو کافر اور کافر کو مومن سے پھر جسے چاہا بلا حساب دولت عطا کر دی جسے چاہا مالی حالت تنگ کر دی یہ سب اس کی حکمت پر مبنی ہے۔ ابن عباس ؓ نے کہا کہ اللہ کا اسم اعظم جس کے ذریعہ دعاء کی جائے تو دعا قبول ہوتی ہے وہ آیت آل عمران میں ہے: "کہہ اے اللہ! قدیر تک ہے۔" [رواہ الطبرانی] نضر بن شمیل نے کہا: جس نے اللھم کہا: اس نے اللہ کو سارے ناموں سے پکارا۔ معاذؓ نے آپؐ سے اپنے مقروض ہونے کا شکوئی کیا تو آپؐ نے فرمایا یہ آیت پڑھا کرو۔ [رواہ الطبرانی، ابو الدرداء] حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اگر تجھ پر احد کے برابر قرض ہو گا تو اللہ تعالیٰ ادا کر دے گا۔ [رواہ الطبرانی سند جید ہے] خیر کی تخصیص اس لیے ہے کہ مقام دعاء ہے، جب رات چھوٹی ہوتی ہے تو وہ کمی اس کی پوری کر دی جاتی ہے دن پندرہ گھنٹے کا ہو جاتا ہے یہ دن کا انتہائی طول ہے اور رات ۹ گھنٹے کی رہ جاتی ہے۔ یہ کم از کم رات کا دورانیہ ہے یہ اللہ کی عظیم قدرت پر دلیل ہے کہ جو اتنے بڑے بڑے کاموں پر قادر ہے وہ کیا نہیں کر سکتا کہ ملک و سلطنت عجم کے ہاتھ سے نکال کر عرب کے حوالے کر دے عجم ذلیل ہو جائے اور عرب کو عزت ملے۔ کسی نے کہا: و لوج سے اس جگہ مراد ایک دوسرے کا تعاقب کرنا ہے ایک کا آنا دوسرے کا جانا گویا ولوج ہے ابن مسعود نے کہا: گرمی کو جاڑے سے جاڑے کو گرمی سے نکالتا ہے۔ حیوان کو نطفے سے نکالتا ہے نطفہ حیوان سے نکالتا ہے، مومن بندہ زندہ دل ہوتا ہے کافر مردہ دل جیسے ارشاد ہے: "کیا جو مردہ تھا پس ہم نے اسے زندہ کر دیا۔" عبید اللہ بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ خالدہ بنت اسود بن عبد یغوث نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا کون؟ اس نے کہا: خالدہ۔ آپؐ نے فرمایا: "اللہ پاک ہے جو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے۔" "یہ عورت نیک بخت تھی اور اس کا باپ کافر تھا۔ (رواہ عبد الرزاق وابن سعد وغیرہ) حساب کا لفظ قرآن میں تین معانی کے لیے آیا ہے ایک تعجب جیسے: "جسے چاہتا ہے بغیر حساب روزی عطاء کرتا ہے۔" دوسرے عدد جیسے: "بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا۔" تیسرے مطالبہ جیسے "تو ان پر احسان کر یا ان کو روک لے بغیر حساب کے۔" اس جگہ پہلا اور دوسرا معنی مراد ہے۔ "نہ پکڑیں مومن کافروں کو دوست مومنوں کے سوا اور جو کوئی ایسا کرے تو اللہ کے ہاں اس کا کچھ

وزن نہیں ہے مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ کرو اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ کی طرف پلٹنا ہے۔"

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ﴿٢٨﴾

مومنوں کے سوا کافروں کو دوست نہ بنائیں، اور جو ایسا کرے گا اس سے اللہ کا کچھ (عہد) نہیں ہاں اگر اس طریق سے تم ان (کے شر) سے بچاؤ کی صورت پیدا کرو (تو مضائقہ نہیں) اور اللہ تم کو اپنے (غضب) سے ڈراتا ہے، اور اللہ ہی کی طرف (تم کو) لوٹ کر جانا ہے۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس بات سے روکا ہے کہ وہ کافروں کے دوست نہیں اہل ایمان کو چھوڑ کر ان سے پوشیدہ دوستی رکھیں پھر فرمایا جو کوئی ایسا کرے تو اللہ اس سے بری ہے۔ جیسے کہ ارشاد ہے: "ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم ان کے پاس محبت کا پیغام بھیجتے ہو وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔........." پھر فرمایا: "ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ یہ باہم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو کوئی ان کو دوست بنائے وہ انہیں میں سے ہے۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو (کفر کا) فتنہ پھیلے گا اور زمین میں بڑا فساد ہو گا" ان آیات میں عموماً و خصوصاً غیر اہل اسلام سے دوستی کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں تم ان سے دوستی کر کے کیوں گمراہی اور فتنہ و فساد کے گڑھے میں گرتے ہو مگر اہل اسلام نے اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے پھر فرمایا کہ کسی علاقے یا حالات میں ان کے شر و فساد کا اندیشہ ہو تو ظاہر میں ان سے بچے اور دل میں ان کی دوستی اور خیر خواہی نہ ہو۔ بخاری میں ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "ہم بعض لوگوں کے سامنے خوشی کا اظہار کرتے تھے اور دل ان پر لعنت کرتے تھے" ثوری نے ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ تقیہ عمل سے نہیں بلکہ زبان سے ہوتا ہے۔ اسی لفظ کو عوفی نے ابن عباسؓ سے بھی روایت کیا ہے کہ (تقیہ زبان سے ہوتا ہے) ابو العالیہ ابو الشعثاءؒ ضحاک ربیع بن انس کا بھی یہی قول ہے۔ ابن کثیر نے ان کی تائید میں اس آیت کو بتایا ہے "جس نے اپنے ایمان میں اللہ کے ساتھ کفر کیا مگر جو مجبور کر دیا اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہے۔" بخاری نے حسن سے روایت کی ہے (تقیہ قیامت تک رہے گا)

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ یہ آیت کفار سے دوستی اور معاشرت سے منع کرتی ہے جیسے قرابت یا محبت وغیرہ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اپنے سوا ان کو دلی دوست نہ بناؤ۔" خواہ یہ دوستی مستقل طور پر ہو یا مشترکہ طور پر کہ مسلمانوں سے بھی میل جول رہے اور کافروں سے علیک و سلیک یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اللہ سے دوستی

اور کفار سے محبت ایک دوسرے کی نہیں یہ دونوں جمع نہیں ہو سکتیں۔ تقاۃ مشتق ہے وقایہ سے تقویٰ اور تقی ایک چیز سے تقاۃ و تقیہ ایک بات سے اس سے معلوم ہوا کہ حالت خوف میں زبانی دوستی بنانا جائز ہے۔ دل سے ان کا دوست نہ ہو ورنہ پھر یہ بھی انہی میں ہو جائے گا۔ سلف کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اسلام کے مضبوط ہو جانے کے بعد اب تقیہ باقی نہ رہا۔ اگر کسی شخص سے کوئی گناہ کی بات کہلائیں اور وہ لوگوں کے خوف سے ایسی بات کہہ دے تو اس کا دل ایمان و مطمئن ہو تو اسے ایسی بات کہنا اسے نقصان نہ دے گی۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ کہ اللہ نے مسلمانوں کو منع کیا ہے کہ وہ ان سے محبت کا اظہار کریں اور مومنوں کو چھوڑ کر ان سے خفیہ دوستی کریں۔ ہاں، اگر کافر مسلمانوں پر غالب آجائیں تو ان سے اظہار چاہت کر سکتا ہے مگر دین میں ان کی مخالفت کرے گا مگر یہ نہ کرے کہ کسی خون یا حرام مال کو حلال سمجھ لے یا مسلمان عورتوں پر کافر غالب آجائیں تو ایسے وقت ان سے بچاؤ کرنا منع نہیں ہے تقیہ نہیں ہوتا مگر یہ اسی وقت ہے جب کہ قتل کا خوف نیت کی سلامتی کے ساتھ ہو۔ تقیہ رخصت ہے واجب نہیں ہے۔ اگر صبر کیا اور مارا گیا تو اجر عظیم کا مستحق ہوگا۔ ان شاء اللہ ۔ سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں کہ امن کی حالت میں تقیہ نہیں ہوتا تقیہ صرف زمانۂ حرب میں ہوتا ہے۔ تقیہ اس لیے ہوتا ہے کہ آدمی اپنی جان بچا سکے کیونکہ اپنے آپ کو نقصان سے بچانا واجب ہے یہ تقیہ شیعہ کے تقیہ سے مختلف ہے یہ ان کی اصطلاح ہے ورنہ اس طرح کا تقیہ اہل سنت و جماعت کے نزدیک نفاق و کفر ہے پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے خوف دلاتا ہے۔ تاکہ تم وہی کام نہ کر بیٹھو جس سے تم کو روکا گیا ہے۔ اللہ کے حکم کے خلاف کچھ کر بیٹھو یا کفار کے دوست بن جاؤ یا اہل کتاب سے پرانے یرانے گانٹھو ان تمام صورتوں میں تم عذاب کے مستحق ہو جاؤ گے۔ اس آیت میں لفظ نفس کا اطلاق اللہ کی ذات پر بولا گیا ہے جس طرح دوسری جگہ ارشاد ہے: ”تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے نفس میں ہے۔“ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تک پہنچتا ہے اس سے سخت تنبیہ اور شدید وعید ہے کہ دیکھو جن کی دوستی سے تمہیں روکا گیا ہے کہیں تم ان کی دوستی میں مبتلا نہ ہو جانا، سو اللہ کا کہنا سچ ہوا کہ اکثر نام نہاد مسلمان اس بلا میں گرفتار ہیں، کفار کے یار غار اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ: ”اے لوگو! میں اللہ کے رسول کا رسول ہوں، سن رکھو! اللہ کی طرف سے اعلان ہے جنت کی طرف ہو یا جہنم کی طرف۔“

قُلۡ إِنۡ تُخۡفُوا مَا فِي صُدُورِكُمۡ أَوۡ تُبۡدُوهُ يَعۡلَمۡهُ اللّٰهُ وَيَعۡلَمُ مَا فِي

(اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ کوئی بات تم اپنے دلوں میں مخفی رکھو یا اسے ظاہر کرو اللہ اس کو جانتا ہے اور جو کچھ آسمانوں

السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

میں اور جو کچھ زمین میں ہے اس کو سب کی خبر ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس دن ہر شخص اپنے اعمال کی نیکی کو موجود پالے گا اور ان کی برائی کو بھی (دیکھ لے گا) تو آرزو کرے گا کہ اے کاش اس میں اور اس برائی میں دور کی مسافت ہو جاتی، اور اللہ تم کو اپنے (غضب) ∘ سے ڈراتا ہے، اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔

فائدہ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چھپی اور ظاہر ہر چیز سے واقف ہے، اس کا علم تمام حالات، زمانے پر محیط ہے، آسمانوں وزمین کی ذرہ برابر بھی کوئی اس کے علم سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے اس کی قدرت سب میں نافذ ہے اس میں بندوں کو یہ بھی تنبیہ فرمائی ہے کہ انسان اللہ کا خوف رکھیں اور اس کی کسی نافرمانی کے مرتکب نہ ہوں جس چیز کو اللہ دشمن قرار دیتا ہے اس کے پاس تک نہ پھٹکیں اللہ عزت والا صاحب اقتدار ہے، اسی لیے فرمایا کہ قیامت کے دن ہر بندہ اپنے اچھے برے عمل کو دیکھ لے گا۔ جیسے ارشاد فرمایا: "اس روز ہر انسان پالے گا جو اس نے اچھے اعمال آگے بھیجے اور جو کچھ اس نے پیچھے چھوڑا۔" یعنی اپنے اچھے اعمال پر خوش ہو گا اور برے اعمال پر پچھتائے گا۔ اپنے اور اپنے برے اعمال کے درمیان لمبے فاصلے کی تمنا کرے گا۔ اپنے شیطان سے بے زاری کا اعلان کرے گا جس نے اسے ان برائیوں پر اکسایا اور لگایا اور کہے گا: "کاش! میرے اور تیرے درمیان بعد المشرقین ہو سو یہ بہت ہی برا ساتھی ہے۔" پھر بندوں کو تنبیہ فرمائی کہ میری پکڑ سے بچتے رہنا دوسری طرف اپنے بندوں کو امید دلائی کہ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونا کیوں کہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ﴿۳۲﴾

(اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کردے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ کہہ دو کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو، اگر نہ مانیں تو اللہ بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

فائدہ: یہ آیت فیصل ہے ہر اس شخص پر جو خدا کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن محمدی راستہ سے ہٹا ہوا ہے۔ تو ایسے شخص کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ صحیحین میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "جس نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس پر ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ کام مردود ہے اسی لیے کہ اگر تم اللہ سے دوستی چاہتے ہو تو میری تابعداری کرو، تمہیں تمہاری چاہت سے

زیادہ دے گا وہ یہ ہے کہ خود اللہ تم کو دوست بنالے گا۔" بعض علماء کا کہنا ہے کہ محبت ہونا بڑی بات نہیں لطف یہ ہے کہ محبوب ہو۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوع روایت ہے: "دین میں اصل چیز الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ہے۔" ابوزرعہ نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔ انکار اس طرح دور ہو سکتا ہے کہ یہ مضمون دیگر صحیح حدیثوں میں مذکور ہے، پھر اتباع رسولؐ پر مغفرت کا وعدہ دیا گیا ہے اور نافرمانی پر عذاب ہوگا اطاعت کے بغیر محض محبت کا دعویٰ کوئی کام نہ دے گا۔ عام آدمی تو کیا تمام رسول یہاں تک اولی العزم پیغمبر بھی آپؐ کے زمانہ میں ہوتے تو ان کو بھی نبی ﷺ کی اطاعت لازمی تھی۔

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ محبت کا معنی دل کا کسی دوسری چیز کی طرف مائل ہونا ہے اور یہ میلان اسی لیے ہوتا ہے دل نے اس چیز میں کوئی کمال دیکھا ہے، اس لیے اس کی طرف اس کا میلان ہوا ہے۔ زہری کہتے ہیں کہ اللہ اور رسول سے بندے کی محبت یہ ہے کہ وہ دونوں کی اطاعت کرے اللہ کی محبت بندے سے یہ ہے کہ وہ اسے بخش دے۔ حسن کہتے ہیں کہ بعض لوگوں نے آنحضرت سے عرض کیا کہ ہم اللہ کو چاہتے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [رواہ ابن جریر و غیرھما] عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ شرک اپنی چال میں اس چیونٹی سے بھی زیادہ مخفی ہے جو اندھیری رات میں پتھر پر چلتی ہے۔ ادنیٰ شرک یہ ہے کہ تو ذرا سی سخاوت پر کسی کو دوست رکھے اور ذرا سے انصاف پر کسی سے دشمنی رکھے۔ دین اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی راہ میں دوستی اور دشمنی رکھی جائے۔ [رواہ ابو نعیم و الحاکم] بعض نے کہا کہ یہ آیات یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئیں جو کہ کہتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں، کسی نے کہا کہ قریش کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو کہ کہتے تھے کہ ہم بتوں کو اللہ کی محبت کے لیے پوجتے ہیں تاکہ وہ ہمیں اللہ سے ملادیں۔ لیکن اس آیت کا مضمون عام رکھنا ہی بہتر ہے۔ اس آیت میں اتباع سنت کے لیے ترغیب دی گئی ہے۔ اس میں تقلید ترک کرنے کا بھی اشارہ ہے کیونکہ مغفرت کا وعدہ اتباع سنت پر اور جہاں اتباع قرآن و سنت سے مغفرت کا وعدہ ہے وہاں عام اتباع پر مغفرت بھی نہ ہوگی۔ پھر عام اعلان فرمایا کہ تم اللہ اور اس کے رسول کے مطیع ہو جاؤ۔ جس سے معلوم ہوا کہ مقلد اللہ اور رسول کا متبع نہیں ہوتا ہے کیونکہ اس نے اللہ اور رسول کے مقابلے میں بغیر کسی نص کے غیر کی اطاعت کی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٣﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾	اللہ نے آدم اور نوح اور خاندان ابراہیم اور خاندان عمران کو تمام جہان کے لوگوں میں منتخب فرمایا تھا۔ ان میں سے بعض بعض کی اولاد تھے، اور اللہ سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔ ....

فائدہ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اللہ نے ان خاندانوں کو تمام اہل زمین پر پسند کیا پہلے آدم علیہ السلام تھے، ان کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا ان میں اپنی روح پھونکی، ہر چیز کا ان کو نام بتایا، جنت میں بسایا پھر وہاں سے زمین پر اتارا کسی حکمت کے تحت، دوسرے مصطفیٰ نوح علیہ السلام تھے۔ انہیں سب سے پہلے رسول بنا کر اہل زمین کے لیے بھیجا سب لوگ بت پرست تھے، وہ رات دن لوگوں کو توحید کی طرف بلاتے رہے جب لوگ نہ مانے تو اللہ نے ان سے انتقام لیا اور آپ کے ماننے والوں کے سوا سب کو ڈبو دیا، تیسرے مصطفیٰ ابراہیم خلیل علیہ السلام ہیں، انہیں کی نسل سے ہمارے خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، عمران سے مراد اس جگہ مریم ام عیسیٰ کے باپ ہیں یہی قول محمد بن اسحاق سے ہے، ان کا شجرہ نسب سلیمان بن داؤد علیہ السلام سے ملتا ہے، موضح القرآن میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی عمران ہے۔ فتح البیان میں ہے کہ اصطفاء کے معنی اختیار کے ہیں جو مشتق ہے صفوۃ سے، ہر چیز کے خالص کو صفوۃ کہتے ہیں۔ زجاج نے کہا: اللہ نے ان کو نبوت کے لیے سارے جہاں میں چن لیا، آدم علیہ السلام ابو البشر ہیں اس لیے پہلے ان کا نام لیا پھر نوح علیہ السلام کا نام لیا کیونکہ وہ آدم ثانی ہیں پھر ابراہیم کا ذکر کیا وہ آدم ثالث ہیں۔ ابو سلیمان دمشقی نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام کا نام سکن تھا وہ نوحہ بہت کیا کرتے اس لیے نوح کہلائے آدم علیہ السلام نو سو ساٹھ برس جئے نوح علیہ السلام ادریسؑ کی نسل سے تھے۔ ان کے ادریس کے درمیان دو واسطے تھے اس لیے یہ لملک کے بیٹے ہیں لمک بیٹی ہے، متوشلخ کے وہ بیٹے ہیں۔ اخنوغ (یہ نام ہے ادریس کا) کے نوح علیہ السلام ایک ہزار پچاس برس زندہ رہے، نحوی کہتے ہیں کہ نوح عجمی نام ہے مشتق نہیں ہے آل ابراہیم سے خود ابراہیم مراد ہیں یا اسماعیل و اسحٰق اور یعقوب مراد ہیں یا وہ لوگ جو ان کے دین پر تھے، دوسرا قول بہتر ہے اس لیے کہ ابراہیم کو دو شاخوں کی بنیاد کہا۔ اسماعیل کو عرب ٹھہرایا، انہیں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں سو آپؐ بھی اصطفاء میں داخل ہیں۔ اسحاقؑ بنی اسرائیل کی بنیاد قرار دیا ان میں ملک اور نبوت صلی اللہ علیہ وسلم تک رہا پھر آپؐ کی امت کو قیامت تک ملک دیا۔ ابراہیم ایک سو ستر برس تک زندہ رہے۔ آل عمران سے مراد والد موسیٰ و ہارون ہیں وہ سلیمان علیہ السلام کی اولاد سے ہیں یا مریم کے والد ہیں۔ دوسرا قول بہتر ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام و مریم علیہا السلام کا قصہ بیان کیا دونوں عمرانوں کے درمیان ایک ہزار آٹھ سو برس گذرے، عمران اول و یعقوبؑ کے درمیان تین دادے گذرے ہیں اور دوسرے عمران اور یعقوب کے درمیان تین دادے تھے۔ عمران عجمی اسم ہے کسی نے کہا عربی ہے جو عمر سے مشتق ہے دونوں صورتوں میں یہ نام غیر منصرف ہے اس میں علمیت و عجمیت دو اسباب پائے جاتے ہیں یا ان کی زیادتی سبب ہے ذریت کا لفظ ہے اصول و فروع دونوں پر استعمال ہوتا یہاں تک کہ آدم علیہ السلام تک کو بھی شامل ہے۔ بعض کا بعض سے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ دین کے معاملے میں ایک

دوسرے کے حامی وناصر ہیں قتادہؒ نے کہا! نیت عمل، اخلاص اور توحید میں یہ مشترک ہیں، ابن عباسؓ کہتے ہیں آل ابراہیم، آل عمران، آل یاسین اور آل محمد ﷺ سے مراد ہے۔

فائدہ: اس امت میں دستور تھا کہ ماں باپ اپنے بعض لڑکوں کو اپنے حق سے آزاد کر کے ان کو اللہ کی نیاز کر دیتے تھے پھر تمام عمر انہیں دنیا کے کسی کام میں نہ لگاتے وہ ہمیشہ مسجد میں عبادت گذار رہتے، عمران کی عورت کو حمل تھا اس نے پہلے سے ہی یہی نذر مان رکھی تھی جب اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو وہ مایوس ہوئی کہ میری نذر پوری نہ ہوئی کیونکہ دستور لڑکے کی نذر کا تھا۔ اللہ نے فرمایا کہ اللہ خوب جانتا ہے یعنی اگرچہ وہ بیٹی ہے مگر بیٹے سے بہتر ہے۔

فائدہ: عمران کی عورت کا نام حنہ بنت فاقوذ تھا، یہ والدہ مریم علیہا السلام کی، ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ان کو حمل نہ ٹھہرتا تھا، ایک دن ایک پرندے کو دیکھا جو اپنے بچے چگا رہا ہے ان کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی ، انہوں نے اللہ سے بچہ مانگا دعاء قبول ہوئی، شوہر سے محبت ہوئی تو حمل ٹھہر گیا تو نذر مانی کہ میں اسے دنیا سے آزاد کر کے خالص تیری عبادت کے لیے وقف کروں گی وہ بیت المقدس کی خدمت کیا کرے گا، اسے معلوم نہ تھا کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی ہے۔ جب اس نے جنم دیا تو میں نے اسے لڑکی جنم دیا ہے۔ وَضَعَتْهَا میں تا اگر مرفوع ہے تو یہ عمران کی بیوی کا قول ہے اور تا ساکن ہے۔ تو یہ اللہ کا قول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قوت عبادت اور معبد کی خدمت کے لیے لڑکی لڑکے کے برابر نہیں ہو سکتی، پھر اس بچی کا نام مریم رکھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ولادت کے دن بچے کا نام رکھنا جائز ہے۔ یہ پہلی شریعت میں تھا حدیث میں مرفوع آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "آج رات میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے اور میں نے اس کا نام اپنے باپ ابراہیمؑ کے نام پر رکھا ہے۔" [اخرجہ الشیخان] صحیحین میں یہ بھی روایت ہے کہ انس بن مالک اپنے بھائی حسین کو جو نوزائیدہ تھے کو لے کر آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپؐ نے اسے گڑھتی دی اور اس کا نام عبد اللہ رکھا۔ بخاری میں ہے کہ ایک شخص آپؐ کے پاس آیا اور عرض کیا آج رات میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے اس کا نام کیا رکھوں؟ آپؐ نے فرمایا تو اس کا نام منذر رکھ دے۔ سمرہ بن جندب سے مرفوع آیا ہے کہ بچہ اپنے عقیقہ میں گروی ہوتا ہے ساتویں دن جانور ذبح کریں اور نام رکھیں۔ [رواہ احمد وصحیح الترمذی] دوسری روایت میں نام کے بجائے خون بہانا ہے جو کہ زیادہ صحیح ہے۔ پھر اللہ نے بچے کو شیطان کے شر سے بچانے کے سلسلہ میں مریم کی والدہ کی دعا قبول کی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوع آیا ہے کہ دنیا میں کوئی بچہ ایسا نہیں جسے ولادت کے وقت شیطان نہ چھوتا ہو مگر مریم اور ان کا بیٹا۔ پھر ابو

ہریرہؓ کہتے ہیں کہ اگر تم چاہو تو آیت پڑھ لو: اِنِّیٓ اُعِیۡذُهَا بِكَ .... الخ [رواہ الشیخان] دوسری روایت ایک دو بار شیطان کا مسکن آیا ہے تیسری روایت میں کہ شیطان بچے کے پہلو میں کچوکے دیتا ہے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام بن مریم شیطان سے محفوظ رہے۔

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ مریم کی والدہ عیسیٰ علیہ السلام کی نانی ہیں، عمران بن ماثان ان کے نانا ہیں وہ نبی نہ تھے، نانی نانا دادا دادی کے حکم میں ہے۔ اس حنہ کو حمل ٹھہرا تھا کہ عمران مر گئے۔ مریم کے معنی خادم کے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ اگر وہ کنیسہ کی خدمت کے لائق نہیں تو عابدہ ہی سہی۔ رجیم کے معنی ہیں مردود پھٹکارا ہوا۔ سلیمان جمل کہتے ہیں کہ یہاں یہ مشکل ہے کہ ظاہر آیت سے نکلتا ہے کہ انہوں نے استعاذہ وضع حمل کے بعد کیا حالانکہ شیطان کا عمل ولادت کے بعد فوراً ہوتا ہے۔

إِذۡ قَالَتِ امۡرَأَةُ عِمۡرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرۡتُ لَكَ مَا فِي بَطۡنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلۡ مِنِّيٓۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الۡعَلِيمُ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا وَضَعَتۡهَا قَالَتۡ رَبِّ إِنِّي وَضَعۡتُهَآ أُنثَىٰ وَاللَّهُ أَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡ وَلَيۡسَ الذَّكَرُ كَالۡأُنثَىٰۖ وَإِنِّي سَمَّيۡتُهَا مَرۡيَمَ وَإِنِّيٓ أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيۡطَٰنِ الرَّجِيمِ ﴿٣٦﴾

(وہ وقت یاد کرنے کے لائق ہے) جب عمران کی بیوی نے کہا کہ اے پروردگار جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے میں اس کو تیری نذر کرتی ہوں اسے دنیا کے کاموں سے آزاد رکھوں گی تو (اسے) میری طرف سے قبول فرما تو تو سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔ جب ان کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور جو کچھ ان کے ہاں پیدا ہوا تھا اللہ کو خوب معلوم تھا، تو کہنے لگیں کہ پروردگار! میرے تو لڑکی ہوئی ہے اور (نذر کے لیے) لڑکا (موزوں تھا کہ وہ) لڑکی کی طرح (ناتواں) نہیں ہوتا اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

فائدہ: موضح القرآن میں ہے کہ ان کے والدین نے خواب دیکھا کہ اگرچہ یہ لڑکی ہے مگر اللہ نے یہی نیاز قبول کی، یہ اسے مسجد میں لے جاؤ چنانچہ اسے مسجد میں لے گئے مسجد کے بزرگوں نے کہا: لڑکی رکھنے کا دستور نہیں ہے، اس کے لیے الگ حجرہ بنا دیا۔ دن کو وہاں عبادت کرتیں رات کو زکریاؑ ان کو اپنے گھر لے جاتے کیونکہ زکریا کی بیوی ان کی خالہ تھیں ان سے یہ کرامت دیکھی کہ بے موسم کے پھل اللہ کی طرف سے آتے تب زکریا جو ساری عمر اولاد سے ناامید تھے اب انہیں بھی امید ہو چلی کہ شاید مجھے بھی بے موسم میوہ ملے، اللہ سے اولاد کی دعاء کی۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اللہ نے خبر دی کہ ہم نے مریم کو نذر میں قبول کیا، اچھی شکل وخوبصورت پرورش کی

، نیک لوگوں میں پہنچایا وہ ان سے علم وغیرہ کی تعلیم حاصل کرنے لگی۔ اسی لیے فرمایا: کہ "ہم نے اسے زکریاؑ کے سپرد کر دیا۔" صحیح میں آیا ہے کہ یحییٰ اور عیسیٰ خالہ زاد بھائی تھے اسی لیے مریمؑ اپنی خالہ کی گود میں پرورش پاتی تھیں۔ صحیح میں وارد ہے کہ آپ ؐ نے حکم دیا کہ عمرہ بنت حمزہ کو اس کی خالہ جعفر بن ابو طالب کی بیوی پالے کیونکہ خالہ بمنزل ماں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام کی عبادت و بزرگی کا ذکر فرمایا کہ وہ عبادت میں ایسی مستعد تھیں کہ جب زکریا علیہ السلام ان کے پاس جاتے تو وہاں رزق موجود پاتے مجاہد عکرمہ وغیرہ نے کہا کہ گرمی کا پھل جاڑے میں اور جاڑے کا میوہ گرمی میں موجود ہوتا، مجاہد کا قول ہے کہ رزق سے مراد یہاں علم ہے یا علم کے صیغے ہیں مگر پہلا قول صحیح تر ہے اس آیت میں کرامات اولیاء پر دلیل ہے۔ سنت میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جامیؒ نے "کتاب شواھد النبوہ" میں صحابہ کرام و اہل بیت سے بہت سی مثالیں نقل کی ہیں۔ زکریا اس رزق کو دیکھ کر کہتے کہ یہ کہاں سے آیا؟ تو وہ کہتیں اللہ کے پاس آیا ہے، وہ جسے چاہے بلا حساب رزق عطا فرمادے۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے کئی روز تک کچھ نہ کھایا پیا، بہت بھوک لگی تھی، بیبیوں کے گھر گئے وہاں بھی کچھ نہ پایا، فاطمہؓ کے گھر گئے ان سے فرمایا تمہارے پاس کچھ ہے؟ انہوں نے کہا: میں اور میری ماں آپ ؐ پر قربان ہو جائیں گھر میں کچھ بھی نہیں۔ وہاں سے باہر نکلے ایک ہمسائی عورت نے دو روٹیاں اور ذرا سا گوشت بھیجا، فاطمہؓ نے سالن رکابی میں ڈالا اور کہا کہ اپنی جان اور تمام لوگوں پر آپ ؐ کو ترجیح دوں گی حالانکہ وہ تمام بھوکے اور ضرورت مند تھے۔ پھر حسن اور حسین کو بھیج کر آپ ؐ کو بلایا۔ اور عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اللہ نے کچھ بھیج دیا ہے۔ میں نے آپ ؐ کے لیے اسے چھپا رکھا ہے۔ فرمایا: اے بیٹی لاؤ وہ ہانڈی رکابی اٹھا لائیں تو دیکھا کہ وہ روٹی گوشت سے پر ہے۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گئیں انہیں معلوم ہوا کہ یہ اللہ کی طرف سے برکت ہے، اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ کہا اور آپ ؐ پر درود شریف بھیجا اور کھانا آپ ؐ کے سامنے رکھ دیا۔ آپ ؐ نے دیکھ کر اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ کہا: پوچھا یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا ہے؟ عرض کیا: اے باپ! "یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق عطاء کرتا ہے۔" آپ ؐ نے فرمایا: "تمام تعریف اس ذات کی ہے جس نے تجھے بنی اسرائیل کی عورتوں کی سردار کی مانند بنایا جنہیں جب اللہ کی طرف سے رزق ملتا تھا اور پوچھا جاتا تھا تو وہ کہتی یہ اللہ کی طرف سے ہے۔" پھر آپ ؐ نے علیؓ کو بلایا۔ علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ اور تمام ازواج و اہل بیت نے کھانا کھایا سب کا پیٹ بھر گیا فاطمہؓ کہتی ہیں کہ وہ ہانڈی رکابی اسی طرح پر رہی میں نے تمام ہمسائیوں کو اس سے دیا اللہ نے اس میں خیر و برکت دی۔ [رواہ ابو یعلیٰ]

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ تو پروردگار نے اس کو پسندیدگی کے ساتھ قبول فرمایا اور

وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا قَالَ يَامَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

اسے اچھی طرح پرورش کیا اور زکریا کو اس کا متکفل بنایا، زکریا جب کبھی عبادت گاہ میں اس کے پاس جاتے تو اس کے پاس کھانا پاتے (یہ کیفیت دیکھ کر ایک دن مریم سے) پوچھنے لگے کہ مریم یہ کھانا تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے، وہ بولیں اللہ کے ہاں سے (آتا ہے) بے شک اللہ جسے چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ کفلھا کو اکفلھا بھی پڑھا ہے یعنی زکریاؑ، مریمؑ کے کفیل بن گئے، زکریاؑ، سلیمانؑ کی اولاد میں سے تھے ابن عباس اور مجاہد و صحابہ کی ایک جماعت نے کہا کہ مریم بنی اسرائیل کی سردار و صاحبزادی تھیں۔ چنانچہ تمام احبار ان کی کفالت کرنا چاہتے تھے۔ آخر کار قرعہ اندازی ہوئی۔ زکریا علیہ السلام نے ان کے خالو تھے قرعہ بھی ان کے نام نکلا وہی کفیل ٹھہرے۔ بعض نے کہا کہ زکریاؑ نے ان کے لیے ایک الگ اونچی محراب بنائی تھی۔ جس پر سیڑھی لگا کر جانا ہوتا تھا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ وہ رزق انگور تھا بیوقت ضرورت ایک کارتون میں آجاتا تھا۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ قَالَ كَذَٰلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَل لِّي آيَةً قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا وَاذْكُر رَّبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

اس وقت زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا کی (اور) کہا کہ پروردگار مجھے اپنی جناب سے اولاد صالح عطا فرما، تو بے شک دعا سننے والا (اور قبول کرنے) والا ہے۔ وہ ابھی عبادت گاہ میں کھڑے نماز ہی پڑھ رہے تھے کہ فرشتوں نے آواز دی کہ (زکریا) اللہ تمہیں یحییٰ کی بشارت دیتا ہے جو اللہ کے فیض (یعنی عیسیٰ) کی تصدیق کریں گے اور سردار ہوں گے اور عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والے اور (اللہ کے) پیغمبر (یعنی) نیکو کاروں میں ہوں گے۔ زکریا نے کہا اے پروردگار میرے ہاں لڑکا کیونکر پیدا ہوگا کہ میں تو بڈھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے، اللہ نے فرمایا اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ زکریا نے کہا کہ پروردگار میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما اللہ نے فرمایا نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے تین دن اشارے کے سوا بات نہ کرسکو گے تو (ان دنوں میں) اپنے پروردگار کی کثرت سے یاد اور صبح و شام اس کی تسبیح کرنا۔

فائدہ: موضح القرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ کے حکم کی گواہی دے گا یعنی مسیح علیہ السلام کے پیدا ہونے سے حضرت یحیٰی ان کے پیدا ہونے کی خبر دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کو اللہ نے خطاب دیا۔ اپنے حکم 'مکا یعنی محض اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے بغیر باپ کے پھر جب یحیٰی علیہ السلام ماں کے پیٹ میں پڑے تو حضرت زکریا کی تین روز تک یہ حالت رہی کہ کسی سے بات نہ کر سکتے تھے اس وقت ان کی عمر سو برس تھی ان کی بیوی کی عمر ۹۸ برس تھی انہیں دنوں حضرت عیسیٰ، مریم کے پیٹ میں پیدا ہوئے۔

فائدہ: ابن کثیر کہتے ہیں کہ جب زکریا نے دیکھا کہ مریم کے پاس بے موسم کے پھل دیکھے تو اپنی اولاد کی خواہش پیدا ہوئی اگر چہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ بیوی بھی بوڑھی بانجھ تھی۔ اس کے باوجود چپکے سے دعا مانگی اے میرے رب! مجھے اچھی اولاد عطا فرما۔ فرشتوں نے سامنے آکر محراب میں ان سے روبرو کہہ دیا۔ محراب سے مراد وہ جگہ ہے جہاں وہ عبادت کرتے تھے یہاں تک کہہ دیا کہ اس بچے کا نام یحیٰی ہو گا۔ قتادہ نے کہا: یحیٰی اس لیے نام ہوا کہ اللہ نے با ایمان زندہ کیا کلمة الله سے مراد عیسیٰ بن مریم ہیں۔ ربیع بن انس نے کہا: سب سے پہلے جس نے عیسیٰ بن مریم کی تصدیق کی وہ یحیٰی علیہ السلام ہیں۔ قتادہ نے کہا: یحیٰی سنت و منہاج عیسیٰ پر تھے۔ عباس نے کہا یحیٰی اور عیسیٰ علیہ السلام خالہ برادر تھے، یحیٰی علیہما السلام کی والدہ مریم سے کہتی تھیں کہ جو بچا میرے پیٹ میں ہے وہ سجدہ کرتا ہے اسے جو تیرے پیٹ میں ہے، کلمة اللہ عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ یحیٰی علیہ لسلام سے پڑھے تھے۔ عکرمہ نے کہا: سید وہ ہے جو غصے پر کنٹرول رکھے، ابن زید نے کہا: سید شریف آدمی کو کہتے ہیں۔ حصور وہ ہے جو عورت کے پاس نہ جائے، ابن مسعود اور عکرمہ کا یہی قول ہے۔ مجاہد عکرمہ وغیرہ نے کہا کہ حصور وہ ہے جس کے نہ اولاد ہو اور نہ منی ہو، ابن عباس نے کہا وہ ہے جس کا پانی نہ اترے یعنی منزل نہ ہو، ابن عمرو نے کہا: اللہ کی مخلوق میں کوئی ایسا بے گناہ نہیں جس سے وہ ملا ہو سوائے یحیٰی بن زکریا کے۔ پھر سعید بن المسیب نے یہ آیت پڑھی سَیِّدًا وَّ حَصُوْرًا پھر زمین سے کوئی چیز اٹھا کر کہا: حصور وہ ہے جس کا زکر اس چیز کی مانند یعنی بے حس و حرکت ہو، ابن عمرو سے مرفوع ہے کہ جو کوئی اللہ سے ملے گا گنہ گار ہو گا مگر یحیی بن زکریا۔ اللہ نے ان کو سَیِّدًا وَ حَصُوْرًا فرمایا ہے۔ ان کا زکر مثل کپڑے کے پلو کے تھا، پھر اپنی انگلی سے اشارہ کیا۔ ابو ہریرہ کے الفاظ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر ابن آدم اللہ سے گناہ لے کر ملے گا چاہے اسے عذاب کرے چاہے اس پر رحم کرے مگر یحیٰی کہ وہ سَیِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَ نَبِیٌّ تھے۔

﴿نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ میں ایک دوسری بشارت ہے جو پہلی بشارت ولادت سے افضل ہے۔ زکریاؑ کو جب

اس بشارت کا یقین ہو گیا تو اس بڑھاپے میں بیٹے کے وجود سے تعجب کیا، اللہ نے فرمایا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے پھر اس کی دو نشانیاں بتائیں:

* اول یہ کہ تندرست ہونے کے باوجود تین روز تک کسی سے کلام نہ کر سکو گے۔
* دوئم یہ کہ کثرت سے لاالٰہ کی تکبیر و تسبیح کرو گے۔

یہ قصہ سورۂ مریم میں مفصل آئے گا۔ فتح البیان میں ہے کہ نہ زکریاؑ نے یہ دعا مریمؑ کے پاس کی تھی یا اس دعا کی وجہ یہ ہوئی کہ حنہ بانجھ تھی اسے اللہ نے مریم عطا کی تو انہوں نے خیال کیا کہ جس نے اسے بچہ دیا ہے وہ مجھے بھی بڑھاپے میں باوجود بیوی بانجھ ہونے بچہ دے سکتا ہے یا جس نے مریمؑ کو بے موسم کے پھل عطا کیے کیا وہ مجھے بھی بچہ نہیں دے سکتا؟

ذُرّیت نسل کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ واحد ہے سب پر بولا جاتا ہے ملائکہ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ عربی میں جمع کا صیغہ بول کر واحد مراد لینا جائز ہے۔ یا کئی ایک فرشتوں نے پکارا۔ محراب سے مراد مصلی ہے۔ مسجد یحییٰ کا نام پہلی کتابوں میں یوحنا تھا یہ نام عجمی ہے مشتق نہیں ہے کلمۃ اللہ سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں، اس لیے کہ کلمہ کن سے پیدا ہوئے یا جس طرح لوگ کلام اللہ سے ہدایت پاتے ہیں اس طرح ان سے ہدایت پائیں گے یا اگلی کتابوں میں ان کی خبر تھی کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوں گے سو جب پیدا ہوئے تو لوگوں نے کہا یہ وہی کلمۃ اللہ ہیں جس کا وعدہ تھا، ابو عبیدہ نے کہا: کلمہ یعنی کتاب لے کر آئے تھے سب سے پہلے یحییٰ علیہ السلام عیسیٰؑ پر ایمان لائے یہ ان سے تین برس یا چھ ماہ بڑے تھے رفع عیسیٰ سے پہلے مارے گئے سید کہتے ہیں سردار کو یحییٰؑ عورتوں کے پاس نہ جاتے تھے یا جماع کی قدرت ان میں نہ تھی یا آپ شہوت پر کنٹرول رکھتے تھے۔ قاموس نے کہا: حصور وہ ہے جو عورت کے پاس نہ جائے باوجود قدرت ہونے کے یہی معنی یہاں اس جگہ مناسب ہے اس لیے کہ یہاں مدح کا مقام ہے ان کو صالحیں اس لیے کہا کہ وہ انبیاء کی نسل سے تھے یا من جملہ صلحاء میں سے تھے جس طرح فرمایا: ”وہ آخرت میں نیکوں میں سے ہونگے۔“

زجاج کہتے ہیں کہ صالح وہ ہے جو اللہ کے فرائض اور لوگوں کے حقوق ادا کرے بشارت کے بعد زکریا کا استعاذہ اس لیے تھا کہ بشارت پر بیس یا چالیس برس گذر چکے تھے بشارت کے دن نوے برس کے تھے یا ایک سو بیس برس کے، بی بی کی عمر اٹھانوے برس تھی، رمز کہتے ہیں اشارہ کرنے کو ہونٹ، آنکھ، ہاتھ یا ابرو سے، واحدی نے کہا: عشی کہتے ہیں تیسرے پہر کو یعنی زوال آفتاب سے غروب تک، اسی لیے نماز ظہر کو و عصر کو صلاتی العشاء کہتے

ہیں کسی نے کہا عشی عصر سے شروع ہو کر شب تک کو کہتے ہیں مگر یہ قول ضعیف ہے۔ بکرہ کہتے ہیں طلوع فجر سے دوپہر تک کو تسبیح سے مراد اس جگہ نماز ہے یا سبحان اللہ کہنا ہے۔

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ﴿٤٢﴾ يَامَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿٤٣﴾ ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٤٤﴾

اور جب فرشتوں نے (مریم سے) کہا کہ مریم! اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور پاک بنایا ہے اور جہان کی عورتوں میں منتخب کیا ہے۔ مریم اپنے پروردگار کی فرمانبرداری کرنا اور سجدہ کرنا اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنا۔ (اے محمدؐ) یہ باتیں اخبار غیب میں سے ہیں جو ہم تمہارے پاس بھیجتے ہیں، اور جب وہ لوگ اپنے قلم (بطور قرعہ) ڈال رہے تھے کہ مریم کا متکفل کون بنے تو تم ان کے پاس نہیں تھے، اور نہ اس وقت ہی ان کے پاس تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

فائدہ: مسجد کے بزرگوں نے جب مریم کی والدہ کا خواب سنا تو سب کی خواہش ہوئی کہ ہم مریم کی پرورش کریں گے تب سب نے اپنے قلم جس سے تورات لکھتے تھے بہتے پانی میں ڈالے۔ تمام قلم پانی کے بہاؤ پر بہہ گئے، حضرت زکریا کا قلم الٹے بہاؤ پر چلنے لگا، تب مریم کی پرورش زکریا کے ذمہ ٹھہری۔

فائدہ: اس آیت میں خبر دی گئی جو فرشتوں نے مریم علیہا السلام سے کہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں چن لیا ہے جس سے ان کی بزرگی اور عظمت اس زمانے کی تمام عورتوں پر ثابت ہو گئی۔ ابوہریرہؓ سے مرفوعاً ہے کہ (بہترین عورتیں جو اونٹ پر سواری کریں قریش کی عورتیں ہیں اولاد پر بڑی مہربان شوہروں کے مال کی بہترین محافظ) مریم بنت عمران کبھی اونٹ پر سوار نہیں ہوئیں۔ علیؓ کے الفاظ میں ہے کہ نبیؐ نے فرمایا: ”جہاں کی عورتوں میں مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد ہیں، فاطمہ بنت محمدؐ آسیہ زوجہ فرعون۔“ ترمذی اس روایت میں متفرد ہیں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ انسؓ آپؐ سے روای ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ”تمام عورتوں میں بہتر چار ہیں۔ مریمؑ آسیہؑ، خدیجہؓ، فاطمہؓ۔“ [رواہ ابن مردویہ] ایک روایت میں تین ہیں: مریم آسیہ خدیجہ اور عائشہ کی فضیلت تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید تمام کھانوں پر۔ [ابن مردویہ] بخاری شریف کی روایت بھی ایسی ہی ہے۔

قنوت کا معنی طاعت خشوع کے ساتھ ہے۔ ابوسعید سے مرفوعاً ہے کہ قرآن کے جس لفظ میں قنوت کا ذکر

ہے اس سے مراد طاعت ہے۔[رواہ ابن ابو حاتم] مجاہد نے کہا: مریمؑ اتنا قیام کرتیں کہ پاؤں سوج جاتے۔ قنوت رکوع کی طوالت ہے، ہر نماز میں ایسی ہی ادائیگی ہوتی اللہ کے حکم: "اپنے رب کے لیے طاعت کر۔" سجدے کا ذکر رکوع سے پہلے اس لیے کیا کہ سجدہ رکوع سے افضل ہے یا یہ کہ اس وقت ان کے ہاں نماز کی ترتیب نہ تھی، یا واؤ جمع کے لیے ہے نہ کہ ترتیب کے واسطے، سجدہ رکوع سے مراد نماز ہی ہے قنوت سے مراد نماز کی طوالت ہے، اس آیت سے جماعت کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے یا یہ مطلب کہ جسطرح وہ نماز پڑھتے ہیں اسی طرح تم بھی نماز پڑھا کرو ، اگرچہ ان کے ہمراہ کوئی بھی نہ ہو پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ پیغام جو ہم نے آپؐ کی طرف بھیجا ہے یہ غیب کی خبر ہے تم اس وقت وہاں نہ تھے جب وہ لوگ جھگڑا کرتے تھے، مریم کی پرورش کے لیے کون ہو گا؟ بعض لوگوں نے اس آیت سے قرعہ اندازی کے جواز پر استدلال کیا ہے اس مسئلہ میں اختلاف بھی مشہور ہے لیکن قرعہ اندازی کے سلسلے میں صحیح احادیث بھی موجود ہیں، امام شوکانی نے "نیل الاوطار" میں پندرہ مواقع گنوائے ہیں جہاں قرعہ اندازی ہوئی۔

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَامَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٤٦﴾

(وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے) جب فرشتوں نے (مریم سے کہا) کہ مریم اللہ تم کو اپنی طرف سے ایک فیض کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح (اور مشہور) عیسیٰ ابن مریم ہو گا (اور جو) دنیا اور آخرت میں باآبرو اور (اللہ کے) خاصوں میں سے ہو گا۔ اور ماں کی گود میں اور بڑی عمر کا ہو کر (دونوں حالتوں میں) لوگوں سے......

موضح القرآن میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی خبر پہلے نبیوں نے دی تھی کہ مسیح پیدا ہو گا جس کے ذریعہ بنی اسرائیل کو عروج نصیب ہو گا۔ مسیح کے معنی ہیں جس کے ہاتھ لگانے سے مریض اچھا ہو جائے یا جس کا کوئی وطن نہ ہو، ہمیشہ سیاحت میں رہے، یہودیوں نے ان کا انکار کیا جب دجال پیدا ہو گا تو وہ آپ کو مسیح کہے گا تب یہود اس پر ایمان لائیں گے۔

قَالَتْ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ قَالَ كَذَلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ إِذَا قَضَى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٤٧﴾

(یکساں) گفتگو کرے گا اور نیکو کاروں میں ہو گا۔ مریم نے کہا، پروردگار میرے، ہاں بچہ کیونکر ہو گا کہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ تک تو لگایا نہیں، فرمایا کہ اللہ اسی طرح جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو ارشاد فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

فائدہ: فرشتوں نے مریمؑ کو بشارت دی کہ تمہارے ہاں ایک بڑی شان والا لڑکا پیدا ہوگا جو ایک حرف کُن کہنے سے پیدا ہو جائے گا جمہور نے کہا: یہ لفظ تفسیر میں "مصدقا" یعنی وہ اللہ کے کلمہ کی تصدیق کرنے والا ہو گا اس کا نام دنیا میں مسیح مشہور ہوگا، تمام مومن اسے پہچانیں گے، عیسیٰ کو ابن مریم اس لیے کہا کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے، دنیا میں ان کی وجاہت یہ تھی کہ وہ پیغمبر ہو کر آئے شریعت لائے، بیمار کو اچھا کر دیتے، مردے کو زندہ کر دیتے، آخرت میں وجاہت یہ ہو گی کہ جس کے لیے انہیں اجازت ہو گی سفارش کریں گے وہ قبول ہو گی جس طرح ان کے بھائی اوالوالعزم پیغمبروں کی سفارش قبول ہو گی۔ گود میں بات کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی توحید کی طرف دعوت دیں گے۔ یہ ان کا ایک معجزہ ہے اور اللہ کی ایک نشانی ہے۔ کہولت (پوری عمر) ان کی طرف وحی آئے گی۔ صاحب علم اور صالح عمل والے ہوں گے۔ ابوہریرہؓ نے مرفوع روایت کی ہے کہ عیسیٰ کے سوا کسی نے صغر سنی میں بات نہیں کی، جریج نے ابن اسحٰق سے یہ روایت کی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ تین شخصوں کے سوا کسی نے بچپن میں کلام نہیں کی۔ عیسیٰ ایک بچہ جو زمانہ جریج میں تھا۔ اور ایک اور بچہ (شاید یہ شاہد یوسف ہو) [رواہ ابن ابو حاتم] مریم علیہا السلام نے بشارت سن کر تعجب کا اظہار کیا، کیونکہ نہ تو ان کا شوہر تھا نہ شادی کا ارادہ تھا اور نہ ہی (خاکم بدہن) باغیہ تھیں۔ فرشتے نے اللہ کی طرف سے ان کو جواب دیا کہ اللہ کے لیے یہ کیا مشکل ہے؟ یہاں "اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔" کہا تاکہ کسی کو عیسیٰ کے مخلوق ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے، پھر اس کی تاکید یہ کہہ کر فرمائی کہ جب ہم کوئی حکم دیتے ہیں کہ لفظ کن کہہ دیتے ہیں وہ امر وجود میں آجاتا ہے ذرا تاخیر نہیں ہوتی۔ اِدھر حکم ہوا اور اُدھر وہ کام ہو گیا۔ جیسے ارشاد فرمایا: "بس ہمارا حکم ایک آنکھ جھپکنے کی طرح ہوتا ہے۔"

فائدہ: فتح البیان میں کہا ہے کہ کلمہ سے پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مروجہ اسباب کے بغیر ہم اسے پیدا کریں گے بس ایک لفظ کن سے پیدا ہو جائے گا ابو السعود نے سورہ نساء میں نقل کیا ہے کہ بڑے نصرانی ڈاکٹر نے خلیفہ رشید کی مجلس میں علی بن حسین واقدی سے مناظرہ کیا اور کہا کہ تمہاری کتاب میں اس بات پر دلیل ہے کہ عیسیٰ اللہ کا جز ہیں پھر یہ آیت پڑھی۔ "وہ اس کا کلام جسے اس نے مریم کی طرف ڈالا اور روح ہے اس سے۔" واقدی نے کہا: تم نے وہ آیت نہیں پڑھی: "اس نے تمہارے لیے مسخر کر دی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور زمیں میں ہے سب کی سب۔" اس سے پھر کہا: اس آیت سے لازم آتا ہے کہ یہ تمام اشیاء اللہ کے اجزاء ہوں وہ نصرانی عاجز ہو کر اسلام لے آیا، رشید نے خوش ہو کر واقدی کو ایک خلعت فاخرہ عطاء کی اسی طرح ایک سفید

انگلستان میں روم کے بادشاہ کے پاس گیا، اس مجلس میں ایک عیسائی نے مسلمان کو دیکھ کر یہ طعنہ دیا کہ تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے پیغمبر کی بیوی پر لوگوں نے کیا کیا کہا تھا؟ اس نے جواب دیا ہاں مجھے علم ہے اس طرح کی دو بیبیاں تھیں، جس پر زنا کی تہمت لگائی گئی مگر اس قدر فرق ضرور تھا ایک بی بی پر صرف تہمت لگی اور دوسری بی بی ایک بچہ بھی جنم دے کر ساتھ لائیں وہ نصرانی مبہوت ہو گیا۔ حقیقت حضرت عائشہؓ اور مریمؑ دونوں پاک تھیں، کشاف میں لکھا ہے کہ مسیح ایک لقب ہے بمعنی مبارک، دجال کو مسیح اس لیے کہتے ہیں وہ کانا ہو گا ایک آنکھ اس کی سرخ ہو گی یعنی کسی نے مَل کر آنکھ نکال ڈالی، یا اس لیے کہ مکہ اور مدینہ کے علاوہ ساری دنیا میں گھومے گا۔ عیسیٰ عجمی لفظ ہے بمعنی سرخ و سفید یا معرب ہے یشوع کا، مگر انجیل میں جابجا یشوع آیا ہے بغیر ہمزہ کے اس آیت میں لقب نام اور کنیت تینوں کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ ان کے بغیر مکمل تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ مقربین میں اشارہ ہے رفع آسمان کی طرف مہد کہتے ہیں بچے کے بستر کو جہاں وہ رضاعت کے زمانہ میں سوتا ہے کہل کا معنی ہے ادھیڑ عمر کا آدمی جو شباب اور بڑھاپے کے درمیان ہو۔ ابوہریرۃؓ سے روایت کردہ حدیث میں ہے کہ چار بچوں نے مہد یعنی پنگھوڑے میں بات کی۔ عیسیٰ، یوسف کے حق میں گواہی دینے والا، صاحب جریج اور ابن ماشطہ فرعون خفاجی کہتے ہیں کہ کل گیارہ بچوں نے پنگوڑے میں بات کی سیوطی نے ان کو نظم کیا ہے جو کہ فتح البیان میں موجود ہے۔ موضع القرآن میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے وہ باتیں اپنی والدہ کی گود میں کیں یا نبی ہو کر انتہا۔ مجاہد نے کہا کہ کہلا بمعنی حلیم ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عیسیٰ نے ایک گھنٹہ تک بات کی پھر گفتگو کی عمر کو پہنچنے تک بات نہ کی وہ بات یہ تھی کہ انی عبداللہ اتانی الکتاب الایہ اسی ضمن میں اپنی والدہ کی برأت بھی ظاہر کر دی۔ ابن قتیبہ نے کہا کہ عیسیٰؑ کو تین برس کی عمر میں رسالت ملی، تیں مہینے زندہ رہے پھر ان کو آسمان پر اٹھا لیا گیا وہب کہتے ہیں کہ تین برس رہے اس آیت میں مریم کو یہ بشارت دی گئی کہ عیسیٰ کہولت کی عمر تک زندہ رہیں گے اس حال سے دوسرے حال تک تغیر ہو گا، اگر اللہ ہوتے تو تغیر واقع کیوں ہو گا؟ اس میں عقیدہ نصاریٰ کی تردید ہے آیت شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ آسمان سے زمین پر اتریں گے دوسری آیت میں ان کے اترنے کو قیامت کی نشانی بتایا ہے اب وہ زمانہ قریب معلوم ہوتا ہے کہ ابن مریم تشریف لائیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ تم میں سے جو کوئی ان سے ملے میرا سلام کہے۔

پھر عیسیٰ کے اوصاف کو ان کی صفت صلاح پر ختم کیا اس لیے، آدمی صالح جب ہی ہوتا ہے جب حقیقی منہج پر قائم و دائم رہے سو لفظہ صلاح شامل تمام مقامات دین و دنیا کو افعال قلوب اور اعمال جوارح سب اس میں شامل ہیں

اس لیے سلیمان علیہ السلام نے نبوت کے بعد یہ دعاء کی: ﴿وَاَدۡخِلۡنِیۡ بِرَحۡمَتِكَ فِیۡ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیۡنَ﴾ اس آیت میں صلحاء سے مراد ابراہیم، اسماعیل، اسحاق و یعقوب جیسے لوگ مراد ہیں۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ﴿٤٨﴾ وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٤٩﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿٥٠﴾

اور وہ انہیں لکھنا (پڑھنا) اور دانائی اور تورات اور انجیل سکھائے گا۔ اور (عیسیٰ) بنی اسرائیل کی طرف پیغمبر (ہو کر جائیں گے اور کہیں گے) کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں وہ یہ کہ تمہارے سامنے مٹی کی مورت بشکلِ پرند بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے (سچ مچ) جانور ہو جاتا ہے، اور اوندھے اور ابرص کو تندرست کر دیتا ہوں، اور اللہ کے حکم سے مردے میں جان ڈال دیتا ہوں، اور جو کچھ تم کھا کر آتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو سب تم کو بتا دیتا ہوں اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو ان باتوں میں تمہارے لیے (قدرتِ اللہ کی) نشانی ہے۔ اور مجھ سے پہلے جو تورات (نازل ہوئی) تھی اس کی تصدیق بھی کرتا ہوں اور (میں) اس لیے بھی آیا (ہوں) کہ بعض چیزیں جو تم پر حرام تھیں ان کو تمہارے لیے حلال کر دوں اور میں تو تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔

فائدہ: موضح القرآن میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو تورات اور ہر کتاب بغیر پڑھے آتی تھی یہ سب معجزات ہوتے تھے ان کے وقت میں تورات کے بہت سے مشکل احکام ختم کیے گئے۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ نے پوری بشارت کا ذکر فرمایا ظاہر ہے کہ کتاب سے مراد اس جگہ کتابت ہے۔ تورات وہ کتاب ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوئی، انجیل وہ کتاب ہے جو عیسیٰ پر اتری، عیسیٰؑ دونوں کتابوں کے حافظ تھے بنی اسرائیل کی طرف رسول بن کر آئے اپنے معجزات تفصیل سے بتائے۔ کہتے ہیں کہ اکمہ وہ ہے جو دن میں نہ دیکھ سکے اور رات میں دیکھ سکے کسی نے اس کے برعکس کہا: کسی نے کہا اعمیٰ ہے اور یہی قول زیادہ صحیح ہے اس لیے معجزہ تحدی اور چیلنج کے لیے ہے لہذا یہی ابلغ اور اقویٰ ہے۔ ابرص وہ ہے جس کے بدن پر سفید داغ ہوں بہت سے علماء کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو اس کے زمانہ کی مناسبت سے معجزات عطا کیے۔ زمانۂ موسوی میں سحر غالب تھا۔ جادوگر

عظیم سمجھے جاتے تھے اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو وہ معجزہ دے کر بھیجا جس سے تمام جادوگر دنگ ہو کر رہ گئے آنکھیں پتھرا گئیں، عقل حیران رہ گئی، جب یقین ہو گیا کہ یہ تو اللہ عظیم کی طرف سے ہے تو اسلام لا کر نیک بندے بن گئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں طبیبوں کا بڑا زور تھا، علم غیب جاننے والے سربراہ تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے عیسیٰؑ کو ایسے معجزے عطا کیے جو کسی غیب یا حکیم کے باپ سے بھی وجود میں نہ آ سکیں۔ ایسے معجزے اسی سے صادر ہو سکتے ہیں جس کے ساتھ اللہ کی تائید ہو، طبیب کی کیا ہستی ہے کہ وہ جماد کو زندہ کر سکے یا اندھے برص والے کو شفا بخشے یا جو قیامت تک قبر میں لیٹا ہوا ہے اسے زندہ کر اٹھائے۔ اسی طرح ہمارے نبی آخر الزمان ﷺ کے زمانے میں فصحاء و بلغا شعراء کا طوطی بولتا تھا۔ نبی ﷺ ایسی کتاب لائے اللہ کی طرف سے کہ تمام جن و انس اکٹھے ہو کر بھی نہ بنا سکے۔ اگرچہ ان میں بعض بعض کا مددگار بھی کیوں نہ بن جائے یہ اس لیے ہے کہ اللہ پاک کا کلام کبھی مخلوق کے کلام کے مشابہ نہیں ہو سکتا۔ بہر حال آیت میں دلیل ہے کہ عیسیٰؑ نے تورات کے بعض احکام کو منسوخ کیا تھا یہی صحیح قول ہے بعض نے لوگوں سے کہا کہ منسوخ تو کچھ نہیں کیا تھا بعض چیزیں جن کے حلال ہونے میں ان میں نزاع تھا انکو حلال کر دیا۔ جس طرح دوسری آیت میں ارشاد ہے: "تاکہ میں واضح کروں تمہارے لیے وہ چیزیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو۔" فتح البیان میں ہے کہ کتاب سے مراد لکھنا یا جنس کتب الٰہیہ ہیں۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں قلم سے لکھنے کو کتاب کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ بڑے خوش خط تھے۔ حکمت سے مراد علم ہے یا تہذیب واخلاق۔ ابوذرؓ سے ایک طویل حدیث میں ہے کہ عیسیٰؑ نے صرف ایک چمگادڑ بنایا تھا اس کے سوا کچھ نہیں بنایا کیونکہ چمگادڑ میں عجیب قسم کی خصوصیات جمع ہیں۔ اس کے دانت داڑھ اور کان ہیں مادہ کے پستان ہیں، اسے حیض آتا ہے حیض سے طہارت حاصل ہوتی ہے بغیر پروں میں اڑتا پھرتا ہے۔ جس طرح جانور جنم دیتے ہیں اسی طرح یہ بھی بچے کو جنم دیتا ہے حالانکہ یہ پرندہ ہے اور پرندے بچے نہیں دیتے۔ بلکہ انڈے دیتے ہیں۔ رات دن میں اسے دکھائی نہیں دیتا، دو اوقات میں ایک غروب آفتاب کے، دوسرے طلوع فجر کے بعد نظر آتا ہے، آدمی کی طرح ہنستا ہے، یہ جانور ان کی سفارش پر بنایا تھا، جہاں تک ان کی نظر جاتی اڑتا نظر آتا، جب نگاہ سے غائب ہو جاتا تو مر کر گر جاتا یہ اس لیے کہ اللہ کا کام بندے کے کام سے ممتاز رہے۔ اذن کی قید سے ثابت ہوا کہ اگر اللہ کا حکم نہ ہوتا تو وہ کبھی چمگادڑ نہ بنا سکتے حقیقتاً خالق تو اللہ ہی ہے مگر اس تخلیق کو عیسیٰؑ کے ہاتھ پر جاری کیا، پرندہ کی شکل بنانا اور پھونک مارنا عیسیٰؑ کا کام تھا اور تخلیق اللہ کی طرف سے تھی۔ اکمہ کہتے ہیں مادرزاد اندھے کو عرب کو برص سے بے حد نفرت تھی برص کو وضح بھی کہتے ہیں۔ عرب بادشاہوں میں ایک شخص وضاح تھا مگر

خوف کے مارے اسے کوئی ابرص نہ کہتا تھا، چاند، گر گٹ کو ابرص و سام ابرص کہتے ہیں۔ اسی شدید سفیدی کی وجہ کے باعث عیسیٰ علیہ السلام بہت سی بیماریوں سے اچھا کر دیتے تھے جس کا ذکر انجیل میں آیا ہے یہاں ہر دو امراض کا بطور خاص ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ غالبًا یہ دونوں امراض دوا سے شفایاب نہیں ہوتے ایک دن میں ایمان لانے کی شرف پر پچاس ہزار آدمیوں کو اچھا کیا۔ اکمہ و ابرص کے ساتھ اذن کی قید نہیں لگائی کہ پرندے کی تخلیق اور مردے کو زندہ کرنے کے مقابلہ میں ان دو امراض میں کوئی زیادہ تعجب و مشکل نہیں ہے کہ الوہیت کا وہم پیدا ہو اس وقت اور بھی بہت سے اطباء موجود تھے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ چار آدمیوں کو زندہ کیا، عازر ابن العجوز ابنۃ العاشر سام بن نوح، سام کہتے ہیں کہ زندہ کرنے کی دعا: ((یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ)) تھی اہل علم نے اسے اسم اعظم کہا ہے۔ احیا کے ساتھ اذن کی قید اس لیے کہ الوہیت کا وہمہ نہ گذرے کیونکہ یہ کام انسانی افعال کی جنس سے نہیں ہے۔ اس آیت میں نصاریٰ کی بھی تردید ہے۔ اکل و ذخیرے کی خبر دینے میں عیسیٰ کی نبوت پر قطعی دلیل ہے یہ ان کا بڑا معجزہ تھا کہ اللہ کے بتانے پر غیب کی خبر دیتے تھے۔ جس کی خبر کسی شخص کے فرشتوں کو بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ کاہن جو خبر سناتے ہیں اس کی خبر بنیاد مقدمات پر ہوتی ہے نہ کہ اللہ کے بتانے پر۔ پھر اس میں خطاء اور بھول چوک کا بھی امکان ہوتا ہے تورات کی تصدیق اس لیے تھی کہ انبیاء علیہ السلام ایک دوسرے کو سچا بتاتے ہیں۔ موسیٰ اور عیسیٰ کے درمیانی ایک ہزار نوسو پچھتر سال گذرے تھے۔ تورات میں چربی اور ہر پنجے والا جانور حرام تھا۔ جیسے اللہ کا ارشاد ہے: ''اور یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن والی چیز حرام کر دی۔'' اور ارشاد ہے: ''سو یہویوں کے گناہ کی وجہ سے ہم نے ان پر پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں جو ان کے لیے حلال تھیں۔'' اس قسم کی اشیاء اصل تورات میں حرام نہ تھیں انکے علماء نے حرام کر رکھا تھا۔ حضرت عیسیٰ نے ان کو حلال کر دیا جس نے کہا کہ: ''بعض'' سے مُراد یہاں ''کل'' ہے۔ تو اس نے غلط کہا۔ اس لیے لغت عرب میں کسی جگہاں بعض کل کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ عیسیٰ کی شریعت موسوی شریعت کے مقابلے میں نرم اور آسان تھی۔ یہ کہنے سے کہ ''میرا اور تمہارا رب وہی اللہ ہے'' سے ثابت ہوا کہ تمام رسولوں کا دین ایک ہی تھا کسی نے کبھی توحید میں اختلاف نہیں کیا یہ نصاریٰ کے نجرانی وفد پر ایک حجت ہے اور جو کوئی اس کی مثل (اللہ کی) مانے وہ موحد نہ ہوا۔

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿٥١﴾ فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ	کچھ شک نہیں کہ اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے تو اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔ جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے نافرمانی (اور نیت قتل) دیکھی تو کہنے لگے کہ کوئی ہے جو اللہ کا طرفدار اور میرا مددگار

أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴿۵۴﴾

ہو، حواری بولے کہ ہم اللہ کے (طرف دار اور آپ کے) مدد گار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیں کہ ہم فرمانبردار ہیں۔اے پروردگار جو (کتاب) تو نے نازل فرمائی ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور (تیرے) پیغمبر کے متبع ہو چکے تو ہم کو ماننے والوں میں لکھ رکھ۔اور وہ (یعنی یہود قتل عیسیٰ کے بارے میں ایک) چال چلے اور اللہ بھی (عیسیٰ کو بچانے کے لیے) چال چلا اور اللہ خوب چال چلنے والا ہے۔

موضح القرآن میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارہ پیروکاروں کو حواری کہا جاتا ہے۔حواری کہتے ہیں دھوبی کو، عیسیٰؑ پر پہلے جو لوگ ایمان لائے وہ دھوبی تھے، آپ نے ان سے کہا کہ تم کپڑے کیا دھوتے ہو میں تمہیں دل کو دھونا سکھاتا ہوں وہ ان کے ساتھ ہو لیے اس طرح ان سب کے لیے خطاب یہی دیا گیا اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اصلی رسول تھے۔بنی اسرائیل کہتے جب انہوں نے محسوس کیا کہ لوگ میرا ساتھ نہ دیں گے تو خواہش کی اور کوئی میرے دین کو قبول کرے اور اسے رواج دے، حواریوں کے ذریعہ دوسروں تک دین پہنچے اس وقت تک بنی اسرائیل اس دین میں بہت کم داخل ہوئے، یہود کے علماء نے اس وقت کے بادشاہ کو بہکایا کہ یہ شخص ملحد ہے، تورات کے حکم کے خلاف باتیں بتاتا ہے، اس نے لوگ بھیجے کہ ان کو پکڑ لائیں جب وہ پہنچے تو عیسیٰ کے یار کھسک گئے اس جلدی میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھالیا۔ایک تشبیہ ان کی رہ گئی اسے پکڑ کر انہوں نے سولی چڑھادیا۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں خبر دی ہے کہ جب عیسیٰؑ نے محسوس کیا یہ لوگ کفر پر ڈٹ گئے ہیں اور گمراہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے تو تب انہوں نے حواریوں کی طرف توجہ کی۔مجاہد نے کہا کہ انصاری سے مراد کون میرا تابع ہو گا۔ابن کثیر کہتے ہیں کہ مجاہد کا قول زیادہ صحیح ہے ظاہر یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کے لیے میرے مدد گار کون ہیں؟ جس طرح ہمارے پیغمبر اعظم ﷺ ہجرت سے پہلے موسم حج میں لوگوں سے کہتے کہ کون ہے جو مجھے جگہ دے؟ تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچاؤں، کیونکہ قریش نے مجھے پیغام پہنچانے سے روک رکھا یہاں تک کہ انصار نے آپؐ کی مدد کی اور انہیں جگہ دی۔آپؐ ہجرت کر کے ان کے پاس تشریف لے گئے اور انہوں نے آپ کو ہر کالے گورے سے بچایا اور یہی حال حضرت عیسیٰؑ کا ہوا کہ ایک گروہ بنی اسرائیل کا ان پر ایمان لے آیا تھا، اللہ کے نازل کیے نور کے تابع ہو گیا تھا، کہتے ہیں کہ حواری دھوبی

تھے۔ بعض نے کہا سفید پوش تھے کسی نے کہا: شکاری تھے۔ صحیح یہ ہے کہ حواری بمعنی ناصر ہے جس طرح صحیحین میں آیا ہے کہ احزاب کے دن نبی ﷺ نے صحابہ کو بلایا تو زبیر نہ آئے۔ پھر بلایا تو زبیر آئے اس پر فرمایا: ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے یعنی دوست خالص سچا مددگار میرا حواری زبیر ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا: شاہد سے مراد امت محمد ﷺ ہے اسے ابو حاتم بسند جید روایت کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے فاسد ارادہ کا ذکر فرمایا کہ انہوں نے عیسیٰ کو قتل کرنا چاہا اس وقت کا بادشاہ کافر تھا، لوگوں نے اس کے کان بھرے کہ یہاں ایک شخص ہے بادشاہ کی طاعت سے لوگوں کو روکتا ہے اور انہیں گمراہ کرتا ہے، رعایا میں فساد کرتا ہے، باپ بیٹوں میں تفرقہ ڈالتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ مردود بادشاہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا اس نے اپنے گماشتے دوڑائے کہ اسے پکڑ لاؤ اور سولی پر چڑھادو۔ جب وہ آگئے تو سمجھے کہ مطلب حل ہو گیا اللہ تعالیٰ نے عیسیٰؑ کو اس کے گھر کے روشن دان سے آسمان پر اٹھالیا۔ اس گھر میں ایک کو عیسیٰؑ کی شکل بنادیا انہوں نے اسے عیسیٰؑ سمجھ کر سولی چڑھادیا۔ اللہ کی تدبیر یہ تھی کہ ان کو دھوکا لگ گیا عیسیٰ ان کے درمیان سے صاف بچ کر نکل گئے اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ ہماری تدبیر کتنی اچھی ہے۔

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ احساس سے یہاں مراد قومی ادراک ہے کفر سے مراد کلمہ کفر ہے جسے اپنے کانوں سے سنا تھا اور ارادۂ قتل بمنزلہ کفر ہے۔

ہوتا ہے وہاں مشورۂ قتل ہمارا

لو حضرت دل اور سنو تازہ خبر

اور جن یہودیوں نے انہیں قتل کرنا چاہا وہ جانتے تھے کہ تورات میں جس مسیح کی خبر دی گئی ہے وہ ہی عیسیٰ بن مریم ہیں، جو ان کے دین میں بعض باتوں کو منسوخ کریں گے۔ جب وہ ظاہر ہوئے یہ لوگ کافر بن کر ان کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ماں بیٹے دونوں کو شہر سے نکال دیا، وہ زمین میں مارے مارے پھرتے اور مَنْ اَنْصَارِیْ پکارتے۔ حواریوں نے ان کا ساتھ دیا، سب سے پہلے بارہ آدمی ان پر ایمان لائے تھے۔ زجاج نے کہا کہ اللہ کی تدبیر یہ ہے کہ وہ مکاروں کو ان کے مکر کی سزا دیتا ہے۔ جزاء کا نام تدبیر رکھ دیا یہاں اس کا معنی کدامع اور دھوکہ نہیں ہے یا مکر سے مراد شبیہ عیسیٰؑ ہے جو کسی دوسرے پر ڈال دی گئی اور آسمان پر ان کا اٹھالینا ہے۔ سدی نے کہا بنی اسرائیل نے انیس حواریوں سمیت عیسیٰ کا محاصرہ کیا تھا اس وقت عیسیٰؑ نے کہا: کون شخص ہے جو میری شکل قبول کرتا ہے اسے جنت ملے گی؟ ایک شخص جس نے وہ صورت قبول کرلی عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر چلے گئے۔ اس پر اللہ

تعالیٰ نے فرمایا ہمارا مکر (تدبیر) بہتر ہے۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَاعِيسَى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ۝۵۵ فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝۵۶ وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ۝۵۷ ذَلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ۝۵۸

اس وقت اللہ نے فرمایا عیسیٰ! میں تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کر کے تم کو اپنی طرف اٹھالوں گا اور تمہیں کافروں (کی صحبت) سے پاک کروں گا، اور جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے ان کو کافروں پر قیامت تک فائق (وغالب) رکھوں گا پھر تم سب میرے پاس لوٹ کر آؤ گے تو جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے اس دن تم میں ان کا فیصلہ کردوں گا۔ یعنی جو کافر ہوئے ان کو دنیا اور آخرت (دونوں) میں سخت عذاب دوں گا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اور جو ایمان لائے اور عمل نیک کرتے رہے ان کو اللہ پورا پورا صلہ دے گا، اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ (اے محمدؐ) یہ ہم تمہیں (اللہ کی) آیتیں اور حکمت بھری نصیحتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔

موضح القرآن میں ہے کہ عیسیٰؑ کے پہلے تابعدار انصار تھے جو سچے مسلمان تھے سو ہمیشہ غالب رہے انتہا۔

ابن کثیر نے کہا کہ مفسرین کا اختلاف ہے کہ ﴿إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ﴾ سے کیا مراد ہے؟ قتادہ نے کہا کہ اس میں تقدیم تاخیر ہے اصل عبارت یوں ہے: ((إِنِّيْ رَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُتَوَفِّيْكَ)) یعنی پہلے رفع پھر وفات ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ متوفی کی معنی ہیں مُمِيْتُكَ، وھب بن منبہ نے کہا: اللہ نے عیسیٰ کو دن کے پہلے پہر تین ساعت تک وفات دی پھر انہیں اپنی طرف اٹھالیا۔ ابن اسحاق نے کہا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ سات ساعت تک موت کی حالت میں رہے پھر زندہ ہوگئے۔ وھب کا دوسرا قول ہے کہ وہ تین روز تک مرے رہے پھر اٹھے پھر آسمانوں پر اٹھالیے گئے۔ مطرق وراق نے کہا: دنیا کی وفات مراد ہے۔ نہ کہ موت کی وفات۔ ابن جریر نے کہا: توفّی سے مراد رفع ہے۔ اکثر اہل علم کا قول ہے کہ وفات سے مراد اس جگہ خواب ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: "وہ تمہیں رات کو فوت کرتا ہے۔" "اور فوت ہو جاتے ہیں نفس اپنی موت کے وقت اور وہ جو اپنی نیند میں نہیں مرتا۔ نبی ﷺ جب نیند سے بیدار ہوتے تو کہتے: ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا)) نیند کو موت کی بہن کہا جاسکتا ہے۔ سونا جینا گویا مرنا جینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ان کے کفر کی وجہ سے اور مریم پر بڑا بہتان

لگانے کی وجہ سے اور انکے یہ کہنے کی بنا پر کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا ہے (حالانکہ) نہ انہوں نے قتل کیا اور نہ انہوں نے سولی چڑھایا بلکہ انکو شبہ پڑ گیا۔ "الی قولہ..........شھیداً" میں ضمیر عیسیٰؑ کی طرف راجع ہے۔ یعنی نہیں ہے کوئی شخص اہل کتاب میں سے مگر وہ عیسیٰ پر ایمان لائے گا۔ یہ جب ہو گا کہ وہ قیامت سے پہلے زمین پر اتریں گے۔ اس وقت تمام اہل کتاب ان پر ایمان لائیں گے کیونکہ وہ جزیہ دینا موقوف کر دیں گے اسلام کے سوا کچھ نہ قبول کریں گے۔ حسن نے کہا: وفات سے مراد منام ہے اللہ نے ان کو خواب میں اٹھالیا آپؐ نے یہود سے فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام مرے نہیں ہیں وہ قیامت سے پہلے تمہارے پاس دوبارہ آئیں گے۔ تَطھیرُ کا مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں اٹھادوں گا تو تم کافروں کے ہاتھ سے بچ جاؤ گے۔ پھر یہ فرمایا کہ تمہارے پیروکار قیامت تک سارے کافروں پر غالب رہیں گے۔ ابن کثیر کہتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ویسے ہی ہوا جب مسیحؑ آسمان پر اٹھالیے تو انکے اصحاب گروہوں میں بٹ گئے۔ بعض نے کہا: وہ اللہ کے بندے اور رسول تھے، اللہ کی باندی کے بیٹے تھے بعض نے غلو کرتے ہوئے کہا وہ اللہ کے بیٹے تھے۔ بعض نے کہا: وہ خود اللہ تھے۔ کسی نے کہا: ثلاثہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انکے عقائد کو قرآن میں نقل کر کے ہر ایک گروہ کا رد کیا۔ غرض یہ کہ وہ تین سو برس تک ایسی ہی گروہ بندی کا شکار رہے، پھر یونان سے ایک بادشاہ قسطنطین نامی اٹھا جو نصرانی ہو گیا تھا اس نے دین مسیح کو بدل دیا اور وہ اسی تبدیلی کی خاطر وعیسائی ہوا تھا، اس نے دین مسیح کا حلیہ بدل دیا کچھ بڑھایا اور کچھ گھٹایا، اسی زمانے میں خنزیر کا گوشت حلال کیا گیا، مشرق کی جانب رخ کر کے نماز پڑھی گئی، اس نے بارہ ہزار کنیسہ اور معابد بنائے گئے، گناہ کے کفارہ میں دس روزہ کا اضافہ کر دیا، دین مسیح، دین قسطنطین بن گیا اپنے نام پر شہر آباد کیا، اللہ نے اس کی مدد کی اور وہ یہود پر غالب آگیا اس لیے وہ اقرب الی الحق تھا۔ اگرچہ سب کے سب کافر تھے لَعنھمُ اللّٰہُ جب ہمارے نبی ﷺ مبعوث ہوئے جو ان پر ایمان لایا وہ اللہ، ملائکہ، کتب و رسل سب پر ایمان لاتا ہے اس لیے وہ ہر نبی کا متبع ہے کیونکہ اس نے روئے زمین پر آنے والے ہر نبی کی تصدیق کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کی شریعتوں کو شریعت محمدی میں شامل کیا ہے اور یہ شریعت کبھی نہ منسوخ ہو گی اور نہ کوئی تبدیلی ہو گی۔ یہ دین ہمیشہ کے لیے منصور و غالب رہے گا اللہ تعالیٰ نے تمام مشرق و مغرب اصحاب نبوی کے ہاتھ پر فتح کر دیئے، جس طرح آپؐ نے اللہ کی طرف سے خبر دی تھی کہ اللہنے وعدہ کیا ان سے جو تم میں ایمان لائے اور نیک عمل کیے کہ انہیں ضرور زمین کی خلافت بخشوں گا۔ جس طرح تم سے پہلے لوگوں کو خلافت بخشی، اور وہ اس دین کو مستحکم کرے گا جسے اس نے تمہارے لیے پسند کیا اور ان کا خوف امن سے بدل دے گا وہ میری

عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے یہ اس لیے ہوا کہ سچے مومن مسیح یہ ہی لوگ تھے ۔انہوں نے بلاد انصاری ملک شام کی ان کے ہاتھ سے چھین کر انہیں روم کے شہر قسطنطنیہ کی طرف نکال دیا اسلام اور اہل اسلام قیامت تک ان پر غالب رہیں گے تمام اموال ان کے ہاتھ لگیں گے روم سے شدید جنگ ہوگی۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم تیرے پیروکاروں کو کافروں پر غالب کردیں گے قیامت تک پھر جب وہ لوٹ کر ہمارے پاس آئیں گے تو ہم انکے اختلاف کا فیصلہ کردیں گے کفار کو دنیاو آخرت میں عذاب دیں گے چنانچہ جو یہود مسیح کے منکر تھے جو نصاریٰ مسیح کو اللہ کہتے تھے وہ دنیا میں مارے گئے ،قید ہوئے ان کا قبضہ سلطنتوں سے اٹھ گیا آخرت میں انہیں اس سے بھی شدید عذاب کا سامنا کرنا ہوگا اور جو مومن صالح ہیں انہیں دنیاو آخرت میں پورا پورا بدلہ دیں گے دنیا میں نصرت فتح ملے گی اور آخرت میں شاندار باغات ہیں اللہ ظالموں کو نہیں چاہتا پھر فرمایا:اے محمد ! ﷺ ہم نے جو تمہیں ولادت مسیح کا قصہ سنایا ہے یہ لوح محفوظ سے تم پر نازل کیا ہے۔اس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہے۔جیسے کہ سورۂ مریم میں ارشاد ہے:”یہ عیسیٰ بن مریم سچا قول ہے جس کے بارے میں وہ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔اللہ کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ اولاد بنالے۔اس کی ذات پاک ہے جب وہ کسی بات کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہوجا،پس وہ ہوجاتا ہے۔“

فائدہ: فتح البیان میں لکھا ہے کہ باب کی اس آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔مطلب یہ ہے کہ پہلے رفع پھر تطہیر پھر زمین پر اترنے کے بعد وفات پائی۔ابو زید نے کہا:متوفی کے معنی قابض ہیں کشاف میں کہا ہے کہ ہم تمہاری مدت پوری کریں گے تم ان کے ہاتھ سے مارے نہ جاؤ گے مطرق وراق نے کہا دنیا سے تمہیں شہوات اور لذت نفس سے الگ کردیں گے۔یہ تحریف ہے تفسیر نہیں ابن المسیب کہتے ہیں کہ عیسیٰؑ کو جب آسمانوں پر اٹھا یا گیا تو آپ کی عمر تینتیس برس تھی۔بیت المقدس سے لیلۃ القدر میں اٹھائے گئے۔اس وقت مریم علیہاالسلام کی عمر تیرہ برس تھی جب آپؑ پیٹ میں تھے،اسوقت بابل پر سکندر کے حملہ کو پینسٹھ برس ہوگئے تھے،رفع مسیح کے بعد مریمؑ چھ سال زندہ رہیں۔ابن القیم علیہ الرحمہ نے”زاد المعاد“میں لکھا ہے کہ کوئی ایسی مستند چیز دیکھنے میں نہیں آئی جس سے یہ پتہ چلے کہ رفع آسمان کے وقت عیسیٰؑ کی عمر تینتیس برس تھی۔جب کہ ہر نبی چالیس سال کی عمر میں رسول ہوتا ہے کیونکہ عمر کا سن کمال یہ ہی ہے اور یہ عمر تمام انبیاء کو شامل ہے۔شامی کہتے ہیں کہ علامہ ابن القیم کی بات صحیح ہے،احادیث نبویہ میں ان کے رفع کی عمر ایک سو بیس سال آئی ہے۔زرقانی کہتے ہیں کہ سیوطی نے”تکملہ تفسیر محلی و شرح نقایہ“میں وثوق سے لکھا ہے کہ رفع عیسیٰؑ تراسی سال کی عمر میں ہوا

،اور نزول کے بعد سات سال ٹھہریں گے مجھے تعجب ہے کہ اس قدر لفظ و اتفاق کے باوجود انہوں نے ایسی بات کیسے لکھ دی، پھر میں نے ”فرقان الصعود “میں دیکھا کہ انہوں نے اس قول سے رجوع کیا، یہ تطہیر سے مراد اہل کفر کی صحبت کی نجاست ہے۔ تابعین عیسیٰ ؑ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ان کے اصحاب خالص تھے جنہوں نے نہ ان کو اللہ یا خدا کا بیٹا کہا انہیں میں سے مسلمان ہیں کہ عیسیٰ ؑ پر ایمان لائے ہیں عیسیٰ ؑ کی تعریف میں غلو نہیں کرتے جس طرح نصاریٰ نے کیا نہ تفریط کرتے ہیں جس طرح یہود نے کیا بعض نے کہا کہ نصاریٰ ہمیشہ غالب رہیں گے کسی نے کہا مراد روم ہے، کسی نے کہا مراد حواری ہیں جو منکرین مسیح پر ہمیشہ غالب رہیں گے کسی نے کہا: مراد مسلمان اور نصاریٰ ہیں۔ شوکانی کہتے ہیں کہ ہر نصاریٰ کا غلبہ ایک گروہ یا سارے کافروں پر اس آیت کے منافی نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے کسی گروہ میں مغلوب و مقہور ہوں جس طرح متعدد آیات میں یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ملت اسلامیہ ہمیشہ دیگر امتوں میں غالب رہے گی۔ اس باب میں شوکانی نے ایک مستقل رسالہ اور ”الغمامة فی تفسیر وَجَاعِلُ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡكَ فَوۡقَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ“ لکھا ہے حاصل یہ ہے کہ صیغہ اَلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡكَ عموم کا صیغہ رہے، اسی طرح اَلَّذِيۡنَ بھی عموم پر دال ہے ہمارے لئے ضروری ہے کہ جو بات نظم قران سے ماخوذ ہو اس پر عمل کریں اور جب کوئی امر تخصیص کا مقتضی یا تقیید یا ظاہری معنی سے رک جانے کا تقاضہ کرے تو اس پر بھی عمل کرنے کو واجب سمجھیں اور جہاں کوئی ایسا تقاضہ نہ تو اسے عموم پر محمول کریں آیت کا ظاہر معنی ہر متبع کو شامل ہے جو کافروں پر غالب رہیں گے خواہ وہ اتباع بطور دلیل ہو یا بذریعہ تلوار یا دونوں طرح سے ہو، وہ اتباع سارے دین میں ہو یا بطن دین میں ہو تمام زمانوں میں ہو یا بعض میں اسی طرح کافر پر متبع غالب رہے گا ہر وہ شخص کافر ہے خواہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو پہچان کر چھپائے یا انکاری ہو یا دین کی مخالفت ہوتی ہو یا یوں کہ کسی دین پر نہ جیسے بت پرست آتش پرست، یا سورج پرست، یا شریعتوں کا مخالف اس آپ ﷺ کی نبوت سے قبل دین مسیح کے مخالف کسی دین کا پیروکار ہو جس طرح یہود اور دیگر ملت کفریہ کا حال ہے۔ پھر حضرت محمد ﷺ مبعوث ہوئے تو اس میں کچھ شک نہ رہا کہ متبعین عیسیٰ یہی سب مسلمان لوگ ہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے محمد ﷺ کی نبوت کا اقرار کیا ہے اور آپ ﷺ کے وجود کی بشارت دی ہے، بلکہ انجیل میں یہ حکم موجود ہے کہ متبعین عیسیٰ علیہ السلام کو محمد ﷺ کی اتباع کرنی چاہیے دین کے معاملے میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے اصل متبعین تو یہی اہل اسلام ہیں اور جو کوئی بعثت محمدیہ کے بعد نصرانی رہے گا وہ اگرچہ دینی اعتبار سے متبع عیسیٰ نہیں ہے مگر صورت نام اور شریعت عیسوی کی جزیات کے اعتبار سے متبع ہے گویا کہ یہ گمراہی

اور کفر میں پھنسا ہوا ہے ایسے لوگ عموماً قرآن پاک سے باہر نہیں نکل سکتے بلکہ یہ آخرت میں ہلاک ہوں گے گویا یہاں کافروں پر فائق ہوں کیونکہ یہ فوقیت اسی گھر میں ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "پھر تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے ہم تمہارے اختلاف کا فیصلہ کر دیں گے ہم ظالموں کو محبوب نہیں رکھتے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اہل کفر عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین فائق رہیں گے محمدی نبوت سے قبل سے مراد حواری اور نصاریٰ ہیں لیکن حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد مسلمان نصاریٰ و حواری ہیں حقیقی متبعین وہی پہلی قسم کے لوگ ہیں باقی لوگ نہ صورت میں متبعین ہیں اور نہ سیرت میں، مگر اللہ تعالیٰ نے تمام کو سارے کفار یہودیوں یا تمام کفار پر فائق فرمایا، چنانچہ واقعہ ایسا ہی ہوا کہ ملت نصرانیہ بعثت محمدی سے قبل تمام مل کر کفار پر غالب و قاہر تھے۔ جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے تو تمام امت کفر ملت اسلامیہ اور ملت نصرانیہ کے درمیان لٹ بٹ گئے، کوئی قیدی ہوا، کوئی قتل ہوا، کوئی مسلمان ہو گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کو ملت نصرانیہ پر غلبہ عطا فرمایا، اللہ نے جو وعدہ کتاب عزیز میں فرمایا اسے پورا کر دیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: "ہم نے طاقت بہم پہنچائی ان لوگوں کو جو ایمان لائے ان کے دشمنوں پر پس وہ غالب ہو گئے اور عزت تو اللہ کے لئے، اس کے رسول کیلئے ہے اور مؤمنوں کے لئے اور اللہ کافروں کو مومنوں پر ہرگز غلبہ عطاء نہ کرے گا۔"

ادھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی اور ادھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت تمام امتوں پر غالب اور ظاہر رہے گی غرض یہ کہ ملت اسلامیہ اور ملت نصرانیہ میں غور فکر کرنے سے بخوبی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اہل ملت اسلامیہ اور ملت نصرانیہ دیگر تمام ملل کفریہ پر فائق ہیں اور اس کی دلیل مذکورہ بالا آیت ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خطاب ہے، لیکن یہ بے فائدہ تکلف ہے کیونکہ سیاق و سباق اس بات پر صریح دلیل ہے، مخاطب عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آخری زمانے میں آسمان سے دنیا میں تشریف لائیں گے صلیب کو توڑیں گے خنزیر کو قتل کریں گے جزیہ موقوف کر دیں گے اور شریعت محمدی کے احکام کیمطابق فیصلے کریں گے ان کے انصار و حواری اسی وقت یہی مسلمان ہوں گے الیٰ یوم القیمۃ جعل کا انجام ہے یعنی اسلام کا غلبہ اس انتہا تک رہے گا پھر بعد میں جو اللہ چاہے اس کے بعد اہل کفر اور اہل ایمان کا انجام بتایا کہ اہل کفر عذاب میں مبتلا ہوں گے اور اہل ایمان جزاء کے مستحق ہوں گے۔ نعمان بن بشیر مرفوعاً کہتے ہیں کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر غالب رہے گا اور انہیں اپنے مخالفوں کی کوئی پرواہ نہ ہو گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے اس نے ابو حاتم اور ابن عساکر نے روایت کیا۔ پھر نعمان نے کہا کہ اگر مجھ پر

کوئی یہ الزام لگائے کہ میں نے یہ بات بنائی ہے تو وہ شخص اس حدیث کی تصدیق کتاب اللہ میں دیکھ لے
﴿وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ .... الخ﴾
معاویہ سے بھی لگ بھگ یہی حدیث مرفوع مروی ہے۔ انہوں نے بھی یہی آیت پڑھ کر سنائی، الحمد اللہ کہ کتاب و سنت دونوں میں یہ بشارت موجود ہے کہ اسلام تا قیامت باقی رہے گا قیامت سے پہلے کمزور ہو گیا تو دوسرے تیسرے علاقوں میں یہ مخالفوں پر غالب رہے گا، آج بھی الحمد اللہ اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت مظلوم و مقہور تاہم بعض علاقوں میں مسلمان کفار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں۔ ابن زبیر کہتے ہیں کہ نصاری تا قیامت یہود پر غالب رہیں گے، مشرق و مغرب میں جہاں بھی کوئی یہود ہے اس پر نصاریٰ غالب ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تمام دنیا میں دو ہی امتیں غالب و حکم ہیں ایک مسلمان دوسرے نصاریٰ باقی تمام اہل ملت مقہور و مغلوب ہیں۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَى عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٥٩﴾ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿٦٠﴾ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴿٦١﴾ إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾

عیسیٰ کا حال اللہ کے نزدیک آدم کا سا ہے کہ اس نے (پہلے) مٹی سے ان کا قالب بنایا پھر فرمایا کہ (انسان) ہو جا تو وہ (انسان) ہو گئے۔ (یہ بات) تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ پھر اگر یہ لوگ عیسیٰ کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقت الحال تو معلوم ہو ہی چلی ہے، تو ان سے کہنا کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلاؤ اور ہم خود بھی آئیں اور تم خود بھی آؤ، پھر دونوں فریق (اللہ سے) دعا و التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔ یہ تمام بیانات صحیح ہیں، اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور بے شک اللہ غالب (اور) صاحبِ حکمت ہے۔ تو اگر یہ لوگ پھر جائیں تو اللہ مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔

موضح القرآن میں ہے کہ نصاریٰ نے آپ ﷺ سے جھگڑا کرتے ہوئے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے نہیں بلکہ اس کے بیٹے ہیں اگر اس کے بیٹے نہیں تو تم بتاؤ وہ کس کے بیٹے ہیں۔ جواب میں یہ آیت نازل ہوئی کہ آدم کو اللہ نے بغیر ماں باپ کے پیدا کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو اگر بغیر باپ کے پیدا کیا تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نصاریٰ اگر کسی بھی دلیل کو ماننے کے لئے تیار نہیں تو ان سے قسم کرو جس کی صورت میں بتائی کہ دونوں فریق اپنی جان اور اپنی اولاد کے ساتھ حاضر ہوں اور دعا کریں کہ جو کوئی جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت اور عذاب ہو پھر نبی ﷺ بذات خود حضرت فاطمہ اور امام حسن اور حسین اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لے کر گئے، نصاریٰ کے دانشور مقابلہ سے بھاگ گئے اور جزیہ دینا قبول کیا۔.....................انتھاء))

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کی قدرت کے سامنے ایسی ہے جیسے آدم کو بغیر ماں باپ کے پیدا فرمایا صرف لفظ کُنْ کہہ کر پیدا کیا، سو جس نے آدم کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا وہ بغیر باپ کے پیدا نہیں کر سکتا؟ اگر یہ لوگ بغیر باپ کے پیدا ہونے والے کو اللہ کا بیٹا ٹھہراتے ہیں تو یہ دعویٰ آدم پر بطریق اولی صادق آتا ہے، لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام کو بیٹا کہنے کا دعویٰ بالکل باطل اور لغو ہے۔ آدم کو بغیر نر اور مادہ کے پیدا کیا اور حوا کو بغیر عورت کے مرد سے پیدا فرمایا باقی مخلوق کو مرد اور عورت سے پیدا فرمایا چنانچہ سورۂ کریم میں ارشاد فرمایا "تیرے رب کی طرف سے حق ہے یعنی عیسیٰ کے حق میں سچی بات یہی ہے۔" اور فرمایا "کہ حق کے بعد تو پھر گمراہی ہے۔"

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "کہ اے محمد ﷺ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تم ان سرکش لوگوں کو مباہلہ کے لئے بلاؤ۔ ابن اسحاق نے سیرت میں لکھا ہے کہ نجران سے ساٹھ عیسائی آئے تھے ان میں چودہ آدمی اہل دانش تھے ان کا سربراہ عاقب عبدالمسیح تھا، ان کا سردار ایسم تھا، ابو حارثہ بن علقمہ برادر بکری بن وائل وغیرہ، پھر ان سب کے تین امیر تھے عاقب صاحب رائے تھے اور انہیں کے مشورے سے تمام معاملہ طے پائے تھے دوسرے سید تھے جو صاحب مدارس تھا، یہ آدمی بکر بن وائل سے عرب تھا لیکن نصرانی ہوا تو بادشاہ روم نے اس کی بڑی عزت کی اس کے لئے گرجے بنائے گئے ان کا اسے متولی بنایا گیا یہ سابقہ کتب میں سے آپ ﷺ کے اوصاف جانتا تھا لیکن اپنی وجاہت اور اقتدار کی بنا پر انہیں چھپا گیا، یہ لوگ مسجد نبوی میں عصر کے وقت داخل ہوئے بہت عمدہ اتنے میں ان کی نماز کا وقت ہو گیا تو وہ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو نماز پڑھنے دو انہوں نے مشرق کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی اور آپ ﷺ نے ان سے بات چیت کی، حارثہ بن علق عاقب سید باوجود دین کے معاملے میں بادشاہ سے اختلاف کے باوجود عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا یا اللہ کہتے تھے ثالث ثلاثہ کہتے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے قول سے برتر ہے اسی طرح تمام نصاریٰ ان کو اللہ کہتے تھے اور دلیل یہ دیتے کہ وہ مردوں کو زندہ کر دیتے، پھلبہری والے کو اچھا کر دیتے، غیب کی خبریں دیتے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ یہ تمام کام اللہ کے حکم سے ہوتا، اللہ

تعالیٰ نے نصاریٰ کے ان تینوں اقوال کو رد کیا۔ غرض یہ کہ جب دونوں بڑے پادریوں نے گفتگو کی تو آپ ﷺ نے فرمایا تم ایمان لے آؤ انہوں نے کہا کہ ہم تو پہلے ہی ایمان لا چکے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام تو اس بات سے روکتا ہے کہ تم عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہو، صلیب کی عبادت کرو اور سور کھاؤ، انہوں نے کہا کہ تم بتاؤ کہ عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟ آپ ﷺ کافی دیر خاموش رہے پھر وحی آنا شروع ہو گئی سورۃ آل عمران میں کچھ اوپر ایسی آیات نازل ہوئیں، آپ ﷺ نے ان کو مباہلہ کی دعوت دی تو انہوں نے الگ ہو کر باہم مشورہ کیا اور طے یہ کیا کہ حضرت محمد ﷺ سے مباہلہ نہ کیا جائے کیونکہ آپ ﷺ سچے مرسل ہیں اگر تم نے مباہلہ کیا تو تم سب تباہ ہو جاؤ گے، یہ مشورہ کر کے آپ ﷺ کو بتایا اور ساتھ یہ بھی کہا: آپ ﷺ اپنے دیں پر رہیں اور ہم اپنے دین پر ہیں البتہ ایک آدمی ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ جن اموال میں ہمارے درمیان اختلاف ہو وہ فیصلہ کر دے، ویسے ہم آپ ﷺ کو پسند کرتے ہیں۔ محمد بن جعفر کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ تم تیسرے پہر آؤ میں تمہارے ساتھ ایک قوی امین بھیج دوں گا عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے کبھی امارت کا شوق نہیں ہوا البتہ اس روز میری خواہش ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ مجھے بھیج دیں۔ چنانچہ میں یہ امید لے کر ظہر کے اول وقت میں مسجد میں آکر بیٹھ گیا آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی دائیں بائیں دیکھنا شروع کیا میں اونچا تھا کہ شاید میری طرف نظر پڑھ جائے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عبیدہ بن الجراح کو بلایا اور فرمایا کہ تم ان کے ساتھ جاؤ اس میں ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت بھی ہے، جب یہ لوگ کھڑے ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس امت کا امین ہے [رواہ الشیخان والترمذی والنسائی وابن ماجہ] بخاری میں انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اس امت کا امین عبیدہ ابن الجراح ہے ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابو جہل نے کہا کہ اگر میں محمد ﷺ کو کعبہ کے پاس نماز پڑھتے دیکھوں تو ان کی گردن مار دوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر وہ ایسا کرتا تو ظاہر ظہور فرشتے اسے پکڑ لیتے اور اگر یہود موت کی آرزو کرتے تو مر جاتے اور اپنی جگہ جہنم میں دیکھ لیتے اور اگر مباہلہ کرنے والے باہر آتے تو پھر اپنے مال اور گھر بار کو نہ پاسکتے۔ [رواہ احمد، بخاری، ترمذی و نسائی] ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے بیہقی نے "دلائل نبوت" میں نجران کے وفد کا طویل قصہ بیان کیا ہے۔

ابن کثیر نے اسے اپنی تفسیر مین نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ نو (۹) ہجری میں ہوا۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جزیہ دیا وہ اہل نجران میں ہے۔ جو آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی وہ آیت ہے: "اور لڑو

ان سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ دن آخرت پر۔"

﴿اَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ﴾ سے مراد حضرت محمد ﷺ اور علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ﴿اَبْنَاءُ نَا وَاَبْنَائُكُمْ﴾ سے مراد حسن وحسین ہیں ﴿نِسَاءُ نَا وَنِسَاءُ كُمْ﴾ سے مراد فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔[رواہ ابن مردویہ] حاکم نے مستدرک میں روایت کرتے ہوئے کہا کہ یہ حدیث شرط مسلم، صحیح ہے۔

فائدہ: فتح البیان میں اس آیت کی تفسیر اس طرح ہے کہ اہل نجران نبی ﷺ کے پاس آئے ان میں سید وعاقب تھے انہوں نے آکر کہا کہ تم ہمارے صاحب یعنی عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیوں کرتے ہو، اگر تم اسے اللہ کا بندہ کہتے ہو تو پھر اس جیسا کوئی دیکھا یا سنا ہے تو دکھاؤ، یہ کہہ کر وہ واپس چلے گئے جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور کہا کہ اگر اب وہ آئیں تو ان سے کہنا: ((اِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ .... الایہ)) یہ اصل قصہ صحیحین میں روایت ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک عالم روم کے علاقہ میں قید ہوگئے تھے' اس نے عیسائیوں سے کہا کہ تم عیسیٰ علیہ السلام کو کیوں پوجتے ہو؟ اہل روم نے کہا کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے تو اس نے کہا کہ اس اعتبار سے تو آدم علیہ السلام پوجا کے زیادہ لائق ہیں کیونکہ ان کا باپ تھا نہ ماں تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے' اس نے کہا کہ اس اعتبار سے حزقیل زیادہ افضل ہیں اس لئے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فقط چار مردے زندہ کئے اور حزقیل نے چار ہزار افراد زندہ کئے، پھر انہوں نے کہا: وہ نابینا کو بینا کر دیتے تھے اور پھل بہری والے کو اچھا کر دیتے تھے، تو اس عالم نے کہا کہ اس لحاظ سے جرجیس اولیٰ ترین ہیں کیونکہ ان کو دیگ میں پکا کر جلا ڈالا تھا وہ بالکل تندرست صحیح سلامت اٹھ کھڑے ہوئے۔

آیت: ﴿قُلْ تَعَالُوْا نَدْعُ اَبْنَاءَ نَا﴾ اور اگرچہ عام ہے مگر مراد اس سے خاص لوگ ہیں یعنی نجران کے وہ نصاریٰ جو آپ ﷺ کے پاس آئے تھے یہ قصہ حاکم اور ابو نعیم نے دلائل میں لکھا ہے، سعد بن ابی وقاص کی حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت اتری تو آپ ﷺ نے علی فاطمہ حسن وحسین کو بلایا اور کہا: اے اللہ میرے گھر والے یہی ہیں۔[مسلم، ترمذی، ابن المنذر، الحاکم اور البیھقی] مگر جعفر بن محمد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں ابو بکر، عمر، عثمان اور علی مع اپنی اولاد کے آئے۔[ابن عساکر] ہوسکتا ہے کہ اہل دین کی جماعت کو بلانا عام ہو، گو سبب خاص ہے۔ اس میں مباہلہ کے جواز کی دلیل موجود ہے۔ اگر کوئی شخص عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حجت بازی کرے تو اسے مباہلہ کریں۔ امت اس بارے میں مقتدی ہے لڑکوں کا ذکر کیا ہے کیونکہ لڑکیاں نساء میں داخل ہیں یا یہ کہ دشمن کے مقابلے میں لڑکے ہی آتے ہیں۔ یہاں ابناء سے مراد حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اس لئے آپ ﷺ

انہیں کو ساتھ لے کر نکلے تھے معلوم ہوا کہ نواسوں کو بھی بیٹا کہتے ہیں،ابناء و نساء اور اعزا اہل ہوتے ہیں اس لئے انہی کو خاص کیا ابناء و نساء کو انفسنا اس لئے مقدم کیا کہ ان کا قرب و منزلت واضح ہو جائے مباہلہ اس لئے ہوتا ہے سچا جھوٹے سے الگ ہو جائے اس کام کے لئے مباہلہ لیکن ابناء اور نساء کا ساتھ لینا اس لیے ہے کہ ان کی ہمراہی سے زیادہ وثوق ثابت ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ مباہلہ نبی ﷺ کے یا آپ ﷺ کے زمانہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر زمانہ میں اہل کفر، مشرکین اور اہل کتاب سے شدید ضرورت کے وقت مباہلہ کیا جاسکتا ہے، اسے نبی ﷺ کے ساتھ خاص کرنا نری جہالت ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ حافظ ابن القیم کے زمانے میں کچھ لوگ منکرین صفات تھے اور ظاہر نصوص کی تاویل کرتے تھے آپ نے ان کو مباہلہ کی دعوت دی لیکن وہ مقابلے میں نہ آئے یہ قصہ ان کے " قصیدۂ نونیہ" میں مفصل مذکور ہے۔ اس سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی مباہلہ کرنا چاہا لیکن وہ نہ ہو سکا مباہلہ حجت قائم کرنے کے بعد ہر زمانہ میں ہو سکتا ہے مباہلہ کرنے والا اہل دین و صاف تقویٰ ہونا چاہیے تاکہ اگر مخالف پر فریق ظاہر ہو۔ آپ ﷺ نے وفد نجران سے توحید کے موضوع پر مباہلہ کرنا چاہا، ابن القیم نے صفات باری کے بارے میں مباہلہ کرنا چاہا رائے اور قیاس کے مقلدین عمل بالحدیث کے منکر ہیں ان سے تقلید شخصی پر مباہلہ کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ تقلید کے خلاف اس قدر نصوص و براہین تحریر و تقریر موجود ہیں کہ کوئی دقیقہ باقی نہیں رہا مگر مبتدعین و مقلدین اپنی بات پر اس طرح ڈٹے ہوئے ہیں کہ کسی دلیل و نص کو خاطر میں نہیں لاتے ایسی صورت میں ایک مباہلہ ہی سچائی کا معیار باقی بچتا ہے اگر وہ مباہلہ نہیں کرتے تو پھر ظہور مہدی کا انتظار کریں کہ اس وقت کفار و مشرک ہی نہیں بلکہ اہل تقلید و اصحاب رائے کا بھی دوالیہ ہو جائے گا یہ آیت نبی ﷺ کی رسالت پر بھی قطعی دلیل ہے حالانکہ وہ سابقہ کتب سے نبی ﷺ سے متعارف تھے اسی طرح اہل تقلید بھی حق کو پہچانتے ہیں جگہ جگہ ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُو الرَّسُوْل﴾ کا اعلان ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقلید باطل ہے ان سے مباہلہ کس بات پر ہو۔ نجران کے نصاریٰ سے مباہلہ کی وجہ ان کا تثلیث کا عقیدہ تھا مقلدین چار اماموں کو واجب الاتباع مانتے ہیں وہ شرک فی الالوہیت کرتے تھے یہ شرک فی الرسالۃ میں غرق ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محمد ﷺ کا قصہ جو ہم نے بیان کیا ہے یہی حق بات ہے پھر اگر وہ اس کا انکار کریں اور شرک کریں، اللہ ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے وہ ان کے فساد کا ان کو بدلہ ضرور دے گا ہر گز وہ اس کے غصہ سے نہیں بچ سکتے۔ اللہ کریم ہمیں اپنے عذاب سے محفوظ رکھے اور ہر باطل سے بچا کر راہ حق پر چلنے کی توفیق بخشے۔

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٦٤﴾

کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی) ہے اس کی طرف آؤ وہ یہ کہ اللہ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں، اور ہم میں کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے، اگر یہ لوگ (اس بات کو) نہ مانیں تو (ان سے) کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم (اللہ کے) فرمانبر دار ہیں۔

ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ خطاب اہل کتاب اور ان جیسے دیگر لوگوں کو جو ان جیسی چالیں چلتے ہیں۔ جملہ مفیدہ کو کلمہ کہتے ہیں۔ اس کلمہ کی یہ صفت بیان کی وہ عدل وانصاف ہے ہم اور تم اس میں برابر ہیں وہ کلمہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں۔ بت ہو یا صلیب یا کوئی جہنمی طاغوت ہو تمام رسولوں کی یہی دعوت تھی اللہ کا ارشاد ہے: ”ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری عبادت کرو۔“ مزید فرمایا: ”ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔“

پھر فرمایا کہ بعض لوگ بعض کو رب نہ ٹھہرائیں جس طرح اہل کتاب نے اپنے علماء اور مشائخ کو رب ٹھہرایا، انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور درویشوں کو معبود ٹھہرایا۔ یا جس طرح مقلدین امت اسلام نے مولویوں درویشوں اور اماموں کی اپنا رب ٹھہرایا ہے کہ ان کی بات کے مقابلے میں اللہ اور اس کے رسول کی بات نہیں مانتے ان کی رائے وقیاس واجتہاد کو نصوص کتاب وسنت پر مقدم رکھتے ہیں۔ ارشاد ہے ”اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔“

ابن جریج کہتے ہیں کہ ارباب کو معبود بنانے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی معصیت میں بعض نے بعض کی اطاعت کی۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ بعض لوگ بعض کو سجدہ کرتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر وہ اس عدل والی حق بات سے انکار کریں تو تم گواہ رہو اپنے اسلام پر مستقل مزاجی سے جیسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے شریعت بنائی ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں ہم نے شرح بخاری میں ابوسفیان کے قصہ کے ضمن میں بیان کیا کہ قصیر نے ان سے حسب ونسب نبی علیہ السلام کے وصف ودعوت کا حال پوچھا، تو انہوں نے صاف صاف سارا حال بیان کیا حالانکہ وہ اس وقت مشرک تھے بعد میں اسلام لائے یہ قصہ صلح حدیبیہ کے بعد کا ہے۔ اس کلمہ کا حاصل یہ ہے کہ جب قیصر کے پاس آپ ﷺ کا خط پہنچا اس نے اسے پڑھا اس میں لکھا تھا:

اللہ کے نام سے شروع جو بہت رحم کرنے والا مہربان ہے

روم کے بڑے بادشاہ ہرقل کے نام!

"سلام ہو اس پر جو ہدایت کے پیچھے چلے، اس کے بعد اسلام لاؤ اور محفوظ ہو جاؤ اللہ تمہیں دوہرا اجر دے گا اگر نہ مانو گے تو یاد رکھو کہ تم پر تمام رعایا کا بھی گناہ ہو گا اور اے اہل کتاب! آؤ ہم اس کے فرمانبردار ہیں۔"

محمد ابن اسحاق وغیرہ نے کہا کہ سورہ آل عمران کی اسی سے زیادہ ابتدائی آیات وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئیں۔ زہری نے کہا کہ پہلے جذیہ دینے والے یہی لوگ ہیں اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آیت جزیہ فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی اگر یہ آیت آپ ﷺ نے فتح مکہ سے پہلے ہرقل کو لکھی اپنے خط میں لکھی تو ابن اسحاق اور زہری کے قول کو جمع کرنا کئی طرح پر ہے اول یہ کہ یہ ایک دو بار اتری۔ ایک بار حدیبیہ سے پہلے، دوسری بار فتح مکہ کے بعد، دوئم یہ کہ سورۃ کی ابتدائی آیات وفد نجران کے بارے میں ہوں، تیسرے یہ کہ وفد نجران حدیبیہ سے پہلے آیا ہو اور جو انہوں نے مباہلہ سے صلح کر کے دینا منظور کیا تھا وہ جذیہ نہ ہو بلکہ بطور جہاد نہ اور مصالحہ ہو آیت جذیہ کا نزول اس کے موافق ہوا چوتھے یہ کہ نبی ﷺ نے جب ہرقل کو خط لکھا تھا اس وقت یہ آیت نہ اتری ہو پھر آپ ﷺ کے لکھنے کے مطابق ایک نازل ہوئی ہو، جس آیات سازی حجاب یا طلاق ازواج وغیرہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے موافق نازل ہوئیں۔ واللہ اعلم.

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ اس آیت کا خطاب اہل نجران کو ہے یا یہود مدینہ یا دونوں کے ہے۔ نظم قرانی کا ظاہر یہی عموم ہے بعض کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے ابن مسعود کی قرأۃ الٰی کلمۃ عدل سواء ہے یعنی اے اہل کتاب تم میری دعوت کو مانو وہ دعوت اسی کلمہ عادلہ مستقیمہ کی ہے وہ کلمہ توحید شرکیہ عبادت کو ترک کرنا ہے کیونکہ نصاری غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے، مسیح علیہ السلام کو الوہیت میں شریک باپ بیٹا روح القدس ثابت کرتے تھے، ایک اللہ کے تین الہ کر ڈالے ابن جریج کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود کو اس آیت کی طرف بلایا انہوں نے انکار کیا تو ان کے خلاف جہاد کیا آخر جذیہ دینے کا انہوں نے فیصلہ کیا قتادہ نے بھی لگ بھگ یہی کیا ہے۔ اتخاذ رب میں ہر ایک نصاریٰ کے لیے تنبیہ ہے کہ انہوں نے مسیح علیہ السلام و عزیر علیہ السلام کو رب سمجھ لیا ہے حالانکہ وہ جنس بشر سے تھے دوسرا اس میں مقلدین کے لئے عبرت ہے کہ ان کے ائمہ نے حلال کو حرام کر دیا اور مقلدین نے اسے مان لیا سو جو کوئی بھی ایسا کام کرتا ہے وہ متخذ رب ہے۔ بعض اہل علم نے کہا کہ یہاں ربوبیت سے مراد انہوں نے سرداروں کی اطاعت لی ہے اگرچہ ان کی عبادت نہ بھی کرتے ہوں مگر ایسے مطیع ہیں جیسے رب کے

مطیع ہیں۔

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٦٥﴾ هَاأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٦٧﴾ إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٨﴾

اے اہلِ کتاب تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات اور انجیل ان کے بعد اتری ہیں (اور وہ پہلے ہو چکے) تو کیا تم عقل نہیں رکھتے۔ دیکھو ایسی بات میں تم نے جھگڑا کیا ہی تھا جس کا تمہیں کچھ علم تھا بھی، مگر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو کچھ بھی علم نہیں، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ سب سے بے تعلق ہو کر ایک (اللہ) کے ہو رہے تھے اور اسی کے فرمانبردار تھے اور مشرکوں میں نہ تھے۔ ابراہیم سے قرب رکھنے والے تو وہ لوگ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں اور یہ پیغمبر (آخر الزماں) اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور اللہ مومنوں کا کارساز ہے۔

فائدہ: موضح القرآن میں ہے کہ یہود اور نصاریٰ میں یہ جھگڑا چلا آرہا تھا کہ ہر ایک گروہ کہتا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے دین پر تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تو ان کا کہنا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تورات وانجیل پر عمل کرتے تھے تو یہ صراحتہ بے عقلی ہے کیونکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی ہیں اور اگر ان کا یہ مقصد ہے کہ اس وقت بھی یہود و نصاریٰ ہی ہدایت کا نام تھا تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام یکسو اللہ کے فرمانبردار تھے۔ پھر فرمایا کہ اپنے راہ حق پر ہونے کی دلیل کی ضرورت تو اس وقت پڑتی ہے جب اپنے اوپر وحی نہ آتی ہو سو مسلمانوں کا والی، اللہ ہے یہ اس کے حکم پر چلتے ہیں۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کو جھٹلایا ہے کہ وہ انکے دین پر تھے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ نجران کے وفد میں یہود اور نصاریٰ کے علماء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اکٹھے ہوئے اور ہر ایک نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے یا نصاریٰ تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا عقل کے اندھو ابراہیم علیہ السلام تو تورات اور انجیل سے بہت پہلے ہو گذرے ہیں یہ ان لوگوں کے لئے تنبیہ ہے جو بغیر علم کے حجت کرتے ہیں جاہل ہو کر اہل علم سے جھگڑا کرتے ہیں نبی علیہ السلام کے بارے میں حجت کرتے تو بات تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ان کی کتابوں میں موجود تھا لیکن اس بارے میں حجت نہ تھی لیکن ابراہیم کے بارے میں کچھ

علم نہ تھا۔ انہوں نے اس بارے میں جھگڑا کیا، اللہ تعالیٰ نے اسے غیب جاننے والے اللہ کی طرف لوٹا دو جسے تمام حقائق کا علم ہے صفات باری تعالیٰ میں فرقہ جہمیہ معطلہ کا جھگڑنا بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے ہر صفت کی اپنی مرضی سے تاویل کرتے ہیں، سلف کی طرح اس کا علم اللہ کے سپرد نہیں کرتے یہی حال مقلدین کا ہے کہ بے سوچے سمجھے تقلید کے واجب ہونے پر سر پھوڑتے ہیں، اللہ اور رسول نے جس چیز کی اتباع کا حکم دیا ہے اسے پسند نہیں کرتے خود تو جاہل ہیں اور کتاب و سنت کا علم رکھنے والوں سے جھگڑا کرتے ہیں۔ حنیف کہتے ہیں کہ جو شرک سے الگ ہو کر ایمان قبول کرے جیسے ابراہیم علیہ السلام تھے سورہ بقرہ میں بھی اسی طرح کی آیت ہے۔

"انہوں نے کہا تم یہودی ہو جاؤ یا نصاریٰ تب ہدایت پاؤ گے۔" پھر فرمایا کہ ابراہیم کے اصل ماننے والے وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کی اطاعت کی یا پھر یہ نبی اور ان پر ایمان لانے والے ہیں خواہ مہاجر ہوں یا انصار۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ (مرفوع ہے) کہ ہر نبی کے لئے نبیوں میں کچھ دوست تھے اور میرے دوست میرے باپ خلیل اللہ ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں مذکور آیت تلاوت کی۔ [رواہ سعید بن منصور، ترمذی، البزاز]

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ یہ آیت اہل کتاب پر کھلی حجت ہے کہ تورات اور انجیل کا نزول تو ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد میں ہوا ان دونوں میں یہود و نصاریٰ میں کسی دین کا نام نہ تھا البتہ اسلام کا نام ہر کتاب میں موجود ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کا نام ہر کتاب میں موجود ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان کتنا عرصہ ہے۔ قرطبی نے کہا: ابراہیم علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام تک ہزار برس کا فاصلہ ہے موسیٰ علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام دو ہزار سال ہیں اس سلسلے میں لوگوں کے مختلف اقوال ہیں (جن پر کوئی نص نہیں ہے) قران پاک نے فیصل بات کی ہے "اس عرصہ میں بہت سے زمانے گذرے ہیں جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

اس بارے میں بلاوجہ جدل و نزاع ممنوع ہے بلکہ حدیث میں تو حق بات کو ترک نہ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے آپ صلی اللہ علیہ سلم کا ارشاد ہے جس نے حق پر ہوتے ہوئے بھی جھگڑنا چھوڑ دیا میں جنت میں اللہ کی طرف سے ایک گھر کا ضامن ہوں۔ البتہ امن طریقہ سے بحث و مباحثہ کو جائز رکھا گیا ارشاد ہوتا ہے "ان سے بہت اچھے انداز میں بحث و تمحیص کرو اور اہل کتاب سے نہ جھگڑا کرو مگر احسن طریقہ سے۔ اس زمانے میں جو جدال اور بحث و مباحثہ کا طریقہ رائج ہے۔ وہ جدال سے بڑھ کر سب و شتم کا مظہر ہے جو کہ یقیناً حرام ہے۔ مناظرہ و مجادلہ کا احسن طریقہ وہی ہے جس کا حکم قرآن و سنت میں موجود ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو حنیف اس لئے فرمایا کہ وہ تمام ادیان و باطلہ

سے الگ تھلگ ہو کر اسلام کے صراط مستقیم کی طرف گئے تھے، یہ دین تمام ادیان میں سب سے اچھا سب سے آسان اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے۔ شعبی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہود و نصاریٰ کی تمام حجت ختم کر دی ہے۔ یہ کہہ کر ان کا دعویٰ جھوٹا کر دیا کہ وہ مشرک نہ تھے جس طرح تم مشرک ہو، مسیح علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بتاتے ہو۔ حسن نے کہا کہ ہر مومن ولی ہے ابراہیم علیہ السلام کا ماضی میں ہو مستقبل میں ہو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابراہیم علیہ السلام سے دو نسبتیں ہیں: ایک یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی نسل اور اولاد میں سے ہیں۔ دوئم یہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین بعینہ دین ابراہیم علیہ السلام کے مطابق ہے۔ **واللہ الحمد.**

وَدَّتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّونَكُمْ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٦٩﴾ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٧٠﴾ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٧١﴾ وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٧٢﴾ وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ قُلْ إِنَّ الْهُدَى هُدَى اللَّهِ أَنْ يُؤْتَى أَحَدٌ مِثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٧٣﴾ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٧٤﴾	(اے اہلِ اسلام) بعض اہلِ کتاب اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ تم کو گمراہ کر دیں، مگر یہ (تم کو کیا گمراہ کریں گے) اپنے آپکو ہی گمراہ کر رہے ہیں اور نہیں جانتے۔ اے اہلِ کتاب تم اللہ کی آیتوں سے کیوں انکار کرتے ہو اور تم (تورات کو) مانتے ہو۔ اے اہل کتاب تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو اور حق کو کیوں چھوڑتے ہو۔ اور اہلِ کتاب ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ جو (کتاب) مومنوں پر نازل ہوئی ہے اس پر دن کے شروع میں تو ایمان لے آیا کرو اور اس کے آخر میں انکار کر دیا کرو تاکہ وہ (اسلام سے) برگشتہ ہو جائیں۔ اور اپنے دین کے پیرو کے سوا کسی اور کے قائل نہ ہونا (اے پیغمبر) کہہ دو کہ ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے (وہ یہ بھی کہتے ہیں) یہ بھی (نہ ماننا) کہ جو چیز تم کو ملی ہے ویسی کسی اور کو ملے گی یا وہ تمہیں اللہ کے روبرو قائم معقول کر سکیں گے، یہ بھی کہہ دو کہ بزرگی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ کشائش والا اور علم والا ہے۔ وہ اپنی رحمت سے جس کو چاہتا ہے خالص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل کا مالک ہے۔

موضح القرآن میں ہے یعنی تورات کے قائل ہو پھر اسی کی خلاف ورزی کرتے ہو تورات کے بعض حکم تو موقوف کر ڈالے تھے اپنی اغراض کے لئے اور بعض آیات کے معنی تبدیل کر ڈالے تھے اور بعض چیزیں چھپا

ڈالتے تھے جیسے کہ آپ ﷺ کی آمد کی خبر، بعض یہودیوں نے باہم مشاورت کی کہ تم صبح کو جاکر ظاہری طور پر مسلمان ہو جاؤ اور شام کو پھر جایا کرو تو شائد مسلمان بھی اپنا دین چھوڑ دیں اور ہمارے دین میں داخل ہو جائیں پھر کہنے لگے کہ اپنے دین والوں کے کسی کی بات کا ہرگز یقین نہ کرو تاکہ کسی کے دل میں سچا اسلام نہ بیٹھ جائے اللہ تعالیٰ نے ان کے فریب کا پردہ چاک کر دیا اور فرمایا کہ آپ ﷺ ان سے کہہ دیں کہ ہدایت کا مالک تو اللہ ہے جسے چاہتا ہے عطاء کرتا ہے تمہارے فریب سے کوئی گمراہ نہ ہو گا تمہارا یہ حسد کہ بزرگی اور نبوت بنی اسرائیل کے بجائے کسی اور فرقہ میں کیوں آگئی تو یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطاء کرتا ہے اسی پر کسی کا حق نہیں ہے۔

فائدہ: ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس آیت میں یہود کے حسد کی خبر دی ہے کہ وہ مؤمنوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں انہیں معلوم کہ ان کے اس حسد اور مکر کا وبال انہیں پر پڑے گا پھر بطور انکار فرمایا کہ تم جان بوجھ کر اللہ کی آیات کا انکار کیوں کرتے ہو آپ ﷺ کی صفات کو چھپاتے ہو مجاہد نے کہا کہ یہود صبح کی نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھتے اور شام کو کافر ہو جاتے، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ یہودیوں نے کہا جب تم آپ ﷺ کے ساتھیوں سے ملو تو دن کے پہلے حصہ میں ایمان لے آؤ اور دن کے آخری حصہ میں اپنی نماز پڑھو قتادہ کا بھی ہی قول ہے ربیع اور ابو مالک یہ بھی کہتے تھے تم اپنا بھید سوائے اپنے ہم مذہبوں کے دوسروں پر ظاہر نہ کرو کہ وہ ایمان لاکر الٹی تم پر حجت قائم کریں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ واضح آیات اور قاطع دلائل سن دیکھ کر مومنوں کے دلوں میں ایمان گھر کر جاتا ہے۔ اے گروہ یہود! اگر تم نے صفات محمد ﷺ کو چھپایا ہے تو اسے کیا فرق پڑتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے علم و فضل عطاء کرے تم ان کو اپنا علم نہ بتاؤ گے تو کیا ہوا اللہ ان کو بتادے گا جسے چاہے گمراہ کر دے، دل پر مہر لگادے آنکھوں پر پردہ ڈال دے، مسلمانوں تم پر اللہ کی مہربانی ہے کہ تمہیں ایسا پیغمبر عطاء کیا جو تمام انبیاء سے اشرف ہے تمہیں وہ شریعت دی جو تمام شریعتوں سے زیادہ کامل ہے۔

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ اہل کتاب کے گروہ سے یہاں مراد بنو نضیر اور بنو قریظہ ہیں اور بنی قینقاع یا تمام اہل کتاب مراد ہیں۔ حرف مِن بیان کے لئے ہے سفیان نے کہا کہ سورہ آل عمران میں جہاں کہیں اہل کتاب کا ذکر آیا ہے اس سے مراد نصاریٰ ہیں مگر اس میں نظر ہے۔ اس لئے کہ اس سورۃ میں بہت سی جگہوں پر خطاب یہود ہے جیسے کہ اسی باب کی آیت میں ہے آیٰتُ اللّٰہِ سے مراد نبی ﷺ کی نبوت کے دلائل ہیں جو ان کی کتابوں پہلے انبیاء سے منقول ہے یا وہ تمام آیات جن کو عناد و بغض کی بنا پر چھپاتے تھے حق کو باطل سے ملانے کا مطلب یہ

ہے کہ تحریف کرتے ہیں یا یہودیت اور نصرانیت کو اسلام میں گڈمڈ کرتے ہیں حالانکہ تم جانتے ہو کہ اللہ کے ہاں اسلام کے بغیر کوئی دین قبول نہیں ہے۔ اہل کتاب کے اشراف نچلے درجے کے لوگوں سے کہتے ہیں کہ تم صبح کو مؤمن اور شام کو کافر ہو جاؤ تاکہ مسلمان متزلزل ہو جائیں لیکن انہیں معلوم نہیں ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کو اس طرح پختہ کر دیا ہے کہ دشمنوں کی کوئی چال کامیاب نہیں ہو سکتی۔ عبداللہ بن صیف عدی بن زید حارث بن عوف وغیرہ نے یہ بات کہی تھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اہل علم نے کہا ہے کہ آیت اس سورت میں مشکل ترین آیت ہے۔ واحدی نے کہا یہ آیت مشکلات القرآن سے ہے تفسیر اور اعراب کے اعتبار سے، رحمت سے مراد اسلام یا قرآن یا نبوت یہ سب معانی شامل ہیں بہر حال یہ آیت دلیل اس بات پر کہ نبوت کوئی استحقاقی چیز نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل ورحمت پر منحصر ہے اور نہ ہی کوئی کسبی چیز ہے۔

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾ بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿٧٦﴾

اور اہلِ کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے پاس (روپوں کا) ڈھیر امانت رکھ دو تو تم کو (فوراً) واپس دیدے اور کوئی اس طرح کا ہے اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو تو جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو تمہیں دے ہی نہیں یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ امیوں کے بارے میں ہم سے مواخذہ نہیں ہوگا، یہ اللہ پر محض جھوٹ بولتے ہیں اور (اس بات کو) جانتے بھی ہیں۔ ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرے اور (اللہ سے) ڈرے تو اللہ ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بتایا کہ جن لوگوں کا وطیرہ یہ ہے کہ پرایا مال یعنی دوسرے دین والوں کا کھانا اور امانت میں خیانت کرنا ان کے لئے روا ہے تو دین کے معاملہ میں ان کی بات کی کیا سند ہو سکتی ہے۔ ہمارے یہاں اگرچہ کافر حربی کا مال زبردستی لینا روا ہے، لیکن امانت میں خیانت کرنا جائز نہیں ہے۔

فائدہ: ابن کثیر کہتے ہیں کہ اللہ نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ یہود خائن ہیں مسلمانوں کو ڈرایا ہے کہ ان کے پھندے میں نہ آنا ان میں دو طرح کے لوگ ہیں ایک وہ کہ اگر خزانہ ان کے پاس امانت ہو تو واپس کر دیں دوسرے وہ جو ان کے پاس ایک دینار بھی امانت ہو تو وہ واپس نہ کریں قنطار کا معنی سورہ بقرہ میں گزر چکا ہے دینار معروف ہے۔

مالک بن دینار کہتے ہیں دینار اس لئے کہتے ہیں کہ دین و نار ہے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ جس نے حق کے ذریعہ لیا وہ اس کے لیے دَیْن اور اگر ناحق لیا تو وہ اس کے لئے نار ہے کسی نے کہا دینار کا آخر نار ہے درھم کا آخر ہم ہے۔

ترا مالك دينار نيستى سعدى، طريق نسبت بجز زهد مالك دينار

کہتے ہیں کہ سعدی کو چالیس دینار ورثہ میں ملے تھے، اس نے ان سے چالیس سال گذار لئے اور کسی سے کچھ نہ مانگا۔ ابن کثیر نے "كتاب الكفاله بخاری" سے ایک طویل حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع نقل کی ہے۔ اس قصہ میں بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ذکر کیا ہے جس نے اللہ کی ضمانت پر ایک ہزار درھم دینار قرض دیئے، قرض دار کو کوئی ایسی کشتی وغیرہ نہ ملی جس کے ذریعہ وہ قرض خواہ کے پاس جا کر قرض واپس کر دیتا۔ آخر کار اس نے اللہ توکل کرتے ہوئے ایک لکڑی میں سوراخ کر کے دینار اس میں ڈالے اور خط بھی لکھا اور لکڑی دریا کے حوالے کر دی، وہ لکڑی تیرتی ہوئی قرض خواہ کے ہاتھ لگی اس نے اپنا قرض وصول کر لیا۔ [رواہ احمد] اس حدیث میں امانت داری اور توکل اللہ علیہ کا انجام مذکور ہے۔ کچھ ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے اللہ کی ضمانت پر قرض دیا اور قرض دار نے بھی حق امانت ادا کر دیا۔ ایک وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا مال امانت لے کر کھاتے ہیں۔ اہل کتاب کہتے تھے کہ عربوں کا مال کھا لینا ہمارے لئے درست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تم دغا باز جھوٹے ہو۔" کسی کا مال ناحق کھانا جائز نہیں ہے عرب ہوں یا عجم۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی شخص نے پوچھا کہ ہم لڑائی میں اہل ذمہ کی مرغی بکری وغیرہ کھا لیتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے کہا تمہارا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا ہم تو اس میں کوئی ہرج نہیں جانتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! یہی تو اہل کتاب کا وطیرہ ہے انہوں نے کہا تھا: "جہل لوگوں کے بارے میں ان کا مال کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" جب اہل ذمہ نے جزیہ ادا کر دیا تو ان کی رضاء کے بغیر ان کا مال کھانا کیسے جائز ٹھہرا ہے۔

نیم بیضه که سلطان ستم روادارد اور زنند لشکر یانش هزار مرغ بیخ

یعنی اگر بادشاہ آدھا انڈا بھی ظلم سے کھالے تو اس کے لشکری سینکڑوں ذبح کر ڈالیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے اہل کتاب جو کوئی اپنا وعدہ پورا کرے گا اسے اللہ دوست رکھے گا۔ عہد سے مراد ایمان لانا ہے محمد ﷺ پر جب وہ مبعوث ہوں، کیونکہ تمام انبیاء سے اس بات کا عہد و پیمان لیا گیا تھا۔

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین اہل کتاب کی خیانت کا حال بیان کر دیا تو مال میں ان کی خیانت کا حال اس آیت میں بیان فرمایا: "دینار چوبیس قیراط کا ہوتا ہے ہر قیراط میں درمیانی درجہ کے تین جو ہوتے

ہیں اس طرح جو کی تعداد بہتر (۷۲) ہو گئی۔ مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ ایک چھوٹی سی امانت ادا نہیں کرتے وہ بڑی امانت کیسے ادا کر سکتے ہیں، ان کا کہنا تھا عرب کا مال ہضم کرنا حلال ہے کیونکہ وہ ہمارے دین کے مخالف ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٧﴾

جو لوگ اللہ کے اقراروں اور اپنی قسموں (کو بیچ ڈالتے ہیں اور (ان) کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں ان کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں، ان سے اللہ نہ تو کلام کرے گا اور نہ قیامت کے روز ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کو دکھ دینے والا عذاب ہو گا۔

یہ صفت یہود میں تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اقرار لیا تھا اور قسمیں دلائیں تھیں کہ ہر نبی کے مددگار رہیں گے لیکن انہوں نے اس سے انحراف کیا اب جو کوئی بھی دنیاوی غرض کے لئے جھوٹی قسم کھائے اس کا بھی یہی حال ہو گا۔

فائدہ: اہل کتاب نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ ہم محمد ﷺ کی اتباع کریں گے اور ان کی صفات لوگوں پر ظاہر کریں گے اس پر جھوٹی قسمیں بھی کھائیں پھر رذیل دنیا کی خاطر یہ عہد اور قسمیں توڑ ڈالیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب تمہارا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو گا نہ تم بات کرنے کے لائق ہو اور نہ تم گناہوں سے پاک ہو سکو گے ، تم جہنم کا ایندھن بنو گے۔ اس سلسلے میں ابن کثیر نے بعض احادیث بیان کی ہیں جن کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ تین اشخاص ہیں جن سے اللہ نہ کلام کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا، ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے۔ میں نے عرض کیا: اے رسول اللہ! وہ تو تباہ و برباد ہو گئے، آپ نے تین مرتبہ یہی فرمایا: چادر لٹکانے والا، (ناجائز) مال کھانے والا، جھوٹی قسم کھا کر احسان دھرنے والا۔ [احمد، مسلم واهل سنن]

دوسری حدیث میں الفاظ ہیں: تین اشخاص کو اللہ تعالیٰ دشمن گردانتا ہے۔ قسم کھا کر مال بیچنے یا خریدنے والا تاجر، متکبر فقیر، احسان دھرنے والا بخیل۔ [رواہ احمد]

یہ حدیث غریب ہے۔ عدی بن عمیر کندی کا کہنا ہے کہ امرء القیس بن عامر کندی نے ایک حضرمی شخص سے زمین کے بارے میں تنازعہ کیا نبی ﷺ کے سامنے تو آپ ﷺ نے حضرمی سے کہا کہ گواہ لاؤ اس کے پاس گواہ نہ تھا امراء القیس سے کہا قسم کھاؤ، حضرمی نے کہا: اے رسول خدا! آپ ﷺ نے قسم لی قسم رب کعبہ کی میری زمین گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا جس نے جھوٹی قسم کھائی تاکہ کسی کا مال کھائے، ایسا شخص جب اللہ سے ملے گا تو

اس پر غضبناک ہوگا۔ پھر یہ آیت پڑھی: "جو لوگ خرید کرتے ہیں..............الخ"

امرءالقیس نے عرض کیا بھلا جو کوئی شخص جھوٹی قسم کھانا چھوڑ دے اسے کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا جنت، اس نے عرض کیا آپ ﷺ گواہ رہیں میں نے جنت کے لئے اسے ترک کر دیا۔

وَإِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيقًا يَلۡوُونَ أَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتَابِ لِتَحۡسَبُوهُ مِنَ الۡكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُونَ ﴿٧٨﴾

اور ان (اہلِ کتاب) میں بعض ایسے ہیں کہ کتاب (تورات) کو زبان مروڑ مروڑ کر پڑھتے ہیں تاکہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھتے ہیں کتاب میں سے ہے حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے (نازل ہوا) ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور (یہ بات) جانتے بھی ہیں۔

فائدہ: ابن کثیر کہتے ہیں کہ اللہ نے اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ کلمات میں تحریف کرتا ہے اور اللہ کی مراد کو بدل کر جاہلوں کو تاثر دیتا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دیدہ دانستہ دلیری کرتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں۔ مجاہد، قتادہ، شعبی، ربیع نے کہا کہ زبان مروڑنے سے مراد تحریف کرنا ہے۔ بخاری نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ تحریف کرتے ہیں کہ اس سے اللہ کی مراد کا ازالہ ہو جائے ورنہ مخلوق میں کسی کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ کا کلام بدل ڈالے البتہ معنی میں الٹ پھیر کرتے ہیں وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ تورات اور انجیل بھی اسی طرح غیر مبدل ہیں جیسے اتریں تھیں ہاں یہ لوگ تاویل و تحریف کے سبب گمراہ ہو گئے چنانچہ کچھ کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھتے، پھر کہتے ہیں کتاب اللہ ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہ تھیں کیونکہ اللہ کی کتابیں محفوظ ہیں جو بدل نہیں سکتیں۔ [رواہ ابن ابو حاتم]

ابن کثیر کہتے ہیں کہ اگر تو وہب کی مراد وہ کتابیں جو اس وقت اہل کتاب کے ساتھ میں ہیں تو ان میں تو یقیناً تحریف ہوئی ہے اور وہ کتابیں مراد ہیں جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئیں تھیں تو وہ کتابیں بلاشبہ محفوظ ہیں ان میں کوئی شے داخل نہیں ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ مسئلہ تحریف میں دو قول ہیں: اول یہ کہ تحریف لفظی ہوئی، دوئم یہ کہ تحریف لغوی ہوئی۔ محققین کہتے ہیں کہ تحریف دونوں طرح سے ہوئی لفظ اور معنی دونوں کا محفوظ رہنا خاصہ قرآن ہے کیونکہ سابقہ کتابوں کے الفاظ و معنی معجزہ نہ تھے کہ ان میں کوئی تحریف نہ ہو سکتی ہو، یہ ذمہ تو اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن کے بارے میں لیا ہے، ارشاد ہے: "ہم نے ہی قرآن اتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔" آج تورات اور انجیل کے جس قدر نسخے دنیا میں موجود ہیں سب میں تحریف ہو چکی ہے کیونکہ ایک دوسرے سے

مختلف ہیں اگر تحریف نہ کی گئی ہوتی تو ان میں اختلاف نہ پایا جاتا یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اہل کتاب نے دنیاوی اغراض کے لئے اپنی کتابوں میں ہر طرح کا ردوبدل کیا، ہر مذہب کے بے دین بدعتی لوگ اسی طرح کیا کرتے ہیں، اہل بدعت واہل رائے نے قرآن کے معانی کو بدلنے کی پوری کوشش کی لیکن علماء کتاب وسنت نے ان کے داؤ کو ہمیشہ مات دی، مناظرے کے وقت اہل باطل ہمیشہ منہ کی کھاتے ہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿۸۰﴾

کسی آدمی کو شایاں نہیں کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ، بلکہ (اس کو یہ کہنا سزاوار ہے کہ اے اہل کتاب) تم (علمائے) ربانی ہو جاؤ کیونکہ تم کتابِ (اللہ) پڑھاتے رہتے ہو۔ اور اس کو یہ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو اللہ بنالو، بھلا جب تم مسلمان ہو چکے تو کیا اسے زیبا ہے کہ تمہیں کافر ہونے کو کہے۔

فائدہ: یہودی مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تمہارا نبی ﷺ ہم سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو جبکہ ہم تو پہلے ہی سے اللہ کی بندگی کرتے ہیں مگر وہ چاہتا ہے کہ میری بندگی کرو سو اللہ نے فرمایا کہ جسے اللہ تعالیٰ نبی بنائے اور لوگوں کو کفر سے نکال کر اسلام میں داخل کرے، ایسا شخص انہیں کفر کی تلقین کیسے کرے گا مگر تمہیں یہ ضرور کہتا ہے کہ تم میں پہلے جو دینداری تھی، کتاب کا پڑھنا اور سیکھانا وہ بات نہیں رہی اب میری طاعت میں وہی کمال حاصل کرو۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ جب نجران کے وفد میں یہود و نصاریٰ کے احبار آئے تو انہیں آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مسلمان ہو جاؤ تو ابو رافع قرظی نے کہا! اے محمد کیا تم چاہتے ہو کہ ہم بھی اسی طرح تمہاری پوجا کریں جس طرح نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا! معاذ اللہ کہ ہم غیر اللہ کی پوجا کریں یا کسی کو غیر اللہ کی عبادت کا حکم دیں۔ اللہ نے مجھے اس لئے نہیں بھیجا۔ اس پر یہ آیت اتری ہے [رواہ محمد بن اسحاق] اہل کتاب اپنے احبار و رھبان کو پوجتے تھے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے احبار اور رھبان کو رب بنالیا۔"

سنن ترمذی میں ہے کہ عدی بن حاتم نے کہا اے رسول اللہ (عوام) نے ان کی پوجا نہیں کی البتہ ان کے علماء نے جو کچھ ان کیلئے حلال کیا اور حرام کیا، انہوں نے اسے مان لیا یہی ان کی عبادت تھی ابن کثیر کہتے ہیں کہ احبار

رھبان اور مشائخ اس میں داخل ہیں باخلاف رسولوں اور ان کے ماننے والوں کے کہ علماء باعمل ہیں وہ اسی بات کا حکم کرتے ہیں جس کا حکم اللہ نے دیا اور اسی چیز سے روکتے ہیں جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا تمام رسول خالق اور مخلوق کے مابین سفیر ہیں اور رسالت کی امانت کے حامل وامین ہیں۔ عدی بن حاتم کی حدیث اس بات پر نص قاطع ہے کہ اہل علم کی رائے پر چلنا عبادت ہے اور جب ان کی اتباع ہو گی تو وہ علماء اور فقراء معبود ٹھہریں گے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسانوں کی تقلید (جو کتاب وسنت کے خلاف ہو) شرک ہے جس کی بنیاد اہل کتاب سے شروع ہوئی رسولوں کا کہنا تو ہے کہ تم ربانی بنو۔ ابن عباس وغیرہ نے کہا! ربانیین کے معنی حکماء، علماء، حلیم ہیں۔ حسن وغیرہ نے کہا کہ کتاب وسنت کے جاننے والوں کو ربانیین کہتے ہیں۔ حسن کا دوسرا قول ہے کہ اس سے مراد اہل عبادت واہل تقویٰ ہیں۔ ضحاک نے "بما کنتم تعلمون الکتاب" کے معنی کئے ہیں کہ جس نے قرآن سیکھا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ فقیہ ہو" تعلمون" کے معنی "تفھمون "بعض نے تشدید کے ساتھ تعلیم سے پڑھا ہے "تدرسون" سے الفاظ کا حفظ کرنا مراد لیا ہے۔ فرمایا کہ کوئی بشر (اللہ سے ہدایت پاکر) اللہ کے سوا کسی کی نبی یا فرشتے کی عبادت کا حکم نہ دے گا جو داعی الی الکفر ہے۔ ایمان یہ ہے کہ صرف اللہ کی عبات کی جائے۔ ارشاد ہوتا ہے: "ہم نے تجھ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے ان سب کی طرف ہم نے یہی وحی کہ اللہ کے سوائی کوئی معبود نہیں فقط میری عبادت کرو۔ "اور فرمایا: "ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا تجھ سے پہلے (اور کہا) کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے بچو۔ تجھ سے پہلے جو رسل ہم نے بھیجے ان سے پوچھ کہ کیا ہم نے کوئی معبود مقرر کیا جس کی وہ عبادت کریں۔ "پھر فرشتوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا: "اور جو کوئی ان میں سے کہے کہ میں اس کے سواء معبود ہوں! پس اسے ہم جہنم کی سزا دیں گے اور ظالموں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔"

فتح البیان میں ہے کہ لفظ بشر سے مراد اس جگہ تمام بنی آدم ہیں یعنی کسی ایک آدمی کا بھی یہ رتبہ نہیں ہے کہ وہ کتاب حکم اور نبوت کے دعوی پر اپنی خدائی کا حکم دے حکم سے مراد فہم وعلم ہے یا اللہ کا حکم نافذ کرنا ہے، پہلا قول زیادہ بہتر ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام پر افتراء کیا جو کہ صحیح نہیں ہے ربانی مربی کو کہتے ہیں جو لوگوں کو علم صغیر سکھائے، پھر علم کبیر بتلائے، گویا کاموں کو سہل بنا کر رب قدیر کی اقتداء کرتا ہے۔ مبرد کہتے ہیں ربانیین سے مراد اصحاب علم ہیں ربانی وہی عالم ہے جو رب قوی کے ساتھ تعلق رکھتا ہو۔

جس روز ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فوت ہوئے تو محمد بن حنیفہ نے کہا: آج اس امت کا ربانی مر گیا۔

بعض نے کہا کہ مرادولات الامر اور علماء ہیں میں کہتا ہوں کہ اس سے مراد خدا پرست علماء و فضلاء ہیں۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے:

((حدیث عشق محابا بایدچه سریانی په عبرانی))

باکلی کہتے ہیں کہ: «تعلمون بتشدید ابلغ» ہے کہ کبھی عالم غیر معلم ہوتا ہے۔ تخفیف صرف علم پر دال ہے تدرسون بھی اسی کا مؤید ہے۔ دراست مذاکرہ علم وفقہ کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ علم و تعلیم و دراست آدمی کو ربانی بنادیتے ہیں۔ بھلا کوئی اسلام لانے کے بعد کفر کا حکم بھی دے سکتا ہے۔؟ کسی نے آپ ﷺ سے اجازت چاہی کہ آپ ﷺ کو سجدہ کرے اس پر یہ آیت نازل ہوئی معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کسی کو بھی سجدہ کرنا کفر ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨١﴾ فَمَن تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٨٢﴾

اور جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہو گا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہو گی، اور (عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اس اقرار پر میرا ذمہ لیا (یعنی مجھے ضامن ٹھہرایا) انہوں نے کہا (ہاں) ہم نے اقرار کیا، (اللہ نے) فرمایا کہ تم (اس عہد و پیمان کے) گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔ تو جو اس کے بعد پھر جائیں وہ بد کردار ہیں۔

فائدہ: اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ آدم سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک ہر نبی سے ہم نے عہد لیا تھا کہ جس کسی کو ہم کتاب و حکمت دے کر بھیجا تو بعد میں آنے والا رسول اس سے پہلے رسول کی مدد کرے اس پر ایمان لائے یہ نہ ہو کہ بعد میں آنے والے رسول کا علم و نبوت پہلے کی نصرت میں مانع ہو۔ موضح القرآن میں ہے کہ اللہ نے نبیوں میں سب سے پہلے نبی اسرائیل سے اقرار لیا تھا۔ ابن عباس قتادہ سدی وغیرہ کہتے ہیں کہ اصرؔ سے مراد عہد ہے۔ ابن اسحاق نے کہا کہ اس سے مراد میثاق شدید مؤکد ہے۔ علی ابن ابو طالب اور ابن عباس کہتے ہیں کہ اللہ نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس سے یہ اقرار لیا کہ اگر محمد ﷺ کو بھیجیں اور وہ نبی زندہ ہو تو ان پر ایمان لائے، ان کی مدد کرے اور اپنی امت سے اس بات کا عہد لے کہ اگر وہ محمد ﷺ کے مبعوث ہونے تک زندہ موجود باقی ہوں تو ان پر ایمان لائے اور ان کا مددگار بنے۔ عبد اللہ بن ثابت کہتے ہیں کہ ایک روز عمر رضی اللہ تعالیٰ

عنہ آپؐ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ مجھے قرظی یہودی نے تورات کے چندہ جامع کلمات لکھ دیئے ہیں فرمائیں تو آپ کو سناؤں؟ آپ ﷺ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ابن ثابت نے کہا!اے عمر!تم آپ ﷺ کا روئے مبارک نہیں دیکھتے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پڑھنا شروع کیا:((رضیت باللہ رباً و بالاسلام دینا وبمحمد رسولاً))تب آپ ﷺ کا غصہ فرو ہوا اور فرمایا:"قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم میں موسیٰ علیہ السلام آ جائیں اور تم اسکی پیروی کرو اور مجھے چھوڑ دو تو تم گمراہ ہو جاؤ گے، تم امتوں میں میرا حصہ ہو اور نبیوں میں سے میں تمہارا حصہ ہوں۔" [رواہ احمد] حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع آیا ہے کہ اہل کتاب سے مت پوچھا کرو کچھ اس لئے کہ وہ خود گمراہ ہیں تو تم یا تو باطل کی تصدیق کرو گے یا سچ کو جھٹلاؤ گے ،واللہ!حال یہ ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام تم میں زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اطاعت کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔ابن کثیر نے اس سلسلے میں جو لکھا ہے اس کا خلاصہ کلام یہ ہے کہ سارے انبیاء میں بڑے امام یہی ہیں جس زمانے میں ہوتے واجب الطاعت تھے تمام انبیاء پر مقدم رہتے، جب شب المعراج میں تمام انبیاء بیت المقدس میں جمع ہوئے تو سب کے امام آپ ﷺ ہی تھے ،سب میں شفیع فیصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مقام محمود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے۔ واللہ الحمد.

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے ہر پہلے نبی سے پچھلے نبی کی نصرت کا عہد و پیان لیا تھا کہ اگر خود اس نبی کی آمد پر زندہ ہو تو اس پر ایمان لائے اور اس کا مددگار ہو ورنہ اپنی امت کو فرمایا کہ اگر موسیٰ تمہارے درمیان زندہ ہو تو انہیں میری پیروی کے سوا چارہ نہ ہو ابن کثیر میں یہ الفاظ ہیں:"یہ وہ امام اعظم ہیں جو کسی بھی زمانہ میں پائے جائیں تو انہی کی طاعت واجب ہو گی اور ان کی طاعت تمام انبیاء کی طاعت پر ہے، چنانچہ اسی لیے انہیں معراج کی رات تمام انبیاء کا امام بنایا گیا بیت المقدس میں اسی طرح قیامت کے دن رب ذوالجلال جب بندوں کے درمیان فیصلہ کے لئے تشریف لائیں گے تو آپ ﷺ گنہگاروں کی سفارش فرمائیں گے اور سفارش کا یہ وہ مقام محمود ہے جس کے لئے آپ ﷺ ہی کی ذات شایانِ شان ہے۔" الحمد اللہ.

فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے ہر پہلے نبی سے بعد میں آنے والے نبی سے عہد و پیان لیا کہ اگر وہ خود اس نبی کو پاوے تو اس پر ایمان لائے اس کی نصرت کرے اور اپنی امت کو حکم دے کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی نصرت کریں۔ موسیٰ سے عیسیٰ کے لئے عہد لیا اور عیسیٰ سے نصرت محمد ﷺ کے لئے عہد لیا کہ وہ ان پر ایمان لائیں۔ ابن کثیر نے کہا کہ اس سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کا ذکر تورات اور انجیل میں موجود ہے، بغوی

نے کہا کہ عہد اسی وقت لیا گیا جب آدم سے ان کی اولاد کو نکالا۔ رازی نے کہا اس میثاق سے مراد وہ دلائل ہیں جو اتباع الٰہی کو عقلوں کے لئے لازمی قرار دیتے ہیں لیکن ظاہر آیت سے پہلا قول ہی اولیٰ ہے۔ یہ میثاق شہادت کے ساتھ رجسٹرڈ ہے اور جو اسی سے پھر گیا وہ نافرمان ہے۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿٨٣﴾ قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿٨٤﴾ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٨٥﴾

کیا یہ (کافر) اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ سب اہلِ آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے اللہ کے فرمانبردار ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو کتاب ہم پر نازل ہوئی اور جو صحیفے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اترے اور جو کتابیں موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے انبیاء کو پروردگار کی طرف سے ملیں سب پر ایمان لائے ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (اللہ ئے واحد) کے فرمانبردار ہیں۔ اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔

فائدہ: اسی روایت میں اس شخص کی تردید کی گئی جو اللہ کے دین کے سوا کسی اور دوسرے دین کا متلاشی ہو، اللہ کا دین وہی ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اسی کی عبادت کریں جس کا حکم تمام کائنات زمین و آسمان میں جاری ہے خوشی ناخوشی سے جیسے کہ ارشاد ربانی ہے "اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی اور ناخوشی سے۔" اور فرمایا: "کیا وہ نہیں دیکھتے جو اللہ نے اشیاء پیدا کی ہیں ان کے سائے دائیں بائیں جھکتے ہیں اللہ کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے اور وہ اس کے فرمانبردار ہیں اور اللہ ہی کے لئے سجدہ ریز ہے جو چیز آسمانوں اور زمین میں ہے تمام چوپائے اور فرشتے اور وہ تکبر نہیں کرتے اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں وہ بجالاتے ہیں جن کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔"

سو ہر مومن دل و جان سے اللہ کا فرمانبردار ہے کافر ناخوشی سے تابعدار ہے عطاء بن ابی رباع مرفوع کہتے ہیں کہ ممن فی السموت سے مراد ملائکہ ہیں اور من الآرض سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اسلام پر پیدا ہوا ہے۔ ابن عباس نے کہا یہ اسلام سے میثاق مراد ہے جو اللہ نے ذریت آدم سے لیا تھا۔ اسباطؔ یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہتے

ہیں یہ بارہ گروہ تھے، ہمارے اوپر قرآن پاک اترا اور مذکور انبیاء پر صحیفے اترے موسیٰ پر تورات اور عیسیٰ پر انجیل اتری نبیوں کا لفظ عام ہے جو بالاجمال تمام انبیاء کو شامل ہے اس امت کے لوگ ہر نبی رسل اور منزل من اللہ کتاب پر ایمان لائے ہیں کسی ایک کا بھی انکار نہیں کرتے پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کوئی اللہ کے بتلائے ہوئے طریقے کے علاوہ کوئی طریقہ چاہے گا تو وہ مقبول نہ ہو گا بلکہ ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہو گا جیسے کہ حدیث میں آیا ہے جو کوئی ایسا عمل کرے جس پر ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ عمل مردود ہے! ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع مروی ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے حضور اعمال پیش ہوں گے نماز کہے گی اے میرے رب! میں نماز ہوں۔ اللہ پاک فرمائیں گے بہتر ہے اسی طرح صدقہ، روزہ کہے گا اللہ کریم سب سے فرمائیں گے بہتر ہے پھر اسلام آئے گا اور کہے گا اے اللہ میں اسلام ہوں اللہ فرمائیں گے آج میں تجھ سے لین دین کروں گا پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا﴾ [رواہ احمد]

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں آپ ﷺ نے اپنی امت سے خبر دی ہے انبیاء کا خصوصاً ذکر کیا کہ اہل کتاب ان کے وجود کے معترف ہیں، ان کی نبوت میں کسی کو اختلاف نہیں ہے اسباط سے اس جگہ مراد پوتے ہیں۔ کیونکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے لغوی معنی مراد نہیں جس کا معنی نواسے ہوتے ہیں یہود و انصاری بعض انبیاء کو مانتے تھے اور بعض کا انکار کرتے تھے یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ کے ہاں قبول دین یہی دین اسلام ہے اس کے سوا کوئی دین مقبول نہیں۔

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٨٦﴾ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٨٩﴾

اللہ ایسے لوگوں کو کیونکر ہدایت دے جو ایمان لائیکے بعد کافر ہو گئے اور (پہلے) اس بات کی گواہی دے چکے کہ یہ پیغمبر برحق ہے اور ان کے پاس دلائل بھی آگئے اور اللہ بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور انسانوں کی سب کی لعنت ہو۔ ہمیشہ اس لعنت میں (گرفتار) رہیں گے ان سے نہ تو عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ ہاں جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اپنی حالت درست کر لی تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ (ایک نصاری تھا جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہو کر شرک میں مبتلا

ہو گیا پھر نادم ہوا اور اپنے قبیلہ سے کہا کہ آپ ﷺ سے پوچھیں کہ کیا میری توبہ قبول ہو گی یا نہیں؟ اس پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی (اسے ابن جریر، حاکم اور ابن حبان نے روایت کیا) البینات سے مراد دلائل کا قائم ہونا ہے جو آپ ﷺ کی نبوت پر روشن دلائل ہیں یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ جو کوئی توبہ کرتا ہے اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ مرتد کی توبہ قبول ہے۔ کسی نے کہا کہ توبہ کے ساتھ عمل صالحہ بھی ضروری ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَى بِهِ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ﴿٩١﴾

جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے پھر کفر میں بڑھتے گئے، ایسوں کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہو گی اور یہ لوگ گمراہ ہیں۔ جو لوگ کافر ہوئے اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے وہ اگر (نجات حاصل کرنی چاہیں اور) بدلے میں زمین بھر کا سونا دیں تو ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، ان لوگوں کو دکھ دینے والا عذاب ہو گا، اور ان کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔

فائدہ: پہلے یہود اقرار کرتے تھے کہ یہ نبی برحق ہے جب وہ تشریف لائے تو منکر ہو گئے پھر ان کا انکار بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ جنگ وجدل کے لئے تیار ہو گئے تو ایسے لوگوں کی ہرگز توبہ قبول نہ ہو گی یعنی ان کو توبہ کرنا نصیب ہی نہ ہو گا۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس آیت میں وعید وتنبیہ ہے ان لوگوں کیلئے جو ایمان لانے کے بعد کفر پر جم گئے کہ مرتے دم تک ان کو توبہ کرنا نصیب نہ ہو گی۔ جیسے کہ اللہ کا ارشاد ہے "ان لوگوں کی توبہ نہیں ہے جو برے اعمال کرتے رہے یہاں تک کہ ان کو موت آ پہنچی۔ الخ" ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ایک قوم مسلمان ہوئی پھر مرتد ہو گئی پھر اسلام لائی پھر مرتد ہو گئی پھر اپنی قوم کے پاس آدمی بھیج کر رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فدیہ کا ذکر فرمایا کہ جو لوگ اگر فدیہ میں زمین بھر کر بھی سونا دیں تو بھی کچھ فائدہ نہ ہو گا جس طرح عبداللہ بن جدعان کا حال پوچھا تھا کہ وہ مہمان نواز تھا، قیدی چھڑاتا تھا، محتاجوں کو کھانا کھلاتا تھا، یہ سب کچھ اس کے کام نہیں آیا اس نے ایک دن بھی نہ کہا: "اے اللہ مجھے قیامت کے دن بخش دے۔" معلوم ہوا کہ کافر دنیا میں خیرات کرے یا آخرت میں فدیہ دینا چاہے کچھ کام نہیں آتا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ان سے نہ بدلہ لیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی سفارش کام دیگی۔" ایک جگہ فرمایا: "نہ اس میں خرید و فروخت ہو گی اور نہ دوستی کام آئے گی۔" مزید فرمایا: "جن لوگوں نے کفر کیا اگر ان کے پاس زمین کی تمام

چیزیں ہوں اور اتنی اور بھی ہوں اور وہ قیامت کے عذاب سے بچنے کے لئے اسے فدیہ میں دینا چاہیں تو وہ ان سے قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہو گا۔"

اس جگہ پہلے زمین بھر سونے کا ذکر کیا پھر فدیئے کا اس سے معلوم ہوا کہ وہ اور ہے اور یہ اور ہے کیونکہ واؤ یہاں عطف کے لئے زاید نہیں ہے، حاصل یہ ہے اللہ کے عذاب سے کوئی چیز نہ پھیر سکے گی۔ انس بن مالک سے مرفوعاً ہے کہ ایک دوزخی سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں کہ بھلا ساری دنیا تیرے لئے ہو تو اسے دے کر اپنی جان چھڑائے گا وہ کہے گا ہاں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اس سے بہت آسان تجھے یہی چاہتا تھا کہ تیرے باپ آدم کی پیٹھ میں تجھے اقرار لیا تھا کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے گا مگر تو نہ مانا اور میرے ساتھ شرک کیا۔[رواہ احمد وشیخان]

دوسری حدیث انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً ہے کہ ایک جنتی کو لائیں گے اللہ اسے فرمائے گا آدم کے بیٹے تو نے اپنا گھر کیسا پایا؟ وہ کہے گا: بہت اچھا گھر ہے۔ پھر اللہ کہے گا: کچھ مانگ؟ وہ کہے گا: کیا مانگوں، ہاں! مجھے دنیا میں ایک مرتبہ لوٹا دے تاکہ تیری راہ میں دس مرتبہ مارا جاؤں۔" یہ اس لئے کہے گا کہ اس نے شہادت کی فضیلت دیکھ لی ہو گی۔ پھر ایک دوزخی کو لایا جائے گا اللہ اس کو فرمائیں گے اے آدم کے بیٹے! تو نے اپنی جگہ کیسی پائی؟ وہ کہے گا اے رب! بہت بری جگہ ہے۔ اللہ فرمائے گا: سونے سے بھری ہوئی زمین دے کر تو اپنی جان چھڑانا چاہے گا؟ وہ عرض کرے گا: ہاں! اللہ فرمائیں گے تو جھوٹ بولتا ہے میں نے اس سے بھی بہت آسان چیز تجھ سے مانگی تھی کہ تو نے وہ بھی نہ کیا پھر اسے دوزخ میں ڈال دیں گے، اسی لئے فرمایا کہ ان کے لئے عذاب دردناک ہو گا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہو گا۔

فائدہ: فتح البیان میں ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے حق میں نازل ہوئی، قتادہ، حسن اور عطاء کا بھی یہی قول ہے پہلے تو یہ لوگ آپ ﷺ کی صفات پر پھر منکر ہو گئے اس کفر پر جم گئے۔ ابن جریر نے کہا: کفر میں گناہوں سے ہوئی یہ آیت خاص یہود کے لئے آئی ہے۔ بعض نے کہا! تمام کفار کیلئے آئی ہے پہلے انہوں نے اللہ کے خالق ہونے کا اقرار کیا پھر اللہ کے ساتھ شرک کیا پھر کفر پر جم گئے۔ بعض نے کہا زیادت کفر یہ بات تھی کہ وہ کہتے تھے کہ ہم آپ ﷺ پر کسی آفت کا نازل ہونے کی توقع کرتے ہیں کسی نے کہا یہ آیت نفر اصحاب حارث بن سوید کے بارے میں اتری جو مرتد ہو گئے تھے حارث نے تو رجوع کر لیا وہ مکے میں کفر پر ڈٹے رہے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا اس آیت میں توبہ کا قبول نہ ہونا مشکل ہے کیونکہ پہلی آیت میں توبہ کا مقبول ہونا ہے۔ آپ

کا ہے ارشاد ہے: ”تو وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔“

بعض نے کہا مرتے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی جیسے ارشاد ہے ”ان کی توبہ نہیں ہے جو برے اعمال کرتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں۔“

کسی نے کہا کہ وہ توبہ قبول نہیں ہوتی کہ ایک کفر سے توبہ اور دوسرا کفر قبول کیا۔ جس طرح مسلمان ہو کر رافضی خارجی ہو جاتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مرتد ہو کر اپنا حال چھپانے کے لئے توبہ کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں کفر ہوتا ہے ابو العالیہ نے کہا: وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے حالت شرک میں گناہوں سے توبہ کی مگر شرک میں بدستور مبتلا رہے، یعنی یہی حال ان مسلمانوں کا ہے جو مومن کہلا کر قبر پرستی تقلید پرستی کرتے ہیں گناہوں سے تو بچتے ہیں مگر شرک نہیں چھوڑتے، کوئی غیر اللہ کی نذر مانتا ہے، کوئی کسی کے نام کا ذبیحہ دیتا ہے، کوئی کسی کی دہائی دیتا ہے، کوئی غیروں سے استعانت کرتا ہے، کوئی مصیبت میں پیر و مرشد کو پکارتا ہے۔ مجاہد نے کہا جب کوئی کفر پر مرے تو توبہ قبول نہیں ہوتی۔ ابن جریر نے کہا: ((زیادة علیٰ الکفر بعد الکفر)) یہی ہے شوکانی کہتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ اس آیت کو اسی شخص کی عدم قبول توبہ پر محمول کیا جائے جو کافر غیر تائب ہونے کی حالت میں مرا۔ یہ جو فرمایا کہ زمین بھر سونا لینا ان سے منظور نہیں، اس سے مراد اصحاب حارث ہیں جو حالت کفر میں مر گئے یا تمام کافر جو روئے زمین پر ہیں یا بت پرست کیونکہ یہ آیت عام ہے۔

((اس آیت پر تیسرا پارہ تمام ہوا۔ وللہ الحمد.))

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ
پارہ تِلْكَ الرُّسُلُ مکمل ہوا